

برطانوی مظالم کی کہانی
عبد الحکیم خاں اختر شاہ جہانپوری
کی زبانی

(مشعلِ راہ)

منصور حیدر راجہ

ملنے کا پتہ

فرید بک سٹال ۳۸ اردو بازار، لاہور ۲

برطانوی مظالم کی کہانی

عبد الحکیم خاں اختر شاہ جہانپوری
کی زبانی

(مشعلِ راہ)

ملنے کا پتہ

فرید بک سٹال ۳۸ اردو بازار لاہور ۲

دوری کی زبانی

نام کتاب —————
مصنف ————— عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہانپوری مظہری
کاتب ————— محمد شریف گل
ضخامت ————— ۱۸×۲۳ ، ۱۰۰۸ صفحات
اشاعت ————— بار اول
مطبع ————— جنرل پرنٹرز لاہور
ناشر ————— علامہ اختر شاہ جہانپوری
قیمت ————— روپے

فرید بک سٹال۔ اردو بازار لاہور

انتساب

”حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے فخر خاندان و نادر روزگار نے اپنے گھر سے جب اپنے بھتیجے مولوی اسماعیل کے ہاتھوں فتنہ و ابہت کا ظہور دیکھا تو بقول مصنف فرمایا: ”اسلمین فرمایا تھا کہ: ”میری طرف سے کہو اُس لڑکے نامراد کو، کہ جو کتاب بھٹی سے آئی ہے میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے اُس کے عقاید صحیح نہیں، بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہوئے ہیں۔ میں آج کل بیمار ہوں، اگر صحت ہو گئی تو میں اس کی تردید کھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم ابھی نوجوان نہ ہو، مانتی شور و شر برپا نہ کرو۔“

موصوف کے دوسرے چچا شاہ عبدالقادر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مولوی اشرف علی تھانوی فرمایا تھا: ”بابا! ہم تو سمجھتے تھے کہ اسماعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں جانتا۔“

رئیس المبتدعین صاحب کی ابتدائی کارگزاری کے تیور دیکھتے ہی شہنشاہ اقلیم منق حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے بقول مرزا حیرت دہلوی فرمایا تھا: ”اسمعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا۔“ اس کے بعد علامہ خیر آبادی نے تحقیقی الفتویٰ فی ابطال الطغویٰ لکھ کر اس فتنے کو پامال کیا اور شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ سپران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم نے معینہ الایمان اور الحجۃ العمل فی ابطال الجہل تصنیف کر کے اپنی گھر سے اٹھی ہوئی اس پراسرار شہادت کی بیخ کنی فرمائی۔

احقر مذکورہ حضرات کی ایمانی فراست کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی ناچیز کاوش کو ان پانچوں بزرگوں سے منسوب کرتا ہے۔

اختر شاہ جہانپوری مظہری عفی عنہ

فہرست

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۲۶۸	اینگلو انڈین علماء کی کھیپ	۷	مناجات بدرگاہِ مجیب الدعوات
۲۷۰	دیوبند مرکز	۹	استغاثہ - بارگاہِ رسالت میں
۲۸۵	علی گڑھ مرکز	۱۱	سخن ہائے گفتنی
۲۹۲	ندوہ کا پراسرار حال		باب اول
۲۹۷	مرزائے قادیان	۴۹	انگریزوں کا قبضہ اور مظالم
۳۰۳	باب سوم	۵۲	مداخلت فی الدین
۳۰۵	فرقہ سازی	۷۰	۱۸۵۷ء کا ٹکڑاؤ اور نتائج
۳۰۵	الہدیت فرقہ	۷۹	ایک تاریخی مغایطے کا حل
۳۰۶	دیوبندی فرقہ	۱۲۸	باب دوم
۳۰۷	نیچری فرقہ	۱۴۹	مسلمانوں کو اسلام سے کیوں بے بہرہ کرنا پڑا؟
۳۰۷	مرزائی فرقہ	۱۵۱	خارج کی تاریخ
۳۰۸	صلحِ کلیت و دہریت	۱۵۶	خارجی سلفی
۳۰۹	خاکسار پارٹی	۱۷۸	خارجی حرّانی
۳۰۹	جماعتِ اسلامی	۱۸۰	خارجی وہابی
۳۱۱	رئیس البتدعین مولوی اسماعیل دہلوی کے کارنامے	۱۸۹	خارجی اسماعیلی
۳۱۱	ترک تقلید	۲۰۲	دیوبندیت کی ابتداء
۳۱۶	توحید الٰہیت	۲۶۵	

۵۲۹	اسمعیل پرستی	۳۱۸	توہینِ شانِ رسالت
۵۳۳	امکانِ کذب	۳۳۸	توہینِ انبیاء کا عالمی ریکارڈ
۵۳۴	انکارِ ختمِ نبوت	۳۴۷	مکفیرِ مسلمین
۵۳۷	تتقیص رسالت کی ناقابلِ فہم جسارت	۳۵۸	قتل و قاتلِ مسلمین
۵۴۱	دیوبندیوں کی پیر پرستی	۴۱۱	خوابِ نبوت
۵۵۹	علمائے دیوبند کا مخصوص تصوف	۴۶۲	مسئلہ غلبہ بیت
۵۶۵	بانیِ جماعتِ اسلامی کے کارنامے	۴۷۶	دشمنِ مصطفیٰ کی نسل منقطع
۵۶۸	مودودی صاحب کا خدا	۴۷۸	کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کی مخالفت
۵۶۹	انبیائے کرام پر تیر اندازی	۴۹۶	فرقہ اہل بیت کی تخریب کاری
۵۷۴	صحابہ کرام پر زہر الی کرم نوازی	۴۹۶	جماعت کا اہل بیت نام؟
۵۸۳	قرآن و حدیث پر مہربانیاں	۴۹۷	امتیازی نشانات
۵۸۷	فرقہ سازی کے ذوق کی تسکین	۴۹۹	وہابی توحید
۵۹۰	بانیِ بیخیریت کے کارنامے	۵۰۰	عقیدہ رسالت
۶۰۳	بانیِ خاکسار پارٹی کے کارنامے	۵۰۲	انکارِ تعلید
۶۰۹	مسٹر غلام احمد پرویز کی تخریب کاری	۵۰۳	مجتہدینِ عظام پر طعن
۶۲۲	شیعہ حضرات	۵۰۶	خلافت پسندی
۶۲۶	انکارِ قرآن مجید	۵۰۶	وہابیہ کی طہارت کا پانی
۶۳۲	صحابہ کرام سے دشمنی	۵۰۹	غیر مقلدین کی شانِ عبادت گزاری
۶۳۵	تقیہ	۵۱۲	غیر مقلدین کے دیگر محبوب مشغلے
۶۳۸	متعہ	۵۱۵	وہابی خورد و نوش
۶۴۲	مسلمانوں سے بغض و عداوت	۵۱۹	غیر مقلدین کی ازدواجی بے ضابطگی
۶۴۳	مرزا غلام احمد قادیانی کی	۵۲۳	غیر مقلدین کی اہام بازی
	تخریب کاری	۵۲۸	دیوبندی جماعت کی تخریب کاری

منا لفتِ جہاد

ظلی بروزی نبوت کا دعویٰ

حقیقی نبوت کا دعویٰ

مقدس بارگاہوں میں درپردہ دہنی

ابن اللہ ہونے کا دعویٰ

دعویٰ الوہیت

اقبالِ ڈگری

مسلمانوں سے علیحدگی

باب چہارم

انگریز دوستی کی کہانی، انگریز دوستوں کی زبانی

سید احمد بریلوی

مولوی محمد اسماعیل دہلوی

مولوی محمد اسحاق دہلوی

مولوی محبوب علی

مولوی کرامت علی جونپوری

مولوی ملک علی نانوتوی

مولوی سمیع اللہ دہلوی

مولوی ڈپٹی نذیر احمد

مولوی محمد احسن نانوتوی

مولوی عبدالاحد دہلوی

میاں نذیر حسین دہلوی

مولوی محمد حسین بٹالوی

۶۴۵

۶۴۵

۶۴۸

۶۵۳

۶۵۷

۶۵۸

۶۵۸

۶۵۹

۶۶۳

۶۶۳

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

۶۶۶

مولوی نواب صدیق حسن خاں جھوپالی

سر سید احمد خاں علی گڑھی

علامہ شبلی نعمانی اعظم گڑھی

الطاف حسین حالی پانی پتی

مولوی رشید احمد گنگوہی

مولوی اشرف علی تھانوی

مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی

مولوی محمد الیاس کاندھلوی

مرزا غلام احمد قادیانی

شیعہ حضرات

باب پنجم

وہابیہ کی زنا ر دوستی

گائے کی قربانی اور گاندھوی حضرات

گاندھوی شیخ الہند کے کارنامے

تحریکِ خلافت

جمعیتہ العلماء ہند

گاندھوی امام الہند کے کارنامے

احزاب پارٹی

علمائے اہلسنت کی فہمائش اور ادائے فرض

نجیدی وہابیہ کی بُت پرست توازی

بُت پرستوں کی پختہ زنا ر

قطعاتِ تاریخ

ماخذ و مراجع

مناجات

اے خدا، سب کے حاجت روا، آج ایمان کی جان خطرے میں ہے
 رہزنِ دین بننے لگے رہنا، حق پرستوں کا ایسا خطرے میں ہے
 یوں تو آزاد ہیں، حکمرانی بھی ہے، یوں تو سکے کی اپنے روانی بھی ہے
 درحقیقت ہیں محکوم کفار کے، اہل اسلام کی آن خطرے میں ہے
 جن کے زیرِ نگیں ہفت کشور ہوتے، قسمت اقوامِ عالم کی لکھتے رہتے
 آج ہیں کفر کے زیرِ فرماں وہی، قوم کی شوکت و شان خطرے میں ہے
 تھے جو پیکرِ کبھی عدل و انصاف کے، تھے جو پتلے کبھی حُسنِ اخلاق کے
 آج وہ ہو گئے ننگِ انسانیت، آج کا ساز و سامان خطرے میں ہے
 آج اپنی خلافت بنیِ خواب ہے، کشتیِ شانِ مسلم ہی غرقاب ہے
 خود ہی آپس میں دست و گریباں ہیں، جس سے ہر مریض سلطان خطرے میں ہے
 آہ کشمیر، قبرص، فلسطین میں یا اریٹیریا، روس اور چین میں
 حق کی خاطر مسلمان کھولیں زباں، جسمِ خطرے میں ہے جانِ خطرے میں ہے
 عہدِ انگریز کی سب سے لعنت بڑی، تھا جو وکٹوریہ نے بنایا نبی
 اُس کے اب پیروکار اس قدر ہو گئے، جس سے نظمِ گلستاں خطرے میں ہے
 لیڈروں کے زالے ہی اطوار ہیں، کہتے ہیں قوم کے یار و غمخوار ہیں
 قومیت کو مٹاتے ہیں کچھ اس طرح، دین کا ہر نگہباں خطرے میں ہے
 ناچ گانے غضبِ آج محبوب ہیں، آہ اُمّ النجابت کے مشروب ہیں
 ہو رہی ہیں امیروں میں خرمستیاں، دورِ حاضر کا انسان خطرے میں ہے
 رہزنوں کا ہوا گرم بازار ہے، رہنماؤں سے اب قوم بیزار ہے
 غیرتِ دین و ایمان کا بیوپار ہے، آج سچا مسلمان خطرے میں ہے

کیسے تفسیر و تفہیم کے نام سے ، کیسے فکر و تدبیر نما دام سے
یوں مطالب بتاتے ہیں آیات کے ، جن سے مفہوم قرآن خطرے میں ہے
مصطفیٰ کے فرامین و درزاں ، مصطفیٰ کی اُنھیں سے کریں کسرِ شاں
کس غضب کی ہیں یہ شوخیاں الاماں ، تیرے پیارے کافرمان خطرے میں ہے
اہل اسلام کو منتشر کر دیا ، اب تو ہر فرد ہے ایک فرقہ جدا
دشمنانِ نبی بن گئے اولیا ، آج سچوں کی پہچان خطرے میں ہے
ہم نے مانا کہ بیشک خطاکار ہیں ، ماکِ دو جہاں ! ہم گنہگار ہیں
اُمتی ہیں مگر تیرے محبوب کے ، اُمتِ شاہِ فریشتان خطرے میں ہے
بہر شاہِ اُمم ہو نگاہِ کرم ، پھر ترقی کرے قوم یہ دم بدم
شان و شوکت سے اختر بھی چمکے تیرا ، ذوالمنن ! وہ پریشان خطرے میں ہے

اختر شاہجہان پوری نظری غفرلہ

لاہور

استغاثہ

(بجھنورسرایانور، شافعِ یوم النشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)

نگاہِ محبت ، چشمِ عنایت ، یا رسول اللہ
 پریشان حال ہیں ہم اہلسنت ، یا رسول اللہ
 اٹھا رکھا ہے سرہنمت پھر تخریب کاروں نے
 بظاہر بن کے ہمدردانِ ملت ، یا رسول اللہ
 وہ، جو ہیں صاحبانِ جبتہ و دستارِ کھلاتے
 بہ باطن آپ سے جن کو عداوت ، یا رسول اللہ
 وہ، چہرہ جن کا مومن کا مگر دل ہے ابو جہلی
 ہے اُجلا جن کا تن ، گندی ہے شیر ، یا رسول اللہ
 زباں پر لعو توحیدِ دل ایمان سے چالی
 ہے کلمہ لب پہ اور دل میں کدورت ، یا رسول اللہ
 وہ، جو ہیں آپ کی تعظیم اور تکریم کے مُنکر
 وہ گستاخانِ دربارِ رسالت ، یا رسول اللہ
 یہ رہنِ مسلمان بن کر نکل آتے ہیں میدان میں
 کریں کس طرح ہم اپنی حفاظت ، یا رسول اللہ
 ہمارے اہل حق باہدِ دست و گریباں ہیں
 انہیں کب اپنے ہے جھگڑوں سے فرصت یا رسول اللہ
 مقابلِ دشمنانِ دین کے جو مردِ میدان تھے
 وہ ہیں شیرِ نیستانِ سیاست یا رسول اللہ

سجا تھا جن کے تن پر جامۃ الفقر ماضی میں
 ہے اب زر کی تگ و دو ان کا خلعت یا رسول اللہ
 کسی کو صرف ہے درکار خوشنودی امیروں کی
 کسی کو صرف کرسی کی ضرورت یا رسول اللہ
 انہیں میں سے نئے فیشن کے کچھ مفتی معاذ اللہ
 مسائل میں بھی کر بیٹھے ہیں جدت یا رسول اللہ
 ہمارے رہبرانِ دین و ملت کی یہ حالت ہے
 کہیں کس سے ہم اپنے دل کی حالت یا رسول اللہ
 ٹکے ہیں دشمنانِ دینِ ادھر تخریب کاری پر
 محذور ہے فضاتے دین و سنت یا رسول اللہ
 دروالا پہ اختر استغاثہ لے کر آیا ہے
 حبیبِ حق ، شہنشاہِ رسالت یا رسول اللہ
 مدینے سے اُٹھے پھر ابرِ رحمت یا رسول اللہ
 کرم ہو پھر بشکلِ اعلم حضرت یا رسول اللہ
 (صلی اللہ تعالیٰ علیہ والہ وصحبہ وسلم)

از اختر الحامدی الرضوی مدظلہ
 حیدرآباد



سخن ہائے گفتنی

وہ محرکات جو اس کتاب کی تصنیف کا باعث بنے اولاً اُن کا قارئین کے سامنے اظہار

کر دینا ضروری خیال کرتا ہوں، لیکن وجہات حسب ذیل ہیں:

۱۔ باری تعالیٰ شانہ کے فضل و کرم اور اُس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نظر عنایت سے

اس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ سے تعلق خاطر ہے اور رشتہ عقیدت و نیاز مندی حاصل ہے۔ اس بنا پر نہیں کہ راقم الحروف نے العظمت بریلوی سے براہ راست

فیض حاصل کیا تھا، کیونکہ امام موصوف کا ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء میں وصال ہو گیا تھا اور احقر کاسن پیدائش ۱۹۳۵ء ہے۔ امام احمد رضا کے ساتھ دوسرا کوئی عام رشتہ بھی نہیں ہے

جبکہ آپ مولد بریلوی، نسباً پٹھان اور مشرباً قادری تھے اور راقم سطور مولد انشا، بھجپنوی، نسباً راجپوت اور مشرباً نقشبندی مجددی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگرچہ برائے نام ہی

سہی۔ ہاں فاضل بریلوی کے ساتھ ایک خاص رشتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ موصوف کو عرب و عجم کے عمائد دین و ملت یعنی اکابر علمائے اہلسنت نے امام تسلیم کیا اور چودھویں سی

کا مجدد بتایا تھا۔ لہذا اس ناچیز کو امام احمد رضا خاں بریلوی سے بھی اُسی طرح نیاز مندانہ عقیدت و محبت ہے جس طرح حضرت امام ربانی، مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ

اور دوسرے بزرگان دین سے ہے۔ والحمد للہ علی ذلک۔ اس تعلق خاطر نے مجبور کیا کہ امام احمد رضا خاں بریلوی کے تجدیدی کارنامے پر جو کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ

میں لکھا جاسکے، لکھ کر اپنی عقیدت کا ثبوت پیش کروں کیونکہ لکھنے والوں نے ابھی تک اس اہم ترین عنوان پر لکھنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی ہے۔

۲۔ دوسری وجہ اس موضوع پر قلم اٹھانے کی یہ ہے کہ خطیب مشرق، مصنفِ خون کے انس، علامہ شتاق احمد نظامی مدظلہ مدیرِ پاسبان الہ آباد کا یہ بیان پڑھنا نصیب ہوا کہ:

”محترم مفتی ظفر علی صاحب نعمانی پرنسپل دارالعلوم امجدیہ کراچی کا مرسلہ پکیٹ جس وقت مجھے موصول ہوا اور کتاب کے سرورق ”حیاتِ العلحضرت“ پر نظر پڑی تو وفور شوق میں اوراق گردانی کرنے لگا مگر اپنی حرام نصیبی کہ جس عنوان کا تلاشی تھا وہ مجھے نہ مل سکا، یعنی ”العلحضرت کی شانِ تجدید“۔ میرے خیال میں جلد اول کا سب سے اہم اور ضروری باب یہی تھا کہ العلحضرت کی مجددیت پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی اس کے بعد زندگی کے دوسرے گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ بعد کے دوسرے نسخوں میں حضرت ملک العلماء محمد ظفر الدین صاحب قبلہ پرنسپل جامعہ لطیفیہ کیتھارن نے اس خصوصی مسئلہ پر گفتگو فرماتی ہو، لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو مکتبہ کراچی کو چاہیے کہ وہ موصوف سے اس عنوان پر ایک علمی و تحقیقی مقالہ لے کر دوسری یا تیسری جلد میں شائع کر دے، ورنہ میری نگاہ میں ”حیاتِ العلحضرت“ ایک عالم و فاضل کی تاریخ تو کہی جاتے گی لیکن کسی مجدد کی تاریخ نہ بن سکے گی۔ ضرورت ہے کہ العلحضرت کی شانِ تجدید پر محققانہ گفتگو کی جاتے۔ یہ تنقید و تبصرہ نہیں بلکہ ایک ناقص راتے کا اظہار ہے“ لہ

شاید موصوف کی یہ آواز صدائے صحرا ہو کر ہی رہ گئی تھی کہ اس موضوع پر ابھی تک کوئی کتاب منصہ شہود پر جلوہ گر نہ ہو سکی۔ راقم الحروف یہی کچھ لکھنے کی بفسدہ تعالیٰ جبارت کر بیٹھا تاکہ ایسے عظیم عنوان اور ایسے جلیل القدر امام و مجدد کے تجدیدی کارنامے پر اس بے ڈھنگی کتاب کو دیکھ کر علمائے اہلسنت میں سے کوئی صاحب بھنجلا اٹھیں اور اس طرح غصے میں آکر ”العلحضرت کا تجدیدی کارنامہ“ شایانِ شان طریقے سے عالمانہ اور محققانہ انداز میں لکھنے کی شاید زحمت گوارا فرمائیں۔

۳۔ تیسری وجہ مذہبِ اہلسنت و جماعت سے بغاوت کرنے والے اینگلو انڈین علماء اور انصاف دشمن مورخوں کی علمائے اہلسنت اور خصوصاً امام احمد رضا خاں بریلوی کے خلاف

معاندانہ روش ہے۔ یہ حضرات اپنے اکابر کی انگریز دوستی اور بُت پرستی نوازی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے بے جا الزامات اور واہمی تباہی اعتراضات کا ایک لائقناہی سلسلہ مدتوں سے منظم طور پر جاری کیے ہوئے ہیں۔ جن حضرات کے قدموں پر بھی کبھی انگریز دوستی کی گردن پڑی اور جن کے خلوص و لہیت، تقویٰ و طہارت اور دیانت و امانت کی فرشتے بھی قسم کھا سکتے ہیں، اُن علمائے کرام اور اویائے عظام پر انگریز دوستی کا الزام نہایت بے باکی سے لگادیتے ہیں اور اپنی اس نازیبا حرکت، الیبلی شرارت، اکابر ہند پاک سے عداوت، تاریخ و واقعات میں خیانت کرنے پر ذرا انہیں شرماتے، آنکھیں تک نہیں جھکاتے، مثلاً پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

”دہلی میں دبیر الدولہ نواب فرید الدین (ف ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء)، منشی زین الدین (ف ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۵۶ء)، مفتی صدر الدین آزدہ (ف ۱۲۸۵ھ/ ۱۸۶۸ء)، مولوی فضل امام خیر آبادی (ف ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۲۸ء)، مولوی محمد صالح خیر آبادی (برادر فضل امام خیر آبادی)، منشی فضل عظیم خیر آبادی (فرزند اکبر فضل امام خیر آبادی)، مولوی فضل حق خیر آبادی (ف ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۶۱ء)، بدایوں میں مولوی فضل رسول (ف ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء)، مولوی علی بخش صدر الصدور (ف ۱۳۰۳ھ/ ۱۸۸۵-۸۶ء)، مراد آباد میں مولوی عبدالقادر چیف رام پوری (ف ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۹ء)، الہ آباد میں مولوی اسد اللہ (ف ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲-۸۳ء) وقاضی عطار رسول چریا کوٹی، کلکتہ میں قاضی نجم الدین خاں کاکوروی (ف ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۳ء) اور ان کے صاحبزادگان، قاضی سعید الدین (ف ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء)، مولوی حکیم الدین (ف ۱۲۶۹ھ/ ۱۸۵۳ء) اور قاضی علیم الدین (ف ۱۲۵۷ھ/ ۱۸۴۱ء) وغیرہ۔ مدراس میں قاضی ارتضاعی گوپاموی (ف ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳-۵۴ء) اور وناسک میں خان بہادر مولوی عبدالفتاح مفتی وغیرہ برصغیر پاک و ہند کے وہ اعظم و افاضل ہیں جنہوں نے منصب افتاء، قضاء اور صدر الصدوری کے ذریعے سرکار کمپنی کے اقتدار کو

کو بحال اور مضبوط کر کیا۔“ لے

۷۔ گلشن کے اس اک منظرِ پُچار کے ہاتھوں

سوچا کہ ہیں یا رومرے دامانِ نظر میں

قادری صاحب کو مذکورہ علمائے کرام کی ملازمت تو نظر آگئی اور صرف ملازمت کے پیشِ نظر مزے لے لے کر برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہ ہونے کا الزام عائد کر دیا۔ کاشش ! موصوف روز قیامت کا منظر اور وہاں کی باز پرس کو مدِ نظر رکھتے۔ الزام تراشتے اور بہتان لگانے سے پہلے مندرجہ ذیل امور پر غور فرمایا جاتا :

- ۱۔ کیا ان علمائے کرام نے کسی خلافِ اسلام منصوبے میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا؟
- ۲۔ کیا ان اکابر نے کمپنی کے دباؤ یا ترغیب سے اسلامی عقائد و نظریات میں کوئی ترمیم و تسخیر کی تھی؟

۳۔ کیا ان بزرگوں نے حکومت کی حمایت کا کوئی ایسا اعلان کیا تھا جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا؟

ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ عرض کرتے ہیں کہ معاندین اس قسم کا ایک بھی الزام علمائے اہلسنت پر ثابت نہیں کر سکتے۔ رہی بغض و عناد کی بات، تو یہ راستہ ہی دوسرا ہے۔ اس راستے پر گامزن ہو کر، جو کسی کے جی میں آئے کتنا پھرے، کون کسی کا منہ پکڑ سکتا ہے؟ مبتدعینِ زمانہ نے تو بغض و عناد میں شمشادِ دو جہاں، سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیسے کیسے نازیبا کلمات استعمال کیے ہیں، جن کی کھلے کافروں کو بھی کبھی جرأت نہ ہوئی بلکہ اس سے بھی تجاوز کر کے باری تعالیٰ شانہ کے سبوح و قدوس ہونے کو داغدار کرنے کی غرض سے ذاتِ باری تعالیٰ پر امکانِ کذب کا الزام لگانے اور اسے جھوٹا ٹھہرانے کی باقاعدہ مہم شروع کر دی تھی۔ یہی حضرات اگر علمائے اہلسنت پر الزام تراشی کرتے ہیں تو کونسی عجیب بات ہے؟ ہاں پروفیسر محمد ایوب قلداری جیسے تاریخ دوست حضرات سے ہم اتنی گزارش

ضرور کریں گے : ۵

ہاں چاہتے ہیں کہنا کچھ اپنی لے میں ہم بھی

نغمہ نواز رکھ دے اب ساز لکن تکرانی

اس کتاب میں مختلف عنوانات کے تحت جو کچھ تحریر ہوا ہے اگر اسے انصاف اور دیانت داری کے ساتھ پڑھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ علمائے اہلسنت سے عناد رکھنے والوں کے وہ صاحبانِ جتہ و دستار جنھیں برٹش گورنمنٹ نے اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر آسمانِ علم کے شمس و قمر منوانے اور تقویٰ و طہارت میں رشکِ جنید و شبلی باور کرانے کی خاطر اپنے پروپیگنڈے کی ساری مشینز کی حرکت دی ہوئی تھی اور تا حال بھی مصروفِ عمل ہے، کچھ اور ہی نظر نہ آنے لگیں۔ معلوم نہیں پروفیسر محمد ایوب قادری جیسے حق کے متلاشی نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لے کر کیوں علمائے اہلسنت کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے؟ ۵

دل میں سما گئی ہیں قیامت کی شوخیاں

دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

اسی طرح مولوی محمد سلیمان بدایونی نے سہ ماہی ”العلم“ کراچی، بابت مارچ ۱۹۵۸ء

مطابق ۸، ۱۳ احم میں امام احمد رضا خاں بریلوی سے بعض عناد کی بنا پر ”حیاتِ المحضرت“ مصنفہ علامہ ظفر الدین بہاری علیہ الرحمہ کے پیش نظر ایسی طویل اور لاجل تنقید کی ہے جو بجا خود محتاج تنقید ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اُسی تنقید کا اپنی کئی تصانیف اور تحریروں میں سہارا لیا ہوا ہے۔ گویا جب ان حضرات کے دریائے تحقیق میں جوش آتا ہے تو اتنے باریک بین ہو جاتے ہیں کہ اپنے مخالفین کی آنکھوں میں فرضی تینکے بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن جب اپنے اُن علماء کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جنھیں اَدْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰہ بنا کر اپنے دلوں اور دماغوں پر سوار کیا ہوا ہے تو آنکھیں اتنی چندھیا جاتی ہیں کہ اُن حضرات کی آنکھوں کے شہتیر بھی نظر نہیں آتے۔ یہ تحقیق ہے یا دھاندلی؟ یہ انصاف ہے یا تاریخ پر ظلم؟ یہ عام مسلمانوں کی رہنمائی اور خیر خواہی ہے یا تحقیق کی آڑ میں اُنھیں غلط راستے پر گامزن کرنا اور خدا کے مقبول بندوں کے خلاف صف آرا کرنا اور ہونا؟ حقائق آپ حضرات کے بھی سامنے ہیں

انصاف کی ترازو ہاتھ میں ہے، کیوں ڈنڈی مار کر دیانت و امانت کا خون سرِ بازار کیا جا رہا ہے؟ کیا قیامت نہیں آتے گی؟ ہم مولوی محمد سلیمان صاحب بدایونی کو مخلصانہ اور خیر خواہانہ مشورہ دیتے ہیں کہ:۔

رندِ خواب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پراتی کیا پڑی، اپنی نبیڑ تو

اس سلسلے کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بعض حضرات بغضِ معاویہ میں اتنے دُور نکل جاتے ہیں کہ سنگین سے سنگین الزام ڈنکے کی چوٹ لگاتے ہیں لیکن اُس الزام کی پشت پر کوئی جھوٹ موٹ کی دلیل یا فرضی وجہی شہادت تک پیش کرنے سے بھی عاجز ہوتے ہیں۔ ثبوتِ خواہ زندگی بھر میسر نہ آ سکے لیکن بہتان تراشی میں کوتاہی کرنا جرم سمجھتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں ”آئینہ صداقت“ نامی ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کتاب کے مُصنّف پروفیسر الحاج محمد فیروز الدین رُوحی ہیں۔ سرِ ورق پر لکھا ہے کہ ”بریلوی اور دیوبندی مسلک کی حقیقت تاریخ کے آئینہ میں“۔ یہ سہانا اعلان کتاب کا پیارا پیارا نام پڑھ کر اور یہ معلوم کر کے کہ مُصنّف ماشاء اللہ اسلامک سٹڈیز کے پروفیسر ہیں اور ساتھ ہی الحاج بھی نیرِ روحانیت سے تعلق رکھنے والے تخلص سے بھی مزین ہیں، یہ امید ہو چلی تھی کہ موصوف نے ضرور تاریخی انصاف سے کام لیا ہوگا، اختلافات کی تلخی کو کم کرنے کی سعی فرمائی ہوگی اور علمی انداز میں مثبت کردار ادا کیا ہوگا، لیکن کتاب کا مطالعہ کیا تو ساری کتاب رہی ایک طرف، پہلے چند صفحات ہی نے میرے غم میں اُمید میں ایسی آگ لگائی کہ اُس کا نام و نشان تک مٹا دیا۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ شاید محترم رُوحی صاحب مثبت انداز کے تصور سے بھی نا آشنا ہیں اسی لیے موصوف نے پوری کتاب میں منفی انداز ہی کو نبھایا اور بعض مقامات پر تو اس سے بھی نیچے پھسلے اور گڑھکے زہرے۔ چونکہ ”آئینہ صداقت“ نامی کتاب کے بارے میں راقم الحروف نے اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا ہے لہذا اس کا تعارف کروانا ضروری خیال کرتا ہوں۔ موصوف رقم طراز ہیں:

”کسی سے مناظرہ مقصود نہیں ہے، نہ کسی کو سب و شتم کرنے کا خیال ہے، نہ ہی کسی کی بے جا طرفداری اپنا شعار ہے۔ ہر بات کا ثبوت کتاب اور حوالہ سے

موجود ہے۔ ہر شخص خدا کو حاضر و ناظر جان کر، طرف داری اور جانب داری کو چھوڑ کر، اس کتاب کا مطالعہ کرے گا، انشاء اللہ حقیقت اُس پر واضح ہو جائے گی۔“

آیتہ رُوحی صاحب کے مذکورہ دعاوی کا جائزہ لیتے ہیں کہ اپنی اس تصنیف میں موصوف نے کہاں تک ان کا پاس لحاظ کیا ہے؟ یا محض قارئین کے دل موہ لینے کی خاطر یہ خوشنما اعلان کیا ہے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

”ان کو کیا معلوم کہ ابنِ عابدین شامی نے حکومت کے اثر سے ان غریبوں (دوبلوں) کو بدنام کیا اور ان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کر کے اپنی دنیا سنبھالی۔ بُرا ہو اس دنیا پرستی اور سنہرے سکوں کا، جس کے عوض شامی نے نجیوں کو دل کھول کر بدنام کیا۔ شامی نے یہ سب کچھ محمد علی پاشا کے حکم سے اُس کی دولت کے اثر سے لکھا ہے۔“

شاید اس گروہ نے بزرگانِ دین کی امانت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اسی لیے باری تعالیٰ شانہ، اور انبیائے کرام سے لے کر علمائے کرام تک جس کو بھی اپنے خلاف دیکھتے ہیں، اُسی کی طرف اپنی توپوں کا رخ پھیر کر دھواں دھار بمباری شروع کر دیتے ہیں۔ رُوحی صاحب سے تو کیا کہا جاتے لیکن ہم انصاف پسند قارئین سے یہ درخواست ضرور کریں گے کہ موصوف نے علامہ ابنِ عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ جیسے مسئلہ عالمِ دین، اہلسنت کے مایہ ناز فقیہ اور اپنے دور کی یگانہ روزگار شہنشاہی پر جو الزامات مذکورہ عبارت میں عائد کیے ہیں، ان کا ثبوت مُصَنِّف نے ”آئینہ صداقت“ میں کس جگہ دیا ہے؟ اگر ثبوت ہے تو کس صفحے پر اور اگر پہلے صفحے سے آخری تک ثبوت کے نام کا ایک لفظ بھی نہ مل سکے تو ”ہر بات کا ثبوت کتاب اور حوالہ سے موجود ہے۔“ یہ اعلان حقیقی دعویٰ ہی کہلاتے گا یا فراڈ؟ کیا ایسی کتاب کا نام ”آئینہ صداقت“ ہی رکھنا چاہیے تھا یا اور کچھ؟ کیا

تاریخ کے آئینے میں اسی طرح فیصلہ ہوا کرتا ہے ؛ معلوم ہوتا ہے کہ روجی صاحب بھی اپنے قبیلے کے جید اساطین کی طرح تاریخ سے انتہائی خائف ہیں، ورنہ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے دلائل قارئین کی خدمت میں پیش کرتے، ثبوت ٹھوس، واضح اور وزنی ہوتے تاکہ اُن کی روشنی میں براہِ راست یہی راستے قائم کرنے پر مجبور ہو جاتا جس کا اعلان موصوف نے بغیر کسی دلیل کے کیا ہوا ہے۔ یکتبی ستم ظریفی ہے کہ بغیر دلیل کے دعویٰ کیا جاتا ہے۔ کیا یہ تاریخ کا، دیانت داری کا، اپنی عملیت کا بلکہ خود اپنی ذات کا مذاق اڑانا نہیں ہے ؟

آئیے اتارین کی عدالت کے بعد آپ کی سپریم کورٹ سے فیصلہ کروا لیتے ہیں۔ یہ ہیں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر، یعنی مولوی حسین احمد صاحب ٹانڈوی (اسے گاندھوی نہ پڑھنا سنیے موصوف کیا فرماتے ہیں :

”محمد بن عبد الوہاب نجدی ابتداءً تیرہویں صدی نجد سے ظاہر ہو اور چونکہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اُس نے اہل سنت والجماعت سے قتل و قتل کیا اور اُن کو بالجو اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، اُن کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا اور اُن کے قتل کو باعثِ ثواب و رحمت شمار کرتا رہا اہل عربین کو خصوصاً اور اہل حجاز کو عموماً اُس نے تکلیف شاقہ پہنچائیں۔ سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے۔ بہت سے لوگوں کو اُس کی تکلیف شدیدہ کے مبینہ منورہ اور منکرہ معظّمہ چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اُس کے اور اُس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے الحاصل وہ ایک ظالم و باغی اور خونخوار فاسق شخص تھا۔“

ہم روجی صاحب سے سوال کرتے ہیں کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے محبوب نجدیوں کے مظالم اور عقائد فاسدہ بیان کیے تو وہ آں جناب کے نزدیک دنیا پرست اور

لے ٹانڈوی صاحب کو چاہیے تھا کہ یہاں اہل سنت و جماعت یا اہل سنت والجماعت۔

لے حسین احمد ٹانڈوی، مولوی : الشہاب الثاقب، مطبوعہ دیوبند، ص ۲۶

دین فروش ٹھہر گئے لیکن صدر دیوبند مولوی حسین احمد ٹانڈوی کے بارے میں ارشاد فرمادیا جائے کہ جناب کے نزدیک یہ بھی دنیا پرست اور دین فروش قرار پائیں گے یا نہیں؟ اب ذرا دوسری بڑی سرکار مولوی خلیل احمد انبٹوی کا فیصلہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے؛

”سوال: محمد بن عبد الوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن کے مال و اَبْرُو کو اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا، اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے اور کیا سلف اور اہل قبلہ کی تحفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے اور غوراً ج ایک جماعت ہے شوکت والی، جنہوں نے امام پر چڑھاٹی کی تھی تاویل سے کہ امام کو باطل یعنی کفر یا معصیت کا ترک سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں، آگے فرماتے ہیں، ان کا حکم باغیوں کا ہے۔۔۔ اور علامہ شامی نے اس کے حاشیہ میں فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے زمانے میں (محمد بن عبد الوہاب کے تابعین سے سرزد ہوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہوئے، اپنے کو حنبلی مذہب بتاتے تھے، لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے عقیدے کے خلاف ہو، وہ مشرک ہے اور اسی بنا پر انھوں نے اہل سنت اور علمائے اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا، ملخصاً۔ لہ

اس کتاب المہند علی المہند پر اکابر علمائے دیوبند کی تقابض بھی ہیں، جن میں آپ کے شیخ المہند مولوی محمود الحسن، جناب کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانوی، جمعیتہ العلماء ہند کے صدر مفتی کفایت اللہ دہلوی اور دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز مفتی مولوی عزیز الرحمن بھی

شامل ہیں۔ کیا رُوحی صاحب بتا سکیں گے کہ مولوی حسین احمد ڈانڈوی اور مولوی خلیل احمد انبٹوی نے کس کی دولت کے اثر سے نجدیوں کو بُرا بھلا کہا تھا؟ نیز ان حضرات کی تصدیق کرنے والے اتنے سارے علمائے دیوبند کو کہاں سے دولت ملتی تھی؟ نجدیوں کو بُرا بھلا تو اکثر علمائے دیوبند نے بھی کہا ہے لیکن یہ منطق ہماری سمجھ بوجھ سے بالابہ کہ علامہ شامی اگر نجدیوں کے عقائد فاسدہ کا ذکر کریں تو دین فروش اور دنیا پرست قرار دے دتے جاتے ہیں لیکن علمائے دیوبند جب نجدیوں کے مظالم اور غلط عقائد و نظریات کی نشان دہی کرتے ہیں تو انھیں علمائے حق کہا جاتا ہے۔ یہ کیسا انصاف ہے، اسلامک سٹڈیز کے پروفیسر عالیجناب الحاج محمد فیروز الدین رُوحی بالقابہ نے اپنی ماڈرن صداقت کے آئینے میں قارئین کو تین مزید جملے پُوں دکھائے ہیں:

”احمد زینی دحلان کی حقیقت بھی سنیہ۔ یہ شخص حکومت کا تنخواہ دار ایجنٹ تھا اور اُس کے حکم و اشارہ پر سب کچھ لکھتا تھا۔ چونکہ مفتی مکہ تھا اس لیے خوب کھل کھینے کے مواقع حاصل تھے۔ تفصیلات کا موقع نہیں“ ۱

”مولوی فضل رسول بدایونی انگریز کے ایجنٹ اور تنخواہ دار تھے“ ۲

”یہاں یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگی کہ مولانا (امام احمد رضا خاں بریلوی) نے جہاد کے معاملہ میں اپنے استاد (شیخ احمد بن زینی دحلان مکی) کی سنت کو پورا پورا نباہ کر انگریز کا ساتھ دیا ہے۔ جہاد کے سلسلے میں فتاویٰ رضویہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔“ ۳

مذکورہ تینوں حضرات پر موصوف نے الزام تو اتنا سنگین لگا دیا لیکن اس شوخی اور شرارت کی کہاں تک داد دی جائے کہ پوری کتاب میں اس امر کا ثبوت ایک بھی نہیں دیا جاسکا۔ معلوم نہیں یہ کیسی دیانتداری کا ریکارڈ قائم کیا جا رہا ہے؟ بزرگانِ دین پر الزام تراشی تو

۱۔ محمد فیروز الدین رُوحی: آئینہ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۵۵

۲۔ ایضاً: ص ۵۵

۳۔ ایضاً: ص ۵۵

ڈنکی کی چوٹ کرتے جاتے ہیں لیکن ثبوت کے نام سے بھی بدکتے اور بھاگتے چلے جاتے ہیں ،
 پکڑے جانے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے تو یوں آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے اور اُسے
 اپنی صداقت کے آئینے کی زینت بناتے ہیں :
 ”تفصیلات کا موقع نہیں“ ۱

”یہاں پر صرف اشاروں پر اکتفا کیا جا رہا ہے“ ۲

”یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں“ ۳

”ہم صرف اشارہ دیں گے“ ۴

اس فرضی آئینہ صداقت میں یہ علی دنیا کا مذاق اڑایا گیا ہے یا نہیں ؟ بندہ خدا ! جب
 آپ کے پاس ان بزرگوں کو مطعون کرنے اور مورد الزام ٹھہرانے کے لیے ایک دلیل بھی نہیں جسے
 آپ اپنے نام نہاد ”آئینہ صداقت“ میں پیش کرتے تو الزام تراشی کرنے کی بجائے صاف صاف
 یوں لکھ دیتے کہ ”علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کے بارے میں ہمیں تو کیا ہمارے بڑے بڑوں کو
 بھی کوئی ایک ثبوت نہیں مل سکا تھا، لیکن ہم نے اپنے اکابر کی سیاہ کاریوں پر پردہ ڈالنا ہے ،
 ان حالات میں اگر علمائے اہلسنت پر گھنوں نے الزامات نہ لگائیں تو اپنے اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ
 کی تحریب کاری ، انگریز دوستی اور بت پرست نوازی پر پردہ کس طرح ڈالیں ؟ لہذا یہ ذلیل
 راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں کیونکہ راہِ راست ہماری طبیعتوں کے ناموافق ہے۔ فقط والسلام
 اگر صاف صاف اس طرح لکھ دیا جاتا تو قارئین کی نظر میں اُس درجہ قابلِ نفرت تو نہ
 ٹھہرتے کہ علمی خیانت کرنے اور بزرگانِ دین کے مخالفوں کی فہرست میں شامل ہونے کو اپنا
 کارنامہ ہی سمجھتے چلے جا رہے ہیں۔ رُوحی صاحب نے یہ زہر کتنے معصومانہ انداز سے اُگلا ہے کہ :

۱۔ محمد فیروز الدین رُوحی : آئینہ صداقت ، مطبوعہ کراچی ، ص ۵۵ ، ۱۴۵

۲۔ ایضاً ، ص ۱۴۴

۳۔ ایضاً : ص ۱۴۵

۴۔ ایضاً ، ص ۱۴۵

”جہاد کے سلسلہ میں فتاویٰ رضویہ دیکھنا خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔“ جہلا اس ستم ظریفی کی داد کہاں تک دی جائے کہ صرف کتاب کا نام کچھ دیا اور جلد، عبارت اور صفحے وغیرہ کا نشان تک نہ بتایا کہ کسی نے نقل کا اصل سے مقابلہ کر کے دیکھ لیا تو سر بازار اس صداقت کے آئینے کو چھنا چور کر دے گا۔ موصوف نے حوالہ اس طرح دیا ہے گویا یہ دس بیس صفحے کی کتاب ہے لہذا مکمل حوالے کی کیا ضرورت؟ ہر کوئی آسانی سے مطلوبہ بیان کو تلاش کر لے گا، حالانکہ فتاویٰ رضویہ تو دنیا ئے اسلام کا وہ عظیم فقہی ذخیرہ ہے جس کی چند سطریں بھی شاید رُوحی صاحب کسی کے سامنے بیٹھ کر نہ سنا سکیں گے۔ فتاویٰ رشیدیہ اور امداد الفتاویٰ کے سائز میں اگر فتاویٰ رضویہ کو چھپوایا جاتے تو اس کی بارہ جلدوں کے پچیس ہزار سے بھی زائد صفحات بنیں گے۔ اگر رُوحی صاحب کی نظر میں فتاویٰ رضویہ شریف کی کوئی ایسی عبارت ہے جو اُن کے نزدیک قابلِ اعتراض اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے تو اُسے پیش کر کے، فیصلہ قارئین کے سپرد کر دیتے۔ بغیر حوالہ الزام کیسا؟

موصوف کا مندرجہ ذیل بیان اور اُس کے ذریعے جو تاثر دیا گیا ہے یہ کرشمہ اُن کی مشاقی پر دلالت ہے۔ رُوحی صاحب نے یہاں جو چابکدستی اور ہاتھ کی صفائی دکھائی وہ تعریف سے مستغنی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”علمائے اسلام نے دہلی کے آخری بادشاہ ظفر شاہ کی برائے نام حکومت کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی اور اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے شدید مظالم سے مجبور ہو کر دہلی میں جہاد کا فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علمائے دہلی اور علمائے حق پرست کی مہیں ہوئیں۔“

یہ بالکل درست ہے کہ علمائے کرام نے ۱۸۵۷ء میں جہاد کا فتویٰ مرتب کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ حق پرست علماء نے اُس فتوے کی تصدیق و تشہیر فرمائی۔ لیکن رُوحی صاحب کے کمال کی داد کہاں تک دی جائے کہ اُن علمائے کرام کے اسمائے گرامی صیغہ راز میں رکھے۔

اس طرح شرمانے اور پردہ پوشی کا تکلف فرمانے کی وجہ یہی تو ہے کہ اگر وہ نام ظاہر کر دیتے تو موصوف کے محبوب علماء کسی اور ہی صف میں نظر آنے لگیں گے۔ لہذا بغیر اظہار کے تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ وہ علمائے دیوبند ہی تھے جو انگریزوں کے خلاف جنگ آزما ہوئے تھے اور یہی علمائے حق پرست ہیں۔ فتویٰ مرتب کرنے والے اور تصدیق و تشہیر کرنے والوں کے اسمائے زراعی اگر کچھ دیے جاتے تو روحی صاحب کا سارا منصوبہ ہی دریابرد ہو جاتا، اسی لیے راز داری کا دامن پکڑ کر چلتے رہے۔ آگے موصوف نے اپنے محبوب علماء کی لٹہیت اور انگریز دشمنی کی دلیل کیا منہ ڈار پیش کی ہوئی ہے۔ لکھتے ہیں:

”ان مدارس (دیوبند و سہارن پور) نے نہ کبھی سرکاری امداد لینے کو ارادہ کیا اور نہ ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے یہاں آنے کا موقع دیا، جو انھیں سرکار کی وفاداری پر مائل کرتے۔“

جب دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارن پور دونوں ہی دینی درسگاہیں ہیں پھر ان کے متعلق سرکاری امداد اور ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے یا نہ آنے کے ذکر کا یہاں کوئی موقع اور محل ہی نہیں تھا۔ یہ بہر تعلیم یافتہ آدمی جانتا ہے کہ سرکاری امداد کوئی مدارس کو ملتی ہے اور ڈپٹی انسپکٹر کون سے تعلیمی اداروں میں جایا کرتے ہیں۔ چونکہ یہاں چور کی وارڈھی میں تئکے والا معاملہ تھا، لہذا موصوف کو یہ غیر متعلق شیخی گھارنی پڑی۔ فارغین کرام کی تسلی کے لیے ہم وہ تنکا بھی دکھا دینا ضروری سمجھتے ہیں، جس نے روحی صاحب کو یہ البیلا اور لا تعلق بیان داغنے پر مجبور کیا تھا۔ دارالعلوم دیوبند اور مدرس مظاہر العلوم سہارن پور کی حقیقت اور ان کے بانیوں اور کارکنوں کے مدلل اور تفصیلی نقد و حال بعد شوق اسی کتاب میں ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں، یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء)، مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) کے شاگرد و عزیز اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ اس مدرسہ کی تاسیس میں جن حضرات کا ہاتھ تھا، ان میں سے

ایک مولوی محمد الحسن دیوبندی (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے والد مولوی ذوالفقار علی دیوبندی (المتوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) تھے جو پہلے بریلی کالج کے پروفیسر اور پھر ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے۔ دوسرے مولوی شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے والد مولوی فضل الرحمن (المتوفی) تھے جو بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر

مدارس رہے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے ملازمت ختم ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملک العلّی کے صاحبزادے تھے۔ پہلے یہ اجیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے تھے اس کے بعد بنارس، بریلی اور سہارن پور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس بن کر رہے۔ گویا مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے والے، پڑھانے والے، چلانے والے سب کے سب سرکاری آدمی تھے اور خاص طور پر ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہی رہے تھے۔ دریں حالات یہاں ڈپٹی انسپکٹروں کے آنے کی کون سی ضرورت اور گنجائش باقی رہ گئی تھی؟

مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے مدرس اول مولوی محمد منظر نانوتوی تھے۔ موصوف دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملک العلّی نانوتوی کے شاگرد اور عزیز تھے۔ تمام سرکاری ملازمت کی اور اگر کالج میں تعلیمی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ ریٹائر ہونے پر سہارن پور میں یہ مدرسہ قائم کر لیا۔ ان کے معاون خاص، موصوف کے حقیقی بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی تھے۔ یہ بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے۔ بریلی کالج میں تعلیمی خدمات انجام دینے پر مامور رہے۔ سرکاری ملازمت ختم کرنے کے بعد دونوں بھائیوں نے سہارن پور میں مدرسہ قائم کر لیا۔ یہ تھے ان مدارس کے کارندے۔ کیا حکومت ان حضرات کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرتی؟ انگریزوں کو معلوم نہیں روجی صاحب نے اتنا بے وقوف کیوں سمجھ لیا کہ وہ تحصیل حاصل کی سعی کرتے۔

الحاج فیروز الدین صاحب! ایک روز ہم سب نے اپنے پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ کیا ”آئینہ صداقت“ حبیبی کتاب لکھتے وقت آپ کو اُس عظیم بارگاہ کی حاضری اور قیامت جیسے دن کی ہولناکی کا خیال تک نہ آیا؟ کسی کی خاطر اپنی عاقبت برباد کرنا کس کی

عقلندی ہے؛ جن اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں، اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہوں پر آپ نے سنگین بہتان لگائے اور الزام عائد کیے ہیں۔ کیا بروز قیامت یہ بزرگ آپ کو گریبان سے پکڑ کر باری تعالیٰ شانہ کی بارگاہ سے انصاف کے طلب گار نہ ہوں گے؟ کیا اُس روز یہ دھاندلی کام بجائے گی؟

جب سرِ مشرودہ پوچھے گا بلا کے سامنے

کیا جوابِ جرم دو گئے تم خدا کے سامنے

۴۔ اس کتاب کے لکھنے کی چوتھی وجہ علمائے اہلسنت کی سہل پسندی اور خوش فہمی ہے۔ شعبان المعظم ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۶۱ء میں ”مرکزی مجلس رضا لاہور“ نے راقم الحروف کا مقالہ ”العلحضرت کا فقہی مقام“ شائع کیا۔ اس مقالے کے صفحہ ۱۹ پر ایک عبارت یوں ہے: ”کسی زندہ قوم میں اس مرتبے کا کوئی عالم پیدا ہو جاتا تو وہ قوم اُس کے علوم و فنون سے نہ صرف خود مستفید ہوتی بلکہ تمام دنیا کو اُس کے افکار و نظریات پڑھنے اور سمجھنے پر مجبور کر دیتی“

اس عبارت پر ہمارے ایک محترم مولوی صاحب بڑ بیٹے اور فرمایا کہ کیا العلحضرت قدس سرہ مرؤہ قوم میں پیدا ہوئے تھے؟ کیا علمائے اہلسنت نے العلحضرت پر آپ کی نظریں کوئی قابلیت کام نہیں کیا؟ فلاں کتاب میں میرا ایک مقالہ، فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک موجود ہے، اُسے پڑھ کر اسے قائم کیجیے۔

گویا معاندین و مبتدعین نے جو امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف لاکھوں صفحات سیاہ کیے ہوئے ہیں۔ ہمارے کرم فرما مولوی صاحب نے چند صفحے کا ایک مضمون لکھ کر مخالفین کا سارا قرض چکا دیا۔ العلحضرت اور اُن کی تعلیمات کو منظرِ عام پر لے آئے، فاضل بریلوی کو ہر کہ و مر سے امام نہانہ منوا دیا۔ اہلسنت و جماعت کے سب دکھ دور کر دیے۔ بھلا اس خوش فہمی اور صورتِ حالات سے چشم پوشی کی کوئی حد ہے؟

وائے ناکامی متاعِ کار و اوں جاتا رہا

کار و اوں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

۵۔ پانچویں وجہ بعض موجودہ علمائے اہلسنت کی ستم ظریفی اور امام احمد رضا خاں بریلوی کے

ساتھ نادان دوستی ہے۔ ایسے بھی علمائے اہلسنت ہیں جنہوں نے اپنی صلاح کلی میں یا ناقص مطالعہ و کوتاہ فہمی سے یا مبتدعین زمانہ سے مرعوب ہو کر فاضل بریلوی قدس سرہ کی بعض تحقیقات کو اس رنگ میں پیش کرنا شروع کر دیا ہے جس سے رضویت کا چہرہ تقریباً مسخ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب جب علمائے اہلسنت سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ایسی باتوں کا سہ باب کریں، ان حضرات کو سمجھاتیں تو کشتی اہلسنت کے یہ ناخدا کسی طرح بھی اپنی مہر سکوت توڑنے پر رضا مند نہیں ہوتے۔ اس افسوسناک صورت حال نے مجبور کیا امام احمد رضا خاں بریلوی کے علمی کارناموں کو کسی حد تک منضبط کرنے کی اپنی بساط بھر کوشش کر دی جاتے۔ واللہ ولی التوفیق۔

ان وجوہات کے تحت راقم الحروف کے دل میں یہ خیال موجزن ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں ایک بڑھیا سوت کی انٹی لے کر شامل ہو سکتی ہے تو کیوں نہ حقائق کے پھولوں کا ایک گلدستہ تیار کر کے مجدد دوراں کے عقیدت مندوں میں شامل ہونے کی کوشش کروں شاید یہی کاوش میرے لیے کفارۃ سیئات اور نجاتِ اخروی کا باعث بن جائے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت پیش ہی اُس وقت آتی ہے جب رہنمائی کے پردے میں رہبرنی اور تخریب کاری کا بازار گرم ہو چکا ہو۔ کسی بھی مجدد کے کارناموں کا مطالعہ کر کے دیکھ لیجئے اُس کے گرد ایسے تخریب پسندوں کا جم غفیر نظر آئے گا جو رہبری کے پردے میں رہبرنی کا کام کرتے ہوں گے اور اصلاح کے نام پر فساد کی جڑیں مضبوط کرنا اُن کا مشغفہ رہا ہو گا۔ چونکہ بدقسمتی سے ایسے لصوص دین بھی مسلمانوں کے سامنے قوم کے رہنما، دینی پیشوا اور روحانی مقتدا بن کر ہی آتے ہیں بایں وجہ کتنے ہی مسلمانوں کی قوت فیصلہ ایسے مواقع پر گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور اہل اسلام سے کتنے ہی بد نصیب اُن کے بعض خوشنما کاموں کو دیکھ کر بک جاتے ہیں۔

امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہ کے دور میں بھی دو طبقے تخریب دیں کام کرنے میں پیش پیش تھے یعنی حکومت اور نام نہاد مذہبی رہنما۔ بعینہ اسی صورت حال سے امام احمد رضا خاں بریلوی نور اللہ مرقدہ کو دوچار ہونا پڑا۔ وہاں اکبر اور جہانگیر تھے تو یہاں اسلام دشمن انگلیز۔ وہ حکومت علی الاعلان اسلام کو بدلنے اور مٹانے پر مصہر تھی لیکن انگریزی حکومت نامعلوم اور پراسرار طریقوں سے۔ اُس وقت کے فیض و فضل سے محروم علماء، جو دین محمدی کی جڑیں کھودنے میں مصروف تھے وہ صاف نظر آتے تھے کہ اسلام دشمن حکومت کے اراکین سلطنت ہیں

لہذا عوام الناس اُنھیں اپنا رہنما تسلیم کرنے پر کبھی راضی نہیں ہو سکتے تھے لیکن برطانوی دور کے علمائے سونے ایسے نامعلوم طریقوں سے برٹش گورنمنٹ کے اسلام دشمنی والے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی منحوس کوشش کی کہ ملتِ اسلامیہ کے کتے ہی بیدار مغز حسرات تک کی قوت فیصلہ اُن کے کھوٹ کا سراغ لگانے سے قاصر ہو کر رہ گئی۔ مذکورہ صورتِ حال کے پیشِ نظر ہمیں اس کتاب کی پہلی جلد کا بیشتر حصہ محض تخریب کاروں کی سراغ رسانی کے لیے وقف کرنا پڑا۔ چاروں جلدوں کے مندرجات حسبِ ذیل ہیں :

جلد اول مظلوم اسلام دشمنی کی صورتیں، برٹش نواز علماء خود اپنی تاریخ کے آئینے میں، اُنھوں نے مقدس شجرِ اسلام میں کیسی کیسی غیر اسلامی قلیں لگائیں نیز ہندو کے ہاتھوں پاک کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت میں ضم کرنے کی کیسی کیسی چالیں چلیں۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کو بر ملا ایک قوم بتایا، حتیٰ کہ گاندھی جیسے بُت پرست کو اپنا امام بنایا۔ جملہ عنوانات پر دلائل کے انبار۔

امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے کا نظردن شر میں خاک، علمائے جلد دوم مبتدعین نے کون کون سی علمی محاذ کھولے، سب کے ساتھ مقابلہ، گھسان کارن، میدانِ فاضل بریلوی کے ہاتھ، طرزِ استدلال کی جھکیاں، محاسبے کا خدا داد سکہ، علیت کے نمونے، تصانیف کا معیار اور اُن کے اعداد و شمار۔

جلد سوم آپ کا جامع العلوم ہونا گونا گوں تصانیف کا عالیہ کی روشنی میں، علمائے عرب و عجم کی نظر میں آپ کا مقام، فاضل بریلوی کے درجہِ امامت پر سیر حاصل اور ایمان افزہ بحث۔

جلد چارم اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کا روحانی درجہ، آپ کے ملفوظات و مکتوبات وغیرہ۔

یہ کام یقیناً اتنا عظیم ہے کہ اس کے لیے علمائے کرام کا ایک بورڈ مقرر ہوتا، وہ حضرات متعلقہ مواد کو اکٹھا کر کے اُن سے اس مردِ حق آگاہ کہ کارناموں کو ایک لڑی میں پرتے چلے جاتے۔ لیکن افسوس! امام احمد رضا خاں بریلوی جیسے جامع العلوم، مرکزِ دائرہ تحقیق اور نقیبہ اعظم پر آج تک علمائے کرام نے جو کتابیں لکھی ہیں اُنھیں دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال اُن چھوٹی موٹی کتابوں کا وجود بھی اس بے اعتنائی اور خود فراموشی

کے دور میں غنیمت ہے۔ ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۷ء میں احقر کو بعض نفسِ مضمون سے خاص مناسبت رکھنے والی کتابیں اور بھی دستیاب ہو گئیں تو مجد د مآتہ حاضرہ قدس سرہ کا تجدیدی کارنامہ اڑھائی تین ہزار صفحات تک پھیلتا چلا گیا اور ہنوز بعض کتابوں کے دستیاب نہ ہونے کے باعث اس میں کافی کمی محسوس کرتا ہوں۔

بہر حال ہر دست جو کچھ تیار ہوا ہے اسے غنیمت شمار کر کے چار جلدوں میں تقسیم کر رہا ہے۔
یوں تو چار کا عدد بھی کئی وجہ سے بہت مبارک ہے لیکن ممکن ہے کہ اشاعت کی جانب سے حوصلہ افزا حالات پیدا ہو جائیں یا اہل علم حضرات کے تعاون سے بعض نایاب کتابوں تک رسائی ہو گئی تو شاید اس مقدس مجموعے کی پانچ جلدیں ہو جائیں۔ باری تعالیٰ شانہ اپنے عاجز بندے کو اسے مکمل کرنے کی توفیق مرحمت فرماتے، علمائے کرام کو علمی معاونت کا جذبہ بخشے اور کسی خوش نصیب پبلشر کو اسے منظر عام پر لانے کا حوصلہ عطا فرمائے تاکہ مغفدوں کے علاوہ ان لوگوں کے سامنے بھی امام زمانہ کا تذکرہ ایک شفاف آئینے کی صورت میں آجائے جو آج تک دورِ حاضر کی اس عیدِ نظیر علمی ہستی کو محض ایک خشک مُلا، بدعتی مولوی، جھگڑالو، پیٹ پرست اور انگریز کا ایجنٹ وغیرہ سمجھتے رہے ہیں کیونکہ بدقسمتی سے جن علماء کو اُنھوں نے وارثِ علم سمجھا ہوا تھا، وہ علماء نہ تھے لصوصِ دین تھے، اُنھوں نے اپنی اسلام دشمنی پر پردہ ڈالنے کی خاطر علمائے حق کو بدنام کیا، اُن کے خلاف متعدد محاذ کھولے اور علمائے سَو کی قصیدہ خوانی کرتے رہے تاکہ اُنھیں بھی مسلمانوں میں سے ہمنوائی کرنے والے مل جائیں۔ اُن کے قائم کردہ فرقے کے شجرِ جنبشہ کی جڑیں بھی دُور تک پھیل کر مضبوط ہو جائیں۔ ایسے معاندین کو خاص طور پر دکھانا ہے کہ اے دھوکا کھانے والو! جس کا فتاویٰ جہازی سائز کے چودہ ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور تمہیں بہکانے والے علماء جس کی بعض تصانیف کو پڑھ کر سمجھ لینے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے، کیا وہ ایک خشک مُلا تھا یا دُنیا نے اسلام کا فقیہِ اعظم اور امام زمانہ جس نے برٹش گورنمنٹ کے جملہ ایجنٹوں اور گاندھی کی شہرِ پنج کے تمام مہروں کو مات کر دیا، علم و فضل کے بلند بانگ دعوادی کے باوجود اُنھیں علمی محاذ پر شکست فاش ہی نہیں دی بلکہ سب کی ناک خاک میں رگڑی۔ کیا وہ ایک جھگڑالو تھا یا حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ) کی طرح ایک زبردست مجاہد، حقانیت کا

علیہ دار اور چودھویں صدی کا محدث تھا جس کی کسی ایک تصنیف کا کسی مخالف سے آج تک جواب نہ لکھا جاسکا، بلکہ اُس کی کسی ایک دلیل کو بولہبی شرارے آج تک دعویٰ سے بیگانہ ثابت نہ کر سکے بلکہ اُس کی ایک ہزار تصانیف میں سے کوئی ایک حوالہ بھی ایسا نہ دکھاسکے جو غلط ہو بلکہ اُس کے متعلق کسی سے آج تک یہ دکھایا نہیں جاسکا کہ فلاں مسئلے میں وہ اُمتِ محمدیہ کے اکابر کی تصریحات کے خلاف ہے۔ کیا جو اول سے آخر تک اکابر کے دامن سے وابستہ، اُسی مقدس اسلام کا علیہ دار ہو، کسی ایک شیعہ میں بھی اُن سے سب مباح اختلاف کرتا روا نہ رکھے، کسی ایک مسئلے میں اُن کی تصریحات سے انحراف نہ کرے وہ بدعتی مولوی ہے اور جنہوں نے برٹش گورنمنٹ کے وظیفوں کی شراب سے مخمور اور گاندھی وغیرہ عمائدین کانگرس کے جال میں پھنس کر بلا اور ٹاٹا کی تجویزوں کی جھنجھکار سے مسحور ہو کر نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے مقدس اسلام کا خلیہ بدلنے، اُس کی سورت کو مسخ کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا، آیا ایسے اسلام دشمن عناصر کو اُن کے خوش فائزوں، تالیف قلوب کے سامانوں اور محض جبر و دستار یا قال اللہ و قال رسول اللہ کی گردانوں کے باعث مسلمانوں کے خیر خواہ بلکہ رہنما بلکہ ملتِ اسلامیہ کی کشتی کے ناخدا تسلیم کر لیا جائے؟

احقر نے مشعلِ راہ کی جلد اول میں یہی کٹھن اور دشوار گزار وادی طے کی ہے۔ ملک و ملت کی خیر خواہی میں وقت کی ضرورت اور صورتِ حالات کے سخت سب سے نازک اور سب سے اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ انصاف پسند حضرات ملاحظہ فرمائیں گے کہ ہم نے کسی سے ذاتی عداوت یا دھڑے بندی کے طور پر الزام عائد نہیں کیے، بلکہ جو کچھ کہا ہے انصاف کی ترازو پر تول کر کہا ہے بلکہ وہی کچھ کہا ہے جو انہوں نے اپنی تصانیف کے اندر از خود لکھا ہے۔ ہم نے اُن کے اپنے ہی تیار کردہ آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی ہیں۔ اگر چشمِ بینا کو واقعی وہ چہرے بد صورت نظر آئیں تو اس کی ایک وجہ تو یہی ہو سکتی ہے کہ وہ چہرے ہی حقیقت میں بدنما تھے اور دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جن آئینوں میں اُن کی صورتیں دکھائی گئی ہیں وہ تمام کے تمام تلف کر دینے کے قابل ہیں۔

بمقتدین حضرات اور اسلام دشمن طاقتوں کے پُر اسرار کارندوں کے بارے میں

راقم الحروف کا قلم اٹھانا اُن کے معتقدین کی دل آزاری کی خاطر نہیں بلکہ اس حقیقت کی نقاب کشائی کا نازک فریضہ و دوجہ سے ادا کرنا پڑا۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا نفسِ مضمون چودھویں صدی کے مجددِ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرنا ہے اور تجدید اُس وقت تک بیان کی نہیں جاسکتی جب تک اُس دور کی تخریبِ کاری کا مکمل نقشہ پیش نہ کر دیا جائے۔ دوسری وجہ مسلمانوں کی خیر خواہی اور اُن کی فلاحِ داین کا جذبہ ہے۔ یعنی جو تدعیانِ اسلام گمراہ گروں کے پیچھے لگ کر، اُن کے معتقد ہو کر گروہوں میں بٹ گئے، مسلمانوں کی چوڑہ سو سالہ جماعت یعنی سوادِ اعظمِ اہلسنت و جماعت سے علیحدہ ہو گئے ہیں، انھیں یہ دکھا دیا جائے کہ جن حضرات کو آپ غلط فہمی میں پیشوا اور رہنما تسلیم کر چکے ہیں، اُن کے اصلی اور حقیقی خدو خال یہ تھے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ہمیں بتانا پڑا کہ مسلمانوں کی جمعیت اور شیرازہ بندی کو کس نے نقصان پہنچایا؟ یہ فرقہ و دو حضرات کس نے بنوائے؟ کن صاحبانِ حجتہ و دستار سے بنوائے؟ کس مقصد کی خاطر بنوائے؟ یہ بتا کر بعدِ عیانِ اسلام سے لپیل کروں گا کہ ایسے حضرات کے پیچھے لگ کر دنیا میں مسلمانوں کی اجتماعی قوت کا جائزہ نکالنا اور آخرت میں واصلِ جہنم ہونا زیادہ مفید ہے یا اس کے برعکس؟ یہ فیصلہ فار تین پر چھوڑوں گا۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات ہمارے اس اقدام کو نظرِ استحسان سے نہ دیکھیں بلکہ غیر مسلموں کے پڑھائے ہوئے سبق کے مطابق اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگ جائیں کہ کسی فرقے کے معتقدات یا اُس کے اکابر پر تنقید کرنا منافیِ اندازِ فکر اور فضا کو مکرر کرنا ہے۔ ایسے تمام حضرات کی خدمت میں ہم یہ وضاحت پیش کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مقدس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوند کاری کرنے والوں اور مسلمانوں کی اجتماعیت کو پارہ پارہ کرنے والوں کا تذکرہ کیوں ناگزیر سمجھا گیا؟

۱۔ جن حضرات کے ہم نے اسلام دشمنی کے پراسرار اور حقیقی خدو خال پیش کیے ہیں، اُن میں سے اکثر آنجنابانی ہو چکے اور اُن کا معاملہ چونکہ اب براہِ راست اپنے مالک سے ہے، لہذا اُن کے بارے میں ہمیں اب کوئی فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ لیکن بد قسمتی اُنھیں کہتے ہی مدعیانِ اسلام نے اپنا پیر اور پیشوا بنا لیا تھا اور اُن کی حقیقت کو

سمجھنے کی بدولت کہتے ہی اسلام کا دعویٰ کرنے والے آج بھی بخوشی اُسی گمراہی کے گڑھے میں لڑھکتے جا رہے ہیں جس میں اُن کے پیشوا گرے تھے۔ چونکہ اُنہیں رہنما سمجھنے والے اندھا دھند اُسی عین گڑھے میں گرتے جا رہے۔ جو انکھ کھلنے پر مکمل تب ہی نظر آجائے گی۔ لہذا کلمہ گوئی کا پاس لحاظ کرتے ہوئے، اُنہیں اخروی زیاں سے بچانے اور قعرِ جہنم سے نجات دلانے کی محض یہ ایک مدلل اپیل اور تفصیلی گزارش ہے اور بس۔ کیا یہ منفی اندازِ فکر ہے؟

۲۔ قرآن کریم ہی کو دیکھ لیجئے کہ اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں کا بطلانِ خوب شرح و بسط کے ساتھ واضح فرمایا اور اُن کے سرغنوں کو دنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے ذلیل و خوار کیا، حتیٰ کہ مسلمانوں کا دم بھرنے والے اُن عناصر کی خلافتِ اسلام سرگرمیوں کے راز کھول کھول کر مسلمانوں کے سامنے رکھ دیے اور اُن کے وجود کو مدتِ اسلامیہ کے لیے کھلے کافروں سے زیادہ نقصان دہ قرار دے کر وقت آنے پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دُشکاف لفظوں میں یوں حکم دیا:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ اے غیب کی خبریں دینے والے (نبی) کافروں
وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ اور منافقوں سے جہاد کرو اور اُن پر سختی فرماؤ۔

اللہ تعالیٰ نے تو اُن مسلمانوں کا دعویٰ کرنے والوں کے خلاف اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جہاد کرنے اور سختی جتنے کا حکم دیا تھا، جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے مسلمانوں کی جڑیں کھودنے اور کافروں کے ہاتھ مضبوط کرنے میں خفیہ طور پر مصروف رہتے تھے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو منفی اندازِ فکر کہا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اسلامی تعلیم اور مثبت اندازِ فکر یہی ہے کہ غلط مدعیانِ اسلام کا محاسبہ کرنا نہایت ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔

اب اسی ارشادِ ربّانی کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیے کہ جن لوگوں نے برٹش گورنمنٹ

کے اسلام اور مسلمانوں کی دشمنی پر مبنی منصوبے اور انہیں متحدہ ہندوستان میں ایک
عضو مطلق بنادینے والی سکیم کو مسلمانوں کے رہنما، پیشوا، ناخدا کشتی ملت اور مسیحی قوم
وغیرہ بن کر کامیاب کیا، یا وہ لوگ جنہوں نے بایں جبہ و دستار گاندھی جیسے ملت اسلامیہ کے
دشمن اور ٹھیکہ جت پرست کی گٹھیا پر رات دن ناہیبہ فرسائی کی، اسلام اور ہندو مت
کافرق مٹاتے، باپو کی جے مناتے رہے، مسلمانوں کا رُخ حرم سے سو عنات کی جانب پھیرتے
رہے، کیا ایسے لوگوں کی خلاف اسلام، ظاہر اور پوشیدہ کارگزاریوں کو ظاہر کرنا حکم خداوندی
کی تعمیل اور قرآن کریم کی تعلیم ہے یا مفتی انداز فکر؟

۳۔ وقت آنے پر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایسے منافقوں کو نام لے لے کر مسجد نبوی
سے باہر نکال دیا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے آپ نے منافقوں کی تعمیر کردہ مسجد ضرار کو مسمار
کروا دیا، اُن کی مسجد کو از روئے شرع مسجد قرار نہیں دیا گیا، اُن کی نماز جنازہ پڑھنے اور
اُن کے لیے بخشش کی دعا کرنے سے آپ کو منع فرما دیا گیا۔ معلوم نہیں اسلامی رواداری کے
نام نہاد علمبردار نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور خود اللہ جل شانہ کے ان احکام کے بارے
میں کیا فتویٰ صادر فرمائیں گے؟

۴۔ عہد رسالت کے فوراً بعد منکرینِ زکوٰۃ اور سید کذاب اور اسود غنسی وغیرہ مدعیانِ نبوت
منظر عام پر آئے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ بھی برابر کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کے برحق خلیفہ اول، امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جملہ
صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے باتفاق رائے نہ صرف اُن سے جہاد کیا بلکہ
ان فتنوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، حالانکہ ملت اسلامیہ اُن دنوں انتہائی
نامساعد حالات سے دوچار تھی۔ یہ ہے سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تیار کردہ
عظیم النیظروں اور اکابرِ عز و جل جو مسلمانوں کے لیے قیامت تک روشنی کے مینار کا کام
دیتا رہے گا۔ صحابہ کرام کے تقویٰ و طہارت اور اصابت رائے سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم اس درجہ مطمئن تھے کہ اپنی بارگاہ کے ان تربیت یافتہ افراد کی پیروی کرنے کا
بعد والوں کو یوں حکم دیا:

اَصْحَابِ كَالْتَجُومِ بِآيَتِهِمْ اُتْدِيْتُمْ
میرے تمام صحابہ ستاروں کی مانند ہیں۔ ان میں سے
جس کی اقتدا کرو گے ہدایت پاؤ گے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی نے نہیں بلکہ خود اللہ جل شانہ نے صحابہ کرام کو معیارِ حق قرار
دیتے ہوئے اپنے کلام معجزِ نظام میں واضح طور پر اور دلائلِ قطوں میں یہ اعلان فرمایا:

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِهِ
پھر اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لائے جیسا تم
فَقَدْ هَمَدُوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّا
لائے، جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیر
هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۝ ۷
تو وہ نری ضد میں ہیں۔

جملہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، خواہ وہ مہاجر ہوں یا انصار، اللہ رب العزت نے
سب کو ایمان کی حقیقی دولت سے مالا مال قرار دیا اور ان کی مغفرت کا عام اعلان فرمایا ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَا
اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی
جَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ
راہ میں لڑے اور جنہوں نے جگہ دی اور مدد کی،
اَوْوَا وَنَصَرُوْا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ
وہی سچے ایمان والے ہیں۔ ان کے لیے بخشش
حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ
ہے اور عزت کی روزی۔

كَرِيْمٌ ۝ ۸

تمام صحابہ کرام کی مغفرت اور ان میں سے بھی جنہیں عظیم الشان اور عظیم النیظیر و رجب
مرحمت ہوتے ان کے بارے میں منعم حقیقی عز شانہ نے فرمایا ہے:

لَا يَسْتَوِيْ سَيِّدُكَ مِنْ اَنْفُسِكُمْ
تم میں برابر نہیں وہ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے
مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتِلْ اُولٰٓئِكَ
مال خرچ کیا اور جہاد کیا۔ وہ مرتبے میں ان
اَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا
سے بڑے ہیں جنہوں نے بعد فتح کے خرچ اور
مِنْ بَعْدُ وَقَاتِلُوا وَكُلًّا
جہاد کیا اور ان سب (پہلے خرچ اور جہاد کرنے والوں)

۱۰۔ سورۃ الانفال، آیت ۴، ۱۱۔ سورۃ البقرہ، آیت ۱۴۵

۱۲۔ سورۃ البقرہ، آیت ۱۴۵

وَعَدَ اللَّهُ الْحُسَيْنِ - ۱ اور بعد میں (سے اللہ جنت کا وعدہ فرما چکا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا مقدس گروہ ہمیشہ اللہ جل شانہ، اور اُس کے آخری پیغامبر کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائے رکھنا تھا۔ قرآن کریم نے وضاحت فرمادی ہے کہ وہ حضرات، قدسی صفات اپنی منزل مقصود کو پا چکے تھے، اُن کی قربانیاں بارگاہِ خداوندی میں شرفِ قبولیت حاصل کر چکی تھیں اور اللہ رب العزت نے انھیں اپنی رضا مندی کا یوں ثرہ سُنا دیا تھا:

وَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ
الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارَ وَالَّذِينَ
اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ رَضِيَ اللَّهُ
عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ
جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَٰلِكَ الْفَوْزُ
الْعَظِيمُ ۝ ۱۰

اور سب میں پہلے مہاجرین و انصار میں سے اور جو بھلائی کے ساتھ اُن کے پیرو ہوئے اللہ اُن سب سے راضی ہے اور وہ اللہ سے راضی ہیں اور اُن کے لیے باغ تیار کر رکھے ہیں، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے

مہاجر و انصار کے اولین گروہ اور باقی اُن کا اتباع کرنیوالے، جن سے اللہ تعالیٰ راضی ہے اور دنیا میں ہی جنہیں جنت کا ثرہ سُنا دیا گیا، کیا انبیائے کرام کے بعد بنی نوٹ انسان کے اس افضل ترین گروہ سے بہتر کوئی اسلامی تعلیمات کو سمجھ سکتا تھا؟ کیا اس کا باب ترین جماعت کے طرز عمل کو منفی انداز قرار دینے والے اسلامی زاویہ نظر رکھنے والے سمجھ جائیں یا غیر اسلامی نظریات کے حامل اور صحابہ کرام کے اتباع سے عاری؟ حالانکہ قرآن کریم کی دوسرے ایمان و ہی معتبر جو صحابہ کرام کی طرح ہو۔ اعمال وہی مقبول ہوں گے جو اُن حضرات کے اتباع میں ہوں، اسلامی نظریات و تعلیمات کی دسی تعبیریں معقول اور قابل تسلیم ہیں جو اُن حضرات سے منقول ہیں۔ یہی مقدس گروہ قصہ اسلام کی بنیاد تھا۔ جو عمارت اس بنیاد پر تعمیر

ہوگی وہ اسلامی اور اُن سے بہت کچھ عمارت بھی بنائی جائے گی، خواہ اُس کی بنیاد قرآن کریم پر بتائی جائے یا احادیثِ مقدسہ پر، توحید پر مبنی ٹھہرائی جائے یا تصوف پر، سراسر غیر اسلامی اور عند اللہ ناقابل قبول ہوگی کیونکہ صحابہ ہی حقانیت کا معیار اور کتاب و سنت کے عملی مفہوم و معانی کا وہ زندہ ثبوت ہیں جن کی نظیر چشمِ فلک کُن نے نہ آج تک دیکھی ہے اور نہ دیکھی جاسکتی ہے۔ خود اللہ ربُّ العزت نے اپنے اُن مقبول ترین بندوں اور عظیم الشان گروہ کی توصیف فرمائی، اُنہیں سندِ قبولیت بخشی، کامیابی و کامرانی اور رحمت و رضوان کا مزہ سُنایا اور اُنہیں ہمیشہ باغ و بہشت اور آرام و راحت میں رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ ارشادِ ربّانی ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ
اَعْظَمُ حَرْجًا عِنْدَ اللّٰهِ ط وَاُولٰٓئِكَ
هُمْ الْفَاوِزُونَ ۝ يَبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ
بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ
لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خَالِدِيْنَ
فِيْهَا اَبَدًا ط اِلَّا رِجًّا لِّلّٰهِ عَمِلُوْا
اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ۱۰

وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں لڑے، اللہ کے یہاں اُن کا بڑا درجہ ہے اور وہی مراد کو پہنچے۔ اُن کا رب اُنہیں اپنی رحمت اور اپنی رضا کا مزہ سناتا ہے اور ایسے باغوں کا جو دائمی نعمت ہیں، ہمیشہ ہمیشہ اُن میں رہیں گے بے شک اللہ کے پاس بڑا ثواب ہے۔

اللہ جلّ شانہ نے دوسرے مقام پر اسی وعدے کو یوں دہرایا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ
جَعَلَتْ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ
خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَ مَسْكِنٌ طَيِّبَةٌ
فِيْ جَنَّاتٍ عَدْنٍ ط وَرِضْوَانٌ

اللہ نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں سے جنتوں کا وعدہ کیا ہے، جن کے نیچے نہریں رواں ہیں، اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ مکانوں کا جو جنتِ عدن میں ہیں اور اللہ کی

مَنْ اللَّهُ أَكْبَرُ ذَٰلِكَ هُوَ الْقَوْرُ الْعَظِيمُ ۝ ۱۰
 رضا جو سب سے بڑی (نعمت) ہے۔ یہ ہے سب سے بڑی کامیابی۔

اسی مقام پر چند آیات کے پُروردگار عالم نے صحابہ کرام کی قربانیوں کو شرف قبولیت بخشے ہوئے انھیں اپنی نوازشات کا ان لفظوں میں بھی مشرہ سنایا ہے:

لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ذَٰلِكَ ۝ ۱۰
 لیکن رسول اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے ، انھوں نے اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا اور انھیں کے لیے بھلائیاں ہیں اور یہی مراد کو پہنچے۔ اللہ نے ان کے لیے تیار کر رکھی ہیں ایسی بہشتیں جن کے نیچے نہریں رواں ہیں خَلِيدِينَ فِيهَا ذَٰلِكَ الْقَوْرُ الْعَظِيمُ ۝ ۱۰
 ہمیشہ ان میں رہیں گے، یہی بڑی مراد ملنی ہے۔

یہ ہے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کا مقدس گروہ، جن کے اعمال مقبول، جن کا ایمان باقی اُمت محمدیہ کے لیے نمونہ، جو دنیا میں رضائے الہی اور وعدہ جنت کی بیشمار توں سے نواز گئے ان کا طرز عمل اور اللہ و رسول (جل جلالہ) و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعلیمات کے تحت انداز فکر یہ ہے کہ جو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد نبوت کا دعویٰ کرے اگر وہ اور اس کے متبعین اس انتہائی تلبیس سے باز نہ آئیں تو صحابہ کرام نے انھیں موت کے گھاٹ اتار دینے کے علاوہ کوئی اور سلوک تجویز ہی نہیں کیا۔ اس کے ساتھ ہی جن لوگوں نے اسلامی فرائض میں سے صرف ایک زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کیا اور زکوٰۃ ادا کرنے سے جواب دے بیٹھے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد مقدس میں صحابہ کرام نے باتفاق ان لوگوں سے بھی جہاد کیا اور ان کے دعویٰ کو اسلامی کو ایک پرکاش کے برابر حیثیت نہ دی۔

۱۰ پ ۱، سورۃ التوبہ، آیت ۲،

۱۰ پ ۱، سورۃ التوبہ، آیت ۸۹

اب کیا فرماتے ہیں آج کے مدعیانِ علم و دانش کہ اگر اسلامی حکومت ہوتی تو دورِ حاضر کے دجال اور اُس کے پیروکاروں کے ساتھ اُڑوے شرع کیا سلوک ہوتا، صحابہ کرامؓ نے تو ایک ہی فرض کے انکار کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا لیکن جو آج اکثر فرائض کے منکر ہیں اور جن کے نزدیک صرف اسلام کا دعویٰ کر لینا ہی اُن کے مسلمان ہونے کے لیے کافی ہے، ایسے مدعیانِ اسلام اور اُن صاحبانِ جُبۃ و دستار کے ساتھ اسلامی حکومت کیا سلوک کرتی جنھوں نے برٹش گورنمنٹ اور ہندو بے بہبود کے ایما پر، اُن کے وظائف کے تحت، مقدس شجرِ اسلام میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی نقلیں لگائیں، اسلام کے اینگلو انڈین ایڈیشن تیار کیے، بعض اسلام اور عیسائیت کا فرق ملتے رہے تو کتنے ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کو شیروں کے بناتے اور سب کو اپنے گاندھی مہاراج کے قدموں میں جھکانے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگائے ہوئے تھے، ایسے اسلام دشمن عناصر کا اسلامی حکومت کے ہاتھوں کیا حشر ہوتا، اگر قسمتی سے آج کہیں بھی ایسی اسلامی حکومت نہیں تو ایسے افراد کی نشان دہی جرم کون سے اسلام کے تحت ہو گئی، کیا مسلمانوں کو ازراہ ہمدردی غلط کارروائیوں سے خودارکونامنی اندازِ فکر ہے، کیا آج کل کے اسلام میں رہنوں کو رہنما اور بدخواہوں کو خیر خواہ ماننا اور منوانا مثبت اندازِ فکر قرار دیا گیا ہے؟

۵۔ اللہ تعالیٰ ہر صدی میں مجدد بھیجتا ہی اسی لیے ہے کہ تخریب کاروں نے جو دینِ متین میں غتر بُود کر رکھی ہو، اُس کا تجزیہ کریں، صحیح و غلط اور حق و باطل میں اپنی خداداد قوت فیصلہ اور ہمتِ مردانہ سے تمیز کر دکھائیں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیں۔ مثلاً امام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۵۰۵ھ) نے فلاسفہ، معرکہ اور زنادقہ کے عمائدین و سرغوں کو ہر میدان میں علمی محاذ پر شکست دی۔ مباحثہ و مناظرہ اور تقریر و تحریر میں عمرِ بھر اُن کا محاسبہ کرتے رہے اور اپنے اس علمی کارنامے کے باعث اُمتِ محمدیہ میں حجتہ الاسلام کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں حالانکہ امام موصوف کے مخالف علماء کا دعویٰ بھی دورِ حاضر کے مبتدعین کی طرح یہی تھا کہ اصلی اسلام کے حقیقی علمبرار وہی ہیں۔

اسی طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۰۴۴ھ) نے اکبری دور

کے پیدا کردہ غلط کار علماء اور صوفیہ کا زبردست تعاقب کیا اور اسلامی خطوط سے ہٹی ہوئی حکومت کو تائب و ایزدی اور بہت مردانہ سے راہِ راست پر گامزن کر دیا۔ کیا اُس دور کے بے فیض و فضل یعنی نام نہاد ابراہیم الفضل و فیضی اور غلط کار علماء و صوفیہ مسلمان ہونے کے دعویدار نہیں تھے؟ اُن کے دعویٰ اسلام کے باوجود انھیں آج بھی غلط کار اور سرہندی مرتد کہا کو گیا رہیں صدی کا مجدّد تسلیم کیا جاتا ہے۔

لیکن حالات کی اس ستم نظریفی کو سمجھنے سے ہم یقیناً بڑی حد تک اپنے آپ کو قاصر ہی سمجھیں گے کہ پچھلے تخریب کاروں یعنی رہنمائی کے بھیس میں رہنمائی کرنے والوں کو رہن ہی مانا جاتا ہے مگر برٹش گورنمنٹ جیسی اسلام دشمن طاقت اور ہندو بے بہبود جیسے مسلمانوں کے ازلی دشمنوں نے جن جُتے جُتے والوں کو خریدا، اُن سے رہنمائی کے پردے میں رہنمائی کا کام لیا، ایسے لصوص دین اور بدخواہان اسلام و مسلمین کی نشان دہی کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے شر سے بچانے کو منفی لہذا فکر کون سے اسلام کے تحت قرار دیا جاتا ہے؟

۶۔ بر حکومت امن عامہ اور لوگوں کے مال و جان کی حفاظت کے پیشِ نظر جرائم پیشہ افراد پر کوڑا پیچ کر رکھتی، ارتکابِ جرم کی پاداش میں انھیں سزائیں دیتی ہے تاکہ انھیں عبرت ہو اور آئندہ لوگوں کو جانی اور مالی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ کیا حکومت کا یہ اقدام فضا کو مکدر کرنا یا اپنی رعیت کی خیر خواہی کا ثبوت؟ نیز جو حضرات ایسے عناصر کی نشان دہی کریں تاکہ ذمہ دار حضرات اُن سے باخبر ہو کر مناسب قدم اٹھا سکیں تو نشان دہی کرنے والوں کو خطا کار کہا جائے گا یا ملک و ملت کا خیر خواہ؟

۷۔ بر حکومت کا ایک آئین ہوتا ہے، جسے وہ ملک میں نافذ کر کے تمام باشندوں کو اُس کی پابندی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر کوئی ایک شخص یا جماعت اُس آئین کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے گھر میں بیٹھ کر اُس آئین میں ترمیم کرے اور کچھ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر انھیں اس ترمیمی آئین پر عمل کرنے کی ترغیب دے، بلکہ اس ترمیمی آئین ہی کو حکومت کا اصل آئین بتایا جائے تو ان حالات میں حکومتِ وقت ایسے فرد یا جماعت کو اپنا خیر خواہ سمجھے گی یا باغی شمار کرے؟ اُس کے دماغ کو سیدھا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی؟ جو ایسے

پُر اسرار باغیوں کی نشان دہی کرے وہ غلط کار لوگوں کی نظر میں تو واقعی کھٹکے گا لیکن کیا حکومت وقت اُس نشان دہی کرنے والے کو بُرا سمجھے گی؟ کیا عقلاء کے نزدیک اُس کا یہ اقدام ملک و ملت کی خیر خواہی شمار ہوگا یا قابلِ ملامت و نفرت؟ جب دنیاوی حکومت کے پُر اسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا (جیسا کہ حکومت کی منشا اور تنخواہ کے تحت سیکورٹی فورسز کرتی ہے) پسندیدہ اور قابلِ تحسین فعل ہے تو حکومتِ الہیہ کے ایسے پُر اسرار باغیوں کی نشان دہی کرنا منافیِ اندازِ فکر کہاں سے ہو گیا؟

۸۔ کیا جو حضرات اُن اکابر و صحابہ کرام کو گایاں دینا ثواب شمار کریں جن کے تقویٰ و طہارت کی فرشتے بھی قسم کھا سکتے ہیں اور انبیائے کرام علیہم السلام کے علاوہ چشمِ فلک کہن نے جن کی نظیر برگز نہیں دیکھی، علاوہ بریں، مسوائے چند اصحاب کے باقی اُس سارے مقدس گروہ کو مردہ شمار کریں، کلامِ الہی جس میں کوئی ایک لفظ کی کمی بیشی کر سکا ہے نہ کر سکے، اُسے محرف بلکہ اوّل سے آخر تک گھڑی ہوئی کتاب بتائیں، انجیل موجودہ کو غیر محرف ٹھہرائیں، مجاہد بنِ کرم مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں، اُن کے مال و جان کو اپنے لیے مباح اور اُن کی آبروریزی کرنے کو کارِ ثواب بتائیں، بلکہ مسلمانوں کے قتل کو کھلے کافروں، ٹھیٹ بُت پرستوں کے قتل سے زیادہ باعثِ ثواب شمار کریں، اپنے مہدی ہونے بلکہ صاحبِ وحی و عصمت ہونے کے راگِ اللہیں اور یوں اپنی جعلی نبوت کے پُر اسرار سانگ بھریں، اپنے بڑوں سے ایسی کرامتیں منسوب کریں کہ انبیائے کرام کے معجزے بھی پیچھے رہ جائیں، اللہ تعالیٰ سے ہمکلام ہونے بلکہ مصافحہ کرنے کا جھوٹا دعویٰ کریں تاکہ سید الانبیاء علیہ افضل الصلوٰۃ والسلام کی تخصیص مٹائیں، اپنا کلمہ پڑھوانے کی تلقین کریں بلکہ اپنی ذات پر درو پڑھوائیں سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی پیدائش پر مسرت کرنے کو کنھیا کا سانگ گنٹائیں، نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے آپ کے زمانے میں چھ پھیل و نظیر اور سناٹیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا علم شیطان لعین کے علم سے کم بتائیں۔ محیطِ زمین کے علم کا فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے انکار کر کے بلکہ شرکِ بتا کر اسی علم کو شیطانِ مردود کے لیے نصووس سے ثابت سنائیں، یوں نصووس سے شیطان کو خدا کا شریک ہونا ثابت ٹھہرائیں،

سروِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علوم غیبیہ کثیرہ و افردہ کو بچوں، پاکلوں اور جانوروں کی معلومات کے برابر سُنائیں اور ذرا نہ شرمائیں، نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کو جہلاء کا خیال اور فضل و کمال سے خالی بلکہ قرآنِ کریم کا انکار بتائیں اور مرتبی کے نام سے تیرھویں صدی میں نئی خاتمیت گھڑیں اور اُسے آپ کے شایانِ شان گننائیں یوں برٹش گورنمنٹ جن سے دعویٰ نبوت کرواتی اُن کے لیے چور دروازے بنائیں، احادیثِ مطہرہ کے دفاتر کو من گھڑت پلندے ٹھہرائیں، پیشانی پر ششہ کھینچ کر ہنود کی بے کے غرے لگائیں، اُن کی ارتحیاء اٹھائیں، سماجیوں پر بچوں کی چادریں چڑھائیں، گاندھی کو نہ صرف اپنا پیشوا اور امام علی الاطلاق بنائیں بلکہ اُس ٹھیٹ مشرک، کھلے بت پرست کو نبوت کا اہل سُنائیں، باری تعالیٰ شانہ کو مجسم ٹھہرا کر حادث بنائیں بلکہ اُس کا جھوٹا ہو جانا ممکن بنا کر کاذب بالفعل تک ٹھہرائیں بلکہ وقوعِ کذب کے معنی درست ہو جانا تک سُنا کر اپنا منکر الوہیت ٹھیٹ دہریہ ہونا دکھائیں، کیا ایسے حضرات کو محض اُن کے جُبہ و دستار کی بنا پر یا مولوی، مولانا، مفتی، حضرت جی، امام الہند، شیخ الاسلام، شیخ الہند، امام ربانی، قطب الافطاب، فقیہ النفس، مسیحائے قوم، شاعرِ ملت، مصلح، ریفارمر، حکیم الامت، مفسر، محدث، نابذہ عصر، شمس العلماء، مجدد، شیخ اکل اور امیر المومنین وغیرہ کہلانے کے باعث یہی مسلمانوں کے رہنما، ملتِ اسلامیہ کے پیشوا اور اسلام کے خیر خواہ شمار کر لیا جائے؟ جہلا کون سا مسلمان اُنہیں اپنا پیشوا مان سکتا ہے؟ کیا کسی صاحبِ عقل و دانش کو زیب دیتا ہے کہ وہ رہنماؤں کو چھوڑ کر لصوصِ دین کو رہنما تسلیم کریں؟ ایسے حالات میں شیطان، منافقینِ مدینہ، یزید پلید اور دوسرے ملتِ اسلامیہ کے دشمنوں کی طرح ان حضرات کے سپاہ کارناموں سے مدعیانِ اسلام کو باخبر کرنا ایک اخلاقی اور دینی فریضے کی ادائیگی ہے۔ کیا ایمان کے لٹیروں سے لوگوں کو خبردار کرنا مفتی اندازِ فکر ہے؟

۹۔ پاکستان کو معرضِ وجود میں آتے ہوئے اٹھائیس سال کا عرصہ گزر چکا لیکن تاحال تحریکِ پاکستان کی کوئی شایانِ شان تاریخِ منظرِ عام پر نہیں آسکی اور نہ ابھی تک نظریۂ پاکستان کو

اُجاگر کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی گئی بلکہ اندرونِ خانہ اسے مٹانے اور بے راہروی کو فروغ دینے کی کوشش ہی ہوتی رہی ہے جبکہ پاکستان کا مطلب لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ بتایا جاتا تھا۔ گویا: ۷

ہم بدلنا چاہتے تھے نظمِ میخانہ تمام
آپ نے بدلا ہے لیکن صرف میخانے کا نام

اگر کوئی بھی حکومت تحریک پاکستان کی تاریخ مرتب کرواتی اور اُسے اسکولوں کالجوں میں رائج کرتی نیز نظریۂ پاکستان کے تحت پاکستان کی انتظامی مشینری چلائی جاتی تو یقیناً اس مملکتِ خدا داد کا نقشہ پہلے کی نسبت بہت وسیع ہو چکا ہوتا لیکن اس ستم ظریفی کی داد بھلا کون دے سکتا ہے کہ دنیا کی اس سب سے بڑی اور نظریاتی مملکت میں پاکستان بنانے والوں اور اس کی مخالفت میں سر دھڑکی بازی لگا دینے والوں کو ایک ہی لائحہ سے بانٹا گیا بلکہ پاکستان کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے والوں کو پامال اور اس کے دشمنوں کو مالامال کیا گیا۔ جب بدخواہوں کو سر آنکھوں پر جگہ ملی تو انھوں نے نظریۂ پاکستان کو دلوں اور دماغوں سے نکال دینے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ اس افسوسناک صورت حال کا ان کا نتیجہ نکلا ہوں کے سامنے ہے کہ کشمیر کا مسئلہ صرف سلامتی کونسل کے کاغذات کی زینت بن کر رہ گیا اور ملک کا ایک بازو کٹ چکا۔ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت اور نظریاتی ملک کا نقشہ سمٹ سکا کر رہ گیا۔ (اتنا للہ و اتنا لیبہ راجعون) ۷

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا

کارواں کے دل سے احساسِ نیاں جاتا رہا

جب پاکستان کے پُر اسرار دشمنوں یعنی اسی ملک میں رہ کر اس کی جڑیں اکھیڑنے والوں نے وٹن کھادیا تو جن حضرات نے برطانوی اور گاندھی دُور سے دینِ متین پر اپنی مخصوص عنایات کی بارش کا برسانا شروع کیا ہوا ہے انھوں نے کیا گل نہیں کھلائے؟ کسی اہلِ نظر سے پوچھیے کہ اسلامی اقدار و شعائر کیا حشر کیا جا رہا ہے؟ کیا رہنمائی کے بھیس میں یوں رہزنی کرنے والوں کی نشان دہی اچھی بات نہیں ہے؟ کیا لیٹروں کو رہنما بنا لینے میں دابر بن

کی جھلائی ہے ؟ افسوس !

متاعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کا فردا کا غزہ خوں ریز ہے ساقی

۱۰۔ یزید پلید تختِ خلافت پر متمکن بھی ہوا، اس کے باوجود ہر مسلمان اُسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، بلکہ کوئی مسلمان اُس کے نام پر اپنے کسی بچے کا نام رکھنا پسند نہیں کرتا لیکن اس کے باوجود شاہِ گلگوں قبا، سید الشہداء، حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بارگاہ میں ہمیشہ خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا رہا ہے اور لاکھوں مسلمان اپنے بچوں کا نام محمد حسین، علی حسین، غلام حسین اور غلام شہید وغیرہ رکھ کر امام عالی مقام سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی اور سلطان ٹیپو شہید کی بارگاہوں میں ہر پڑھا لکھا مسلمان تحمین و آفرین کے چھول بچھا کر کرتا ہے لیکن جعفر بنگال و صادق دکن نفرت و حقارت کی نگاہوں سے ہی دیکھے جاتے رہے ہیں جیسا کہ شاعر مشرق، ڈاکٹر اقبال مرحوم نے فرمایا ہے :
جعفر از بنگال و صادق از دکن

ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن

کیا علامہ اقبال مرحوم کا یہ اندازِ فکر منفی ہے ؟ ہمارے کرم فرما نا صحیحین کی تلقین کا حاصل

یہی ہو گا کہ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور یزید پلید اینڈ کمپنی کو ایک ہی نظر سے دیکھا جائے۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ اور ابو الفضل فیضی کو یکساں حیثیت دی جائے۔

سلطان فتح علی ٹیپو اور میر صادق جیسے ملتِ فروش میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے۔ نواب

سراج الدولہ اور علی ویردی خاں کو میر جعفر کے برابر ہی بٹھایا جائے۔ فخر انیشیا، فاتح سومنا،

سلطان محمود غزنوی سے ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین، عبدالکریم چھگلہ، مولوی حسین احمد

ٹانڈوی، مولوی احمد سعید دہلوی، مولوی حفظ الرحمن سیوہا رومی، مولوی عطاء اللہ شاہ

بخاری، مولوی داؤد غزنوی، عبدالغفار خاں سرحدی گاندھی اور شیخ عبداللہ کشمیری

جیسے ملتِ فروشوں کو فروتنہ سمجھا جاتے۔

لیکن ہمارے ناصحین حضرات کو بار رکھنا چاہیے کہ جب تک دنیا میں ایک بھی ذی ہوش اور انصاف پسند باقی رہے گا اُس وقت تک حضرت امام حسین، حضرت مجدد الف ثانی، سلطان محمود غزنوی، سلطان فتح علی گیلو اور نواب سراج الدولہ وغیرہ کو علی قدر مراتب ادب و احترام کی نگاہوں سے ہی دیکھا جائے گا لیکن یزید پلید، فیضی، ابو الفضل، میر جعفر، میر صادق اور اُن کی معنوی ذریت کے نام سے بھی گھن آتی رہے گی۔ حق و باطل میں تمیز ہوتی رہے گی اور انھیں شیروشکر نہیں کیا جاسکے گا کیونکہ: جو چپ رہے گی زبانِ خنجر، لہو پکارے گا آئینہ کا

دریں حالات جن صاحبانِ مجتہد و دستانے بڑے گورنٹ کی جڑیں پاتاں تک پہنچانے اور گاندھی جیسے اسلام دشمن بُت پرست کو اپنا امام اور پیشوا بنا کر اسلام کو ہندومت میں مدغم کرنے اور ہندو مسلم کا فرق مٹانے بلکہ دونوں کی ایک مشترکہ قوم بنانے کی خاطر اپنی تمام صلاحیتیں صرف کر ڈالیں، ملتِ اسلامیہ کا رخ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی جانب سے لندن اور دوار کا کی طرف پھیرنے کی سرتوڑ کوشش کی اور اس طرح مسلمانوں کی ایمانی دولت کو ٹوٹ کر، اُن کی اجتماعی قوت کو منتشر کر کے اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتے رہے، آخر ایسے حضرات کا اسلامیانِ پاک و ہند کے پراسرار بدخواہوں سے کیا رشتہ ہے؟ ایسے رہنوں سے عقیدت رکھنے میں بھلا دنیا و آخرت کی کون سی بھلائی کا راز پنہاں ہے؟ آخر انھیں ظاہر کرنے سے روکا کیوں جاتا ہے؟

یہ دستورِ زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں

یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زبانِ میری

اب اگر تخریب کاروں کی نشان دہی نا پسندیدہ امر ہے تو ہر ایک حکومت میں سی، آئی، ڈی کے محکمے کا مقصد کیا ہے؟ پولیس کس لیے رکھی جاتی ہے؟ فوج میں سیکورٹی کا عملہ اور ایم، پی کا کام کیا ہے؟ آخر ہر حکومت اس اقدام پر کیوں مجبور رہتی ہے؟ عدالتی نظام کا مقصد کیا ہے؟ ملازموں کا ریکارڈ رکھ کر اُن کی اور اُن کے لواحقین کی دل آزاری کیوں کی جاتی ہے؟ کیا ناصحین حضرات بتا سکتے ہیں کہ حکومت کا یہ نظام غلط ہے یا ملک اور قوم کی خیر خواہی کا

جذبہ ہی اس کے پیچھے کا رہا ہے ؟

یقیناً ہر عاقل ان انتظامی امور کو ضروری قرار دے گا کیونکہ یہ اقدام ملک اور قوم کی بہتری اور لوگوں کے مال و جان کی حفاظت کے لیے ناگزیر ہیں۔ جب اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر جارحانہ کار نہیں تو اس جانب سے آنکھیں کیوں بند کر لی جاتی ہیں کہ جان اور مال سے ایمان تو لاکھوں گنا عزیز ہے۔ جان و مال کے دشمنوں کی نسبت ایمان کے دشمنوں اور رہنروں کا محاسبہ بدرجہا ضروری ہے۔ اسلامی حکومت جو ایسے افراد کا محاسبہ کیا کرتی تھیں کیا ان کا انداز فکر منفی تھا۔ آج حکومت اگر اسلامی ہونے کا ثبوت دینے سے محروم ہو جاتی ہیں تو ملک و ملت سے ہمدردی رکھنے والا کوئی فرد جب صرف مسلمانوں کی ہمدردی کے تحت ایسے رہنروں کی نشان دہی کے فریضہ کی ادائیگی کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کا انداز فکر کس طرح منفی قرار دے دیا جاتا ہے ؟

کیا ایسے ناصحین حضرات حکومت کو یہ مشورہ دینے کے لیے تیار ہیں کہ وہ ملازموں کا ریکارڈ نہ رکھے، غلط کار اور جرائم پیشہ افراد کو سزائیں نہ دے کیونکہ ایسا کرنا ناصحین کی اصطلاح کے مطابق ان مجرموں اور ان کے لواحقین کی دلازاری کا باعث ہے۔ کیا حکومت عدالتیں توڑ دے، پولیس، سی۔ آئی۔ ڈی اور سکیورٹی وغیرہ کے محکمے ختم کر دے ؟ کیا ایسا کرنے سے نظام سلطنت درہم برہم نہ ہو جائے گا ؟ کیا ایسا کرنے سے لوگوں کے مال و جان محفوظ رہ سکیں گے ؟ ہرگز نہیں۔ لہذا یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ دینی معاملات میں کھرے کھوٹ کی پہچان کرنا اس سے بھی ضروری اور اہم ترین فریضہ ہے۔ اسے منفی انداز فکر قرار دینا کھوٹے سکتوں پر پردہ ڈالنا اور خود اپنے بھی کھوٹ کو چھپانے کا ایک حربہ نہیں تو اور کیا ہے ؟

مملکتِ خدا و پاکستان میں اس ستم ظریفی کا سلسلہ روزِ اوّل ہی سے چلا آ رہا ہے کہ محکمہ تعلیم نے اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتب میں ایسے ہی علماء اور لیڈروں کو ملتِ اسلامیہ کے رہنماؤں میں شمار کیا ہے جنہوں نے پُر اسرار طریقے پر قوم کو اپنے پیچھے لگا کر برٹش گورنمنٹ کی جڑیں مضبوط کیں یا گاندھی کو اپنا پیشوا بنا کر ملتِ اسلامیہ کو اس کے قدموں میں جھکانے اور ہندو مسلم فرق مٹانے، دونوں کو ملا کر ایک قوم بنانے پر اپنی عمر عزیز

برباد کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی برٹش گورنمنٹ کے عہد میں جو علمائے کرام مسلمانانِ پاک و ہند کی ناخدائی کا فیصلہ ادا کرتے رہے، پورے نصاب میں ابتدائی جماعتوں کی کتابوں سے لے کر انتہائی جماعتوں کی کتب میں بھی اُن حضرات کے بارے میں ایک ٹوٹا چھوٹا لفظ تک نہیں ملتا۔ کیا انگریزوں اور ہندوؤں کے چھپتے لیڈر اور علماء کو اُن کی تمام تر سیاہ کاریوں اور رہنمی کے باوجود مسلمانوں کا رہنا بتانا اور بچے بچے کو یہی رہنا منفی انداز فکر اور مسلمانانِ پاکستان کو گمراہ کرنا نہیں ہے؟ آخر ملک و ملت کے بدخواہوں کو خیر خواہ اور رہنروں کو رہبر بتانے میں دنیا اور آخرت کا کون سا نفع متوقع ہے؟ کیا خود اپنی قوم کو یوں اندھیرے میں رکھنا اور لصوصِ دین کا معتقد بنانا ایک قومی المیہ ہے یا نہیں؟

اے صاحبانِ عقل و دانش! انصاف سے کام لیجیے، کھرے کھوٹے میں تمیز کیجیے۔ رہنروں کو رہنما اور رہنماؤں کو رہزن بتانے کا مشغلہ ملک و ملت سے غداری اور دارین کی بربادی کا باعث ہے۔ خدا را خود اپنی اُردو سروں کی عاقبت برباد نہ کیجیے۔ آخر۔ اس تجزیہ کاری کا پراسرار جمال بچھانے والا انگریز بوریا بستر لے کر بھاگ گیا اور اپنے جزیرے میں اوندھے منہ جا پڑا ہے۔ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے وظیفے بند ہو گئے۔ وظیفہ خوار، انجمنی ہو چکے۔ اب اُن کا معاملہ براہِ راست اپنے پروردگار سے ہے۔ اُنھوں نے جیسے درخت بوٹے تھے اُن کے چھل کھا رہے ہوں گے۔ اُنھوں نے اپنی عاقبت محض دنیا سنہالنے کے لیے بھیجی تھی لیکن اُن کے معتقدین و متبعین جو شعوری یا غیر شعوری طور پر اُنھیں رہنما تسلیم کر بیٹھے۔ ان بیچاروں کو نہ دنیاوی نفع نہ اخروی یعنی نہ وظیفے نہ ثواب۔ صرف نسبی یا علمی نسبت کی لاسٹھی پکڑ کر، کسی نہ کسی اندھے کے پیچھے اپنی آنکھیں بند کر کے چلے جا رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے کنوئیں میں گر رہے ہیں، لیکن اُن کی لاسٹھی چھوڑنے یا آنکھیں کھولنے کی اُن بلکہ سمجھانے والے مسلمانوں پر واہی تباہی بہتان۔ بھلا اس زالی عقلمندی اور دانشوری کا کوئی ٹھکانا ہے؟

مجھ مدعیانِ اسلام سے اپیل ہے کہ وہ کھرے اور کھوٹے کا از روئے انصاف فیصلہ کریں۔ اگر کسی کی محبت یا نفرت پہلے سے دل میں جاگزیں ہے تو تھوڑی دیر کے لیے اُسے

بالائے طاق رکھ دیجیے۔ غیر جانبدار ہو کر اور تنقیدی نظر سے اس کتاب کا مطالعہ کیجیے۔ یہ ایک شفاف آئینہ ہے۔ احقر نے بساط بھر پوری کوشش کی ہے کہ یہ آئینہ انصاف اور دیانتداری سے تیار ہو جائے۔ جن کتابوں سے اسے مرتب کیا ہے وہ خود مبتدعین حضرات کی ہیں۔ فیصلہ ہر قاری کی دیانت پر منحصر ہے۔ اگر موجودہ مبتدعین کا دل بھی بے ساختہ شہادت دینے لگے کہ جن حضرات کو انھوں نے پیشوا بنایا ہو انھاد وہ ہرگز پیشوا نہیں تھے تو جانِ برادر! ناجی گروہ میں ملنے، مسلمانوں کی جس حقیقی جماعت یعنی اہلسنت و جماعت سے آپ یا آپ کے بڑے بڑے کھسکے بہلانے پھیلانے پر علیحدہ ہو گئے تھے، اُسی میں شامل ہو جانے سے کون سا نقصان پہنچ جائیگا؟ کیا یہ دارین کی بھلائی کا ذریعہ نہ ہوگا؟ آئیے! اپنے قدیم مرکز پر جمع ہو جائیے تاکہ اسے بھائی بھائی بن کر گلے لگ جائیں اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت بڑھ جائے۔ ایک مرکز پر جمع ہو جانے میں ہی دارین کی کامیابی و کامرانی ہے۔ صخر

اے کاش ترے دل میں اُتر جائے مری بات

جن حضرات کو پیش کردہ حوالوں میں سے کسی حوالے کی صحت کے بارے میں شک گزرے یا اس کے برعکس حوالے اُن کے سپیش نظر ہوں اور وہ افہام و تفہیم کے طور پر گفتگو کرنا چاہیں تو مکتبہ حامدیہ، گنج بخش روڈ، لاہور کی معرفت بصدر شوق تحریری گفتگو کر سکتے ہیں۔ علمائے اہلسنت کے پاس اگر کوئی ایسی کتاب ہو جو مبتدعین کی تاریخ یا مجدد ماتہ حاضرہ قدس سرہ کے تجدیدی کارنامے میں معین و مددگار ثابت ہو سکتی ہے تو مذکورہ پتے پر ارسال فرمائیں۔ استفادہ کے بعد فوراً بصدر شکریہ واپس کر دی جائے گی۔ اُمید ہے کہ علمائے کرام تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى کے تحت راقم الحروف کو فراموش نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں مولانا انوار الاسلام صاحب سے ملنا، انھیں کوئی کتاب مرحمت فرمانا احقر ہی کو عطا فرمانا سمجھائیگا۔ مجدد ماتہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے تجدیدی کارنامے کو بیان کرنے کے سلسلے میں جتنی کتابوں کا موجود ہونا ضروری تھا وہ یقیناً ہمارے پاس ساری نہیں ہیں اور نہ ہم اتنی کتابیں فراہم کر سکتے ہیں۔ اپنی اس تنگد مانی کے باعث جلد اولِ سدرست پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں، جو ہمارے نزدیک نامکمل ہوتے ہوئے بھی اپنے موضوع کی جملہ تفصیلات سے بڑھ کر

مواد سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ محض علمائے کرام کی نظرِ کرم اور اُن بزرگوں کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اہل علم حضرات سے ہم اعلیٰ حضرت قدس سرہ کی خاطر تعاون کی پھر اپیل کرتے ہیں کہ کتابوں کے ذریعے ہمیں زیادہ سے زیادہ نوازیں تاکہ مشعلِ راہ کی لقیہ جلدیں ترمیم و اضافوں کے ساتھ شایانِ شان طریقے سے منصفہ شہود پر جلوہ گر ہوں۔ نیز فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جتنی بھی تصانیف کی فہرست ملے اور آپ کے مطبوعہ وغیر مطبوعہ خطوط کی نقلِ مرحمت فرمائیں جن کے نام الجمل المعداد اور سوانح اعلیٰ حضرت میں درج نہ ہوں۔

اس مجموعے کی تدوین میں جن حضرات نے بعض کتابیں عنایت فرما کر اپنے قیمتی مشنوروں سے ہماری مدد کی، احقر اُن کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے۔ حوصلہ افزائی کرنے والے قدر دانوں کا بھی شکر گزار اور ممنون ہوں۔ اپنے مخدوم و محترم عالیجناب محمد مسعود احمد صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج مٹھی ضلع خضرپارکر (صوبہ سندھ) کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس ایسے الفاظ کہا؛ یقین جانیے کہ موصوف کی ہدایات نے راقم الحروف کو مشعلِ راہ کا کام دیا۔ اس عظیم و ضخیم مجموعے کو منظرِ عام پر لانے والے مولانا انوار الاسلام قادری رضوی جیسے عاشقِ رضویت کا احقر کیا شکریہ ادا کر سکتا ہے؛ باری تعالیٰ شانہ! انھیں اس خلوص و محبت اور جذبہٴ صادق کا آخرت میں بہترین صلہ دے اور اس دنیا میں انھیں اس سے بدرجہا زیادہ مذہبِ مہذب اہلسنت و جماعت کی خدمت کا حوصلہ اور مواقع عطا فرمائے۔ (آمین)

اہل علم حضرات کو اس میں جس قدر خامیاں نظر آئیں، انھیں اس ناچیز کی کوتاہ علمی پر محمول کرتے ہوئے مطلع فرمائیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں اصلاح ہو سکے۔ جو کام کی باتیں نظر آئیں انھیں اس ناکارہ کے ولی نعمت، مرشدِ برحق، مفتی اعظم دہلی، حضرت شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظرِ کرم اور فیضِ رضا کا کرشمہ شمار کیا جائے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَ الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَ الْحَقُّنِیْ بِالصَّالِحِیْنَ۔ وَ صَلَّی اللّٰھُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ صَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

باب اوّل

حَامِدًا وَ مُصَلِّيًا۔ تارین کرام! زیرِ نظر رسالے میں چودھویں صدی کے تجدیدی کارنامے
 کو پیش کرنا ہمارا موضوعِ سخن ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ تجدید کی ضرورت اُسی وقت پیش آتی ہے
 جب تخریب اپنے عالمِ شباب میں ہو۔ تخریبِ کاری جب تک اپنے نقطہٴ عروج پر نہ پہنچ جائے
 تجدید یک منظرِ عام پر آتی ہے؛ کیونکہ سلسلہٴ نبوت کے ختم ہو جانے کے بعد اب تجدید ہی اصلاح
 کا نقطہٴ عروج ہے۔ ظاہر ہو کہ تجدید سے پہلے انتہائی تخریب کا پایا جانا ضروری ہے۔ اس
 حقیقت کے پیشِ نظر ہمیں امام احمد رضاؒ بریلوی قدس سرہ کے تجدیدی کارنامے پر بحث کرنے
 سے پہلے اُن افراد و عناصر کو ضرور دیکھنا ہو گا جنہوں نے تیرھویں صدی کے آخر اور چودھویں صدی
 میں اصلاح کے نام پر اسلام کا ٹھیلہ بگاڑنے کی جسارت کی، اُمتِ محمدیہ کے تیرہ سو سالہ اجماعی
 اور تہ عقاید و منطریات سے انحراف کر کے غیر اسلامی نظریات کی مقدس شجرِ اسلام میں پیوکاری
 کی اور اس طرح ان مبتدعینِ زمانہ نے اپنے اپنے انداز میں تخریبِ دین کا ناپاک فریضہ انجام دیا۔
 سب سے پہلے تصویر کا یہ رُخ دکھانا ضروری ہے۔ ۵

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں

مجھے ہے حکم اذان لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ

جن حضرات نے سابقہ مجددین کے حالات پڑھے اور اُن بزرگوں کے تجدیدی کارناموں کا
 گہرا مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب تک اُن خرابیوں کا ذکر نہ کیا جائے جن پر مذہبی
 رنگ روغن چڑھا کر، اسلامی لیبیل لگا کر دین میں شامل کیا جا رہا ہو، اُس وقت تک یہ واضح
 کیا ہی نہیں جاسکتا کہ فلاں مجدد نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ مثلاً اکبری دور کی اسلام دشمنی
 اور ”دین الہی“ کی فتنہ سامانی کا تذکرہ نہ کیا جائے تو امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ
 علیہ (متوفی ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) کا، کیا کارنامہ پیش کیا جاسکتا ہے؟ اسی ضرورت کے
 تحت مبتدعینِ زمانہ کی تحریری کارروائی کا پیش کرنا لازم آیا ورنہ ہمیں اس گندگی کو کُریدنے،
 اس سنڈاس میں جھانکنے اور اس کو ٹری کو اُدسنے بدھنے کی ضرورت کیا پڑی تھی؟ خدا گواہ ہے

اُس کا حبیب شاہد ہے کہ کسی کی محبت یا نفرت کو درمیان میں حائل کیے بغیر، مبتدعین کی صورتیں، تخریب کاروں کے چہرے، خود اُنھیں کے آئینوں میں دکھائے ہیں۔ راقم الحروف نے اس سلسلے میں بغرضِ خیر خواہی صرف یہی کیا ہے کہ جن اپنے آئینوں کو انھوں نے منتشر کر کے گہروں میں چھپایا ہوا تھا، اُنھیں جمع کر کے قارئینِ کرام کے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب ہر چشمِ بینا خود ہی دیکھ لے گی کہ انکے ہی آئینوں میں مبتدعینِ زمانہ کی صورتیں کیسی نظر آتی ہیں؟

۷ اُنھیں کی محفلِ سنوارتا ہوں، چراغِ میرا ہے رات اُن کی
اُنھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں، زبانِ میری ہے بات اُن کی

انگریزوں کا قبضہ اور مظالم

۷ منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی

اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

دوسری یورپین اقوام کی دیکھا دیکھی انگریزوں کو بھی متحدہ ہندوستان میں تجارت کرنے کا شوق دامنگیر ہوا۔ ملکہ الزبتھ سے بعض انگریز تاجروں نے اجازت لے کر ۱۶۰۰ء میں بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی قائم کی۔ ۱۶۴۴ء میں باؤن نامی ایک انگریز ڈاکٹر نے مغل فرمانروا شاہجہان کی بڑی لڑکی جہاں آراء بیگم کا علاج کر کے کمپنی کے لیے مزید مراعات حاصل کیں۔ تلاشِ ملک کے باشندوں نے سرزمینِ پاک و ہند کو سونے کی چڑیا دیکھا تو چوری چھپے دونوں ہاتھوں سے ٹوٹے اور ہر وقت یہاں اپنے پیہ مضبوط کرنے میں کوشاں اور سرگرم عمل رہنے لگے۔

سلطان محمد الدین اورنگ زیب کے زمانے میں انھوں نے چند سرکاری جہازوں کو لوٹ لیا۔ بادشاہ کے حکم سے ان کی کوٹھیوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ مکرو فریب کی ان زندہ تصویروں نے سترہ ہزار پونہ جرمانہ ادا کر کے رحم دل بادشاہ سے معافی حاصل کر لی۔ بنگال کا صوبیدار علی ویردی خاں ایک بیدار مغز اور مردم شناس حاکم تھا۔ انگریزوں کی فطرت اور خفیہ چالوں کو بھانپ کر وہ ان عیاروں پر کڑی نظر رکھا کرتا تھا۔ موصوف نے اپنے ہانشین اورنواسے سراج الدولہ کو بھی انگریزوں کی فطرت اور کارگزاریوں سے باخبر رکھتے ہوئے

ان کے بارے میں سخت ہدایت کر رکھی تھی۔

علی ویردی خاں کی وفات کے بعد ۵۶ء میں سراج الدولہ بنگال کا نواب بنا تو انگریزوں نے علی ویردی خاں مرحوم کے دوسرے نواسے شوکت جنگ کو گانٹھ کر قلعہ بنڈیاں شروع کر دیں۔ اس پر فوراً تادیبی انداز میں نواب سراج الدولہ نے قاسم بازار اور کلکتہ کی انگریزی کوٹھیوں پر قبضہ کر کے ان کا انتظام مانک چند نامی ایک ہندو افسر کے سپرد کر دیا۔ لارڈ کلائیو مدراس سے فوج لا کر کلکتہ پر حملہ آور ہوا، لیکن مانک چند اس حملے کی اطلاع ملتے ہی انتظام چھوڑ کر بھاگ گیا تو کلائیو نے بغیر کسی مزاحمت کے آسانی سے کلکتہ اور ہنگلی پر قبضہ کر لیا۔ اس واقعے سے اُس کی جرات یہاں تک بڑھی کہ سات روز تک کلکتہ میں ٹوٹ مار کا بازار گرم رکھا۔ نواب سراج الدولہ نے ان کے استیصال کی ٹھان لی اور ایک لشکرِ جبار لے کر انگریزوں پر ہتھ بول دیا تھا تا کہ یہ آئے دن کا جھگڑا ایک روز مٹا ہی دیا جائے۔ کلائیو نے مقابلے کی تاب نہ دیکھتے ہوئے صلح کی پیشکش کر دی اور عہد نامہ مدراس کی رو سے صلح ہو گئی۔

یہ صلح کلائیو نے محض اس لیے چاہی تھی کہ نواب کی عظیم طاقت کو سازشوں کے جال میں اُلجھا کر کمزور کرنے کے لیے کچھ وقت مل جائے۔ سراج الدولہ کے سپہ سالار لشکر اور علی ویردی خاں کے بہنوئی یعنی میر جعفر کو گانٹھ لیا نیز نواب کی فوج کے دو جرنیل راج ورنجھ اور مانک چند بھی خرید لیے گئے۔ ان غداروں کا ہاتھ میں آنا ہوا اور کلائیو نے زیادہ مہلت دیے بغیر ۵۶ء میں عہد نامہ مدراس کی دھجیاں اڑا کر پھینک دیں اور پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کے خلاف جنگ آزمائی کے لیے صف آراء ہو گیا۔

انگریزوں سے نواب کی فوجی قوت اگرچہ کئی گنا تھی لیکن گھر کے بھیدی لٹکا ڈھار ہے تھے اس لیے اپنوں کی بدولت شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اپنی غداری کے سرٹیفکیٹ پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے میر جعفر کے لڑکے کے میرن نامی نے نواب شجاع الدولہ کو اپنے ہاتھوں شہید کر دیا۔

۵۷ دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر

دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

شجاع الدولہ کی جگہ کلائیوں نے اپنے محسن اور چہیتے لیکن ننگ ملک و ملت یعنی میر جعفر کو
بنگال کا نواب مقرر کر دیا۔ میر جعفر نے ازراہ تشکر و امتنان انگریزوں کے لیے قومی خزانے کا
منہ چوٹ کھول دیا۔ قوم کی گاڑھے خون پسینے کی کمائی کو انتہائی بے دردی سے اپنے آقاؤں
پر بچھا کر نہا شروع کر دیا۔ کلائیوں کو اس خوشی میں دو لاکھ چونتیس ہزار پونڈ نقد اور چوبیس
ہونے جاگیریں دیے۔ کونسل کے ممبروں کو بڑی بڑی بھاری رقمیں دیں۔ بنگال سے نچلے درجے
کے ہر افسر کو تین تین ہزار پونڈ انعام ملا۔ اسی لیے تو بنگال کے لوگ میر جعفر کو "کلائیو کا گدھا"
کہا کرتے تھے۔ انگریزوں کو خوش رکھنے کے لیے میر جعفر نے انعامات و تحائف کا سلسلہ
باقاعدگی سے جاری رکھا لیکن ایک روز خزانہ بھی اسی طرح خالی ہو گیا جس طرح میر جعفر کا
سینہ ملک و ملت کے درد سے خالی تھا۔ انگریز صاحب بہادروں کی یہ حالت دیکھ کر موڈ
خراب ہو گیا۔ میر جعفر کو برطرف کر کے اُس کے داماد میر قاسم کو نواب مقرر کر دیا گیا۔
میر قاسم بیدار مغز اور عوام کا خیر خواہ تھا۔ کمپنی کی ٹوٹ کھسوٹ اور بنگال جیسے
خوشحال ترین صوبے کی بد حالی اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ شروع میں تو مصلحتاً میر جعفر
کی سنت کو ادا کرنا پڑا لیکن کچھ عرصے بعد برطانوی لیٹیروں کے مطالبات ماننے اور اٹھیں
پورا کرنے سے اپنے مجبور و معذور ہونے کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے ناراض
ہو کر اپنے اصلی پٹھو میر جعفر کے دوبارہ نواب ہونے کا اعلان کر دیا، تو اس موقع پر میر قاسم
اور انگریزوں میں ٹھن گئی۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر ایک فیصد کن لڑائی ہوئی، جس میں
میر قاسم کو افسوسناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس جنگ سے کیا نتائج برآمد ہوئے؟ اس کا
جواب میاں محمد شفیع کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

"بکسر کی لڑائی (۱۷۶۴ء) نے ہندوستان کی کم توڑ دی اور انگریز کی ریڑھ
کے مہرے مضبوط ہو گئے جو ابھی تک لرزتے رہتے تھے۔ شجاع الدولہ کو

ملہ میاں صاحب مجبور گئے یہاں سراج الدولہ کے بجائے میر قاسم لکھنا چاہیے تھا۔ نواب سراج الدولہ تو بکسر کی لڑائی
سے چھ سات سال پہلے پلاسی کی جنگ میں جام شہادت نوش کر چکا تھا۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں ہوئی تھی۔

بالکل دب کر صلح کرنی پڑی۔ الہ آباد کے ساتھ کئی علاقے انگریزوں نے دہالے۔
 غنیمت ہو کہ ریاست مل گئی اور ہندو مسلمان کی چند روز زندگی نکل آئی۔ بنگال کے
 انگریز بلا شرکت غیرے مالک بن گئے۔ دولت اُن کی لونڈی ہو گئی، اس لیے کہ
 صرف بنگال سے اُنھوں نے تین کروڑ ستائیس لاکھ ستر ہزار آٹھ سو تینتیس پونڈ
 وصول کیے۔ خاص نوابوں کی حیب سے جو رقم نکالی، اکیس لاکھ انتہر ہزار چھ سو
 پیسہ پونڈ تھی۔ ان رقموں کے علاوہ اور بہت کچھ دیگر ذرائع سے وصول کیا گیا،
 جس کے ساتھ عوام و خواص کی رگوں تک کا خون کھینچ کر لندن چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے
 کہ بنگال کا رزق اُنھیں دنوں ختم ہو گیا اور اس امیر صوبے پر ہمیشہ کے لیے افلاس
 دوڑ گیا۔

جناب غلام رسول مہتر نے انگریزوں کی ان عیاریوں کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے،
 "۱۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کا اصل ناظم سراج الدولہ تھا۔ اُس سے جھگڑا پیدا کیا
 پھر صلح کر لی اور باہم معاہدہ ہو گیا، بایں ہمایوں اور درباریوں خصوصاً
 میر جعفر سے خفیہ ساز باز کہ سراج الدولہ کو ختم کر دینے کا بندوبست کیا گیا۔
 ۲۔ میر جعفر نے نظامت کی خاطر اپنے آقا سے غداری کی اور انگریزوں کے لیے
 کامیابی کا دروازہ کھولا، اُسے نظامت ضرور دی گئی لیکن بے اندازہ
 رقیس وصول کی گئیں بلکہ مالی مطالبوں کا ایک لاکھ تین سو ستر ہزار
 ہو گیا۔ میر جعفر تنگ آ گیا تو اُسے مسند سے اتار کر اُس کے داماد میر قاسم کو
 ناظم بنا دیا گیا۔

۳۔ میر قاسم بھی ٹوٹ کا سلسلہ زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکا تو اُس سے
 جنگ ہوئی اور دوبارہ میر جعفر کو گدی پر بٹھایا گیا۔
 ۴۔ اسی اثنا میں بادشاہ دہلی سے پچیس لاکھ سالانہ دینے کے وعدے پر

بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی لی گئی۔ بالآخر بادشاہ کے چھپس لاکھ بھی ضبط کیے اور اُس کے مملوکہ علاقے بھی دوسروں کے ہاتھ فروخت کر دیئے گویا سراج الدولہ سے وفا کی نہ میر قاسم یا میر جعفر سے اور نہ بادشاہِ دہلی سے۔ جس سے فائدہ اٹھانے کا موقع نکلا، فائدہ اٹھایا، پھر اُسے بے مصرف سمجھ کر پھینک دیا۔

ریاست ٹونک کے بہادر حکمران، نواب امیر خاں نے بھی انگریزوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لارڈ دارن ہیسلنگ نے یہ محاذ حسبِ تصریحات مولوی محمد جعفر تھانیسری اور مرزا حیرت دہلوی وغیرہ کے سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۶۶ھ) کے ذریعے فتح کیا، جس کا مفصل اور مدلل ذکر آگے آئے گا۔ موصوف نے بڑی رازداری اور نمک حلائی کے ساتھ اس پھرے ہوئے شیر کو انگریزوں کے شیطانی پنجے میں گرفتار کیا تھا، اپنے مہربان آقاؤں کے آہنی پنجے میں بند کر دیا اور اس طرح اپنی مہربان، بے روبریا اور غیر متعصب سرکار کی حدودِ مملکت کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں پورا پورا ہاتھ بٹایا کیونکہ اس انگریزی عملداری کو موصوف فخریہ طور پر اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے اور لارڈ دارن ہیسلنگ بھی سید احمد صاحب کے ایسے کارناموں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا اور ان پر اعتماد رکھتا تھا۔ وسط ہند کے نواب امیر خاں، سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف جو کچھ برٹش گورنمنٹ کرنا چاہتی تھی وہ خود پرے میں رہ کر سید احمد صاحب سے ہی کوایا گیا۔ نظام حیدر آباد کے بعد اگر مسلمانوں میں سے کسی نے سب سے بڑھ کر برٹش گورنمنٹ کے قیام و استحکام میں مدد دی تو وہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی ہے لیکن ان صاحبانِ مجتہد و دستار نے اپنے ملک و ملت سے غداری کے کارناموں پر اصلاح، جہاد اور شکوک کے مظالم کا توڑ وغیرہ ایسے ایسے خوشنما لیل لگا کر قوم کے سامنے پیش کیے کہ عوامِ اناس کی کافی تعداد اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ آئندہ صفحات میں ہم تفصیلی طور پر حقائق پیش کر کے قارئینِ کرام سے فیصلہ چاہیں گے کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے

دین کی اصلاح و تجدید کا پڑا اٹھایا تھا یا تخریب دین اور افراق بین المسلمین کا؛ موصوف
 فی سبیل اللہ انگریزوں سے جہاد کرنے نکلے تھے یا انگریزوں کی غلامی کو دُستِ دینے کی
 خاطر انگریزی امداد کے سہارے سرحد کے مسلمانوں اور پنجاب کے سکھوں کا زور توڑنے کیلئے
 بھیجے گئے تھے؟ وہ مجاہد بننا چاہتے تھے یا انھیں بادشاہت اور نبوت کا سودا سمایا ہوا تھا؛

وارن ہیسٹنگز ۱۷۷۲ء سے ۱۷۸۵ء تک گورنر جنرل رہا۔ حق یہ ہے کہ جس طرح اس
 ظالم حکمران نے دیسی عوام و خواص کے خون کا آخری قطرہ تک چُوس لینے کی اگر کوئی کُسر رہی تھی
 تو پوری کر دکھائی اسی طرح جعفر بنگال اور صادق دکن جیسے ملتِ فردشوں سے جس جس شعبے میں
 جو کمی رہ گئی تھی وہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی نے پوری کر دکھائی اور ایسی راز داری سے کہ
 پوری قوم آج تک اُسی بُحران میں مبتلا چلی آرہی ہے۔ موصوف کی تخریب کاری کے اثرات
 متعدی مرض کی طرح پھیلے اور آج تک پھیلنے ہی جا رہے ہیں کیونکہ اُس پر جو خوشامالی لگایا گیا
 اُس کے پیشِ نظر کتنے ہی مسلمانوں نے اسے مرض کے بجائے شفا اور بدخواہی کی جگہ خیر خواہی
 سمجھ لیا۔ لارڈ وارن ہیسٹنگز کی ظالمانہ روش کا میاں محمد شفیع نے یوں نقشہ کھینچا ہے:

”وارن ہیسٹنگز نے ہندوستان اگر انگریزی اخلاق کی تکمیل کر دی۔ کوئی ظلم ایسا

نہ تھا جو اُس نے نہ کیا ہو اور کوئی بد عہدی ایسی نہ تھی جو عمل میں نہ لایا ہو۔

ملک گیری کی ہوسناکیوں اور زرکشی کی حرص پرستیوں کو آخری حد پر پہنچا دیا۔

اُس کے بعض مظالم تو ایسے دردناک ہیں کہ لکھتے وقت قلم کا نپ جاتا ہے اور

ایسے شرمناک ہیں کہ غیرت اذنی تحریر نہیں دیتی۔“ ۱

جیدر علی نے مسبور کی پہلی اور خصوصاً دوسری لڑائی میں انگریزوں کی فوجی طاقت کا
 جوازہ نکال دیا تھا۔ دوسری لڑائی میں انگریزوں کے مایہ ناز اور تجربہ کار جرنیلوں یعنی کرنل ہیلی
 اور منر و جسیوں کی شیخی کرکری کر کے انھیں عبرت ناک شکست دی تھی۔ جیدر علی کا اگرچہ
 دورانِ جنگ ہی انتقال ہو گیا تھا لیکن اُس کے جانشین سلطان فتح علی ٹیپو نے اپنے والد

کی طرح ایسی کامیابی سے دو سال تک متواتر جنگ لڑی کہ وارن ہسٹنگز کو مجبور ہو کر صلح کی پیشکش کرنی پڑی۔ معاہدے کی رو سے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیے گئے۔ آئندہ باہم نہ لڑنے اور دوستی کا عہد و پیمان ہو گیا، لیکن انگریز اور بدعہدی کے بھائی بہن ہیں۔

وارن ہسٹنگز کے بعد ۱۸۵۷ء سے ۱۸۵۹ء تک لارڈ کارنوالس گورنر جنرل رہا۔ اُس نے آتے ہی نظام اور مرہٹوں کو یہ جھانسنہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا کہ آئندہ جو علاقے فتح کیے جائیں گے اُن میں تینوں طاقتیں حصہ دار ہوں گی اور تینوں ایک دوسرے کی مدد کرنے کے پابند رہیں گے۔ یہ اتحاد ثلاثہ یا تثلیث انگریزوں نے اپنی فوجی قوت کو کمزور دیکھ کر کیا تھا۔ نظام کی نالافتی تو مشہور تھی لیکن اس موقع پر مرہٹے بھی دھوکا کھا گئے کیونکہ اُن کا مشہور اور مدبر سیاستدان، نانافرنیس مرچنٹ تھا۔ مرہٹوں نے اسلام دشمنی تو مد نظر رکھی لیکن غلامی کی جن ظالمانہ اور عیارانہ زنجیروں میں پورا ملک جکڑا جا رہا تھا، اُن کی طرف مرہٹوں کی نظر ہی نہ گئی۔

میسور کی دوسری لڑائی کے خاتمے پر انگریزوں نے جو سلطان فتح علی ٹیپو سے نہ لڑنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا معاہدہ کیا تھا، اُسے پس پشت ڈالتے ہوئے، ٹرانکور کے راجہ کی مدد کے بہانے سے، لارڈ کارنوالس نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر سلطنت میسور پر حملہ کر دیا۔ ایک سال تک ٹیپو سلطان مردانہ وار مقابلہ کرتا رہا لیکن رسد کی کمی اور دشمن فوجوں کی کثرت کے پیش نظر سلطان کو دب کر صلح کرنی پڑ گئی۔ تین کروڑ تاوان جنگ دینا پڑا اور ریاست میسور کے تقریباً نصف حصے سے دستبردار ہو کر باقی آدھی ریاست کو بچانا پڑا۔ مفتوحہ نصف علاقے کو انگریزوں، مرہٹوں اور نظام نے آپس میں بانٹ لیا۔

کارنوالس کے بعد ولزی آیا جو ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۰ء تک گورنر جنرل رہا۔ ولزی کو ملک گیری کی ہوس اپنے پیشرو سے بھی زیادہ تھی۔ سلطان نے فوراً اس خطرے کو محسوس کیا۔ نظام اور مرہٹوں کو سارے نشیب و فراز سمجھائے، لیکن تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔ ان سے مایوس ہو کر فرانس، ترکی اور افغانستان کی حکومتوں کے پاس اپنے سفیر بھیج کر مدد طلب کی۔ فرانس اور ترکی اُن دنوں اپنے ہی مسائل میں الجھے ہوئے تھے اس لیے بروقت کوئی مدد

نہیں کر سکتے تھے۔ زمان شاہ والی افغانستان نے اس اپیل کا غیر مقدم کیا اور سلطان فتح علی ٹیپو کی امداد کے لیے ایک لشکر جو رالے کفرور راونہ ہو گیا۔ زمان شاہ ابھی پنجاب سے ہی گزر رہا تھا کہ افغانستان میں اپنے بھائی کے باغی ہونے کی خبر سن کر اس کی سرکوبی کرنے کی غرض سے مجبوراً واپس لوٹنا پڑا۔

بیرونی امداد سے سلطان یوں محروم رہ گیا اور اندرونی طور پر ولزی نے سازش کا ایسا جال پھیلایا کہ میسور کے اراکین سلطنت میں سے میرصادق، میر غلام علی اور پورنیا جیسے انگریزوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے، سلطنت میسور کو چند روزہ زندگی کے آرام کے بدلے بیچنے اور متحدہ ہندوستان کو انگریزوں کا غلام بنانے پر تیار ہو گئے۔ اس موقع پر کمپنی نے نظام اور مرہٹوں کو ساتھ لے کر بغیر کسی خوف و خطر کے تین اطراف سے حملہ کر دیا۔ انگریزوں اور ان کے ساتھیوں کی فوجیں، میرصادق وغیرہ کی بدولت بغیر کسی روک ٹوک کے سرنگا پٹم تک پہنچ گئیں۔ انیسویں صدی کا ہنوز آغا نہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مسلمانانِ پاک و ہند کی امیدوں کا آخری چراغ بھی ۱۷۹۹ء میں بجھ گیا۔ ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ سلطان حیدر علی والی میسور جیسے شیر دل سپاہی، بدتر جرنیل اور اسلامی غیرت کے نشان کا مایہ ناز فرزند اور لائق ترین جانشین یعنی سلطان فتح علی ٹیپو بھی سرنگا پٹم کے قلعے میں غداروں کی بدولت اس طرح محصور ہو گیا جیسے شیر آہنی پنجرے میں۔ ان نامساعد حالات میں بھی وہ مرد مومن، شیر دل مجاہد اور مسلمانانِ پاک و ہند کی عظمت کا نشان، آخری وقت تک لڑتا رہا۔ جان دے دی لیکن اسلامی آن پر دھبہ نہ لگنے دیا۔ انگریزوں کے سامنے گردن نہ جھکا تو اوٹھیدان کر بلا کا سچا غلام ہونا ثابت کر گیا۔

زندگی کے اس نازک موڑ پر بھی عظمتِ اسلام کا یہ بیباک نقیب اپنوں اور بیگانوں کے سامنے یتاریخی اعلان کرتا ہے کہ ”شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے“ بہادر سلطان موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مردانہ وار لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ سلطان کی لاش کو تڑپتے ہوئے دیکھ کر فرطِ انبساط میں جنرل ہیتس کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے : ”آج سے ہندوستان ہمارا ہے“ یہ کسی مجنون کی بڑ نہیں بلکہ ایک حقیقت کا اظہار تھا۔ انگلیسٹ میں اس فتح کی خوشی میں جشن منایا گیا، چراغاں ہوا۔ برطانوی حکومت نے ولزی

جیسے تنگ انسانیت کو مارکوس کا خطاب دیا اور جزل مہیسر س کو لارڈ بنا دیا گیا۔ شہیدانِ کربلا کی سنت کو زندہ کر دکھانے والے عظیم سلطان کے متعلق ہر غیرت مند اور حریت پسند مسلمان کے منہ سے یہ الفاظ دلی خلوص اور عظمت و عقیدت کے جذبات کے ساتھ دعا تیر انداز میں جاری ہو جاتے ہیں: س

ابر رحمت تیرے مرقد پر گہر باری کرے
حشر بین شانِ کربلی ناز برداری کرے

وہ سلطان میپوشید جس سے انگریز ہر وقت خائف رہتے تھے۔ لارڈ وارن ہسٹنگز اور لارڈ کارنوالس کو جس کے ملک کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی جرات نہ ہوتی تھی، کیا لارڈ ولزلی اپنی طاقت کے بل بوتے پر اُس کی ریاست میں داخل ہو گیا تھا؟ سلطان میپو جیسے مدبر اور سیدانغز حکمران کو خبر نہ ہوئی اور انگریزی فوج اپنے اتحادیوں سمیت سلطنتِ میسور کا جگر چیرتی ہوئی سرنگاپٹم تک جا پہنچی، یہ ناممکن امر کیا ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت سے ممکن ہو گیا تھا؟ نہیں، بلکہ یہ اسی گھر کے ایک منخوس چراغ قابلِ صدفِ نفرت و حقارت کا رنامہ ہے۔ خود میرصادق نے ہی اپنے ہاتھوں اس گھر کو آگ لگائی تھی۔ اُسی نا آستانے و دولت نے پاک و ہند کے باشندوں کو برطانوی ڈاکوؤں کا غلام بنانے کا ناپاک فریضہ انجام دے کر تاریخ میں اپنے لیے بدترین مقام پسند کر لیا تھا۔ اسی لیے تو ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا: س

جعفر از بنگال و صادق از دکن

تنگ ملت، تنگ دیں، تنگ وطن

سلطان حیدر علی اور اُس کے فرزند نامدار کی فراست، تدبر اور باریک بینی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے نظام اور مرہٹوں کی کوتاہ اندیشی کا غلام رسول مہرنے یوں رونا رویا ہے:

”دلیبی حکمرانوں میں سے میسور کا فرماں روا حیدر علی پہلا شخص تھا جس نے انگریزوں کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا۔ اُس کی دُور رس نگاہ نے بھانپ لیا تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان میں قدم جمانے کا موقع مل گیا تو ملک خوفناک

آفات کا ہدف بن جائے گا۔ طاقت کا مقابلہ طاقت سے کیا جا سکتا ہے ...
 حیدر علی کی تمام کوششیں انگریزوں کو ختم کر دینے کے لیے وقف رہیں ...
 حیدر علی، نظام مرہٹوں اور ناظم کرناٹک کو بھی بار بار آگاہ کرتا رہا۔ اُس کے
 فرزند ٹیپو سلطان نے بھی زندگی اسی مقصد کی نذر کر دی لیکن نظام اور مرہٹے
 کوئی بھی شایان کام نہ کر سکے، صرف اسی ویم میں مبتلا رہے کہ انگریزوں کے
 ساتھ ہو کر سلطنتِ میسور کو ختم کر دیں۔ وہ ختم ہو گئی تو انگریزوں نے نظام کو
 اس درجہ بے دست و پا بنا دیا کہ اُس کا عدم اور وجود برابر ہو گیا اور مرہٹوں کا
 نشان تک باقی نہ چھوڑا۔۔۔ غرض سلطنتِ میسور کی تباہی انگریزوں کی جنگی
 قوت کا کارنامہ نہ تھی بلکہ دیسی حکمرانوں خصوصاً نظام اور مرہٹوں کی نالافتی،
 کونہ اندیشی اور تفرقے کا نتیجہ تھی۔“ ل

سلطانِ ٹیپو کی شہادت اور سلطنتِ میسور کی تباہی کے بعد حسبِ منشا کھل کر کھیلنے
 کے لیے ولزلی کا راستہ صاف ہو گیا تھا۔ بعض ریاستیں تو پہلے ہی انگریزوں کی باج گزار
 ہو گئی تھیں، اب ولزلی نے باقی دیسی حکمرانوں کو مجبور کرنا شروع کیا کہ وہ اپنی اپنی ریاست
 میں انگریزوں کی امدادی فوج رکھیں اور اُس کے اخراجات بڑاشت کریں۔ جن ریاستوں نے
 ایسا کرنے سے انکار کیا اُن پر فوج کشی کر کے یکے بعد دیگرے قبضہ کر لیا گیا لیکن جن حکمرانوں نے
 اپنی اپنی ریاستوں میں انگریزی فوج رکھنا منظور کر لیا تھا اُن کا انجام بھی دوسروں سے چنداں
 مختلف نہیں رہا۔ کسی سے بڑھتی ہوئی فوج کے اخراجات پورے نہ ہو سکے، کوئی بساط سے
 باہر خراج ادا کرنے سے قاصر رہ گیا اور کسی سے انگریزی عسکری کے مطالبات پورے نہ
 ہو سکے تو اس کمی کو پورا کرنے کی غرض سے اُس ریاست کا ایک حصہ خرید لیا جاتا، دل
 چاہتا تو ایسے حکمران کو ہٹا کر کسی اپنے نمک خوار کو گدے نشین کر دیتے اور اُس کے ذریعے
 اُس ریاست کے عوام کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لینے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھتے اور

آخر کار اُس علاقے کو برپ کرنے پر جا کر ہی وہ قضیہ ختم ہوتا۔ انگریزوں کی اس پالیسی کا ولیم ہوٹ نے یوں تجزیہ کیا ہے :

”جورٹیس اور حکمران انگریزوں کی دوستی کے جادو سے مسحور ہوئے اُن کیلئے یہ دوستی انجام کار مملکت ثابت ہوئی۔ اُن میں سے ہر ایک کو تختِ حکومت سے اُترنا پڑا یا وہ اُس طاقت کے ہاتھ میں بے جان کھلونے بن کر رہ گئے جو اپنی مرضی پوری کرنے پر تلی بیٹی تھی۔ اُن حکمرانوں نے دوستی کی راہ اختیار کی یا دشمنی کی ؟ نتیجہ دونوں حالتوں کا یکساں نکلا۔ اگر اُنھوں نے غاصب انگریزوں سے دوستانہ تعلقات گوارا نہ کیے تو اُن پر ارادہ ہائے بدکا الزام لگا کر حملہ کر دیا گیا اور اُن کے علاقے مسخر ہو گئے۔ اگر اُنھوں نے پیش کردہ دوستی قبول کر لی، تو وہ ڈپلومیسی کے جال میں اس طرح الجھ گئے کہ اپنی عزت اور موردِ مقبوضات سے محروم ہوتے بغیر نجات نہ پاسکے۔ حتیٰ یہ ہے کہ وہ لوگ جہاں حکومت کرتے رہے تھے وہاں قیدی بن کر رہ گئے تھے۔“

انگریز جو تاج کے روپ میں آئے تھے لیکن ایک بلائے ناگہانی بن کر متحدہ ہندوستان کے اکثر حصے پر قبضہ جما بیٹھے کتنی ہی ریاستوں کو کمال عیاری سے مہم کر چکے تھے۔ عیاری کا کوئی گڑ ایسا نہ تھا، جو انگریزوں نے آزما کر نہ دیکھا ہو، ٹوٹ کھسوٹ کی کوئی ترکیب ایسی باقی نہ رہی تھی جو اُنھوں نے جاری نہ کی ہو۔ کیا پنجاب کی سکھ ریاستوں نے اس خطرے سے بچنے کی کوئی تدبیر اختیار کی یا اُسی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں جیسے بلی کو دیکھ کر کبوتر آنکھیں بند کر لیا کرتا ہے ؟ مگر صاحب نے اس حقیقت کے چہرے کو یوں بے نقاب کیا ہے :

”مغلیہ سلطنت کے دورِ زوال میں سکھوں نے ستلج اور جہنا کے درمیان چند مسلیں قائم کر لی تھیں، جنھیں سکھ ریاستوں کا آغاز سمجھا جاسیے اور ستلج کے شمال میں بھی اُن کی چند مسلیں تھیں، جن میں سے انجام کار رنجیت سنگھ نے

خاصی شہرت حاصل کی۔ اگر وہ ذرا دُور اندیشی سے کام لیتا تو تمام سیکھوں کو متحد کر کے ایک پائیدار حکومت کا انتظام کر سکتا تھا لیکن اُس نے ذاتی برتری کے جنون میں ستیج اور جہنما کے درمیان کی سیکھ مسللوں کو بدظن کر دیا اور وہ بھی انگریزوں کی آغوش میں چلی گئیں۔ رنجیت سنگھ کو پھر بھی ہوش نہ آیا۔ اُس نے اپنوں کو غیروں کے قبضے سے نکال کر اپنے ساتھ ملانے کے بجائے انگریزوں سے (۱۸۰۹ء میں) معاہدہ کر کے ستیج کو اپنی اور انگریزی سلطنت کے درمیان حدِ فاصل بنا لیا، گویا سیکھوں کی نصف قوت انگریزوں کے پاس چلی گئی، باقی نصف کارٹیس رنجیت سنگھ اس بنا پر خوش ہو گیا کہ اب کسی خلش اور خدشے کے بغیر شمال اور مغرب میں اپنے حدود بڑھا سکے گا۔ اگرچہ حقیقتِ حال کے اعتبار سے اُس نے سیکھوں کے مستقبل پر سب سے کاری ضرب لگائی تھی۔

اُس نے ایک طرف سیکھوں کے ڈکڑے کیے، دوسری طرف اپنے دائرہ حکومت کی توسیع کے لیے ایسی کوتاہ اندیشی کی پالیسی اختیار کی کہ ہرگز وہ غیر مطمئن ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب انگریز ہندوستان کے معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق طے کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ایک ہی جہت میں دیائے ستیج سے پشاور جا پہنچے۔ سیکھوں کی حکومت کا نشان تک باقی نہ رہا اور ایک بھی آنکھ سیکھوں کی تباہی پر اشک باری کے لیے نہ مل سکی۔ آخر میں سیکھوں کے لیے فخر کی صرف ایک دستاویز باقی رہ گئی کہ اُنھوں نے انگریزوں کا ساتھ دے کر پورے ملک کو غلامی کی زنجیریں پہنائیں۔ پچاس ساٹھ سال تک وہ اسی سرمایہ فخر کے سہارے انگریزوں کی نظر میں متحد علیہ بنے رہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جب انگریز متحدہ ہندوستان کے اکثر علاقوں پر قبضہ جما چکے تھے۔ کتنی ہی چھوٹی بڑی ریاستوں کا حسرت ناک انجام سامنے تھا، اُن دنوں امیرانِ سندھ نے

سکھوں جیسی بداندیشی اور خود فریبی سے ہی کام لیا تھا یا کوئی قابلِ قدر ایسا بھی اقدام کیا جو حوت پسندی اور عاقبت اندیشی کے تحت کرنا پڑتا ہے۔ اس سوال کا جواب بھی مرصاحب کے لفظوں میں ہی پیش خدمت ہے :

”سندھ کی مثال سب سے بڑھ کر دردناک ہے۔ وہاں کے امیر ایک طرف انگریزوں سے بدکتے تھے اور دوسری طرف انھیں سکھوں کی پیش قدمی کا خطرہ پریشان کر رہا تھا۔ انگریزوں نے معمول کے مطابق فریب کاری سے کام لیا، وہ سکھوں کی پیش قدمی کے خطرے کو زیادہ سے زیادہ بھیاںک صورت میں پیش کر کے امیروں پر اثر ڈالتے اور اپنے قدم جھاتے رہے۔ نہ رنجیت سنگھ میں اتنی وسعتِ قلب اور وسعتِ نظر تھی کہ وہ امیروں کو پورا اطمینان دلا کر انگریزی اثرات کو دور رکھا اور نہ امیروں میں اتنی ہوشمندی تھی کہ وہ سکھوں کے خطرے کی روک تھام کے لیے کسی دوسری تدبیر سے کام لیتے اور انگریزوں سے بچے رہتے جو تقریباً بیسیوں دلیسی حکومتوں کو ہضم کر چکے تھے۔

امیروں سے حتمی معاہدہ تھا کہ فوج اُن کے علاقے میں سے نہ گزاری جائے گی لیکن پہلی جنگِ افغانستان میں انگریزوں نے اس شرط کی خلاف ورزی کی بلکہ شاہ شجاع کو امیروں سے روپیہ بھی دلویا۔ جنگِ افغانستان ختم ہو گئی تو انگریزوں نے امیروں کو دبانام شروع کیا کہ تم نے تو ہماری مشکلات کے وقت دوستی کا حق ادا نہ کیا تھا، اب نیا معاہدہ کرو، مجوزہ معاہدہ امیروں کے استقلال کو ختم کرنا تھا۔ وہ بیچارے تذبذب میں پڑے اور اُن پر حملہ کر دیا، اُنلے متحدہ ہندوستان کی جس ریاست پر بھی انگریزوں نے قبضہ کیا اُسے دوستی کے چکر میں

پھنسا یا یا دوسروں کو ساتھ لے کر، اُسے دشمن ٹھہرا کر حملہ آور ہوئے اور قبضہ کر لیا۔ کیٹی نے انگریزوں کی اس چالبازی پر یوں تبصرہ کیا ہے :

”کہا جاتا ہے کہ امیرانِ سندھ نے معاہدوں کی خلاف ورزی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے معاہدے توڑنے کا حق اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ اگر معاہدوں کو توڑنے کا نتیجہ لازماً یہ ہوتا کہ علاقے چھین جاتے تو آج حکومتِ برطانیہ کے پاس دریائے برہم پتر اور دریائے سندھ کے درمیان ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی باقی نہ رہتا۔“

پنجاب، ناگپور اور ستارہ پر انگریزوں نے کس طرح قبضہ کیا؟ یہاں کس قسم کا جال پھیلا کر اپنی توسیع پسندی کی ہوس اور سرزمینِ پاک و ہند کے چپے چپے کو غلام بنا کر لوٹنے کی خواہش پوری کی، ملاحظہ ہو :

۱۔ مارڈنگ نے سکھوں کی حکومت کا صرف ایک حصہ چھینا تھا اور کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھ فروخت کیا تھا، ڈلہوزی نے پورا پنجاب لے لیا اور دلیپ سنگھ کو معزول کر کے فتح گڑھ (یو۔ پی) پہنچایا۔ اُس نے عیسائیت قبول کر لی، شاید اسی لیے کہ تختِ حکومت حاصل کرنا سہل ہو جائے گا لیکن عیسائیت اُسے انگریزوں کے قریب تر نہ لاسکی۔ اور آخری دور میں اُس سے جو بدسلوکیاں ہوئیں وہ بڑی ہی درد انگیز اور عبرت افزا تھیں۔

۲۔ ستارہ کی چھوٹی سی ریاست سیراجی کے خاندان کے لیے رکھی گئی تھی۔ معاہدہ یہ ہوا تھا کہ وہ دو امانتاً قائم رہے گی۔ اپریل ۱۸۴۸ء میں ستارہ کے راجہ نے وفات پائی۔ اُس کے اولاد نہ تھی۔ لیکن ہندو دھرم کے رواج کے مطابق اُس نے ایک لڑکے کو متبنی بنا لیا تھا۔ ڈلہوزی نے

متنبی کو راجہ بنانا منظور نہ کیا اور ریاست ضبط کر لی۔

۳- ۱۸۵۳ء میں رگھوجی جھونسلا والی ناگپور فوت ہوا۔ اُس کے بھی کوئی اولاد نہ تھی اور غالباً اس خیال سے اُس نے کسی کو متنبی نہ بنایا تھا کہ عوام اُسے اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم سمجھ لیں گے، تاہم ملک کے رواج اور ہندو دھرم کے مطابق اُس کی بیوہ متنبی تجویز کر سکتی تھی۔ ڈلہوزی نے وہ ریاست بھی بے تکلف سنبھال لی، پھر محلات کا سارا اسباب انتہائی بے دردی سے برسرِ عام نیلام کرایا، یہاں تک کہ ایک رانی بدسلوکی پر خفگی کے جوش میں پورے محل کو آگ لگوائے کے لیے تیار ہو گئی تھی! لے

یہ ہے برطانوی لیٹروں کے متحدہ ہندوستان پر قابض ہونے کی مختصر سی کہانی اور نہ ماننے والوں کی خود اپنی ذہانی، اس کے باوجود دیکھتی تم نظریہ ہے کہ بعض مُبتدعینِ زمانہ اور لُصوہین نے برٹش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی میں زمین آسمان کے قلابے ملائے اور اس کے باوجود انگریزوں کے اُن نمک خواروں، ملک و ملت کے غداروں کو آج تک مسیحا ئے قوم، مصلح، رہنما، ریفارمر اور معلوم نہیں کیا کیا منوانے کی ہم برابر جاری ہے۔ ایسے بیانات اسی کتاب کے باب چہارم کے اندر ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں۔ اب بانی علی گڑھ کالج سرسید احمد خاں کا انگریزوں کے متعلق ایک بیان ملاحظہ ہو کیونکہ پاکستان کا ایک طبقہ موصوف کو پاکستان کا معیارِ اول منوانے پر بضد ہے:

”اُن (سرسید) کی نہایت بچتہ راتے تھے کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان

کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد لڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انہوں نے یہاں کی حکومت بزور حاصل کی اور نہ مکرو فریب سے ، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی ، سو اسی ضرورت نے ہندوستان کو ان کا محکوم بنا دیا ، اے

موصوف کے ہر لفظ سے کس طرح انگریزوں کی محبت کے دریا رواں ہیں ، عقیدت و احترام کے کیسے کیسے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور ساتھ ہی درد مندان ملک و ملت کی آنکھوں میں دھول جھونک کر قوم کو کیسا غوثِ نادھو کا دیا جا رہا ہے کیونکہ مسیحائے قوم اور نا خدا ئے کشتیِ ملت جو ٹھہرے۔ اکبر الہ آبادی نے اسی لیے تو کہا تھا : اے

یورپ نے دکھا کر رنگ اپنا ، ستید کو مرید بنا ہی لیا

سب پیروں سے تو بچ نکلے ، اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

ایک طرف انگریز اپنی مخصوص پالیسی کے ذریعے ویسی ریاستوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ جمانے لگے اور دوسری طرف اُس متحدہ ہندوستان کو ، جو کبھی سونے کی چڑیا مشہور تھا اور جسے اپنی بعض مصنوعات پر بجا طور پر ناز تھا ، اُسے صنعتی لحاظ سے مفلوج کرنے میں بھی برطانوی لٹیروں نے کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ برطانوی لوگوں کے تاثرات ہمارے سُوتی کپڑے کی صنعت کے بارے میں اُس وقت یہ تھے : (بقول میاں محمد شفیع)

”ہندوستان کی جس چیز نے سب سے زیادہ تباہی مچائی ہوئی ہے وہ سُوتی

کپڑا ہے۔ ہمارا (برطانوی) اُونی کپڑا اُس کے سامنے بے قدر ہو گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ہندوستانی دولت ٹوٹ رہے ہیں لیکن عیسائی برباد ہو رہے ہیں

کیا انجام ہوگا ، یہی کہ ہندوستانی دو تہہ ہو جائیں گے اور ہم مفلس کے مفلس بنیں

یہی میاں صاحب ہماری ریشمی صنعت کے بارے میں مسٹر شیلٹن کا ایک بیان یوں

لے العارف حسین حاتی : حیاتِ جاوید ، ص ۶۸۲

لکھ محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء مطبوعہ لاہور ، بار اول ، ۱۹۵۷ء ، ص ۱۰۱

نقل کرتے ہیں :

”انگلستان میں جو ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی سے درآمد ہوتا تھا وہ بالکل بند ہو گیا ہے، اس لیے کہ بنگال کا ریشمی کپڑا فرانس اور اٹلی کے ریشمی کپڑوں سے آدھی قیمت پر انگلستان پہنچ جاتا ہے اور دونوں سے بہتر ہے“ لہ

اس سونے کی چڑیا پرتا بلض ہونے سے پہلے برطانیہ انتہائی پس ماندہ اور غریب ملک تھا۔ سرزمین پاک و ہند کو ٹوٹ کر انگریزوں نے اپنے ملک کو صنعتی بنایا اور صفِ اول کے خوشحال ملکوں میں انگلستان کا شمار ہونے لگا۔ میاں محمد شفیع اس حقیقت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

”ہندوستان پرتصرف حاصل کرنے سے پہلے انگلستان کی حیثیت نہایت معمولی تھی یہ سونے کی چڑیا ہاتھ لگی۔ پشتِ ہالشت کی نسلوں کے خزانے انگلینڈ پہنچے تو کارخانوں کی بنیادیں شروع ہو گئیں۔ جہاں سرسبز چراگاہیں ، تروتازہ مرغزار تھے وہاں چمنیاں دُھواں اُگلنے لگیں۔۔۔۔۔ ۱۸۵۷ء سے ہندوستان کی صنعت رُوبہ زوال ہوئی اور انگلستان میں کپڑا بننے کی دیگر صنعتی آسانیاں پیدا ہو گئیں ، کلین نکل آتیں ، گھنٹوں کے کام منٹوں میں ہونے لگے۔ سستے مال ہندوستان کی بندرگاہوں میں پہنچے۔ ہندوستان کے ہاتھ سست پڑ کر پرانے ڈھچھرے چلتے رہے“ لہ

جب انگریزوں نے یہاں کی دولت کے ذریعے اپنے ملک کو صنعتی بنانا شروع کیا تو چونکہ بنگال کے سُوتی اور ریشمی کپڑوں نے فرانس اور اٹلی کی صنعتوں کو ناکارہ بنائے رکھ دیا تھا، اسی خطرے سے بچنے اور اپنی مصنوعات کو ترقی دینے اور کامیاب بنانے کی غرض سے انگریزوں نے متحدہ ہندوستان کی صنعتِ پارچہ بافی کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر

اٹھانہ رکھی۔ اس سلسلے میں میاں صاحب نے مسٹر بورڈس کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

”پارچہ بافوں پر جانے کیے جاتے تھے، قید کی سزائیں دی جاتی تھیں، کوڑے لگاتے جاتے تھے۔ اُن سے جو تجارتی عہد ناموں پر دستخط کرائے جاتے تھے۔ اس سے مصنوعات ناپید ہو گئی ہیں اور یہیں تو سخت گراں ہیں۔ عہد مغلیہ میں اور علی ویر دی خاں کے زمانے میں یہ پارچہ باف نہایت خوش تھے اور اب بالکل تباہ ہو گئے ہیں“ لے

دسی صنعتوں کو اس طرح تباہ کرنے کا معاملہ کہاں جا کر ختم ہو، یہ بھی میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

۱۸۵۰ء تک مکمل طور پر انگریزوں نے یہاں کی صنعت و تجارت کو ٹھکانے لگایا اور ہندوستان سوئی ٹیک کے لیے وہاں (انگلستان) کا محتاج ہو کر بیٹھ گیا۔ نہ تجارت رہی نہ جہاز رہے۔ روٹی کے بھی لالے پڑ گئے، سلطنت، جہانِ ادیں، عزتیں، یہ سب تو جا ہی چکی تھیں، صناعتوں اور کارخانہ داروں کے طبقے کی تباہی نے قوم کی شومی قسمت کی داستان کو مکمل کر کے دلوں کے لیے ایک اور مسلسل چراغت کا سامان مہیا کر دیا“ لے

جب انگریز اپنی کمال عیاری سے ملک پر قبضہ کر رہے تھے، دونوں ہاتھوں سے یہاں کی دولت کو لوٹ رہے تھے، ہندوستان کی وہ صنعتیں جنہوں نے یورپ کی مصنوعات و پارچہ جات کو مقابلے میں بالکل ردی ثابت کر دیا تھا، ان ظالموں نے انہیں ٹھکانے لگا کر یہاں کے پارچہ بافوں اور صنعت کاروں کو محتاج بنا دیا۔ تجارت ختم کر دی اور ہر طرح تباہ و برباد کر کے سوئی ٹیک کے لیے انگلستان کا اس خطے کو محتاج بنا دیا تھا۔ اُن دنوں بھی انگریزوں کے دسی نمک خوار وکیل صفائی بن کر اپنے آقاؤں کی یوں قصیدہ خوانی کر رہے تھے:

”غرض ان (قاسمی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہوا کہ درستی ملک اور صفائی راہ اور رفاد عوام اور امن خلائی اور امان مخلوق اور راحت رسائی رعیت اور آرام دہی بریت میں حکام فرنگ کا مثل اور نظیر اس وقت میں بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے بلا اور مفتی خوشامد کی راہ سے باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں، مگر میری نظر میں جو رائج اور صحیح معلوم ہوا، وہ لکھ دیا اور قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔“

شاید اکبر الہ آبادی نے ایسے ہی انگریز کے مداحوں کی فوج کو دیکھ کر یہ شعر موزوں کیا تھا:

ایمان بیچنے پر ہیں اب سب تیلے ہوئے
لیکن خرید ہو جو علی گڑھ کے بھاؤ سے

داخلت فی الدین: جیٹ انگریز دسی ریاستوں پر قبضہ جاتے جا رہے تھے، ملک کی دولت کو طرح طرح کے حربوں سے لوٹ رہے تھے، یہاں کی صنعتوں کو تباہ و برباد کر کے اور اپنے ملک کو صنعتی بنا کر پاک و ہند کے باشندوں کو انگلستان کا دست نگر بنا رکھے تو اہل ملک کی عزیز ترین متاع یعنی دولتِ دین و ایمان کو کوٹ لینے کی طرف سے بھی غافل نہیں تھے۔ اس سلسلے میں انگریزوں کا پہلا منصوبہ یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خرچ پر انگلینڈ سے پادری بلائے جاتے، وہ متحدہ ہندوستان میں آکر دوسرے مذاہب پر اعتراضات کا لاقتنا ہی سلسلہ شروع کر دیتے اور اپنی حقانیت جتانے کی غرض سے جگہ جگہ مناظروں کا چیلنج بھی دے دیا کرتے۔ اس کے ساتھ ہی عیسائیت کی حمایت میں بے شمار کتابیں شائع کروا کر مفت تقسیم کرنے لگے۔ چنانچہ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بیان مولوی عبدالرشید ارشد نے یوں نقل کیا ہے:

”انگریزوں نے تمام باشندگانِ ہند کو عیسائی بنانے کی اسکیم بنائی تھی۔
اُن کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو کوئی مددگار اور معاون نصیب نہ ہو سکے گا“

اس لیے انقیاد و اطاعت سے سرتابی کی جرأت نہ ہو سکے گی۔ انگریزوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر حکمرانوں کا باشندوں سے اختلاف، تسلط و قبضے کی راہ میں سنگ گراں ثابت ہوگا۔ اس لیے پوری جانفشانی اور تندہی کے ساتھ مذہب و ملک کو مٹانے کے لیے طرح طرح کے مکر و جیلے سے کام لینا شروع کیا انھوں نے بچوں کو نافوں کو اپنی زبان اور دین کی تلقین کے لیے شہروں اور دیہات میں مدرسے قائم کیے اور پچھلے علوم و معارف کے مٹانے کی پوری کوشش کی۔ خود مولوی عبدالرشید ارشد نے انگریزوں کی اس ظالمانہ روش کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے:

’ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دور میں عدل و انصاف اور رعایا پروری کے بجائے جبر و استبداد، لوٹ کھسوٹ کا عام دور دورہ تھا۔ مسلمان چھ سو برس سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے مگر انھوں نے غیر مسلموں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ ہندو مسلمان باہم دو گرتیر و شکر کی طرح رہتے تھے مگر انگریزی عملداری میں ہندوستان کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تیار کیا گیا۔ پادریوں کو نہ صرف تبلیغ کی عام اجازت تھی بلکہ انگریزی حکام اُن کی پشت پناہی کرتے۔ اسکولوں اور کالجوں کے مدرسین عموماً پادری ہوتے تھے۔ انجیل کا درس ضروری کر دیا گیا تھا۔ پادری عام جمعوں میں نہ صرف عیسائیت کی تبلیغ ہی کرتے بلکہ ہندو اور مسلمانوں پر بے محابا جارحانہ حملے کیے جاتے۔ چونکہ انگریز کی نظر میں اُس کا اصل مد مقابل مسلمان تھا اور اُسی کو وہ اپنا سیاسی حریف سمجھتا تھا۔ اسی لیے انگریزوں کا خیال تھا کہ جیت تک مسلمانوں کو پشت اور ناکارہ نہ بنا دیا جائے اُس وقت تک حکومت اور سر بلندی کا نشہ ان کے دماغوں سے نہیں نکلے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ ظلم و جور اور تبلیغ عیسائیت کا نشانہ بنایا گیا۔‘

لے عبدالرشید ارشد، مولوی: بیس پڑے مسلمان، ص ۹۴

لے ایضاً، ص ۹۴

اس منصوبے کے تحت بے شمار عیسائی پورے ملک میں پھیل گئے۔ ان میں پادری فنڈز کی سرگرمیاں سب سے نمایاں تھیں۔ ہجگہ اسلام پر اعتراضات کی بوچھاڑ اور مناظرے کا چیلنج دیتا پھیر رہا تھا۔ اہلسنت و جماعت کے مایہ ناز عالم دین یعنی پائیہ حرمین مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اگرہ کے تاریخی مناظرے میں اُسے وہ شکست فاش دے کر ساکت و صامت کیا کہ انگلستان کی طرف بھاگتے ہی بنی۔ غلام رسول مہرنے اس امر کا تذکرہ یوں سپرد قلم کیا ہے:

”اس ضمن میں پادری فنڈز کا ذکر ضروری ہے جو ۱۸۵۴ء میں یہاں آیا تھا اور آتے ہی اسلام پر اعتراضات کا لاتنا ہی سلسلہ جاری کر دیا تھا۔ اُسے عربی اور فارسی سے خوب واقفیت تھی۔ اسلامی علوم کی کتابیں بھی دیکھ چکا تھا سادہ لوح علماء جنہیں عیسائیت سے چمداں واقفیت نہ تھی۔ فنڈز کے اعتراضات کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ آخر مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں نے بمقام اگرہ فنڈز سے مناظرہ کیا۔ موضوع مناظرہ یہ تھا کہ توریت و انجیل میں تحریف ہوئی یا نہ ہوئی؛ فنڈز نے شکست کھائی اور وہ واپس چلا گیا تاہم یہ حقیقت پھر ایک مرتبہ واضح ہو گئی کہ پادریوں کو دوردراز کے سفر کر کے یہاں آنے اور لوگوں کے عقائد بگاڑنے کی کوشش کرنے کا حوصلہ کیوں ہوا؟“

پروفیسر محمد ایوب قادری نے بھی اس مناظرے کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے:

”مولوی رحمت اللہ بن خلیل اللہ عثمانی ۱۲۳۳ھ/ ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ کیرانہ ضلع مظفرنگر وطن ہے۔ مفتی سعد اللہ مراد آبادی، مولوی محمد حیات اور مولوی امام بخش صہبائی وغیرہ سے تحصیل علم کی۔ ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء میں اگرہ میں پادری فنڈز سے مناظرہ کیا۔ فنڈز نے راہ فرار اختیار کی۔ جبکہ آزادی ۱۸۵۷ء میں بڑے زور کے ساتھ حصہ لیا، جس کے نتیجے میں جائیداد و

الماک ضبط ہو گئی اور مکہ معظمہ کو ہجرت کرنی پڑی۔ مکہ معظمہ میں صولت النساء بیگم کی استعانت و امداد سے مدرسہ صولتیہ قائم کیا۔ عیسائیت کے رد میں بڑا کام کیا ہے۔ ۱۳۰۸ھ/۱۸۹۰ء میں انتقال ہوا۔ ۱

میدانِ مناظرہ میں اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے سرکاری سطح پر دوسرا رنگ بدل لیا۔ تمام ملازموں کے نام عیسائیت قبول کر لینے کے پادری ایڈمنڈ سے خطوط لکھوائے گئے۔ انگریزوں کی اس شرمناک کارگزاری کا تذکرہ غلام رسول مہر نے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے :

”۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ایک طویل خط ملک کے تمام تعلیم یافتہ آدمیوں، خصوصاً معزز سرکاری ملازموں کے پاس بھیجا، جس کا مضمون یہ تھا: اب ہندوستان میں ایک علمداری ہو گئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہو گئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہو گئی، مذہب بھی ایک چاہیے۔ اس لیے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔“ ان تمام باتوں کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ لوگوں کو یقین ہو جاتا، اب حکومت نے عیسائیت کو فروغ دینے اور سابقہ مذاہب کو مٹا دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔ ۲

میاں محمد شفیع نے پادری ایڈمنڈ کے مذکورہ خطوط کا تذکرہ اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

”چلتے چلتے سنگتی آگ پر پادری ایڈمنڈ نے کلکتہ سے ۱۸۵۵ء میں تمام دفاتر اور اہم اداروں میں ذیل کا اعلان بھیج کر تیل چھڑک دیا۔ جو شک میں تھے اُنھیں بھی یقین ہو گیا کہ انگریز ہمیں مذہب سے بھی محروم کر دیں گے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، دونوں پر اس کا یکساں اثر پڑا اور دونوں تپ گئے۔“ ۳

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۰

۲۔ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹

۳۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، بار اول، ۱۹۵۷ء، ص ۱۱۷

پادریوں کی ان شرمناک سرگرمیوں میں حکومت کا ہاتھ تھا یا نہیں؟ میاں صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

”حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ پادریوں کی تحریک و تبلیغ میں خود گورنر شامل رہے ہیں۔ مبلغین عیسائیت کو باقاعدہ امداد دیکر تنخواہیں دی جاتی تھیں اور بعض گورنر تبلیغ میں خاصی دل چسپی اور جوش و سرگرمی رکھتے تھے۔“ ۱

برٹش گورنمنٹ کا نظریہ و منصوبہ پادریوں کی سرگرمیوں سے واضح تھا۔ آخر ہزاروں میل دُور سے یہاں آکر، اتنا خرچ برداشت کر کے پادریوں کو یہاں تبلیغ کرنے، دوسروں کے مذاہب پر اعتراضات جڑنے کی آخر کون سی ضرورت پڑی تھی؟ ضرورت بھی تسلیم کی جائے تو آمد و خرچ اتنے مصارف ایک مذہبی مبلغ کے پاس کہاں سے آئے؟ اگر مصارف ہوں بھی تو ہزاروں روپے خرچ کر کے یہاں آکر تبلیغ کرنے کے بجائے ایک کوڑی خرچ کیے بغیر اپنے ملک میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم رہ سکتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ پادریوں کو ہزاروں میل دُور سے یہاں آنے کی قطعاً کوئی ضرورت تھی اور نہ کسی عام آدمی میں استطاعت پادریوں کی ضرورت تھی تو برٹش گورنمنٹ کو اور انھیں یہاں لانے، اُن کے سارے اخراجات برداشت کرنے کی استطاعت تھی تو الیسیٹ انڈیا کمپنی میں جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ساری کارگزاری انگریزی حکومت کی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود یہاں کے ایک علی گڑھی دیول نامار، اپنی سرکار ابد قرار کی صفائی میں یوں کُہ رہے تھے:

”اول یہ ہے کہ کلکتے کے بعض پادریوں نے اپنے حسبِ عادت، مذہب و ملت کے بارے میں مناظرے اور مباحثے کے طریقے پر ایک اعلان چھپوا کر عام طور پر ہندوستانیوں کے پاس بھیجا ہے اور ہندوستانیوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس قسم کے مضامین ابد پائدار گورنمنٹ کے اشارے سے بھیجے گئے ہیں۔ حالانکہ گورنمنٹ کو اس کی مطلقاً خبر نہیں ہے اور سرکار عالی مقدار کی یہ شان

ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنی رعایا کو اپنے دین و مذہب کی ترغیب و تحریص دے۔
صاف ظاہر ہے کہ اس ملک میں ہر مذہب و ملت کے لوگ ہیں جو الگ الگ
آئین رکھتے ہیں اور ان کا علاقہ اس سرکار والا اقتدار کے ماتحت ہے۔ گورنمنٹ
ان پر لطف و کرم کی یکساں نظر رکھتی ہے۔ اقتدار کو اتنی مدت ہو چکی ہے، کبھی
کسی سے مذہب و ملت کے بارے میں تعرض نہیں کیا گیا، اس میں اسلام
ہوں یا دوسرے مذاہب و ملل !

ایسے آلہ کاروں کی صفائی کے باوجود گورنمنٹ کے خلاف نفرت کے عام جذبات بھڑکنے لگے،
پادریوں کی ان سرگرمیوں کی ذمہ داری ہر کوئی حکومت پر ڈالتا تھا، ان سب سے قطع نظر
علمائے دین کے مقابلے میں پادریوں کی شکستیں اور ذلت و ناکامی کے واقعات نے حکومت
پر واضح کر دیا کہ اہل ہند اور خصوصاً مسلمانوں کو عیسائی بنانے کی تجویز نہایت ٹیڑھی کھیر
ثابت ہو کر رہے گی، اس حقیقت و تجربے کی روشنی میں جو کام پادریوں سے لینا تھا وہ حکومت
نے اپنے کالے پادریوں سے لینا شروع کر دیا اور یورپین تعلیم و تہذیب کی قدردانی و حوصلہ افزائی
شروع کر کے دینی علوم اور علوم شرعیہ کی تحصیل کرنے والوں کو عضو معطل بنا دینے کی ٹھان لی۔
مہر صاحب لکھتے ہیں :

”ابتداء میں مدرسوں اور کالجوں کے اندر تعلیم کا دوسرا طریقہ تھا۔ وہ تمام السنہ
و علوم پڑھائے جاتے تھے جن کا پہلے رواج تھا، مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت،
فقہ، حدیث، ہندو دھرم کی کتابیں وغیرہ، ان کے ساتھ انگریزی بھی پڑھائی
جاتی تھی۔ بعد ازاں عربی اور فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی۔ فقہ، حدیث اور
دوسری مذہبی کتابیں بند کر دی گئیں۔ اردو اور انگریزی کا زور ہوا۔ مذہبی
علوم کی تعلیم ختم ہونے پر تشویش تھی ہی، اچانک حکومت نے اشتہار دے دیا
کہ جو شخص سرکاری سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ ہو گا یا فلاں فلاں علوم اور

انگریزی میں امتحان دے کر سند حاصل کرے گا اسے دوسروں کے مقابلے میں ملازمت کے لیے ترجیح دی جائے گی۔ اس طرح تعلیم کے متعلق بھی سوسائٹی پیدا ہوگا۔

جب انگریزی حکومت نے مذہبی تعلیم اسکولوں اور کالجوں سے خارج کر دی اور اس کی جگہ انگریزی زبان و علوم کو دے کر ملازمت کے سلسلے میں انگریزی تعلیم کو فوقیت اور اولیت دے کر مشرقی اور مذہبی علوم کو پامال کرنا شروع کیا تو اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ملازمت کے سلسلہ میں اپنے مقرر کردہ ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ کو لازمی قرار دیا۔ یہ امر متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نظر میں زخم پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا کیونکہ ہندو ہوں یا مسلمان سب ہی اس وقت ڈپٹی انسپکٹروں کو اپنے ملک اور اپنی اپنی قوم کے غدار انگریزوں کے ایجنٹ سمجھتے تھے اور انہیں کالا پادری کہا کرتے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اس امر کا یوں اظہار کیا ہے:

”دفترِ پیشکامہ گورنمنٹ سے استہار جاری ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا، وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکیٹ پر، جن کو ابھی تک سب لوگ کالا پادری سمجھتے تھے، منحصر ہو گئیں اور ان غلط خیالات کے سبب لوگوں کے دلوں پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہو گئی۔ اور لوگ یہ سمجھے کہ ہندوستان کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے کہ تاجمبور ہو کر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر و تبدل ہو جائیگا۔“

سر سید احمد خاں صاحب بہادر نے اپنی سرکارِ نامدارہ ابد پائدار کی صفائی پیش کرتے ہوئے اور ملک و ملت کے دین و ایمان کی تباہی و بربادی کی اسکیموں کی تائید و تصدیق کرتے ہوئے

اپنی انگریز دوستی اور اقتدار پرستی کا ایسا کھل کر ثبوت دیا کہ دین فروشوں کی علی الاعلان حکومت کی حمایت اور ملک و قوم کے خلاف بولنے کا دروازہ کھول دیا۔ چنانچہ موصوف اُس وقت خود ساختہ منصف بن کر یوں بیان داغتے ہیں:

”جو حقیقی بات یہ ہے کہ ہمارے عادل کانوں تک یہ خبر پہنچی ہے کہ اس ملک کے رہنے والے علوم و فنون اور انگریزی زبان حاصل کرنے کے اسکولوں کو اپنے مذہب و ملت کی تبدیلی کا سبب جانتے ہیں، اسی وجہ سے لوگ تحصیلِ علم و تکمیلِ فنون میں مستی کرتے ہیں، بچوں کو اسکولوں میں نہیں بھیجتے، یہ سب خیالات بد عقلی و کج فہمی کی وجہ سے ہیں۔“

انگریزی حکومت کی چال یہ تھی کہ جب اپنے کسی تخریبی منصوبے پر عمل کرنا منظور ہوتا تو اپنے دیسی ایجنٹوں سے اُس کے بارے میں تجویزیں پیش کروادی جاتی تھیں اُس کے بعد حکومت یہ کہہ کر احکامات جاری کر دیتی کہ ملک کے بعض اہل الرائے کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے ہم یہ حکم نافذ کر رہے ہیں۔ اسی طرح جب حکومت نے سررشتہ تعلیم کے ذریعے مشرقی علوم و السنہ کی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں میں برائے نام باقی رکھا ہوا تھا تو علیحدہ، معنی اقباب سرسید احمد خان صاحب نے یوں تجویز پیش کی تھی:

”سررشتہ تعلیم جو چند سال سے جاری ہے، وہ تربیت کے لیے ناکافی ہی نہیں بلکہ خراب کرنے والا تربیت اہل ہند کا ہے۔ اردو زبان جس کے وسیلے سے اکثر جگہ تعلیم جاری ہے، اس کی حالت ایسی نہیں جس سے تعلیم ہونا ممکن ہو۔۔۔۔۔ میری صاف رائے ہے کہ اگر گورنمنٹ اپنی شرکت دیسی زبان میں تعلیم دینے سے بالکل اٹھا دے اور صرف انگریزی مدرسے اور اسکول جاری رکھے تو بلاشبہ یہ بدگمانی جو رعایا کو گورنمنٹ کی طرف سے ہے، باقی رہے، صاف صاف لوگ جان لیں کہ سرکار انگریزی زبان کے وسیلے سے تربیت کرتی ہے

اور انگریزی زبان بلاشبہ ایسی ہے کہ انسان کی ہر طرح کی علمی ترقی اس میں ہو سکتی ہے۔ لہ

بعض حضرات آج تک یہ کہتے ہوئے نہیں چھوٹے کہ سر سید احمد خاں صاحب اردو زبانوں کے بہت بڑے حامی تھے اور آپ نے اس زبان کی بڑی خدمت کی تھی، ایسے حضرات ذرا آنکھیں کھول کر حیاتِ جاوید کے اس حوالے کو پڑھیں اور انصاف کو تہِ نظر رکھیں۔ مسلمان قوم کو بدلنے، اسلام سے نا آشنا کرنے اور نئی نسل کو دین سے ناواقف محض رکھ کر انگریزی کو اور بے راہ رو بنانے اور بنوانے میں کہیں بڑش گو رمنٹ کے ساتھ موصوف بھی پورے پورے شریک کار تو نہیں تھے؟ یہ فیصلہ کرنا قارئینِ کرام کا کام ہے، ہ

وہ یہ کہتے ہیں، بسا یا ہے بیاباں ہم نے

ہم یہ کہتے ہیں، اُجاڑا تھا گلستان کس نے؟

جب مذہبی تعلیم کو اسکولوں اور کالجوں سے قطعاً خارج کر دیا گیا تو دینی علوم حاصل کرنے والے مسلمان ملازمتوں سے محروم رہ کر در بدر کی ٹھوکریں کھانے لگے یا قوم کے رجم و کرم پر پلنے کے لیے کسی مسجد میں اڈھ جما کر بیٹھ جاتے راس کے برعکس جس نے انگریزی پڑھی ہوتی، اُسے کالے پادریوں (ڈپٹی انسپکٹروں) سے ملازمت کے لیے سرٹیفکیٹ مل جاتے اور خاصی گزربسر کرتے نظر آتے۔ ان حالات میں کون سا والد ہے جو اپنے بچوں کو بے روزگار دیکھنا چاہتا ہو؟ اُنھیں در بدر کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہو؟ اگرچہ دوسری طرف ایمانی غیرت اور دینی حمیت دامن جھٹکتی تھی لیکن اولاد کی خوشحالی اور بدحالی کے جو مناظر روزانہ نگاہوں کے سامنے آ رہے تھے اُن کے سپیش نظر اکثر حضرات نے اپنے بچوں کے لیے اسکولوں اور کالجوں کا راستہ ہی اختیار کیا جیسا کہ آزاد ہونے کے بعد سے ملکِ خدا پاکستان میں بھی کمالِ سعادت مندی اور فرمانبرداری کے ساتھ انگریزوں کی اسی اسلام دشمن پالیسی پر متواتر پچیس سال سے آج تک عمل ہوتا آ رہا ہے۔

بہر حال یہ راستہ اختیار کر کے ملازمت تو مل جاتی تھی۔ یہ تعلیم معاش کا ایک ذریعہ ضرور ہو گئی تھی لیکن جب یہ نوہمال اسکولوں اور کالجوں کی چار دیواری سے فارغ التحصیل ہو کر ملتے تھے تو وہی کچھ بن کر نکلتے تھے جو انگریز انجینئرز بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ مسلمان عیسائی بننے پر تو آمادہ نہ ہوئے اور انگریز اپنے اس مقصد میں واقعی ناکام رہے لیکن حکومت نے اپنا مقصود دوسری طرح حاصل کر لیا کہ ان کی تعلیم حاصل کرنے والی نئی نسل کی اس انداز سے اپنی تربیت شروع کر دی، گفتار و کردار اور غور و فکر کے زاویے اس طرح بدل دیے کہ عاتق مسلمان کے علاوہ ان کے مسلمان ہونے کا ثبوت شاید ہی کوئی ملتا تھا۔ گویا عیسائی بننے کو حقیقی مسلمان بھی نہ رہنے دیا۔ یہ تھا برطانوی منصوبہ جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں خصوصاً مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹانے اور اسلام کے عیدم النظیر فیوض و برکات سے روم رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔

۱۸۵۷ء کا ٹکراؤ: انگریز جس طرح ملک کے بلا شرکتِ غیر حاکم بنے، دولت لوٹی، ان کی صنعتیں تباہ کیں، پاک و ہند کے باشندوں کی پشت پالشت کے گاڑھے خون سینے کی کمائی سے جس طرح اپنے قلاش ملک انگلستان کو غوثحال اور صنعتی بنادیا، ان میں خیم دوسرے سے گہرا تھا۔ اہل ملک کو تڑپانے کے لیے ان میں سے ایک ظلم بھی کافی تھا، ان پے درپے مظالم کے پہاڑ ڈھائے جا رہے تھے اور خون کا گھونٹ پی کر مظلوم سستے رہتے تھے۔ مگر جب پاک و ہند کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے پروگرام پر عمل شروع تو مظلوم بلبلائے لگے۔ حکومت کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے نقطہ عروج پر پہنچے۔ اس ستم بالائے ستم نے غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑادی، پورا ملک ایک آتش فشاں بن گیا صرف کسی خاص بہانے کی ضرورت تھی کہ چربی والے کارتوسوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کیا۔ فوجیوں کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو جو کارتوس دیے جاتے ہیں ان پر خنزیر کی چربی اور فوس کو دیے جانے والے کارتوسوں پر گائے کی چربی لگائی جاتی ہے۔ چونکہ یہ کارتوس ان سے لگائے بغیر چل نہیں سکتے تھے لہذا ہندو اور مسلمان فوجیوں کا یہی خیال تھا کہ اس جتنے سے حکومت ان کے دھرم اور ایمان کو خراب کرنا چاہتی ہے اور ان کے جذبات کو

ٹھیس پہنچا رہی ہے۔ میرٹھ چھاؤنی کے بعض سپاہیوں نے وہ کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو انھیں اطمینان دلانے کے بجائے نشتر اقدار میں بدست رہنے والے افسروں نے اُن کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک کیا۔ اس امر کا تذکرہ جناب غلام رسول مہر نے مؤرخانہ انداز میں یوں کیا ہے :

”۹ مئی کی صبح طلوع ہوئی۔ دیسی رسالے کو پیل پرٹیک کے میدان میں آنے کا حکم مل گیا۔ یورپی فوج کو اور توپ خانے کو اس طرح کھڑا کیا گیا کہ اگر کوئی سپاہی مزاحمت کی خفیف سی بھی حرکت کرے تو توپوں کے منہ کھول دیے جائیں اور سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ سپاس مجرموں کو دھجھوں نے میرٹھ چھاؤنی میں ۲۴ اپریل ۱۸۵۷ء کو چربی والے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جنھیں انگلیز سزائے موت کا حکم سنا چکے تھے، پہرے میں لایا گیا۔ پرٹیک کے میدان میں پہلے اُن کی وردیاں اتاری گئیں، پھر لوہاروں کو حکم دیا گیا کہ ان مجرموں کو بٹیاں پہنائی جائیں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ کیٹی نے لکھا ہے : ”یہ منظر بڑا دردناک تھا۔ اُن بد نصیب آدمیوں کے یاس انگیز اشارے دیکھ کر بہت سے لوگوں کے دل میں ہمدردی کے جذبات متحرک ہو گئے۔ اُن میں ایسے بھی تھے جو فوج کے گلے سرسبد سمجھے جاتے تھے۔ وہ سپاہی جنھوں نے حد درجہ امتحانی حالات اور اجنبی مقامات میں حکومت برطانیہ کی خدمات انجام دی تھیں اور اُن کی وفاداری میں کبھی تزلزل نہ آیا تھا۔ قیدی ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور بلند آواز کے ساتھ جرنیل سے التجائیں کر رہے تھے کہ ہم پر رحم کیجیے اور ایسی ذلت خیز سزا نہ دیجیے۔ جب انھیں اُمید کی کوئی بھی کرن نظر نہ آئی تو وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بڑا بھلا کہنے لگے کہ کیوں چپ چاپ کھڑے ہمیں ذلت کا نشانہ بنتے دیکھ رہے ہو؟“

ظاہر ہے کہ گرویش توپیں لگی ہوئی تھیں اور اُن کی امداد کے لیے ایک بھی حرکت سب کی یقینی موت کا باعث بن سکتی تھی۔ لہذا اگرچہ دلوں میں غیظ و غضب کا

طوفانِ ملامت تھا، تاہم صبر و ضبط کے سوا چارہ نہ تھا۔ ذمہ دار انگریزوں نے بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ فعل سراسر احمقانہ تھا اور اس درجہ احمقانہ جو تصویریں نہیں آسکتا۔ ۱

موصوف نے اُس جرنیل کے اسی احمقانہ فعل کے بارے میں فارسٹ جلد اول صفحہ ۳۴ کے حوالے سے اُس وقت کے انگریز گورنر جنرل کے تاثرات یوں پیش کیے ہیں:

”آدمیوں کو پرڈ میں بیڑیاں پہنانا جس میں کئی گھنٹے صرف ہوئے اور اُن لوگوں کی موجودگی میں سب کچھ کرنا جن میں سے بہتیروں کی طبیعتیں برگشتہ تھیں اور وہ کارتوسوں کی داستان کو درست سمجھتے تھے، یقین ہے کہ اس سے پرڈ کے دل پر سخت ضرب لگی ہوگی۔ فوج کے مزاج اور اُن لوگوں کے جُرم کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے انھیں ایسی رسم کی بجا آوری کے بعد محض دیسی گارو کی حفاظت میں جیل بھیجنا ناقابلِ تصور حماقت تھی۔“ ۲

یہ ہیں گورنر جنرل کے تاثرات۔ جب حکومت ایسی عیار اور ظالم ہو تو لاداکھوں نہ پکتا۔ میرٹھ چھاؤنی میں مذکورہ برطانوی جرنیل نے فوجیوں پر وہ قیامت خیز ظلم ڈھایا کہ مظلوموں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ابتداء میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی۔ ۱۰ مئی، ۱۸۵۷ء کو وہاں فوج نے بغاوت کر دی۔ انگریزوں کی فوج سے تصادم ہوا۔ جنگل کی ہوا کی طرح یہ خبر دوسری چھاؤنیوں میں پہنچی اور وہاں بھی دیسی اور پردیسی فوجیں ہم دست و گریباں ہوئیں۔ فوجوں کی طرف دیکھ کر بھڑکے ہوئے عوام بھی اپنے غصے کی آگ کو ٹھنڈا کرنے اور ظالم حکمرانوں سے بدلہ لینے میں شریک کار ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک میدانِ کارزار بن گیا۔ دیسی اور پردیسی، محکوم اور حاکم، مظلوم اور ظالم آپس میں اس طرح ٹکرائے کہ ایک فریق کی محفلِ تباہی یقینی تھی۔

اس مسلح اور بھرپور تصادم کا نتیجہ صاف نظر آ رہا تھا کہ پاک و ہند کی سرزمین پر حکومت کرنے کا انگریزی کارنامہ چند روز میں حرفِ غلط کی طرح ٹٹے والا تھا۔ کتنے ہی مقامات پر دیسی فوجوں کا قبضہ ہو گیا اور انگریزوں کا کسی شہر پر قبضہ باقی رہ جانا تو دور کی بات ہے یہ معلوم ہونے لگا تھا کہ شاید ایک بھی انگریز واپس برطانیہ جانے کے لیے زندہ و سلامت نہ بچ سکے گا لیکن بعض ملک دشمن اور ملت فروش عناصر نے تن من دھن کی بازی لگا کر اپنے آقاؤں کی بیڑی بنا دی، اُکھڑی ہوئی حکومت پھر جہادی اور اس طرح ہزاروں برادرانِ جعفر و صادق نے اپنے عمل سے ملت فروش ہونے پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔

صوبہ یوپی سے انگریزی اقتدار کا جنازہ سب سے پہلے نکالا گیا اور جگہ جگہ قومی پرچم لہا دیے گئے، لیکن اُن خماں نصیبوں کو کیا معلوم تھا کہ انگریزوں کے بعض ہی خواہ، چند سکوں پر کھانپنے والے ملک دشمن اور ملت فروش عناصر اس خوشی کو پھر مایوسی میں تبدیل کر دیں گے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال کے لیے انگریزوں کو پاک و ہند کی قسمت کے مالک بنائے رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انگریزوں کی حمایت میں خود اپنے بھائیوں کا خون اس جرم کی پاداش میں اپنے ہاتھوں بہائیں گے کہ وہ ایک غیر ملکی ظالم قوم کی غلامی سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ میان محمد شفیع نے صوبہ یوپی کے حالات کا نقشہ اپنے الفاظ میں یوں کھینچا ہے :

”حقیقت یہ ہے کہ اس ساری تحریک کا مرکز یوپی تھا، جس کا کونا کونا سنگ اُٹھا، جس کے ایک ایک دل سے انگریزوں کے خلاف لاوا پھوٹ بہا۔ جس نے ملک اور دین کے لیے جان و مال، عزت و آبرو، محبت، شفقت، دنیا طلبی، حرص، لالچ، مال اندیشی، بہتری، یہود، ہر چیز کی بازی لگادی۔ نہ ماضی کی شان کو دیکھا، نہ مستقبل کی تباہی کو سوچا، نہ جاگیروں پر نظر گئی، نہ دولت کا خیال آیا۔ شہر شہر، قصبہ قصبہ، گاؤں گاؤں آزادی خواہی میں بھڑک گیا۔ آبادیوں اور جنگلوں میں آگ لگ گئی۔“ لے

لے محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۹۵

جزل نجت خاں، خان بہادر خاں اور دیگر مجاہدین جنگ آزادی نے جس دانش مندی اور جرات سے بریلی شہر کو سب سے پہلے انگریزی تسلط سے آزاد کر دیا، وہ تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ بریلی کی اس شاندار اور جرأت مندانہ معرکہ آرائی کے بارے میں میاں محمد شفیع صاحب نے اپنے تاثرات کا ان لفظوں میں اظہار کیا ہے:

”آفرین ہے روہیلکھنڈ کے اُن مجاہدین پر جنہوں نے بریلی کے میدان میں شجاعت اور قربانی کی مثال قائم کی تھی اور بتا دیا تھا کہ مسلمان بیچارگی میں شیر نیستاں اور پیل دماں ہے جب وہ اللہ کے نام پر تلوار اٹھاتا ہے تو وہ کائنات کو ٹھکرا کر موت سے ہم آغوش ہو جاتا ہے۔ باطل کا ہجوم اُس کے ضمیر کو زیر نہیں کر سکتا۔ طاقت و جبروت کے سینے میں بچے ڈال دیتا ہے۔“

خان بہادر خاں صاحب نے بریلی کو فتح مندی سے ہمکنار کرنے کے بعد دیگر اضلاع اور خصوصاً دہلی میں بادشاہ کے پاس عرضداشت بھیجی۔ پاک و ہند کے باشندوں کو آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے گرایا اور سر توڑ کوشش کرنے کی ترغیب دلائی۔ میاں صاحب نے اس امر کا تذکرہ یوں کیا ہے:

”یہ ساری کوشش خان بہادر خاں اور اُس کے کارکنوں کی تھی کہ اتنی آسانی سے بیک وقت روہیلکھنڈ کا صوبہ آزاد ہو گیا۔ پھر اُس نے خود ایک عرضداشت بادشاہ کے پاس اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجی اور روہیلکھنڈ کے تمام اضلاع میں بھی شائع کی: ”ہندوستان کے رہنے والو! بڑے انتظار کے بعد ہماری آزادی واپس آگئی ہے۔ اب بتاؤ تم اسے قبول کرتے ہو یا رد کرتے ہو؟“ تم اس مبارک موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے یا اپنے ہاتھوں سے دے دینے پر تیار ہو اور فائدے کے خواہشمند نہیں؟“

بریلی اور اُس کے گرد و نواح کو انگریزی تسلط سے پاک کرنے کے بعد وہاں کا انتظام خان بہادر خاں کے سپرد کیا گیا اور ۱۸۵۵ء کی جنگ آزادی کا ممتاز مجاہد و مدبر، جنرل بخت خاں عازم دہلی ہوا۔ فوج، خزانہ اور سامانِ حرب و ضرب ساتھ تھا تاکہ بادشاہِ دہلی کی مدد کر کے مُغلیہ حکومت میں جان ڈالی جاتے۔ بریلی سے لاؤشکر سمیت بخت خاں کا جانا خود ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز حکومت میں کسی جگہ روکنے یا ٹھکانے کی سکت نہیں تھی۔ انگریزی طاقت چھوٹے چھوٹے اجزاء میں منتشر ہوئی پڑی تھی۔ لیکن اس مجاہدِ ملت کی اُننگیں اور آرزوئیں کامیاب ہوتے ہوئے ناکام ہو کر رہ گئیں۔ غلام رسول مہر نے ان حقائق کو یوں بیان کیا ہے :

”جنرل بخت خاں اور خوجوں میں پہنچا۔ وہ اپنے ساتھ منظم فوج لایا تھا اور اُسے چھ مہینے کی تنخواہ پہلے ادا کر دی تھی۔ ساز و سامان بھی لایا تھا اور روپیہ بھی خزانہ سرکار میں جمع کیا تھا۔ اُس میں جنگی اور انتظامی دونوں قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں۔ لیکن اُس کے پہنچنے سے پیشتر شہزادے تمام امور اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ بادشاہ نے اگرچہ بخت خاں کو پورے اختیارات دے دیے تھے لیکن شہزادوں کو کب منظور تھا اور کوئی اور شخص دہلی میں مختار بن جائے۔ وہ ہر کام میں روڑے اٹھاتے رہے یہاں تک کہ انتظام درست ہو ہی نہ سکا۔“

جنرل بخت خاں کی قابلیت کو میاں محمد شفیع صاحب نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

”بخت خاں میں دو باتیں جمع تھیں، اول تو وہ روہیلہ تھا، جو شجاعت و جانبازی کا سبب ہے، پھر یہ کہ اُس میں بادشاہی خُون بھی تھا، جس نے تحمل، شائستگی اور مزید شرافت کی خوبیوں سے آراستہ کر دیا تھا۔ باقی طبعی خوبیاں بھی اس اچھے روہیلے میں کسی سے کم نہ تھیں۔۔۔۔۔ انگریز نے اس کی دانائی اور فوجی شعور دیکھ کر تمام دیسی توپ خانہ اُس کے ماتحت کر لیا۔ جس بڑی کاہر سردار تھا وہ کارگزاری میں سب پر سبقت لے گئی تھی۔ غدر کے

قریب یہ لائقِ صوبیدار بدل کر اپنے باپ دادوں کے اصل وطن بریلی میں چکا تھا اور اس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ چکی تھی۔ بادشاہ بھی اس سے بے خبر نہ تھا۔ ۳۱۔ جون کو جب بریلی میں انگریزوں کا صفایا ہو گیا تو بخت خاں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، سات ہزار باقاعدہ سوار اور پیدلوں کی جمیٹیں اور کئی ہزار مجاہد لے کر مع سامانِ حرب ۲ جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی پہنچا۔^۱

مولانا احمد اللہ شہید مدرسی رحمۃ اللہ علیہ ایک متبحر عالمِ دین اور صاحبِ اجازت تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں آپ نے عیدمِ النظر جنگی کارنامے سرانجام دیے۔ جس فنی مہارت کے ساتھ مولانا نے انگریزوں کے مایہ ناز اور نچتہ کاریوں کو پکے درپے شکستیں دیں اور ان کے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا، وہ تاریخِ عالم کے جنگ آزمائہ جرنیلوں کی تاریخ کا ایک سنہرا اور تابناک ورق ہے۔ اس سلسلے میں میاں محمد شفیع یوں رقمطراز ہیں:

”۱۷ مئی ۱۸۵۸ء کو خان بہادر خاں اور باقی لیڈر بریلی سے نکل گئے (کیوں کہ انگریزوں نے حریت پسندوں کو شکست دے کر دوبارہ بریلی پر قبضہ کر لیا تھا) مولوی احمد اللہ شہید پھر شاہمان پور پہنچے۔ ان کی تیز نظر نے بجانب لیا تھا کہ انگریز وہاں تھوڑی سی فوج چھوڑ کر بریلی پر آئے ہیں۔ اُنھوں نے وہاں پہنچ کر اُس تھوڑی سی فوج کو مار بھگایا اور بریلی کی شکست کی تلافی کر لی۔ جنرل ہیل کو سخت ہزیمت دی۔۔۔۔۔ اب لڑائی کا رنگ یہ ہو گیا کہ سرکومن اودھ کو فتح کرتا تھا تو مولوی صاحب روہیلکھنڈ پر قبضہ جمالیتے تھے۔ وہ روہیلکھنڈ (بریلی) کو لیتا تھا تو یہ اودھ کو فتح کر لیتے تھے۔ اس پریشانی میں انگریز نے طے کیا کہ اس آہنی ہاتھ کو شل کر دینا چاہیے۔ اس بے مثل مجاہد سے جب تک چھپانہ چھڑایا جائے گا اُس وقت تک ساری کوشش بیکار ہے، اس کے سوا اور کوئی ایسا خطرہ نہیں، پھر بھی لڑائی میں قابو

پانا یا اس کو زیر کرنا مشکل تھا، اس لیے سوچ لیا کہ یہ کام غدار اچھی طرح
کر سکیں گے، لے

انگریزوں نے ”پاون“ نامی ایک ہندو راجہ سے ساز باز کی جس نے بچاؤ کے ہزار روپے انعام اپنے
کے بدلے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو اور حریت پسندوں کے عیدم النظیر جرنیل کو شہید کر کے،
پاک و ہند کی غلامی کے محض پر دستخط کر دیے۔ میاں صاحب نے مولانا احمد اللہ شہید رحمۃ اللہ علیہ کو
اُن کے مجر العقول کارناموں کے پیش نظر لڑیوں خراج عقیدت پیش کیا ہے :

آخر کار قوم اور دین کا سب سے بڑا مجاہد، ملک کی آزادی کا عظیم ترین حامی،
شجاعت کا شیر نیتاں، اُس آخری وقت کا سہارا، قتل و تدبر کا نمونہ، جنگی
چالوں میں انگریز کے جگر کو پگھلانے والا، عربم و استقلال کی چٹان، اسلام
اور مسلمانوں کا فخر، انقلابیوں کے ٹوٹے ہوئے دل کی جان، آزادی خواہوں کی
امیدوں کا روشن آفتاب، اس طرح اپنے ہی ایک غدار کے ہاتھ سے موت
کی وادی میں غروب ہو گیا۔“ لے

مولانا احمد اللہ شہید نے شاہجہان پور کے معرکے میں جس فراست، تجربہ کاری اور عزم و
استقلال سے انگریزوں کے ایک بائرناز سپہ سالار جنرل ہیل کو شکست فاش دی اور
اُس کے سارے جنگی منصوبوں کو خاک میں ملایا تھا، مولانا کی اس مہارت اور نرالی کارکردگی
پریلیس کے نبصرے کو میاں صاحب نے یوں نقل کیا ہے :

”مولوی کا یہ جملہ بالکل اچھوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی یورپ کا
جنرل لڑ رہا ہے۔“ لے

مولانا احمد اللہ شہید کی شہادت کا علم ہونے پر جو شمسرت میں ”ہومز“ نے اپنے خیالات کا

لے محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۸

لے ایضاً : ص ۲۵۹

لے ایضاً : ص ۲۰۸

یوں اظہار کیا:

”شمالی ہندوستان میں ہمارا سب سے بڑا دشمن، سب سے خطرناک انقلابی ختم ہو گیا ہے۔“

اودھ کے علاقے میں مدتوں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن وہاں جس استقامت اور پامردی کے ساتھ حریت پسندوں نے آزادی کی دولت حاصل کرنے کے لیے تن من دھن کی بازی لگائی اور ہر قسم کی تکالیف برداشت کر کے جنگ جاری رکھی، اُس پر خود میلیسن نے یوں تبصرہ کیا تھا:

”اودھ کے لوگ اپنے سپاہی بھائیوں کے شریکِ کار ہو گئے اور ملک کی آزادی کے لیے جانیں دے دیں۔ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اُنھوں نے کس عزم و ارادہ اور سرفروشی کے ساتھ ہم سے جنگ آزمائی کی، اصل یہ ہے کہ ہندوستان کے کسی حصے میں ایسی طویل اور استقامت آمیز جنگ نہیں ہوئی۔ ان تمام معرکوں میں اُس ظلم کی داستان (واجد علی شاہ کی معزولی) آگ لگاتی رہی جو ہم نے ۱۸۵۶ء میں کیا تھا۔ یہی خیال، یہی رُوح تھی جس نے اُن کے دلوں کو فولاد سے زیادہ مضبوط کر دیا تھا۔۔۔۔۔ شکستوں پر بھی اُن کا یہ حال تھا کہ جھوکوں مرجانے کو ہماری اطاعت پر ترجیح دیتے تھے اور اُن تمام طبقوں نے اُس آخری وقت میں خاموشی اختیار کی جب دنیا میں اُن کے لیے کوئی چارہ نہ رہا۔“

اودھ کے معزول حکمران واجد علی شاہ کی بیگم، حضرت محل، جس نے میدانِ جنگ تو کیا زندگی بھر محل سے باہر کی فضا بھی نہیں دیکھی تھی، چونکہ برطانوی مظالم سے سینہ فگار تھی، اسی لیے جب اس خاتون نے شمعِ حریت کے پروانوں کو سینہ سپر دیکھا، تو خاموش نہ بیٹھ سکی، برجیس قدر کی سرپرست بن کر، رعایا میں نئی رُوح بن کر میدانِ کارزار میں انگریزی فوجوں سے

معروف پیکار ہو گئی۔ میاں صاحب نے یوں اس امر کی وضاحت کی ہے:

”خیر اس بادشاہ کی کوتاہیوں کو اس کی ایک بیگم، حضرت محل نے اس طرح پورا کیا کہ انتقام کی آگ میں اگر دشمنوں کو نہ جلا سکی تو کیا، خود اس میں جل کر قوم کو سُرخ و کرگئی اور جو کچھ بادشاہ کو کرنا چاہیے تھا، اس کی کھنوں میں رہ جانے والی اس بیگم نے ہر طرح کی قربانی دے کر حق ادا کیا، حالانکہ کشتی بائی (جھانسی کی رانی) کی طرح نہ آزاد فضا کی چلی ہوئی تھی، نہ اس نے تیر و تنگ کا استعمال سیکھا تھا، نہ مردوں کے دوش بدوش رہی تھی، وہ تو شاہی محلوں کی پردہ نشین خاتون تھی۔۔۔ اس لائق بیگم نے اپنے بیٹے پر جس قدر کی برہنہ تھی لے کر محبوب علی کو نیا بت دی اور سب سے پہلے بادشاہ دہلی کو آزادی اودھ کی مبارک باد دے کر علاقے کے زمینداروں، جاگیرداروں، نوایوں اور راجاؤں کو خطوط لکھے۔ سب نے اطاعت میں تلوار اٹھالی اور سینہ سپر ہو گئے۔“

تیموری خون کا امین، شہزادہ فیروز شاہ ان انتہائی بگڑے ہوئے اور ناسازگار حالات میں بار اور اورنگ زیب کی یادگار ثابت ہوا۔ دہلی سے گوا یا رتک کے اکثر معرکوں میں حریت پسندوں کی مختلف جماعتوں میں شامل ہو کر مردانہ وار لڑنا اور شمعِ حریت کے پروانوں کو غاصب انگریزوں سے لڑا رہا۔ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر گیا کہ بابر کی شجاعت اور اورنگ زیب کی ایمانی فراست کا کم از کم ایک امین، ۱۷۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت مغلیہ خاندان میں ضرور موجود تھا۔ اس عظیم شہزادے کو میاں صاحب نے یوں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

”جس وقت غدر ہوا، اس سے پہلے ہی فیروز شاہ جج کے لیے گیا ہوا تھا۔ جب واپس آیا تو ساحل پر قدم رکھتے ہی انقلاب کی خبر کانوں میں پڑی اور یہ جو افر و شہزادہ دہلی پہنچ کر ہنگامہ دارو گیمیں کود پڑا، دادِ شجاعت دی اور جب دہلی پر انگریز قابض ہو گئے تو نہایت احتیاط کے ساتھ مشرقی دروازے سے

نکل کر بریلی کی طرف آگیا۔ بریلی کی جنگ کا عزیز معرکہ ختم ہوا تو راجا صاحب کے پاس جا پہنچا اور جب تانٹیا توپی ناگپور سے دوبارہ گوا لیا آیا ہے تو یہ اور نواب باندہ بھی اُس سے جنگوں میں آئے تھے۔ وہ (تانٹیا توپی) بھی گرفتار ہو کر پھانسی چڑھ گیا تو فیروز شاہ کچھ دنوں ادھر ادھر جھنک بھٹکا کر خوش قسمتی یا ہوشیاری سے بچ نکلا اور بچے چلا گیا۔ کہتے ہیں کہ وہیں باقی زندگی فقیرانہ حالت میں گزار کر دنیا کو رخصت کیا۔ رحمت ہو اُس باہمت شہزادے پر! لے

جھانسی کی رانی، لکشمی بائی نے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں عورت ہونے کے باوجود جس طرح مردانہ وار حصہ لیا اور اپنی حریت پسندی کا لوہا منوایا اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

لکشمی بائی بھی حضرت محل کی طرح محل کی راحتوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئی، ورنہ انگریز کے قدموں پر سر جھکا دیتی تو اُس کی زندگی کی راحتوں میں ذرا سا بھی شک نہ آتا۔ اُس نے جھانسی سے غاصب انگریز کو نکال دیا۔ اُس کے انقلابیوں نے ساگر، نوگاؤں، باندہ، بانا پور، شاہ گڑھ اور کرکی سے انگریزوں کا نام نشان مٹایا۔ رانی نے اس کے بعد امن و امان اور انتظام کی وہ یاقوت دکھائی کہ توگ حیران رہ گئے! لے

تانٹیا توپی برہمن نے جس شجاعت اور جوانمردی سے اس جنگ آزادی میں حصہ لیا وہ بھی حریت پسندوں کی تاریخ میں ایک امتیازی مقام رکھتا ہے۔ نامساعد حالات میں بھی مختلف انقلابی لیڈروں کے ساتھ مل کر اور تنہا انگریزوں سے اس طرح مقابلہ کرتا رہا کہ ستم پیشہ انگریزوں کو ناک چنے چوادیے۔ مولانا احمد اللہ شہید کے بعد تانٹیا توپی کی رزم آرائیاں، فنونِ حرب و ضرب کے لحاظ سے کسی بھی دوسرے انقلابی لیڈر سے کم حیرت انگیز نہیں۔ اس محبِ وطن برہمن کے کارناموں کا کرشمہ ملاحظہ ہو:

جنرل ونڈھم جس نے یورپ میں اپنی لیاقت دکھائی تھی، اُس وقت کان پور کی فوجوں کا کمانڈر تھا۔ تانتیا بھنہ نے جو کبھی نانا صاحب کا کلرک اور اب جنرل تھا، سوچ لیا کہ اب کان پور میں تھوڑی سی فوج ہے، جنرل ونڈھم پر ضرب لگانی چاہیے اور اپنی بے قاعدہ فوج لے کر جنرل ونڈھم کے مقابلے پر آگیا۔... باقاعدہ سخت گولہ باری شروع ہوئی۔ تانتیا نے اپنی فوج کو نیم دائرے کی شکل میں ترتیب دے کر بڑھنا شروع کیا۔ ونڈھم نے حلقہ توڑنے کی کوشش کی لیکن تانتیا کی توپوں نے معذور کر دیا۔... تانتیا کے دائرے نے گرفت کو زیادہ مضبوط کر لیا۔ شام کے چھ بجے تک انگریزی فوج نے پورے طور پر حوصلہ ہار دیا اور بہت سا سامان جنگ انقلابیوں کے ہاتھ آیا۔... دن نکلے ہی لڑائی شروع ہو گئی اور انقلابیوں نے دونوں پہلوؤں پر گولہ باری شروع کر دی۔ دایاں بازو بالکل اڑا دیا۔ برگنڈیر ولسن، کیپٹن ایم کری مارتی، میجر سٹرلنگ، میجر گین سب مارے گئے۔ تیسرے دن انقلابیوں کو مکمل فتح حاصل ہوئی۔ انگریزی فوج بالکل تباہ ہو گئی۔ اُس دن تانتیا کانپور سے کانپور پر قبضہ ہو گیا۔

متعدد بار حوصلہ شکن حالات سے بھی دوچار ہونا پڑا کیونکہ غداروں کی سرگرمیوں کے باعث ملکی حالات میں نشیب و فراز آتے رہا لیکن واہ رے بہادر بھنہ جو جذبہ حب الوطنی سے سرشار اور آزادی وطن کا دواہمانہ طلبگار تھا، بے سرو سامانی کی حالت میں بھی اُس کے عزائم متزلزل نہ ہوتے۔ مثلاً:

”تانتیا رانی جھانسی کے ساتھ مل کر انگریزوں سے لڑتا رہا اور جب یہ بہادر رانی جنگ آزادی میں ماری گئی تو اکیلا رہ گیا اور نانا صاحب سے بھی ساتھ چھوٹ گیا۔ نہ کوئی فوج تھی، نہ سامان تھا، پھر بھی پوری ہمت رکھ کر صاحب ریشیو کو ساتھ لے کر سرمتھورا (متوسط ہندوستان) میں جا بیٹھا اور غداروں کو

ٹوٹ کر کچھ سامان مہیا کر لیا۔ ۱

تانیٹیا، راؤ اور شہزادہ فیروز شاہ، جنہوں نے اپنی حریت پسندی اور جو انگریزی کا زندہ ثبوت اپنے عمل سے گھر میں بیٹھ کر نہیں، موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال ڈال کر مہیا کر دیا تھا، ان بہادروں کا انجام ملاحظہ ہو :

”۲۵ دسمبر، ۱۸۵۷ء کی رات کو دونوں نے میجر لاک کی فوج پر سخت شبخون مارا اور بالکل تباہ کر کے جنگل سے نکل گئے۔ شہزادہ فیروز شاہ بھی اپنی فوجوں سے آ ملا اور یہ سب اندر گڑھ میں جمع ہو گئے۔ انگریزوں نے ہر طرف سے گھیر ڈال لیا۔۔۔ جب یہ لوگ جنگل میں چھپے ہوئے تھے تو انگریز عیار نے مان سنگھ سے جو اس تمام دوردھوپ میں اُس (تانیٹیا) کا ساتھی تھا سازش کر لی اور اُس غدار نے جنگ آزادی کے اس ہیر و کو گرفتار کر دیا۔، اپریل کو تانیٹیا انگریزوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ تین دن مقدمے کی کارروائی ہوئی، پھر ۸ اپریل ۱۸۵۷ء کو پھانسی دے دی گئی۔ آخر وقت جب یہ بہادر تختے کے پاس پہنچا اور پھانسی دینے والے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے بڑھے تو اُس نے مسکرا کر کہا: ”اس تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ اچھل کر خود چھندا گلے میں ڈال لیا اور لٹک گیا۔“

راؤ صاحب ۲۱ اگست کو جنگلوں سے گرفتار ہوا اور پھانسی دی گئی۔ شہزادہ فیروز شاہ بچ کر نکل گیا اور مکے جا پہنچا۔ ۲

جب انگریزوں نے اپنے زرخیز غلاموں اور حلیفوں یعنی ملک دشمنوں اور ملت فروشوں کے سہارے انقلابیوں کا زور توڑ دیا اور تقریباً تمام بڑے بڑے شہروں پر دوبارہ قبضہ کر لیا، تو انقلابیوں کے چھوٹے چھوٹے باقی ماندہ جتنے ایک جگہ جمع ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ انگریزوں نے انہیں پسپا کرتے ہوئے نیپال کی ترائی میں دھکیل دیا۔ ان بہادروں نے اس

۱۔ محمد شفیع میاں : ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶۱

۲۔ ایضاً : ص ۲۶۳

بیچارگی اور کس مہمپس کی حالت میں بھی اپنے خون سے مادرِ وطن کی سرزمین کو لالہ زار تو کر دیا لیکن
برطانوی ٹپروں کے سامنے گردن نہ جھکائی۔ میاں صاحب اس امر کی یہ وضاحت فرماتے ہیں:

”نیپال کی ترائی اُن بہادروں کے خون سے رنگین ہو گئی، جنہوں نے اپنے ملک
کی آزادی کے لیے ہر عزیز سے عزیز چیز کی بازی لگا کر ڈھائی سال تک
انگریزوں کی طاقت کو ہلکان کیا تھا۔ بے سرو سامانی اور بد نظمی میں انتہائی معذوری
مجبوری اور بے بسی میں بھی اپنے ملک کی عزت کو بلند رکھ کر جانیں قربان کیں۔
ہر طرف سے مائوسی کے بادل سر پر منڈلاتے دیکھے۔ اہل ملک کی غداری سے
سارے سہارے ٹوٹ گئے۔ موت کے سوا کوئی آس ننگاہوں کے سامنے
نہ رہی، پھر بھی تلوار ہاتھ سے نہ رکھی اور غاصب، ظالم انگریز کے سامنے
سر نہ جھکایا۔ یہاں تک کہ ہمالیہ کے دامن میں آخری حملے کو کے خون میں نہاتے
اور زمین پر گر کر آنے والی نسلوں کو سعیِ آزادی کا پیغام دے گئے۔“

فاریں کرام! یہ تھا ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی کا ایک رخ۔ اب اسی تصویر کا دوسرا
رخ بھی ملاحظہ فرمایا جاتے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ ۱۸۵۷ء میں لاکھوں حریت پسندوں کا
خون کن منحوس چہروں کی وجہ سے رائیگاں گیا۔ وہ کون سے وطن دشمن اور ملت فروش عناصر تھے
جن کے باعث مٹھی بھر پردیسی پاک و ہند کے کروڑوں باشندوں کو دوبارہ طاقت کے ذریعے
غلام بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ مرزا الہی بخش کا کارنامہ ملاحظہ ہو:

”یہ (مرزا الہی بخش) شاہی خاندان کا بوڑھا، سمجھ دار آدمی، بادشاہ کا رشتے میں
چچا اور سمدھی تھا۔ بہادر شاہ اس سے تمام معاملات میں مشورہ لیتا تھا۔ اس
ظالم کو ملک و مذہب سے تو کیا ہمدردی ہوتی، خاندان کی بہتری سے بھی بے بہرہ
نکلا۔ انگریزوں کا پٹھو بن کر ٹمٹا دیا بھی بچھا دیا۔ ذرا سراسی خبریں پہنچائیں،
زینت محل کو سبز باغ دکھا کر ہم راتے کر لیا۔ حکیم احسن اللہ خاں پر بھی ڈور سے

ڈالے اور انقلابیوں کو بدنام کرتا رہا۔ ہر معاملے میں اُنھیں غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی تاکہ اُس کا انعام نہ مارا جائے۔

سب سے بڑا کارنامہ جو اُس نے کیا وہ یہ تھا کہ بادشاہ کو بخت خان کے ساتھ جانے سے روکا، پھر اپنی زندگی میں بادشاہ کو پکڑ دیا اور شہزادوں کی گرفتاری کے وقت بھی پہنچ کر اُن کو تسلیاں دیں اور ذبح کر دیا۔ چالاک اتنا تھا کہ سب پریشیہ کیے گئے اور گرفتار ہوئیں اور شور مچے لیکن یہ ہر طرح محفوظ رہا۔ نہایت چرب زبان اور سلجھا ہوا تھا۔ ایک اور ظلم اس نے یہ کیا تھا کہ جننا کا پل تڑوا دیا، جس کی وجہ سے انقلابیوں کی مشرقی رسد رسانی بند ہو گئی۔ انگریز نے بھی پیٹ بھر کے انعام دیے۔ دربار میں پہلی کرسی مقرر ہوئی۔ ۲۲۸۳۰ روپے سالانہ پنشن دی جو نسل در نسل تھی۔ بیوی کی الگ، لڑکوں اور لڑکیوں کی الگ، عزیزوں کی ان کے علاوہ۔ بعد میں مختلف تقریبوں پر اضافے ہوتے رہے۔ یہ ننگ خلف اپنے خاندان کی درگاہ حضرت سلطان جی میں رہا اور ۱۸۷۵ء میں مراۓ لے

بہادر شاہ ظفر کے معتاد و مشیر یعنی حکیم احسن اللہ خاں کی محسن کشی اور ملک دشمنی ملاحظہ ہو:

”بہت سمجھدار، تعلیم یافتہ اور معاملات میں بصیرت رکھنے والا آدمی تھا لیکن جس پر رجب علی اور الہی بخش کا جادو چلے، وہ غدار بن کرے یہ کیونکر ہو سکتا تھا؟ افسوس تو یہ ہے کہ جس پر بادشاہ اور عوام کو پورا اعتماد ہو، عزت سے وقت بھی گزر رہا ہو، ہر طرح کی دلجوئی بھی ہوتی ہو، وہ ملک اور قوم اور اپنے ولی نعمت سے بے وفائی برتے؟..... بادشاہ کے خلاف گواہی دی، اس سے زیادہ اور کیا کرتا؟“ لے

وہ نکال دیا گیا تھا اور نکال دیا جاتا۔

بھلا ہو میاں والی اور عیسیٰ خلی والوں کا، بھلا ہو پنجاب کے پھلنے پھوننے والے زمینداروں کا، بھلا ہو ریاست ہائے پھلکیاں کا اور سب سے زیادہ بھلا ہو سکھ قوم کا، جس نے صرف روٹی کے لیے انگریز کی غلامی کا پٹا گلے میں ڈال کر بڑی خوشی اور انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ اُس کی جڑیں پاتاں تک پہنچا دیں اور ملک کے آزادی خواہوں کے سینے پھلنی کر کے شہروں، قصبوں اور گاؤں کو لوٹ کر ہندوستان (پاک و ہند) کی پیشانی پر ہمیشہ کے لیے کلنگ کا ٹیکہ لگا دیا، اے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں صوبہ پنجاب نے جس طرح حصہ لیا اُس کے متعلق سر جان لارنس کی رپورٹ کا ایک اقتباس اور میاں صاحب کے اپنے تاثرات اور تحقیق ملاحظہ ہو:

”انگریز گوبی میں بے دست و پا ہو گیا تھا لیکن پنجاب اُس کے اثر میں تھا۔ پنجاب کے سکھ اور مسلمان فوج میں بھرتی کر لیے گئے تھے اور انھیں کے ذریعے وہاں کے جن اضلاع میں ہندوستانی فوجوں نے بغاوت کی اُن کو سختی سے تباہ کر دیا گیا۔ اب دہلی کا مرحلہ درپیش تھا اور اُس کے بعد ہندوستان کے اکثر حصوں میں اس آگ (تحریک آزادی) کو بجھانا تھا۔ بڑے پیمانے پر بھرتی شروع کی گئی اور لوگ بہت خوشی کے ساتھ انگریز کے دست و بازو بن کر ہندوستان کی طرف چل پڑے۔ اُن کی کیا نیت اور کیا ارادے تھے، کس خیال پر اتنی آسانی سے شرکت کی؟ سر جان لارنس کی زبانی سنیں، وہ غدر کی رپورٹ میں لکھتا ہے: ”پنجابی ہمارے ساتھ ہو گئے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کو اپنی برتری کا احساس تھا اور پنجابی خیال کرتے تھے کہ ہم اُن سے بہتر ثابت ہوں گے۔ اسی بنا پر خیال کرتے تھے

کہ جس روٹی کو ہندوستانیوں نے ٹھکرا دیا ہے، وہ اب ہمارے حصے میں آئیگی،
اُس کے ہم ملک نہیں گئے۔^۱

جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء میں صوبہ پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں نے حریت پسندوں کا
ساتھ دے کر انگریز کی غلامی کا جو اتار پھینکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس جب
اکثر شہروں اور علاقوں سے برٹش اقتدار کا جوازہ نکل چکا تھا، تو صوبہ پنجاب کے باشندوں نے
چند سکوں اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر برطانوی ڈاکوؤں کے دست و بازو
بن کر حریت پسندوں کو کچلنے اور انگریزی اقتدار دوبارہ بحال کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ
کیا۔ اس صوبے کا کارنامہ یوں بیان کیا گیا ہے :

”پنجاب کی عدم شرکت کا ایک عذر یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ سکھوں کے ظلم نے
اس قابل نہ چھوڑا تھا کہ بغادت میں حصہ لیتے۔ اُن کا ملکی و قومی شعور مدہ کر گیا تھا۔
شاید یہ صحیح ہو، کیونکہ دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ جب انگریز نے بھرتی کی تحریک شروع
کی تو سب لبیک کہہ کر دوڑ پڑے تاکہ لوٹ میں شریک ہو کر ہندوستانیوں سے
بدلہ لیں۔ پھر انگریز کے دست بدست اُن کے سب مظالم میں حصہ لیا اور کسی
بُرے سے بُرے فعل سے بھی اجتناب نہ کیا اور نہ شرم محسوس کی اور نہ دل
میں یہ خیال گزرا کہ اُن بھائیوں پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں جو اپنے لیے نہیں،
اپنی قوم اور مذہب کے لیے ایک غیر قوم سے لڑ رہے ہیں۔“^۲

پنجاب کے مشہور نوانہ خاندان نے جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء میں خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا
پارٹ ادا کیا تھا۔ لیکن میاں محمد شفیع نے اپنی ذاتی تحقیق کی بنا پر یہ رائے پیش
کی ہے :

”مئی، ۱۸۵۷ء میں تین سو سو اوروں کا دستہ بھرتی کر کے جہلم میں پلٹن نمبر ۱۴

کے باغیوں سے لڑا پھر لالہ کوپر کے ساتھ مل کر نمبر ۲۶ کے باغیوں سے چال بازی کی اور اُن کو گرفتار کرایا اور اجنلے کا کنواں آزادی خواہوں کی لاشوں سے پاٹنے میں اس کا ہاتھ تھا۔ اس کے بعد مختلف علاقوں میں بہت کارگزاریاں کیں۔ تانیا کے مقابلے میں کالپی کا میدان انقلابیوں کے خون سے رنگین کیا اور وہاں سے جنرل نیئر کے ساتھ دسٹریکٹ ہند کے جھگڑے منٹائے۔

پنجاب میں واپس آکر خان بہادری کا خطاب چار سو اسی روپے کی پنشن اور بارہ سو روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ اپنی محنت اور جستجو سے بہت سی زمین حاصل کر کے دریا تے جہلم سے نہر تک کھدوائی۔ گھوڑوں کی نسل کو قابل رشک ترقی دی۔ خاندانی جھگڑوں سے الگ تھلگ رہا۔ عزت پائی اور اسے سی۔ ایس۔ آئی کا خطاب ملا اور آخر میں تمام جائداد ملا کر ایک اچھی خاصی ریاست ہو گئی اور صرف تدبیر سے شاہ پور کا نہیں بلکہ پنجاب کا ایک رئیس اعظم بن گیا۔ بارے مجاہد وطن اور جاں نثارانِ دین و ملت کے خون کی سیبا ہی کہاں جاسکتی ہے؟ اے

لاہور کے قزلباش خاندان کے بارے میں بھی میاں صاحب کی ایسی ہی تحقیق ہے۔ معلوم نہیں اُن کے پاس کیسے دلائل تھے؟ اُن دلائل میں کتنا وزن ہے؟ بہر حال اُنھوں نے لکھا ہے:

”علی رضا خاں قزلباش۔ اس نے غدر میں دہلی کے قریب ایک رسالہ بھرتی کیا اور جائداد بیچ کر خرچ بھرا۔ اُس میں اس کے چاروں بھتیجے (بلکہ پانچوں) عبداللہ خاں، محمد حسن خاں، محمد زمان خاں، غلام حسین خاں اور شیر محمد خاں بھی تھے۔ اس فوج نے نکلسن کی نمایاں خدمات انجام دیں اور بہت شجاعت دکھائی۔ محمد رضا خاں اس کا بھائی بہت دلیر تھا۔ مالوے اور شمس آباد میں

دو مرتبہ زخمی ہوا اور دو گھوڑے مرے۔ سخت معرکوں میں بے محابا گھس جاتا تھا۔ اس لیے آرڈر آف مبرٹ حاصل کیا۔ سردار بہادری کا خطاب اور دو سو روپے پنشن علی الدوام ملی۔ علی رضا خاں کو بھڑائیچ اور اودھ میں تعلقداری ملی، خان بہادر کا خطاب پایا اور تمام بھائیوں کو خان بہادری کے خطاب ملے۔ ۱۸۶۲ء میں علی رضا خاں کو نوابی کی عزت بخشی گئی۔ اس کے بڑے بیٹے نواز ش علی خاں کو مختلف اعزاز بخشے گئے اور باپ کے بعد نوابی کا خطاب ملا۔ دوسرے بیٹے ناصر علی خاں کو بعد میں اسٹنٹ کمشنر بنایا گیا۔ نواز ش علی خاں نے خدمتِ خلق سے بڑی عزت پائی اور لاہور کا سب سے بڑا آدمی ہوا، بلکہ پنجاب کے چوٹی کے رئیسوں میں شمار ہونے لگا۔ سی۔ آئی۔ امی کا خطاب بھی پایا۔ بعد میں چھوٹا بھائی ناصر علی خاں نواب ہوا اور عزت سے کارگزاریاں دکھا کر ۱۸۹۶ء میں مرا۔ فتح علی خاں نے اس کی جگہ لی، جو بھتیجا تھا۔ یہ نواب بھی اطاعت و فرماں برداری سے انگریز کے نزدیک سر بلند و باوقار رہا۔ ملے

نشاہد ایسے ہی کارہائے نمایاں سے متاثر ہو کر دیوبندیوں کے امیرِ شریعت اور شعلہ بیان خطیب یعنی مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری (المتوفی ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء) نے بقول علامہ خالد محمود صاحب سرزمینِ پنجاب کی یوں منظوم تحریف فرمائی ہے:

نہدیم کشورے مردود و مرتاب	بہ شوی ہائے کفر آباد پنجاب
چہ ملکہ ننگ و عارے ہفت کشور	ز شرق و غرب بادش خاک بر سر
خبر طینتش مردم کشی ہا	ز قتلِ مسلمش باشد خوشی ہا
چہ پیرانش مریدانِ فرنگی	لقب کافر و ذاتِ پاک زنگی
ز نواب و رئیسانش چہ پرسی	سگ و سگ زادگان کرسی بہر سی
چناں فرزند ناہموار زاید	کہ از خرقمیش برتر نباید

چکداز لالہ اشغون مسلمان اردو نالال حجاز و مصر دایراں
 جواناش عسلمانِ فرنگی پناو شاں بدامنِ فرنگی
 چہ پنجاب آن فرنگی را معسکر معسکر را غلام احمد سمیہ
 ضلالت را پیمبر هست پنجاب فرنگی را معسکر هست پنجاب
 فضائش کفر ریز و کفر بیز است بہ آئین الہی در ستیز است
 زمینِ فتنہ زائے فتنہ خیز

کہ شیطان پیش پائش سجدہ ریزے ۱

۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو کہاں کہاں سے بھرتی کرنے کے لیے جوان ملے، جن کے بل بوتے پر حریت پسندوں کو بُری طرح کچل کر برٹش گورنمنٹ کو دوبارہ استحکام نصیب ہوا تھا، ملاحظہ ہو :

”یکم اپریل ۱۸۵۸ء تک انگریزی فوج کی تعداد چھیانوے ہزار تک پہنچ گئی۔
 سکھ، پٹھان اور پنجابی مسلمان بھرتی ہو ہو کر آ گئے۔ راجاؤں اور نوابوں
 نے بھی اپنی فوجیں بھیج دیں۔ اس طرح بے شمار فوج جمع ہو گئی اور چاروں طرف
 پھیل کر انقلابیوں کا صفایا بول دیا۔ لیو گارڈ اور ڈگلس، بہار کی طرف
 چلے گئے۔ سر ہنری لارنس نے نیپال سے شروع ہی میں مدد منگالی تھی
 اور جنگ بہادر غدار نہایت خلوص اور پابوسی سے پانچ ہزار گورکھوں کے
 ساتھ لکھنؤ پہنچ گیا۔“ ۲

مشرقی پنجاب میں پٹیا لہ، نا بھہ اور جیند وغیرہ سکھوں کی ریاستیں تھیں یہ ریاستیں
 آزادی وطن کی تردید سے دشمن نکلیں۔ انگریزوں کی حمایت میں حریت پسندوں کے خلاف
 بڑھ چڑھ کر کارنامے دکھائے۔ انقلابیوں پر دل کھول کر ضرر پہن لگائیں اور انگریزوں سے

۱۔ عبد الرشید ارشد، مولوی، بنیں بڑے مسلمان، ص ۸۱

۲۔ محمد شفیع میاں، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۵

بھی بڑھ کر مظالم کے پہاڑ ڈھالتے۔ ان کے کارہائے نمایاں کی کہانی پنجاب کے مشہور مورخ جناب غلام رسول مہر کی زبانی سماعت فرماتے:

”ان ریاستوں کو موقع حاصل تھا کہ انقلاب کی بنیادیں مستحکم کر دیتیں یا اسے ختم کر ڈالتیں۔ یہ انبالہ اور دہلی کے درمیان واقع تھیں اور ان کی امداد کے بغیر انگریزوں کا عقب حفاظت سے بالکل محروم تھا۔ اگر یہ ریاستیں خاموش بھی بیٹھی رہتیں تو اس حالت میں بھی انقلاب کی کامیابی کے خاصے امکانات موجود تھے لیکن جب پٹیلہ، نا بھہ اور جیند نے انقلاب پر انگریزوں سے بھی زیادہ بے دردی کے ساتھ ضربیں لگانی شروع کیں تو دہلی اور پنجاب کے درمیان تعلقات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ان ریاستوں نے شہنشاہِ دہلی کی دعوت ٹھکرائی جو سوارِ پیغام لے کر آئے تھے انھیں قتل کر دیا۔ اپنے خزانے انگریزوں پر نثار کیے، اپنی فوجیں جمع کیں، جن علاقوں میں سے انگریزوں کو گزرنا تھا انھیں بچائے رکھا، پھر انگریزوں کے ساتھ ہو کر دہلی پر حملہ کیا، لے

ان ریاستوں کی مذکورہ کارکردگی پر موصوف نے یوں تبصرو کیا ہے:

”جیند، نا بھہ اور پٹیلہ کے علاقے ایسی جگہ واقع تھے کہ اگر وہاں کے رئیس ذرا صبر کرتے تو دہلی سے ستلج کا پورا علاقہ انگریزوں کے لیے غیر محفوظ ہو جاتا اور انبالہ بھی خطرے میں پڑ جاتا۔ اگر وہ قومی آزادی کی جنگ میں معاون بن جاتے تو انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے دستے بکھرے رہتے اور ان کے لیے اکٹھے ہونے یا آپس میں سلسلہٴ محابرت قائم کر لینے کی کوئی صورت نہ تھی اور وہ یقیناً مارے جاتے۔ اس کے بعد انگریز انگلستان سے بڑی فوج لا کر ہندوستان کو از سرِ نو فتح کرنے کے لیے اگر کوئی قدم اٹھاتے تو یقیناً امن میں کامیاب ہونا آسان نہ رہتا، لیکن ان سکھ ریاستوں کی انگریز دوستی اور

وطن دشمنی نے صورت بگاڑ دی“ ۱

سکھوں کی وطن دشمنی اور انگریز دوستی، جو اس موقع پر واضح ہوئی وہ قومی لحاظ سے پاک و ہند کی تاریخ میں ایک امتیازی کارنامہ ہے کیونکہ پوری سکھ قوم انگریزوں کی دوستی ہوئی ناؤ کو بچا کر سارے پر لگانے کی غرض سے آزادی چاہنے والے مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف صف آراء ہو گئی، مثلاً:

”سکھوں نے اس اہم موقع پر جبکہ مذہب و ملت کے درونے ہر ہندوستانی کے دل کو آگ بگولہ بنا دیا تھا، خاص طور پر خلوص کے ساتھ انگریز کی غلامی کو راحت سمجھ کر گلے میں ڈالا اور دست و بازو بن کر ہندوستان کے دل پر ضربیں لگائیں، جیسے خاص اسی کام کے لیے پیدا ہوئے تھے، اور تو اور اپنی رانی مائی جنہاں کا بھی انگریزوں کے لیے مقابلہ کیا۔ دہلی میں آکر تو گویا حق نمک ادا کر دیا۔ بڑی بڑی قربانیاں دیں اور باغیوں کو ذاتی دشمن سمجھ کر لڑے“ ۲

انگریزوں نے سکھوں کو حریت پسندوں کو کچلوانے اور خاص طور پر ان سے تخت دہلی اور مسلمانوں کو نیست و نابود کروانے کی غرض سے عیارانہ طریقے پر اشتعال انگیزی کی، اس بابا بازی کا ذکر میاں صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”انگریزوں نے سکھوں کو بھڑکانے کے لیے ایک عجیب چال چلی۔ وہ یہ کہ بادشاہ دہلی کی طرف سے ایک جھوٹا اعلان چھپوا دیا کہ سب کاموں سے پہلے باغیوں کا یہ فرض ہے کہ سکھوں کو تباہ کر دیں۔ سکھ پہلے ہی وطن پرستی سے خالی تھے، اس تحریک سے کوئی بھہر دی نہ تھی، اس اعلان سے اور بضد ہو ہو کر بھرتی ہوئے تاکہ دہلی اور دہلی والوں سے خوب بدلہ لیں“ ۳

۱۔ غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۹۹

۲۔ محمد شفیع میاں: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۲۰۳

۳۔ ایضاً: ص ۱۹۸

پال دہند کے مختلف گوشوں میں پنجاب کے مسلمانوں اور سکھوں نے جو کارنامے انجام دیے اُن کی ایک جھلک پیش کی جا چکی۔ پنجاب کے اندر جو دوسرے صوبوں کے فوجی مختلف چھاؤنیوں میں تھے، جب اُنھوں نے برٹش گورنمنٹ کے خلاف علمِ جہاد بلند کیا تو اُن مسئلہ حریت پسندوں کے ساتھ پنجاب میں جو سلوک ہوا وہ ملاحظہ فرمائیے :

”پنجاب میں بھی فتح کے بعد پوریوں ہی کی پلٹیں پشاور تک پھیلی پڑی تھیں وہ ہر جگہ بڑیں لیکن انگریز یہاں معذور و مجبور نہ تھا۔ ملک (پنجاب) کے لوگ اُس کے دستِ مبارک سے ہر جگہ اُن کو کچل دیا گیا۔ باقی مقامات سے پلٹیں پہنچتی رہیں، فیروز پور سے بھی قریب ہونے کی وجہ سے پہنچیں“ ۱۔

نواب احمد علی خاں منڈل نے اس جنگِ آزادی میں جو کارنامہ انجام دیا اُس کی ایک جھلک بھی ملاحظہ ہو :

”منڈل خاندان کا نواب (احمد علی خاں) جس کی خدمات کی تعریفیں لارڈ کیننگ تک نے کیں۔ سالانہ پانچ سو روپے لگان کے ادا کرتا تھا، وہ ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا گیا، اس لیے کہ اُس نے غدر میں انگریز کی ایسی مخلصانہ مدد کی کہ ملکہ و کٹوریہ کا بیٹا بھی نہ کرتا“ ۲۔

جن حضرات کی انگریز دوستی اور ملک دشمنی کی طرف سطور بالا میں اشارات کیے گئے۔ ان مقصود کسی پر کھڑا اچھا لانا یا کسی کو بدنام کرنا نہیں، بلکہ ان حضرات کا ذکر ضمناً اس وجہ سے آگیا ہے کہ مٹھی بھر انگریزوں نے جس طرح سرزمینِ پاک و ہند پر قبضہ جمایا، مدتوں یہاں باشندوں پر حکومت کرتے رہے، کتنے ہی اہم ترین مواقع پر ناممکن کو ممکن کر دکھانے اُن کے اندر جو صلاحیت تھی اُس صلاحیت کے دو جز ہیں، ایک یہ کہ اُن کے اندر ایجنہ تلاش کرنے اور اُن کے ذریعے سازشوں کا جال پھیلانے کی بڑی مہارت تھی اور دوسرا

جُزیہ ہے کہ ملک کے اندر ایسے حضرات کی کوئی کمی نہیں تھی جو انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ہر بڑی سے بڑی چیز قربان کر دیا کرتے تھے۔ برٹش گورنمنٹ کی ساری کامیابیوں کا راز دراصل ان حضرات کی ملک دشمنی، پیٹ پرستی اور ملت فروشی کی مرہون منت ہے۔ یہاں صرف اُن حضرات کا تعارف منظور تھا جن کی بدولت برطانوی یہاں اپنی حکومت قائم کرنے اور مٹھی بکھرنے کے باوجود اپنا قبضہ و اقتدار ایسے وسیع و عریض ملک پر برقرار رکھنے میں کامیاب و کامران رہے۔ ملک اور قوم کا اپنے ذاتی اور گھٹیا مفاد پر سودا کر نیوالوں کی نشان دہی کر دینا بھی انگریزوں کی عیاری اور مظالم کے ساتھ لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ

لاؤ تو قتل نامہ ذرا ہم بھی دیکھ لیں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

اس تحریک آزادی کے دوران اور دوبارہ غلبہ پالینے کے بعد انگریزوں نے اہل ہند کے ساتھ عموماً اور مسلمانوں کے ساتھ خصوصاً کبے کبے ظلم و ستم روا رکھے اور تاریخِ عالم کے بے رحم ترین حکمرانوں کو بھی غرور مند کر کے کس طرح امتیازی مقام حاصل کیا؟ اس کے ثبوت میں چند ننگِ اساتید اور وحشیانہ مظالم کے واقعات پیش کرتا ہوں۔ جب مرزا الہی بخش نے منگل شہزادوں کو ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار کر دیا، تو جنرل ہوڈسن نے اُن کے ساتھ کیا سلوک کیا:

”شہزادے رتھ پر سوار اور سواروں کے حلقے میں چلے آ رہے تھے۔ جیل خانے کے قریب پہنچے تو ہوڈسن نے سامنے بکرا، کپڑے اُتروا کر، پھر اُسی رتھ پر سوار کیا اور اپنے ہاتھ سے تین گولیاں مقامِ قلب پر ماریں اور شہِ گو کو سنگین سے چیر دیا اور اُسی طرح چبوترہ کوتوالی میں جا کر نقشوں کو زمین پر ڈال دیا۔“
شہزادوں کے ساتھ یہ ظالمانہ اور ہیبت کا سلوک روا رکھنے کی، خود ہوڈسن نے یہ وجہ بتائی تھی:

”میں بے درد نہیں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ اُن بد بختوں (تین شہزادوں) کے وجود سے زمین کو پاک کر دینے کا موقع ہاتھ آنے پر مجھے خوشی حاصل ہوئی۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ انہیں پھانسی پر لٹکاؤں گا، لیکن جب حالات نے یہ صورت اختیار کر لی کہ وہ رہیں گے یا ہم، تو میرے پاس سوچنے کا وقت نہ تھا۔“

ہوسکتا ہے ہوڈسن کا یہ بیان انگریزوں یا دوسرے انصاف پسند دشمنوں کو مطمئن کر گیا ہو لیکن اصل سوال تو اپنی جگہ پر علیٰ حالہ قائم ہے۔ بتانا تو یہ تھا کہ شہزادوں کو یہ کس جرم کی سزا دی جا رہی تھی؟ متحدہ ہندوستان کے شاہی خاندان کو ختم کرنے کا برطانوی لیڈروں کو کہاں سے پرمٹ ملا تھا؟ کون سا ضابطہ اخلاق انہیں اس سزا کی اجازت دے رہا تھا؟ شہزادے کون سی ناپاکی پھیلا رہے تھے جس کے پیش نظر ہوڈسن جیسے پاکباز کو ان کے وجود سے زمین کو پاک کرنا پڑا؟ کیا انگریزوں کے پاس ان مظالم کے جواز کا کوئی ثبوت ہے؟ ان کے علاوہ دیگر مغل شہزادوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک روا رکھا گیا اُس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیے:

”دلی کے آس پاس جتنے شہزادے ملے، پکڑے گئے۔ اُن کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ اُن میں بوڑھے، لنگڑے، بیمار سب کے سب پھانسی میں لٹکائے گئے۔ سب سے زیادہ بوڑھا قیصر مرزا (ابن شاہ عالم ثانی) اکبر شاہ کا بھائی تھا اور مرزا محمود شاہ، اکبر شاہ کا پوتا وجہ مفاصل میں مبتلا تھا۔ اُن کی لاش پھانسی میں گولا لاٹھی لگی ہوئی لٹکتی تھی۔ شہزادے بے تیزی کے ساتھ پھانسی پاتے تھے۔“

پھانسی دہشت سے پہلے شہزادوں کو تڑپانے کی غرض سے جیل خانے میں رکھ کر، اُن سے شفقت لی جاتی، مارا پیٹا جاتا تھا۔ آخر اس سلوک کی وجہ؟ کس جرم کی یہ پاداش تھی۔ جناب غلام رسول مہر کی زبانی شہزادوں کا یہ قصور تھا:

لے غلام رسول مہر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۰

لے ذکا، اللہ مولوی: عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۷۰۸

”جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی اُن سے عام دستور کے مطابق مشقت لی جاتی تھی وہ بچارے مشقت کیا کر سکتے تھے؟ اُن سے چلے پھرنی جاتی تھی، پس نہ سکتے تو کوڑوں کی مار پڑتی۔ یہاں تک کہ وہ بچارے چند روز میں مر جاتے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کتنے مرے؛ اُن کا قصود اس کے سوا کیا تھا کہ بہادر شاہ کے خاندان سے تھے؟“

کیا چشم فلک کہن نے ایسے مناظر دیکھے ہوں گے کہ کسی قوم نے حکمران خاندان کو چُن چُن کر چھانسی پر لٹکایا ہو، جب گدھ اُن کی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا گئے ہوں تو ڈھانچے دریا میں پھینکوائے گئے ہوں۔ اگر کسی نے ایسا نہیں کیا تو نہ سہی، انگریزوں نے متحدہ ہندوستان میں شاہی خاندان کے افراد سے ۱۸۵۷ء میں یہ سلوک کر کے اپنی برتری کا لوہا منوایا۔ وناٹک ساور کرنے ان بہیمانہ مظالم پر یوں تبصرو کیا ہے:

”جب گدھ کچھ مدت تک اُن کا گوشت نوچ چکے تو مڑے ہوئے جسدوں کو کھنچوا کر دریا میں ڈلوا دیا گیا۔ آہ زمانے تیرے انقلابات! شہنشاہِ اکبرِ اعظم کی اولاد پر نماز جنازہ ادا کرنے اور انہیں آغوشِ زمین میں سُلانے والا بھی کوئی نہ تھا؟“
منزل شہزادوں پر تو یہ ظلم کے پہاڑ ڈھانے گئے لیکن جب متحدہ ہندوستان کے پایہ تخت دہلی میں انگریز فاتحانہ طور پر داخل ہوئے تو باستندگانِ دہلی پر جو قیامت برپا کی وہ مولوی ذکاء اللہ صاحب کی زبانی ہے:

”سپاہِ شہر کشا نے شہر میں قدم رکھا تو اُس کے ساتھ جو مرد آیا اُس کو وہ گولی مارتے۔ اُس وقت دوست دشمن، مجرم و غیر مجرم میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ اُس میں کچھ ہندو مسلمان کی تخصیص نہ تھی۔“

ذکاء اللہ مولوی، ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۵۶

ذکاء اللہ ساورکر، ساورکر، طبع اول، ص ۲۸۰

ذکاء اللہ مولوی، عروجِ عبدالمکشیہ، ص ۵۰۵

دہلی میں انگریزی سپاہ اور سکھوں کے حبیش جب فاتحانہ انداز میں داخل ہو گئے تو سچے سچے باشندوں کے ساتھ انھوں نے انسانی ہمدردی کا کہاں تک ثبوت دیا تھا۔ یہ جناب مہر صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”کرنل برن شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا، جس نے قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اپنا مرکز بنایا۔ یہ کوٹھی چاندنی چوک میں تھی۔ شہر میں تھوڑی سی آبادی رہ گئی تھی۔ لشکریوں کے حبیش مقرر ہو گئے جو بازاروں، گلیوں کے چکر لگاتے، جہاں کسی گھر کو آباد پاتے، مردوں، عورتوں، بچوں سب کو پکڑ کر برن کے پاس لے آتے اور ٹھنے بچھونے کے پتھارے مردوں کے سروں پر ہوتے۔ تلاش میں جو چیز قیمتی ہوتی نکال لی جاتی اور جس اسباب کو کوڑی میں کوئی نہ خریدتا اسے واپس دے کر لاہوری دروازے سے باہر نکال دیتے کہ جہاں سینگ سمائیں، چلے جائیں۔ اس طرح باقی شہر بھی خالی کر لیا گیا۔“

۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی کے لال قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تھا۔ ۲۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب رابرٹس کان پور جانے لگا تو اس نے دہلی کو جی گھوم پھر کر دیکھا۔ شاہجہان آباد کی بربادی کا نقشہ رابرٹس نے یوں کھینچا تھا:

”صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا۔ لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے۔ دہلی حقیقتاً شہرِ خموش تھا۔ اس معلوم ہوتا تھا۔ ہمارے اپنے گھوڑوں کے سُموں کی آواز کے سوا کوئی آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی۔ ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری۔ ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ ہر نعش پر وہ حالت طاری تھی جو موت کی کشمکش نے طاری کر دی تھی۔ ہر نعش تجربہ بد تحلیل کے مختلف مراحل میں تھی۔ ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے تاکہ انسانیت کے

زمین میں دبے ہوئے برتن نکال لیتے، جن میں عمر بھر یا پشتوں کی بچائی ہوئی
پونجی موجود ہوتی۔ ۱۷

دہلی میں مسلمانوں اور مغلیہ خاندان سے تعلق رکھنے والوں کے ساتھ انگریزوں نے جو سلوک
روا رکھا اُس کا تصور بھی انتہائی دردناک اور وحشت انگیز ہے۔ سید کمال الدین حیدر نے اس کا
اجمالی تذکرہ یوں کیا ہے:

”سنا تیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی۔ سات دن برابر قتل عام رہا اُس کا
حساب نہیں۔ اپنے نزدیک گویا نسلِ تیموریہ کو نہ رکھا مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورت
سے جو سلوک کیا بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔ ۱۸

عبادت گاہیں برباد و دلت کے نزدیک قابلِ احترام ہیں اور مساجد تو پھر مساجد ہیں، لیکن
انگریزوں نے نہ انسانی اور اخلاقی ضابطوں کو مد نظر رکھا اور نہ اپنے عیسائی ہونے کے دعوے
کا کوئی پاس لیا۔ مسلمانوں کے جذبے نے انہیں اتنا اندھا کر دیا تھا کہ دہلی کی مشہور و معروف
جامع مسجد کو سکھ فوج کا ہیڈ کوارٹر مقرر کر دیا گیا۔ سکھوں نے بھی انسانی اور اخلاقی کسی زاویے
سے اس حرکت پر غور کرنے کی زحمت گوارا نہ کی، بلکہ اُس خانہ خدا میں وہ نازیبا اور شرمناک
کام کیے جو ان کی قومی ذہنیت کا ایک جز بن کر رہ گئے۔ مولوی ذکا اللہ لکھتے ہیں:

”جامع مسجد جہشہ کی کل مساجد کی ناک تھی اُس کو یوں نکتا بنایا کہ سکھ سپاہ
کی بارگاہ اُس کو بنایا۔ اُس میں بول و براز کرنے سے کچھ پرہیز انہوں نے نہیں
کیا۔ سکھوں نے اپنے گڑھاتے حلوے کے سُرخ مینار کے نیچے خوب چڑھائے
سور ذبح کر کر کے پکائے۔ کتے جو انگریزوں کے ساتھ تھے وہ درگاہ شریف
میں پڑے پھرتے تھے۔ ۱۹

جب دہلی کے باشندوں کو خاک و غون میں ملا دیا، بچے کچھ افراد کو شہر سے بھگا دیا، اپنے نزدیک

۱۷ غلام رسول قمر: ۱۸۵۷ء، مطبوعہ لاہور، ص ۱۶۲

۱۸ کمال الدین حیدر، سید: قیصر التواریخ، جلد دوم، ص ۲۵۴

۱۹ ذکا اللہ، مولوی: عروجِ عہدِ انگلشیہ، ص ۷۱۹

تیموری خاندان کو مٹا دیا تو صرف دو چیزیں باقی رہ گئی تھیں، ایک مغلوں کی آخری نشانی ضعیف العمر اور حرمِ نصیب بادشاہ بہادر شاہ ظفر، جو انگریزوں کی قید میں تھا اور دوسری چیز دہلی کی نوہ کنائیں خالی عمارتیں۔ ان کے بارے میں انگریزوں کا روزنامہ کرائیکل لاہور، اکتوبر، ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں یہ سوال کرتا ہے:

”دہلی کو اب تک کیوں تباہ نہیں کیا گیا؟ بادشاہ اب تک کیوں زندہ ہے؟ اس کا جواب اختصار سے دے دینا چاہیے۔ شہر دہلی اور بادشاہ کا وجود دفتری حکومت کا ممنون ہے۔ دفتری حکومت نے ہمارے سالاروں کے ہاتھ باندھ دیے۔“

یہی مطالبہ لاہور کے دوسرے انگریزی اخبار ”پنجابی“ نے ماہ نومبر میں اپنی حکومت سے ان لفظوں میں کیا:

”دہلی مسلمانوں کا بروقتلم ہے، کیوں اب تک اسے زمین کے برابر نہیں کیا گیا؟ بادشاہ مسلمانوں کی محبت و عقیدت کے تنگے کا پروہت ہے، کیوں اب تک اسے پھانسی نہیں دی گئی یا گولی نہیں ماری گئی؟“

جن کے خون پسینے کی کمائی سے انگریز پھلے چھو لے تھے، جن کی پشت پاشت کی پونجی کو لوٹ کر انگلستان جیسے غریب اور لپہا نہ ملک کو صنعتی، مالدار اور ترقی یافتہ بنا بیٹھے تھے۔ آزادی اور دولت چھین لینے ان کے مذاہب میں مداخلت کرنے پر ہی بس نہ کی بلکہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی پاداش اور آزادی چاہنے کے جرم میں وہ مظالم ان غریبوں پر ڈھائے کہ جن کے ذکر سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ دہلی میں جو کچھ کیا اس کی جھلک کشمیر کی جا چکی۔ باقی ملک میں شہروں اور دیہات میں، اس بذ نصیب ملک کے باشندوں سے کیسا سلوک کیا گیا ملاحظہ ہو۔ ”نیل نے الہ آباد اور اس کے گرد و نواح میں ظلم و جور کی بھٹیاں دہکار رکھی تھیں۔“

اس انتہاء میں اُس کی جگہ بہتری ہیوے لاک کو سپلائی بنا دیا گیا اور ہیوے
۳۰ جون کو الہ آباد پہنچ گیا۔ نیل جتنا کام انجام دے چکا تھا، اُس کی تفصیلات
بیان کیں نیز بتایا کہ ریناؤ کو ہراول کے طور پر بھیجتے وقت اُس نے کیا کیا ہدایا
دیں؟ ہیوے لاک نے ان تمام ہدایات پر تحسین کا اظہار کرتے ہوئے اُن کی
تصدیق کر دی۔ گویا ظلم و جور اور بے پناہ تشدد محض نیل ہی کو پسند نہ تھا،
تمام انگریز جنرل ایسے ہی طور طریقوں کو پسند کرتے تھے۔ لے

ریناؤ جس کو کرنل نیل مذکور نے ہراول کے طور پر آگے بھیجا ہوا تھا۔ اہل ملک کے ساتھ
اُس کے سنگین مظالم، جن کی کوئی بااخلاق آدمی ہرگز جرأت نہ کر سکتا تھا، انگریزی ذہنیت کے
پوری طرح آئینہ دار ہیں:

دو روز میں بیالیس آدمیوں کو پھانسیاں دی گئیں۔ بارہ آدمیوں کے ایک
گروہ کو اس بنا پر موت کی سزا دی گئی کہ جب کالم کوچ کرتا ہوا اُن کے پاس
سے گزرا تو انھوں نے منہ پھیر رکھے تھے۔ ریناؤ جب پڑاؤ ڈالتا تو سامنے
کے تمام دیہات کو آگ لگا دیتا، لے

کرنل نیل نے ایک مکان کے اندر فرش پر علیحدہ علیحدہ گاتے اور سٹور کے خون کا
چھڑکاؤ کر دیا ہوا تھا۔ جو حریت پسند گرفتار ہو کر اُس کے سامنے پیش کیا جاتا اُسے پھانسی
دینے سے پہلے یہ تعذیب دی جاتی کہ اگر مسلمان ہے کہ اُس مکان میں اپنے حصے کا سٹور کا
خون زبان سے چاٹ کر فرش کو صاف کرے اور اگر قیدی ہندو ہے تو اُس سے گاتے کے
خون والی جگہ کا ایک قطعہ اسی طرح صاف کروایا جاتا۔ جو انکار یا حیل و حجت کرتا تو دُڑے
لگتے۔ انکار کی صورت میں دُڑے مار مار کر اُسے ختم کر دیا جاتا اور نہ صاف کرنے کے بعد پھانسی
پر لٹکا دیا جاتا اور اس طرح موت سے پہلے چند منٹ زندہ رہنے کی مہلت مل جاتی۔ یہ

طریقہ کار نیل نے ۲۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو جاری کیا تھا۔ اس طریقہ تغذیہ کو میلی سن جلد دوم ص ۳۰۰ سے یوں نقل کیا گیا ہے :

”برگیدر جنرل نیل کا عزم مصمم ہے کہ بے گناہوں کے خون کا ہر دھبہ ان بدعاشوں (حیثیت پسندوں) سے قبل از نفاذ سزا سے موت صاف کرایا اور دھلویا جائے جو آئندہ غدر میں سرگرم حصہ لینے کی بنا پر گرفتار ہوں۔ انھیں حیثیت، ذات اور درجہ جرم کی بنا پر اس کام کے لیے منتخب کیا جاتے۔ ہر بدعاش کو موت کی سزا کا حکم سن لینے کے بعد پھرے کے ساتھ متعلقہ مکان میں لے جایا جائیگا، اور مجبور کیا جائے گا کہ وہ دھتوں کا ایک حصہ صاف کرے۔ یہ کام زیادہ سے زیادہ کراہت انگیز بنا دینا چاہیے۔ اگر مجرم کام پورا نہ کرے تو نوجی کو تو ال تازیانے لگواتے۔ اپنے حصے کا کام کر چکنے کے بعد مجرم کو پھانسی دے دی جائے۔ اس غرض سے پھانسی پاس ہی نصب کی جائے گی۔“

نیل نے اپنی اس تجویز پر دل کھول کر عمل کیا لیکن ہنری ہیوے لاک جسے نیل کی جگہ الہ آباد کے علاقے کافوجی افسر مقرر کیا گیا تھا اس نے بھی ۳ جون ۱۸۵۷ء سے جو سلوک برصغیر پاک و ہند کے باشندوں کے ساتھ روارکھا، وہ ایک انگریز سول افسر کی زبانی میلی سن جلد دوم صفحہ ۲۰۷ سے یوں منقول ہے :

”راستے کے بہت سے گاؤں جلا دیے گئے تھے اور انسان وہاں قطعاً نظر نہ آتا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف دلدل تھی، جلی ہوئی جھونپڑیوں کے سیاہ کھنڈر تھے، جنہیں موسم کے اثرات نے اور زیادہ بد وضع بنا دیا تھا۔ ایک بھی صدانہ سنی جاتی تھی جو کسی انسان کے وجود کا پتہ دیتی یا معلوم ہو سکتا کہ آدمی کام کاج میں لگے ہوتے ہیں۔ ایسی صدائوں کی جگہ ملینڈوں کے ٹرانے کا شور تھا یا ٹڈیوں کی تلخ و تیز بانسیاں بج رہی تھیں یا ہزاروں پردار

کیڑے دھیمے دھیمے غنغار ہے تھے جو نمی اور گرمی کے باعث پیدا ہو گئے تھے ،
 پھر نیم کے درختوں کی ناعوش گوار بوجھی وقتاً فوقتاً لٹکی ہوئی لکڑیوں کی بدبو
 ہوا خراب کر رہی تھی ، جنہیں ہماری آنکھوں کے سامنے مکروہ ستور مزے سے
 کھا رہے تھے۔ یہ سب چیزیں ہمارے مختلف حواس پر اثر انداز ہو رہی تھیں
 اور مل کر بربادی ، تباہی اور رنج و ماتم کا ایسا مرقع تیار کر رہی تھیں جو میرے
 نزدیک موجود لوگوں میں سے کسی کو عمر بھر فراموش نہ ہوگا۔^۱

لیفٹیننٹ رابرٹس نے ۲۱ جون ۱۸۵۷ء کو جہلم سے اپنی والدہ کے نام ایک خط
 انگلستان بھیجا۔ اس میں اپنی قوم کے عزائم اور متحدہ ہندوستان کے باشندوں کو اذیت ناک
 سزائیں دینا اور توپ سے اڑانا جس فخریہ انداز میں لکھا وہ انگریزوں کی ذہنیت کی صحیح تصویر
 اس خط کا ایک اقتباس مولانا غلام رسول مہر کے لفظوں میں ملاحظہ ہو :

”سزائے موت کی سب سے زیادہ موثر صورت یہ ہے کہ مجرم کو توپ سے
 اڑا دیا جائے۔ یہ بڑا ہی خوفناک نظارہ ہوتا ہے لیکن موجودہ وقت میں
 ہم احتیاط پر کاربند نہیں ہو سکتے۔۔۔۔۔ ہمارا مقصد ان بد معاش مسلمانوں
 پر یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کی مدد سے انگریز اب بھی ہندوستان کے مالک
 رہیں گے۔“^۲

جو ظلم و ستم دہلی میں ڈھایا گیا اُسی طرح دیگر شہروں اور دیہات میں غالب آنے کے
 بعد انتقام کی جھٹیاں گرم کی گئیں۔ نیل ، ہیوے لاک اور ریناؤ کے جو مظالم بیان ہوئے
 پورے ملک میں یہی کچھ کیا گیا۔ اس کے بعد فوجی عدالتیں نیچے کچھے باشندوں کے لیے
 قائم کر دی گئیں ، اُن کا عدیم المثال انصاف ملاحظہ ہو :

”ملزموں کو گرفتار کر کے مقدمات کی چھان بین کے لیے فوجی کمیشن کے سربراہ
 کے روبرو پیش کر دیا جاتا تھا۔ یہ کام بڑی تیزی سے ہوتا تھا۔ موت کے سوا

^۱ غلام رسول مہر : ۱۸۵۷ء ؛ مطبوعہ لاہور ، ص ۲۵۹

^۲ ایضاً : ص ۳۶۶

کوئی سزا نہ تھی اور اثباتِ جرم کے سوا کسی مقدمے کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ جن اصحاب کا کام ملزموں کے جرم کی چھان بین تھا وہ نرمی کے چنداں روادار نہ تھے۔“

انگریزوں کا مقصد اس فوجی نظام عدالت سے یہ تھا کہ بچے کھچے باشندوں کو مزید ایسی عبرت ناک سزائیں دی جائیں کہ بعد میں کوئی سراٹھانے کا تصور بھی دل میں نہ لانے پاتے۔ اکثر کو ماخوذ کر لینے کے بعد سزائے موت کی سزا ہی دی جاتی تھی۔ طریقہ ہائے اذیت ایسے وحشت ناک اور غیر انسانی تھے کہ بعض انگریز بھی ان پر اظہارِ ملامت کیے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ ٹامپسن ص ۱ سے ایک انگریز کا بیان یوں منقول ہے:

”ہندوستانیوں کے لیے تعذیبات، یہ مسلمانوں کو (پھانسی دینے سے پہلے) سٹوروں کے چمڑوں میں سینا یا ان کے جسموں پر سٹوروں کی چربی ملنا اور ان کے جسموں کو جلانا یا ہندوؤں کو بھرست ہونے پر مجبور کرنا، یہ تمام حرکات سراسر منتقامہ اور غیر مسیحی ہیں اور ہمارے لیے باعثِ بے عزتی ہے۔ انجام کار یہ ہم پر مصیبت بن کر گریں گی۔ ان روحانی اور ذہنی تعذیبات کے بعد یورپ والوں کو منہ دکھانے کے قابلِ دہم نہیں رہ سکتے۔“

فتح دہلی کے دو ماہ بعد لارڈ لارنس نے دہلی میں فوجی کمانڈر کے نام ایک آرڈر بھیجا، جس کا ایک اقتباس ولیم میور کی کتاب جلد اول صفحہ ۲۳۹ سے یوں نقل کیا گیا ہے:

”مجھے یقین ہے کہ ہم نے جس طریق پر بلا امتیاز تمام طبقوں کو ٹوٹا ہے اس کے لیے ہم پر ہمیشہ لعنت بھیجی جائے گی اور یہ فعل بالکل حق بجانب ہو گا۔ بہر حال دو مہینے کی ٹوٹ کو کافی سمجھنا چاہیے۔ میرے پاس اس بارے میں بمبئی سے بھی شکایتیں پہنچ رہی ہیں۔۔۔۔۔ میں نے یہ بھی سنا ہے، اگرچہ یقین نہیں آتا

کہ افسر باہر نکل نکل کر ویسی باشندوں کو بیدار دی سے قتل کر رہے ہیں۔۔۔۔۔
 اگر ہمارے سامنے بلند اصول نہ بھی ہوں جب بھی عام مصلحتوں کا تقاضا
 یہی ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو اس قسم کی چہرہ دستیوں سے باز رکھیں باغیوں
 اور قاتلوں کو پھانسی پر لٹکانے یا گولی سے اڑانے کے لیے مجھ سے زیادہ
 کوئی مستعد نہ ہوگا، لیکن یہیں دوست دشمن میں امتیاز کرنا چاہیے۔ موجودہ
 صورت حال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام طبقے ہمارے خلاف متحد ہو جائیں اور چاچولی
 جنگ شروع ہو جائے، ملک آہستہ آہستہ ویرانی کی منزل پر پہنچ جائے۔
 پھر ہمارے لیے یہاں ٹھہرنا ہی ممکن نہ رہے۔“ ۱

سکھوں نے بھی انگریزوں کے دوش بدوش حریت پسندوں کو بلا امتیاز ہندو مسلم کے
 جہانی اور روحانی اذیت پہنچانے، دونوں قوموں کو برٹش گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کی
 غرض سے تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ پیش خدمت ہے
 جو موہرے ٹامس نے ہنری کاٹن کو بتایا اور ٹامپسن صفحہ ۴۸ سے جناب غلام رسول مہر نے
 اپنے لفظوں میں اُسے یوں بیان کیا ہے :

”اندھیرا ہو چکا تھا، ایک سکھ اردلی میرے خیمے میں آیا اور سلام کرنے کے بعد
 بولا کہ ہم نے قیدیوں سے جو سلوک کیا ہے، میں سمجھتا ہوں آپ اُسے دیکھنا
 پسند کریں گے۔ مجھے (ہنری کاٹن کو) شبہ ہوا۔ فوراً اٹھا اور حوالات میں
 گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بدبخت مسلمان آخری دموں پر ہیں۔ اُن کی مشکیں کسی
 ہوتی ہیں، کپڑے اترے ہوئے ہیں اور تانے کے پیسے گرم کر کر کے اُن کے
 جسموں کو سر سے پاؤں تک داغا جا چکا ہے۔ میں نے خود انھیں گولیوں سے
 ہلاک کر دیا، تاکہ اُن کی اذیتیں ختم ہوں۔“ ۲

اسی سکتہ نہایت کا مظاہرہ ہندوؤں کے بارے میں بھی ملاحظہ ہو کہ اجنلے میں کیس
مظاہرہ کیا :

”اجنلے کے ارد گرد پہرے کھڑے کر دیے گئے تاکہ کوئی آدمی تھانے کی طرف نہ
آنے پاتے۔ دس دس کے جھنڈوں میں قیدیوں کو باہر لایا جاتا، اُن کے نام
اور پتے لکھے جاتے اور اُس جگہ بھیج دیا جاتا جہاں سکتہ سپاہی اُنہیں
گولیاں مارنے کے لیے متعین تھے۔ کوپر نے خود لکھا ہے کہ اُنہیں قتل گاہ
کی طرف بھیجا جاتا تو وہ غصے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے کہ ٹھکرو!
تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہو گا۔ کبھی سکھوں کو طعنہ دیتے، کبھی گنگا جی کو
مدد کے لیے پکارتے۔“ لے

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بعض انگریز افسروں نے جو بہیمیت اور زندگی کا ثبوت
دیا اہل ملک کے ساتھ محض اس وجہ سے غیر انسانی برتاؤ کیا کہ اُنہوں نے آزادی حاصل
کرنے کا تصور بھی کیوں کیا؟ انگریزوں کو دوسروں کے ملک پر قبضہ جمالینے، وہاں کی دولت
لوٹنے، صنعتیں تباہ کرنے، اس کی دولت سے انگلستان کو صنعتی اور ترقی یافتہ بنانے کا
اخلاقی اور انسانی حق حاصل تھا لیکن ویسی باشندوں کا کوئی حق نہیں تھا کہ جب اُن کا ملک
اُنہیں لہجہ ارا تھا تو اُنہوں نے اُن کیوں کی؟ صنعتیں تباہ کی جاری تھیں تو کیوں بلبلائے، عیسائی
بنانے کی سر توڑ کوشش کر کے اگر انگریزوں نے اُن کے دلوں پر آرے چلائے تو دیسیوں کے
منہ سے سی سی کی آواز کیوں نکلی؟ یہ تھی متحدہ ہندوستان میں بسنے والوں کے جرائم کی فرد۔ کیا
انگریزوں کے نزدیک یہ مجرم قابلِ معافی تھے؟ لیکن اخلاق اور انسانیت کی رُو سے ویسی
مجرم تھے یا انگریز؟ اہل خانہ اپنے گھر کو بچانا چاہتے تھے تو مجرم ٹھہرے لیکن ڈاکو اُسی گھر کو
صرف متواتر لوٹنا چاہتے تھے بلکہ اُس پر قبضہ جائے رکھنے پر مُصر تھے اور ایسا کرنا اُن کی
نظر میں نہ مجرم تھا نہ معیوب۔ یہ المیہ نہیں تو اور کیا ہے کہ انگریزوں کے جن جنرلوں اور دیگر

فوجی افسروں نے زیادہ سے زیادہ زندگی کا ثبوت دیا، سفاکی، وحشت اور بربریت کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ ۱۸۵۷ء میں متحدہ ہندوستان کے اندر توڑ دکھائے اُنھیں ہیرو قرار دیا گیا، اُنھیں اور اُن کی اولاد کو پیشگوئیوں اور جاگیروں سے نوازا گیا، انگلستان کی تاریخ میں اُن ننگ انسانیت افراد کو نمایاں کر کے دکھایا گیا۔ گویا پوری برطانوی قوم کی ذہنیت ڈاکوؤں جیسی اور ڈاکو نواز بن کر رہ گئی تھی۔ انگریزوں کی اسی ذہنیت اور ۱۸۵۷ء میں اُنھوں نے جس دراندگی کا مظاہرہ کیا، اُس کے پیش نظر جناب غلام رسول مہر کیسبیا پیارا سوال کرتے اور باشندگان پاکستان کے ضمیر کو بھنجھوڑتے ہیں :

”اب سوچیے کہ جس کے دل میں ۱۸۵۷ء کے واقعات محض نہ کی یاد تازہ ہوگی، کیا اُس میں انگریزوں کے لیے کسی بھی خوشگوار خیال کی گنجائش باقی رہے گی؟ شعلوں کو کون چھول سکتا ہے اور خارزار کو کون حریر و پرینیاں کا فرش قرار دیتا ہے؟ تاریخ قوموں کے اعمال کا مرقع ہے۔ انگریز جب اُس میں اپنا نامہ اعمال دیکھیں گے اور اُس کے اوراق پر ۱۸۵۷ء کے خون ناحق کا دھارا متلاطم نظر آئے گا، تو اُن کی حالت کیا ہوگی؟ وہ نیل، نکلسن، سوڈن یا اُن جیسے دوسرے لوگوں کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟ اس دنیا کا ہر ذرہ ذرہ پکار کر کہے گا کہ انگریزوں نے وہ حرکتیں کیں جو انسانیت ہی نہیں بلکہ جنگلی درندوں کے لیے بھی باعثِ ننگ تھیں۔“

مولانا غلام رسول مہر کے مذکورہ بالا سوال اور وضاحت سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں حریت پسندوں اور خاموش رہنے والوں کے ساتھ، بغیر کسی امتیاز کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے اُپر مظالم کے پہاڑ ڈھائے، اندھا دھند گولیاں چلائیں، دیہات جلواتے، گولال لٹائی لگا کر درختوں سے اُٹے لٹکاتے، سورا اور گائے کا خون فرشِ زمین سے چاٹ کر صاف کر دیا، توپ سے اڑایا، اسباب چھینا، گھر بار سے

نکالا، جا تا دیں ضبط کیں، کالے پانی کی مزائیں دیں، ایسے بے شمار طرقِ مظالم ایجاد کیے جن کے پیش نظر کوئی انصاف پسند انھیں پھول نہیں بلکہ شعلہ سمجھنے پر مجبور ہوگا، اُن کی ظاہری عنایات کو جبر و پرنیاں کا فرش نہیں بلکہ خارزار ہی قرار دے گا۔ خود بعض انگریز مورخوں اور انصاف پسند افسروں نے اپنی قوم کے ان مظالم کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھا اور اُن سے اپنی برأت کا اظہار کیا ہے۔

اس باب کے گزشتہ اوراق میں ہم نے متحدہ ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط، لوٹ مار اور جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء میں انھوں نے بربریت کے جو المناک مناظر پیش کیے، اُن کو بیان کیا جس کی محض یہی وجہ ہے کہ ایک طرف انگریزوں کے مظالم پیش کیے جائیں اور دوسری طرف بعض صاحبانِ مجتہد و دستار اور علمِ میز کے امین کہلانے والوں کے اس مشعل راہ کتاب کے بابِ چہارم میں ایسے بیانات و اعلانات بھی قارئینِ کرام کے سامنے رکھے جائیں، جن میں انھوں نے انگریز کو خار نہیں بلکہ پھول بتایا ہے۔ ظالم نہیں بلکہ عادل ٹھہرایا ہے، انھیں اپنا پشت پناہ اور حامی و ناصر سنایا ہے۔ ایسے بیانات اور حوالے پیش کر کے ہم قارئینِ کرام سے انصاف چاہیں گے اور فیصلے کے طلب گار ہوں گے۔

مولانا غلام رسول مہر کا سوال اپنی جگہ پر بجایا ہے لیکن یہ یقین نہیں آتا کہ ایسے وسیع النظر و درخ سے وہ تاریخی پھرے پنہاں ہوں جنھوں نے انگریزوں کو خار نہیں بلکہ پھول بتایا ہے لہذا انھیں خبر ہوگی اور اُن جیسے کتنے ہی اہلِ علم اس حقیقت سے آگاہ ہیں، لیکن یاد رکھئے ہم آج تک قاصر رہے کہ ایسے حضرات خار کو پھول بتانے والوں کے گودیدہ کیوں بنے رہتے ہیں؟

علمائے کرام اور جنگِ آزادی: آخر میں چند اُن علمائے کرام کا ذکر فرمنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سرگرم حصہ لیا تھا۔ مولانا احمد اللہ شہید جنھوں نے بریلی اور تھانہ بھمان پور وغیرہ کے معرکوں میں انگریزوں کے نامی گرامی بریلوں کو بھی گھٹے ٹیکنے پر مجبور کر دیا تھا اور حریت پسندوں میں نئی روح پھونک کر اس علاقے سے انگریزوں کے قدم اُکھاڑ دیے تھے۔ ان کے جنگی کارناموں کی ایک جھلک

گزشتہ صفحات میں دکھائی جا چکی ہے۔ موصوف ۱۸۴۰ء سے برطانوی اقتدار کے خاتمے اور اسلامی حکومت کے قیام کی خاطر سرگرم عمل تھے۔ چنانچہ موصوف کے بارے میں مفتی انتظام اللہ شہابی یوں رقمطراز ہیں :

”۱۸۴۰ء میں مولانا احمد اللہ شاہ دلاور جنگ بن محمد علی، نواب چلیا پن، جے پور میں میر قربان علی، گوالیار میں محراب شاہ قلندر سے بیعت جہاد کرتے ہوئے دلی گئے مفتی صد الدین خاں آزرہ کے مشورہ سے اگرہ آئے۔ مفتی انعام اللہ خاں بہادر کے یہاں مقیم ہوئے۔ مجلس علماء کی تشکیل کی اور بیعت جہاد کا سلسلہ شروع کر دیا۔“

مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۷۸ھ) جو ۱۸۵۷ء میں فتویٰ جہاد محرک اور جاری کرنے والے تھے، ان کے بارے میں زمانہ حال کے قابلِ فخر مورخ پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں :

”جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل بخت خاں کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، بعبور دیرائے شوریٰ سزا ہوئی، جزیرۂ اندمان بھیجے گئے اور وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا۔“

مفتی انتظام اللہ شہابی نے اس سلسلے میں فتویٰ جہاد اور علامہ کی حریت پسندانہ سرگرمیوں کا ذرا وضاحت کے ساتھ اپنے لفظوں میں یوں تذکرہ کیا ہے :

”گنپن کے عمال کی بدعہدی، خود غرضی اور بدینتی نے فرنگیوں کو بالکل بے نقاب کر دیا تھا۔ عوام اعراض کرنے لگے تھے تو خواص کا کیا عالم ہو گا؟ دلیسی

۱۔ انتظام اللہ شہابی، مفتی، مولوی فضل حق خیر آبادی اور پہلی جنگِ آزادی، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۳

بدیسی کی کشمکش کی بیہ زبردست ٹکراہٹ بالکل فطری تھی اور آخر ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو دل کا غبار آتش فشاں بن کر پھوٹ نکلا۔ عوام کی اس بے چینی کا اثر مولانا (فضل حق خیر آبادی) پر بھی پڑے بغیر نہ رہا۔ وہ دہلی آتے ہی قلعہ میں گئے۔ بہادر شاہ سے اگلی راہ و رسم تھی۔ بادشاہ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے ایک اشرفی نذر کی، موجودہ صورت حال کے متعلق بادشاہ سے گفتگو کی، بادشاہ کی انگلیں ختم تھیں، دوسرے شہزادوں کی ٹوٹ کھسٹ اور تخت شاہی کی تمنائیں باہمی رقابت کا میدان گرم کیے ہوئے تھیں۔ مولانا نے دیکھا کہ عائد شہر میں بھی دو گروہ تھے، ایک بادشاہ کا ہمنوا، دوسرا حکومت چینی کا بھی خواہ۔ فوج کا جائزہ لیا۔ حریت پسندوں کی دو جماعتیں ایسی بھی تھیں جو ایک مقصد کو لیے ہوئے جان پر کھیل رہی تھیں۔ ایک جماعت مجاہدین کی تھی دوسری جماعت روہیلوں کی۔ یہ لوگ جنرل بخت خاں سردار روہیلہ کی زیرِ کمان تھا۔ مولانا کی خبر سُن کر جنرل بخت خاں ملنے آئے۔

چنانچہ مولانا نے آخری تیر ترکش سے نکالا۔ جمعہ کے روز جامع مسجد میں علما کے سامنے تقریر کی اور استفتاء پیش کیا۔ مفتی صدر الدین خاں جزیزی ہوئے۔ مولوی عبد القادر، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولوی فیض احمد ہادی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رامپوری وغیرہ نے دستخط کر دیے، مگر مفتی صاحب (مفتی صدر الدین آزادہ) بالآخر کو بالآخر لکھ گئے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں عام شورش پڑھ گئی۔ دہلی میں نوسے ہزار سپاہ جمع ہو گئی تھی۔

علامہ فضل حق خیر آبادی (المتوفی ۸/ ۱۲۷ھ / ۱۸۶۱ء) معقولات کے امام و مجتہد، فریضہ عالم دینی، متبحر عالم دین اور ماہر قانون تھے کیونکہ سرشتہ دار سے صدر الصدوری تک کے فرائض

امتیازی شان سے ادا کر چکے تھے۔ جب علامہ گرفتار ہو گئے اور مقدمے کی سماعت شروع ہوئی تو لطف کی بات یہ ہے کہ کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں بلکہ آپ سرکاری وکیل سے خود بحث کرتے تھے۔ برطانوی قانون کے منہجے کو آپ تاریک بکوت کی طرح توڑ کر عدالت کو رہائی پر مجبور کر دیتے تھے۔ سرکاری وکیل کو ہر بار لاجواب کر کے آپ اس طرح کھلا رہے تھے جیسے بلی کسی چوہے کو منہ میں دبا کر بعض اوقات ڈھیلا کر دیتی ہے۔ مثلاً :

”سیرۃ العلماء میں ہے کہ ۱۸۵۹ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش میں مولانا موصوف (فضل حق خیر آبادی) ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلے کے لیے جیوری بیٹھی۔ ایک اسپیکر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ وکیل سرکار کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے، بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کرتے اور خود ہی ثل تاریک بکوت عقلی و قانونی بحث سے نوڑ دیتے تھے۔ حج یہ رنگ دیکھ کر رنگ رہ گیا۔ حج نے صد و الصدوری کے ہمد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا، وہ مولانا کی عظمت اور تجربہ سے واقف بھی تھا، وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہو جائیں، اُسے سجد ہمدردی تھی۔ اُس وقت تک صورت بھی یہ تھی کہ مولانا پر جرم ثابت نہیں ہو رہا تھا اور اُمید تھی کہ بری ہو جائیگا وکیل لاجواب تھے۔“

ماہر قانون اور امام عقلیات ہونے کی بنا پر سرکاری وکیل کو لاجواب تو کر دیا، قانون کی رو سے عدالت جرم ثابت نہیں کر پاتی لیکن حقیقت تو اپنی جگہ ہے کہ فتویٰ جہاد آپ ہی کا جاری تھا۔ بہادر شاہ ظفر، جنرل نعت خاں، مولانا احمد اللہ شہید اور حضرت محل کو جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے سلسلے میں اہم مشورے، جنگی تیاریوں، مقابلے کی صورتوں اور اپنی خامیوں کو پورا کرنے کے بارے میں تجویزی پیش کرتے رہے۔ علماء کا جو بورڈ تشکیل دیا گیا تھا اُس میں آپ بھی شامل تھے۔ لکھنؤ سے دہلی آتے ہوئے راستے میں شہروں اور دیہات میں انگریزوں کے خلاف

جہاد کرنے کے لیے کربستہ ہو جانے کی تلقین کرتے ہوئے آئے تھے۔ اگر قانون کے ذریعے عدالت میں سے کسی امر کو مٹا دیا جائے تو نہ مہی لیکن اس سے حقیقت تو نہیں بدل گئی تھی۔ اس حق پسندی اور صداقت کی دوا کہاں تک دی جائے کہ قانون کو لا جواب کر دینے کے باوجود، بری ہونے کے نزدیک پہنچ کر خود اعلان کرتے ہیں کہ فتویٰ میرا تھا، علما نے میرے کہنے سے اس کی تصدیق و تائید کی تھی۔ اس اقرار کا نتیجہ صاف ظاہر تھا لیکن علامہ نے ثابت کر دکھایا کہ میں نے قانون کے شکنجے کو توڑ دیا ہے لیکن جس کام کو شریعت کا تقاضا سمجھ کر کیا ہے، آج اس کا اظہار نہ کر کے، خدا کے اس انعام اور اپنے شرعی فریضے کی ادائیگی کا انکار کر کے عظیم اخروی سعادت سے خود کو محروم کیوں قرار دوں؟ علامہ کے اس تاریخی فیصلے نے انہیں اہل عزیمت کی صف میں امتیازی مقام پر کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب موصوف لکھتے ہیں :

”دوسرا دن آخری دن تھا۔ مولانا نے اپنے اوپر کے بقیہ الزام رو کر دیے۔ پھر پٹا کھایا اور کہا: جس منبر نے فتویٰ کی خبر کی اس کے بیان کی اب میں تو نیت و تصدیق کرتا ہوں، میرا ہی لکھا ہوا ہے اور میرے ہی مشورہ سے علما نے دستخط کیے۔ پہلے اس گواہ نے سچ رپورٹ لکھوائی تھی مگر اب عدالت کے سامنے میری صورت سے معوب ہو کر جھوٹ بولا ہے۔ مجھے خدا کے حضور میں جانا ہے غلط بات مذہب کے مسئلہ میں نہیں بول سکتا۔“ اس بیان سے حیران ہو گیا گھڑی گھڑی مولانا کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ رنگ دوسرا ہو چکا تھا جج کو رعایت کی (اقبالِ جہنم کی قانونی صورت میں) کوئی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ بعد رنج و غم حبس دوام کا حکم سنایا۔ مولانا نے بڑی سترت سے حکم کو منظور کیا۔۔۔۔۔ آخرش مولانا اندامان روانہ ہو گئے۔“

مولانا کی اس عزیمت کی قدر اہل کمال ہی کر سکتے ہیں۔ قانونی طور پر رہائی یقینی ہو چکی ہے۔

جس جرأت واستقلال سے فتویٰ جاری کیا، اُسی عزم واستقامت سے تمام قانونی شکنجوں کو توڑ کر، وکیل سرکار کو لا جواب کر کے خود اقرار کرتے ہیں۔ اس اقرار کے نتائج سامنے ہیں، قانونی سزا معلوم ہے مگر دنیا کی زندگی میں ہر تکلیف اٹھانے اور ہر سختی سے سخت سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جانے میں اگرچہ دنیاوی راحتیں جواب بھی اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ قانونی رہائی کے پس پردہ علامہ کے استقبال کے لیے تیار کھڑی تھیں، آپ کی قدم بوسی کی منظر تھیں لیکن آفرین ہے اس جرأتِ زندان پر کہ ایسی رہائی اور دنیاوی تمام راحتوں کو اپنے استحقاق سے ٹھکر کر اپنے عظیم کارنامے فتویٰ جہاد کا، جو حریت پسندوں کے لیے صورِ اسرافیل اور فرنگی اقتدار پر صاعقہ تھا، خود اقرار کر لیتے ہیں اور ہر دنیاوی سختی کو خندہ پیشانی کے ساتھ سہنے سکھنے اور خود تیار ہو جاتے ہیں۔ قافلہ سالارِ عشق سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے صبر و استقامت کی اس آخری زمانے میں جھلک دکھا دینے والے اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی سرہندی قدس سرہ کی جرأتِ زندان کی یاد پھر تازہ کر دکھانے والے اس خیر آبادی مرقۃ کو باری تعالیٰ اپنی خاص نعمتوں سے نوازے، اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے۔ آمین یا اللہ العالمین

خیو نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
مُرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

جب علامہ کو مجبور دریا تے شور کی سزا دی گئی، جزیرہ اندمان بھیجے گئے تو اس شہا نہ زندگی گزارنے والے، ناز و نعم میں پلنے اور پروان چڑھنے والے، کو دولت جس کی لونڈی، ہاتھی اور پالکی کی سواری میسر، دیباہوں اور سرکاروں میں راہ در رسم تھی، اُس علامہ سے اندمان میں کیا کام لیا جاتا تھا؟ یہ مفتی صاحب مذکور سے پوچھیے:

”مولانا کو انڈیمان میں خدمت بہت ذیل سپرد کی گئی تھی، بارہا کون کی صفائی کیا کرتے تھے“ لے

مولانا فیض احمد بدایونی بھی ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مردانہ وار حصہ لینے والے علمائے کرام میں سے ایک ہیں۔ موصوف کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں:

”مولانا فیض احمد، مولوی عبدالقادر (بدایونی بن مولانا فضل رسول) کے چھوٹے زاد بھائی اور بہنوئی تھے۔ مولانا فیض احمد نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔“

مولانا فیض احمد بدایونی کے متعلق دوسری جگہ موصوف نے یوں تفصیلی وضاحت کی ہے:

”مولانا فیض احمد بدایونی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے نامور مجاہدین میں ہیں۔ مولوی رحمت اللہ کیہ انوی اور پادری فنڈر کے درمیان جو مناظرہ ۱۰ اپریل ۱۸۵۴ء کو آگرہ میں ہوا، اس میں بھی مولانا فیض احمد بدایونی کی سرگرمیوں کو دخل تھا۔ مولانا اس زمانہ میں وہاں بورڈ آف ریونیو میں سرشتہ دار تھے۔۔۔۔۔ جب جنگ آزادی کا آغاز ہوا تو ڈاکٹر وزیر خاں کے ہمراہ سیدھے دہلی پہنچے اور بادشاہ دہلی کی طرف سے ذمہ دار عہدوں پر سرفراز رہے۔ سقوط دہلی کے بعد روہیل کھنڈ کا رخ کیا۔ بدایوں (گکراں) اور بریلی وغیرہ میں انگریزوں سے مقابلہ کیا۔ اس کے بعد آودھ کی طرف نکل گئے اور پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے اور کیا حشر ہوا۔“

مولانا کفایت علی کافی مراد آبادی جو اہلسنت و جماعت کے جید عالم دین اور سچے عاشق رسول تھے، انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء میں پوری سرگرمی اور جوش و خروش کے ساتھ حصہ لیا تھا۔ اسی جرم کی پاداش میں آپ گرفتار ہوئے، سزائے موت کا حکم ملا اور پھانسی دی گئی۔ پروفیسر موصوف نے آپ کے کارناموں کا یوں اعتراف کیا ہے:

”مولانا کفایت علی نام، کافی تخلص تھا، مراد آباد کے رہنے والے تھے۔“

لے محمد ایوب قادری : تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ کراچی، ص ۵۵

لے ایضاً : ص ۳۸۶

تحصیل علم بدایوں، رامپور اور لکھنؤ میں کی۔ مفتی ظہور اللہ لکھنوی کے شاگرد تھے۔
جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں مردانہ وار حصہ لیا۔ مراد آباد کے صدر الشریعہ
بناتے گئے۔ مراد آباد پر جب انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو مئی ۱۸۵۸ء میں
ان کو پھانسی دی گئی۔ قبر عقب جیل بہنوز موجود ہے۔ ہمیشہ نعت لکھتے تھے۔
شرح شمائل نر مذی کا نظم میں ترجمہ کیا۔ مولانا کفایت علی کافی کے ہاتھ کا تحریر کردہ
شمائل نر مذی کا پہلا مستودہ خاکسار مترجم کے پاس محفوظ ہے۔ ۱

مفتی صدر الدین خاں آذرہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۷۰ء) دہلی میں صدر الصدوری
کے عہدے پر فائز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں فتاویٰ جہاد کی تصدیق و تائید کی اور آپ کی وجہ سے
اُس فتوے کی خوب نشر و اشاعت ہوئی۔ جب حریت پسند ناکام رہے اور فرنگی دوبارہ
غالب آئے تو انھوں نے موصوف کے ساتھ جو سلوک کیا، ملاحظہ ہو:

”۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانہ میں فتاویٰ جہاد کے اہتمام میں منصب
اور جائداد منقولہ وغیرہ منقولہ ان سے چھین لی گئی۔ چند مہینے نظر بند بھی رہے۔
تحقیقات کے بعد رہا ہوئے۔ جائداد غیر منقولہ واپس مل گئی اور جائداد منقولہ
جو نیلام ہو چکی تھی نہ ملی۔“ ۲

مفتی صاحب موصوف کے بارے میں یہی پروفیسر محمد ایوب قادری آگے یوں وضاحت
فرماتے ہیں:

”جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتاویٰ جہاد پر دستخط کیے۔ اُس کی وجہ سے گرفتار
عزل منصب اور ضبطی جائداد کی نوبت پہنچی۔ چند ماہ کے بعد رہائی ہوئی نصف
جائداد اگراشت ہوئی۔۔۔۔۔ تین لاکھ روپے کی مالیت کا کتب خانہ
۱۸۵۷ء میں ضبط ہو گیا، اُس کے حصول کے لیے لارڈ لارنس کے پاس

لاہور پہنچے، مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ لے

مفتی عنایت احمد کا کوروی (المتوفی ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء) بھی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف مردانہ وار لڑے، فتویٰ جہاد کی تشہیر کی اور لوگوں کو انگریزوں کے خلاف غلبہ اُٹھانے پر ہے۔ کالے پانی کی سزا ملی اور جزیرہ اندمان بھیجے گئے مفتی صاحب کے بارے میں قادری صاحب نے ضمناً لکھا ہے:

”مفتی لطف اللہ ولد شیخ اسد اللہ..... پندرہ برس کی عمر کے بعد مفتی عنایت احمد کا کوروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مفتی صاحب (مفتی عنایت احمد کا کوروی) اُس زمانہ میں مفتی ومنصف تھے عمدۂ افتاء کے ساتھ مفتی عنایت احمد صاحب سلسلہ درس و تدیس بھی جاری رکھتے تھے۔ جب مفتی عنایت احمد صاحب کا تبادلہ بحیثیت صدر امین علی گڑھ سے بریلی ہوا تو مولوی لطف اللہ صاحب بھی مفتی صاحب کے ہمراہ پہنچے۔ وہاں جلد کتب درسیہ کی تحصیل سے فراغت حاصل کی۔ بعد فراغ مفتی صاحب نے اپنے ہی اجلاس کا سرپرستہ دار مقرر کر لیا۔ اُسی زمانہ میں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہو گیا۔..... جب مفتی عنایت احمد اندمان سے واپس آئے تو مدرسہ فیض عام کانپور میں اُنھوں نے مولوی لطف اللہ صاحب کو مدرس دوم رکھ لیا پھر مدرس اول ہو گئے۔“ لے

مفتی عنایت احمد کا کوروی علیہ الرحمہ، بریلی میں خان بہادر خاں کے مشیر اور جنرل بخت خاں کے ہمراہ رہے تھے مولانا احمد اللہ شہید نے علماء کی جو ہاد کیٹی بنائی تھی آپ بھی اُن حضرات میں شامل تھے۔ عبورِ دیار سے شور کی سزا ملی اور جزیرہ اندمان بھیجے گئے تھے لیکن ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۱ء میں وہاں سے رہا کر دیے گئے اور واپس گھر آ پہنچے۔ جب آپ حج بیت اللہ

لے محمد ایوب قادری: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۲۴۸

لے ایضاً، ص ۴۵۱

اور زیارتِ روضہ مطہرہ کی غرض سے جا رہے تھے توجہ کے قریب اُن کا جہاز کسی چٹان سے ٹکرایا اور نماز پڑھتے ہوئے ۲۷ شوال ۱۲۷۹ھ / ۱۷ اپریل ۱۸۶۳ء کو مالکِ حقیقی سے جاملے۔
 اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا رسول بخش کاکوروی شروع میں نواب واجد علی شاہ والی اودھ کی فوج میں ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے موقع پر آپ نے کاکوروی اور اُس کے نواح میں تقریریں کر کے انگریزوں کے خلاف ایک لشکرِ جرّار تیار کر لیا تھا۔ اودھ کے فوجیوں کا کافی حصہ آپ کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو گیا تھا۔ تیاریاں جب مکمل ہو گئیں اور حملہ کرنے کی تجویز کی جا رہی تھی، تو انگریزوں نے اس عظیم مجاہد کو اُس کے سترہ ساتھیوں سمیت گرفتار کر لیا اور شاہ پیر محمد کے ٹیلے پر ان جملہ مجاہدین جنگِ آزادی کو پھانسی پر لٹکا دیا۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مولانا رضا علی خاں بریلوی ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت عمر کی اڑتالیس منزل طے کر چکے تھے۔ آپ خان بہادر خاں کے نہ صرف مشیر بلکہ سرپرست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں کی ہدایات کے بموجب خان بہادر خاں کبھی مولانا رضا علی خاں کی ہدایت کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ موصوف کا وصال ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء میں ہوا۔ اِنَّا لِلّٰہ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔
 مولانا نقی علی خاں (المتوفی ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۰ء) ابن مولانا رضا علی خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہما جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے وقت آپ خان بہادر خاں کے دستِ راست بن کر رہے۔ جنرل بخت خاں اور مولانا احمد اللہ شہید نے علماء کی جو ”جہاد کمیٹی“ بنائی تھی اُس میں مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی عنایت احمد کاکوروی اور مولانا رضا علی خاں بریلوی سرِ فہرست تھے۔ مولانا نقی علی خاں بریلوی کی ڈیوٹی مجاہدین کے لیے رسد کا انتظام کرنا تھا۔

مولانا وہاج الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علاقہ مراد آباد میں امیر المجاہدین اور مولانا کفایت علی کافی رامپوری ان کے دستِ راست تھے۔ ران بزرگوں نے مراد آباد سے انگریزی تسلط کا خاتمہ کر دیا تھا۔ مولانا وہاج الدین نے جنرل بخت خاں اور صوبہ سیدار بریلی خان بہادر خاں سے مکمل رابطہ رکھا ہوا تھا۔ شہزادہ فیروز شاہ کی معیت میں مراد آباد کے آخری معرکے میں شکست کھائی، روپوشی کی حالت میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَاَنَا اِلَيْهِ رَاٰجِعُوْنَ۔

ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین اجمیری، مولانا ارشد حسین رامپوری، مولانا ہدایت الرسول، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا تراب علی خواجہ، مفتی ریاض الدین، مولانا غلام جیلانی، مولانا کریم اللہ، مولانا غلام احمد شہید، مفتی عبد الوہاب گوپامٹوی، مولانا ڈاکٹر وزیر خاں اکبر آبادی، مفتی انعام اللہ خاں، مولانا سرفراز علی شاہ جہان پوری، مولانا بیاقت علی الہ آبادی، مولانا اعتقاد علی بیگ، مولانا نور الحسن، مولانا رضی الدین بدایونی اور دیگر سیکڑوں علمائے دین نے سرگرم حصہ لیا۔ بعض میدان جنگ میں مارے گئے تو بعض کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ کتنے ہی تھے جو چھانسی پر لٹکائے گئے اور کئی حضرات کو عبور دیا تے شور کی نرا دی گئی۔

یہاں ایک حقیقت کا اظہار کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا غلام رسول مہرنے اپنی تصنیف، ۱۸۵ کے صفحہ ۲۰۵ پر مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں کو وہابی بتا کر ان حضرات کی رُوحوں کو تڑپانے کی مذموم سعی کی ہے حالانکہ یہ مولانا شہید تو سید قربان علی شاہ جے پوری علیہ الرحمہ کے مرید تھے اور فرقہ خلافت آپ نے پیر محراب شاہ قلندر گویا باری رحمۃ اللہ علیہ سے پایا تھا۔ جب علامہ فضل حق خیر آبادی دہلی پہنچے تو جنرل بخت خاں اُن سے خود ملنے آئے تھے۔ جنرل بخت خاں کے قلب و دماغ میں اگر وہابیت کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو علامہ خیر آبادی جیسے دشمن خارجیت و وہابیت سے ملنا کب گوارہ کیا جاتا بلکہ دہلی میں وہابی علماء بھی موجود تھے لیکن کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ بخت خاں اُن کے پاس گئے ہوں یا وہ حضرات خود آئے ہوں اور اپنی حمایت کا یقین دلایا ہو۔ ان سب باتوں پر طرہ یہ کہ مولانا احمد اللہ شہید اور جنرل بخت خاں نے جو علماء کی ”جہاد گھمٹی“ بنائی تھی اُس کے سرخیل علامہ فضل حق خیر آبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء)، مفتی غیاث احمد کاکوروی (المتوفی ۱۲۷۹ھ/ ۱۸۶۳ء)، مولانا رضا علی خاں بریلوی (المتوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۵ء) اور مولانا فیض احمد بدایونی (المتوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) تھے۔ اگر حضرات وہابی ہوتے تو جہاد گھمٹی کے سربراہ علمائے اہلسنت کیوں بنائے جاتے، کیا وہابی علماء پر مثل ”جہاد گھمٹی“ نہ بنائی جاتی، معلوم سمجھ ایسا ہوتا ہے کہ وہابیوں میں شاید

جھوٹ بولنے کو عیب شمار نہیں کیا جاتا، یا ہو سکتا ہے کہ یہ امکان کذب باری تعالیٰ کے عقیدہ سے اثر ہو کہ جب وہ اپنے معبود کو جھوٹا مانتے ہیں تو خود جھوٹ سے کیوں پرہیز کریں؟ ہو سکتا ہے کہ مولانا غلام رسول مہر جیسے بھاری بھر کم مؤرخ نے اسی وجہ سے یہ پہاڑ جتنا جھوٹ بولنا کوئی عیب یا تاریخ پر ظلم نہ شمار کیا ہو۔

ایک تاریخی مغالطے کا حل

اسی سلسلے میں ایک اور تاریخی مغالطے کا ازالہ بھی از حد ضروری نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ بعض علماء کے بارے میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک یہی بتایا جاتا رہا، اُنھوں نے خود یہی کہا کہ ہم برٹش گورنمنٹ کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اُنھوں نے مطلقاً حریت پسندوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ اگر کسی سے ہو سکا تو خفیہ یا اعلانیہ انگریزوں کی نصرت ضرور کی ورنہ خاموش رہے۔ ۱۹۴۷ء میں نوے سال بعد جب انگریز یہاں سے دوڑ گئے، تو بعض حضرات نے اپنے قلم کا زور اس امر پر صرف کرنا شروع کیا کہ ہمارے وہ علماء تو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہیرو بلکہ انگریزوں کے اصلی بھگانے والے اور ملک کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے والے تھے۔ اس سلسلے میں ہم اُن علماء کے بارے میں دونوں قسم کے بیانات پیش کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام اس تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر آسانی سے فیصلہ کر سکیں:

۱۔ مولانا رشید احمد گنگوہی ۶ رذی قعدہ ۱۲۴۴ھ / تصویر کا ایک رخ

۱۸۶۹ء میں گنگوہ ضلع سہارن پور میں پیدا ہوئے رہا پٹ

نام شیخ ہدایت احمد ولد پیر بخش ہے۔۔۔۔۔ حضرت حاجی امداد اللہ کے مرید

لے پیر بخش نام رکھنا تو تقویۃ الایمان، فتاویٰ رشیدیہ اور ہشتی زیور حصہ اول وغیرہ کتابوں میں شرک لکھا ہے۔ یہ فقہی مسئلہ تو علما نے دیوبند ہی حل فرما سکتے ہیں کہ داد اجماع کے شرک ہونے سے اولاد کے نسب میں تو کوئی فرق نہ آئے گا؟

ہوئے۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں معرکہ شاملی میں شریک ہوئے۔ جس کے نتیجے میں چھ ماہ قید و بند کے شدید مصائب بھیلے۔ دارالعلوم اسلامیہ دیوبند کے بانیوں اور سرپرستوں میں رہے۔ ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء میں انتقال ہوا۔" لے

مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کے پہلے صدر مدرس اور شیخ الحدیث یعنی مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء) کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں تحریر فرماتے ہیں:

۲۔ "مولوی محمد مظہر نانوتوی بن حافظ لطف علی ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن اپنے والد سے کیا۔ پھر مولانا ملوک علی سے علوم مروجہ کی تحصیل کی (یعنی دہلی کالج میں)۔ علم حدیث شاہ عبدالغنی سے حاصل کیا۔ تحصیل علم کے بعد اجیر کالج میں ملازم ہو گئے۔ وہاں سے آگے کالج تبادلاً ہوا۔ جنگ آزادی میں مردانہ وار حصہ لیا۔ جہاد شاملی میں شریک ہوئے۔ پیر میں گولی لگی۔ کچھ دنوں بریلی رہے، معافی عام پر رہا ہوئے۔" لے

مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے اس واقعے کو تفصیل سے مولانا حسین احمد فیض آبادی سابق صدر دارالعلوم دیوبند کی تصریح کے مطابق "نقش حیات" جلد ثانی کے صفحہ ۴۲ تا ۴۳ کے حوالے سے یوں نقل کیا ہے:

۳۔ "جب انقلاب ۱۸۵۷ء کی تحریک اطراف و جوانب ہند خصوصاً اطراف دہلی میں چلنی شروع ہوئی تو ان حضرات کے جوش و خروش میں نئی حرکت پیدا ہوئی۔ ان بزرگوں نے محسوس کیا کہ اس انقلاب میں حصہ لینا فرض اور لازم ہے۔ وہ انگریزوں کے افعال مافیہ اور احوال حاضر پر بخوبی مطلع تھے۔ اس تمام جماعت میں حضرت شاہ ضامن صاحب قدس سرہ العزیز زیادہ

مولانا محمد ایوب قادری: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۵۰،

لے ایضاً: ص ۵۰۳

پیش پیش تھے۔ حاجی امداد اللہ صاحب تحریک القلاب میں حافظ صاحب کے ہمہ اندوز تھے مگر پیش پیش اور اُس قدر جوش میں نہ تھے بد قسمتی سے مولانا (شیخ محمد تھانوی) کی رائے یہ تھی کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا ہم مسلمانوں پر فرض تو درکنار موجودہ احوال میں جائز ہی نہیں۔

اس اختلاف اور فتویٰ کی بنا پر حضرت مولانا رشید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو اُن کے اوطان سے دونوں حضرت نے بلوایا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کو امام مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا محمد قاسم کو سپہ سالار افواج قرار دیا گیا اور مولانا رشید احمد صاحب کو قاضی بنایا گیا اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی اور حضرت حافظ ضامن صاحب تھانوی کو مینہ، میسرہ کا افسر قرار دیا گیا۔ چونکہ اطراف و جوانب میں مذکورہ بالا حضرات کے مقبوض، علم و تصوف اور تشرع کا بہت زیادہ شہرہ تھا اُس وقت ہم بہتھیاروں پر پابندی نہ تھی، عموماً لوگوں کے پاس ہتھیار تھے جن کو رکھنا اور سیکھنا مسلمان ضروری سمجھتے، مگر یہ ہتھیار پرانی وضع کے تھے۔ بندوبست توڑے دار تھیں، کارٹومی رائفیں نہ تھیں، یہ صرف انگریزی فوج کے پاس تھیں۔ مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے اور تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی گئی اور انگریزوں کے ماتحت حکام نکال دیے گئے جب پلٹیں توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یکدم فیر کیا۔ پلٹیں گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی صاحب نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے ان حضرات کی ہر قسم کی قابلیت کا سکے بیٹھ گیا۔

شاملی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا، ضلع سہارن پور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار یا کہ اُس پر حملہ

کیا جاتے چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو وقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی مغلوب ہو گئی۔

حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت

حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا، لہ

پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب نے حاجی امداد اللہ تھاکر کی رحمتہ اللہ علیہ کے تذکرے میں اضافہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

۴۔ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں تھانہ بھون اور اُس کے قُرب وجوار کے مسلمانوں

نے حضرت حاجی صاحب کو امیر جہاد مقرر کر کے شمالی ضلع مظفر نگر میں

انگریزوں سے سخت مقابلہ کیا، جس میں حافظ محمد ضامن صاحب شہید

ہوئے۔ اس معرکہ جہاد میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی،

مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی اور قاضی عنایت علی تھانوی

وغیرہ حضرات شریک تھے۔ جنگ آزادی کا فیصلہ انگریزوں کے حق میں ہوا۔

حاجی امداد اللہ ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے اور اپنی سرگرمیوں

کا مرکز مکہ معظمہ کو بنالیا۔ مکہ معظمہ ہی میں ۱۲۔ جمادی الآخر، ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۹ء

میں انتقال ہوا، لہ

قارئین کرام! مذکورہ صدر علماء کے بارے میں تصویر کا ایک رنگ پیش کر دیا ہے کہ ان

حضرات نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا تھا بہر حال اس دعوے کو سامنے رکھے

اور اسی تصویر کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے۔

مولوی محمد احسن نانوتوی جو ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء سے بنارس

اسی تصویر کا دوسرا رخ کالج میں فارسی کے مدرس اول رہے اور ۱۲۶۷ھ

طالعیز الرحمن نٹھوڑوی، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ راجچی، ۱۹۶۴ء، ص ۶ تا ۸۰۔

محمد ایوب قادری، تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۱۲۳

۱۸۵۱ء میں تبدیل ہو کر بریلی کالج آگئے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت بھی بریلی

گورنمنٹ کے وفادار اور غیر خواہ رہے جیسا کہ پروفیسر محمد ایوب قادری تصریح فرماتے ہیں۔

۵۔ "۲۲ مئی (۱۸۵۷ء) کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد آسن صاحب نے بریلی کی مسجد

نوحہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے

بغاوت کرنا خلافِ قانون ہے۔ نواب بہادر خاں، کمشنر بریلی مسٹر ایگزیکٹو

کے بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتماد تھا، اس

سلسلے میں ایک انگریز مورخ رقمطراز ہے: "پچھلے صدی کے

محافظ (حافظ رحمت خاں) کے پوتے خاں بہادر نے کمشنر (بریلی) کی

کونستشوں کی پوری پوری تائید کی اور (بریلی) کالج سے منسلک ایک

مولوی (محمد آسن نانوتوی) نے مسجد میں تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت

سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے۔" لے

موصوف کی اس تقریر نے بریلی کے مسلمانوں میں آگ لگا کر رکھ دی۔ مولانا محمد آسن نانوتوی

کے خلاف غیظ و غضب کا ایک طوفان اُٹ آیا کیونکہ یہ مسلمانوں کے جذبہ ہریت کے لیے کھلا ہوا

چیلنج، اُن کی دینی غیرت کو لٹکانا اور تعلیماتِ الہیہ کو بازیچہ اطفال بنانا تھا۔ چنانچہ

قادری صاحب لکھتے ہیں:

۶۔ "اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد آسن

نانوتوی کے خلاف ہو گئے۔ اگر کو تو الٰہی شہر شیخ بدر الدین کی فمائش پر

مولانا بریلی نہ چھوڑتے تو اُن کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا اور اس تقریر

کا ردِ عمل یہ بھی ہوا کہ ۲۵ مئی، ۱۸۵۷ء کو بروز عید نوحہ کی مسجد میں

مولوی رحیم اللہ خاں نے انگریزوں کے خلاف سخت تقریر کی اور اُس موقع

پر بہت خاں بھی موجود تھے۔ مسلمانوں میں بہت ہوش پیدا ہو گیا تھا مگر کو تو الٰہی

نے اپنی حکمتِ علی سے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا، لے
۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے وقت بعض علماء و علماءِ دیوبند کا ایک ہنگامی اجلاس ہوتا ہے۔
آزادی کے بارے میں غور کیا گیا۔ گفتگو کیا ہوئی، ملاحظہ فرمائیے:

”تھانہ بھون میں حضرت حاجی امد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ
محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم
نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس
مجلس میں مولانا محمد احسن بھی شریک ہوئے (جنہوں نے ۲۲ مئی ۱۸۵۷ء
کو بریلی میں تقریر کرتے ہوئے برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کو خلافِ شرع
بتایا تھا) مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا:
جب قاضی عنایت علی جنگ کے دوران خاموش رہے اور عائنِ مجلس
میں سے بھی اُس وقت کسی نے اُس کو جہاد سمجھ کر اُس (جنگِ آزادی)
میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اس لڑائی
کو جہاد کیسے کہا جاسکتا ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری
اور بے سروسامانی کو عدم جہاد کا سبب قرار دیا گیا۔“ لے

اثرِ علی تھانوی جو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے چھ سال بعد ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء میں
رہے تھے انہوں نے بھی جب اس جنگِ آزادی کے جملہ حالات و کوائف پر نظر
فرمایا تو یہی فیصلہ صادر فرمایا تھا کہ یہ محض ایک لڑائی تھی، اسے جہاد قرار نہیں دیا جاسکتا۔
قادری صاحب لکھتے ہیں:

”مولانا اثر علی تھانوی نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔“ نیت کا حال
تو خدا ہی جانتا ہے بظاہر تو اُس (جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) کو جہاد کا درجہ

نہیں دیا جاسکتا۔ لے

بعض علمائے دیوبند نے حاجی املاؤ اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کو امیر المومنین مقرر کر کے اپنے علاقے میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ حکومت اس لیے قائم کی گئی تھی کہ انگریزی اقتدار کا مختلف و متعدد مقامات سے جنازہ نکل گیا تھا۔ اپنے موافقین کو حکومت نے مطلع کر دیا کہ اب تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی پڑے گی کیونکہ حکومت تو آپ ہی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ چنانچہ تھانہ جھون کے گرد و نواح میں علمائے دیوبند نے حریت پسند کی لیگ سے خود کو محفوظ رکھنے کی غرض سے اپنی ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ اس حقیقت کو مشہور دیوبندی عالم اور مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ) کے سوانح نگار مولوی عاشق الہی میرٹھی نے بیان کر کے یوں حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہوا ہے:

۹۔ "اس بلامنی کی عانت میں جس کو قصہ کی اصلیت ظاہر کرنے کے لیے مختصر

الفاظ میں حاشیہ پر درج کر دیا گیا ہے۔ عام باشندگانِ قصبہ کی یہ حالت ہوئی

گویا اُن کا مرتی و منتظم بادشاہ (برٹش گورنمنٹ) سر سے اُٹھ گیا اور شرعی

و طبعی ضروریات و مخصات میں بھی کوئی خبر گیر نہ رہا، جس کی رائے پر عمل کریں۔

پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ

ہاں کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت

کے باعث اپنا امن اُٹھایا اور ہڈ بڑا اشتہار عام اطلاع دے دی ہے

کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے۔ اس لیے آپ چونکہ ہمارے

دینی سردار ہیں، اس لیے دنیاوی نظم حکومت کا بھی بار اپنے سر پر رکھیں اور

امیر المومنین بن کر ہمارے باہمی قصبے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت

مکو اُن کی درخواست کے موافق اُن کے سروں پر ہاتھ رکھنا پڑا۔ آپ نے

دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک

قاضی شرع بن کر فیصل بھی فرماتے۔ اسی قصہ نے مفسدوں میں ترکیب ہونے کی راہ چلائی اور مغربوں کو جھوٹی سچی خبری کا موقع دیا۔ ۱

انگریز کی حکومت اٹھ جانے اور برٹش گورنمنٹ کے اعلان پر عمل کرنے کی غرض سے علمائے دیوبند نے جو سیلف گورنمنٹ قائم کر لی تھی اور حریت پسندوں کی یلغار سے خائف ہو کر منظم ہوتے تھے کیونکہ حریت پسند ان امتحان کو عموماً مجبور کرتے یا ٹوٹ لیا کرتے تھے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے موقع پر انگریزوں کی حمایت کرتے یا تحریک آزادی میں حریت پسندوں کا ہاتھ نہ بٹاتے تھے۔ علمائے دیوبند کا ایک مرتبہ حریت پسندوں سے مقابلہ بھی ہو گیا تھا، جس کو بعد والوں نے تو مختلف رنگوں میں پیش کیا ہے لیکن مولوی عاشق الہی میرٹھی یوں تصریح کرتے ہیں:

۱۔ ”ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولانا محمد قاسم نانوتوی اور طبیب حانی) علی حضرت حاجی صاحب و نیز ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بند و فچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما جھٹاپی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اسی لیے اٹل پہاڑ کی طرح پراجا کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جانثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ رے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہونٹاک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہر آب ہو جائے وہاں چند فقیر یا تھنوں میں تلواریں لیے جم غفیر بند و فچیوں کے سامنے ایسے جھے رہے گویا زمیں نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پرفیرس ہوئیں اور حضرت ضامن صاحب زیر ناک گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔“ ۲

انگریزوں نے جب دوبارہ غلبہ پایا تو مغربوں نے مولانا رشید احمد گنگوہی پر برٹش گورنمنٹ کے باغی ہونے اور دیوبندی اصطلاح کے مفسدوں یعنی حریت پسندوں کی معاونت کرنے کی تمت لگا دی، جس کا ان کے سوانح نگار نے یوں شکوہ کیا ہے:

۲۔ عاشق الہی میرٹھی، مولانا، تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۴،
۳۔ ایضاً، ص ۵،

۱۱۔ شروع ۱۲۷۶ ہجری نبوی / ۱۸۵۹ء دو سال تھاجس میں حضرت امام ربانی

(مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرہ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے

باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی، لہٰذا

موصوف نے آگے اس الزام تراشی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے یہ وضاحت بھی فرمائی ہے۔

۱۲۔ ”جب بغاوت و فساد کا قلعہ فرو ہوا اور رحم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ

غلیبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے

اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ چھوٹی سچی تمتموں اور مغبری کے پیشیہ سے سرکاری

خیبر خواہ اپنے کو ظاہر کریں انھوں نے اپنا رنگ جھپٹا دیا اور ان گوشہ نشین حضرات

(علمائے دیوبند) پر بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مغبری کی کہ تھانہ کے فساد میں

اصل الاسول یہی لوگ تھے“ ۱

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) پر ۱۸۵۶ء میں حکومت کے باغیوں

کا ساتھ دینے یا خود بغاوت کرنے کا جس شخص نے پاک و ہند میں سے الزام لگایا، وہ واحد

شخص قاضی محبوب علی خاں تھے۔ اگرچہ آج اُن پر یہی الزام عائد کرنے والے کتنے ہی حضرات

ہیں اور وہ مولانا گنگوہی پر الزام تراشی کر کے اُن کے متبع ہونے کا دم بھرتے اور اس کے باوجود

اپنا شمار موصوف کے عقیدت مندوں میں کرتے ہیں، حالانکہ گنگوہی صاحب کے سوانح نگار

نے لکھا ہے:

۱۳۔ ”حاکم کے انتظام کا اٹھنا تھا کہ باہم رعایا میں برسوں کی دبی ہوئی عداوت نکلنے

اور خدا جانے کس کس زمانہ کے انتقام لینے کا وقت آگیا کہ جدھر دیکھو مار پیٹ

اور جس محل پر نظر کرو معرکہ آرائی و جنگ۔ اسی بلاخیز قصہ میں تھانہ بھون کا وہ فساد

واقع ہوا، جس میں قاضی محبوب علی خاں کی مغبری سے حضرت مولانا (رشید احمد

۱۔ عاشق الہی میرٹھی، مولانا، تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۳۷،

۲۔ ایضاً، ص ۷۷،

گنگوہی) پر مقدمہ قائم ہوا، لے

جب مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کر لیا گیا اور اُن پر مقدمہ چلانا شروع ہوا تو عدالتی کارروائی کس مزے کی ہوئی یہ موصوف کے زبردست قبیح و معتد مفتی عزیز الرحمن نہٹوڑوی کی زبانی مینے :

۱۴۔ "حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی)

اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے نام وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔۔

آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھیال دامپور تشریف لے گئے لیکن منبر کی

خبر سانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔

یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارنپور جیل کی

کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مقدمہ

چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے

تسلیم دیکھا کر فرمایا: "ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے" سہارن پور جیل سے آپ کو

منظر نگار جیل منتقل کیا گیا۔ بالآخر جیل گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا، رہا کر دیا گیا۔"

مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) اینڈ کمپنی نے ۱۸۷۵ء میں حریت پسندوں کا

ساتھ دیا اور اپنے گروہ کی زبانی مفسدوں میں شریک رہے تھے یا حکومت کے خیر خواہ نہ تھے؟ اس

سوال کے جواب میں خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار، مولانا عاشق الہی میرٹھی نے یوں

جواب دیا ہے:

۱۵۔ "جیسا کہ آپ حضرات (گنگوہی و نانو توہی صاحبان) اپنی مہربان سرکار کے دلی

خیر خواہ تھے تا زلیست خیر خواہ ہی ثابت رہے۔"

لے عاشق الہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۴۷

لے عزیز الرحمن نہٹوڑوی، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۷۱

لے عاشق الہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۹

مولانا رشید احمد گنگوہی نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حریت پسندوں کا ساتھ دیا یا حکومت کا
آپ بھر گورنمنٹ کے وفادار رہے یا ملک و ملت کے؟ اس کا جواب خود گنگوہی صاحب کی
زبانی ملاحظہ ہو:

۱۶۔ ”میں (گنگوہی صاحب) حقیقت میں سرکارِ کافرماں بردار ہوں تو جھوٹے الزام
سے میرا بال بھی بیکار نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکارِ مالک ہے، اُسے اختیار
ہے جو چاہے کرے“

ب۔ مدعی لاکھ پیر بھاری ہے گواہی تیری

قارئینِ کرام! یہ مندرجہ بالا سولہ بیانات و عبارات علمائے دیوبند کی تصانیف سے ہی
پیش خدمت ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان پر اکتفا کرنا کافی سمجھا گیا ہے۔ فیصد کرنا تو قارئینِ حضرات
کا کام ہے لیکن بغرض سہولت ہم مذکورہ عبارتوں کا مفاد اور جہاں متضاد باتیں ہیں ان کی مطابقت
پیش کرتے ہیں۔ واللہ التوفیق:

۱۔ جب گنگوہی صاحب خود اعلان فرما رہے تھے کہ میں برٹش گورنمنٹ کا وفادار ہوں ،
۱۸۵۷ء کی لڑائی کے وقت بھی وفادار رہا تھا اور انگریزوں کے خلاف کوئی قدم
نہیں اٹھایا تھا، اس کے باوجود بھی جو یہ کہتا ہے کہ انھوں نے انگریز سے بغاوت یا اس
لڑائی کی تھی وہ موصوف پر جھوٹا الزام لگاتا ہے۔ آپ کی اس ذاتی تصریح کے بعد
جیسا کہ آخری عبارت سے معلوم ہو رہا ہے، کسی کا دعویٰ کہ گنگوہی صاحب نے، ۱۸۵۷ء
کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا تھا سراسر بے معنی اور خلافِ واقعہ ہو کر رہ جاتا ہے یا نہیں؟
۲۔ گنگوہی صاحب کے اس ذاتی بیان سے پہلی چاروں عبارتیں غلط اور ان کے دعوے
بے بنیاد ثابت ہو کر رہ گئے۔ گنگوہی صاحب کے انکار کے سامنے کسی دوسرے کا
بیان کہاں قابلِ قبول ہے؟

۳۔ تذکرۃ الرشید کتاب، جو مولانا رشید احمد گنگوہی کی سوانحِ حیات ہے وہ موصوف

کی زندگی میں ہی لکھی گئی، اُن کے خاص معتمد و معتقد نے لکھی، جو دیوبندی جماعت کے ایک جید عالم بھی تھے اور یہ کتاب پہلی مرتبہ میرٹھ سے ۱۳۱۳ھ/۱۹۰۵ء میں چھپی۔ کسی دیوبندی عالم نے اس کے مندرجات پر تنقید نہیں کی بلکہ بسو حشتم تسلیم کرتے آئے۔ دریں حالات ۱۹۶۱ء میں چھپنے والے تذکرہ علمائے ہنداردو میں اگر تذکرۃ الرشید کی طباعت کے چھٹے سال بعد اپنے اکابر کی حقیقت کو بدل کر پیش کیا جاتے، اس طرح کہ رات کو دن اور دن کو رات کہنے اور کھوانے کی مہم شروع کر دی جاتے، اس سے اگرچہ حقیقت نفس الامری تو نہ بدل سکے گی لیکن جس جماعت کا اپنے روزِ اول سے طریقہ و دستور ہی یہی ہو کہ ”جنا گئے تو جناد اس، گنگا گئے تو گنگا رام“ اگر وہی عجت انگیزوں کے چلے جانے کے بعد اپنے اکابر کی تاریخ میں اول بدل نہ کرے تو آخر دنیاواوں کو منہ کیسے دکھائے؟

۳۔ مولانا عاتق الہی میرٹھی جب ۱۹۰۵ء میں علی الاعلان لکھ رہے تھے کہ اکابر دیوبند تمام عبرتیں گورنمنٹ کے غیر خواہ رہے، کسی دیوبندی عالم نے اس خیال کی تردید نہیں کی جیسا کہ عبارت ۵۱ سے ظاہر ہے۔ دریں حالات اُن پر برٹش گورنمنٹ سے لڑنے یا اس کی بدخواہی کا دعویٰ کرنا سراسر الزام ہے یا نہیں؟

۵۔ جب علمائے دیوبند کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں انگریزوں سے لڑنے والے باغی اور مفسد ہیں جیسا کہ عبارت نمبر ۱ اور نمبر ۱۱ سے ظاہر ہے تو معلوم نہیں آجکل کے دیوبندی علماء کیوں اپنے اکابر کی توہین کے مرتکب ہونے لگے کہ اُن حضرات کو باغیوں اور مفسدوں کی فہرست میں شامل کرنے پر بضد ہیں۔

۶۔ جب علمائے دیوبند کے نزدیک یہ جنگِ آزادی شرعی نقطہ نظر سے جہاد نہ تھا، جیسا کہ عبارت ۵، ۵۱ اور ۵۲ میں ہے، دیوبندیوں کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بھی یہی فیصلہ ہے جیسا کہ عبارت نمبر ۱ سے ظاہر ہے ان حالات و حقائق کے پیش نظر عبارت نمبر ۴ میں اس لڑائی کو معرکہ جہاد کہنا کس وجہ سے ضروری سمجھا گیا؟

۷۔ اگر علمائے دیوبند نے باغ میں بیٹھ ہوئے انگریزی فوج سے لڑائی کی تھی، تو پتہ نہ بھی

چھینا تھا اور شالی قصبے سے بھی انگریزی فوج کو مار پیٹ کر بھگا دیا تھا، بلکہ بقول مولانا حسین احمد فیض آبادی انگریزی توپ خانے کو کھینچ کر حاجی صاحب کے پاس پہنچانے والے خود گنگوہی صاحب تھے جیسا کہ عبارت نمبر ۳ میں ہے تو عبارت نمبر ۱۴ ملاحظہ فرمائیے کہ یہاں گنگوہی صاحب عدالت کو تسبیح دکھا کر فرما رہے ہیں کہ حضور! ہمارے پاس تو صرف یہ ہتھیار ہے بلکہ آگے تصریح موجود ہے کہ گورنمنٹ کو کوئی ثبوت اس بات کا نہ مل سکا کہ گنگوہی صاحب نے، ۱۸۵۵ء کی جنگ آزادی میں حکومت کے خلاف کوئی حصہ لیا تھا اور اسی وجہ سے مجبور ہو کر رہا کرنے پڑے تھے لیکن پوری ایک صدی گزر جانے کے بعد آج ان کے معتقدین کہاں سے ثبوت مل گیا کہ موصوف بھی انگریزوں سے معرکہ آراء ہوئے تھے؟

۸۔ اگر واقعی علمائے دیوبند اور عالیشان گنگوہی صاحب نے انگریزی فوج سے باغ میں چھپ کر اور قصبہ شالی میں لڑائی کی ہوتی، بلکہ توپ خانہ تک چھینا ہوتا تو انگریزی عدالت کے پاس سیکرڈ گواہ اس امر کی شہادت دیتے، توپ خانہ جیسی چیز چھین جانے پر بھی حکومت کو ثبوت نہ ملتا، ایک ایسی کج بھارت ہے جو کسی ذی ہوش کی سمجھ میں مشکل ہی آسکتی ہے نیز گنگوہی صاحب پر ہی کیا منحصر اگر علمائے دیوبند نے باغ میں اور شالی قصبے کے اندر یہی کچھ کیا ہوتا تو، ۱۸۵۵ء میں ہی انگریزوں نے کتنے ہی علمائے دیوبند کو پھانسی دے دی ہوتی لیکن انگریزوں نے تو ۱۸۵۱ء تک ان سے یہ بھی نہ کہا کہ اے ہمارا توپ خانہ چھیننے والو! اے قصبہ شالی سے ہماری فوج کو بھگا دینے والے ردھانی پشواؤ! ہمارا توپ خانہ واپس کرو اور پھانسی پر لٹکنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ آخر ایسا کیوں نہ کہا گیا؟

۹۔ ۱۸۵۹ء میں جب بعض حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوئے تو ساری دیوبندی جمیعت میں سے اور پورے پاک دہند کو انگریزی اقتدار سے بزعیم خود نجات دینے اور دلانے والوں کے لشکرِ چار کے ایک راس مجاہد، نام رشید احمد، ساکن قصبہ گنگوہ کو تسبیح سمیت گرفتار کر لیا گیا۔ وہ بھی از خود نہیں بلکہ قاضی محبوب علی خاں کی مخبری پر گرفتار ہوئے

ورنہ اس تکلف کی بھی حکومت کو کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اگر ان حضرات نے اس جنگ میں واقعی انگریزوں کے خلاف کوئی حصہ لیا ہوتا، جس طرح کہ پہلی چاروں عبارتوں میں تاثر دیا گیا ہے تو، ۱۸۵۵ء کے آخر سے ۱۸۵۹ء تک ان حضرات کو مہلت کیوں دی جاتی؟ کیا حکومت اپنے باغیوں کو اتنی مہلت دے سکتی تھی؟

۱۔ ان حضرات کو مجاہد بنانے کی عمارت جنگِ شامی کی بنیاد پر اٹھائی گئی ہے۔ اس لڑائی کا تذکرہ، پیش کردہ عبارت ۱، ۲، ۳ اور ۴ میں موجود ہے۔ پہلی چاروں عبارتوں کا نقطہ نظر عبارت ۵ کے خلاف ہے۔ یہاں علمائے دیوبند کی مذکورہ پانچوں عبارتوں میں تطبیق دینا ضروری ہے تاکہ صحیح صورت حال سامنے آجائے۔

۱۱۔ عبارت ۲، ۳ اور ۴ میں ایک بات مشترک ہے کہ حافظ محمد ضامن صاحب جنگِ شامی میں مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ صرف یہی جانی نقصان ہوا تھا اور باقی سب خیریت ہے۔

۱۲۔ باقی رہا یہ تعین کہ جنگِ شامی کہاں ہوئی تھی، عبارت ۵ جو تذکرۃ الرشید کی ہے اس میں تو یہی تصریح کی گئی ہے کہ شامی کے نزدیک جب یہ حضرات باغ میں چھپے ہوئے تھے اور اس وقت قصدِ یا اتفاقیہ جو لڑائی ہو گئی یا لڑنا پڑ گیا، اُسی کا نام جنگِ شامی ہے۔ اور اسی باغ والے معرکے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے لیکن مولانا حسین احمد فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب نادری صاحبان فرماتے ہیں کہ باغ کی معرکہ آرائی کے بعد یہ روحانی گروہ قصبہ شامی میں انگریزی فوج سے بھی جا کر لڑا تھا، وہاں سے انگریزی فوج کو جھکا کر اپنا قبضہ بھی جمایا تھا اور اس آخری معرکے میں جو شامی قبضے کے اندر ہوا، حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے۔ حقیقت تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے اور اس کی عطا سے پھر اس کا محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ لیکن ہمیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تذکرۃ الرشید کا بیان ہی درست ہے کیونکہ مولانا حسین احمد فیض آبادی اور پروفیسر محمد ایوب نادری صاحب کے بیانات سے صریحاً بناوٹ کی بو آ رہی ہے۔ اگر غیر جانب داری سے ذرا بھی دماغ پر زور دیا جائے تو معاملے کی تہہ تک پہنچ جانا

قطعاً مشکل نہیں رہتا۔ مثلاً :

۱۳۔ اگر باغ کی لڑائی کے علاوہ ان حضرات نے شاملی قصبے میں جا کر انگریزی فوج کو جگایا ہوتا تو غلبہ پانے کے بعد انگریز فوراً ان حضرات کو گولی کا نشانہ بنا دیتے یا پھانسی پر لٹکا دیتے کیونکہ اس حالت میں گواہوں کی کمی رہتی نہ ثبوت کی۔ لیکن ان حضرات کے ساتھ حکومت نے کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی۔ اس سے ثابت ہوا کہ علمائے دیوبند شاملی قصبے میں جا کر ہرگز انگریزوں سے نہیں لڑے بلکہ صرف باغ والی لڑائی کا واقعہ ہی درپیش آیا تھا اور حافظ ضامن صاحب باغ والے معرکے میں شہید ہوئے تھے۔

۱۴۔ عبارت ۱ میں فیض آبادی صاحب نے یہ اقرار بھی کیا ہے کہ شاملی قصبے کے معرکے میں حافظ ضامن صاحب شہید ہوئے تھے۔ لیکن تذکرۃ الشہید کی عبارت ۱ میں باغ والے معرکے کو شاملی کی لڑائی بتایا اور اسی میں حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا لکھا ہے۔ لہذا معلوم یہی ہوتا ہے کہ لڑائی صرف باغ والی ہوئی، یہیں حافظ صاحب شہید ہوئے اور اسی کو مولانا حسین احمد صاحب نے شاملی قصبہ تک بغیر کسی ثبوت کے محض اپنے جوش عقیدت سے پھیلا دیا، پھر دوسرے حضرات نے اسی فرضی بنیاد پر ہوائی قلعہ تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔

۱۵۔ اس سلسلے میں یہ بات تصفیہ طلب رہ گئی کہ لڑائی تو صرف باغ میں چھپ کر ہوئی تھی لیکن وہ لڑائی کس سے لڑی گئی؟ انگریزی فوج سے یا حریت پسندوں سے؟ عبارت ۱ اور ۲ اشارۃً اور عبارت ۳ اور ۴ صراحتاً یہ بتا رہی ہیں کہ ان حضرات نے انگریزوں سے لڑائی کی تھی، جن میں سے تین بیانات قیام پاکستان سے بعد کے ہیں یعنی ۱۹۶۱ء کے اور صرف ایک بیان ایسا ہے جو قیام پاکستان سے شاید پہلے دیا ہو لیکن کانگریس کی ہمنوائی اور گاندھی کی پیشوائی کا سہارا لے کر انگریز دشمنی کا اعلان کیا گیا کہ نہ صرف ہم اپنے ہندو بزرگوں اور بھائیوں کے زیر سایہ انگریزوں سے لڑنے کو تیار ہیں بلکہ ہمارے تو اکابر بھی برٹش گورنمنٹ سے برسرِ پیکار رہے تھے۔ مقصد صرف ہندو کا اعتماد حاصل کرنا معلوم ہوتا ہے ورنہ حقیقت میں اگر ان حضرات نے انگریزوں سے

روائی کی ہوتی تو کم از کم دس بیس بڑے بڑوں کو ضرور انگریزوں نے پھانسی پر لٹکا دیا ہوتا لیکن معاملہ برعکس ہے کہ قریباً ڈیڑھ سال بعد صرف ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو پکڑا گیا اور چھ ماہ کے بعد وہ بھی رہا کر دیے گئے کہ ان کی انگریز دشمنی کوئی معمولی سا بھی ثبوت خود حکومت کو نہ مل سکا۔ ان حقائق کے پیش نظر عبارت مذکورہ درست معلوم ہوتی ہے کہ یہ حضرات برٹش گورنمنٹ کی حمایت میں حریت پسندوں سے لڑے تھے اور حکومت کے باغیوں کا قلع قمع کرنے کی غرض سے باغ میں چھپے ہوئے تھے۔

۱۶۔ ہو سکتا ہے یہاں کوئی صاحب یہ سوال کر دیں کہ اگر علمائے دیوبند حریت پسندوں سے لڑے تھے تو مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کو گرفتار کیوں کیا گیا تھا نیز المخلص حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی (المتوفی ۱۳۱۴ھ/ ۱۸۹۹ء) اور مولانا محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۷۹ء) کے وارنٹ گرفتاری کیوں جاری ہوئے تھے؟ معلوم تو کچھ ایسا ہوتا ہے کہ وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کا قصہ ہی من گھڑت ہے اور اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو شاید ایسا ہوا ہو گا کہ حکومت کے پاس ان حضرات کے خلاف جتنار بیکار ڈ تھا جس کی بنا پر وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے تھے، اُس سارے ریکارڈ اور وارنٹ گرفتاری کے جملہ حروف علمائے دیوبند کی عظیم روحانی طاقت نے مٹا دیے ہوں گے اور خالی کاغذات کو دیکھ کر حکومت کے کارندے کوئی انتقامی کارروائی کرنے سے عاجز رہ گئے ہوں گے۔ اس شبہ کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ قبلہ حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ توحید چھاپا کر مکہ معظمہ کی طرف نکل گئے تھے لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی تو ۱۸۵۷ء سے ۱۸۷۹ء تک متحدہ ہندوستان میں ہی رہے اور دارالعلوم دیوبند کے بانی کی حیثیت بھی اختیار کر گئے تھے لیکن ان بائیس سالوں میں بھی حکومت کے جاری کردہ وارنٹ گرفتاری مولانا کی روحانیت سے خائف ہو کر ان پر اثر انداز ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

باقی رہا مولانا رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) کی گرفتاری والا معاملہ۔ تو اس سلسلے میں گزارش یہی ہے کہ موصوف کو اس بنا پر ہرگز گرفتار نہیں کیا گیا

کہ انہوں نے انگریزوں سے ۱۸۵۷ء میں کوئی لڑائی جھڑائی کی تھی بلکہ انہیں تو تقریباً
 ڈیڑھ سال بعد محض مجنوں کی تسکین خاطر کی غرض سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں
 حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ کسی کے مال جان کی ذمہ دار نہیں ہے بلکہ حالات
 ایسے موڑ پر آ پہنچے ہیں کہ اب ہر کوئی اپنی حفاظت آپ کرے۔ اس اعلان کے
 پیش نظر تھانہ مجنوں اور اس کے گرد و نواح میں اپنے انتظامی امور سرانجام دینے کی
 غرض سے ایک انتظامیہ کمیٹی بنائی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی بنا پر بعض حاسدوں نے
 انگریزی حکام کے کان بھرے تو انہیں مطمئن کرنے کی غرض سے پورے علاقے میں سے
 ایک مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کر لیا گیا اور چھ ماہ کے بعد حکومت نے موصوف کو
 اپنا سچا وفادار تسلیم کر کے صاف بری کر دیا۔ ان جملہ حقائق کو پیش کردہ عبارت ۱۷ میں
 ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے، اسی عبارت کا یہ آخری جملہ کتنا معنی خیز ہے۔ ”اسی قصہ نے
 مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مجنوں کو جھوٹی سچی مجبوری کا موقع دیا۔“
 ۱۷۔ عبارت ۱۷ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باغ میں چھپ کر جب ان بانکے جاثناروں نے
 حریت پسندوں پر فائرنگ کی تھی اس وقت شاید رات تھی جیسا کہ ان الفاظ سے
 مترشح ہوتا ہے کہ ”جب پلٹن مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے
 یکدم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھپے ہوئے ہیں۔“
 اگر یہ رات کا وقت نہیں تھا تو یہ صورت رہی ہوگی کہ باغ میں سے چھپ کر ہی فائر
 کرنے رہے ہوں گے سامنے مقابلے پر نہیں آتے ہوں گے جس سے ان کی تعداد
 کے بارے میں کوئی اندازہ لگایا جاسکتا۔

۱۸۔ عبارت ۱۸ سے یہ واضح ہو رہا ہے کہ یہ صرف چند حضرات تھے، ہاتھوں میں تلواریں
 لیے پھر رہے تھے کیونکہ اپنے علاقے کے حاکم بن بیٹھے تھے کہ حریت پسندوں سے
 کم از کم اپنی حکمرانی کو محفوظ رکھیں حریت پسندوں یعنی اپنی انگریزی سرکار کے
 باغیوں کو دیکھ کر ان حضرات کے جذبہ جہاں شناری نے جوش مارا اور ان سے بڑھ گئے۔
 ۱۹۔ جہاں تک ان حضرات کی جہاں فردی و شجاعت کا تعلق ہے تو وہ ہر قسم کے شک و شبہ

بالا تڑ ہے۔ مولانا عاشق الہی میرٹھی کے یہ الفاظ ترجمانی کے لیے کافی ہیں۔ ”بند و فقیوں
مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرہ آزماج تھا اپنی سرکار کے مخالفت باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا
ہٹ جانے والا نہ تھا، اسی لیے اٹل پہاڑ کی طرح پراجا کر ڈٹ گیا اور سرکار پر
جاں نثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ کے شجاعت و جوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے
تیسرے کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جاتے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں
لیے جم غفیر بند و فقیوں کے سامنے ایسے جھے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔“
اس عبارت کا ایک ایک لفظ ان حضرات اکابر دیوبند کے اقوال و افعال کی ترجمانی کا
واقعی پورا پورا حق ادا کر رہا ہے۔ اپنے اکابر کی شجاعت و جوانمردی اور برٹش گورنمنٹ
پر جہاں نثاری کے جذبے کی اس سے بہتر شاید کوئی بھی دیوبندی عالم الفاظ کے آئینے
میں تصویر نہ دکھاسکا ہوگا۔ ہر منصف مزاج ان لفظوں کو دیکھ کر پکار اٹھتا ہے: ص
کشش لفظوں میں ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

۲۰۔ عبارت ۲۰ تو بتا رہی ہے کہ ان حضرات کے جھنڈے تلے ہزاروں مجاہد جمع ہو گئے تھے
لیکن عبارت ۲۱ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اپنی طرز کے مجاہدوں میں یہی چند فقیر (علمائے
دیوبند) تھے۔ بہر حال تعداد کچھ بھی سہی اتنا ضرور ہے کہ حافظ ضامن صاحب کے شہید
ہوئے سے پہلے ان حضرات نے گورنمنٹ کی مخالفت یا حمایت میں کوئی لڑائی نہیں
لڑی اور جس معرکے میں حافظ صاحب شہید ہوئے تھے اس کے بعد باقی مجاہد خواہ وہ
ہزاروں کی تعداد میں تھے یا کم و بیش، لیکن سب کی شجاعت و جوانمردی کا تلامذہ خیر
طوفان تھم گیا تھا اور صرف ایک آدمی کے شہید ہو جانے کی وجہ سے باقی سب نے
خاموشی اختیار کر لی، علاوہ جانب دار ہو کر معتکف ہو بیٹھے تھے۔ اس حقیقت کو
مولانا حسین احمد نانڈوی صاحب (المتوفی ۱۳۷۷ھ/ ۱۹۵۷ء) نے کیسے حسرت
و یاس کے الفاظ میں بیان کر کے ان حضرات کے مجاہدانہ عوائم اور شجاعت و
دلیری کا سکہ بٹھادیا ہے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا شہید ہونا تھا کہ معاملہ
بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ موصوف کا اس طرح آہ سرد بھرنا صورت حال کی پوری پوری

غازی کو رہا ہے۔

۲۱۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ علمائے دیوبند برٹش گورنمنٹ کے ہرگز مخالف نہیں تھے بلکہ ضرورت پڑنے پر جہاں نثار سپاہی بھی بن جاتے تھے کیونکہ یہ پورا بھی انگریزی حکومت کا خود کاشتہ تھا اور اسے اپنی پرورش کے لیے سخت ضرورت تھی کہ حکومت اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھے۔ ۱۸۵۷ء میں اس نوزائیدہ گروہ نے پورا پورا ثبوت اپنی انگریز دوستی کا فراہم کر دیا تھا۔ نہ انھوں نے فتویٰ جہاد پر دستخط کیے اور نہ ایسا کوئی فتویٰ خود جاری کیا۔ نہ بادشاہ کی حمایت کا کوئی اعلان کیا اور نہ انگریزوں کے خلاف ایک لفظ کسی دیوبندی عالم نے منہ سے نکالا۔ نہ یہ حضرات جنرل بخت خان مولانا احمد اللہ شہید یا کسی بھی دوسرے حریت پسند کی زیرکمان انگریزوں سے لڑے اور نہ کسی بھی مرحلے پر ان سے رابطہ قائم کر کے انھیں اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ جو حضرات گاندھی کو پیشوا مان بیٹھے انھوں نے توڑنگے جھنڈے کے زیر سایہ ہندوؤں کی ہمنوائی میں انگریزوں کے خلاف ضرور لب کشائی شروع کی باقی جملہ علمائے دیوبند نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو ہمیشہ غدر کہا، حریت پسندوں کو باغی اور مفسد ہی ٹھہراتے رہے۔ یہ وہ امور ہیں جو تاریخ سے ثابت ہیں، کوئی دیوبندی عالم اس کے برعکس آج تک ثابت نہیں کر سکا ہے، اگرچہ پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب بعض اوقات اکابر دیوبند کو محض نجابل عارفانہ کے بطور اور علمائے دیوبند کو خوش کرنے کی غرض سے مجاہدین جنگ آزادی لکھ دیا کرتے ہیں ویسے حقیقت میں ان کے نزدیک بھی علمائے دیوبند وہی کچھ ہیں جو کچھ وہ حضرات تھے اور جو کچھ ۱۹۴۷ء سے پہلے خود ان کے متعلق کہا جاتا رہا۔ باری تعالیٰ شانہ کی حکمت زالی ہے۔ جس محمد ایوب قادری صاحب کے بل بوتے پر آج علمائے دیوبند اپنے اکابر کو جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء کے مجاہد منوانے کی مہم چلا رہے ہیں۔ آں موصوف کے قلم سے جی قدرت نے وہ الفاظ لکھوا دیے جن کے آئینے میں علمائے دیوبند کی حقیقی تصویر نظر آرہی ہے اور کم از کم احقر یہ کہ بغیر نہیں رہ سکتا کہ موصوف کی اس عبارت کا ہر جملہ معنی نیز اور حقیقت کی منہ بولتی تصویر ہے۔ گزشتہ صفحات

میں اگرچہ عبارت نمبر ۷ کے تحت موصوف کے وہ خیالات پیش کیے جا چکے ہیں لیکن ہماری نظر میں بھی چونکہ علمائے دیوبند کی پوزیشن یہی کچھ ہے جو محمد ایوب قادری صاحب نے اس عبارت میں پیش کی ہے۔ لہذا اس عبارت کو آخر میں فیصلہ کن بیان کے طور پر پھر نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو:

”تمنا نہ جھون میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ محمد ضامن، مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد مظہر نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور قاضی عنایت علی وغیرہ نے مجلس مشاورت منعقد کی۔ اس مجلس میں مولانا محمد آسن بھی شریک ہوئے۔ مولانا شیخ محمد تھانوی نے جہاد کے خلاف رائے دی اور فرمایا: ”جب قاضی عنایت علی، جنگ کے دوران خاموش رہے اور حاضرین مجلس میں سے بھی اس وقت کسی نے اس کو جہاد سمجھ کر اس میں حصہ نہیں لیا تو اس وقت جبکہ انتقام کا جذبہ کارفرما ہے، اس لڑائی کو جہاد کیسے کہا جاسکتا ہے؟ بعض روایات میں ہے کہ مسلمانوں کی کمزوری اور بے سروسامانی کو عدم جہاد کا سبب قرار دیا گیا۔“

حقیقت چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں
کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے

ضروری وضاحت بعض حضرات یہاں یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ مجدد مائتہ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ کا تجدیدی کارنامہ بیان کرتے ہوئے

انگریزوں کا ذکر کس غرض سے کیا گیا اور اس کا یہاں کیا جوڑ تھا؟ احقر یہ گزارش کرے گا کہ تجدید کی ضرورت تخریب کے وقت پیش آتی ہے۔ انگریز نے جس عیاری اور فن کاری سے پاک و ہند پر قبضہ جمایا، اسی طرح مقدس اسلام کو مٹانے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تھا۔ چونکہ دین میں تخریب کاری انگریزوں نے براہ راست نہیں کی بلکہ اپنے زر خرید علماء سے

یہ خدمت لی تھی، لہذا اس راز کو سمجھنے کے لیے انگریزوں کے اُن کارناموں کا مجملہ اظہار
ضروری سمجھا گیا جن سے انگریزوں کی ذہنیت کا اندازہ ہو سکے۔ چونکہ اگلے ابواب میں تخریب کار
علماء کا بیان ہے بایں وجہ پہلے انگریزوں کی فطرت پر قلم اٹھانا پڑا۔ یعنی : ۷
حافظ بخود نہ پوشیدہ این جامڑے آلود
اسے شیخ پاک دامن ! معذور دار مارا

باب دوم

ارمغانِ حجاز

سودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
 نسیم از حجاز آید کہ ناید؟
 سود آمد روزگارِ این فقیرے
 دگر دانائے راز آید کہ ناید؟
 (علامہ اقبال)

لکٹی شروع ہو گئی۔ جس ایمان کو بچانے کی خاطر یہی مسلمان سب کچھ ٹا دیا کرتے تھے۔ وہ ایسے مسخروں کے چنڈر وہ زندگی کے راحت و آرام کے بدلے ایمان جیسی دولت لٹانی شروع کر دی۔ دوسری طرف دین اسلام میں خود علمائے دین کے ہاتھوں وہ عملِ حرام اور اصلاح کے نام پر شریعتِ مطہرہ میں اس طرح ترمیم و اضافہ کروایا گیا کہ اپنی طرف سے ان سرکاری علمائے اسلام کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ الغرض کتابِ اسلام کے مختلف ماڈرن ایڈیشن ایسی آج و تاب اور نظر فریب دکشتی کے ساتھ شائع ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسلام ان بطلانوی اسلاموں کے زرخیز میں گھر گیا۔ نئے نئے اور چمکیلے اسلاموں کی ظاہری چمک و مک نے نادانوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تو اصل دین کی اصلیت ان کی نگاہوں میں مشکوک ہو کر رہ گئی۔ جب عوام کی نظروں سے اصل اور نقل، حقیقی اور جعلی کا فرق اوجھل ہونا شروع ہوا تو ہر کوئی اپنی پسند کا اسلام چن کر اس کا پیروکار بننا شروع ہو گیا۔ یوں مسلمانوں کی جمعیت پریشان ہو گئی، وہ فرقوں میں بٹ گئے اور انگریزوں کا مقصد، جسے وہ حاصل کرنے سے عاجز تھے، بعض صاحبانِ جبہ و دستار کی بدولت پورا ہو گیا۔

ایسا کہ گزرنے سے برٹش گورنمنٹ کی مراد و طرح برآئی، اولاً جماعتوں اور فرقوں میں مسلمانوں کو اس طرح بانٹ دیا اور اختلافات کی خلیج اتنی وسیع کرادی کہ یہ سوال ہی مٹ گیا کہ کبھی متحد ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر حکومت کے لیے ردِ سرکابا عث ہو سکتے ہیں یا انگریزی اقتدار کے لیے کسی خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ثانیاً: اسلامی تعلیمات سے ایک کثیر تعداد کو نابد رکھ کر اور جعلی اسلاموں کا پیروکار بنا کر بھی حکومت نے اطمینان کا سانس لینا شروع کر دیا کیونکہ اسلام کے حقیقی فیوض و برکات سے بڑی حد تک مسلمانانِ پاک و ہند خود کو محروم کر چکے تھے۔ اہلانی قوت کمزور ہو گئی، شوقِ جہاد اور جوشِ عمل کا رخ حکومت کی وفاداری کی طرف پھر گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اگر انھوں نے بہادری بھی دکھائی تو یہی برٹش گورنمنٹ کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرتے رہے یا ہندوؤں کے معاون بن کر ان کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے۔ سب سے بڑی جو انمردی بس آتی

میدان میں جب ناکامی کا سامنا ہوا تو مسلمانانِ پاک و ہند کی آئندہ نسلوں کو اسلامی تعلیمات سے محروم رکھنے اور ان کی جمعیت و قوت کو منتشر و پریشان کرنے کی غرض سے فرقہ بازی کا بیج بونے کی ٹھان لی۔ یہ تحریبی منصوبہ عیسائی بنانے والے منصوبے سے بھی بدتر، دُور رس نتائج کا حامل اور ضرر رساں تھا، کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس تحریب کو تعمیر، بگاڑ کو بناؤ، دشمنی کو دوستی، بیخ کنی کو رواداری، فساد کو اصلاح اور مداخلت فی الدین کو عدم مداخلت سمجھے آج بھی اور انگریزوں کے اس تحریبی منصوبے پر کاربند ہو کر مسلمانانِ پاک و ہند اپنے ملی خصائص اور قوتِ ایمانی کو مٹانے میں ایک آٹومٹک مشین کی طرح آج تک سرگرم عمل چلے آ رہے ہیں۔

اس منصوبے کے تحت حکومت نے اپنے جاری کردہ اسکولوں اور کالجوں سے دینی تعلیمات کو خارج از نصاب کر کے رعیت کا ذاتی معاملہ قرار دے دیا۔ ملازمتیں انگریزی اسکولوں کی تعلیم پر منحصر ہو کر رہ گئیں تو نتیجہ ظاہر ہے کہ دینی مدارس ویران ہونے لگے۔ اشک شونی کیلے اسکولوں میں برائے نام دینیات کو شامل رکھا، جس میں چند بزرگوں کی کہانیاں پڑھائی جاتی تھیں یا اُن اینگلو انڈین علماء کے فضائل و مناقب ذہن نشین کروائے جاتے تھے جو برٹش گورنمنٹ کے اس تحریبی منصوبے کو بڑی ہوشیاری، رازداری اور کمالِ نمک حلاوت پر و ان چڑھا رہے تھے۔ زہیری کے پردے میں قوم کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے، لیکن جن حضرات نے ملتِ اسلامیہ کی پاک و ہند میں حقیقی خدمات انجام دیں اُن مجاہدوں، بادشاہوں، شہیدوں اور رہنماؤں کو زینتِ طاقِ نیساں بنوا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے اسکولوں اور کالجوں سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کی اکثریت کا یہی عالم ہونا تھا اور آج بھی ہے کہ حقیقی اسلام سے بڑی حد تک نا آشنا، نئے نئے اسلاموں کے ماننے والے، اینگلو انڈین علماء کے معتقد اور مغربی تہذیب کے دلدادہ۔ ان بظاہر پڑھے لکھے مسلمانوں کی حقیقی حالت زار پر، اسلامی عینک سے دیکھنے والی آنکھیں یوں اشکبار ہوتی ہیں:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سُو بھی

اسلامی تعلیمات سے بے بہرہ ہو جانے کے باعث، جب ایمان جیسی متاعِ عزیز

لٹنی شروع ہو گئی۔ جس ایمان کو بچانے کی خاطر یہی مسلمان سب کچھ ٹٹا دیا کرتے تھے۔ وہ ایسے مسخروں کے چندر روزہ زندگی کے راحت و آرام کے بدلے ایمان جیسی دولت ٹٹانی شروع کر دی۔ دوسری طرف دین اسلام میں خود علمائے دین کے ہاتھوں وہ عملِ حرامی اور اصلاح کے نام پر شریعتِ مطہرہ میں اس طرح ترمیم و اضافہ کروایا گیا کہ اپنی طرف سے ان سرکاری علمائے اسلام کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا۔ الغرض کتابِ اسلام کے مختلف ماڈرن ایڈیشن ایسی آب و تاب اور نظر فریب دکشی کے ساتھ شائع ہوئے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اسلام ان برطانوی اسلاموں کے نسخے میں گھبر گیا۔ نئے نئے اور چمکیلے اسلاموں کی ظاہری پچک دمک نے ناواقفوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا تو اصل دین کی اصلیت ان کی نگاہوں میں مشکوک بن کر رہ گئی۔ جب عوام کی نظروں سے اصل اور نقل، حقیقی اور جعلی کا فرق اوجھل ہونا شروع ہوا تو ہر کوئی اپنی پسند کا اسلام چن کر اس کا پیروکار بننا شروع ہو گیا۔ یوں مسلمانوں کی جمعیت پریشان ہو گئی، وہ فرقوں میں بٹ گئے اور انگریزوں کا مقصد، جسے وہ حاصل کرنے سے عاجز تھے، بعض صاحبانِ جہت و دستار کی بدولت پورا ہو گیا۔

ایسا کہ گزرنے سے برٹش گورنمنٹ کی مراد و طرح بر آئی، اولاً: جماعتوں اور فرقوں میں مسلمانوں کو اس طرح بانٹ دیا اور اخلاعات کی خلیج اتنی وسیع کروادی کہ یہ سوال ہی مٹ گیا کہ کبھی متحدہ ہندوستان کے مسلمان متحد ہو کر حکومت کے لیے در دسر کا باعث ہو سکتے ہیں یا انگریزی اقتدار کے لیے کسی خطرے کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ثانیاً: اسلامی تعلیمات سے ایک کثیر تعداد کو نا بلد رکھ کر اور جعلی اسلاموں کا پیروکار بن کر بھی حکومت نے اطمینان کا سانس لینا شروع کر دیا کیونکہ اسلام کے حقیقی فیوض و برکات سے بڑی حد تک مسلمانانِ پاک و ہند خود کو محروم کر چکے تھے۔ ایمانی قوت کمزور ہو گئی، شوقِ جہاد اور جوشِ عمل کا رخ حکومت کی وفاداری کی طرف پھر گیا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد اگر انھوں نے بہادری بھی دکھائی تو یہی برٹش گورنمنٹ کی ریڑھ کی ہڈی کو مضبوط کرتے رہے یا ہندوؤں کے معاون بن کر ان کے مقاصد کو تقویت پہنچاتے رہے۔ سب سے بڑی جو اندری بس اتنی

دکھائی جاسکی کہ اسلام کا نام لے کر غریب مسلمانوں کے دوٹوں سے پاکستان بنایا لیکن جس قسم کی اسلام ورزی انگریز سکھا گئے تھے اُس نے اپنا پورا رنگ دکھایا کہ چوتھائی صدی گزر گئی لیکن کوئی حکومت پاکستان میں اسلامی قانون رائج کرنے کی جرأت نہ کر سکی بلکہ پورا زور متواتر اس پر صرف کیا جاتا ہے کہ حقیقی اسلام کو محسوس رکھا جائے یا ملک بدر کر دیا جائے۔ غرضیکہ انگریزوں سے جو کمی رہ گئی تھی اُسے اب مسلمان خود پورا کر رہے ہیں۔ اس بے راہ روی کا خمیازہ بھی جھگٹنا پڑ رہا ہے۔ عذاب الہی سروں پر مستط ہے لیکن کیا مجال کہ ہمارے دانشور اور اصحاب اقتدار قوم کو اس غلط روش سے ہٹانے کی ضرورت بھی محسوس کریں۔ باری تعالیٰ شانہ اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے طفیل ہمیں راہِ راست پر چلائے اور ہماری غلطیوں سے درگزر فرماتے۔ آمین۔

اس باب میں چونکہ فرقہ بازی کے بارے میں تاریخی طور پر کچھ پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ انگریزوں کی دُور رس نگاہوں نے دہلی کے مائے ناز علی ودینی گھرانے کے ایک منچلے، جوشیلے اور نوجوان عالم دین کو ناٹ لیا، یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی (د ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کو اور پاک و ہند کی سرزمین میں فرقہ ساری کا سنگ بنیاد موصوف سے دکھوایا گیا۔ فرقہ بازی کے پاک و ہند میں جو فلک بوس محل نظر آ رہے ہیں اُن کی بنیاد رکھنے کا سہرا آں موصوف ہی کے سر ہے۔ آپ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۷۶ھ / ۱۷۶۲ء) کے پوتے، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۶ء) و شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کے بھتیجے اور شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے فرزند تھے۔ منچلے پن نے خوب کُل کھلایا، علمی میدان میں بازی ہار گئے تو انگیزوں کے کہنے پر سکھوں کا نام لے کر برہمہ کے مسلمانوں کے غُور سے ہولی جا کھیلے، اُنھیں ملعونین اشرار، کلاب النار اور شعلہ الدہم ٹھہراتے رہے۔ اُن کے ننگ و ناموس پر دست درازی کرتے رہے۔ پٹھانوں نے آخر کار مجبور ہو کر میزبانی سے ہاتھ اٹھایا اور اس جمعیت کے اکثر افراد کو اُن کے اصلی مقام پر پہنچایا۔ ایک ہی رات کے اندر جتنے ہاتھ آ سکے سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جو باقی رہا

انہیں سکھوں نے آدو پچا اور جو چند اشخاص بھاگ سکے ان کے علاوہ سب کو بالاکوٹ کے مقام پر ۲۶ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ / ۸۳۱ کو ذبح کر کے اس اذنانک ڈرامے کا پہلا پارٹ ختم کر دیا۔

تیسویں صدی میں خارجیت نے نجد کی سرزمین سے سراٹھایا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) اس بلائے ناگہانی کے ٹھیکدار بنے تھے۔ جب وہابیت کے فتنے کو اس زمین مقدس میں قدم جانے کی جگہ مل گئی تو اسی گمراہی کو دہلی پہنچا یا گیا مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اس مشن کو دل و جان سے قبول کر لیا اور اس کی تبلیغ و اشاعت میں کوشاں رہنے لگے۔ چونکہ حقیقت میں یہ وہی خارجی فرقہ ہے جس کی خبر مخبر صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے پہلے ہی دی تھی کہ قیامت تک یہ فرقہ مختلف ناموں سے ظاہر ہوتا رہے گا اور اس کا آخری گروہ دجال کے ساتھ ہوگا۔ لہذا موصوف کی کارگزاری پر گفت گو کرنے سے پہلے، جن جن رنگوں میں خوارج آج تک نمایاں طور پر ظاہر ہوتے رہے ہیں، ان کے بارے میں اختصار سے کچھ تاریخی طور پر عرض کر دیا جائے تاکہ ایک منصف مزاج کے لیے صورت حال کو سمجھنے میں کوئی وقت یا سہیدگی باقی نہ رہ جائے۔

انگریزی دور سے چونکہ یہ دھاندلی جاری ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک نیا ہی مکتبہ فکر گھڑا ہوا ہے اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی چونکہ حضرت شاہ صاحب مذکور کے پوتے ہیں لہذا انہیں ولی اللہی مکتبہ فکر کا ایک عظیم علمدار ٹھہرا دیا جاتا ہے حالانکہ یہ دونوں دعوے محض گھڑنت اور فرضی ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ کا کوئی اپنا مکتبہ فکر نہیں بلکہ وہ سختی حنفی عالم دین اور صوفی منش بزرگ تھے۔ شاہ صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے دینی عقائد میں بعد المشرقین ہے کیونکہ مولانا نے نہ صرف وہابیت قبول کی تھی بلکہ سرزمین پاک و ہند میں وہابیت کا سنگ بنیاد رکھنے والے اور اس کے بانی آپ اور صرف آپ ہیں۔ موصوف کا اپنے خاندان سے دینی و مذہبی انقطاع بھی اسی طرح ہے جس طرح نجد کے بانی وہابیت کا دینی سلسلہ اپنے خاندان سے حتیٰ کہ اپنے والد ماجد مولانا عبدالوہاب (المتوفی ۱۱۵۳ھ / ۷۶۰ء) سے نہیں ملتا۔ کیا محض حسب و نسب کے سامنے رکھ کر کنعان کا دینی و مذہبی رشتہ لوح علیہ السلام سے جوڑا جاسکتا ہے؟ ہرگز

نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کا مذہب اختیار کیا تھا، محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ / ۱۷۹۱ء) نے ابن تیمیہ حرانی کا مذہب اپنایا، ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) نے ابولعلی وغیرہ سلفی حضرات کا مذہب قبول کیا تھا اور ابولعلی قاضی وغیرہ نے مسلک خوارج کو اپنا دین ٹھہرایا تھا۔

خوارج

اب راقم الحروف اپنے مسلمان بھائیوں کی خیر خواہی میں یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ آخری رسول، نبی الانبیاء، خرد و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خوارج کے بارے میں مسلمانوں کو کیا ہدایت فرمائی ہے۔ یہ ناچیز جو حسب سے زیادہ اپنے آقا و مولیٰ، سرور و مکار شفیع انس و جان، نبی مختار، حبیب پروردگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کا محتاج یہاں ایسے لوگوں کے بارے میں پیارے نبی کے چند پیارے پیارے کلمات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ شاید کوئی خوش نصیب یہ سوچ سکے کہ جس نبی کا کلمہ پڑھتے اور جس کے اُمتی ہونے کا دم بھرتے ہیں، جب خود اُس آقا کی نگاہوں میں یہ جماعتیں ایسی ہیں تو بعض علماء کے جُتے دستار پر کیوں جائیں، بہتر یہی ہے کہ آقائے دو جہاں کے قدموں سے لگ جائیں۔ اگر ایک بھی خوش نصیب راہِ راست پر آگیا تو الحمد للہ، احقر کی محنت ٹھکانے لگی۔ اب پیارے مصطفیٰ کے پیارے ارشادات کا ایک ایک لفظ غور سے پڑھیے، سوچ سمجھ کر فیصلہ کیجئے کہ پیشگوئی کس پر صادق آتی ہے :

سمعت رسول اللہ صلی اللہ	سنائیں (ابو بزرہ اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے
تعالیٰ علیہ وسلم باذنی و	اپنے کانوں سے اور دیکھائیں نے اپنی آنکھوں
سأیتہ بعینی اتی رسول	کے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ
اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم	میں کچھ مال حاضر کیا گیا، آپ نے تقسیم فرمایا۔
بہال فقسمة فاعطی من عن	واٹیں اور بائیں طرف والوں کو عطا فرمایا اور
یمینہ ومن عن شمالہ ولم	پچھے والے کو نہ دیا۔ تو پیچھے والوں سے ایک

يعط من ورائه شئ فقام رجل
من ورائه فقال يا محمد ما عدلت
في القسمة - رجل اسود مظموم
الشعر وعلیه ثوبان ابضات
فغضب رسول الله صلى الله تعالى
عليه وسلم غضباً شديداً - قال
والله لا تجدون بعدى رجلاً
هو اعدل مني ثم قال يخرج
في آخر الزمان قوم كان هذا
منهم يقرؤن القرآن لا تجاوز
تواقيم يبرقون من اسلام
كما يبرق السهم من الرمية
سياهم التحليق لا يزالون
يخرجون حتى يخرج اخرهم
مع المسيح الدجال فاذا
لقيتهم هم شر الخلق و
الخليقه -

(نسائی مشکوٰۃ، باب قتل اہل الردۃ)

آدمی کھڑا ہو کر کہنے لگا : اے محمد!
آپ نے تقسیم میں انصاف نہیں کیا - وہ آدمی
سیاہ رنگ اور مُنڈے ہوئے سردالہ تھا۔
اُس نے بالکل سفید کپڑے پہنے ہوئے پتھر
رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سخت
ناراضگی کا اظہار فرمایا اور ارشاد فرمایا : خدا
کی قسم، میرے بعد تم مجھ سے زیادہ انصاف
کرنے والا کسی کو نہ پاؤ گے۔ مزید فرمایا : آخری
زمانے میں ایک قوم نکلی گی، گویا یہ بھی اُسی قوم کا
ایک فرد ہے، وہ قرآن بہت پڑھیں گے لیکن
قرآن کا اثر اُن کے دلوں کی طرف نہیں جائیگا۔
اسلام سے وہ ایسے نکل جائیں گے
جیسے تیر شکار سے۔ سر منڈانا اُن لوگوں کی
نشانی ہوگی۔ وہ ہر دور میں ظاہر ہوتے
رہیں گے، یہاں تک کہ اُن کی آخری جماعت
دجال کی ساتھی ہوگی۔ جب تم اُن لوگوں کو
پاؤ تو سمجھ لینا کہ وہ بدترین مخلوق ہیں۔ (نہود
باللہ من شرورہم)

آخری زمانے کی جس قوم کا اس حدیث میں ذکر فرمایا گیا ہے اُس کے بارے میں
یہ تو معلوم ہو گیا کہ مدعی اسلام ہونے کے باوجود وہ دائرۃ اسلام سے خارج ہوگی اور
سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو بدترین مخلوق قرار دیا تھا۔ اس کے
ساتھ ہی اُس گروہ کی چار نشانیاں بھی ہمیں بتادی ہیں :
۱۔ وہ نشان رسالت میں گستاخانہ کلمات استعمال کیا کریں گے۔

۲۔ زیادہ تر سرمنڈائیں گے۔

۳۔ قرآن خوب پڑھیں گے لیکن اُن گستاخانِ رسول کے دلوں پر قرآن کا اثر نہیں ہوگا۔

۴۔ وہ قوم ہر دور میں کافروں کی معین و مددگار بن کر رہے گی حتیٰ کہ دجال کا ساتھ بھی ہی لوگ دیں گے۔

قارئین کرام! بشأن رسالت میں گستاخانہ عبارتیں لکھنے والے بالکل ظاہر ہیں۔ حتیٰ کہ ایسے نازیبا الفاظ بھی سید الانبیاء علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کی شان میں جاری کر دیے جن کی کبھی بدترین دشمنوں اور کھلے کافروں کو بھی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح وہ جماعت یا قوم بھی بالکل ظاہر ہے جو اپنی اور بت پرستوں کی ایک قوم بناتی اور متحدہ قومیت کا گیت گاتی رہی ہے۔ کیا اس فرمانِ رسالت کے مطابق کھرے اور کھوٹے کو پہچاننے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟ ہرگز نہیں رہتا۔ اب دوسرا ارشادِ گرامی ملاحظہ ہو:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہِ بیکس پناہ میں حاضر تھے اور آپ اُس وقت مال تقسیم فرما رہے تھے۔ اُسی اثناء میں ذوالخویصرہ آیا جو بنی تمیم سے تھا، اُس نے کہا: اے اللہ کے رسول! انصاف کرو۔ آپ نے فرمایا: کبھی اگر میں انصاف نہیں کرتا تو اور کون انصاف کرے گا؟ تیرے اس گمان کی وجہ سے کہ میں بھی عدل نہیں کرتا، تو صریح زبان کا رہ گیا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! اجازت دیجیے میں اس کی گردن اڑا دوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: اسے جانے دو، اس کے ساتھ بہت ہیں

عن ابی سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال بینا نحن عند رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ویقسم قماً اتاہ ذوالخویصرہ وهو رجل من بنی تمیم فقال یا رسول اللہ اعدل فإل یمک فإل یعدل اذ لم اعدل قد خبت وخسرت ان لو اکن اعدل فقال عمر ائذن لی اضرب عنقه فقال دعه فان له اصحابا یحقر احدک صلاته مع صلاتهم وصیامہ مع صیامهم یقرؤن

تم اپنی نمازوں کو ان کی نمازوں کے مقابلے میں
اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں کے مقابلے
میں حقیر جانو گے۔ یہ قرآن پڑھیں گے مگر وہ
ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ (ادعا)
اسلام کے باوجود یہ لوگ دیں سے ایسے نکل
جائیں گے جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے۔

القرآن لا یجاوز تراجمہم
یمرقون من الدین
کما یمرق السم
من الرمیة۔
(مشکوٰۃ، باب المعجزات)

یہی واقعہ دوسری روایت میں یوں مذکور ہوا ہے :

ایک شخص آیا جس کی آنکھیں دھنسی ہوئی، پشانی
اُٹھی ہوئی، دلاڑھی گھنی، رخسار اونچے اور
سر منڈا ہوا تھا۔ وہ کہنے لگا: اے محمد! اللہ
سے ڈرو و حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:
اگر بقول تمہارے، میں بھی خدا کی نافرمانی کرتا
ہوں تو کون ہے جو اس کے احکام کی اطاعت
کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے مجھے اہل زمین پر
امین بنایا ہے اور تم مجھے امین نہیں مانتے۔
ایک مرد نے اُس کو قتل کرنے کی اجازت مانگی
لیکن اُسے منع کر دیا گیا۔ جب وہ گستاخ واپس
لوٹ گیا تو سرکار نے ارشاد فرمایا: اس کی اصل
سے ایک قوم ہوگی، وہ لوگ قرآن پڑھیں گے مگر
قرآن ان کے زخروں سے نیچے نہ اترے گا۔
جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے وہ اس طرح
اسلام سے نکل جائیں گے۔ وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر
مسلمانوں کو قتل کریں گے۔ اگر میں اُس قوم کو

اقبل رجل غائرا العینین وناقی
الجهنم کث اللحیہ مشرف
الوجتین محلوک الراس فقال
یا محمد ابق اللہ فقتل
فمن یطم اللہ اذا عصیته
فیامنن اللہ علی اهل الارض
ولا تامنونی فسأل رجل قتله
فمنعه فلما ودی قال عن من
فیضی هذا قوم یقرؤن
القرآن ولا یجاوز
حناجرهم یمرقون عن
الاسلام مروق السم
من الرمیة فیقتلون اهل
الاسلام ویدعون
اهل الاوثان، لئن
ادرکتهم لا قتلنہم
قتل عاد۔ (ایضاً)

پاتا تو انھیں اس طرح ہلاک کر دیتا جیسے قوم عاد
کی گئی۔

قارئین کرام! ان دونوں روایتوں میں مذکورہ گستاخ ٹولے کی مزید نشانیاں بیان فرمائی گئی ہیں تاکہ امت محمدیہ انھیں پہچان کر خبردار ہو جائے، ان کی باتیں سننا یا ان کے گروہ میں انھیں مسلمان سمجھ کر بل جانا تو دور کی بات ہے، مسلمان ان کے سائے سے بھی بچیں۔ ان کے ظاہری حال اور ادعاے مسلمانی پر نہ جائیں۔ پہلی روایت کے تحت چار نشانیاں نمبر وار پیش کر دیں، مزید ملاحظہ ہوں :

۵۔ پابندی اور ادائیگی نماز روزہ وغیرہ عبادات میں یہ اصلی مسلمانوں سے بڑھ چڑھ کر نظر آئیں گے۔

۶۔ مختلف جیلے بہانے تراش کر مسلمانوں کو قتل کرنا ان کی مردانگی ہوگی۔

۷۔ بُت پرستوں سے بگاڑیں گے نہیں بلکہ ان کے یار و مددگار بن کر رہیں گے۔

مسلمانو! سچے خدا کے سچے نبی نے (جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) جس گروہ کی یہ سات نشانیاں بیان فرمائی ہیں، کیا ان نشانیوں کے ذریعے آپ اس گروہ کو پہچان نہیں سکیں گے؟ یہ گروہ دور حیدری سے شروع ہو گیا تھا، ہر دور میں مختلف رنگ بدل کر ظاہر ہوتا رہے گا، یہاں تک کہ اس گروہ کی آخری جماعت دجال کی معین و مددگار ہوگی۔ کیا اُسی جماعت کو آپ نے ماضی قریب میں چھوٹے دجالوں کے ساتھ نہیں دیکھا؟ کیا مسلمانوں کے مفادات پر وہ آج بھی ضربیں نہیں لگا رہے؟ کیا اب انھوں نے چھوٹے دجالوں کو دجال مان کر اُس روش سے کفارہ کر لیا ہے؟ آئیے اب دیکھیں کہ پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نگاہ اور میں اس گروہ کی قدر و قیمت اور شرعی پوزیشن کیا ہے :

۱۔ یہ گروہ اسلام سے خارج ہے جیسا کہ تینوں مذکورہ روایتوں میں ہے :

۲۔ یہ بدترین مخلوق ہیں — جیسا کہ پہلی روایت میں ہے۔

۳۔ اللہ کا رسول ان سے سخت ناراض ہے — پہلی روایت

۴۔ رسول خدا کے نزدیک یہ گروہ زیاں کار ہے۔ دوسری روایت

۵۔ صحابہ کرام کے نزدیک یہ لوگ قابلِ گونہ زد فی ہیں جیسا کہ حضرت عمر کی درخواست سے واضح ہے۔ دوسری روایت

۶۔ یہ قوم عادی طرح ہیں اور اُسی کی طرح ہلاک کیے جانے کے سزاوار۔ تیسری روایت

۷۔ اگر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام انھیں پاتے تو ان کے خلاف جہاد فرماتے۔

تیسری روایت

مسلمان بھائیو! کلمہ طیبہ کے ہمراہیو! اللہ تعالیٰ کے آخری رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے پیارے پیارے الفاظ پیش کر کے خوارج کی جملہ جماعتوں کی سات نشانیاں اور ان کے بارے میں سات احکام ان روایتوں سے ہی اخذ کر کے آپ کے سامنے پیش کر دیے۔ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں، کسی مخالف جماعت کی کھینچ تان نہیں، اُسی آقا کے ارشادات ہیں جس کا کلمہ یہ حضرات بھی پڑھتے ہیں، جن کے اُمتی ہونے کا یہ لوگ بھی دم بھرتے ہیں، دیکھیے ان ارشادات کو سن کر کس کر دھڑکتے ہیں؟ یا جس گھر سے نکل کر بھاگے تھے پھر اُسی کا رخ کرتے ہیں؟ اے میرے رب! اے ساری کائنات کے رب! ہدایت فرما کہ یہ لوگ بھی اندھیرے کو چھوڑ کر اسلام کے اجالے میں آئیں اور اپنی عاقبت کو برباد ہونے سے بچائیں۔ آمین یا اللہ العالمین بحق سید المرسلین و صلی اللہ تعالیٰ علیٰ خلیلہ محمد و آلہ و صحبہ اجمعین۔

خوارج باقاعدہ جماعتی شکل میں پہلے پہل مولائے کائنات، امیر شش جہات، تاجدارِ ولایت امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں جنگ صفین کے بعد ظاہر ہوئے۔ قبل ازیں یہ آپ کے ساتھی اور تبع تھے لیکن سُنہ تحکیم کی آڑ میں بگڑے اور اپنا اصلی رنگ روپ ظاہر کرنے لگے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

”عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضرت علی کو تحکیم کے قبول کرنے پر مجبور کیا اور پھر ایک خاص حکم مقرر کرنے پر تُل گئے، جلد ہی اپنے خیالات سے منحرف ہو گئے اور تحکیم کو ایک جرم قرار دینے لگے۔ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا کہ جس طرح ہم نے حکیم کو قبول کر کے ارتکابِ کفر کیا تھا اور پھر اُس سے تائب ہوئے آپ بھی اپنے کفر کا اقرار کر کے توبہ کا اعلان کریں۔ عرب کے بدو بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملانے لگے۔ لَا حُکْمَ إِلَّا لِلّٰہ کے نعرہ کو اپنا شعار بنایا اور حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے خلاف لڑائی کا آغاز کر دیا۔ ۱

خوارج کے گروہ کی یہ اپنے روزِ اوّل سے ہی فطرتِ علیّیّی ہے کہ جو حضرات اسلام کا مکمل نمونہ پیش کر رہے تھے، جو بابِ مدینۃ العلم تھے اور جن حضرات، قدسی صفات سے بہتر اسلام کی مکمل علیّی تفسیریں چشمِ فلکِ کس نے بھی آج تک غیر انبیاء کے گروہوں میں نہیں دیکھی تھیں۔ خوارج نے اُن حضرات کو بھی اسلام سے خارج ٹھہرانے اور کافر بتانے بلکہ اُن کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی تھی۔ ان لوگوں کی اکابر دشمنی پر مزید تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر ابو زہرہ مصری مزید یوں وضاحت کرتے ہیں:

”لَا حُکْمَ إِلَّا لِلّٰہ کے الفاظ ہر اُن کے پیشِ نظر رہتے۔ یہی اُن کا دین تھا، جس سے مخالفین پر آوازے کستے اور ہر بات کو ختم کر کے رکھ دیتے۔ جب حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کو مصروفِ گفتگو دیکھتے یہی نعرہ لگاتے۔ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) اور ظالم حکام سے اظہارِ بیداری کا خیال اُن پر حاوی رہتا تھا۔ یہ چیز اُن کے قلب و دماغ پر مچھا گئی۔ اُن کے لیے حق تک رسائی حاصل کرنے کے سبب دروازے بند کر دیے تھے۔ عثمان و علی، طلحہ اور زبیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) اور ظالمین بنی امیہ سے برأت کا اظہار کرنے والے کو اپنے زمرہ میں شامل کر لیتے تھے اور بعض دوسرے اصول و مبادی میں نسبتاً اس سے نرم سلوک کرتے، حالانکہ وہ مسائل ان سے اہم ہوتے اور اُن میں مخالفت کا ارتکاب کرنے سے وہ ان سے

زیادہ دُور جا پڑتے، مگر اظہارِ برأت کی مخالفت میں یہ خطرہ نہ تھا۔۔۔۔۔
 برأت کا خیال اُن کے اعصاب پر بُری طرح سوار تھا اور جمہور مسلمانوں کی
 جماعت میں داخل ہونے سے مانع تھا۔

جب طرح یہود کی خواہ گردن اڑادی جائے لیکن وہ موت کی تمنا نہیں کرے گا اسی طرح
 خارجیوں کی خواہ جان جاتی رہے لیکن مسلمانوں اور اُن کے اکابر کو مشرک اور خارج عن الاسلام
 کہنے سے نہ کبھی باز آئے اور نہ تاقیامت باز آئیں گے۔ یہی سلوک ان بد بختوں نے اپنے
 اولین زمانہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کو مسلمان شمار کرنے والوں کے ساتھ
 روا رکھا تھا۔ حضرت حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور آپ کے دیگر ساتھیوں نے اپنے عمل سے
 پوری اُمت محمدیہ کو یہ دکھا دیا تھا کہ خوارج اُن کے نزدیک واجب القتل ہیں کیونکہ خود ارشادِ
 نبوی اس پر شاہد ہیں۔ اس سلسلے میں فاضل ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

”یہی حال خوارج کا تھا، بے محابا علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو اُن کے
 خطبوں بلکہ ناز میں تنگ کرتے تھے۔ یہ حضرت عثمان و علی (رضی اللہ تعالیٰ
 عنہما) کی پیروی کی وجہ سے مسلمانوں کو چیلنج کرتے اور اُنھیں مشرک قرار
 دیتے تھے۔ ان لوگوں نے جب عبداللہ بن خباب الارت (رضی اللہ تعالیٰ
 عنہ) کو قتل کیا اور اُن کی لونڈی کا پیٹ پھاڑ ڈالا تو حضرت علی (رضی اللہ
 تعالیٰ عنہ) نے اُن سے کہا: ”عبداللہ بن خباب کے قاتلوں کو ہمارے
 حوالے کر دو۔“ خوارج نے جواب دیا: ”عبداللہ بن خباب کو ہم سب نے
 قتل کیا ہے۔“ آخر حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کو اُن سے لڑنا پڑا، یہاں تک
 کہ اُن کا تقریباً قلع قمع ہی کر دیا، تاہم جو رخ نکلے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے
 طریقہ سے ہٹے نہیں بلکہ پوری دلیری اور شجاعت کے ساتھ اپنی دعوت میں
 مصروف رہے۔“

خارجی حضرات اپنے روزِ اوّل سے ہی زلالتِ دین و اخلاص پیش کرتے آئے ہیں لیکن یہ کبھی دوسروں کی آنکھوں میں تنکے ہی دیکھتے رہتے ہیں اپنی آنکھوں کے شہتیروں کو دیکھنے کی یہ حضرات کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کیا کرتے۔ خوارج کی اولین جماعت نے اپنی اس مخصوص فطرت کا ایک یہ ثبوت بھی پیش کیا تھا،

”فہم دین کی کوتاہی نے اخلاص کے باوجود انہیں گمراہ کر دیا اور یہ اسلام کے جوہر اور روح کو پامال کرنے لگے۔ انہوں نے عبد اللہ بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو محض اس لیے قتل کر دیا تھا کہ وہ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو مشرک تصور نہیں کرتے تھے مگر قیمت ادا کیے بغیر ایک عیسائی کی کھجوریں لینے سے انکار کر دیا تھا۔“

دوسرے پر تنقید و نکتہ چینی کرنے کی بیماری تو عام ہے لیکن بعض اوقات انسان غیر شعوری طور پر یا کسی گمراہ پارٹی سے اپنا خلاف واقعہ اختلاف دکھانے اور اس سے اپنی برأت کا نام نہاد اظہار کرنے کی خاطر، خود اپنے ہی عقاید و نظریات پر تنقید کر جاتا ہے۔ زمانہ حال کے خارجیوں اور وہابیوں میں سے کبھی کبھی بعض حضرات بھی یہی طرزِ عمل اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مشہور دیوبندی عالم مولوی بدر عالم میرٹھی نے خوارج کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”اُن (خوارج) کے اقوال و عقاید دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ نہایت موٹی عقل اور سطحی علم کے مالک تھے۔ درکِ مقاصد، فہمِ معانی، استنباط و استنتاج کا اُن میں کوئی ملکہ نہ تھا۔ قرآن شریف پڑھنے کا انہیں شوق ضرور تھا مگر اس کے معانی کی انہیں کوئی اہمیت نہ تھی۔ طوطے کی طرح قرآن اُن کی زبانوں پر تھا مگر اُن کے قلوب اس کی صحیح ہدایات اور لطیف مضامین سے قطعاً خالی تھے۔ اُن کی اس علمی بے مائیگی کی طرف حدیث کے الفاظِ ذیل میں اشارہ کیا گیا ہے: ”یقرؤن القرآن لا یجاوِز حناجرہم۔“

یعنی وہ قرآن تو بہت تلاوت کریں گے مگر قرآن صرف اُن کی زبانوں پر ہوگا ،
اُن کے قلوب میں علم و فہم کا کوئی ذرہ نہ ہوگا۔

دوسری علامت اُن کے علمِ نا جہل کی یہ بتائی گئی ہے کہ : " یقتلون
اہل الاسلام ویدعون اہل الاوثان "۔ بُت پرستوں کو چھوڑ کر اہل اسلام
کو قتل کریں گے۔ کچھ یہ تجربہ بھی ہے کہ سطحی علم کے ساتھ مزاج میں شدت اور
عص میں نقست پیدا ہونا لازم ہے۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہ)
جب ان سے مناظرہ کے لیے پہنچے ہیں تو جو پہلا فقرہ اُنھوں نے فرمایا ہے ،
ہو یہ تھا ، میں ایسی جماعت کے پاس سے آ رہا ہوں جس میں یہ قرآن اُترا ہے
اور جو براہِ راست آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھنے والی ہے۔
اس کا مطلب یہ تھا کہ تم قرآن خواں ضرور ہو مگر قرآن داں نہیں۔ اگر
انصاف کرتے تو یہ فیصلہ آسان تھا کہ قرآن کی صحیح مراد وہ لوگ زیادہ جانتے تھے
جن میں سب سے پہلے قرآن اُترا اور جنھوں نے براہِ راست صاحبِ کتاب
سے اس کی مرادیں سمجھیں اور اپنی آنکھوں سے اس پر عمل کا طریقہ دیکھا۔

کاش امرِ صوف یا اُن کے ہم خیال علماء بھی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں اپنے
دُش بائیں دیکھنے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ قرآن کو طوطے کی طرح پڑھنے والے ، اس کی سچی
ہدایات اور لطیف مضامین سے محروم رہنے والے ، کہیں آجکل وہ حضرات ہی تو نہیں ہیں جو
قرآنِ کریم سے پروردگارِ عالم کو جھوٹا بنانے اور اُس کے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی توہین
و تقبیص کے دلائل فراہم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اولین خوارج نے تو حضرت علی رضی اللہ
تعالیٰ عنہ کو مشرک اور اسلام سے خارج کہا تھا لیکن موجودہ خوارج کے ہدفِ تحقیق سے
تو نہ انبیائے کرام ہی بچے اور نہ خالقِ کائنات۔ اس کے ساتھ ہی اُن جماعتوں یا افراد
کو بھی دیکھ لیتے جو علی الاعلان بُت پرستوں کا ساتھ دیتے رہے ہیں ، مسلم مغلدات کی

مناغت کرنا ہمیشہ شیوہ رہا ہے اور مسلمانوں کے خون کے دھتے ابھی تک جن کے دامنوں پر صاف نظر آرہے ہیں۔ اگر نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر ایمان ہے، اُن کے ارشادات علیہ السلام کو درست تسلیم کرتے ہیں، تو پیارے نبی کے اس پیارے اعلان پر عمل کرتے، "لَیَقْلُوْنَ اهل الاسلام ویدعون اهل الاوثان" کے جن کو مصداق پاتے، بغیر کسی رُور عاین کے اُنہیں خوارِجِ زمانہ تسلیم کرتے اور اُن سے کنارہ کش ہو جاتے۔ کیا خوارِج پر ان تہقیر کرنے والوں نے حق و باطل میں تمیز کرنے کی ایسی رحمت برداشت کی، تاریخِ اِکس کا جواب نفی میں دے رہی ہے کیونکہ منبرِ صادق صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے "ثُمَّ لَا یُعَوِّدُونَ" بھی تو فرمایا تھا۔ ایسے حضرات سب کچھ کہہ جاتے ہیں لیکن حق کی طرف آنے کی آن، باطل پر ڈٹے رہنے کے ارمان، واللہ، ہوا المستعان۔

وجہ یہ ہے کہ موجودہ حضرات کی طرح خوارِج کی ہمیشہ یہی کیفیت رہی ہے کہ تصویر کا جو رُز اُن کے سامنے ہوتا اُسی کو دیکھتے اور دوسری طرف نظر دوڑانا بھی معیوب سمجھتے تھے۔ اپنے نظریات کو غلطی سے قطعاً مبرا اور دوسروں کے عقاید کو سراسر غلط ماننا گویا خارجیت کی اولیٰ شرط ہے اور اس سے ذرا ادھر ادھر ہٹ جانا اُن کے نزدیک دین سے نکل جانے اور جہنم میں گر جانے کے مترادف رہا ہے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں :

"یہ حقیقت ہے کہ خوارِج کے مناظرات و مناقشات پر معصب کارنگ نمایاں ہوتا ہے۔ وہ کبھی نہ خصم کی دلیل کو تسلیم کرتے ہیں نہ اُس کے نظریات کی صحت کا اعتراف کرتے، وہ حق سے کسی قدر بھی قریب کیوں نہ ہو۔ مخالف جس قدر زیادہ قوی دلیل پیش کرتا اُسی قدر یہ اپنے عقیدے پر زیادہ راسخ ہو جاتے اور اپنی تائید میں دلیلیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے انکار اُن کے نفوس پر چھائے رہتے تھے اور اُن کے نظریات و معتقدات اُن کے قلوب کی گہرائی تک جا گزیر ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی قوتِ فکر و منظر کی تمام راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں اور اُن کے ادراکات و احساسات

میں قبولِ حق کی کوئی صلاحیت باقی نہ رہی۔ بایں ہمہ خوارج میں شدتِ نزع و خصوصیت کا جذبہ کار فرما رہتا تھا۔۔۔۔۔ یہ اسباب تھے جن کی بنا پر خوارج کے افکار میں بڑی تنگ نظری پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اُن کی جانب صرف ایک ہی آنکھ سے دیکھا کرتے تھے اور دوسروں کے نظریات کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔^۱

خوارج قرآن کریم کے مفہوم و مطالب کو جس طرح اخذ کیا کرتے تھے اُس کے بارے میں موصوف یوں تصریح کرتے ہیں:

”خوارج ظواہرِ قرآن سے تمسک کرتے تھے اور اُس کے معانی و مفہوم کی گہرائی میں اُترنے کی کوشش نہ کرتے۔ نصوص پر سطحی قسم کی نگاہ ڈالنے سے جو سرسری مفہوم ذہن میں بیٹھ جاتا بس اُسی کے ہورہتے اور اُس سے ایک انچ بھی ادھر ادھر سرکنا گوارا نہ کرتے۔“^۲

خوارج میں موصوف کے نزدیک وضعِ احادیث کا مرض بھی سرایت کیے ہوئے تھا۔ چنانچہ کہتے ہیں:

”مذہب و مسلک کی اندھا دھند تائید کا جذبہ بعض اوقات خوارج کو آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دروغ گوئی کرنے پر مجبور کر دیتا۔ ایک خارجی جس نے اس عقیدہ سے توبہ کر لی تھی، علماء سے کہا کرتا تھا کہ احادیثِ نبویہ کی اچھی طرح چھان بین کریں کیونکہ خوارج کو جب کوئی دلیل نہ ملتی تو وہ خود ساختہ کلام کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتے تھے۔“^۳

خوارج کے نظریات و عقائد چونکہ متعصب، تنگ نظری اور کج فہمی پر مبنی تھے یہی وجہ ہے کہ طبائع کے اختلاف کی بنا پر مختلف فرقوں میں بٹ گئے لیکن ازارقہ کھلانے والے خارجی

^۱ غلام احمد حریری: اسلامی مذاہب، ص ۹۹، ۱۰۰

^۲ ایضاً: ص ۱۰۰

^۳ ایضاً: ص ۱۰۰

باقی سب سے تعداد میں زیادہ اور مضبوط تھے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری نے دیگر خوارج سے ان کے چھ امتیازی عقاید کا ذکر کیا ہے، جن میں سے چار یہ ہیں:

(الف) یہ اپنے مخالفین کو صرف خارج از ایمان ہی قرار نہیں دیتے بلکہ ان کو مشرک اور دائمی جہنمی تصور کرتے ہیں، ان کا قتل و قتال بھی ان کے نزدیک روا ہے۔

(ب) غیر خوارج مسلمان کا ملک دار الحرب ہوتا ہے اور وہاں پر ہر وہ کام مباح ہے جو دار الحرب میں مباح ہوتا ہے مخالفین کے بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا اور انھیں لوندی غلام بنانا جائز ہے۔ جنگ سے جی چڑانے والوں (قتلِ مسلم سے پرہیز کرنے والے خارجیوں) کو قتل کرنا روا ہے۔

(ج) مخالفین کے بچے بھی مشرک ہیں اور ابدی جہنمی ہیں۔ اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ مخالفین کا کفر صرف ان کی ذات تک محدود نہیں رہے گا بلکہ ان کے بچوں تک بھی پہنچ جائے گا، باوجودیکہ انھوں نے اس جرم کا ارتکاب نہیں کیا۔ خوارج کا یہ نقطہ نظر ایک عظیم فکری انحراف کی آئینہ داری کرتا ہے۔

(د) گناہِ صغیرہ یا کبیرہ کا ارتکاب انبیاء سے بھی ہو سکتا ہے۔ لہٰذا از ارتد خوارج کے موخر الذکر عقیدے کے بارے میں موصوف نے اپنے تاثرات کا یوں اظہار کیا ہے:

”اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے اقوال میں تناقض پایا جاتا ہے۔ ایک طرف تو وہ کبار کا ارتکاب کرنے والوں کو کافر قرار دیتے اور دوسری جانب انبیاء سے بھی ان کا صدور جائز سمجھتے ہیں۔ گویا ان کے خیال میں انبیاء کفر کا ارتکاب کے توہر کیا کرتے ہیں۔“

لے غلام احمد حیرانی: اسلامی مذاہب، ص ۱۰۳

لے ایضاً: ص ۱۰۳

خارج کے بارے میں بحیثیت مجوسی پروفیسر صاحب مذکور اپنے خیالات یوں ظاہر کرتے ہیں:
 ”در اصل خارجی مذہب کی بنیاد تشدد اور غلو پر ہے۔ دین اور فہم دین کے معاملہ
 میں یہ لوگ بہت زیادہ غالی اور تشدد تھے۔ اس چیز نے انہیں گمراہی کے
 راستے پر لا ڈالا تھا اور عامہ مسلمین کو بھی گمراہ کرنے کے درپے رہتے تھے۔“

موجودہ زمانے کے خارجی حضرات باوجود اتمامِ حجت کے اور دلائل کے میدان میں عاجز
 رہ جانے پر بھی اپنے عقاید و نظریات سے ایک انچ بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوتے لیکن
 یہ حیرت اُس وقت دُور ہو جاتی ہے جب سم دیکھتے ہیں کہ ان حضرات کی اقلیت جماعت
 پر خود امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے یوں اتمامِ حجت فرمائی؟

”ایک مرتبہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہم عصر خوارج کے مزعومات
 کے دندان شکن اور مدلل جواب دیے۔ اُن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:
 ”اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ میں خطا وار ہوں اور گمراہ ہوں تو میری گمراہی اور
 غلطی کی سزا امت محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کیوں دیتے ہو؟ تم نے
 اپنے کندھوں پر تلواریں لٹکا رکھی ہیں اور انہیں موقع بے موقع بے نیام
 کر لیتے ہو۔ تم یہ نہیں دیکھتے کہ گنہگار کون ہے اور بے گناہ کون؟ دونوں کو
 تم نے ایک ساتھ ملا رکھا ہے۔“

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے
 شادی شدہ زانی کو سنگسار کیا، پھر اُس کی نمازِ جنازہ بھی پڑھائی، اُس
 کے اہل خانہ کو اُس کا وارث بھی تسلیم کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ
 وسلم نے قاتل کو جرمِ قتل میں قتل کیا لیکن اُس کے اہل کو اُس کی میراث
 سے محروم نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے چور کے ہاتھ
 کاٹے اور غیر شادی شدہ زانی کو دُڑے مارے لیکن دونوں کو مالِ غنیمت

میں سے حقتہ بھی دیا۔ آپ نے گنہگاروں کے مابین اللہ تعالیٰ کا حکم قائم کیا، لیکن اسلام نے مسلمانوں کو جو حقتہ دیا تھا اُس سے اُن گناہگاروں کو محروم نہیں کیا، نہ اُن کا نام دائرۃ اسلام سے خارج کیا، نہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اتمامِ حجت کے بارے میں پروفیسر ابو زہرہ مصری نے یوں لکھا ہے:

”حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کی اس مدلل اور عمدہ تقریر کا خوارج کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اُس موقع پر کتابِ الہی سے دلیل لانے کے بجائے عملِ رسول سے دلیل پیش کی، کیونکہ عمل کی تاویل نہیں ہو سکتی، اس کو درست طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے اور جس میں خوارج کے سطحی نظریات اور فکرِ خام کے لیے کوئی گنجائش نہ نکل سکتی تھی۔ سطحی فکرِ تصویر کا ایک ہی رُخ دیکھتا ہے۔ اُس کی نظر ایک جزئیے پر ہوتی ہے اور فہمِ عبادات و اسالیب میں جزئی میلان سے گرا ہی تو حاصل ہو سکتی ہے، مقصد تک پہنچنا مشکل ہے۔ مامورِ کلیہ پر نظر رکھنے سے حق کا ادراک کیا جاسکتا ہے اور درست فیصلہ تک پہنچا جاسکتا ہے۔ نظریں حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا عمل پیش کیا تاکہ اُن پر تاویل کے دروازے بند کر دیے جائیں، بغیر اس کے کہ اُن کی تبلیسیاتِ فاسدہ کے لیے حیرت و اضطراب کا کوئی رشتہ باقی نہ رہنے دیا جائے“۔

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے خوارج کو راہِ راست کی طرف بلانے اور اتمامِ حجت کی غرض سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو اُن کے پاس بھیجا۔ آپ کی

خارج سے جو گفتگو ہوئی اُسے حافظ ابن عبد البر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۶۳۳ھ) کے حوالے سے مولوی بدر عالم میرٹھی دیوبندی نے یوں بظن کیا ہے:

”جب خارج حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر چڑھاٹی کر کے آئے تو لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے امیر المومنین! دیکھیے یہ جاہل لوگ آپ کے مقابلے میں آمادہ پیکار کھڑے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ پہلے انھیں جنگ کر لینے دو۔

حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے عرض کیا کہ آج ذرا تاخیر سے نماز ادا کیجیے، میں اُن لوگوں (خارج) سے گفتگو کروں۔ وہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھڑک رہی ہے۔ شب بیداری کی وجہ سے اُن کے چہرے سیاہی مائل ہیں۔ سجدوں کے نشان پیشانیوں پر ہیں اور کہنیوں میں اُونٹ کے گھٹنوں کی طرح ٹھیکیں پڑ گئی ہیں۔ دھلی ہوئی قیض پھنے ہوئے ہیں۔ حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کو دیکھا تو بولے: ابن عباس! کیسے آتے اور یہ حُلہ کیسا پہن رکھا ہے؟ حضرت ابن عباس (رضی اللہ تعالیٰ عنہما) کہتے ہیں، میں نے جواب دیا: تمہیں اس حُلہ پر کیا اعتراض ہے؟ میں نے خود اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے جسم پر اچھے اچھے مینی کپڑے دیکھے ہیں۔ اس کے بعد قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: ”قل من حرم ذینۃ اللہ الّٰتی اخرج لبعادۃ والطیبات من الرّٰزق“۔ آپ کہہ دیجیے کہ بیزینت اور اچھی اچھی غذا میں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے بتائی ہیں، کس نے حرام کیں؟ پھر اُنھوں نے دریافت کیا: کہو کیوں آنے ہو؟ میں نے جواب دیا کہ میں اُن حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اور جن میں قرآن نازل ہوا تھا اور تم میں کوئی شخص ایسا نہیں جس نے آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دیکھا ہو۔ میری آمد کا

مقصد یہ ہے کہ اُن کی باتیں تم تک اور تمہاری باتیں اُن تک پہنچا دوں۔
 اُنہوں نے آپس میں کہا: ان سے بات مت کر کیونکہ یہ قریشی ہیں اور ان کے
 حق میں قرآن کہتا ہے: ”بل ہم قوم خصمون“۔ بلکہ یہ لوگ جھگڑا لویں۔

بعض نے کہا کہ ہم ضرور گفتگو کریں گے۔ اس کے بعد اُن میں سے دو تین
 شخص سامنے آئے۔ میں نے پوچھا کہ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) پر تمہیں
 کیا اعتراض ہے؟ اُنہوں نے کہا: اس اعتراض میں۔ میں نے کہا: بتاؤ۔
 اُنہوں نے کہا، پہلی بات تو یہ ہے کہ اُنہوں نے دین کے معاملہ میں انسانوں
 کو حکم بنایا، حالانکہ قرآن کریم میں ہے: اِنَّ الْحَكَمَ اِلَّا لِلّٰهِ فیصلہ
 صرف خدا کا ہے۔ میں نے کہا، چلو ایک بات بھولی، اور بھولے گئے،
 حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا)
 سے جنگ کی، پھر نہ کسی کو قید کیا اور نہ مال غنیمت لوٹا۔ اب اگر اُن کی جماعت
 مسلمان تھی تو اُن سے جنگ کیوں کی اور اگر کافر تھی تو جس طرح اُن کے ساتھ
 جنگ درست تھی، قید کرنا بھی درست تھا۔ میں نے کہا، اچھا اور کچھ؟ بولے
 تیسری بات یہ ہے کہ اُنہوں (امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ)
 نے اپنا نام امارت سے کیسے مٹایا؟ اس لیے اگر وہ مومنین کے امیر
 نہیں تو یقیناً کافروں کے امیر ہوئے۔ (لعو باللہ من ذالک)

میں نے کہا اگر میں ان سب باتوں کا بھی خود قرآن و سنت سے ہی
 جواب دے دوں تو کیا واپس چلے جاؤں گے؟ اُنہوں نے کہا: کیوں نہیں۔
 اس پر میں نے کہا، اچھا تو سنو۔ پہلی بات کا جواب یہ ہے کہ خود قرآن
 ہی میں دوسروں کو حکم مقرر کرنے کا حکم موجود ہے چنانچہ حالت احرام میں
 کوئی شخص تسکراتے تو اللہ تعالیٰ نے اُس پر جزا مقرر کی ہے اور اُس کا
 فیصلہ دو منصف مسلمانوں پر رکھا ہے، جو وہ کہہ دیں گے وہی قابل تسلیم
 ہو جائے گا۔ اسی طرح خلع میں طرفین کے درمیان فیصلہ اُن کی رائے

پر رکھ دیا ہے۔ اب تم ہی انصاف کرو کہ جب جانوروں اور عورتوں تک کے معاملات میں مسلمانوں کا فیصلہ قابل تسلیم سمجھا گیا ہے تو مسلمانوں کے جانی معاملات میں کیوں تسلیم نہیں ہوگا؟ اب بناؤ تمہارا اعتراض جاتا رہا یا نہیں؟ کہنے لگے: جی ہاں۔

دوسری بات کا جواب یہ ہے کہ بناؤ حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) تمہاری ماں تھیں یا نہیں؟ اگر انکار کرتے ہو تو کافر ہوتے ہو اور اقرار کرتے ہو تو کیا قید کرنے کے بعد ان کے ساتھ وہ سب معاملات درست رکھو گے جو دوسرے فیڈیوں کے ساتھ جائز ہوتے ہیں؟ اگر اس کا اقرار کرتے ہو، تو بھی کافر ہو، کہو اس پر تمہارا کوئی اعتراض ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔

میں نے کہا: اب تیسری بات کا جواب سنو۔ صلح حدیبیہ میں ابوسفیان و سہیل کے اصرار پر کیا آں حضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے نام سے رسول اللہ کا لفظ محو کرنے کا امر نہیں فرمایا تھا؟ پھر اگر حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے اپنا نام امارت سے علیحدہ کر دیا تو کیا ہوا؟ سوال و جواب کے بعد ان میں دو ہزار اشخاص تو واپس ہو گئے اور جو رہ گئے وہ قتل کر دیے گئے۔

مذکورہ بالا طویل حوالہ ہم نے اس غرض سے نقل کیا ہے تاکہ خوارج کے عقاید، ذہنیت اور ان کے ساتھ صحابہ کرام کا سلوک وغیرہ بہت سے گوشے قارئین کرام کے سامنے آجائیں۔ احادیث میں ان کی جو تشنایاں مذکور ہوئیں وہی مشاہدہ میں آئیں مثلاً:

۱۔ حضرت علی (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) حبشی مسہنی کو توحید کا مخالف ٹھہرانا اور ہر اس مسلمان کو کافر و مشرک قرار دینا جو حضرت امیر المومنین کو مشرک نہ کہے اور ان سے اپنی برأت کا

انہار نہ کرے۔

- ۲۔ صحابہ کرام کے نزدیک خارج کا عقیدہ توحید جیسا کہ اُنھوں نے اُس کی پیش خویش
حدود متعین کی ہوئی تھیں، قرآن و سنت کے خلاف اور اسلامی توحید کے منافی تھا۔
 ۳۔ بات بات میں قرآن سے استدلال کرنا خارج کا طرہ امتیاز تھا لیکن قصورِ فہم کے
باعث قرآنی آیات کو اپنے مخصوص عقاید و نظریات کا تابع رکھنے کے عادی تھے
 ۴۔ عبادت گزاری اور شب بیداری میں یہ مسلمانوں سے متناظر نظر آتے ہیں۔

۵۔ اپنے فیصلے کے روبرو یہ خدا اور رسول (جل جلالہ) وصلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے
 فیصلے کی پروا بھی نہیں کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت اور اُن کا
 جنتی ہونا خود قرآن کریم سے ثابت، حضور جان نور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُنھیں
 عشرہ مبشرہ میں شامل فرمایا، اہل بیت میں ٹھہرایا اور آپ کے ایسے ایسے فضائل و
 خصائص بتاتے جن میں آپ منفرد بھی ہیں اور اپنے گونا گوں فضائل و کمالات کی بنا
 پر اُمتِ محمدیہ میں آپ کو ہمیشہ انتہائی عقیدت اور احترام کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اسی
 طرح دیگر صحابہ کرام کے فضائل قرآن و سنت سے ثابت لیکن خارج نے اپنی ساختہ
توحید کا ان حضرات کو دشمن ٹھہرایا، باری تعالیٰ شانہ، اور اُس کے محبوب صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کے فیصلے کو اپنے توحیدی جوش میں پس پشت پھینک کر، اسلام کے
علمداروں اور اُمتِ مرحومہ کے سرداروں کو بھی مشرک قرار دینے میں کوئی جھجک
محسوس نہ کی۔ موجودہ زمانے کے خارج بھی اپنی ساختہ توحید کی ایسی ہی حدود متعین
کیے ہوئے ہیں، جن کے پیش نظر اُمتِ مرحومہ کا کوئی فرد موحد نہیں ثابت کیا جاسکتا
بلکہ ان کی اصطلاح میں مشرک ہی قرار پاتا ہے اور اس طرح یہ اُمتِ مرحومہ گویا مشرک
کا ایک گروہ یا اُمتِ ملعونہ بن کر رہ جاتی ہے (لعونہ اللہ من شرورہم)

- ۶۔ جو خارجی اپنی ساختہ توحید سے تائب ہو کر حقیقی اسلام کے پیروکار نہ بنیں وہ صحابہ کرام
 کے نزدیک مستحل الدم ہیں جیسا کہ خارج کا حشر امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
 نے کیا۔

۔ خارجی صرف خود کو اسلام کا صحیح متبع مان سکتے ہیں، اس کے علاوہ کسی بڑی سے بڑی ہستی پر تنقید کرنے، اس کی شان میں کیڑے نکالنے، اسے خوفِ خدا سے عاری یا سنتِ رسول کا مخالف کہتے ہوئے انھیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حلقے پر اعتراض کیا تھا۔

اس کے علاوہ اور جتنے گوشے ہیں وہ مذکورہ بالا عبارت سے خود ہی واضح ہیں۔ جب خوارج کا تشدد حد سے بڑھا تو ذوالفقار حیدری نیام سے باہر نکل آئی۔ مسلمانوں نے خوارج کا زور توڑ کر رکھ دیا۔ چُن چُن کر انھیں قتل کیا۔ بہت تھوڑے بچ سکے ورنہ سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ نہ انھیں کلمہ گو شمار کیا نہ اہل قبلہ، نہ صحابہ کرام و تابعین حضرات نے ان کے جُبوں قبوں کو دیکھا اور نہ ان کے ظاہری تدین کو، نہ ان کا مثالی قاری ہونا انھیں مسلمان ثابت کر سکا اور نہ پیشانیوں پر پڑے ہوئے سجدوں کے نشان ان کے اہل اسلام ہونے کی دلیل بن سکے، نہ شب بیداری نے انھیں کفریہ عقاید سے بچایا اور نہ خانہ ساز توحید نے۔ وہ صحابہ کرام و تابعین عظام کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ نہ صرف محاربین کو ان اکابر نے نہ تیغ کیا بلکہ اس ناپاک گردہ کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کی خاطر، اس ساختہ توحید کے علمبرداروں کو چُن چُن کر ذبح کیا اور ملکِ عدم کی سیر کرائی۔ کَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْآخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝

خوارج کے غیر اسلامی عقاید و نظریات کا مرکزی نقطہ نظر یہی تھا کہ وہ اپنا ذاتی کفر پورا کرنے کی غرض سے، ان آیات کو جو بُتوں اور بُت پرستوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں انھیں بزرگانِ دین پر چسپاں کر کے مسلمانوں کو انبیائے کرام و اویائے عظام کی تعقید و محبت کے باعث مشرک قرار دیتے تھے اور آج تک یہی کچھ مظاہرہ کیا جاتا رہا ہے۔ خوارج کی اس عادت کا مشہور دیوبندی عالم، مولوی بدر عالم میرٹھی نے یوں تذکرہ کیا ہے:

”خوارج کا نقطہ ضلالت یہی تھا کہ جو آیات کفار کی شان میں نازل ہوئی تھیں انھیں وہ مسلمانوں کے حق میں سمجھ کر انھیں کافر قرار دیتے، پھر اس جاہلانہ بنیاد پر ان سے آمادہ جنگ ہو جاتے تھے۔“

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خوارج کے بارے میں مس مرد حق آگاہ کی رائے گرامی کا اظہار بھی
 کر دوں، جو علم کی وافر دولت سے ہی مالا مال رہتے بلکہ روحانیت کے لحاظ سے اویسیا
 میں اپنی مثال آپ ہوئے میری مراد شہنشاہ بغداد، قطب الاقطاب، غوث الاعظم
 حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ سے ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

وَقَدْ وَصَّفَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِأَنَّهُمْ يَهْرَقُونَ
 مِنَ الدِّينِ كَمَا يَهْرَقُ السَّهْمُ
 مِنَ الرَّمِيَةِ ثُمَّ لَا يَعُودُونَ
 فِيهِ فَمَنْ الدِّينَ مَرَقُوا مِنَ الدِّينِ
 وَالْإِسْلَامِ وَفَارَقُوا الْمِلَّةَ وَ
 تَرَدُّوا عَنْهَا وَعَنِ الْجَمَاعَةِ
 وَضَلُّوا عَنِ سَوَاءِ الْهَدْيِ وَ
 السَّبِيلِ وَخَرَجُوا عَنِ السُّلْطَانِ
 وَسَلُّوا السَّيْفَ عَلَى الْأُئِمَّةِ وَ
 اسْتَحْلَوْا دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالَهُمْ
 وَكَفَرُوا مِنْ خَالِفِهِمْ لِيَشْمَتُوا
 أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَصْهَارَهُ وَيَتَبَرَّكُوا
 مِنْهُمْ وَيَرْجُوْنَهُمْ بِالْكَفْرِ وَالْعِظَامِ وَيَرْجُوْنَ
 خُلَافَتَهُمْ وَلَا يُؤْمِنُونَ بِعَذَابِ الْقُبُورِ وَلَا
 الْحَوْضِ وَلَا الشِّفَاعَةِ وَلَا
 يَخْرُجُونَ أَحَدًا مِنَ النَّارِ وَيَقُولُونَ
 مِنْ كَذِبٍ كَذِبَةٍ أَوْ أَتَى صَغِيرَةً

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اُن کے
 بارے میں فرمایا ہے کہ وہ دین سے ایسے
 نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے، اور پھر
 دین میں واپس نہیں آئیں گے۔ پس یہ وہی
 لوگ ہیں کہ دین اسلام سے خارج ہو گئے۔
 ملت اسلامیہ میں تفریق کی اور اُس سے
 بھاگے اور مسلمانوں کی جماعت سے کٹ کر
 رہ گئے۔ ہدایت کے میدان سے ہٹ کر
 گئے۔ سلطان وقت کے باغی ہوئے اور
 ائمہ مطہرین پر تلوار اٹھائی اور اُن حضرات
 کا خون بہانا اور مال کو ٹٹا حلال ٹھہرایا۔ اپنے
 مخالفوں کو کافر کہتے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ
 علیہ وسلم کے اصحاب اور خیروں کو گالیاں دیتے
 اُن پر تبر بازی کرتے اور اُن حضرات پر
 کفر اور کبیرہ گناہوں کی تہمت لگاتے اور
 غیر خوارج کو متم کرتے۔ یہ عذابِ قہر،
 حوضِ کوثر، شفاعت اور دوزخ سے کسی
 کے نکالے جانے کا انکار کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے
 جس نے ایک فحہ جھوٹ بولا یا گناہِ صغیرہ

او کبیرہ من الذنوب فمات | یا کبیرہ کیا اور غیر تو برکے مرگیا، تو ایسا آدمی
من غیر توبۃ فهو کافر فی النار مخلد | کافر ہے اور وہ ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

حضرت غوث صمدانی، محبوب سبحانی، سیدنا عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
(المتوفی ۵۶۱ھ) نے آگے خوارج کے پندرہ فرقے، اُن کے بانیوں کے نام اور ہر فرقے
کے مخصوص عقائد کا ذکر کر کے آخر میں جملہ خوارج کی قدر مشترک یعنی ایسے دو غیر اسلامی معتقدات
تحریر فرمائے ہیں، جن پر نجدات کے سوا سب خارجیوں کا اتفاق ہے۔ فرماتے ہیں:

واقفت جمیع الخوارج علی | خوارج کے تمام فرقوں کا بوجہ سیدہ حکیم حضرت
کفر علی رضی اللہ عنہ لاجل | علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کفر اور کبیرہ گناہ کے
التحکیم و علی کفر مرتکب الکبیرۃ | مرتکب کو کافر سمجھنا پر اتفاق ہے، ماسوائے
الا لتجدات فانہا لم یوافقہم | نجدات فرقے کے کیونکہ اس بارے میں
علی ذلک۔ ۲ | وہ دیگر خوارج سے متفق نہیں ہے۔

امام الامۃ حضرت سیدنا ابو خنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۰ھ) نے جو بلاشبہ
امام المسلمین ہیں، صحابہ کرام کے بارے میں اپنا اور جمہور مسلمین کا عقیدہ نیز مرتکب کبائر کا
شرعی حکم یوں بیان فرمایا ہے:

افضل الناس بعد النبیین علیہم | حمد انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد
الصلوٰۃ والسلام ابو بکر الصدیق | تمام انسانوں میں افضل ترین حضرت ابو بکر صدیق
ثم عمر بن الخطاب الفاروق | ان کے بعد حضرت عمر فاروق، پھر ان کے بعد
ثم عثمان بن عفان ذو النورین ثم | حضرت عثمان بن عفان ذو النورین پھر ان کے
علی ابن ابی طالب المرتضیٰ | بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم جمعین
رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین | ہیں۔ یہ سب عبادت گزار، سخی پرگامزن اور

حق کے ساتھ تھے۔ ہم ان سب سے محبت رکھتے ہیں اور ہم رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تمام اصحاب (صحابہ کرام) کو بھلائی کے ساتھ ہی یاد کرتے ہیں اور ہم کسی مسلمان کو کسی بھی گناہ کی وجہ سے اگرچہ وہ کبیرہ ہی کیوں نہ ہو، کافر نہیں کہتے، جب تک کہ وہ اُس کو حلال نہ سمجھے اور ہم اُس کو ایمان کے وصف سے نہیں نکالتے بلکہ بلحاظ حقیقت اُسے مومن ہی مگردانتے ہیں۔

عابدین علی الحق ومع الحق
نولیم جیعا ولا نذکر احدا من
اصحاب رسول اللہ (صلی اللہ
علیہ وسلم) الا بخیر ولا نلقہ
مسلماً بذنب من الذنوب
وان کان کبیرۃ اذا لم
تستحلها ولا نزیل عنه اسم
الایمان ونسبیتہ مومن
حقیقۃ۔

خارجی سلفی

چوتھی صدی ہجری میں اتباع سلف کا دعویٰ کرتے ہوئے بعض حضرات نمودار ہوئے جو خود کو امام احمد ابن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۲۴۱ھ) کا پیروکار کہتے اور دین حق کا علمبردار ٹھہرا کر مسلمانوں کو اسلام سے خارج بتایا کرتے تھے۔ حقیقت میں یہ خارجیت کے علمبردار تھے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری لکھتے ہیں:

”اتباع سلف سے مراد ہمارے نزدیک وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو سلفی المشرک کہتے تھے اگرچہ ہم ان کے بعض عقائد و افکار کی نسبت اسلاف کی جانب صیح نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ حنابلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ چوتھی صدی ہجری میں منصفہ شہر پر جلوہ گر ہوئے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اُن کے تمام اقوال و آراء امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ماخوذ ہیں۔ جنہوں نے عقائد سلف کو حیات نو بخشی اور اُن کی نشاۃ ثانیہ کے لیے مخالفین کے سامنے سینہ سپر رہے

..... یہ خابہ مسئلہ توحید اور قبروں سے اُن کے ربط و تعلق پر گفتگو کرتے تھے۔ آیاتِ تاویل و تشبیہ کا مسئلہ بھی ان کے یہاں اکثر زیر بحث آتا۔ ان کا ظہور چوتھی صدی ہجری میں ہوا۔ یہ اپنے عقائد و افکار کو امام احمد بن حنبل (رحمۃ اللہ علیہ) کی جانب منسوب کرتے ہیں۔ بعض خابہ (جو حقیقت میں حنبلی تھے) ان عقائد کی نسبت امام احمد کی جانب درست نہیں سمجھتے، اس ضمن میں ان سے جدل آزما ہوتے تھے، لہٰذا

سلفی حضرات نے جب خارجیت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہا اور مسلمانوں کو دھوکا دینے کی غرض سے اپنے عقاید فاسدہ کی نسبت امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۲۴۱ھ) کی طرف کرنے لگے تو علمائے اہلسنت کے ساتھ ہی وہ حنبلی علمائے کرام بھی سلفیوں کی ترویج میں انتہائی سرگرمی دکھانے لگے جو حقیقت میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے متبع تھے۔ امام ابن جوزی حنبلی نے ان کا سب سے بڑھ کر تعاقب کیا تھا۔ مثلاً:

”خابہ نے چوتھی صدی ہجری میں بعینہ انہی خیالات کا اظہار کیا تھا اور انھیں سلف کی جانب منسوب کیا۔ علماء اُن کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اس سے خدا کی تجسیم و تشبیہ خدا کا مخلوقات کی طرح جسم دار ہونا، لازم آتی ہے۔ وجہ لزوم یہ ہے کہ جب خدا کی جانب حسی اشارہ کیا جاسکتا تو وہ ضرور مجسم ہوگا۔ خابہ کے انہی نظریات کی بنا پر مشہور حنبلی فقیہ و خطیب ابن جوزی اُن کی مخالفت پر تہل گئے۔ انھوں نے کہا: امام احمد بن حنبل (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) یہ افکار و آراء نہیں رکھتے تھے۔ لہٰذا

علامہ ابن جوزی حنبلی کی سرگرمیوں کے بارے میں موصوف نے کچھ آگے یوں وضاحت کی ہے:

”ابن الجوزی نے اقوالِ حنابلہ (یعنی سلفی حضرات) کے ابطال میں شرح و بسط سے کام لیا ہے۔ ابن جوزی نے جن اقوال کی تردید پر قلم اٹھایا اُن کے قائل مشہور حنبلی فقیہ (سلفی) قاضی ابویعلیٰ (المتوفی ۴۵۷ھ) ہیں۔ قاضی موصوف اُس دور میں شدید نقد و جرح کا نشانہ بنے تھے، یہاں شک کہ بعض حنابلہ کو کہنا پڑا: وقد شان ابو یعلیٰ الحنابلہ شینا لا یفسدہ ماء البعار۔ ابویعلیٰ نے حنابلہ کو اس قدر داغدار کر دیا ہے کہ سمندروں کا پانی بھی اُن دھتوں کو دُور نہیں کر سکتا۔ فقیہ ابن زاعونی حنبلی (المتوفی ۷۷۷ھ) سے بھی قاضی ابویعلیٰ کے بارے میں اسی قسم کا قول منقول ہے۔ بعض حنابلہ کا قول ہے: ان فی قوله عن اب التثبیہ ما یحار النبیہ۔ ابویعلیٰ کے اقوال میں تشبیہ و تجسیم کے اس قدر نوا در پائے جاتے ہیں کہ ایک دانشمند آدمی اُن کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔“

جب علمائے اہلسنت یعنی حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنبلیہ نے ان خوارج زمانہ کا پوری سرگرمی سے تعاقب جاری رکھا تو یہ فتنہ دب گیا اور دو سو سال تک پھر یہ آواز کہیں سے نہ اُٹھی۔ چنانچہ ابوزہرہ مصری نے لکھا ہے:

”چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں حنابلہ نے ان رجحانات کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا، اسی وجہ سے حنبلی مسلک (سلفی حنابلہ) نظروں سے اوجھل ہو گیا۔“

خارجی حرّانی

پانچویں صدی ہجری میں یہ خارجی سلفی فتنہ مکمل طور پر ختم ہو گیا تھا لیکن جس جماعت نے

دجال کے لشکر میں شامل ہونے کا شرف حاصل کرنا ہے اُسے بھلا کون مٹا سکتا ہے، چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں اس وقت نے پھر سر نکال لیا۔ اس دفعہ علامہ ابن تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کی سرکردگی میں خارجیت کے جراثیم پھیلانے کی مہم شروع ہوئی۔ اپنی تیز طبیعت سے علامہ ابن تیمیہ نے کتاب خارجیت کے موجودہ ایڈیشن میں چند اضافے کر کے، جو پہلے ہی کر لیا تھا اُسے اور نیم پر چڑھا دیا۔ اس بارے میں پروفیسر ابوزہرہ مصری نے یوں وضاحت کی ہے:

”ساتویں صدی ہجری میں یہ لوگ ایک مرتبہ پھر معرضِ ظہور میں آئے۔ یہ حیاتِ نوان کو شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے باعث حاصل ہوئی جو سلفیت کے سرگرم داعی تھے۔ ابن تیمیہ نے بعض دیگر مسائل کی دعوت و تبلیغ کا بھی بیڑا اٹھایا جو آپ کے عصر و عہد کی پیداوار تھے۔“
 علامہ ابن تیمیہ حرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) نے خارجیت کے متن پر وہ بے نظیر حاشیہ لکھا، توحید کے مسئلہ کی حدود ایسی وضع کر دیں کہ گزشتہ سات صدیوں کے مسلمانوں میں سے کسی ایک فرد کو متحد ثابت کر دکھانا ناممکن ہو کر رہ گیا۔ جناب ابوزہرہ مصری نے اس بارے میں یوں وضاحت فرمائی ہے:

”سلفیہ کی رائے میں مسئلہ توحید اساسِ اسلام ہے۔ یہ بات حق ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی مجال نہیں۔ سلفیہ مسئلہ توحید کی جو تشریح و توضیح کرتے ہیں وہ جمہور اہل اسلام کے نقطہ نظر سے ہم آہنگ ہے مگر وہ چند امور کو منافی توحید سمجھتے ہیں جو جمہور مسلمانوں کے نزدیک توحید سے متعارض و متضاد نہیں۔ سلفیہ کے وہ مخصوص مسائل یہ ہیں:

- ۱۔ فوت شدگان سے توسل کرنا و حدائیتِ خداوندی کے منافی ہے۔
- ۲۔ روضہ نبوی کے رُوبرُو ہو کر اُس کی زیارت کرنا توحید کے خلاف ہے۔

۳۔ روضہ نبوی کے ارد گرد دینی شعائر و احکام (مثلاً طواف) کا بجالانا توحید کے منافی ہے۔

۴۔ کسی نبی یا ولی کی قبر کے اوپر خدا سے دعا مانگنا، خلاف توحید ہے۔

۵۔ سلف صالحین کا مذہب یہی تھا، اس کی خلاف ورزی کرنا پوالے بدعات کے مرتکب اور توحید کے مخالف ہیں۔^۱

وہ محبوب پروردگار جو باعثِ ایجاد کائنات اور وجہ قیام مخلوقات ہے، اُن کے روضہ مطہرہ کی زیارت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حنفی (المتوفی ۷۲۸ھ) متبعِ خارجیتِ نظریہ کو مزید یوں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے:

”ابن تیمیہ اسی لیے فرماتے ہیں کہ از راہ تبرک روضہ نبوی کی زیارت جائز نہیں، اس لیے کہ آنحضرت نے اپنی قبر کو مسجد بنانے سے روک دیا تھا، جس سے آپ کا مقصود یہ تھا کہ آپ کا روضہ زیارت گاہِ خلافت بن جائے۔“^۲

پروفیسر ابو زہرہ مصری نے موصوف کے اس نظریہ کے بارے میں یوں اپنا عندیہ ظاہر کیا ہے:

”مسئد زیرِ نظر (زیارتِ روضہ انور) میں امام ابن تیمیہ کا موقف جمہورِ اہل اسلام کے خلاف ہے بلکہ اُن کے نظریات کے خلاف ایک زبردست چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ قبورِ صلحا اور اُن کی منت و زیارت کے مسئلہ میں ہم کسی حد تک ابن تیمیہ کے ہمنا ہیں مگر روضہ نبوی کی زیارت کے مسئلہ میں ہم اُن کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔“^۳

موصوف کی اس کتاب کے مترجم یعنی لاپلور زرعی یونیورسٹی کے عربی اور اسلامیات کے

^۱ غلام احمد صبری، پروفیسر: اسلامی مذاہب، ص ۲۶۰

^۲ ایضاً: ص ۲۸۶

^۳ ایضاً: ص ۲۸۲، ۲۸۳

پروفیسر جناب غلام احمد حریری نے روضہ نبوی کی زیارت کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حُرّانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے نظریے کی حمایت اور پروفیسر ابو زہرہ مصری کے موقف پر، جیسا کہ مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے، چیں بچیں ہو کر یوں تنقید کی اور دھاندلی مچائی ہے:

”مصنف کا یہ قول مباغۃ آمیزی پر مبنی ہے (یعنی جمہور اہل اسلام کے خلاف بتانا)۔ حدیث نبوی ”لا تشدوا الرّحال“ کے پیش نظر محدثین کی اکثریت امام ابن تیمیہ کی ہمنوا ہے اور تبرک و تمین کے نقطہ نظر سے روضہ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔“

چونکہ برٹش گورنمنٹ کے عہد اقتدار سے آج تک مدعیان اسلام کو ایسی آزادی رائے حاصل ہے کہ خدائی کئے و دعویٰ دار بن بیٹھو یا بتوت کے مدعی ہو جاؤ، باری تعالیٰ شانہ کو جھوٹا ٹھہراؤ یا انبیائے کرام کو چمار سے بھی ذلیل کتے پھرو۔ سرورِ کون و مکاں اور عالمِ علوم اولین و آخرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نماز میں خیال لانا گدھے پیل کے تصور میں سراپا ڈوب جانے سے بدتر اور شرک بناؤ یا ان کے کثیر، وافر، مختصہ علوم غیبیہ کو بچوں، پاگلوں اور جانوروں کے معلومات کے برابر ٹھہراؤ، بنی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بلحاظ زمانہ آخری نبی ہونے کا انکار کرتے پھرو یا ان کے جملہ اقوال و افعال پر خطِ تنسیخ کھینچ کر، سرے سے ان کے قابلِ حجت یا لائقِ استناد ہونے ہی کا انکار کر بیٹھو، پوچھنے والا بھلا کون ہے؟ عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفویٰ کا دفاع کرنے کی کسی صاحبِ اقتدار و قدرت کو ضرورت ہی کیا پڑی تھی؟ ایسے پُر فتن دور میں کون کسی کی زبان پر پہرہ بیٹھا سکتا ہے؟ ہاں جس وقت قرآن و حدیث سے غیر اسلامی عقائد و نظریات کو اسلامی عقائد کا جامہ پہنایا جائے گا، وہاں دلائل کے میدان میں ایسی دھاندلی کا راز فاش کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور علمائے اسلام نے ایسا دفاع ہر دور میں مثالی طور پر کیا ہے۔

پروفیسر غلام احمد حریری نے چونکہ یہاں حدیث ”لا تشدوا الرّحال“ سے استناد

کر کے ایک بہت بڑا دعویٰ کر دیا ہے جو سراسر محتاج دلیل ہے۔ موصوف نے دعویٰ کر دیا ہے کہ محدثین کی اکثریت علامہ ابن تیمیہ (المتوفی ۷۲۸ھ) کی مہنوا ہے اور اس غرض سے روضہ نبوی کی زیارت کو جائز نہیں سمجھتی۔ لیکن ہمیں فاضل مترجم کے اس دعویٰ سے اختلاف ہے کیونکہ اس حدیث کے پیش نظر محدثین نے روضہ نبوی کی زیارت کو ہرگز ناجائز نہیں کہا اور نہ علامہ ابن تیمیہ حرانی کی قطعاً مہنوائی کی۔ موصوف اگرچہ محدثین کی مہنوائی کا دعویٰ کر رہے ہیں لیکن ہماری گزارش یہ ہے کہ اُنھیں دلائل کے میدان میں محدثین کے مبارک طبقہ میں سے کوئی ایک بھی قابل ذکر سہتی ایسی نہ ملے گی جس نے علامہ ابن تیمیہ کی مہنوائی کو ماسوائے گروہ خوارج کے جو اسلامی عقاید و نظریات کے لیے ہمیشہ ایک چیلنج ثابت ہوتا رہا ہے۔

مقابر بزرگان دین کی زیارت اور اُن کے توسل کے بارے میں علامہ ابن تیمیہ حرانی کا نظریہ یہ تھا :

”جو شخص یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ قبروں کی منتیں قضاے حاجات کا ذریعہ ہیں اُن سے ازالہ تکلیفات ہوتا، رزق کے دروازے کھلتے اور شہر مامون و محفوظ رہتا ہے، وہ مشرک ہونے کی وجہ سے واجب القتل ہے۔“^۱
موصوف کے اس نظریہ کے بارے میں پاکستان کے مشہور اہل قلم اور حتیٰ وانصاف کے عظیم علمبردار، سیدی و سندی و مرشدی حضرت مفتی اعظم ہند شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ / ۱۹۶۶ء) کی زندہ یادگار، مخدومی و مکرمی پروفیسر محمد مسعود احمد زید مجدہ یوں رقمطراز ہیں :

”ابن تیمیہ نے ۷۱۰ھ / ۱۳۱۰ء میں اولیاء و انبیاء کے مزارات پر حاضری کے خلاف ایک رسالہ بھی لکھا تھا جس کی پاداش میں کافی عرصہ بعد ۷۲۶ھ / ۱۳۲۶ء میں سلطان وقت نے اُن کو قید کیا اور اُسی قید و بند میں انتقال ہوا۔“

ابن تیمیہ مزارات پر حاضری کے علاوہ استغاثہ کے بھی خلاف تھے۔ چنانچہ

یوسف النہانی نے اپنی کتاب "شواہد الحق فی الاستغاثہ بلسید

الخلق" میں ابن تیمیہ کے اس عقیدے کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ لہ

سلفی حضرات کا طرز عمل تو یہ تھا کہ وہ خود کو خلیفہ ظاہر کر کے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے

عقائد و نظریات کی نشر و اشاعت کو اپنا نصب العین بنا کر خارجیت کو پھیلانے میں مصروف

رہا کرتے اور فقہاء و محدثین و متکلمین اُمتِ محمدیہ پر تنقید کرنے سے باز رہتے تھے۔ علامہ

ابن تیمیہ حرائی (المتوفی ۷۲۸ھ) پہلے مبلغ خارجیت ہیں جنہوں نے گروہ اکابر کے بڑے بڑے

علمائے کرام و علمائے عظام، حتیٰ کہ ائمہ دین تک کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، کسی بڑی سے

بڑی اور مستحکم ہستی کی شہرت کو داغدار کرنے اور چھلنی بنانے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس

نہیں کی۔ علامہ ابن تیمیہ کی اس روش کے بارے میں جناب پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب

یوں وضاحت کرتے ہیں :

"ابن تیمیہ صوفیائے کرام اور متکلمین سے بھی نالاں معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ

انہوں نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں (النقد من الضلال اور

احیاء العلوم الدین) پر بڑی جرح کی ہے۔ یہ وہی امام غزالی ہیں جن

کی شان میں شیخ ابوالفضل نے گستاخانہ کلمات کہے تھے تو حضرت مجدد

الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فوراً اس کی مجلس سے اٹھ کر چلے آئے تھے اور معلوم

ہے کہ مجدد الف ثانی کون بزرگ تھے؟ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے متعلق

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کہا ہے :

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان

جب تک فیضی نے معافی نہیں مانگ لی، آپ اس کی مجلس میں تشریف نہیں

لے گئے۔ اُنھیں امام غزالی اور دوسرے صوفیہ کرام کے متعلق ابن تیمیہ کہتے ہیں

”صوفی اور متسکین ایک ہی کشتی میں سو رہے ہیں۔“ لے

علامہ ابن تیمیہ حرانی (المتوفی ۷۲۸ھ) کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے یوں اُن کی سوانح حیات بیان کی ہے :

”مگر ایک زمانہ وہ آتا ہے جب اختلاف رائے ایک خطرناک صورت اختیار کر لیتا ہے اور علمائے کرام کے طبقے سے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جن کے افکار و خیالات ملتِ اسلامیہ میں غیر مختتم تفریق کا باعث ہوئے۔ اس سلسلے میں ہم ایک عالم کا ذکر کریں گے یعنی تقی الدین ابوالعباس احمد بن شہاب الدین عبدالحلیم المعروف بہ ابن تیمیہ الحرانی الحنبلی (۶۶۱ھ-۷۲۸ھ) یہ عالم بلا کے ذہین و فطین تھے۔ سنہ ہجری کی عمر میں فتویٰ نویسی کا آغاز کیا تقریباً پانچ سو کتابوں کے مصنف ہوئے۔ جب ابن تیمیہ نے مناظروں میں اپنے افکار و خیالات کا آزادانہ اظہار کیا تو اسخ العقیدہ علمائے اہلسنت و جماعت میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور وہ ان کے سخت مخالف ہو گئے۔ یہاں تک کہ ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور بعض علماء نے تو یہ تک فرما دیا کہ جو ابن تیمیہ کو ملحد نہ سمجھے وہ خود ملحد ہے۔“ لے

علامہ ابن تیمیہ کی تقلید کا نشانہ صرف ائمہ دین ہی نہیں بنے بلکہ حضرت عمر فاروق اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر و اعظم بھی اس اندھا دھند تیر اندازی و ناوک فگنی سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ موصوف لکھتے ہیں :

”ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ابن تیمیہ کے متعلق لکھا ہے کہ اُنھوں نے الصالحیۃ الجلیل کی مسجد میں منبر پر کھڑے ہو کر کہا ”حضرت عمر بن الخطاب نے بہت سی غلطیاں کیں۔“ اسی طرح ایک روایت یہ بھی ہے

کہ انھوں نے کہا: علی بن ابی طالب نے تین سو غلطیاں کیں۔
 ابن تیمیہ حُرانی کے عقائد و نظریات کی تردید تو کتنے ہی اکابر اہلسنت نے کی اور متاخرین
 علمائے اہلسنت نے اُن کے نظریات سے ہمیشہ برأت کا اعلان ہی کیا اور اُنھیں دین و ایمان
 کی موت قرار دے کر مسلمانوں کو ہمیشہ اُن عقاید سے بچنے کی تلقین ہی کرتے رہے۔ اہلسنت
 کے مایہ ناز محدث شیخ احمد شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ ابن تیمیہ حُرانی
 (المتوفی ۷۲۸ھ) کے مخصوص عقاید و نظریات کے پیش نظر، شرعی فیصلہ یوں صادر
 فرمایا ہے:

ابن تیمیہ ایک ایسا شخص ہے جس کو خدا نے رسوا
 کیا، گمراہ کیا، اندھا کیا، بہرا کیا اور ذلیل کیا۔
 اسی لیے ائمہ دین نے اس امر کی صراحت کی
 اور اُس کے فسادِ احوال اور جھوٹے اقوال کو
 بیان کیا۔ جو تصدیق کا ارادہ رکھتا ہے اُسے
 چاہیے کہ اُس امام و مجتہد کی تصانیف کا مطالعہ
 کرے جن کی امامت، جلالت اور مرتبہ اجتہاد
 تک رسائی پر سب کا اتفاق ہے یعنی شیخ
 ابوالحسن سبکی نیز اُن کے فرزند ارجمند علامہ
 تاج الدین سبکی اور اماموں کے شیخ حضرت عزیز
 جماعہ اور اُن کے معاصرین اور دیگر علمائے شافعیہ
 مالکیہ اور حنفیہ وغیرہ کی۔ ابن تیمیہ نے صوفیہ متاخرین
 پر اعتراض کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اُس
 نے حضرت عمر بن خطاب اور علی بن ابی طالب
 رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے اکابر صحابہ پر بھی اعتراضات
 کیے جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اُس کا

ابن تیمیہ عبد خزله اللہ واضلہ
 واعماہ واصتمہ واذلہ وبذلک
 صرح الائمة الذین بیئتو ا
 فساد احوالہ وکذب اقوالہ
 ومن اراد ذلک فعلیہ بمطالعة
 کلام الامام المجتہد
 المتفق علی امامتہ وجلالتہ
 وبلوغہ مرتبة الاجتہاد ای
 الحسن السبکی وولده
 التاج وشيخ الامام العزیز ابن
 جماعة واهل عصرهم وغيرهم من
 الشافعية والمالكية والحنفية
 ولم يقصر اعتراضه علی متأخری
 الصوفية بل اعتراض علی مثل
 عمر بن الخطاب وعلی بن ابی طالب
 رضي الله عنهما كما يأتي والحاصل

ان لا یتقام لکلامه وزن بل
یروی فی کل وعرو حزن و
یعتقد فیہ انه مبتدع ضال
ومضل جاهل غال عاملہ
اللہ بعدلہ وارس جادنا من مثل
طریقته وعقیدتہ وفعلہ
امین۔ لہ

کلام کوئی وزن نہیں رکھتا بلکہ ویرانے میں پھینکنے
کے لائق ہے۔ ابن تیمیہ کے بارے میں عقیدہ
رکھنا چاہیے کہ وہ بدعتی، گمراہ، گمراہ کن، جاہل
اور حد سے نکل جانے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس
کے ساتھ اپنے عمل سے معاملہ کرے اور ہمیں
اُس کے جیسے طریقے اور عقیدے سے بچائے۔
امین۔

میں حضرت فخر المحدثین آگے چل کر ابن تیمیہ، اُن کی تصانیف اور اُن کے متبعین کے بارے میں
مسلمانوں کو اُن کی غیر خواہی کے پیش نظر یوں فہمائش کرتے اور حکمِ شرح بیان فرماتے ہیں
ابن تیمیہ اور اُس کے شاگرد ابن قیم جوزی وغیرہ
کی کتابوں پر کان رکھنے سے بچو کیونکہ اُنہوں
نے اپنی خواہش نفسانی کو معبود بنا لیا تھا
اور خدا نے اُس کو علم کے ذریعے گمراہ کیا اور
اُس کے کان اور دل پر مہر کی اور اُس کی
آنکھ پر پردہ ڈالا۔ پس کون ہے جو اس کے
بوجود اسے ہدایت دے۔ ان لمحدود نے
کس طرح اسلامی حدود سے تجاوز اور
رسوم سے تعدی کی اور شریعت و حقیقت
کی چادر کو پھاڑ کر بھی گمان کیا وہ اپنے رب
کی طرف سے راہِ راست پر ہیں حالانکہ وہ
راہِ راست پر نہیں ہیں بلکہ وہ بدترین گمراہی
اور قبیح ترین خصال اور انتہائی بد نصیبی

وَايَاكَ ان تصنعوا الى ما في
كتب ابن تيمية وتلميذه ابن
القيم الجوزية وغيرهما من
اتخذوا الهواه واصله الله
على علم وختم على سمعه وقلبه
وجعل على بصره غشاوة فمن
يهدي به من سعد الله وكيف
تجاوز هؤلاء الملحدون
الحدود وتعد الرسوم وخروا
سباح الشريعة والحقيقة فظنوا
بذلك انهم على هدى من ربهم
وليسوا كذلك بل هم
على اسواء الضلال واقبح

الخصال وبلغ المقط والخسران
وانهى الكذب و
البهتان فخذ الله متبعهم وطهر
الارض من امثالهم“ ۱۷

خسارے اور جھوٹ بہتان میں مبتلا ہیں۔
اللہ اُن کے پیروکاروں کو رُسوا کرے اور
اُن جیسے عقیدے رکھنے والوں سے زمین کو
پاک کر دے۔

خارجی و باطنی

ساتویں صدی میں اٹھا ہوا یہ خارجیہ کا فتنہ آخر کار علمائے اہلسنت شکر اللہ سید ہم کی
مساعی جمید سے ختم ہو کر رہ گیا۔ علامہ ابن تیمیہ اور اُن کے شاگرد ابن قیم وغیرہ کی تصانیف ایک
حزب کا ناپید ہو گئیں۔ بارہویں صدی میں یہ ناسور پھر چوڑھی دفعہ ابھر آیا۔ نجد میں محمد بن عبد الوہاب
نامی ایک عالم نے خوارج کے مذہب کو ابن تیمیہ کی تصانیف سے حاصل کر کے اُس کی تبلیغ
و اشاعت شروع کر دی۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری اس سلسلے میں یوں وضاحت کرتے ہیں:

”اتباع محمد بن عبد الوہاب نے مسلک ابن تیمیہ کو از سر نو زندگی بخشی۔ اس
تحریک کے بانی و مؤسس محمد بن عبد الوہاب تھے جن کی وفات ۱۱۷۷ء
میں ہوئی۔ محمد بن عبد الوہاب تصانیف ابن تیمیہ سے مستفید ہو چکے تھے۔ انہوں
نے نظر غائر اُن کتب کا مطالعہ کیا اور اُن کو فکر و نظر کی حدود سے نکال کر عمل کے
 دائرہ میں داخل کیا۔ جہاں تک عقاید کا تعلق ہے انہوں نے عقاید ابن تیمیہ پر
 ذرہ بھر اضافہ نہ کیا اور اُن کو جوں کا توں اپنا لیا، البتہ انہوں نے امام ابن تیمیہ
 کی نسبت زیادہ تشدد سے کام لیا اور ایسے عملی امور کو ترتیب دیا، جن سے
 ابن تیمیہ نے تعرض نہیں کیا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ امور اُن کے عصر و عہد
 میں مشہور نہ تھے۔“ ۱۸

۱۷ احمد شہاب الدین بن حجر مکی، محدث: فتاویٰ حدیثیہ، ص ۱۲۴

۱۸ غلام احمد صریحی: اسلامی مذاہب، ص ۲۸۸

ہوتے تھے۔ جن دنوں وہاں پہ صحرانشین تھے ان کی تبلیغ و دعوت سے چنڈاں
 خطرہ نہ تھا، جب سعودی خاندان بلاد عرب میں برسرِ اقتدار ہوا تو ان کو دوسرے
 لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع میسر آئے، جس سے خطرہ بڑھ گیا۔ لہ
 وہاں کو قبہ شکنی میں بڑا مزہ آتا تھا اور اس شرمناک حرکت کو وہ دین کی اہم ترین خدمت،
 توحید کا تحفظ اور اپنا عظیم کارنامہ شمار کرتے تھے۔ پروفیسر ابو زہرہ مصری نے اُن کے اس
 مشغلے کا ذکر یوں کیا ہے :

”شہر ہو یا دیہات، جہاں ان لوگوں کا بس چلتا وہاں پہنچتے اور قبے گرا دیتے۔
 اس کی حد یہ کہ بعض یورپین مصنفین ان کو ”معبد شکن“ کے نام سے پکارتے
 ہیں۔ یہ لقب بالآخر رچھول ہے۔ اس لیے کہ قبہ جات کو معبد کی حیثیت
 حاصل نہ تھی۔ غالباً یہ لوگ اُن مساجد کو مسمار کر دیتے تھے، جن میں قبے
 ہوا کرتے تھے۔“ لہ

وہاں نے اسی پر بس نہیں کر دی تھی۔ بلکہ صحابہ کرام اور دیگر بزرگانِ دین کے مزارات کو
 مسمار کرنے کی خدمت بھی انھوں نے بڑے ذوق و شوق سے انجام دی۔ شعائر اللہ کی
 اس طرح پامالی کو وہ اپنی ساختہ توحید کی معجون کا جزوِ اعظم سمجھتے تھے اور اپنے اس
 کارنامے پر وہ نازاں تھے کہ دنیا سے کفر و شرک کا نام و نشان مٹا رہے ہیں حالانکہ جس
 بلا سے وہ دوسروں کو بچانا چاہتے تھے وہ خود اُن پر ہی مسلط تھی لیکن خوارج کی فطرت شرع
 سے ہی یہ چلی آرہی تھی کہ وہ دوسروں کی آنکھوں میں تنگے تلاش کرنے کی کھوج میں لگے
 رہتے ہیں اور اپنی آنکھوں کے شہتیر دیکھنے سے وہ ہمیشہ ہی قاصر رہے اور تاحال قاصر
 ہیں۔ مثلاً :

”وہاں کے تشدد کی یہ (قبہ شکنی) آخری حد تک نہ تھی بلکہ اس سے

ایک قدم آگے بڑھ کر انھوں نے مقبروں کو مسمار کر دیا۔ جب دیارِ عرب میں وہ برسرِ اقتدار آئے تو صحابہ کے مقبرے گرا کر ان کو زمین کے برابر کر دیا۔ اب صرف اشارات باقی رہ گئے جن کی مدد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ فلاں صحابی کی قبر ہے۔ قبروں کو زمین سے ہموار کرنے کے بعد انھوں نے اس پابندی کے ساتھ ان کی زیارت کی اجازت دے دی کہ زائر صرف اسلام علیکم کہے اور بس“ لے

وہابیوں کی مذمتی اور مقابر کی پامالی کے سلسلے میں پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے بعض مروجین کے حوالے سے، مورخانہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے :

”ابن عبد الوہاب اور ان کے متبعین نے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کے جان و مال کو اپنے لیے حلال کیا بلکہ مروجین صحابہ اور صلحائے امت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قبوتوں کو بے دریغ مسمار کیا۔ چنانچہ ابن عبد الوہاب نے ان قبوتوں کو منہدم کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا جو مسلمانوں کی عقیدت و محبت کے نشان تھے۔ مثلاً، مقامِ جلیبہ پر حضرت زید بن خطاب (جو جنگِ یمامہ میں شہید ہوئے تھے) کے قبۃ شریف پر اپنے ہاتھ سے کدال مارا اور دھڑا دھڑا کر کر زمین کے ہموار کر دیا“

اسی طرح جب ۸ محرم ۱۲۱۸ھ / ۱۸۰۳ء کو سعود بن عبد العزیز فاتحِ انداز سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا تو ”اہلِ نواحی قبوتوں اور شریکیہ مشاہد (۹) کے انہدام پر مامور کیے گئے۔ سعود نے بینیل دن مکہ مکرمہ قیام کیا اور اس دوران مسلمان (متبعین ابن عبد الوہاب) قبوتوں کو گرتے رہے تا اسکہ مکہ مکرمہ کے تمام مشاہد اور قبۃ برابر کر دیے گئے“

”کعبے کے جواب اور قیمتی ذخیرے فاتحین میں تقسیم کر دیے گئے، قبے گرائے گئے اور بعض مجاور قتل بھی کیے گئے۔“ بلکہ ایک دل ہلا دینے والی خبر ولفرڈ بلنٹ کی کتاب فیوجہ آف اسلام میں ملتی ہے۔ مصنف لکھتا ہے: ”ہر جگہ قبتے مسمار کر دیے گئے اور سرزمینِ حجاز کے مقدس مقامات اُس (ابن عبدالوہاب) کے متبعین کے قبضے میں آ گئے تو صوفیہ و ادویاء کے قبتے، حجاج کرام جن کی صدیوں سے عزت و احترام کرتے چلے آئے تھے زمین کے برابر کر دیے گئے۔۔۔۔۔ ان حرکتوں سے عالم اسلام میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور وہابیوں کی قسمت کا ستارہ گردش میں آ گیا۔“

خارج کی فطرت، زبانِ رسالت سے ”یقتلون اهل الاسلام ویدعون اهل الاوثان“ بیان ہوئی تھی کہ وہ بت پرستوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کو قتل کیا کریں گے۔ وہابیہ بھی اپنی خارجیت کا مکمل ثبوت پیش کرتے ہوئے مسلم کشی میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی اور کبھی اُن باندے جو اندروں کی تلوار غیر مسلموں کے خلاف نہ اٹھنے پائی۔ تاریخ اقوام کے اعمال مرقع ہے، زمانے سے بڑھ کر کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں۔ ہر شخص اس ارتداد نبوی اور عمل وہابیہ کو سامنے رکھ کر خود فیصلہ کر سکتا ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتا تو کل بروز قیامت خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ خیر وہابیہ جب مسلمانوں کی جان و مال اور ننگ و ناموس سے قرب کھیل رہے تھے اور اُس کی تاویل یوں بیان کیا کرتے تھے:

”جب عالم و عامی نے ابن عبدالوہاب پر یہ الزام لگایا کہ وہ مسلمانوں کا قتل عام کر رہے ہیں اور اُن کا مال و دولت لوٹ رہے ہیں تو اُن کے متبعین نے جواب دیا کہ حاش و کلا، ہم مسلمانوں کا قتل عام نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہم تو اُن مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں جو اعمال و انکار کی وجہ سے مشرک و کافر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ اس طرح صفائی پیش کی گئی۔۔۔۔۔“ شیخ رحمہ اللہ نے

صرف اُن صنم پرستوں کی تکفیر کی جو اولیاء اور نیکو کار بندوں سے مرادیں مانگتے ہیں جنہوں نے حجت کے ثبوت اور طریق حق کی وضاحت کے بعد بھی شرک کا ارتکاب اور اللہ کا شرک ٹھہرایا اور پھر اُنہوں نے قتال میں بھی پیش قدمی کی، تب شیخ نے اُن سے قتال کیا اور اُن کا خون بہایا اور اُن کا مال لوٹا، اگر مسلمانوں کے اعمال کا اتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے لوگ ہیں جو زندہ بہنے کے قابل ہیں؟ شاید لاکھوں میں معدودے چند ہوں تو ہوں۔“ ۱

وہابیہ چونکہ اپنے سوا جملہ مدعیان اسلام کو کافر و مشرک کہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اصطلاحی مشرکوں کا خون بڑے ذوق و شوق سے بہایا کرتے تھے۔ چنانچہ الدرر السنیہ اور رد المحتار کے حوالے سے پروفیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ان حضرات کی فطرت اور خلعتِ مسلم کشی کو یوں لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے :

”ابن عبد الوہاب اپنے متبعین کے علاوہ اس آسمان کی نیلی چھت کے نیچے اُن تمام مسلمانوں کو علی الاطلاق کافر و مشرک سمجھتے تھے جو اُن کی اطاعت و پیروی سے گریز کرتے تھے۔ اس لیے اُن کا خون بہانے میں دریغ نہیں کرتے تھے۔ یہ بات نبی کو زبیب دیتی ہے مگر کسی مصلح کی یہ کیفیت کم علمی اور کم فہمی کا نتیجہ ہے۔“ ۲

وہابیہ کی تلوار مسلمانوں کے خلاف کیوں اٹھتی رہی؟ اس کا سب سے بہتر جواب تو خود فرامین رسالت میں موجود ہے لیکن اس المناک طرزِ عمل پر ایک فکر انگیز اور اچھوتا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے :

”تاریخ اسلام میں اس قسم کے بہت سے رُوح فرسا مناظر سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا ہے مگر یہاں

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ منطہری، ص ۴۷،

۲۔ ایضاً: ص ۴۷،

ذکر اس شخص کا ہے جو پیغمبرؐ ان بان کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف دعوت

دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیت میں پیغمبرؐ انہ صفات کو تلاش کیا جائے

اور اسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس

نظر آتا ہے۔ پیغمبرؐ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم زندگی بھر کفار و مشرکین اور یہود

و نصاریٰ کے خلاف آمادہٴ پیکار رہے، مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف؟

محمد بن عبد الوہاب نجدی کی تحریک کے متعلق دعویٰ تو یہی تھا کہ شرک و بدعت کے

لیکن حقیقت کچھ اور ہی نظر آتی ہے۔ وہابیوں کا طرز عمل اصلاح کی بجائے برعکس ثبوت پر

کرتا ہے۔ اصلاح کی جگہ فساد کیا، مسلمانوں کو ان سے کوئی تقویت پہنچنے کی بجائے

و انتشار ملا۔ مسلمانوں کا خون ان کے ہاتھوں بہا، ننگ و ناموس اور مال و دولت

دست درازی ہوئی۔ غرضیکہ اس گروہ کا وجود گویا ڈاکوؤں اور لٹیروں کا جھگڑا ہو کر

جس سے مسلمانانِ عالم کے جذبات ان لوگوں کے خلاف بھڑک اُٹھے اور یہ قدرتی و فطری

بات تھی۔ وہابیوں نے قوت حاصل کرنے کی ہر ممکن اور گھٹیا سے گھٹیا تدبیر اختیار کرتے رہے

بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ مثلاً:

”ابن عبد الوہاب نے جن مسائل کے متعلق آواز اٹھائی ان میں سے بعض

یہ ہیں۔ امکانِ کذب، امکانِ نظیر، استغاثہ، استعانت، علم غیب،

الحالت بغیر اللہ، زیارت القبور وغیرہ۔ ظاہر یہ کیا گیا کہ یہ تحریک مروجہ بدعات

اور اعمالِ شرکیہ کے خلاف ایک مخلصانہ کوشش ہے مگر بعض تاریخی واقعات

کی روشنی میں باطن، ظاہر سے کچھ مختلف نظر آتا ہے۔ مثلاً جب ابن عبد الوہاب

نے امیرِ عینہ کو اپنی تحریک میں شمولیت کی دعوت دی تو ان الفاظ میں

اُنّی اسرجوا ان انت قمت بمنصر لا الہ الا اللہ ان یظہرک اللہ تعالیٰ

وتملک نجد اوعرابہا۔ اگر تم لا الہ الا اللہ کی امداد کے لیے

آبادہ ہو جاؤ تو میں اُمید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غالب کرے گا اور نجد اور اہل نجد کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔ حیرت اس بات پر ہے کہ کاریگر کی طرف بلایا جا رہا ہے تو یہ لالچ کیوں دی جا رہی ہے کہ نجد اور اہل نجد کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہوگی؟ حالانکہ اُس وقت ان علاقوں پر کوئی مشرک و کافر حکمران نہ تھا۔ یہ انگ بات ہے کہ ابن عبد الوہاب اپنے مخالفین کو کافر اور واجب القتل تصور کرتے تھے۔ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے تحریص و ترغیب کا یہ انداز مومنانہ نہیں۔“

جب محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ/۱۸۹۲ء) نے درعیہ کے امیر یعنی محمد سعود کو اپنی تحریک کا ساتھ دینے کی دعوت دی تو اُس نے دو شرطیں عائد کی تھیں، دوسری یہ تھی کہ میں اہل درعیہ سے فصل کے وقت کچھ مقررہ محصول وصول کیا کرتا ہوں، آپ اس سے نہیں روکیں گے۔ علیہذا راجحہ و سنت اور ماحی شرک و بدعت ہونے کا دعویٰ کرنے والے محمد بن عبد الوہاب نجدی نے اس کا جواب دیا وہ تبصرہ کے ساتھ پروفیسر محمد سعود احمد صاحب سے سنئے:

”یہ دوسری شرط، سو انشاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائے گا کہ اسخراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔“

کس پر فتوحات؟ کیسی غنیمت؟ انھیں مسلمانوں پر فتوحات اور انھیں مسلمانوں کی دولت جن کو مشرکین و کفار کے زمرے میں شمار کر کے ان کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے۔ ستم رسیدہ مسلمانوں کی متاع عزیز کو غنیمت سمجھ کر کھانا اور کھلانا کیسی ستم ظریفی ہے؟ یہی نہیں بلکہ جب ابن عبد الوہاب کو ذرا قوت حاصل ہو گئی تو پھر رنگ کچھ اور ہو گیا۔ چنانچہ جب حاکم ریاض، وہاب بن دواس نے ابن عبد الوہاب کے پیروؤں کے معتقدات سے

”نگہ اسرار پر سختی کی تو ابن عبد الوہاب نے فوراً جدال و قتال کا حکم صادر فرمایا، بس پھر کیا تھا، مسلمانوں کے کشتوں کے پشتے لگ گئے۔“ لہ

تحریک وہابیت کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے موصوف کیا پتے کی بات کہ گئے ہیں، ”ضمناً ایک اور حقیقت کی طرف اشارہ کرنا چلوں اور وہ یہ کہ تحریک وہابیت نے بعض مسلمانوں کو اکابرینِ ملت کی جناب میں بہت بدباک بنا دیا ہے حیرت و تعجب اس بات پر ہے کہ اکابرین اور صلحائے امت پر اعتراضات اور تنقیدات اُن حضرات کی جانب سے ہوتی ہے جن کی نظر سطحیت کی غماز ہے اور اعتراض اس انداز سے کرتے ہیں گویا نظر ہے تو بس اُنھیں کے پاس“

محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) کے بارے میں اہلسنت و جماعت کے مایہ ناز فقیہ علامہ محمد امین ابن عابدین شامی (المتوفی ۱۲۵۲ھ) رحمتہ اللہ علیہ یوں رقمطراز ہیں:

جیسا کہ ہمارے زمانے میں (ابن) عبد الوہاب کے متبعین میں واقع ہوا، جو نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر قابض ہوئے۔ اپنے آپ کو حنبلی مذہب کا پیروکار ظاہر کرتے تھے، حالانکہ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ مسلمان بس وہی ہیں اور اُن کے عقاید سے اختلاف رکھنے والے سب مشرک ہیں۔ اسی لیے اُنھوں نے اہلسنت و جماعت اور اُن کے علماء کو قتل کرنا مباح ٹھہرایا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی طاقت توڑ دی، مسلمانوں کے لشکروں کو

”کما وقع فی زمانتنا فی اتباع عبد الوہاب الذین خرجوا من نجد و تغلبوا علی الحرمین و کانوا ینتحلون مذهب الحنابلۃ لکنہم اعتقدوا انہم هم المسلمون و ان من خالف اعتقادہم مشرکون و استباحوا بذلک قتل اہل السنۃ و قتل علماءہم حتی کسر اللہ شوکتہم و خرب بلادہم و ظفر بہم عساکر

لہ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواعد مظہری، ص ۱۷

لہ ایضاً: ص ۸،

المسلمین عام ثلث وثلثین ومائتین اُن پر فتح دی یعنی ۱۲۳۳ھ میں۔
والف“ لہ

دہائیہ کے بارے میں دیوبندیوں کے بہت بڑے عالم، براہین قاطعہ جیسی کتاب کے مصنف مولوی خلیل احمد انبٹھوی (المتوفی ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۷ء) نے سوال و جواب کے طور پر اپنا اور اپنی جماعت کا موقف یوں بیان کیا ہے:

”سوال: محمد بن عبد الوہاب نجدی حلال سمجھتا تھا مسلمانوں کے خون اور اُن کے مال و آبرو کو اور تمام لوگوں کو منسوب کرتا تھا شرک کی جانب اور سلف کی شان میں گستاخی کرتا تھا۔ اُس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اور کیا سلف اور اہل قبلہ کی تکفیر کو تم جائز سمجھتے ہو، یا کیا مشرب ہے؟

جواب: ہمارے نزدیک اُس کا حکم وہی ہے جو صاحب درمختار نے فرمایا ہے اور خوارج ایک جماعت ہے شوکت دالی، جنہوں نے امام پر چڑھائی کی تھی تاویل سے، کہ امام کو باطل یعنی کفر یا ایسی معصیت کا مرتکب سمجھتے تھے جو قتال کو واجب کرتی ہے۔ اس تاویل سے یہ لوگ ہماری جان و مال کو حلال سمجھتے اور ہماری عورتوں کو قیدی بناتے ہیں۔ آگے فرماتے ہیں، اُن کا حکم باغیوں کا ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا ہے کہ ہم اُن کی تکفیر صرف اس لیے نہیں کرتے کہ یہ فعل تاویل سے ہے، اگرچہ باطل ہی سہی۔ اور علامہ شامی نے اس کے حاشیہ میں فرمایا ہے، جیسا کہ (مثل خوارج) ہمارے زمانے میں عبد الوہاب کے تابعین سے سرزد ہوا کہ نجد سے نکل کر حرمین شریفین پر متغلب ہوئے اپنے کو حنبلی مذہب بتلاتے تھے لیکن اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ بس وہی مسلمان ہیں اور جو اُن کے عقیدہ کے خلاف ہو، وہ مشرک ہے۔ اور اسی بنا پر انہوں نے اہلسنت و علماء اہلسنت کا قتل مباح سمجھ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے

اُن کی شوکت "ٹوڑ دی"۔

دیوبندی جماعت کے دوسرے جید عالم، دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) نے وہابیوں کے بارے میں اپنے مآثرات کا اظہار اس انداز سے کیا ہے:

”صاحبو! محمد بن عبد الوہاب نجدی ابتداءً تیرھویں صدی نجد سے ظاہر ہوا اور چونکہ یہ خیالاتِ باطلہ اور عقائدِ فاسدہ رکھتا تھا، اس لیے اُس نے اہل سنت والجماعت سے قتل و قتل کیا، اُن کو بالجبر اپنے خیالات کی تکلیف دیتا رہا، اُن کے اموال کو غنیمت کا مال اور حلال سمجھا گیا، اُن کے قتل کرنے کو باعثِ ثواب و رحمت شمار کرتا رہا۔ اہلِ عربین کو خصوصاً اور اہلِ حجاز کو عموماً اُس نے تکلیف شاقہ پہنچائی۔ سلفِ صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے۔ بہت سے لوگوں کو بوجہ اُس کی تکلیف شدیدہ کے مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ چھوڑنا پڑا اور ہزاروں آدمی اُس کے اور اُس کی فوج کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ الحاصل وہ ایک ظالم و باغی، خونخوار، فاسق شخص تھا،“

دیوبندیوں کے مشہور فاضل، علامہ انور شاہ کشمیری (المتوفی ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۲ء) مولوی حسین احمد ٹانڈوی سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے صدر بھی تھے، اُنھوں نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کے بارے میں یوں لکھا ہے:

امام محمد بن عبد الوہاب	محمد بن عبد الوہاب نجدی جو تھا، وہ تو ایک
النجدی فانہ کان رجلاً	کو تاہ فہم اور کم علم انسان تھا، اسی لیے
بلیداً قلیل العلم کان یسارع	کفر کا حکم لگانے میں بڑا جُست و چالا تھا۔
الی حکم بالکفر۔	تھے

لے غلیل احمد انبٹوی، مولوی، المہند علی المفتی اردو، مطبوعہ کراچی، ۲۲، ۶۲

ٹانڈوی صاحب نے توجہ سے کام نہیں لیا، یہاں اہل سنت والجماعت یا اہلسنت وجماعت کے

حسین احمد ٹانڈوی، مولوی، الشہاب التناب، ص ۶۲

انور شاہ کشمیری، مولوی، فیض الباری، ج ۱، ص ۱۶۱

مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۷ء) نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کفری بازی اور مسلمانوں کے مال و جان کا دشمن ہونے کے بارے میں مزید یوں وضاحت بھی کی ہے:

”محمد بن عبد الوہاب کا عقیدہ تھا کہ جملہ اہل عالم و تمام مسلمانانِ ديار مشرک و کافر ہیں اور اُن سے قتل و قتال کرنا، اُن کے اموال کو اُن سے چھین لینا حلال اور جائز بلکہ واجب ہے۔“

وہابیوں نے جہاں وہ قابض ہوئے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ عملی طور پر کر کے دکھا دیا تھا۔ آج بھی اُن کے اس طرزِ عمل کو سراہنے والے بلکہ اُنہیں مصلح اور ریفارمر بتانے والے موجود ہیں لیکن ایسے حضرات تھوڑی دیر کے لیے اگر تعصب کی عینک کو اتار کر دیکھیں کہ جن مسلمانوں کو یہ حضرات کافر و مشرک قرار دے کر قتل کرتے رہے اور آج تک شجرِ وہابیت کی جملہ شاخیں مشرک و کافر ہی قرار دے رہی ہیں اگر اُن کے ان اصطلاحی مشرکوں کا وجود نہ ہوتا تو ہندوپاک کے مٹھی بھر وہابیوں کو تو ہندو شروع میں ہی کہتے چبا گئے ہوتے اور نجدی وہابیوں کی تو عیسائی دنیا کے حصے میں ایک ایک بوٹی بھی نہ آتی۔ مسلمانوں کے دم قدم سے قائم رہ کر انہیں کافر و مشرک بتانا اور بس چلے تو اُن کے خون سے ہولی کھیل لینا، محسن کشی کی المناک مثال ہے یا نہیں؟

اس سے قطع نظر، وہابی حضرات کو سوچنا چاہیے تھا کہ علمائے اہلسنت نے وہابیہ کے متعلق جو کچھ آج تک کہا، زبان اور قلم سے کہا ہے، اگر مسلمانانِ عالم بھی وہابیوں کو تیغ و تبر کے ساتھ اپنے مذہب کی دعوت دینا شروع کر دیتے یا اب ایسا کرنے لگیں تو نتیجہ کیا سامنے آئے گا؟ ہتھیار تو غیر مسلموں کے خلاف استعمال کرنے کی اجازت ہے، جس کی وہابیہ کو اپنے روزِ اول سے کبھی توفیق ملی ہی نہیں، رہے مدعیانِ اسلام کے باہمی اختلافات تو انہیں خلوصِ دل کے ساتھ افہام و تفہیم کے ذریعے ختم کیا جاسکتا ہے۔

خارجی اسماعیل

یہی خارجی تحریک نجد سے چل کر متحدہ ہندوستان میں وارد ہوئی۔ کسے خبر تھی کہ دہلی کا جو خاندان دین برحق کی خدمت میں کاربائے نمایاں سرانجام دے رہا ہے، اسلام میں تخریب اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے کا مشغلہ بھی اسی خاندان کا ایک فرد اختیار کرے گا اور پاکستان میں تخریب کاری کا ایسا پودا لگا جائے گا جس کی شاخیں پورے ملک میں پھیل جائیں گی اور بھولے بھالے مسلمان ایسے پتھر میں چھنس کر رہ جائیں گے کہ اصل اور نقل میں تمیز کرنا بھی مشکل ہو کر رہ جائے گا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے مسلک کو محمد بن عبد الوہاب نجدی کی وہابیت و خارجیت سے کوئی مماثلت ہے یا نہیں؟ مرزا جیت دہلوی اس سلسلے میں یوں وضاحت کرتے ہیں:

”وہ پیارا شہید (محمد اسماعیل دہلوی) تھا جس نے ہندوستان میں (ابن عبد الوہاب کی طرح شریعت محمدی کا ٹھنڈا خوشگوار شربت ہندوستانی مسلمانوں کو پلایا“ لے

ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب نے نجدی اور ہندی وہابیت کے تعلق پر یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

”ہندوستان میں ابن عبد الوہاب کے عقاید کی اشاعت بعض حضرات کے ذریعے سے ہوئی، اس سلسلے میں مولانا اسماعیل دہلوی (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) اور مولانا سید احمد بریلوی (م ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے اہم کردار ادا کیا۔ مولانا سید احمد بریلوی نے تحریک وہابیت کے قریبی زمانے (۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۹ء) میں سفر حجاز بھی کیا تھا، اس لیے ظاہر ہے کہ وہ کیا کچھ خیالات و جذبات لے کر آئے ہوں گے“ لے

لے حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۴۶

لے محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ مظہری، ص ۸۲

چلے آئے چل کر مصوف نے اسی تعلق کی یوں وضاحت فرمائی ہے:

”ابن عبد الوہاب کی تحریک اور ان دونوں حضرات کی سیاسی اور مذہبی کوششوں میں کئی مناسبتیں نظر آتی ہیں۔ ابن عبد الوہاب پر یہ الزام تھا کہ وہ بلادِ مسلمانوں کو بے دریغ قتل کرتے ہیں اور ان کے مال و قناع کو اپنے لیے مباح سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے واقعات مولوی سید احمد اور مولانا اسماعیل کی زندگی میں بھی نظر آئیں گے۔“

ڈاکٹر صاحب نے آگے چند واقعات ان حضرات کی مسلم کشی کے پیش کیے ہیں لیکن اس موضوع پر ہم نے آگے تفصیلی بحث کرنی ہے لہذا انھیں یہاں پیش نہیں کرتے۔ اس کے بعد مصوف نے دونوں تحریکوں کے عقائد کے بارے میں یوں لکھا ہے:

”جہاں تک ان حضرات (سید احمد و اسماعیل دہلوی صاحبان) کے معتقدات

کا تعلق ہے وہ سختی و درستی میں ابن عبد الوہاب سے کسی طرح کم نہیں۔“

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے جب اپنے اکابر کے

مسک اور مسکِ اہل سنت و جماعت سے بغاوت کی تو اپنا علیحدہ جتھا بنانے میں مصروف

ہو گئے اور اس کا نام ”محمدی گروہ“ رکھا گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں مشہور وہابی مؤرخ اور

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سوانح نگار، مرزا حیرت دہلوی یوں لکھتے ہیں:

”پیارے شہید نے ہزاروں جگہ لاکھوں کی زبان سے یہ نکلوا دیا کہ ہم محمدی ہیں۔

چاروں طرف سے آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ اس ضلع میں اتنے محمدی آباد ہیں

اور اس ضلع میں اتنی تعدادِ اسلامیوں کی ہے۔“

یہی نہیں بلکہ مولانا محمد اسماعیل دہلوی کے پیر یعنی سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ /

۱۸۳۱ء) نے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا تو مسلمانوں کے جملہ روحانی سلسلوں سے منقطع

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر، مواظظ منظر، ص ۸۲

۲۔ ایضاً: ص ۸۳

۳۔ حیرت دہلوی مرزا، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۸

ہو کر اپنا سلسلہ نیا "محمدی طریقہ" کھڑا کیا۔ اس کے قواعد اور آداب و اشتغال بھی ایسے وضع کیے کہ طریقت کا ایک ابجد خوان بھی اس بازگیری کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ "طریقہ محمدی" کے بارے میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں تصوف کے چار متعارف و مستقل طریقے رائج تھے، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ سید احمد بریلوی بیعت لینے کی ایک جدید ترکیب پر کاربند تھے۔ پہلے مذکورہ طریقوں پر، پھر محمدی طریقے پر، جو انہوں نے خود مقرر کیا تھا، بیعت لیا کرتے تھے۔ وہ اس کی تشریح یوں کیا کرتے کہ شریعت کے دو پہلو ہیں: ظاہری اور باطنی۔ باطنی پہلو روحانی راحت کے حصول کیلئے روح کی تربیت و تادیب سے تعلق رکھتا ہے اور مذکورہ صوفی طریقے ہی اس مقصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ظاہری پہلو انسان کی روزمرہ زندگی میں صحیح اور دینی کردار بجالانا، اور محمدی طریقہ اسی کی نگہداشت کرتا ہے۔"

"طریقہ محمدی" کی موصوف نے آگے تشریح کرتے ہوئے اسے جو امتیازی مقام بخشا ہے وہ ملاحظہ فرمائیے:

"اس انوکھے طریقہ بیعت کی تشریح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ صوفیانہ طریقے اگر ابتدا کی سرستی و سرشاری سے معرا ہو چکے تھے پھر بھی عام دماغوں میں ان کی جڑیں گہری تھیں۔ لوگ انہیں طریقوں پر بیعت کے خوگر تھے۔ ان کا ایک بیک نرک کامل ایک غیر عملی یا ان ہونی سی بات ہوتی۔ طریق محمدی میں جو صحیح طرز معاشرت ملحوظ رکھا گیا تھا، اس کی تفصیلات خود صراطِ مستقیم اور مختلف وہابی تحریروں میں کافی شرح و بسط سے درج ہیں۔ ان میں سے دو

لے ڈاکٹر صاحب نے طریقے چار بتائے لیکن گناے تین۔ معلوم ہوتا ہے وہ سلسلہ عالیہ قادریہ سے کچھ زیادہ ہی ناراض تھے۔

لے محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۰

رسول بہت نمایاں ہیں۔ باری تعالیٰ پر جس کی صفات اشارۃً بھی کسی مخلوق سے منسوب نہیں کی جاسکتی ہیں، سختی سے بلا شرط و قید ایمان رکھنا اور اپنی شخصی زندگی میں علیٰ اخلاق پر کار بند رہنا۔ ۱

جب مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنا محمدی گروہ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے جدا بنا کر شروع کر دیا۔ اپنے خاندانی بزرگوں کے مسلک کو بھی خیر باد کہہ دیا بلکہ اُس طریقے پر چلنے والوں کو ہر مقام پر مشرک اور بدعتی کہنا شروع کر دیا تو مسلمانوں کے جذبات کا بھر پور اثر لڑائی جھگڑنے تک نوبت آجانا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ متعدد مقامات پر تصادم بھی ہوئے۔ اس حقیقت کو مرزا حیرت دہلوی نے اُلٹ پھیر کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

”جب بدعتیوں کو پلے در پلے یہ فاش شکستیں ملیں تو اب اُنہوں نے مخالفت کا دوسرا پہلو بدلا اور وہ پہلو یہ تھا کہ ہر گلی کے کونڈ پر ایک مٹانا کھڑا کر دیا کہ وہ مولانا شہید کو کا فر بتاتے اور گمراہ کہتے۔ غرض سوائے بُترے کے اور کچھ نہ کہے۔ جب اس قسم کے وعظ ہونے لگے تو دو چار جگہ لاٹھی بھی چل گئی، کیونکہ اب محمدیوں کا گروہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔“ ۲

انصاف والے ذرا اس حوالے کو غور سے پڑھیں۔ وہابی حضرات خود کو قدیمی جماعت بتاتے اور ولی اللہی تعلیمات کا علمبردار ٹھہراتے ہوئے نہیں تھکتے لیکن یہ محمدی گروہ کس نے بنایا تھا؟ جدید گروہ اور اہلسنت سے جدا ہونے والا گروہ کس کا ہے؟ غور فرمائیے اہلسنت و جماعت سے کٹ کر علیحدہ اپنا گروہ بنانے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی ہیں یا مولانا احمد رضا خاں بریلوی، جو ان واقعات کے تقریباً چالیس سال بعد پیدا ہوتے ہیں۔

بہر حال جب لڑائی جھگڑنے تک نوبت پہنچے گی تو بانی وہابیت نے بد معاشوں اور غندوں کا اپنی حفاظت کے لیے ایک محافظ دستہ تیار کیا۔ مادی اکبر، نبی آخر الزماں صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کا اُسوہ حسنہ کائنات کے سامنے روشن ترین مثال ہے۔ جب آپ نے مجھ کو انسانوں کو راہِ راست کی طرف بلانا شروع کیا تو اکثر مخالفین دشمنی پر نکل گئے لیکن آپ نے مخالفانہ کی پروا یکے بغیر، اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر حق و صداقت کی تبلیغ جاری رکھی اور ایک ایسی جماعت تیار کرنے میں شب و روز منہمک رہے جو بجا طور پر گُورپی اُمت کے پیشواؤں کے بھی پیشوا کہلانے کے حق مدار ہیں۔ بعد میں بزرگوں، مصلحوں اور ریغار مروں نے ہمیشہ نیک لاگوں کی دین کے پھیلاؤ میں مدد دی لیکن معلوم نہیں مولوی محمد اسماعیل دہلوی کس قسم کے مصلح تھے اور کیسی اصلاح کرنا چاہتے تھے جس کے پیش نظر انھوں نے خدا پر توکل اور نیک بندوں کی اعانت حاصل کرنے کے بجائے معاشرے کے گھٹیا افراد کی خدمات حاصل کیں۔ اس سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی، حقیقت کے چہرے سے یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

”مولانا شہید نے خطہ کے وزن کو پہچان لیا تھا اور گواہی عطا فرمائی کہ اسی زمانہ میں شہر اس طرف رجوع نہ ہوئے تھے اور نہ ابھی مولوی فضل حق صاحب کی مخالفانہ کارروائی شروع ہوئی تھی، پھر بھی عقلمندی یہ تھی کہ ہر طرح سے بندوبست کیا جائے اور ایسا نہ ہو کہ مخالف غافل پاک کے کوئی جہانی مضرت پہنچائیں۔ آپ نے پہلے چند بڑے بڑے بد معاشوں کے سرغون کو اپنی جادو بھری تقریر سنا کے مرید کیا اور انھیں اپنا ایسا معتقد بنایا کہ وہ اپنی جان قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ مصلحت اس کی مقتضی تھی کہ یہ کارروائی کی جائے کیونکہ دن بدن مخالفت کی آگ بھڑکتی جاتی تھی۔“

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی جگہ جگہ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے لگے اُن کے مذہبی عقائد کو کافرانہ بتانے لگے تو چاروں طرف سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ) کے پاس شکایتیں پہنچنی شروع ہو گئیں کہ حضرت آپ کے بھتیجے آج یوں کہہ رہے ہیں اور کل انھوں نے یہ کہا تھا۔ مرزا حیرت دہلوی نے شکایات

کے معاملے کو اس عجیب انداز میں سپردِ قلم کیا ہے :

”بڑے بڑے رئیس جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے معتقدین میں سے تھے ،
خواہ شیعہ ہوں یا سنی ، اُس کے سمجھانے لگے آپ اپنے جتنیے کو روکیے ،
یہ بڑی بدنامی کی بات ہے۔ شاہ صاحب سب کو یہی جواب دیتے تھے ”جنتک
اسمعیل سے خلافِ شریعت عمل سرزد نہ ہو ، میں کیونکر اُسے روک سکتا ہوں ۔
وہ کوئی فساد انگیز تقریر نہیں کرتا کہ اُس پر میں معترض ہوں ۔ آخر کوئی معقول
وجہ بھی تو ہونی چاہیے جس سے میں اُس کی کارروائی میں دست اندازی کر سکوں
جب اعیانِ شہر شاہ عبدالعزیز صاحب سے یہ جواب پاتے تھے تو اپنا سا
منہ لے کے چلے جاتے ۔“

انسان جب کسی کی ناجائز عقیدت یا نفرت کا شکار ہو جاتا ہے تو اُس کی خوبیاں یا
خامیاں بیان کرتے وقت انصاف کے تقاضوں کو مدِ نظر رکھنے سے قاصر رہ جاتا ہے اور
بعض اوقات ایسے ایسے بیانات پیش کر دیتا ہے جو بڑے مضحکہ خیز ہوتے ہیں ۔
مرزا حیرت دہلوی کے دل و دماغ میں مولوی محمد اسمعیل دہلوی کی عقیدت و محبت کے جذبات
کچھ اس طرح رچے بے معلوم ہو رہے ہیں کہ انھوں نے اپنے اس بیان کے سامانِ
تصنیف بننے کی بھی مطلقاً پروا نہ کی کیسے صفائی پیش کرنا تھی ، عقیدت کا اظہار کرنا تھا ۔ یہ
دوسری بات ہے کہ ایسے بیانات سے مرزا صاحب خود بھی ایک تماشا بن کر رہ گئے مثلاً
”چند متعلقہ باتیں قابلِ غور ہیں :

۱۔ جب بڑے بڑے رئیس شاہ عبدالعزیز بر محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے شکایتیں کر رہے تھے
اور وہ بھی ایسے حضرات جو حضرت شاہ صاحب کے معتقد تھے ، اگر مولوی محمد اسمعیل
دہلوی کا مسلک حضرت شاہ صاحب کے مسلک سے ہٹا ہوا نہیں تھا تو ان سے
شکایت کرنے کی کیا ضرورت تھی ؟

۲۔ اگر موصوف کے خیالات میں کوئی بات خلاف شرع اور فساد انگیز نہیں تھی تو شکایت کرنے والے بدنامی کی بات خود شاہ صاحب کے روبرو کس چیز کو بتا رہے تھے۔
 ۳۔ اگر اعتراض کرنے کی بقول مرزا صاحب کوئی معقول وجہ نہیں تھی تو کیا شکایت کرنے والے دماغ خراب ہو گیا تھا کہ شکایت کرنے والے آتے ہی رہتے اور اپنا سامنہ لے کر چلے جاتے۔ آخر آنے کی وجہ؟

۴۔ کیا شکایتیں صرف روسا ہی کر رہے تھے۔ اُن کی تصنیف "حیاتِ طیبہ" بھی یہی بات ہے کہ عوام و خواص یعنی اُن پڑھ مسلمان سے لے کر علمائے کرام تک سب جلد اٹھتے اور شاہ صاحب جیسے نابغہ عصر سے شکایتیں کر رہے تھے کہ حضرت کیا یہ خانہ اب دین برحق کی خدمت سے اُگنا گیا ہے جو تخریب دین و اضلالِ مسلمین کا کارخانہ خود ہی سنبھال لیا۔ مرزا صاحب یہاں شکایت کرنے والے صرف رئیس حضرات بتا رہے ہیں گویا باقی سب خیریت تھی۔

۵۔ علمائے کرام کی جگہ بڑے بڑے رئیس لکھ کر مرزا صاحب شاید یہی تاثر دینا چاہتے ہوں کہ مذہبی لحاظ سے اُن کے محبوب رہنما کے خیالات و نظریات بالکل درست، مخالف مسلک کے مطابق اور جمہورِ اہلسنت کی آواز تھے، بس رئیسوں کو کچھ شکایتیں اُن کی اصلاحی تقریروں سے ہو گئی تھیں لیکن یہ عجیب معاملہ ہے کہ اسی کتاب کے صفحات اُن کے اس بیان کی تکذیب و تردید کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں فریقِ ثانی کے متعدد علمائے کرام نے ان شکایات کا تذکرہ جس انداز میں کیا اور حضرت شاہ صاحب نے جو جواب محنت فرمایا، اگر تنقید سے بغیر جانب دار ہو کر دیکھا جائے تو اُن کے بیانات حقیقت کی صحیح ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں مثلاً قاضی فضل احمد لدھیانوی نے فریادِ مسلمین کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے:

"اُنھیں دنوں ایک کتاب شیخ (ابن) عبد الوہاب نجدی کی تصنیفات کا انتساب بمبئی سے دہلی میں آئی۔ چونکہ عبد الوہاب مسطور ملک عرب کا باشندہ زبانِ دان تھا

مولوی اسماعیل اُن کی فصاحت و بلاغت پر فریفتہ ہو گئے۔ اُس کے کچھ مسائل انتخاب و اخذ کر کے علمائے دہلی حنفی مذہب سے پھیڑ چھاڑ کرنی شروع کر دی۔ اُنھوں نے اس کو غور و سال، خام خیال سمجھ کر ان سے بحث نہ کی مگر مولانا عبد العزیز (رحمۃ اللہ علیہ) سے ان کی بے اعتدالی کے شنائی ہوئے۔ مولانا موصوف نے کچھ رنجیدہ خاطر ہو کر مولوی اسماعیل کو پیغام بھیجا کہ میری طرف سے کو اُس لڑکے نامراد کو جو کتاب مجبئی سے آئی ہے، میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے۔ اُس کے عقائد صحیح نہیں بلکہ بے ادبی و بے نصیبی سے بھرے ہوئے ہیں میں آج کل بیمار ہوں اگر صحت ہو گئی تو میں اُس کی ترویج لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم ابھی نوجوان بچے ہو، ناحق شور و شر برپا نہ کرو۔

مذکورہ بالا عبارت نے کئی غلط فہمیوں کو دور کر دیا اور صورتِ حال کا اُس کی اصلی شکل میں انہار کر دیا۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) نے اسی خاندانی مسئلے اختلاف کا ایک واقعہ یوں بیان کیا ہے :

اِس کے متعلق مولانا شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب جواب دیا تھا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اُن سے جہر باتا میں کے متعلق کہا تھا کہ حضرت آئین بالجہر سنت ہے اور یہ سنت مُردہ ہو چکی ہے اِس لیے اِس کو زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ شاہ عبد القادر صاحب نے فرمایا کہ یہ حدیث اِس سنت کے باب میں ہے، جس کے مقابل بدعت ہو اور جہاں سنت کے مقابل سنت ہو وہاں یہ نہیں اور آئین بالستر بھی سنت ہے تو اِس کا وجود بھی سنت کی حیات ہے۔ مولانا شہید نے کچھ جواب نہیں دیا۔

یہی مولوی اشرف علی تھانوی ایک واقعہ اور بیان کرتے ہیں، جس سے واضح ہوتا ہے

کہ ان بزرگوں کی زندگی میں اُن کی پروا کیے بغیر مولوی محمد اسماعیل نے وہاں بیت کی کسی قدر ترویج و اشاعت جاری کر دی تھی :

”شاہ عبدالقادر صاحب نے مولوی محمد یعقوب کی معرفت مولوی اسماعیل صاحب سے کہہ دیا تھا کہ تم رفیع الدین چھوڑ دو ، اس سے خواہ مخواہ فتنہ ہو گا۔ جب مولوی محمد یعقوب صاحب نے مولوی محمد اسماعیل صاحب سے کہا تو اُنھوں نے جواب دیا کہ اگر عوام کے فتنہ کا خیال کیا جائے تو پھر اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے ”مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِي عِنْدَ فُسَادِ أُمَّتِي فَلَهُ أَجْرُ مَا تَسْتَعِينُ“ کیونکہ جو کوئی سنت متروکہ کو اختیار کرے گا عوام میں ضرور شورش ہوگی۔ مولوی محمد یعقوب صاحب نے عبدالقادر صاحب سے اُس کا جواب بیان کیا۔ اُس کو سُن کر شاہ عبدالقادر صاحب نے فرمایا : بابا ہم تو سمجھتے تھے کہ اسماعیل عالم ہو گیا مگر وہ تو ایک حدیث کے معنی بھی نہیں سمجھتا۔ یہ حکم تو اُس وقت ہے جبکہ سنت کے مقابل خلاف سنت ہو اور مانحن فیہ میں سنت کا مقابل خلاف سنت نہیں بلکہ دوسری سنت ہے“ لہ

پروفیسر محمد مسعود صاحب نے ایسے ہی واقعات کے پیش نظریوں و وضاحت فرمائی ہے :

”مولانا اسماعیل تو شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے پوتے اور حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے تھے۔ ان کے دونوں چچا (کیونکہ تیسرے چچا شاہ رفیع الدین علیہ الرحمہ کا ۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء میں انتقال ہو گیا تھا) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب ان پر بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے ، مگر جب زورِ علم نے بیاگ بنا دیا تو بات یہاں تک پہنچی کہ ایک مرتبہ حضرت شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مجلس مبارکہ سے ان کو اٹھا دیا۔ آخر میں دونوں چچا ان سے ناراض ہو گئے تھے لیکن سوانح نگار صرف ابتدائی دو کا

ذکر کرتے ہیں، مجلس سے اٹھانے کا واقعہ تو شاید مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی برادر النوا در میں تحریر فرمایا ہے۔ ۱۷

سیف اللہ المسلول، مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) نے جو مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کے معاصر اور دیگر علمائے اہلسنت وجماعت کی طرح ہندی ویاہیوں کی حرکاتِ قبیحہ کے عینی گواہ اور علمائے اہلسنت میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اُنھوں نے ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۴ء میں محمد اسماعیل دہلوی اور اُن کے معتقدوں کی تردید کی اور اس تخریب کاری کے چہرے سے یوں پردہ اُٹھایا:

”اس مذہب کو پسند کیا اور تقویۃ الایمان تصنیف کی، گویا اُسی کتاب لتوحید کی شرح ہے۔ اس دین کی بڑی شہرت ہوئی اور عوام الناس بہت اس بلا میں پھنسے۔ توہین و تحقیر انبیاء و اولیاء کی اور تکفیر تمام امت سلف و خلف کی خوب جاری ہوئی۔ دین دار اہل علم جہاں تھے اُن کے فیضِ صحبت سے جو بچا سو بچا ورنہ اول و ہلہ میں اکثروں کو اس طرف میل آگیا، بسبب شہرت اُن کے خاندان کے اور ناواقف کے فنِ میرت اور حدیث سے جب نوبت دلی میں پہنچی ہزاروں ہزار آدمی کہ شاگرد و مرید اور دیکھنے والے صحبت یافتہ شاہ عبد العزیز صاحب اور مولوی رفیع الدین صاحب (رحمۃ اللہ علیہما) کے اور علم میں اُن سے زائد لوگ موجود تھے، مولوی اسماعیل اور مولوی عبدالحی سے دست و گریباں ہوئے اور خواص نے فمائش کی کہ اس سفر میں یہ نیا دین کیسا نکال لائے کہ اُس کی رُو سے تمہارے استادوں سے لے کر صحابہ تک کوئی کفر و شرک سے نہیں بچتا اور قبل اس سفر کے تم بھی اُسی طریقہ پر تھے اور ویسا ہی وعظ کتے تھے اور فتویٰ لکھتے تھے، جس کو اب شرک کہتے ہو۔ یہ دین میں فساد ڈالنا اور قرآن و حدیث میں تحریف کرنا اور خلافت کو گمراہ کرنا، بہت

جرا ہے۔ ہر چند نصیحت کی، کچھ سودمند نہ ہوئی، لاچار ہو کر سب نے اُن کا رد و ابطال کیا۔ مولوی مخصوص اللہ صاحب اور مولوی موسیٰ صاحب، مولوی رفیع الدین صاحب کے صاحبزادوں نے فتویٰ اور رسالے اُن کے رد میں لکھے، نوبت تکفیر تک پہنچائی۔ مولوی فضل حق خیر آبادی نے جزاء اللہ خیراً کہ علم و فضل میں مولوی اسماعیل وغیرہ کو اُن سے کچھ نسبت نہیں۔۔۔ ہر طرح مولوی اسماعیل کے رد و اُن کا رد و ابطال کیا اور تکفیر کی نوبت تحریر میں آئی۔ مسئلہ شفاعت میں مولوی اسماعیل نے حرکت مذبحی کچھ جواب میں کی آخر کو عاجز و ساکت ہو گئے اور تحقیق الفتویٰ فی مراد اہل الطغویٰ کمال شرح و بسط سے مولوی فضل الحق (رحمۃ اللہ علیہ) صاحب نے لکھا۔ لے

مفتی صدر الدین آزرہ رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) نے بھی مولوی اسماعیل دہلوی کو خوب سمجھایا کہ دین میں تخریب کرنا اور اپنے خاندان کی عظیم الشان مذہبی خدمات پر پانی پھیرنا عقلمندی نہیں ہے۔ موصوف نے اقرار بھی کر لیا تھا لیکن معلوم نہیں اندریں خان کیا مجبوری پیش آگئی کہ پر نالہ ویں رہا۔ مثلاً:

”مفتی صاحب (مفتی صدر الدین آزرہ) اسماعیل کو فمائش کر کے راہِ راست پر لاتے اور اُن سے اقرار کرا لیا کہ اب ہم نے تحقیق کی اور افراط و تفریط کو چھوڑا، سوا و اعظم کے مخالف سے منہ موڑا اور یہ بات خاص و عام پر جامع مسجد میں شائع و ذائع ہو گئی۔“ لے

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے نامور فیض یافتہ مولانا رشید الدین خاں صاحب علیہ الرحمہ نے بھی فمائش کا فریضہ ادا کیا۔ چنانچہ

لے فضل رسول بدایونی، مولانا: سیف الجبار، مطبوعہ کانپور، ص ۵۸، ۵۹

لے فضل احمد قاضی، مولانا: انوار آفتاب صداقت، ج ۱، ص ۵۱۴

قاضی فضل احمد صاحب یوں تصریح کرتے ہیں :

”مولانا رشید الدین خاں صاحب نے تخلیق میں بذریعہ و بلاذریعہ اسمعیل کو بہت سمجھایا کہ دین میں فتنہ ڈالنا اور جماعت میں تفرقہ پیدا کرنا قبیح ہے اور واجب ترک اور مفروض الاجتناب۔ اگر دل میں کچھ خلش ہے (یعنی شک و شبہ) تو آؤ ما و شما و دیگر علماء و صلحا، متفق ہو کر کتب دین کی طرف رجوع کریں اور احقاقِ حق قبول کر لیں اور شقاق و نفاق کو جماعتِ مومنین سے استیصال کریں اور نوائے اعانت و اشاعت کا راہِ راست پر کہ اتباعِ سوارِ اعظم ہے بلند کریں اور خاص و عام کو حق سے آگاہ کریں۔ مولوی عبدالحی اور مولوی اسمعیل اس خوف سے کہ ہمارے عقائد فاسدہ طشت از بام نہ ہو جائیں دوبارہ نہ لائے، اے

جب مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے خاندانی بزرگ سمجھا بھٹا کر تھک گئے، اُس خاندان کے فیض یافتہ علمائے کرام نے فہمائش کا فریضہ ادا کر لیا اور دیگر علمائے اہلسنت انہیں سمجھاتے، راہِ راست پر لاتے اور مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے سے روکتے تھے تو موصوف کا پارہ در چڑھ گیا، خارجیت و نجدیت کا اصلی رنگ موصوف کی تقریر و تحریر سے ظاہر ہونے لگا۔ نئی بات پر مسلمانوں کو ٹھٹھٹ مشرک بتانا شروع کر دیا۔

حضرات علمائے کرام نے مولوی محمد اسمعیل دہلوی سے یہی تو کہا تھا کہ مسلمانوں میں تفریق پیدا نہ کریں متحدہ ہندوستان کے مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کو مشرک بنا کر تیرہ صدیوں کے مسلمانوں کو جہنم کا ایندھن قرار نہ دیں، خود شاہ عبد القادر اور شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما نے سمجھا بھٹا کر اور ڈرا دھمکا کر دیکھ لیا اور موصوف کسی کے کہنے کو خاطر میں لائے ہی نہیں تو مجبور ہو کر مسلمانانِ اہلسنت و جماعت نے قانون کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ اُس وقت مولانا فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء)

نے اس فتنے کے متعلق جو ریمارک دیا وہ اُن کی انتہائی وسیع النظری کا بین ثبوت ہے۔
 مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی نے اُس موقع کے جملہ حقائق کو بیان تو کیا ہے لیکن اس طرح کہ اپنے محبوب رہنما کی آن پر حرف نہ آئے۔ واقعات کو بیان کر دیے لیکن انصاف کا خون کر کے۔ قارئین کرام مندرجہ ذیل بیان کو پڑھیں اور خفائی کی روشنی میں تجزیہ کریں :

”یہ زمانہ گویا مولانا شہید کی ریفارمیشن کا آغاز تھا اور یہی زمانہ اُس تلخ تر دشمنی کا تھا جو خواہ مخواہ حاسد مولانا سے کرتے تھے۔ جب مختلف مضامین پر وعظ ہوئے تو لوگوں میں حبسیا کہ ہم لکھ آئے ہیں ایک شورش سی پھیل گئی اور چاروں طرف ایک دُند چل گیا۔ بھلا وہ تو مدت سے مختلف پیروں، شہیدوں، سینلا ماتا کے پوجنے کے عادی تھے، انھیں اکیلے خدا کی پرستش کا ہے کو اچھی معلوم ہوتی۔ وہ بھڑکتے بھڑکتے مولانا شہید کے فقیری وعظ سے پورے جھڑپ اٹھے اور اب انھوں نے عدالت کی طرف رجوع کرنا شروع کر دیا کیونکہ اکبر شاہ (بادشاہِ دہلی) کی طرف سے تو صاف جواب مل چکا تھا، مگر عدالت میں جانے سے پہلے انھیں ضرور ہوا کہ وہ مولوی فضل حق صاحب سے مشورہ کر لیں کہ کیا تدبیر کرنی چاہیے۔ مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق خیر آبادی) رزیڈنٹ کے بڑے مُنہ چڑھے اور معتبر تھے اور وہ اُن ہی کے کہنے پر زیادہ چلتا تھا۔ جب یہ لوگ سررشتہ دار (علامہ خیر آبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیت عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کے کہنے لگے کہ ”اسماعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیے بغیر نہیں رہنے کا“ یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو انھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔“

بہر حال قانونی چارہ جوئی سے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا وعظ بند کروادیا گیا۔

بندش کے دوران میں معلوم نہیں اعلیٰ انگریزی حکام کے ساتھ مل کر کیا کچڑی پکائی گئی کہ ریزیڈنٹ نے مولوی محمد اسماعیل صاحب کے وعظ پر جو پابندی لگائی تھی اُسے منسوخ کر دیا گیا۔ منسوخ کا حکم متوقع وقت پر نہ پہنچا تو موصوف اپنے معتقد ساتھیوں کے ہمراہ ریزیڈنٹ کے پاس تشریف لے جاتے ہیں۔ ریزیڈنٹ نے جو موصوف کا معنی خیز اور خلاف توقع اعزاز و اکرام کیا یادہ ایسا کرنے پر مجبور ہو گیا تھا، اُس نے اہل نظر علمائے اہلسنت کی آنکھیں کھول دیں۔ یہ واقعہ بھی مرزا حیرت دہلوی کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :

”آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت طے ملانے اور فرصت کا ہزنا ہے، سیدھے کوٹھی پر پہنچے۔ ساتھ میں صرف مولوی عبدالعصم بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا منشی ہیرالال تھا اور ایک خدمت گار تھا۔ پہلے آپ نے جا کے اطلاع کرائی۔ جونہی ریزیڈنٹ نے سنا کہ شاہ اسماعیل آئے ہیں، فوراً باہر نکل آیا اور باہر برانڈے سے آکے لے گیا۔ حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا، آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا۔ معمولی مزاج پُرسی کے بعد ریزیڈنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب! ہمارے سررشتہ دار (علامہ فضل حق خیر آبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکم ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قیدی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔“

زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ وعظ پر جو پابندی لگادی گئی تھی اُسے اُٹھایا جاتا، دوبارہ وعظ کرنے کی اجازت دے دی جاتی لیکن ”قیدی طور پر جاری کیا جائے“ کے الفاظ پھر اور ہی غمازی کر رہے ہیں اور ”کوئی مزاحم نہ ہو“ کا آرڈیننس اُس خدشے کو مزید تقویت بخاتا ہے۔ ان باتوں سے قطع نظر مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی نظر میں مسلمان تو سب کے سب

مشرک ہی تھے لیکن ایک ظاہر بت پرست اور ٹیٹ مشرک یعنی ہیرالال کو کس عقیدت اور
یا یگانگت کے تحت منشی (پرسنل سیکریٹری) رکھا ہوا تھا، جو رازداری کے مواقع پر بھی
سائے کی طرح ساتھ ہونا ضروری تھا۔ حالانکہ ارشاد باری تعالیٰ تو یہ ہے کہ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِلَهَائِهِمْ دُونَكُمْ۔ اے ایمان والو! غیر مسلمانوں کو اپنا رازدار
نہ بنانا۔ لیکن یہ راز لے ریفارم صاحب ہیں کہ ہیرالال ہندو کو منشی رکھتے ہیں اور عجیب و غریب
مجاہد ہیں کہ راجہ رام ہندو راجپوت کو توپچی رکھتے ہیں۔ کہیں یہ میراثِ خوارج سے بہرووری
اور يَقْتُلُونَ أَهْلَ الْإِسْلَامِ وَيَدْعُونَ أَهْلَ الْأَدْيَانِ کی جلوہ گری تو نہیں۔ اسی منشی
ہیرالال کے متعلق مرزا حیرت دہلوی نے یہ بھی لکھا ہے :

”ہیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (محمد اسماعیل دہلوی) کا وعظ بلفظہ
نقل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جو کاغذات منشی ہیرالال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے
ہیں ملے ہیں وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے پر خط لکھے ہوئے ہیں کہ
ہم بلفظہ نقل کرنے کا فر حاصل نہ کر سکے۔“

جب فہمائش سے کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہوا، قانونی چارہ جوئی نے کچھ اور ہی نظارہ
دکھایا کہ چودہ طبق روشن ہو کر رہ گئے تو یقین ہو گیا کہ جس راستے پر موصوف کا مزین ہو چکے ہیں
اُس سے ہٹنا اور اپنے بزرگوں کے مسلک کی پیروی کرنا اب ان کے بس سے باہر ہے
یہ اپنی مرضی کھو چکے، کسی کی مرضی کے پابند ہو چکے ہیں تو علمائے کرام نے طے کیا اب فرض کی ادائیگی کا
”صرف یہی طریقہ باقی رہ گیا ہے کہ موصوف سے بحث مباحثہ کے انھیں مسلک سے ہٹا دیا
اور مذہب اہلسنت و جماعت سے کٹ کر خارجیت و دوہایت کا علمبردار ثابت کیا جائے۔“
عوام الناس ان کے دام فریب میں گرفتار ہو کر اپنی عاقبت برباد کرنے سے محفوظ و مامون
رہ سکیں چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء)
کے خلفاء اور مولوی محمد اسماعیل کے چچا زاد بھائیوں نے ان سے جامع مسجد دہلی میں ایک

فیصل کن مباحثہ کیا، جو پاک و ہند کی سرزمین میں حقیقت و دہا بیت کا سب سے پہلا مناظرہ تھا۔
اس مباحثے کی روداد حضرت فضل رسول بدایونی قدس سرہ نے ۱۲۴۰ھ میں موصوف کے
میں حیات یعنی اُن کے قتل ہونے سے پانچ چھ سال پہلے یوں بیان فرمائی اور کسی نے ایک
لفظ کی تغلیط ثابت نہ کی۔ لکھا ہے :

”مجلس جامع مسجد کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ایک استفتاء مرتب ہوا، بہرہ و
دستخط مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی فضل حق صاحب و مولوی
مخصوص اللہ صاحب و مولوی موسیٰ صاحب و مولوی محمد شریف صاحب و
مولوی عبد اللہ صاحب و آخون شیر محمد صاحب، صبح کے وقت منگل کے
دن انیسویں ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو، کہ مولوی عبدالحی جامع مسجد میں وعظ
کے رہے تھے۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب و مولوی مخصوص اللہ صاحب
و مولوی موسیٰ صاحب، مولوی رفیع الدین صاحب مرحوم کے صاحبزادے اور
مولوی محمد شریف صاحب وغیرہ علماء و طلبہ، خاص و عام، حوض پر مجتمع ہوئے
جب مولوی عبدالحی وعظ کہ چکے، عبد اللہ طالب علم نے استفتاء پیش کیا کہ
اپنی مہر اس پر کر دیجئے۔ مولوی عبدالحی نے کہا، میں نہیں مہر کرتا کہ میں کچھ نہیں
جانتا۔ اُس نے کہا: یہی لکھ دیجئے اور اصرار کیا تو مولوی عبدالحی نے انکار کیا
اور ملال ظاہر کرنے لگے۔

مفتی شجاع الدین علی خاں صاحب نے کہا کہ اس کا تصفیہ ضرور ہے
کہ بڑا اختلاف پڑ گیا ہے۔ مرزا غلام حیدر شاہزادے اہل علم کی تکرار سے
رنجیدہ ہوئے اور مولوی عبدالحی وغیرہ کو مجمع علمائیں واسطے مناظرہ لائے۔ مجمع
بے شمار خاص و عام، امیر و فقیر کا ہو گیا۔ کو تو اہل بھی واسطے بندوبست کے آہنچا۔
مولوی عبدالحی نے فاضلوں سے پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟ کسی نے کہا کہ آپ کے
بلانے کے موافق کہ ہر روز کہا کرتے تھے کہ جس کو تاب مناظرہ کی ہو ہمارے سامنے
آوے۔ سُن کر چُپ ہوئے۔ مولوی مخصوص اللہ (شاہ رفیع الدین محدث

دہلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے) نے کہا کہ ہم بموجب حکم خدا کے آئے ہیں کہ حق ظاہر ہو جائے
 مولوی موسیٰ (شاہ رفیع الدین محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے صاحبزادے) نے کہا کہ تم ہمارے
 استادوں کو (شاہ عبدالعزیز و شاہ عبدالقادر و دیگر علماء اہلسنت کو) بُرا کہتے ہو۔ بولے کہ میں نہیں کہتا۔
 مولوی موسیٰ نے کہا کہ یہ ایسے مسئلے بناتے ہیں کہ اُن سے بُرائی استادوں
 کی ثابت ہوتی ہے۔ پوچھا وہ کیا ہے، کہا کہ مثلاً قبر کے بوسے کو شرک کہتے ہو
 اور ہمارے اکابر (شاہ عبدالعزیز و شاہ ولی اللہ وغیرہ) اُس کے مباشر
 ہوتے تھے۔ مولوی عبدالحی نے انکار کیا۔ کسی نے کہا کہ کھ دو تاکہ تمہارے
 اوپر جھوٹ باندھنے کی تکذیب کی جاوے۔ مولوی عبدالحی نے کانپتے ہوئے ہاتھ
 سے لکھ دیا، بوسہ دہندہ مشرک نیست۔

مولوی رشید الدین خاں صاحب کے ہاتھ میں فتویٰ دیا گیا اور قریب
 مولوی عبدالحی کے آبیٹھے۔ مولوی عبدالحی نے گلہ شکوہ اُن سے شروع کیا کہ
 خانصاحب مجھے آپ کی خدمت میں دوستی تھی، تم بر ملا مجھے ذلیل کرتے ہو۔
 خانصاحب نے فرمایا کہ ہم تمہارے اعزاز و اظہارِ کمال کے واسطے آئے ہیں
 لوگوں نے مشہور کیا ہے کہ تم مسئلے خلاف سلف کے کہتے ہو، اس سبب سے
 تم سے خلق کو وحشت ہے۔ ایسے مجمع میں مفتریوں کی تکذیب ہو جاوے گی۔
 مولوی عبدالحی شکوے اسی کی پریشان باتیں کرتے رہے۔ خانصاحب نے
 فرمایا کہ تمہارے لوگ (مبتغ و مابیت و نجدیت مثل شاہ اسماعیل) کہتے ہیں
 کہ عبدالعزیز کی راہ، راہ جہنم کی ہے (لَعُوذُ بِاللّٰہِ) اُسی وقت گو اسی سے یہ
 بات ثابت ہوگئی، لوگ بُرا کہنے لگے۔ مولوی عبدالحی نے بھی تبرا کیا باوازا بلند
 اور مولوی رشید الدین خاں صاحب سے کہا کہ مولانا عبدالعزیز کی محبت اور
 اعتقاد، علم و بزرگی میں، میں مثل تمہارے ہی، طحاوی اور کرنی کے برابر
 جانتا ہوں۔ پھر استفسار شروع ہوا۔ ہر مسئلے کا جواب دیا کہ چنداں مخالف
 جمہور کے نہ تھا۔

مولوی اسماعیل نے پہلے ہی استفسار سے ارادہ کیا اٹھ جانے کا۔

مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا: ذرا تشریف رکھیے کہ جناب کے بھی دستخط اس تحریر پر ضرور ہیں۔ مولوی اسماعیل نے کہا کہ ”میں کسی کے باپ کا نوکر نہیں، میرے واسطے محتسب لا، اے مردود، میرے ساتھ سختی کرتا ہے“ انھوں نے کہا کہ حضرت! میں سختی نہیں کرتا، عرض کرتا ہوں۔ پھر مولوی اسماعیل نے کہا کہ میرے رسالے کا جواب لکھو۔ مولوی رحمت اللہ صاحب نے کہا کہ رسالہ آپ کا میری بغل میں ہے اگر فرمائیے، اسی مجمع میں جواب عرض کروں۔ غصہ کھا کر کچھ نہ کہا۔ پھر مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ جواب عقلی لکھوں یا نقلی۔ کہا جیسا چاہیے۔ پھر مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ جواب اس کا لکھو گے؟ کہا کہ میں محکوم کسی کا نہیں ہوں۔ مولوی رحمت اللہ نے کہا کہ نئے عقیدے اپنے دل کے بنائے ہوئے کسی سے نہ فرمائیے اور نہیں تو ابھی بحث کر لیجئے۔ مولوی اسماعیل اٹھ بھاگے اور چلتے ہوئے۔

رشید الدین خاں صاحب مولوی عبدالحی سے پوچھا کیے، وہ جواب دیتے تھے، ایسے کہ قدام کے خلاف نہ تھے۔ تیرہویں سوال میں کہ بدعت کی بحث تھی مولوی عبدالحی نے کہا کہ میرے نزدیک بدعت حسنہ یہی ہے، گو اصل ہر بدعت کی بد ہے مگر سبب نیکی کا اس میں ہو تو حسنہ ہو جاتی ہے والا فلا۔ مولوی رشید الدین خاں صاحب نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی بد نہیں ہے بموجب حدیث ”من سن سنة حسنة ومن سن سنة سيئة“ (الحديث) کے اور حدیث ”من احدث في امرنا هذا ما ليس منه“ اور حدیث ”من ابتدع بدعة ضلالة لا يرضاها الله“ کہ ان تینوں حدیثوں سے ثابت ہوا کہ نیا طریقہ نیک بھی ہوتا ہے، بد بھی اور خدا و رسول کی مرضی کے موافق بھی، مخالف بھی، گمراہ بھی، غیر گمراہ بھی۔ اسی سبب سے علماء نے کہا ہے کہ بعض بدعت واجب، مندوب و مباح بعض حرام، مکروہ۔

مولوی مخصوص اللہ صاحب (ابن شاہ رفیع الدین) نے کہا، جس بدعت کی وجہ حسن و فحیح ظاہر نہ ہو وہ کیا ہے؟ مولوی عبدالحی نے کہا: سید۔ انھوں نے کہا: اس تقدیر پر بدعت و مباح میں کیا فرق ہے؟ مولوی

عبدالحمی ساکت ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ احکامِ خمسہ میں سے ایک حکم کم ہو گیا۔
 پھر مولوی عبدالحمی نے کہا کہ ہر بدعت کو بُرا اس واسطے کہتا ہوں کہ ”کل بدعتہ“
 کا کلیہ ظاہر پر ہے اور مخصوص نہ ہو جاوے۔ خانصاحب نے کہا کہ تخصیص سے
 کیا قباحیت لازم آتی ہے؟ اور عموماً میں تخصیص مشہور ہے۔ مولوی محمد شریف
 نے پڑھا ”ما من عام الا وقد خص منه البعض“ خانصاحب نے کہا
 کہ تینوں حدیثیں مذکورہ بالا تخصیص کو چاہتی ہیں، پس تخصیص ضرور ہوئی۔
 مولوی عبدالحمی نے کہا کہ اصل ہر بدعت کی قبیح بعض علماء کا مذہب ہے۔
 خانصاحب نے کہا کہ یہ قول حضرت مجدد (قدس سرہ) کا ہے مگر تمہارے
 مذہب (خارجیت و وہابیت) سے نہایت دور کہ اُن کے مذہب میں جس
 کی اصل شرع میں پائی جاوے وہ سنت ہے، بدعت وہی ہے جس کی اصل
 نہ پائی جائے۔ پھر مولوی عبدالحمی نے غوطہ میں جا کر کہا کہ یہ قول نووی کا ہے،
 فتح المبین میں لکھا ہے۔ اُسی وقت فتح المبین شرح اربعین امام نووی کی
 پیش کی گئی۔ عبارت اُس نظام کی باوازا بلند مع ترجمہ پڑھی گئی۔ پھر تو مولوی
 عبدالحمی اچھی طرح سے قائل معقول ہو گئے۔

پھر اذان میں بعد دفن کے کلام ہوا۔ بعد کسی قدر نکار کے کہا کہ میں کسی
 کو منع نہیں کرتا۔ پھر کلام ہوا، سوم کے فاتحہ میں۔ بعد قیل وقال کے کہا
 کہ اگر اُس دن میں ثواب زیادہ جانتا ہے ممنوع ہے اور اگر ثواب زائد
 نہیں جانتا اور برعایت مصلحت کے کرتا ہے تو منع نہیں ہے۔

تمام ہوا خلاصہ نقل مجلس کا۔ پھر تو یہ حال ہوا کہ ہر ایک مسئلہ میں
 ادنیٰ ادنیٰ آدمی سے قائل (ساکت) ہونے لگے اور اطراف و جوانب میں بھی
 یہ تقریریں اور تحریریں جا بجا پھیل پڑیں۔ سب پر ظاہر ہو گیا کہ مولوی اسماعیل کا
 طریقہ مخالفت ہے تمام سلف صالح کے اور اپنے خاندان کے بھی مخالفت میں اُو
 سبب اعتبار کا وہی نسبت خاندان کی تھی۔ جب اُس کے بھی خلاف ٹھہرے

تو کچھ اعتبار نہ رہا اور ساری قلمی کھل گئی اور ہر جگہ جو اہل علم تھے متوجہ ہوئے ان کی بے دینی کے اظہار اور اُس کے رد کھینے پر۔ ایسے سببوں سے آگ ان کے فتنے کی ٹھنڈی ہو گئی اور نئے دین والے بھی زبان دبا کر بات کرنے لگے،

تاریخ کرام! یہ تھا وہاں بیت کا سنگ بنیاد جو دہلی میں رکھا گیا اور ولی اللہی خاندان سے مولوی محمد اسماعیل صاحب نے جس نجدی شجر کی آبیاری کا کام بڑی تندہی سے کیا۔ علمائے اہلسنت نے اپنی بساط بھرا اس فتنے کا مقابلہ کیا۔ خاندانی بزرگوں اور دیگر علمائے اہلسنت نے سمجھایا، زنی چارہ جوئی کی، بحث و مناظرہ کی محفلیں گرم کی گئیں، لیکن مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) تھے کہ اپنے جدید مذہب سے کسی طرح بٹے، مغلوب ہوئے مگر ڈٹے رہے، اپنے اکابر سے روگردان ہوئے، خاندان سے رشتہ دار، دہلی مرکز سے رابطہ چھوٹا تو جہاد کا چکر چلایا، سید احمد صاحب کو صاحبِ وحی و عصمت بنایا، ان کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے اور سابقہ رویہ ہی کا داغ دھوئے کا خاطر، اس خوشحال میں بھولے بھالے مسلمان پھنسائے۔ نجدیت کی پوری معلومات حاصل کرنے، نجدیوں سے فتنہ و فساد کے گریس لینے کی خاطر، حج بیت اللہ کا بہانہ کر کے ایک بار گئے، وہاں کیوں گئے اور کیا وہاں سے لاتے؟ جتنے منہ اتنی باتیں، حقیقت کا حال حال ہی بہتر جانتا ہے اور اُس کی عطا سے اُس کے برگزیدہ بندے۔ باقی تو صرف عقل و فکر کی باتیں ہیں۔ اس دورہ حج کے بارے میں پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد نے بعض مورخین کے خیالات یوں نقل کیے ہیں:

حضرت سید احمد صاحب کا شاندار سفر حج ان کی زندگی کا ایک اہم اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ بعض انگریز مصنفوں نے زور دیا ہے کہ سید احمد کا سفر حج ان کی زندگی کا ایک انقلابی واقعہ تھا۔ ان کے خیال میں اسی دوران سفر میں ان کو عربی و ماہیت سے زیادہ قریب کا رابطہ ہوا، اُس کے عقائد سے بہت

متاثر ہوئے اور ہندوستان میں اُن کی اشاعت کی۔ ایسا ہی ایک مصنف
 قلبی لکھتا ہے: ”یہی زمانہ تھا جبکہ ایک شخص سید احمد بریلوی مکہ کے سفر سے
 ہندوستان کو وہ بیچ لے گیا جس نے ۱۸۲۲ء میں اُن کی شہادت
 کے بعد وہابیوں کو کوہِ سیاہ کا ردِ عمل بخشا اور اطراف تک اُس کی
 گونج یا جھٹکا پہنچا دیا۔“

ہندوستانی وہابیت پر ایک اور مشہور تر مصنف، ہنٹر لکھتا ہے:
 ”سید احمد کے قیام مکہ کے دوران میں وہاں کے حکام کی توجہ، اُن کی تعلیمات
 کی اُن بدو قبائلوں کے خیالات سے مماثلت کی طرف منطقت ہوئی، جن کے
 ہاتھوں مکہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے۔ علانیہ طور پر اُن کی
 تحقیر کی گئی اور شہر بدر کر دیے گئے۔ اس جو روتھدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ
 ہندوستان آئے تو ایک مذہبی خواب میں اور مشرکانہ بد اعمالیوں کے مصلح
 کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ محمد بن عبد الوہاب کے معتقد و مرید کی حیثیت سے۔“

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب ان مصنفوں سے اتفاق رائے نہیں رکھتے لیکن موصوف
 اس امر کا اعتراف کیے بغیر کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا کہ نجدی اور ہندی وہابیت اصل
 ایک ہی چیز کے دو مختلف نام ہیں۔ شراب وہی ہے لیلِ جُدا جدا ہیں۔ موصوف کی تصریح
 اُن کے اپنے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

”حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبداء ایک ہی ہے، قرآن
 و حدیث۔ دونوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں۔ ان دونوں تحریکوں
 (نجدی اور ہندی تحریک) کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک
 قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصول کو
 دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مصر تھے، جن میں بنیادی چیز توحید

اور ترکِ بدعات پر زور دینا تھا۔ محمد بن عبد الوہاب کی التوحید (کتاب التوحید)
اور شاہ اسماعیل کی تقویت الایمان ان بنیادی اُمور پر زور دینے میں متفق الحیال
ہیں۔ لے

غیت ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ہندی اور نجدی وہابیت کی مماثلت تقسیم کر لی، باقی رہا اُن
کا دعویٰ کہ دونوں تحریکیں اپنا مبداء اور مخرج قرآن و حدیث کو ٹھہراتی ہیں اور توحید و ترکِ
بدعات پر زور دیتی ہیں تو اس سلسلے میں ہماری رائے تو یہی ہے کہ آج تک ایسا کون سا
بد مذہب گروہ کھڑا ہوا ہے جس نے اپنے مخصوص نظریات کا مخرج، قرآن و حدیث کو نہ ٹھہرایا
ہو؟ رہی توحید والی بات، تو یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی پیمانہ توحید سے ناپ کر تو اولین
راج نے امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور انھیں مسلمان جاننے والے
حاجز کرام اور تابعین عظام کو مشرک اور اسلام سے خارج ٹھہرایا تھا، اگر اسی ساختہ
توحید کو لے کر محمد بن عبد الوہاب نجدی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)
ی بارہ صدیوں کے مسلمانوں کو مشرک بنا کر جہنم کا ایندھن ٹھہرائیں، ساری اُمت محمدیہ کو
مشرکوں کا جگھٹا بتائیں تو اتنی بات پر متفق ہونے کی وجہ سے یہ دونوں حضرات اس ساختہ توحید
میں رکھنے والوں کے نزدیک کیوں نہ مصلح اور رہنما قرار پائیں؟ ڈاکٹر صاحب نے
میں تحریکوں میں دو اخلاقی امور بھی ذکر کیے ہیں، جن میں سے امرِ دوم اور موصوف کا
ملاحظہ ہو:

ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرہ امتیاز ایک مرحلے پر مہدوی تحریک سے
اُس کا اتفاق تھا۔ مہدوی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے
کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا۔ اسی کے بعد سید احمد نے رحلت کی۔ مہدوی تحریکات
سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔ لہذا ظاہر ہے کہ دونوں
تحریکوں میں ظاہری تشابہ ایک مشترک ماخذ استفاضہ اور یکساں حالات و

کو الف کی موجودگی کا نتیجہ تھا، نہ کہ ایک دوسرے کے تتبع و تقلید کا۔ لے

پروفیسر الحاج فیروز الدین روحی اس سلسلے میں اپنی تحقیقاتِ عالیہ یوں پیش فرماتے ہیں:

”اتفاق کی بات اُسی زمانہ میں عرب میں بھی وہاں کی مذہبی و سماجی خرابیوں کی بنا پر تجدید و اصلاحِ دین کی تحریک شروع ہوئی، جس کے قائد شیخ محمد بن عبد الوہاب تھے، ترکی کا اُس وقت عرب پر اقتدار تھا، لہذا ترکی کو نقصان اٹھانا پڑا، پھر اس تحریک کو مصر کے بادشاہ محمد علی پاشا نے ہوا دی اور یہ دونوں ملک انگریز کے دوست تھے، وہاں اس تحریک کو وہابی کے لقب سے موسوم کیا گیا۔ لہذا ہندوستان میں بھی سید احمد شہید کی تحریک کو شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی کی شاخ اور تمہ بنایا، بلکہ بعض انگریز مصنفین نے یہاں تک لکھ مارا کہ حضرت سید احمد شہید جب حج کو گئے تو شیخ محمد بن عبد الوہاب سے پڑھ کر آئے، حالانکہ سید احمد کی پیدائش ۱۷۸۶ء کی ہے اور شیخ کا انتقال ۱۷۹۷ء میں ہو جاتا ہے، یہ اتفاق کی بات ہے کہ دونوں تحریکیں ایک ہی جذبہ اور ایک ہی مقصد کے لیے وجود میں آئی تھیں، اور اُس وقت کے ماحول کے اعتبار سے کم و بیش ایک ہی طریقہ کار دونوں نے اختیار کیا۔ لے

حیران ہوں کہ پروفیسر فیروز الدین روحی صاحب کی اس عبارت اور اُن کی اس ساری کتاب کو دیکھ کر کوئی موصوف کو کس مضمون کا پروفیسر تصور کرے گا۔ اردو، عربی، تاریخ اور اسلامیات میں کیسے کیسے گل کھلائے ہیں۔ اردو کی ادبی شان تو ہر جملے سے نمایاں عربی دیکھیے تو ساری کتاب میں ایسی کوئی عربی عبارت نظر آئے گی جو صحیح نقل کر سکے ہوں، اسلامیات سے مراد صرف وہابیت کی قصیدہ خوانی ہو کر رہ گئی اور وہ بھی ثبوت کی محتاج اور تاریخ دانی کیلئے یہی عبارت کافی رہے گی۔ مزید اور ملاحظہ فرمائیے کہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کا سن وفات یہاں ۱۷۹۷ء لکھا ہے لیکن دوسری جگہ:

لے محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں وہابی تحریک، ص ۵۷، ۵۸

لے فیروز الدین روحی، پروفیسر: آئینہ صداقت، مطبوعہ کراچی، ص ۴۵، ۴۶

شیخ نے مسلسل پچاس سال دعوت و تبلیغ کے بعد شوال یا ذیقعدہ ۱۲۰۶ھ مطابق جولائی ۱۸۹۲ء میں رحلت کی۔ شیخ نے چار لڑکے اور ہزار ہا شاگرد چھوڑے۔

حَدِ ناطقہ سرگرمیاں ہے اِسے کیا کیے !

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کے سوانح نگار یعنی مرزا حیرت دہلوی نے اِس سلسلے میں اپنی تحقیق کا نفاذ کچھ عجیب انداز میں بجا یا ہے۔ ذرا کان لگا کر سماعت فرمائیے :

”مولوی اسماعیل جو ہندوستان میں فرقہ موحدیہ کا بانی ہے، کبھی کسی نجدی شیخ سے نہیں ملا اور نہ اِس نے اُن کی کوئی کتاب دیکھی۔ اِس نے وہی تعلیم دی جو کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بتاتی ہے۔ محمد بن عبد الوہاب کی پیدائش سے پہلے محمدیت کی بنا اِس کے خاندان میں پڑ چکی تھی اور جو کچھ اِس نے اور اِس کے خاندان نے حاصل کیا وہ اپنے ہی باب داداؤں سے۔ اسلامی دنیا میں ایک ہی خاندان ہے جسے غیر کے شاگرد بننے کا افتخار حاصل نہیں ہوا۔ یورپینس کا یہ لکھنا کہ محمد بن عبد الوہاب نے ہندوستان تک اپنے مذہبی اصول کے خیالات پھیلائے محض لغو اور بے سرو پا بات ہے۔ جس بُرے پیرایہ میں محمدیوں کو، جنہیں سخت غلطی سے دہابی کہا ہے، انگریز مصنفوں نے گورنمنٹ کو دکھایا ہے، سخت حقارت انگیز کارروائی ہے۔ گورنمنٹ خود جانتی ہے کہ اُس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہل حدیث نے کس قدر تسلیم کر لیا ہے اور اُس کے کیسے فرماں بردار، مطیع اِس گروہ کے لوگ ہیں۔ ان پر کیا، ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی اُن کا روایوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی

جاتی ہیں، لے

موصوف کے یہاں تین دعوے مذکور ہوئے ہیں جنہیں ہم نمبر وار بیان کیے دیتے ہیں:

- ۱۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ موصوف کا یہ دعویٰ کسی سستی یا دہائی تک کو بھی تسلیم نہیں ہو سکتا۔ باب سوم میں کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان کی مطابقت دکھائیں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔
- ۲۔ دوسرا دعویٰ کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا مذہب اپنے خاندان کے مطابق تھا اور اس محمدی مذہب کی بنیاد پہلے ہی ان کے خاندان میں پڑ چکی تھی۔ یہ دعویٰ سراسر غلط اور بے بنیاد ہے۔ گزشتہ صفحات میں قدرے وضاحت کی جا چکی ہے۔
- ۳۔ تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے پیرو، جو پہلے محمدی اور بعد میں اہلحدیث کہلائے، وہ برٹش گورنمنٹ کو بابرکت تسلیم کرتے اور اس کے پورے پورے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔ یہ دعویٰ انھوں نے جس عاجزانہ اور دلیرانہ انداز میں کیا ہے، ان کے پیش نظر ہر کوئی کہہ اٹھے گا کہ: خطر کشش لفظوں کی ایسی ہے کہ ہم بھی صاد کرتے ہیں

حقیقت کچھ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (متوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے کتاب التوحید کو دیکھا یا یہ کتاب انھیں دکھائی گئی۔ موصوف نے دل جان سے اس کے مندرجات کو قبول کیا اور اس کے خیالات و نظریات کی ڈھکے چھپے لفظوں میں تبلیغ شروع کر دی، شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) اور شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ (متوفی ۱۲۴۲ھ/۱۸۲۶ء) تک شکایتیں پہنچیں۔ دونوں حضرات نے بالواسطہ اور بلا واسطہ سمجھا یا سمجھایا لیکن پرنا لہ وہیں رہا۔ یہ دونوں بزرگ وفات پا گئے تو موصوف کی باگیں ڈھیل ہو گئیں۔ خوب کھل کر کھیلنے لگے۔ قانونی طور پر نقص امن کے پیش نظر پابندی گوانی تو زالا ہی انکشاف ہوا، حکومت کی پشت پناہی صاف نظر آنے لگی۔ آخر کار دلائل کے

ذریعے علمائے کرام نے محاسبہ شروع کیا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان اور شاہ عبدالغنی محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگردوں اور بھتیجیوں نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی کا محاسبہ شروع کر دیا۔ ایک طرف یہ دونوں حضرات تھے اور دوسری طرف سارے ملک کے علمائے اہلسنت اور پورا خاندان ولی اللہی۔ جب دلائل کے میدان میں ان حضرات کا بھید کھلنا شروع ہو گیا تو جو بھولے بھالے مسلمان ان حضرات کے دلکش الفاظ کے پتھر میں چنس گئے تھے وہ ان سے علیحدہ ہو گئے اور جو تھوڑی بہت جمعیت فراہم کی تھی وہ بھی منتشر ہو گئی۔

ان حالات میں دوسرا منصوبہ تیار کیا گیا جو پہلے کی سراسر ضد ہے۔ برٹش گورنمنٹ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا دلکش نعرہ سمجھایا تو بادشاہی کا دماغوں میں سودا بھا گیا اور لبیک کہہ کر قبول کر لیا۔ اب فکر لاحق ہوئی لاؤ لشکر کی، اس کے لیے جہاد کے فضائل اور سکھوں کے مظالم پوری دلسوزی سے بیان کیے جانے لگے، ساتھ ہی سید احمد صاحب بریلوی (المتوفی ۱۲۶۶ھ / ۱۸۳۱ء) کی وہ شان بیان کی جانے لگی کہ لوگوں کی عقلیں حیران رہ جاتیں۔ جلد اولیائے کرام سے انھیں بڑھایا گیا بکہ صاحب عصمت و وحی ٹھہرا کر انبیاء کی صف میں بٹھایا گیا۔ سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشابہ اور باری تعالیٰ شانہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہونا سنایا گیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ تمک صعود اور اس سے مصافحہ ولین دین کی کہانیاں گھڑ کر سنائی گئیں، حراط المستقیم کتاب لکھ کر اس میں پہلے فضائل و کمالات درج کر کے، متبعین کے دلوں اور دماغوں میں سید احمد صاحب کی شان بیکتائی کا تصور پیدا کر کے ان کا پجاری بنایا گیا۔

سید احمد صاحب نے بھی اپنے منصب کا پوری طرح لحاظ رکھا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی ان کی جو صفات بیان کرتے، جس مقام پر انھیں بٹھاتے جاتے، یہ کمال دانشمندی سے اس کے مطابق پیشین گوئیاں اور بشارتیں داغے رہتے۔ مکانوں اور سمندروں کی روصیں موصوف سے اسی لیے باتیں کرنے لگ جاتیں، جنات حاضر ہوتے، اولیائے متقدمین تشریف لاکر نوازتے، انبیائے کرام بشارتیں سناتے آتے، مقدس

ہستیاں اگر غسل دیتیں اور کپڑے پہنانے کی خدمات انجام دے جاتیں۔ پنجاب کا بادشاہ
 بننے کی خوشخبری بھی سنا تے نیز افغانستان کا نفاق، چین کا کفر اور ہندوستان کا شرک اپنی
 زندگی میں مٹانے کی بشارت بھی بالہام خداوندی سنا تے اور اُس پر حلف اٹھاتے تھے۔
 غرضیکہ تالیفِ قلوب اور اجتماعِ جمعیت کا وہ کون سا خانہ ساز روحانی حربہ تھا جو کام میں
 لایا نہ گیا ہو۔ علمی باتوں پر ٹوکا جاسکتا ہے۔ دلیل اور ثبوت کا مطالبہ سخت دشواری میں مبتلا
 کر دیتا ہے لیکن روحانی معاملات کا چکر، ایک پختہ دو کاج، جمعیت حاضر اور ثبوت خارج از
 بحث۔ یعنی آم کے آم گھٹلیوں کے دام، ہلدی لگی نہ پھٹکڑی، حکومت نے ولایت و نبوت چیکے
 عطا کر دی۔ بس تدریجی مراحل طے کرنے تھے اور ہر مقام کے حصول کا مرزا غلام احمدؒ (المتوفی ۱۹۰۸ء) کی طرح بتدریج اعلان کرتے جا رہے تھے لیکن منزلِ مقصود پر پہنچنے سے
 پہلے راستے میں ہی بالاکوٹ کا ایسا مقام آگیا کہ یہ منصوبہ وہیں دفن ہو کر رہ گیا اور مرزا غلام احمد
 صاحب ہی وہ فرد واحد نکلے جو برٹش گورنمنٹ کے اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے ورنہ
 کتنے ہی سید احمد صاحب جیسے خواہشمند حضرات منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی راہی ملکِ عدم
 ہوتے رہے۔

سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل صاحب کے دونوں منصوبے ایک دوسرے کے
 سرِ امرِ خلاف ہیں۔ پہلی تحریک جو شرک و بدعت کے خلاف بتائی جاتی ہے اُس کی وجہ یہی
 ظاہر کی گئی کہ مسلمان اکابر پرستی اور شرک میں گرفتار تھے۔ لیکن ان مصلح کلمانے والوں نے
 دوسری تحریک میں سید احمد صاحب کی پرستش کا وہ اہتمام کیا جس کی نظیر ان کے اصطلاحی
 مشرکوں میں بھی نہیں پائی جاتی تھی۔ سید احمد صاحب کو صاحبِ وحی عصمت بتایا جا رہا تھا
 باری تعالیٰ شانہ نامک سعد اور اُس کی ہمکلامی کے شرف سے موصوف کو مشرف بتایا جاتا
 تھا۔ حالانکہ شریعتِ مطہرہ کی رو سے کسی کے بارے میں ایسی باتوں کا عقیدہ رکھنا، اُسے
 نبی ماننے کا مترادف ہے۔ ان حضرات کے پہلے منصوبے کی ترجمان ”لقویۃ الایمان“ ہے
 اور دوسرے منصوبے کا صحیفہ ”صراط المستقیم“ کو بنایا گیا۔ یہ دونوں کتابیں اگر انصاف کی
 نظر سے دیکھی جائیں تو صاف دکھائی دے گا کہ دونوں ایک دوسری کے خلاف ہیں۔

دوسرا منصوبہ تو مکمل طور پر ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں دفن ہو گیا، کیونکہ جب نبی بنے والا ہی نہ رہا تو آگے بات کیسے چلتی۔ پہلے منصوبے کے اثرات تقویۃ الایمان کتاب کی بدولت باقی رہ گئے کہ مٹتے مٹاتے بھی موصوف اس فتنے کی چنگاری دہلی و کلکتہ میں چھوڑ ہی گئے۔ تقویۃ الایمان کے سن تالیف کے بارے میں غلام رسول مہر کی تحقیق یہ ہے:

’یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ تقویۃ الایمان کس زمانے میں لکھی گئی۔ اس میں ایک مقام پر کعبہ مقدسہ کے صحن کا منظر پیش کیا گیا ہے، جس سے دل پر اثر پڑتا ہے کہ یہ منظر چشم دید ہے، لہذا سمجھا جاسکتا ہے کہ کتاب سفر حج سے واپس آکر لکھی گئی۔ ملا صاحب بغدادی نے بعض اصحاب کی انگینت سے تقویۃ الایمان پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ شاہ شہید نے اُس کے جواب میں ایک خط کانپور سے لکھا تھا، جس پر ۱۲۴۰ھ درج ہے۔ اس سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ کتاب سفر حج سے مراجعت پر ۱۲۴۰ھ کے اوائل میں لکھی گئی۔ اُس زمانے میں شاہ شہید ہمہ تن دعوت تنظیم و جہاد کے لیے وقف ہو چکے تھے اور جہادی الاغریٰ ۱۲۴۱ھ کو وہ جہاد کے لیے روانہ ہو گئے۔‘

کیا ہی اچھا ہوتا کہ جناب غلام رسول مہر سن تصنیف کے بارے میں یوں تصریح کرتے کہ ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں سارے ولی اللہی خاندان اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے خوش چین علمائے دہلی نے طلبہ داران و بابیت و خارجیت سے جو مناظرہ و مباحثہ کیا تھا، تقویۃ الایمان اُس سب سے پہلے ضحیٰ وہابی مناظرے سے کچھ عرصہ پہلے لکھی گئی تھی کیونکہ دوران مباحثہ اس رسالے کا ذکر بھی آیا تھا۔ لیکن موصوف ایسی تصریح کرنے سے جملہ وہابی مؤرخین و علماء کی طرح کیوں گریز کرتے جبکہ انھوں نے اس خارجیت کے ڈانڈے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۶۶ھ / ۱۷۶۲ء) نیز شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ /

۱۸۲۳ء) بلکہ حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ (المتوفی ۱۰۳۴ھ / ۱۶۲۴ء) سے ملانے کی دھاندلی بڑے اہتمام سے مچانی ہے۔ اس کی اشاعت کے بارے میں موصوف یوں رقمطراز ہیں:

”تقویۃ الایمان جس کے نئے ایڈیشن کے تعارف میں یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں، پہلی مرتبہ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۶ء میں چھپی تھی، جب شاہ شہید، امیر المومنین سید احمد بریلوی اور جماعت مجاہدین کے ہمراہ وطن مالوف سے ہجرت کر کے جا چکے تھے اور ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے جہاد بالسیف کا آغاز ہو چکا تھا۔“

واقعی غلام رسول مہر صاحب بڑی دور کی کوڑی لائے ہیں کیونکہ ہندوستان کی آزادی و تطہیر کے لیے اس طرح کا جہاد بالسیف تو نظام اور مرہٹے بھی کر چکے تھے۔ جب وہ انگریزوں کے دست و بازو بن کر کئی دفعہ شیر و کن سلطان فتح علی ٹیپو شہید پر چڑھ دوڑے تھے۔ اس تحریک جہاد کی حقیقت اسی کتاب کے تیسرے اور چوتھے باب میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی حکمت عملی بھی دیدنی ہے کہ جب بمب دہلی میں رہے تو دہلیت کے لیے میدان ہموار کرتے رہے اور جب جہاد کے نام سے مغربی ہند کی سرحد پر پہنچ گئے اس وقت تقویۃ الایمان کو شائع کر دیا گیا، تاکہ اس کی اشاعت سے جو آگ بھڑکتی بن وہ عدم موجودگی میں بھڑکے اور مصنف مواخذے سے محفوظ رہے۔ مولوی عبد الشاہد خان شروانی نے تقویۃ الایمان کی تقریظ کے بارے میں اپنے خیالات یوں ظاہر کیے:

”مسلمانوں کی شدت مخالفت کی بنا پر قدرتی طور پر شاہ صاحب کا جذبہ اصلاح غلو کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک طرف تقریظ تھی تو دوسری جانب افراط۔ شاہ اسماعیل صاحب نے مسلمانوں کی ہر غلط روی کو شرک سے تعبیر کرنا شروع کیا۔۔۔۔۔ وعظ و تبلیغ کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔“

پہلے عربی میں، پھر اردو میں تقویۃ الایمان لکھی۔ اس میں حد اعتدال سے تجاوز کیا گیا۔ اس کا خود مصنف کو بھی احساس تھا، لہ

مولانا ذکیل احمد سکندر پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی) نے مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں اپنے تاثرات یوں قلمبند کیے :

”جب سے اسلام ہندوستان میں آیا، قریب ہزار برس ہوئے، کبھی ایسا ترکِ تقلید و جدال فی الدین کا چرچا نہ تھا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی یہ کلام دینِ اسلام پر لائے، لہ

مولانا مفتی سید عبدالفتاح، اشرف علی گلشن آبادی نے تقویۃ الایمان کی پہلی اشاعت کے سن طباعت وغیرہ کے ساتھ تقویۃ پر یوں تبصرہ کیا ہے :

”کتاب تقویۃ الایمان مؤلف مولوی محمد اسماعیل دہلوی، شہر کلکتہ میں مطبع احمدی باہتمام سید عبداللہ بن سید بہادر علی ۱۲۴۲ھ میں مطبوع ہوئی ہے۔ مضمون شرک و بدعت کے دور کرنے کے واسطے جو آیات و ہدایت کی شان میں اور بُت پرستوں کے واسطے نازل ہوئی ہیں، سوا نبیاء و اولیاء کی شان میں لکھیں اور مسلمانانِ اہلسنت و جماعت و مقلدینِ ائمہ اربعہ، عام و خاص سب کو مشرک و بدعتی کہہ دیا اور فاتحہ اموات و زیارت، دہم، چہلم، نذر و نیاز کو باطل کہا اور اعتقاد میں اہل سنت و جماعت کے بہت سی بدعتیں داخل کر دیں اور (ابن) عبد الوہاب نجدی کی کتاب التوحید کا سارا ترجمہ شرح و بسط سے کیا۔ غیب اضافی کو غیب مطلق بنایا اور امانت و حقارتِ انبیاء و اولیاء بدرجہ کمال پہنچایا۔ ۱۲۵۱ھ میں شہر مدراس کے نواب والا جاہ کے حضور میں مجمع علماء کے درمیان مفتی صبغتہ اللہ

عبد الشاہ بن شروانی، مولوی : باغی ہندوستان، ص ۱۱۴

ذکیل احمد سکندر پوری، مولانا : وسیلہ جلیلہ، مطبع مصطفائی، ۱۳۰۱ء، ص ۱۸۴

قاضی الملک اور افضل العلماء محمد ارتضاعلی خاں مفتی صدر عدالت سرکار
مدرسہ اس نے مولوی محمد علی رامپوری خلیفہ سید احمد سے کتاب مذکور میں
چند مقامات پر مباحثہ کیا اور معتقد مذکور کو کافر ثابت کر دیا اور اس مباحثہ
کی حقیقت اور استفتاء "تحفہ محمدیہ" کے صفحہ ۵۱ میں مرقوم ہے "۱۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی تو سکھوں سے جہاد کرنے کا نام نہاد اعلان کرتے ہوئے
۱۲۴۱ھ میں صوبہ سرحد کی طرف چلے گئے۔ موصوف کی عدم موجودگی میں تقویۃ الایمان
انگریز کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ سے ۱۲۴۲ھ میں شائع ہونا بلکہ رائل ایشیاطک سوسائٹی
کلکتہ سے لاکھوں کی تعداد میں انگریزوں نے تقویۃ الایمان شائع کی اور پورے ہندوستان
میں جہاں تک انگریز اسے پہنچا سکتے تھے وہاں تک مفت پہنچاتے رہے۔ کیا یہ افسوسناک
صورت حال اہل فکر و نظر کے لیے لمحہ فکریہ نہیں ہے؟ دہلی کے ایک نیم مولوی کی تصنیف
اس کی نشر و اشاعت ایسٹ انڈیا کمپنی کرے، آخر کیوں؟ قاضی احسان الحق نعیمی
نے متحدہ ہندوستان میں اس خارجیت کی تخم برزی کے بارے میں لکھا ہے:

"یہ وہاں سرزمین نجد سے اُٹھی۔ صحیح بخاری شریف کی حدیث میں حضور سید انبیا
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صد سال پہلے اس کی خبر دی تھی۔ وہ آگ بھڑکی
وہ فتنہ پیدا ہوا اور عبد الوہاب نجدی کے گھر سے نکل کر عرب کے بعض
مقامات میں پہنچا، وہیں سے رد کیا گیا۔ کسی سرزمین نے اسے قبول نہ
کیا۔ جہاں میں اس کے قدم نہ جھے، عراق و یمن نے اس کو جگہ نہ دی،
کوفہ و بصرہ میں، مصر و شام میں، ترکی و ایران میں، غرض دنیا کے کسی
مقام میں، کسی قلمرو اور کسی ولایت میں اس فتنہ کو دخل نہ ہوا اور اس
تلخ تخم کو کسی سرزمین نے قبول نہ کیا۔ نجد کے چھوٹے اور خشک اور بے رونق
خطہ کے چند خشک دماغ، درندہ صفت انسانوں کے دماغ میں وہاں بیت کا

نچل گھومتا رہا۔ مگر افسوس کہ جو چیز دنیا کے ہر خطہ نے ٹھکرا دی تھی اُس کو
ہندوستان میں جگہ ملی، اُس کا تخم دہلی میں لگایا گیا اور وہ جب کچھ پھوٹا تو اُس
کو دیوبند میں تربیت کیا گیا۔ وہاں وہ اس قدر بڑھا کہ اُس کی شاخیں ہندوستان
کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئیں اور اُن سے اس ملک کی فضا مسموم ہو گئی اور
اُس کے زہریلے اثر نے ملک کے بہت سے فوہا لوگوں کو برباد کر دیا اور فساد
کی آگ لگا دی۔ زمانے گزر گئے مگر یہ فتنہ دفع نہ ہوا، لے

موافقین یا مخالفین کی آراء پیش کرنے کے بجائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود مولوی
محمد اسماعیل دہلوی کے اپنے تاثرات تقویۃ الایمان کے بارے میں پیش کر دیے جائیں۔
چنانچہ موصوف کا ایک بیان یوں نقل کیا گیا ہے :

”میں جانتا ہوں کہ اس (تقویۃ الایمان) میں بعض جگہ ذرا تیز الفاظ
بھی آگئے ہیں، بعض جگہ تشدد بھی ہو گیا ہے مثلاً اُن امور کو جو شرک خفی
ہیں، شرک جلی لکھ دیا ہے۔ ان وجوہ سے مجھے اندیشہ ہے کہ شور و شر
فزون پھیلے گی“ لے

دیوبندی حضرات کے حکیم الامت یعنی مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/
۱۹۴۳ء) مولوی محمد اسماعیل دہلوی مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں

یوں وضاحت کرتے ہیں :

”مولوی اسماعیل شہید موحّد (وہابی غیر مقلد) تھے۔ چونکہ محقق تھے، چنانچہ
مسائل میں اختلاف کیا اور مسلک پیران خود مثل شیخ ولی اللہ وغیرہ پر
انکار فرمایا“ لے

لے ماہنامہ السواد الاعظم، مراد آباد : بابت شعبان ۱۳۴۹ھ، ص ۱۲، ۱۵،

لے عبد الشاہ خاں شہروانی، مولوی : باغی ہندوستان، ص ۱۵،

لے اشرف علی تھانوی، مولوی : امداد المشتاق، ص ۹،

قارئین کرام! آپ نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا اعتراف ملاحظہ فرمایا کہ موصوف نے شرک خفی کو شرک جلی ٹھہرایا تھا۔ آخر کیوں؟ کیا یہ مداخلت فی الدین نہیں؟ کیا کوئی شرعی احکام کی حقیقت بدلنے کا مجاز ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے ایسا کیوں کیا تھا، اس کا صاف سیدھا جواب یہی ہے کہ موصوف نے خواجہ کے مذہب کو قبول کر لیا تھا اور خراجیت کا خاصہ یہی ہے کہ خارجی و نجدی عینک لگا کر دیکھنے سے سارے جہان مشرک ہی مشرک نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی تھانوی صاحب کی تصریح بھی ملاحظہ فرمائی کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا مسلک اپنے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی و شاہ عبدالغزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کے مسلک کے خلاف تھا، لیکن کہاں تک داد دی جائے اُن حضرات کے دین و دیانت کی، جو مصنف تقویۃ الایمان اور اُن کے تابعین و ولی اللہی مکتبہ فکر والے بناتے ہیں۔ چنانچہ وہابی مفکر ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

”شاہ ولی اللہ صاحب کی وفات پر پوری نصف صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستان میں ایک تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی جس کا نصب العین وہی تھا جو شاہ صاحب نگاہوں کے سامنے روشن کر کے رکھ گئے تھے۔ سید صاحب کے خطوط اور ملفوظات اور شاہ اسماعیل شہید کی منصب امامت، عقبات، تقویۃ الایمان اور دوسری تحریریں دیکھیے۔ دونوں جگہ وہی شاہ ولی اللہ صاحب کی زبان بولتی نظر آتی ہے۔“

جناب ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، جو کسی کے مقلد ہونے کے روادار نہیں بلکہ اپنی تحقیق کی بنیاد پر عقاید و نظریات کی عمارت تعمیر کیا کرتے ہیں۔ جو محقق، مفکر اسلام، نابغہ اور عبقری اسلام تک مشہور کیے جاتے ہیں لیکن یہاں اگر اُن کی تحقیق و عبقریت کیوں لیلیٰ کے مزار کی جھینٹ چڑھ گئی؟ کیا واقعی سید احمد صاحب کے خطوط کی طرح شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو چھنسانے کے لیے جھوٹی پیشگوئیاں سنائی تھیں؟ کیا

صراطِ السقیم کتاب کے مندرجات کی طرح شاہ صاحب نے بھی وحی و عصمت کا دعویٰ کیا تھا۔
 یا خدا ایک صمد اور اُس سے ہم کلام ہونے، مصافحہ کرنے اور لین دین کرنے کے مدعی
 بنے تھے؛ کیا شاہ صاحب نے اپنی تصانیف میں شرک خفی کو شرک جلی ٹھہرا کر مسلمانوں کو
 شرک بتانے کی مہم چلائی تھی؛ اگر نہیں اور ہرگز نہیں تو ہم مؤذبانہ عرض کرتے ہیں کہ ایسے
 بیانات سے حقیقت ہرگز بدل سکے گی۔ دنیا ئے دنی میں آپ حضرات پر دہیگنڈے کے
 زور پر اگر مسلمانوں کی اکثریت سے ایسا ہی منوا بھی لیں تو حاصل کیا ہوا؛ کیا جب بارگاہِ
 خداوندی میں حاضر ہو کر جواب دینا پڑے گا اُس وقت یہ حربے کام آسکیں گے؛ کیا یہ
 دھاندلی دہاں بھی چل سکے گی؛ موصوف آگے ان ساختہ مصلحین کے بارے میں یوں
 نظر آ رہے ہیں :

”سید صاحب اور شاہ اسماعیل صاحب دونوں روحاً و معنئاً ایک وجود رکھتے
 ہیں اور اس وجود متحد کو میں مستقل بالذات مجتہد نہیں سمجھتا، بلکہ شاہ ولی اللہ
 صاحب کی تجدید کا تہمتہ سمجھتا ہوں۔“

مجھے کو مودودی صاحب جو چاہیں سمجھیں لیکن اتنی وضاحت کرنے کا حق ہمیں بھی از روئے
 شرع حاصل ہے کہ مسلمانوں کے دین کی تجدید کرنے والے کا گروہ اہلسنت و جماعت سے
 خارج فرمایا ہے کیونکہ مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِي کی مصداق یہی جماعت ہے اور اَتَّبِعُوا
 سَوَادُ الْأَعْظَمِ اسی کے متعلق فرمایا گیا تھا اور اس سے جدا ہونے والوں کے حق میں
 لَئِنْ مَن شَدَّ شُدَّ فِي النَّارِ سنایا گیا ہے۔ دریں حالات مولوی محمد اسماعیل دہلوی جو
 خارجیت کے مبلغ اور زمرہ اہلسنت و جماعت سے علیحدہ ہو گئے تھے وہ مسلمانانِ اہلسنت
 و جماعت کے مجتہد ہرگز نہیں ہو سکتے، ہاں اپنی جماعت میں وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی
 طرح مجتہد بنائے جائیں یا نبی، مسلمانوں کا اُن کی تجدید سے کوئی علاقہ نہیں کیونکہ موصوف نے
 اپنے آبا و اجداد کے مذہب اور ناجی گروہ سے اپنا تعلق منقطع کر لیا تھا تھا۔ یہ اُن کا اپنا

فیصلہ تھا اور خود وہ ناجی گروہ سے علیحدہ ہوئے تھے۔

بہر حال مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے جب اس خارجیت یعنی محمد ابن عبد الوہاب نجف دیوبندیت کو تقویۃ الایمان کے لیے اور اس منظر عام پر آنے سے پہلے تقاریر میں اس بعض مضامین بیان کرنے شروع کیے تو علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۶ھ) نے جلد علمائے کرام سے دوش بدوش بلکہ پوری سرگرمی سے موصوف کا محاسبہ شروع کیا، تاکہ یہ فتنہ نہیں بکھڑک جائے اور مسلمانانِ اہلسنت وجماعت اس بلا سے ناگوار نہ رہیں۔ اسی لیے علمی میدان میں آپ نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا ناظمہ بند کر کے مولانا نسیم احمد مروہی اس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں :

”مولانا خیر آبادی نے ایک رسالہ اس سلسلے میں لکھا اور ایک معقولی عالم کی حیثیت سے معقول انداز میں تقویۃ الایمان کے بعض مضامین پر اعتراضات کیے۔ اس رسالے میں نہ تو ذوقِ کفر سازی کی تسکین تھی، نہ سب و شتم، صرف اپنے تاثرات کو پیش کیا گیا تھا۔“

کاش! موصوف نے جو شیعہ عقیدت میں حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ آخر بھولے بھالے مسلمانوں کو صحیح صورتِ حال سے بے خبر رکھنا بلکہ واقعات کو ان کے خلاف دکھانے میں دین کی کون سی خدمت اور آخرت کے مفاد کا کون سا راز مضمر ہے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی علیہ الرحمہ نے جن لفظوں میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے بارے میں حکم شرعی بیان فرمایا وہ تین سوالوں کے مندرجہ ذیل جوابات سے واضح ہے :

”جواب سوالِ اول ایں است کہ کلامِ قائل مذکور سرتاپا کذب و زور و فریب و غرور است۔ چہ اونی سببِ بُودنِ شفاعت برائے نجاتِ گنہگاراں و نفیِ شفاعت و جاہلیت و شفاعتِ محبت از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم و حضراتِ سائرِ انبیاء و ملائکہ و اصفیاء میکنند، ایں اعتقاد اونی

غلافِ کتابِ مبین و احادیثِ سید المرسلین و اجماعِ مسلمین است کما
اثبت فی مقام الاول مفصلاً و قد بان بطلان بعض کلماتہ فی
المقام الثانی معللاً۔

جواب سوال دوم ایں است کہ کلام اُبلاتر دود و استتہان بر استخفافِ
نزلت و جاہ آں سرور، مقربانِ بارگاہِ حضرتِ الہ و انتقاصِ شانِ سائرِ
انبیاء و ملائکہ و اصفیاء و شیوخ و اولیاء، اشتمال و دلالت دارد۔ چنانچہ
در مقامِ ثالث مذکور و فیما سبقتی مبرہن و مسطور است۔

جواب سوالِ ثالث ایں است کہ قائل ایں کلام لا طائل از دئے شرع
مبین بلاشبہ کافر و بے دین ست، ہرگز مومن و مسلمان نیست و حکم اُو
شرعاً قتل و تکفیر است و ہر کہ در کفر اُدشک آر دیا تر دد دارد یا ایں استخفاف
را سہل انگارد، کافر و بے دین و نامسلمان و لعین است، الا در کفر و
بے دینی کمتر هست۔ از سببیکہ ایں کلام را از عقائدِ ضروریہ دین شمارد،
آئس در کفر با قائل ہمسر بلکہ در استخفاف از وبال اتراست، "مخلصاً
در تحقیق الفتوی فی ابطال الطغوی" لہ

قارئینِ کرام کی معلومات کے لیے یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ مولانا فضل حق
بر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء) کی جلالتِ علمی کا کچھ تذکرہ کر دیا جائے۔
مآثرِ موصوف کے بارے میں سر سید احمد خاں صاحب لکھتے ہیں:

"مستجمع کلماتِ صوری و معنوی، جامع فضائل ظاہری و باطنی، بناءً بناءً
فضل و افضال، بہار آرائے چمنستانِ کمال۔ تنگئیِ احبابِ رائے،
سند نشینِ دیوانِ افکارِ رسائے، صاحبِ خلقِ محمدی، موردِ سعادتِ ازلی
وابدی، حاکمِ محاکمِ مناظرات، فرمانروائے کشورِ محاکمات، عکسِ آئینہ

صافی ضمیری، ثالثِ اثین بدلی و حریری، المعنی وقت و موزع اوان،
 فروقِ عمد و لبید دوران، مبطلِ باطل و محققِ حق، مولانا محمد فضل حق۔ یہ حضرت
 خلف الرشید ہیں جناب مستطاب مولانا فضل امام غفر اللہ، المنعم کے اور
 تحصیلِ علومِ عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد کی خدمتِ بابرکت میں کی ہے۔ زبانِ
 قلم نے ان کے کمالات پر نظر کر کے فخرِ خاندان کھٹا اور فکرِ دقیق نے جب سرکار کو
 دریافت کیا، فخرِ جہاں پایا۔

جميع علوم و فنون میں کیتے روزگار ہیں اور منطق و حکمت کی تو گویا انہیں
 کی فکرِ عالی نے بنا ڈالی ہے۔ علمائے عصر یکہ فضلائے دہر کو کیا طاقت ہے
 کہ اس گروہِ اہل کمال کے حضور میں بساطِ مناظرہ آراستہ کر سکیں۔ بارہا
 دیکھا گیا کہ جو لوگ آپ کو یگانہ فن سمجھتے تھے، جب ان کی زبان سے ایک حرف
 سُنا، دعویٰ کمال کو فراموش کر کے نسبتِ شاگردی کو اپنا فخر سمجھتے۔ بایں ہم
 کمالاتِ علم و ادب میں ایسا علم سرفرازی بلند کیا کہ فصاحت کے واسطے ان
 کی عبارت شستہ محضر عروجِ معارج ہے اور بلاغت کے واسطے ان کی
 طبع رسا و ستاویز بلندیِ معارج ہے۔ سبحان کو ان کی فصاحت سے سرمایہ
 خوش بیانی اور امرادِ اقیس کو ان کے افکارِ بلند سے دستگاہِ عروجِ معانی
 الفاظِ پاکیزہ ان کے رشکِ گوہرِ خوش آب اور معانیِ رنگین ان کے غیرتِ
 لعلِ ناب۔ سروان کی سطورِ عبارت کے آگے پابِ گُل اور گُل ان کی عبارتِ نگین
 کے سامنے نچل گئے۔

مولانا رحمن علی مصنفِ تذکرہ علمائے ہند نے علامہ فضل حق خیر آبادی کے تذکرہ میں یہ بھی لکھا
 ”در علومِ منطق و حکمت و فلسفہ و ادب و کلام و اصول و شعر فائق الاقران و
 استحضارِ فوق البیان داشت۔“

لے سرستید احمد خاں، آثار الصنادید، ص ۵۶۲-۵۶۳

لے رحمن علی، مولانا، تذکرہ علمائے ہند فارسی، ص ۱۶۳

اس بابت کا ترجمہ پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں کیا ہے :

”علوم منطق، حکمت، فلسفہ، ادب، کلام، اصول اور شاعری میں اپنے ہم عصروں میں ممتاز اور اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے“۔ لہ

پروفیسر صاحب مذکور اسی کے حاشیے میں علامہ مرحوم کے بارے میں یوں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں :

”مولانا فضل حق خیر آبادی علوم معقول کے امام تھے..... جنگ آزادی

۱۸۵۷ء میں مولانا فضل حق نے مردانہ وار حصہ لیا۔ دہلی میں جنرل نجت خاں

کے شریک رہے۔ لکھنؤ میں حضرت محل کی کورٹ کے ممبر رہے۔ آخر میں

گرفتار ہوئے، مقدمہ چلا، عبور دریا ئے شور کی سزا ہوئی۔ جزیرہ انڈمان

بھیجے گئے۔ وہیں ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں انتقال ہوا“۔ لہ

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے چچا زاد بھائی یعنی مولانا مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(المتوفی ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء) بن شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی

۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۶ء) نے مصنف تقویۃ الایمان کا ڈٹ کر رد کیا۔ جامع مسجد دہلی کے تاریخی

بائٹے میں پیرزور حصہ لیا اور وہاں بھی اسماعیل صاحب سے بر ملا کہا کہ آپ نے جو اپنے خاندانی

ذہب کے خلاف یہاں محمد بن عبد الوہاب نجدی کی بے دینی کو رائج کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے،

اس بڑے تقیہ سے باز آ جانا چاہیے، کیوں اپنے اکابر کے کارناموں پر پانی پھیرنے اور تنگ خاندان

بننے کی ٹھان لی ہے، لیکن مصنف تقویۃ الایمان موقع پر اُدھر اقرار کر لیتے مگر پرنا لہ اُس کی

جگہ سے ذرا نہیں ہٹاتے تھے۔

چونکہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۳ء) نے

فرمایا تھا کہ میں ضعیف بصارت سے معذور ہوں ورنہ کتاب التوحید کا رد اُسی شرح و بسط

محمد ایوب قادری، پروفیسر : تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۳۸۲

لہ ایضاً : ص ۳۸۲

لکھنا چاہتا ہوں جس طرح روافض کے رد میں کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" لکھی ہے۔ شاہ صاحب تو کتاب التوحید کا رد نہ لکھ سکے کیونکہ بصارت ہی جواب دے گئی تھی اور اس کے بعد پیغام اجل آپہنچا تھا، لیکن سفر آخرت سے پہلے اتنا ضرور کر گئے کہ مصنف "تقویۃ الایمان" کو اپنی وراثت و خلافت سے محروم کر گئے تھے۔ آپ کی آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ کتاب التوحید نے "تقویۃ الایمان" کا روپ دھار لیا اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش کو ان کے دوسرے بھتیجے شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین نے اس طرح پورا کیا کہ تقویۃ الایمان کے رد میں "معیۃ الایمان" شرح و بسط سے لکھی اور تقویۃ الایمان کے مندرجات کو اسلام کے خلاف اور اپنے خاندانی معتقدات و مسلک اہلسنت و جماعت کے خلاف ایک چیلنج ثابت کیا۔ علمائے خاندان دہلی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے علمی وارثوں نے "معیۃ الایمان" کی تصدیق و تائید کر کے تقویۃ الایمان کے نظریات سے اپنی برأت کا اظہار کیا تھا۔ مولانا بدر الدین احمد صاحب نے مولانا شاہ مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمہ کی ان کاوشوں کا یوں تذکرہ کیا ہے :

"شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے بھتیجے اور شاگرد، مولانا شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی اور مولانا شاہ محمد موسیٰ دہلوی، جو مولانا شاہ رفیع الدین کے صاحبزادے اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے اور خود مولوی اسماعیل دہلوی کے چچا زاد بھائی تھے، اُٹھ کھڑے ہوئے اور مولوی اسماعیل کے عقائد باطلہ اور ان کی وہابیت فاسدہ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مولوی اسماعیل کے رد میں فتاویٰ اور رسالے مرتب کیے جن میں مولوی اسماعیل کو ان کے عقائد باطلہ کے باعث گمراہ اور کافر قرار دیا اور حق آشکارا کرنے میں رشتہ خاندانی کا کوئی پاس و لحاظ نہ کیا۔ حضرت مولانا شاہ مخصوص اللہ محدث دہلوی نے خاص تقویۃ الایمان کے رد میں "معیۃ الایمان" لکھ کر واضح کر دیا کہ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا علمی و نسب گھرانہ وہابیت نیز تقویۃ الایمان سے متنفر و بیزار ہے۔"

مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) نے مولانا مخصوص اللہ دہلوی بی شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہما کی خدمت میں ایک خط ارسال کیا کہ اپنے چچا زاد بھائی محمد اسماعیل دہلوی اور اُن کی تصنیف ”تقویۃ الایمان“ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ یہ کتاب آپ کے خاندانی معتقدات کے مطابق ہے یا مخالف؟ اپنے سات سوالات اور مولانا مخصوص اللہ دہلوی علیہ الرحمٰن کے جواب کو موصوف نے اپنی کتاب ”تحقیق الحقیقت“ کے صفحہ ۲۴ پر درج کیا اور اُسے ۱۲۶۷ھ میں ممبئی سے شائع کر دیا۔ مولانا مخصوص اللہ دہلوی اس کتاب کی اشاعت کے بعد پانچ چھ سال بیعت رہے لیکن مولانا فضل رسول بدایونی نے اُن کے جوابات کو جن لفظوں میں شائع کیا تھا، اُن کے بارے میں مطلقاً کوئی بات ایسی منظرِ عام پر نہیں آئی کہ موصوف پر الفاظ میں کمی یا بیشی کرنے کا الزام لگایا گیا ہو۔ وریں حالات یہ جوابات شاہ مخصوص اللہ علیہ الرحمہ کی طرف منسوب ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہا۔ یہ وہ سوالات اور اُن کے جوابات فارغین کرام کی خدمت میں پیش کیے دیتے ہیں:

عریضہ

بعد گزارش آداب تسلیمات کے عرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے عرض ہے کہ تقویۃ الایمان کے مشہور ہونے کے وقت سے لوگوں میں بڑی نزاع ہے۔ مخالفین کہتے ہیں کہ وہ کتاب، خلاف ہے تمام سلف صالح اور سوادِ اعظم کے اور مخالف مصنف کے خاندان کے اور اس کتاب کی دوسرے اُن کے استنادوں سے لے کر صحابہ تک کوئی کفر و شرک سے نہیں بچتا اور اُن کے مخالف لوگ کہتے ہیں کہ وہ کتاب موافق سلف صالح اور اُن کے خاندان کے ہے۔ چونکہ اس بات کو جیسا آپ جانتے ہوں گے، غالب کہ دوسرا نہ جانتا ہوگا، اہل البیت اور ی مافی البیت۔ اس خیال سے چند باتیں معروض ہیں۔ امید کہ جواب باصواب مرحمت ہو:

پہلا سوال: تقویۃ الایمان آپ کے خاندان کے موافق ہے یا مخالف؟
دوسرا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ اس میں انبیاء و اولیاء کے ساتھ بے ادبی

کی ہے۔ اس کا کیا حال ہے؟

تیسرا سوال: شرعاً اس کے مصنف کا کیا حکم ہے؟

چوتھا سوال: لوگ کہتے ہیں کہ عرب میں دیانی پیدا ہوا تھا۔ اُس نے یہ نیا مذہب بنایا تھا۔ علمائے عرب نے اُس کی تکفیر کی۔ کیا تقویۃ الایمان اُس کے مطابق ہے؟

پانچواں سوال: وہ کتاب التوحید جب ہندوستان آئی، آپ کے حضرت علم بزرگوار اور حضرت والد ماجد نے اُسے دیکھ کر کیا فرمایا تھا؟

چھٹا سوال: مشہور ہے کہ جب اس مذہب کی نئی شہرت ہوئی تو

آپ جامع مسجد میں تشریف لے گئے اور مولوی رشید الدین خان صاحب

وغیرہ تمام اہل علم آپ کے ساتھ تھے اور مجمع خاص و عام میں مولوی اسماعیل

صاحب اور مولوی عبدالحی کو ساکت اور عاجز کیا۔ اس کا کیا حال ہے؟

ساتواں سوال: اُس وقت آپ کے خاندان کے شاگرد اور مرید، اُن

(اسماعیل دہلوی) کے طور پر تھے یا آپ کے موافق؟ امید ہے کہ جواب

ان سب مراتب کا صاف صاف مرحمت ہو کہ سبب ہدایت ناواقفوں کا،

جواب

پہلے بات کا جواب یہ ہے کہ تقویۃ الایمان کہ میں نے اس کا نام تقویۃ الایمان

ساتھ فائدہ کے رکھا ہے۔ اُس کے رد میں جو رسالہ میں نے لکھا ہے اُس

کا نام ”مُعِیْدُ الْاِيْمَان“ رکھا ہے۔ اسماعیل کا رسالہ موافق ہمارے خاندان

کے کیا کہ تمام انبیاء اور رسولوں کی توحید کے خلاف ہے کیونکہ پیغمبر سب

توحید کے سکھانے کو اور اپنے راہ پر چلانے کو بھیجے گئے تھے۔ اُس کے

رسالہ (تقویۃ الایمان) میں اس توحید کا اور پیغمبروں کی سنت کا پتہ بھی

نہیں ہے۔ اُس میں شرک اور بدعت کی افراد گن کر جو لوگوں کو سکھاتا ہے

کسی رسول اور اُن کے خلیفہ نے کسی کا نام لے کر شرک یا بدعت لکھا ہو،

اُر کہیں ہو تو اُس کے پیروؤں سے کہو کہ ہم کو بھی دکھاؤ۔

دوسرے سوال کے جواب یہ ہے کہ شرک کے معنی ایسے کہتے ہیں کہ اُس کی رُود سے فرشتے اور رسول خدا شرک کا حکم دینے والا ٹھہرتا ہے اور وہ شریک کہ شرک سے راضی ہو وہ مبغوض خدا ہوتا ہے۔ محبوب کو مبغوض بنانا اور کوانا ادب ہے یا بے ادبی ہے اور بدعت کے معنی وہ بنائے پھیلے ہیں کہ اصفیاء اولیا بدعتی ٹھہرتے ہیں۔ یہ ادب ہے یا بے ادبی؟ تیسرے مطلب کا جواب یہ ہے کہ پہلے دونوں جوابوں سے دیندار اور سمجھنے والے کو ابھی کھل جائے گا کہ جس رسالہ سے اُس کے بنانے والے سے لوگوں میں بُرائی اور بگاڑ پھیلے اور خلافت سب انبیاء و اولیاء کے ہو، وہ گمراہ کرنے والا ہو گا یا ہدایت کرنے والا ہو گا؟ میرے نزدیک اُس کا رسالہ عمل نامہ بُرائی اور بگاڑ کا ہے اور بنانے والا (یعنی مصنف) فتنہ گر اور مفسد اور خادی اور مغموی ہے۔ سچ اور سچ یہ ہے کہ ہمارے خاندان سے دو شخص ایسے پیدا ہوئے کہ دونوں کو امتیاز اور فرق نیتوں اور حیثیتوں اور اعتقادوں اور اقراروں کا اور نسبتوں اور اضافتوں کا نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی بے پروائی سے سب چھن گیا تھا۔ مانند قول مشہور کے ”چوں فرق مراتب نہ کنی زنیقی“..... ایسے ہی ہو گئے۔

چوتھی بات کا جواب یہ ہے کہ وہابی (محمد بن عبد الوہاب نجدی) کا رسالہ (کتاب التوحید) متن تھا، یہ شخص (اسمعیل دہلوی) اُس کی شرح (بنام تقویۃ الایمان) کرنے والا ہو گیا۔

پانچویں بات کا جواب یہ ہے کہ بڑے عظم بزرگوار (یعنی شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علیہ الرحمہ) کہ وہ بنائی سے معذور ہو گئے تھے، اُس (کتاب التوحید) کو سنا، یہ فرمایا کہ میں اگر پیار یوں سے معذور نہ ہوتا تو ”تحفہ اثنا عشریہ“ سا جواب، اُس کے رد میں بھی لکھتا۔ اس کریم کی بخشش سے.....

اس بے اعتبار نے شرح (تقویۃ الایمان) کا رد لکھا، تین (کتاب التوحید) کا مقصد بھی نابود ہو گیا۔ ہمارے والد ماجد نے اُس (کتاب التوحید) کو دیکھا نہ تھا (کیونکہ ۱۲۳۳ھ میں وصال ہو گیا تھا) بڑے حضرت (شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ) کے فرمانے سے کھل گیا کہ جب اُس کو گمراہ جان یا تب اُس کا رد لکھنا فرمایا۔

چھٹی تحقیق کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تحقیق اور سچ ہے کہ میں نے مشورت کی راہ سے کہا تھا کہ تم (اسمعیل دہلوی) نے سب سے جدا ہو کر تحقیق دین میں کی ہے، وہ لکھو۔ کچھ ظاہر نہ کیا۔ ہماری طرف سے جو سوال ہوئے تھے (مباحثہ جامع مسجد دہلی میں) اُس کے جواب میں ہاں جی، ہاں جی، کر کے مسجد سے چلے گئے۔

ساتویں بات کا جواب یہ ہے کہ اُس مجلس تک سب ہمارے طور پر تھے پھر اُن کا جھوٹ سُن کر کچے کچے آدمی آہستہ آہستہ بھرنے لگے اور ہمارے والد کے شاگردوں اور مریدوں میں سے بہت نکلا رہے، شاید کوئی نادر بھرا ہو (وہابی بنا ہو) تو مجھے اُس کی خبر نہیں، انتہی بلفظ۔ لے

مولانا محمد مخصوص اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حقیقت کے پیش نظر فرمایا کہ میں تقویۃ الایمان کتاب کو تقویۃ الایمان ہی کہتا اور لکھتا ہوں لیکن قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانہ نے تاریخ وہابیہ دیوبندیہ، مطبوعہ کلیمی پریس کلکتہ ۱۳۳۴ھ صفحہ ۳۳ مرتبہ مولانا مفتی محمد نعیم مدراسی رضوی علیہ الرحمہ سے اُن کے استاد گرامی، قاضی محمود منگیری نور اللہ مرقدہ کا ایک بیان، بلکہ حیرت انگیز بیان یوں نقل کیا ہے:

”مولوی اسمعیل دہلوی کے ہاتھ کے مسودے دیکھے تو تقویۃ الایمان کی جاتے تقویۃ الایمان، بجائے قاف کے ف لکھا ہوا تھا، خداوندِ عالم نے اُس کے

ہاتھ سے لکھایا تھا۔ سچ ہے یہ کتاب ایمان کو فوت کرنے والی ہے۔^۱
 مولانا مخصوص اللہ کی طرح شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۳ھ)
 کے دوسرے صاحبزادے یعنی شاہ محمد موسیٰ دہلوی علیہ الرحمہ نے بھی اپنے چچا زاد
 بھائی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے رد میں پوری طرح اپنا فریضہ ادا کیا۔ جامع مسجد دہلی کے
 تاریخی مباحثے میں دوران گفتگو بھی پوری طرح حصہ لیا اور اپنے اکابر شاہ ولی اللہ محدث
 دہلوی (المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) اور شاہ عبدالعزیز و شاہ رفیع الدین و شاہ عبدالقادر
 رحمۃ اللہ علیہم کے مسلک کی روشنی میں مولوی عبدالحی دہلوی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے
 معتقدات کی تردید کی اور انھیں اپنے بزرگوں کے مسلک سے بغاوت کرنے والے ثابت
 کر کے دکھایا تھا۔ شاہ محمد موسیٰ نے اپنے اس عظیم کارنامے کو کتابی شکل میں ”حجة العمل
 فی بطلان الحیل“ کے نام سے جمع کر دیا تھا۔ پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس کتاب
 کے بارے میں یوں ذرا شرماتے ہوئے، مصنف تقویۃ الایمان کو چھپاتے ہوئے وضاحت
 فرمائی ہے:

”مولوی محمد موسیٰ کی تصنیف سے ایک قلمی فارسی کتاب ”حجة العمل فی
 ابطال الجہل“ ہماری نظر سے گزری ہے۔ یہ کتاب ہفتہ ہم ربیع الاول
 ۱۲۶۶ھ/۱۸۶۶ء میں اتمام کو پہنچی۔ یہ کتاب ساٹھ اوراق (۲۰ صفحات)
 پر مشتمل ہے۔ کتاب کا مضمون رد و ماہیت ہے۔“^۲

اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۲ء)
 شاگردوں، بھتیجیوں اور خوشہ چین علمائے کرام نے مصنف تقویۃ الایمان کے رد میں
 پوری سرگرمی دکھائی۔ مولانا رشید الدین خاں اور مفتی صدر الدین آزاد ہر طرح پیش پیش
 رہے۔ جن کا کچھ ذکر ہو چکا اور باقی تصانیف کے ضمن میں کیا جائے گا۔ مولانا ابوالکلام آزاد

فیضانِ احمدی، مولانا: انوارِ آفتاب صداقت، ج ۱، ص ۵۳۱

ابوالکلام قادری، پروفیسر: تذکرہ علمائے ہند اردو، ص ۵۹۱، ۵۹۲

(المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) کے والد ماجد کے نانا جان یعنی مولانا منور الدین دہلوی رحمہ اللہ علیہ بھی شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے شاگرد اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے ہم سبق تھے۔
نے تقویۃ الایمان کے رد میں ایک مبسوط کتاب لکھی تھی جس کے بارے میں جناب ابوالکلام آزاد کی تصریح ملاحظہ ہو:

”اس میں تقویۃ الایمان کے تیس مسئلے مابہ النزاع منتخب کیے ہیں اور پھر
تین بابوں میں ان کا رد کیا ہے۔ ایک رسالہ اس باب میں ہے کہ مولانا
اسماعیل شہید کے عقائد کا رد خود ان ہی کے خاندان اور اساتذہ کی کتب سے
کیا جائے۔ چنانچہ اس میں برٹلے کے رد میں شاہ عبدالرحیم، شاہ ولی اللہ
شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین کے اقوال سے اپنے نزدیک روکیا ہے۔
کیا کسی انصاف پسند کے لیے اس کے بعد بھی گنجائش باقی رہ جاتی ہے تقویۃ
کی تعلیمات کے ڈانڈے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء)
سے ملاتے اور تقویۃ الایمانی دھرم والوں کو ولی اللہی مکتبہ فکر کے علمبردار ٹھہرانے کی جرأت
کرے۔ مولانا منور الدین دہلوی نے مصنف تقویۃ الایمان کو پہلے خوب سمجھایا بھجایا کہ
تفرقہ بازی اور فتنہ پرازی ایک ظلم عظیم ہے اس سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن خارجیت
دل و دماغ میں کچھ اس طرح سما گئی تھی کہ ان کی فہمائش کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا
مجبوراً مولانا منور الدین کو ان کی تردید میں کمر ہمت باندھنی پڑی۔ مولانا منور الدین
رد و ہا بیت میں جس طرح سرگرمی دکھائی اس کا تذکرہ جناب ابوالکلام آزاد نے یوں کیا
”مولانا اسماعیل شہید مولانا منور الدین کے ہم درس تھے۔ شاہ عبدالعزیز
(رحمۃ اللہ علیہ) کے انتقال کے بعد حب انھوں (مولوی اسماعیل) نے تقویۃ
الایمان اور جلال العینین لکھی اور ان کے اس مسلک کا چرچا ہوا تو علماء میں
پھیل پڑ گئی۔ ان کے رد میں سب سے زیادہ سرگرمی بلکہ سربراہی مولانا منور الدین

نے دکھائی۔ متعدد کتابیں لکھیں اور ۱۲۴ھ والا مشہور مباحثہ جامع مسجد میں کیا۔ تمام علمائے ہند سے فتویٰ مرتب کرایا پھر حرمین سے فتویٰ منگوایا۔ ان کی تحریرات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ابتدا میں مولانا اسماعیل اور ان کے رفیق یعنی شاہ عبدالعزیز صاحب کے داماد مولانا عبدالحمی کو بہت کچھ نہالشی کی اور ہر طرح سمجھایا، لیکن جب ناکامی ہوئی تو بحث و رد میں سرگرم ہوئے اور جامع مسجد (دہلی) کا شہرہ آفاق مناظرہ ترتیب دیا، جس میں ایک طرف مولانا اسماعیل اور مولانا عبدالحمی تھے اور دوسری طرف مولانا منور الدین اور تمام علمائے دہلی۔^۱

یہ بیان کسی ایسے عالم کا نہیں جس کو بریلوی بتا کر اُس کی بات ناقابلِ توجہ ٹھہرا دی جائے۔ یہ بابیوں کے امام الہند کا بیان ہے۔ کیا اس سے صاف اور صریح طور پر واضح نہیں ہو رہا ہے کہ مصنفِ تقویۃ الایمان نے اپنے آبائی مسلک سے، مذہبِ اہلسنت و جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ سرزمینِ پاک و ہند میں فرقہ بازی کا سنگِ بنیاد رکھا اور یہاں محمد بنی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کی جگہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے خارجی مذہب کو رائج کرنے کی سرگوشش کی تھی۔ پس پشت کوئی ایسی طاقت کام کر رہی تھی جو کسی کی فہمائش کا اثر نہیں ہونے دیتی تھی۔ گھر بار خلاف، سارا خاندان خلاف، متحدہ ہندوستان کے تمام علمائے کرام مخالفت پر کمر بستہ، لیکن کسی کی پروا نہیں کی۔ نہ خاندان کو خاطر میں لائے، نہ اپنے بزرگوں کا کوئی پاس لحاظ کیا اور نہ علمائے کرام کے محاسبے اور ان سے بار بار اٹھانے والا جواب رہنے پر کوئی ندامت محسوس ہوتی تھی۔ بس تفریقِ بین المسلمین کی دھن تھی۔ پوری تہذیب سے اُس میں لگے رہے اور کسی بھی رُکاوٹ کو خاطر میں نہ لائے۔ آخر کیوں؟ کیا یہ تھنایت پر تھے اور پاک و ہند کے سارے علمائے کرام سب مشرک و کافر تھے؟ بدنی اُلھی خاندان کے اکابر مشرک و کفر کی تعلیم ہی دیتے رہے تھے اور یہ اُن کی اصلاح

کرنے کو اٹھ کھڑے ہوتے تھے؛ آخر یہ اصلاح ہو رہی تھی یا تخریب، مسلمانوں کو طایا جارا یا توڑنے اور منتشر کرنے کی سعی نا محمود تھی؛ اگر جوڑنے کا پروگرام تھا، تو یہ بات ناقابلِ یقین ہے کیونکہ اس وقت مسلمان ٹوٹے ہوئے اور فرقوں میں بٹے ہوئے کب تھے کہ انھیں جوڑنے کی ضرورت پڑتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ بعض سماجی خرابیاں ان کے مذہب و معمولات میں داخل ہو چکی تھیں، ان کی اصلاح مد نظر تھی۔ اس سلسلے میں یہی عرض کروں گا کہ کاشش! موصوف نے ارادے یہی کچھ ہوتے تو یہ تخریب قابلِ احترام اور لائقِ ستائش قرار پاتی لیکن افسوس! کچھ ایسا ہی لگایا گیا مگر ساتھ ہی اسلامی عقائد و نظریات پر عملِ جراحی کی اس طرحِ مشترک کہ سچے اور سچے مسلمانوں کو بھی خوارج کی طرح بیک جنبشِ قلمِ مشترک و کافر ٹھہرا دیا۔ بعض عقائد کو غیر اسلامی اور کفری ہی غیر اسلامی اور صریح کافرانہ نظریات کو اسلامی عقائد منوانے ہم پورے زور شور سے شروع کر دی گئی۔ آخر سماجی خرابیاں دُور کرنے ہی کا ارادہ تھا مسلمانوں کو خارجی بنانے کی ہم چلانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؛ کیا مسلمانوں کے لیے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا دین، ان کی نجات کے لیے کافی نہیں تھا؛ کیا نجات کا ذریعہ محمد عبد الوہاب نجدی کا دین ہے؟

مولوی ابوالکلام آزاد کے والد ماجد، مولانا خیر الدین جالندھری رحمۃ اللہ علیہ (۱۳۷۶ھ/ ۱۹۰۸ء) اپنے نانا، مولوی منور الدین دہلوی اور مفتی صدر الدین آزاد (۱۲۵۸ھ/ ۱۸۴۱ء) کے نامور شاگرد تھے۔ ردِ وہابیت میں آپ نے بھی انتہائی سرگرمی کی کہ کسی طرح یہ فتنہ جڑ پکڑنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے اور مسلمان اپنا دین و ایمان برباد سے محفوظ ہو سکیں۔ موصوف کے ایسکار ناموں کو ان کے فرزند مولوی ابوالکلام نے

بادلِ ناخواستہ بیان کیا ہے:

”اُسی زمانے میں علمائے مکہ نے والد مرحوم سے کہا کہ وہابی عقائد (وہابیانِ ہند) کی کتابیں اُردو میں ہیں جنہیں وہ سمجھ نہیں سکتے نیز نجدی عقائد کا بھی رد کافی طور پر نہیں ہوا ہے۔ شیخ احمد دحلان نے اس بارے میں خاص طور پر زور دیا اور اس طرح والد مرحوم نے ایک کتاب نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی، جو

ان کی تصانیف میں سب سے بڑی ہے۔ اُس کا نام ”نجم الرجم الشیاطین“ ہے۔ یہ دس جلدوں میں ختم ہوئی ہے اور ہر جلد بہت ضخیم ہے۔ اس کی ترتیب اس طور پر ہوئی ہے کہ ایک سو چودہ مسئلے ماہ النزاع منتخب کیے ہیں۔ اتنی تعداد جزئی جزئی اختلافات کے استقصاء کی وجہ سے ہو گئی ہے۔ ہر مسئلے کے لیے ایک باب قائم کیا ہے۔ اُس میں پہلے قرآن سے، پھر احادیث سے، پھر اقوالِ علماء سے رد کا التزام کیا ہے۔ اس طرح کتاب ایک سو چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔ ایک جلد صرف مقدمہ میں ہے اور چونکہ وہ اُن مسائل کے متعلق نہیں ہے، اس لیے معلومات کے اعتبار سے بکار آمد ہے۔ اس میں اصولی طور پر عقائدِ اہلسنت پر بحث کی ہے اور ہر طرح کے اختلافات کو ختم کر کے اپنے مسلک کو بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔“ ۱

اب ہم ذیل میں چند اُن علمائے کرام کا ذکر کریں گے جنہوں نے تقویۃ الایمان کے فتنے کو دفع کرنے کی غرض سے اس کے کُلّی یا جزئی رد لکھے۔ اگرچہ ایسی تصانیف کا شمار حد و حساب سے باہر ہے لیکن ہم تیرھویں صدی میں لکھی جانے والی بعض اُن تصانیف کے نام پیش کرتے ہیں جو ”گردِ کشتن روزِ اول“ کے بطور لکھی گئی تھیں۔ علامہ فضل حق خیر آبادی، شاہ مخصوص اللہ دہلوی، شاہ محمد موسیٰ دہلوی، مولانا منور الدین دہلوی اور مولانا خیر الدین جاندھری رحمۃ اللہ علیہم کا ذکر سچے گزر چکا۔ اب بفضلہ تعالیٰ بعض دیگر علمائے اہلسنت اور اُن کی کاوشوں کا تذکرہ کرتے ہیں وباللہ التوفیق :

- ۱۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے نامور شاگرد مولانا رشید الدین خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۳ء) نے مصنفِ تقویۃ الایمان کو خوب فہمائش کی۔ مباحثہ جامع مسجد دہلی میں علمائے دہلی کی سربراہی کی اور مولوی عبدالحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء) سے سوالات

کرتے رہے۔ آپ نے شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہما سے بھی تحصیل علم کی تھی۔ مفتی صدر الدین آزر دہ کے رشتہ دار تھے۔ تعلیم و تعلم میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور اسی وجہ سے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے منظور نظر تھے۔ روافض کا رد کرتے رہے اور آخر میں رد و دایا بیت میں سرگرمی دکھاتے رہے۔

۷۔ مفتی صدر الدین آزر دہ (المتوفی ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء) نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء) اور مولانا فضل امام خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۸ء) وغیرہ سے تحصیل علم کی۔ ۸۵ء کی جنگ آزادی میں حصہ لیا اور فتویٰ جہاد کی تصدیق کی، جس کی پاداش میں منصب صدر الصدوری سے معزول ہوئے اور جائیداد منقولہ و غیر منقولہ چھین لی گئی۔ وہابیہ کے رد میں منتهی المقال فی شرح حدیث لاشدو المرحال کتاب لکھی۔ آپ کا کتب خانہ جو ۱۸۵۷ء میں حکومت نے ضبط کیا تقریباً تین لاکھ کی مالیت کا تھا۔

۸۔ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) نے تحصیل علم بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی (المتوفی ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۹ء) کے شاگرد و رشید مولانا نور الحق فرنگی محلی (المتوفی ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲ء) سے کی۔ مولانا فیض احمد بدایونی مولانا سخاوت علی جون پوری، مفتی اسد اللہ آبادی، مولانا شاہ احمد سعید رامپوری اور مولانا عنایت رسول چریا کوٹی جیسے مشاہیر علماء کو آپ کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے وہابیہ کے رد میں مثالی کارنامہ انجام دیا۔ ”بوارق محمدیہ“ اُن کے رد میں شرح و بسط لکھی، جس کا ترجمہ مولانا غلام قادر بھروی نے اردو میں ”شوارق محمدیہ“ کے نام سے کیا۔ یہ کتاب ۱۲۶۵ھ میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ ”احقاقِ حق“ اور ”تصحیح المسائل“ کے ذریعے اُن کے باطل مذہب کا رد کیا۔ ”سیف الجبار“ بھی ۱۲۶۵ھ کی تصنیف ہے اور اس میں نجدی اور ہندی وہابیوں کے

مکائد مظالم، اُن کی تاریخ اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کے مضامین میں باہم مطابقت دکھا کر مبرہن کیا ہے کہ حقیقت میں یہ دونوں مذاہب ایک ہیں۔ مولانا نے عقائد اہلسنت و جماعت کو ایک عربی تصنیف ”المعتقد المنتقد“ میں منضبط فرمایا اور اس کتاب کے ذریعے بھی ضمنی طور پر وہابی عقائد و نظریات کی تردید ہوتی ہے۔ یہ تصنیف لطیف علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) کی مصدقہ ہے۔ یہی وہ مبارک تصنیف ہے جس پر امام اہلسنت اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ (المتوفی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۶۱ء) نے ”المعتقد المستند“ کے نام سے حاشیہ لکھا اور اُس میں گمراہ گروں کے پانچ سرغنوں کی تکفیر کا شرعی فریضہ ادا کیا تھا۔

۹۔ مولانا کریم علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء) یہ سید احمد بریلوی (المتوفی ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۳ء) کے مرید اور خلیفہ تھے لیکن مکائد ظاہر ہونے پر دوبارہ زمرہ اہلسنت میں واپس آ گئے۔ وہابیہ کی ”تقویۃ الایمان“ کے رد میں ”قوة الایمان“ لکھی، اس کے علاوہ اُن بابتہ عین کی تردید میں اور متعدد رسائل لکھے۔

۱۰۔ مولانا سید جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۷ء) عرف اللہ والے صاحب، یہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ تقویٰ و طہارت اور علوم حدیثیہ میں درجہ کمال پر فائز تھے۔ انھوں نے تقویۃ الایمانی عقائد و نظریات کے رد میں رسالہ ”صاعقہ راہیہ در ردّ عقائد وہابیہ“ لکھا۔

۱۱۔ مولانا تراز علی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۰ھ/ ۱۸۶۴ء) نے ”سبیل النجاح الی تحصیل الفلاح“ کے نام سے تقویۃ الایمان کا رد لکھا ہے۔

۱۲۔ مولانا برہان الدینی رحمۃ اللہ علیہ ساکن دیوبند، مشہور فقیہ اور محدث ہو گزرے ہیں۔ ۲۹ ربیع الثانی ۱۲۷۰ھ کو جامع مسجد دہلی میں جو حنفی وہابی اختلاف پر سب سے پہلا اور تاریخی مناظرہ ہوا تھا۔ موصوف نے ”محاکمہ“ کے نام سے اُس مباحثے کی مکمل روئے اور درج کر کے وہابیہ کے دلائل کا رد کیا ہے۔

۱۳۔ مولانا محمد سعید اسمعی مدد راسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ/ ۱۸۵۵ء) نے تقویۃ الایمان

کے رد میں ”سفینۃ النجات“ نامی کتاب لکھی اور تحفہ اثنا عشریہ مصنف شاہ عبدالعزیز
محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کا اردو میں ترجمہ بھی
کیا تھا۔

۱۴۔ مولانا خلیل الرحمن مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں کتاب ”رسم الحجرات“
لکھی جو ۱۲۵۹ھ/ ۱۸۴۳ء میں ممبئی سے شائع ہوئی تھی۔

۱۵۔ مولانا محمد عبداللہ خراسانی بگرامی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء) نے مصنف
”تقویۃ الایمان کا“ ”السیوف الباریقہ علی مرؤس الفاسقہ“ کتاب لکھ کر رد کیا۔ یہ کتاب
مطبع قیصریہ سے ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ مکہ مکرمہ کے سرتاج العلماء
مفتی شافعیہ، سید احمد دحلان مکی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱ء) سے مرثیہ
نے تفسیر، حدیث اور فقہ کی سندیں حاصل کی تھیں۔ مذکورہ کتاب ”السیوف الباریقہ“
بھی حضرت مفتی شافعیہ کی مصدقہ ہے۔ مصنف تقویۃ الایمان کے بارے میں موصوف
یوں اس میں رقمطراز ہیں:

فان قيل ان الملحد الهندي	اگر کوئی یہ کہے کہ ملحد ہندی اسماعیل
اسماعيل الدهلوي كان من	دہلوی جبکہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی
تلامذة مولانا الشاه عبدالعزیز	رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے تو وہ
رحمة الله عليه فكيف يوتد	اپنے دین اسلام سے کس طرح
عن دينه وقلت لخبث اباطن	پھر سکتے تھے؛ میں کہتا ہوں کہ سابقہ
وحب الرياسة كالمرتدين	مرتدوں کی طرح باطنی خباثت اور ہوس
الاولين كانوا يحضرون مع	ریاست کے باعث ایسا ہوا، حالانکہ
النبي صلى الله عليه وسلم	وہ لوگ بھی تو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
في الحج والجهاد والصوم	کے ساتھ حج، جہاد، روزہ اور نماز
والصلوة۔	میں شرکت کیا کرتے تھے۔

۱۶۔ مولانا کریم اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۱ھ/ ۱۸۷۴ء) شاہ عبدالعزیز محدث

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) اور مولانا رشید الدین خاں علیہ الرحمہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ/ ۱۸۳۳ء) وغیرہ سے تحصیلِ علوم کی۔ سید آل احمد عرف اچھے میاں مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء) سے شرفِ ارادت اور اجازت و خلافت حاصل تھی۔ وہابیہ کے رد میں آپ نے ”ہادی المصلین“ کتاب لکھی۔

۱۷۔ مولانا سید عبدالفتاح المعروف بہ مفتی اشرف علی گلشن آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تحصیلِ علوم مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) اور کئی دیگر علمائے کرام سے کی۔ مصنفِ تقویۃ الایمان کے رد میں اور ان کے مکائد کا رد کرتے ہوئے ایک کتاب ”تحفہ مجاہد فی رد وہابیہ“ شرح و بسط سے لکھی۔ دوسری ”تائید الحق“ جو ۱۲۶۵ھ/ ۱۸۴۸ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔

۱۸۔ مولانا محمد آسن واعظ پشاورمی المعروف بہ حافظ دراز رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء) ایک مشہور بزرگ اور متبحر عالم ہو گزرے ہیں۔ ساری عمر درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں گزاری۔ بخاری شریف کی ”منج الباری“ کے نام سے فارسی میں شرح لکھی اور شرح قاضی مبارک پر فاضلانہ حواشی لکھے۔ انھوں نے مصنفِ ”تقویۃ الایمان“ کو بارہا فحاشی کی اور علمی گفتگو کے ذریعے انھیں تقلید اور رفعِ یدین وغیرہ مسائل میں لاجواب کرتے رہے۔ جب ان کے فاضلانہ و متفقانہ دلائل کے سامنے موصوف کی کسی طرح پیش نہ گئی تو موصوف نے خارجیت کا پرنا لہ وہیں رکھا لیکن رفعِ یدین کو ناچھوڑ دیا تھا۔ ان وہابیوں نے ہند سے پنجاب میں جو علمائے اہلسنت نے شہرہ آفاق مناظرہ کیا تھا اُس میں آپ بھی موجود تھے۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی اُس مناظرے میں ہر موضوع پر ساکت و صامت ہوئے اور خارجیت و نجدیت کے تائب ہونے کا اعلان کر دیا تھا، لیکن فوراً بعد ہی بعض وہابی علمائے نے کہنا شروع کر دیا کہ مصنفِ تقویۃ الایمان نے وہابیت و خارجیت سے توبہ کرنے کا کوئی اعلان نہیں کیا تھا، یہ ان پر بُہتان ہے۔ قربان جائیں انحضرت امام احمد رضا خاں بریلوی کے مخاطب قلم پر کہ آپ نے اسی شہرتِ توبہ کی بنا پر مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی

- ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء کی تکفیر سے اجتناب کیا حالانکہ اُن کی تصانیف میں کتنی ہی عبارتیں صریح کفریہ ہیں جن کی آج تک کوئی اسلامی تاویل نہیں کی جاسکی۔ حالانکہ اس واقعے سے چھ سال پہلے علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۰۸ھ/۱۸۶۱ء) نے ۱۲۴۰ھ میں ”تحقیق الفتویٰ“ کے اندر مصنف تقویۃ الایمان کی جامع مسجد دہلی میں تکفیر کی اور ولی اللہی خاندان کے علماء، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے علمی فرزندوں، دیگر علمائے دہلی اور علمائے شنا بہمان پور نے اُس فتوے کی تصدیق و تائید مہری و دستخطی فرمائی تھی۔ مولانا محمد احسن لپساوری نے دیکھا کہ یہ لوگ بعینہ خوارج کی طرح توحید اور شرک کو آپس میں گڈمڈ کر رہے ہیں لہذا ان کی تردید میں کتاب ”تحقیق توحید و شرک“ تصنیف فرمائی تھی۔
- ۱۹۔ مولانا محمد صبغۃ اللہ مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں ”گلزار ہدایت“ نامی کتاب لکھی جو مطبع کشن راج مدراس سے ۱۲۶۴ھ/۱۸۴۷ء میں شائع ہوئی تھی۔
- ۲۰۔ مولانا محمد خلیل الرحمن مصطفیٰ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں ”رم الخیرات“ کتاب لکھی اور اُسے ۱۲۵۹ھ/۱۸۴۲ء میں ممبئی سے شائع کروایا تھا۔
- ۲۱۔ مولانا محمد جید علی مکھنوی ثم جیدر آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) نے تحصیل علم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی اور مولانا رشید الدین خاں رحمۃ اللہ علیہم سے کی۔ فن مناظرہ اور علم کلام میں درجہ کمال رکھتے۔ رد افض سے مناظرہ کرنے میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے۔ جیدر آبادی دکن میں قاضی القضا رہے۔ ”رد تقویۃ الایمان“ کتاب بڑی کاوش و جستجو سے لکھی، جس کے آخر میں ”مراط المستقیم“ کتاب کے بارے میں علمائے دہلی و مکھنؤ کے فتوے بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۳ء میں لکھی گئی۔
- ۲۲۔ مولانا سید معین الدین رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) سجادہ نشین احمد آباد نارہ نے وہابیہ کے رد میں ”ہدایت المومنین الی سلسلۃ الصالحین“ کے نام سے کتاب لکھی اور اُسے مطبع نوکشتور لکھنؤ سے ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۹ء میں شائع

کروایا گیا۔

۲۳۔ مولانا محی الدین بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۴ء) نے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل اپنے والد ماجد مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) سے کی اور اپنے جد امجد مولانا عبد المجید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶ء) سے شرف ارادت حاصل کیا۔ مولانا فضل رسول بدایونی کی کتاب ”احقاقِ حق“ کا کسی دہائی نے ”سراج الایمان“ کے نام سے جواب لکھا تھا۔ آپ نے اُس ”سراج الایمان“ نامی کتاب کا قلم توڑ جواب ”شمس الایمان“ کے نام سے لکھا اور ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۴۹ء میں اُردو اخبار پریس دہلی سے شائع کروایا۔

۲۴۔ مولانا تقی علی خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۸۰ء) جو امام اہلسنت، مجدد مائتہ حاضرہ، مولانا احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۲۱ء) کے والد ماجد ہیں، آپ نے تقویۃ الایمان کے رد میں ”تزکیۃ الایقان فی سادۃ تقویۃ الایمان“ کتاب لکھی۔ آپ کے زمانہ میں حنفیت کا دعویٰ کرنیوالے دہائیوں کا ظہور ہو چکا تھا، اُن کے رد میں متعدد کتابیں لکھ کر مذہب اہلسنت کا دفاع کیا۔ تین چیزیں آپ کی تصانیف میں بہت نمایاں ہیں: (۱) درسِ عشقِ رسول، (۲) مذہب اہلسنت و جماعت کا دفاع، (۳) بد مذہبوں کا رد، خصوصاً دیوبندیوں اور نیچروں کی تخریب کاری کا سبب۔

۲۵۔ مولانا فاضل ارتضاعلی خاں گوپاموی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء) اور بقول بعض ۱۲۷۰ھ/ ۱۸۵۳ء) نے جو مدراس کے قاضی القضاۃ تھے اور صدر اور ملا جلال وغیرہ کے حواشی اور شرح لکھ چکے تھے، اُنھوں نے ”خطبہ الحاقیہ“ کے نام سے دہائیہ کے رد میں کتاب لکھی۔

۲۶۔ مولانا سید بدر الدین جید آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے دہائیہ کے رد میں رسالہ ”احقاقِ الحق“ تصنیف کیا۔

۲۷۔ مولانا محمد عمر امپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء) نے دہائی عالم،

محمد رحیم بخش پنجابی کا رد کیا تھا۔ موصوف تقویۃ الایمان کے حامی تھے اور آپ نے اُن کے جملہ مغموم دلائل کے تار پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اس کے علاوہ مولوی محمد حسین بٹالوی، وکیل غیر مقلدان کے بارہ سوالات کا مسکت جواب دیتے ہوئے ایک رسالہ مرتب کیا جس کا نام ”عشرہ مبشرہ“ ہے۔ یہ کتاب اُن کے سحر علمی کی دلیل اور نہایت بلند پایہ ہے۔ ۱۲۹۸ھ/ ۱۸۸۰ء میں ریاض ہند پریس امرت سر میں طبع ہوئی۔ اول الذکر کتاب کا نام ”فتح الاسلام فی سرۃ اصفاء الاحلام“ ہے اور وہ ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۵ء میں نامی پریس کھنؤ سے طبع ہوئی تھی۔

۲۸۔ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء) نے مصنف تقویۃ الایمان کے رد میں ایک پر لطف کتاب ”فیوض ارواح القدس“ کے نام سے بھی لکھی تھی اور اُس میں یہ التزام کیا تھا کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کے عقائد و نظریات کو اُن کے خاندانی بزرگوں یعنی شاہ عبدالرحیم دہلوی (المتوفی ۱۱۳۱ھ/ ۱۷۱۸ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (المتوفی ۱۷۶۲ھ/ ۱۷۷۶ء) اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء) کے عقائد و نظریات کے خلاف ثابت کر کے دکھایا ہے۔

۲۹۔ مولانا ہدایت اللہ کھنوی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے رد میں ”سبیل النجاح فی تحصیل الفلاح“ کتاب لکھی۔

۳۰۔ مولانا قاضی محمد حسین کوئی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیہ کے رد میں ”ہدایت المسلمین الی طریق الحق والیقین“ کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۴۹ء میں ممبئی سے طبع ہوئی تھی۔

۳۱۔ مولانا شاہ عبدالحمید بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۶ء) جن کو شرف ارادت پونشاہ آل احمد مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۵ھ/ ۱۸۱۹ء) سے حاصل تھا۔ آپ کی بیعت کے واقعہ کو مولانا رحمن علی مرحوم نے تذکرہ علمائے ہند میں یوں بیان کیا ہے

”علم سے فراغ حاصل کرنے کے بعد مرشد کمال کا خیال پیدا ہوا اور ہر طرف شیخ کمال کی تلاش شروع کی۔ چونکہ بہت سے مشائخ وقت (کمال طور سے) شریعت کا اتباع نہیں کرتے تھے اس لیے اُس گروہ سے نفرت شروع ہو گئی۔ قسمت یاد تھی۔ خواب میں دیکھا کہ حضرت ہادی المصطفیٰ، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں جناب محبوب سبحانی، غوثِ صمدانی، شیخ عبدالقادر جیلانی۔ مخدوم الانام، کاننک گنج شکر شیخ فرید الدین نیز دوسرے اولیاء (رحمۃ اللہ علیہم) موجود ہیں۔ حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارہ سے جناب غوث الاعظم نے صاحب ترجمہ (مولوی عبدالمجید بدایونی) کا ہاتھ، شاہ آل احمد مارہروی کے ہاتھ میں دے دیا۔ جب وہ بیدار ہوئے تو مارہرہ کا راستہ لیا اور اپنے پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ زہد و تقویٰ اور اتباعِ شریعت کو کامل طور سے پایا، اُن کے مرید ہوئے، خلافت سے سرفراز ہوئے، اپنے مرشد سے ”عین الحق“ کا لقب پایا۔“

آپ مولانا شاہ فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (۱۲۸۹ھ/۱۸۷۲ء) جیسے نابغہ عصر کے والد ماجد اور حضرت آل رسول مارہروی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) جیسے گوہرِ یکتا کے استاد تھے۔ آپ نے بتدعین زمانہ کے رد میں ”رسالہ رد و مابہ“ تصنیف فرمایا تھا۔

۳۲۔ مولانا خضر الدین احمد آلہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی بانی وہابیت کی تردید میں ”رسالہ ازالة الشکوک والادھام بجواب تقویۃ الایمان“ شرح و بسط سے لکھا۔

۳۳۔ مولانا سید حیدر شاہ حنفی قادری رحمۃ اللہ علیہ متوطن کچھ جھوج المعروف پیر جھوج
مبتدعین جدید کے رد میں ”ذوالفقار الحیدریہ علی اعناق الوہابیہ“
کتاب لکھی۔

۳۴۔ علمائے دہلی و علمائے حرمین کے فتاویٰ کا مجموعہ بنام تنبیہ الضالین و ہدای
الصالحین جس میں مولوی محمد اسماعیل اور مولوی محمد اسحق دہلوی کے نجدی عقائد
خلاف اہلسنت مسائل کی تردید ہے۔

۳۵۔ مولانا سید جلال الدین برہان پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۳ھ/ ۱۸۵۶ء) کے شاگرد
شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۲۹ھ/ ۱۸۱۲ء) کے شاگرد
انہوں نے وہابیان ہند کے عقائد کی تردید میں رسالہ ”صاعقہ سراپہ در رد عقائد
وہابیہ“ لکھا، جو قلمی صورت میں موجود ہے۔

۳۶۔ مولانا حافظ محمد عبداللہ بگرامی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۵ھ/ ۱۸۸۸ء)۔ آپ
فضل حق خیر آبادی (المتوفی ۱۲۷۸ھ/ ۱۸۶۱ء) اور مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء) کے شاگرد تھے۔ مفتی شافعیہ و مدرس مدرسہ بیت المحرم
سید احمد دحلان رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۹ھ/ ۱۸۸۱ء) سے تفسیر، حدیث اور
کی سند حاصل کی۔ وہابیہ کے رد میں ”رسائل رد وہابیہ“ کتاب لکھی۔

۳۷۔ علمائے بریلی نے تقویۃ الایمان کے رد میں صحیح الایمان در رد تقویۃ الایمان
نام سے ایک متفقہ کتاب شائع کروائی۔

۳۸۔ مدراس کے پینتیس^{۲۵} علمائے اہلسنت نے تقویۃ الایمان کے عقائد و نظریات
غیر اسلامی اور کفریہ بتایا اور ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء میں وہ مجموعہ شائع ہوا۔
علمائے کرام نے اپنے فتووں میں ادلہ ثلاثہ سے ثابت کیا ہے کہ تقویۃ الایمان
عقائد و نظریات، اسلامی عقائد کے خلاف اور اشاعت کفر و خارجیت ہیں۔ جو
کتاب کو اسلامی سمجھیں اور اس کے پیش کردہ عقائد کو درست جانیں وہ اسلام
انحراف کرنے والے ہیں۔

۳۹۔ مولانا معین الحق رحمۃ اللہ علیہ پہلے دہائیوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے تھے۔ مطلع ہونے پر تقویۃ الایمان اور صراط المستقیم کے رد میں رسالہ ”جواہر منظومہ“ لکھا، جو مطبع جعفریہ سے ۱۲۶۶ھ/۱۸۵۹ء میں طبع ہوا۔

۴۰۔ علمائے حیدرآباد دکن نے تقویۃ الایمان کے غیر اسلامی نظریات کا رد کرتے ہوئے اپنے فتوؤں کا ایک مجموعہ ”رد تقویۃ الایمان“ کے نام سے شائع کروایا۔

۴۱۔ مولانا سید ابوالسعود مفتی مدینہ منورہ رحمۃ اللہ علیہ کی مہری دستخطی تصدیق کے ساتھ دہا بیان ہند کے رد میں اور ان کے متعلق شرعی حکم بیان کرتے ہوئے علمائے حرمین شریفین کے فتاویٰ کا مجموعہ ”فتویٰ حرمین شریفین“ کے نام سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع ہوا۔ اس میں تقویۃ الایمان اور اس کے مصنف کا رد ہے۔

۴۲۔ مولانا فیض اللہ رحمۃ اللہ علیہ پنجابی نے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں مصنف تقویۃ الایمان کے رد میں ”طریقۃ المسلمین“، مذہب سینہ رد دہا بیہ“ بمبئی سے شائع کروایا۔

۴۳۔ مولانا جمال الدین فرنگی محلی ثم مدرسی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۶ھ/۱۸۵۹ء) نے جدید فرقہ دہا بی اور ان کے تقویۃ الایمانی نظریات کے رد میں ایک کتاب ”جمال الدین والدین“ کے نام سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں بمبئی سے شائع کروائی۔ آپ نے قلف درسی کتب پر حواشی لکھے اور نواب غلام غوث خاں، رئیس کرنامک کے آپ اسناد تھے۔ تبحر علمی اور سخاوت میں مشہور تھے۔

۴۴۔ مولانا احمد علی خلیفہ شیخ عبدالغفور عرف حضرت اخوند رحمۃ اللہ علیہ نے دہا بیوں کے رد میں ایک عربی کتاب ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۵ء میں مطبع حیدری بمبئی سے بنام ”برہان المؤمنین علی عقائد المضلین“ شائع کروائی۔

۴۵۔ مولانا عبدالسبحان پشاور مدرسی رحمۃ اللہ علیہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں علمائے حرمین شریفین سے فتوے حاصل کیے۔ آپ نے ان کا مجموعہ مع اردو ترجمہ مطبع ہاشمی مدراس سے ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء میں شائع کروایا۔

۴۶۔ مولانا محمد عبدالسبحان احمد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۵ء) نے

وہابیوں کے رد میں دلائل قاطعہ و تحقیق فرقہ ناجیہ، خیر المقالہ فی ازالۃ الجہار اور التہدید فی وجوب التقلید وغیرہ کتب و رسائل لکھے۔

۴۷۔ علمائے قاہرہ و مصر نے ہندوستانی زندیقوں کے بارے میں حکم شرع بیان کرتے ہوئے فتوے جاری کیے، ان کا مجموعہ بنام ”رسالہ زندیقیہ“ بمبئی سے شائع ہوا۔

۴۸۔ مولانا محمد عمر امپوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۶۸ء) نے وہابیہ کے رد میں ”سجوماً للشیاطین و دافع وساوس الخناس“ لکھا، جو ۱۳۰۱ھ/ ۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔

۴۹۔ مولانا عبد الرحمن سلطی رحمۃ اللہ علیہ نے وہابیوں کے رد میں ”سیف الابرار علی الکفار“ کے نام سے ایک کتاب ۱۳۰۰ھ/ ۱۸۸۲ء میں مطبع نظامی کانپور سے شائع کروائی۔

۵۰۔ مولانا جلال الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بتہ عین ہند کے رد میں ”شواہد الحق“ لکھی اور ۱۳۰۲ھ/ ۱۸۸۴ء میں چھپی۔

۵۱۔ مولانا مخلص الرحمن چاٹگامی علیہ الرحمہ نے تقویۃ الایمان کے رد میں ”شرح الصدور فی دفع الشرود“ کتاب لکھی۔

۵۲۔ مولانا سید لطیف الحق بن مولانا سید خلیل الحق قادری بتالوی رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کو خارجیت کے شر سے بچانے کی غرض سے ”صلاح المومنین فی قطع الخارجین“ کتاب لکھی، جو قلمی نسخہ کی صورت میں موجود ہے۔

۵۳۔ مولانا محمد عبداللہ سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مسئلہ شفاعت و استدراود تصرف میں تقویۃ الایمانی نظریے کا بالغ رد کرتے ہوئے کتاب ”تحفۃ المسلمین فی حیات المرسلین“ لکھی۔ یہ بھی قلمی موجود ہے۔

۵۴۔ مولانا معلم ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ/ ۱۸۶۶ء) خطیب جامعہ بمبئی نے نجدی عقائد کی روک تھام کے پیش نظر کتاب ”نعم الانبیاہ“ لکھی۔

۵۵۔ مولانا خیر الدین مدراسی رحمۃ اللہ علیہ نے دہلیہ کی تردید میں ”خیر الزاد لیوم الميعاد“ نامی کتاب لکھی۔

۵۶۔ مولانا خادم احمد فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۶۱ھ / ۱۸۵۵ء)۔ آپ شرح وقایہ کے شارح بھی ہیں۔ انھوں نے منکرین تقلید کے رد میں ”ہدایت الانام فی اثبات تقلید الاسماء الکرام“ کتاب لکھی۔

۵۷۔ مولانا سلامت اللہ بدایونی کان پوری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۸۱ھ / ۱۸۶۴ء)۔

آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) اور شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہما کے نامور شاگرد تھے۔ موصوف کو ان بزرگوں سے تفسیر و حدیث اور خاندان ولی اللہ کی اکثر تصانیف کی سند و اجازت حاصل تھی۔ انھوں نے دہلیہ بیان ہند کے رد میں رسالہ ”انساب الکلام فی اثبات المولد والقیام“ اور رسالہ ”در تحقیق جواز مصافحہ و معاقتہ عیدین“ لکھا۔ آپ ایک متبحر عالم دین اور سیکڑوں علماء و فضلاء دہر کے استاد ہو گزرے ہیں۔

۵۸۔ مولانا عبدالقادر بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۱ء)۔ آپ اہلسنت

کے بانیہ ناز عالم دین و بزرگ مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) کے فرزند ارجمند اور امام معقولات و جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے مجاہد اعظم و ناشر فتویٰ جماد، اسیرانڈمان، حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے بانیہ ناز اور سرمایہ روزگار شاگرد ہو گزرے ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی سرپرستی میں جب ندوۃ العلماء کی تحریک کا پتہ چلایا گیا تو آپ نے سرگرمی سے اس کی مخالفت کی۔ دہلیہ کے رد میں ”احسن الکلام فی تحقیق عقائد الاسلام (دعویٰ)، سیف الاسلام

السلول علی المناسع بعمل المولد والقیام (فارسی)، حقیقۃ الشفاعہ اور شفاعہ السائل وغیرہ کتب و رسائل آپ کے تبحر علمی اور حق پسندی کے روشن دلائل ہیں۔

۵۹۔ ثواب قطب الدین خاں دہلوی (متوفی ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۲ء)۔ آپ نے مشکوٰۃ

المصباح کی اردو میں ”مظاہر حق“ کے نام سے شرح لکھی۔ آپ نے غیر متقدمین کے رد میں
 ”توفیر الحق“، ”توفیر الحق اور تحفة العرب والعجم“ وغیرہ رسائل لکھے۔ انتقال تک معظمہ میں
 ہوا تھا۔ آپ غیر متقدمین کے خلاف اور مقلد و یا بنی تھے۔

۶۰۔ مولانا محمد حیات سندھی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۹ء) نے عالم جوانی میں
 مدینہ منورہ کی سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہیں وہاں یہ کے رد میں رسالہ ”حیات النبی“
 عربی زبان میں لکھا تھا۔

۶۱۔ مولانا مفتی ولی اللہ فرخ آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۴۹ھ / ۱۸۳۲ء)۔ فاضل
 اور مفتی قرآن تھے۔ وہاں یہ کے رد میں ”حزب التوسل الی جناب سید الانبیاء
 والمرسل“ کتاب لکھی۔

۶۲۔ مولانا مفتی ارشد حسین رام پوری نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۱۱ھ / ۱۹۹۳ء)
 اہل علم میں آپ کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ سرگروہ غیر مقلدان، میاں نذیر حسین
 (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) کی کتاب ”معیار الحق“ کا ایسا وسیع النظری
 فاضلانہ رد ”انتصار الحق“ کے نام سے لکھا کہ کسی غیر مقلد کو انتصار الحق کا جوار
 لکھنے کی آج تک جرأت نہیں ہوئی۔ اس کتاب کے ۴۱۶ صفحات ہیں۔

۶۳۔ مولانا وکیل احمد سکندر پوری رحمۃ اللہ علیہ مشہور عالم دین اور صاحب تصانیف
 کثیرہ ہیں۔ ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۶ء سے حیدرآباد دکن، سرکار آصفیہ کی ملازمت
 رہے۔ وہاں یہ کے رد میں ”ارشاد العنود الی طریق آداب عمل المولود“ نام
 کتاب لکھی۔

۶۴۔ مولانا محمد شوکت علی صدیقی سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ مشہور عالم اور بزرگ
 ہیں۔ انھوں نے مولوی محمد اسحاق دہلوی کی مائتہ مسائل کے غلط دلائل و مسائل
 راز کھولنے اور ان کی خفیہ و یا بیت کاراز افشاء کرنے کی غرض سے ”افہام
 بجاوب مائتہ مسائل“ لکھی اور ”علم الیقین فی مسائل الاربعین“ بھی آپ کی تصانیف
 تصنیف ہے۔

۶۵۔ مولانا عبد الکریم درویش رحمۃ اللہ علیہ نے شفاعت کے بارے میں تقویۃ الایمانی نظر تہی

کے رد میں بنام ”جوہر الایقان فی شفاعۃ رسول الانس والجان“ تصنیف فرمائی۔

۶۶۔ مولانا حیدر علی رام پوری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۶ء) - آپ نے

شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) سے

حدیث کی سند حاصل کی۔ وہابیہ کے رد میں ”افہام الغافل در تفہیم المسائل کتاب لکھی۔

۶۷۔ مولانا عبد الغفور خاں نساج رحمۃ اللہ علیہ نے نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی

(المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) وغیرہ غیر مقلدین کے رد میں ”نصرۃ المسلمین، الرد

علی غیر المقلدین“ کے نام سے کتاب لکھی جو ۱۲۸۶ھ / ۱۸۶۹ء میں مطبع حامی الاسلام

دہلی سے باہتمام فیض الحسن خان صاحب طبع ہوئی۔

۶۸۔ مولانا صبغۃ اللہ مدرسی رحمۃ اللہ علیہ نے مکین حیات انبیاء کے رد میں ”تنبیہ الانبیاء

فی حیات الانبیاء“ نامی کتاب لکھ کر ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء میں مدراس سے شائع کرائی۔

۶۹۔ مولانا بشیر الدین دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مقلد وغیر مقلد وہابیوں کی گمراہی و گمراہ گری

کے بارے میں ایک فتویٰ لکھا اور تمام علمائے دہلی نے اُس کی تائید و تصدیق میں

مہر و دستخط کیے۔ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ازراہ تفتیہ اور ان دنوں اپنی جماعت کا

وجود و عدم برابر دیکھتے ہوئے غیر مقلدوں کے شیخ الکل اور سرپرست میاں ندیر حسین

دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) نے بھی اس فتویٰ کی تائید کرتے ہوئے

مہر و دستخط کیے ہوئے ہیں۔ یہ مبارک فتویٰ مطبع سید الاخبار سے ۱۲۶۲ھ /

۱۸۴۶ء میں طبع ہوا۔

۷۰۔ مولانا محمد شاہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے میاں ندیر حسین دہلوی کی کتاب ”معیار الحق“

کے رد میں مبسوط کتاب ”مدار الحق فی رد معیار الحق“ لکھی، جو مطبع حسنی دہلی

سے ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں طبع ہوئی۔ صفحات ۴۸۸ ہیں۔

۷۱۔ مولانا منصور علی بن مولانا محمد حسن مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے غیر مقلدین کے

رد میں ”فتح المبین فی کشف مکائد غیر مقلدین“ کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی

- اور اس کا ضخیمہ تنبیہ الومابین کے نام سے لکھا۔ کتاب ۵۲۴ صفحات پر مشتمل ہے۔
 اس پر دہلی، حیدر آباد اور بریلی کے ۳۳ علمائے کرام کے دستخط ہیں۔ ۱۳۰۱ھ/۱۹۸۳ء
 میں یہ کتاب مطبع دارالعلوم فرنگی محل لکھنؤ سے باہتمام مولانا محمد یعقوب طبع ہوئی۔
- ۷۲۔ مولانا محمد امیر الدین اکبر آبادی علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کے بہتر سوالات کے مسکت
 جواب ’انوار محمدی‘ کے نام سے لکھے اور وہ کتاب مطبع نرگشور لکھنؤ سے ۱۲۹۲ھ/
- ۷۵ء میں طبع ہوئی۔
- ۷۳۔ مولانا حافظ محمد یعقوب دہلوی علیہ الرحمہ نے مسئلہ شفاعت میں دوا بیہ کے نظریات کا
 رد کرتے ہوئے کتاب ”افضل البضاعة فی حقیقة الشفاعة“ لکھی۔
- ۷۴۔ مولانا محمد عظیم علیہ الرحمہ نے غیر مقلدین کی فہمائش کے لیے ”اثبات وجوب تقلید
 شخصی بالقرآن والاحادیث النبوی“ کے نام سے ایک کتاب لکھی جو احسن المطابع پٹنہ
 سے ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں چھپی۔
- ۷۵۔ مولانا محمد عبدالرشید بن مولانا محمد عبدالحکیم دہلوی رحمۃ اللہ علیہا نے منکرین تقلید کے رد
 میں ’القول الرشید فی اثبات التقلید‘ کتاب لکھی جو مطبع احمد قلندر معسکر بنگلور سے
 ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں چھپی۔
- ۷۶۔ مولانا محمد مجید الدین سہارن پوری علیہ الرحمہ نے دوا بیہ کے رد میں ”اعانة المسلمین
 امور الدین“ کتاب لکھی۔
- ۷۷۔ مولانا زین الدین حنفی مدراسی علیہ الرحمہ نے ”القول التین“ کتاب لکھ کر دوا بیہ
 رد کیا اور اسے مطبع منظر العجائب مدراس سے ۱۳۰۰ھ/۱۸۸۲ء میں طبع کروایا۔
- ۷۸۔ مولانا قادر علی قادری پوری رحمۃ اللہ علیہ نے ”دلیل الیقین فی رد المنکرین“ کتاب دوا بیہ
 رد میں لکھی۔ یہ مطبع قادریہ کلکتہ سے ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۴ء میں طبع ہوئی۔
- ۷۹۔ مولانا احمد حسن کان پوری رحمۃ اللہ علیہ۔ آپ حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ
 والد متوفی ۱۳۱۷ھ/۱۸۹۹ء کے اجل خلفاء میں سے ہیں۔ مولوی محمد اسمعیل دہلوی
 تقویۃ الایمان میں کنایت اور یکہ وزی میں صراحت جو امکان کذب کا غیر اسلامی

خلافت اسلام نظر پر مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اُس کے رد میں اور جملہ حمایت کرنے والوں کی تردید کرتے ہوئے کتاب "تذیہ الرحمن عن ثنائیۃ الکذب النقصان" لکھی۔

۸۰۔ مولانا عبد السبحان ہسوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۶ء) - آپ حضرت شاہ احمد سعید مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۶۰ھ / ۱۸۶۰ء) کے خلیفہ تھے۔ مکبرین تعلید کے رد میں ایک کتاب "النہد فی وجوب التعلید" کے نام سے لکھی۔

اسی طرح دیگر کتے ہی علمائے اہلسنت اور عمائدین وقت نے وہابیہ کی تردید میں مختلف کتب و رسائل لکھے اور "گربختن روز اول" پر عمل کرتے ہوئے اس نجدی پودے کو پروان چڑھنے سے پہلے بیخ و بن سے اُکھاڑ پھینکنے پر تلی گئے، تقریر و تحریر کے ہر میدان میں ان کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا۔ خود ولی اللہی خاندان کے علمائے کرام اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) کے خوشہ چین حضرات یعنی علی و روحانی فرزندانوں نے بڑھ چڑھ کر ان خارجیت کے علمبرداروں کا محاسبہ کرنا شروع کر دیا تو مصنفِ تقویۃ الایمان کا رشتہ اپنے خاندان اور دہلی مرکز سے ٹوٹ کر رہ گیا۔ تبصین بھی ٹوٹے شروع ہو گئے، مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے کٹ کر جو اپنا "محمدی گروہ" بنانا شروع کیا تھا، بہت سے مسلمان خبردار ہونے پر اس سے علیحدگی اختیار کرنے لگے اور اس طرح برٹش گورنمنٹ کا پہلا تحریری منصوبہ ناکام ہو کر رہ گیا۔

دوسرے منصوبے کے دوران، مولوی محبوب علی کی دیوبندیت کی ابتدا: اس تحریک سے علیحدگی بلکہ مخالفت کے بعد جب سید احمد صاحب کے پاس امدادی سامان و رقوم کی ترسیل کا سلسلہ اور نئی بھرتی کر کے افزادی امداد بھیجنے کا معاملہ تقریباً بند ہو کر رہ گیا، تو مرکز سے تعلق قائم کرنے کی کوشش کی گئی، ادھر مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ / ۱۸۴۵ء) جانشین شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء) بھی دولت کی ادھر فراوانی دیکھ کر کسی قدر مائل ہو چکے تھے، لہذا جلد ہی ان کے ساتھ رابطہ قائم ہو گیا یا قائم کر دیا گیا۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی بڑی حد تک صلح کل اور خاموش طبع عالم تھے۔ اس خارجی ٹولے کے ساتھ بھی

کسی قدر ہاں میں ہاں ملائی شروع کر دی لیکن ایسے انداز میں کہ وہابیوں کی جو رسوائی ہو رہی تھی اُس سے بچنا اور علمائے اہلسنت کی نگاہوں میں اپنا وقار بھی بحال رکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ تقویۃ الایمان میں جن امور کو کفر و شرک ٹھہرایا گیا ہے۔ آپ نے اپنی تصنیف "ماتہ مسائل" میں، اُن میں سے بعض باتوں کو حرام اور بعض کو ناجائز یا مکروہ لکھا ہے موصوف کی یہ دو غلطی پالیسی بھی اُن کے وقار کو قائم رکھنے میں کارگر ثابت نہ ہو سکی۔ علمائے اہلسنت کی نگاہوں میں وہ گرنے شروع ہو گئے تو شرمندگی سے بچنے کی خاطر ۱۲۵ھ/ ۱۸۴۱ء میں حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے۔ موصوف کی اس دو غلطی روش کے بارے میں جناب ابوالکلام آزاد نے یوں وضاحت پیش کی ہے:

"اُنھوں (مولانا ابوالکلام کے والد مولانا خیر الدین) نے وہابیت کو دو اصولی قسموں میں بانٹ دیا تھا۔ کہتے تھے، دو فرقے ہیں، ایک اسمعیلیہ ہے دوسرا اسماعیہ۔ اسمعیلیہ سے مقصود وہ فرقہ تھا جو رسوم و بدعات کی مخالفت کے ساتھ تقلید شخصی کا بھی تارک (یعنی غیر مقلد وہابی) ہو، جیسا کہ مولانا اسماعیل شہید نے تقویۃ الایمان اور جلاء العینین وغیرہ میں لکھا ہے۔

اسماعیہ سے مقصود وہ فرقہ ہے، جو حنفیت و تقلید سے تو انکار نہیں کرتا لیکن بدعات و رسوم کا مخالفت (مقلد وہابی) ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ یہ تھی کہ شاہ اسماعیل نے ماتہ مسائل میں بدعات و رسوم سے اختلاف کیا ہے مگر تقلید و حنفیت کے خلاف کوئی بات نہیں کہی ہے۔ وہ (مولانا خیر الدین جالندھری) کہتے تھے کہ جب اسمعیلیہ غیر مقبول ہو گئی تو وہابیت نے اپنے مکائد کی اشاعت کے لیے راہِ تقیہ اختیار کر لی اور حنفیت کی اڑ قائم کر کے اپنے دیگر عقائد کی اشاعت کرنے لگے۔"

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۵ء) اصل میں اُس وہابی گروہ کے

بانی ہیں جو مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت یعنی محمدی یا موحّدیا المحدث جماعت کے
 نام پر جانے کے بعد پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہا بیت کے لیل سے بچنے اور سُنّیوں
 میں ہرم رکھنے کی خاطر موصوف ہجرت کر گئے اور جاتے وقت اپنے نئے گروہ کے مفادات کا
 تحفظ کرنے کی خاطر مولوی ملک علی نانوتوی کی قیادت میں ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے۔
 پروفیسر محمد ایوب قادری نے اس امر کا تذکرہ یوں کیا ہے :

”مولانا عبید اللہ سندھی کا خیال ہے کہ جب ۱۲۵۷ھ میں شاہ اسحاق جہاز مقدس
 کو ہجرت کر گئے تو تحریک (ماڈرن وہا بیت) کی نگرانی کے لیے ایک بورڈ
 بنایا گیا، جس کے صدر مولانا ملک علی اور تین رکن، مولانا اب قطب الدین
 (ف ۱۲۸۹ھ)، مولانا منظر حسین کاندھلوی (ف ۱۰ محرم ۱۲۸۳ھ)،
 م ۱۵ مئی ۱۸۶۶) اور مولانا شاہ عبدالغنی دہلوی (ف ۶ محرم ۱۲۹۵ھ)
 تھے۔“

مولانا عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ / ۲۱۹ م ۱۹۴۲) کے اس سلسلے میں جو
 تاثرات تھے، بہتر یہی نظر آتا ہے کہ انہیں خود مولانا سندھی کے لفظوں میں ہی بیان
 کر دیا جائے۔ چنانچہ موصوف یوں وضاحت کرتے ہیں :

”مولانا محمد اسحاق مکہ معظمہ میں اپنے بھائی مولانا محمد یعقوب دہلوی کو اپنے
 ساتھ لے گئے اور دہلی میں مولانا ملک علی کی صدارت میں مولانا قطب الدین
 دہلوی اور مولانا منظر حسین کاندھلوی اور مولانا عبدالغنی دہلوی کو ملا کر
 ایک بورڈ بنادیا، جو اس نئے پروگرام (یعنی وہا بیت کی جدید تشکیل) کی
 اشاعت کر کے نئے سرے سے جماعتی نظام پیدا کرے اور یہی جماعت
 ہے جو آگے چل کر دیوبندی نظام چلاتی ہے۔“

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۷۸
 ۲۔ عبید اللہ سندھی، مولوی، شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۰

مولوی ملک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء)

اینگلو انڈین علماء کی کھیپ : جو دہلیوں کی نئی جماعت کے سرپرست مقرر کیے گئے تھے۔ وہ دہلی کالج میں شعبہ عربی کے صدر مدرس تھے۔ تجویز یہی ہوئی ہوگی کہ جماعت میں عام لوگوں کی باقاعدہ بھرتی کرنے سے پہلے ایسے علماء تیار کیے جائیں، جو گورنمنٹ کے پروردہ اور دہلیت جدیدہ کے دلدادہ ہوں۔ چنانچہ خاموشی اور مستعدی سے اینگلو انڈین علماء کی کھیپ دہلی کالج میں تیار کی جانے لگی۔ مولوی مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں :

”نانوتہ کے لیے تعلیمی راہ کا دروازہ مولانا ملک علی رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے کھل چکا تھا۔ وہ دہلی میں مقیم تھے اور دہلی کی سب سے بڑی مرکزی درسگاہ دہلی کالج کے استاد تھے۔ نہ صرف نانوتہ بلکہ عثمانی شیوخ کی برادری اطراف و جوانب کے جن قصبات میں پھیلی ہوئی تھی وہاں تک کے بچے مولانا ملک علی کے ان خاص حالات سے کافی استفادہ کر رہے تھے۔“

دہلی کالج سے جس قسم کے علماء کی کھیپ تیار کی جا رہی تھی، وہ گورنمنٹ کے منظور بن کر نکلتے تھے اور وہی انگریز جو مسلمانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھانے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، وہ اس کالج کے تیار کردہ علماء کو روڑ کر سینے سے لگاتے اور جلد از جلد انھیں برسرِ روزگار کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ قادری صاحب رقمطراز ہیں :

”مولانا ملک علی دہلی کالج کے شعبہ عربی کے صدر مدرس تھے اس لیے نانوتہ اور دیوبند کے حضرات ان کی وجہ سے کالج کے تعلیمی وظائف اور دوسری سہولتوں سے بھی مستفید ہوئے ہوں گے اور دہلی کالج کے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے سرکاری اداروں میں منسلک ہونے میں بھی آسانی رہی ہوگی۔ بلکہ ان حضرات کے سرکاری اداروں میں تقرر کے لیے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کو بھی ایک قسم کی سند خیال کیا گیا اور یہ سمجھا

گیا ہوگا کہ یہ حضرات دہلی کالج کے ذریعے طریقہ تعلیم وغیرہ سے واقف ہو چکے ہیں، ورنہ اتنی آسانی سے قدیم طرز کے فارغ التحصیل علماء کو گورنمنٹ، سرکاری اسکولوں، کالجوں اور محکمہ تعلیم کے ذمہ اراحدوں پر مقرر نہیں کر سکتی تھی۔“ لے

زمانے کی نیرنگیاں عجیب ہیں، ایک وقت تھا کہ مولوی ملک علی نانوتوی اہلسنت و جماعت میں شامل تھے اور ہندی و ماہیت کے سنگ بنیاد یعنی تقویۃ الایمان کو تقویۃ الایمان (ایمان کو ختم کرنے والی کتاب) کہا کرتے تھے لیکن ایک وہ وقت آیا کہ وہاں کے جدید بیڑے کا امیر البحر بننا بھی منظور کر لیا۔ مولوی ملک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۶ھ/ ۱۸۵۱ء) نے مطلوبہ علماء کی جو کھپ تیار کی ان میں سے چند حضرات کے نام یہ ہیں:

”مولانا ملک علی کے تلامذہ کی تعداد کا استحضار ناممکن ہے۔ ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے علماء مثل مولانا مظہر نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا محمد منیر نانوتوی، مولانا محمد فاسم نانوتوی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا احمد علی سہارنپوری، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمن دیوبندی، مولوی کریم الدین پانی پتی، منشی جمال الدین مدار المہام بھوپال، شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، مولوی عالم علی مراد آبادی (ت ۱۲۹۵ھ/ ۱۸۷۸ء)، مولوی سمیع اللہ دہلوی، مولانا عبد الرحمن پانی پتی وغیرہ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔“ لے

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت، جو آجکل اہلحدیث کے نام سے متعارف ہے جب متحدہ ہندوستان میں غیر مقبول ہو کر راندی گئی تو مولوی ملک علی کی سرپرستی میں دوسری جماعت بنانے کی سکیم تیار کی گئی پہلے اس کے چلانے والے علماء تیار کیے گئے،

لے محمد ایوب قادری، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۲۷

لے محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۸۲

اس کے بعد برٹش گورنمنٹ نے اپنے اُن منظورِ نظر علماء کو کس طرح اور کہاں کہاں مسلمانوں پر مسلط کیا، ایک دہلی کالج کی کتنی برانچیں اور ذیلی شاخیں قائم کی گئیں، اس سلسلے میں شیخ دیوبندی عالم، مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۴ء) یوں رقمطراز ہیں:

”۱۸۵۷ء میں اس جماعت کی مرکزی قوت میں سلطانِ دہلی کی طرفداری اور غیر جانبداری کی بنا پر ایک اختلاف رونما ہوا اور یہ جماعت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بعد میں اس جماعت کے دہلی کے ایک مرکز کی بجائے دیوبند اور علی گڑھ دو مرکز بن گئے۔ مولانا محمد قاسم، دہلی کالج کے عربی عرصہ کو دیوبند لے گئے اور سر سید احمد خاں نے کالج کے انگریزی حصہ کو علی گڑھ پہنچا دیا۔“

نئے مراکز یعنی دیوبند اور علی گڑھ کا برٹش گورنمنٹ کے بارے میں کیا نظریہ تھا، مولوی عبدالحق قدوسی کی زبانی سنیں:

”دل کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے بظاہر علی گڑھ فریق اور دیوبندی جماعت گورنمنٹ کے معاملہ میں قدم سے قدم ملاتے نظر آتے ہیں۔ دونوں کا مقصد علمی میدان میں مسلمان قوم کو آگے بڑھانا ہے۔ حصولِ مقصد کے لیے انگریز سے کامل وفاداری کو دونوں ہی ذریعہ سمجھتے ہیں۔“

بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ مسلمانانِ پاک و ہند میں سے سرکاری تعلیم حاصل کرنے والوں کو علی گڑھ میں تربیت دینے اور دینی علوم سے دلچسپی رکھنے والوں کو مدرسہ دیوبند میں مخصوص انداز پر ڈھالنے کی مہم چلائی گئی۔ بعض وہ مسلمان تھے جو دہلی کالج کی انگریزی تعلیمات سے کتراتے تھے تو دوسرے دینی علوم سے جان بچاتے تھے، دونوں قسم کے حضرات کو پابندِ سلاسل رکھنے کی خاطر ایک مرکز کے علیحدہ علیحدہ مرکز بنا دیے گئے۔ جہاں تک مفاد کا تعلق ہے وہ قطعی طور پر واضح ہے کہ حکومت

لے عبید اللہ سندھی، مولوی: شاہ ولی اللہ اور اُن کی سیاسی تحریک، ص ۱۱۲

لے ہفت روزہ الاعتصام، لاہور۔ بابت ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

زبان برداری کرنے اور اس طرح حکومت کا اعتماد حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ مراعات و عنایات کی بھیک مانگ کر پھینے پھولنے کے مواقع حاصل کرنا تھا اور قوم کے انگریزی خوان یا مولیانہ ذہن رکھنے والوں کو اسی غلامانہ ذہنیت کی افیون کھلا کر اپنے اپنے دائرہ کاری میں کھل کھینے کے مواقع فراہم کرنے تھے۔ دونوں مراکز کے راستے الگ الگ لیکن منزل مقصود ایک تھی۔

انسانی فطرت کی یہ کمزوری کون سی ڈھکی چھپی بات ہے کہ وہ کوئی غلط اقدام کرے یا ایسا کرنے پر مجبور کیا جائے تو بسا اوقات وہ تاویلات کا سہارا لیتا ہے اور اس غلط حرکت کو درست منوانے کی اس انداز سے سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ گویا دوسروں کا اس کی صحت پر ایمان لانا ہی اولین فریضہ اور ان کا مقصد حیات ہو۔ اس مرحلے پر خواہ زاویہ نظر کتنا ہی خلافِ دین و دیانت ہو جائے اس کی کم ہی پروا کی جاتی ہے۔ ایسے واقعات کا مظاہرہ اگر ایک فرد سے سرزد ہو اس کی سنگینی کا عالم اور ہے لیکن یہی طرزِ عمل اگر جماعتی طور پر اختیار کر لیا جائے تو اس کی مضرت کا ایسے حالات میں اندازہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ دہلی کالج کو علی گڑھ اور دیوبند کے مراکز میں تبدیل کرنے کی وجہ بالکل صاف اور سیدھی سادی بات تھی لیکن حالات کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ افسانہ نویسی میں بات کہاں سے کہاں جا پہنچتی ہے۔ مدرسہ دیوبند کے موجودہ مہتمم قاری محمد طیب صاحب فرماتے ہیں :

”اچانک چند نفوسِ قدسیہ نے بالہامِ خداوندی اپنے دل میں ایک خلش اور کسک محسوس کی۔ یہ خلش علومِ نبوت کے تحفظ، دین کو بچانے اور اس کے راستے سے ستم رسیدہ مسلمانوں کو بچانے کی تھی۔ وقت کے یہ اولیاء اللہ (چشمِ بدور) ایک جگہ جمع ہوئے اور اس بارہ میں اپنی اپنی قلبی واردات کا تذکرہ کیا جو اس پر مجتمع تھیں“ ۱

موصوف اسی سلسلے میں مزید یوں وضاحت فرماتے اور قارئین کو خواب آور گولیاں کھلاتے ہیں :

”اس سے جہاں یہ واضح ہے کہ اُس وقت کے ہندوستان میں یہ تجویز کوئی رسمی تجویز نہ تھی بلکہ الہامی تھی، وہیں یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اس تجویز کے پرہ میں ملک گیر اصلاح کی سپرٹ چھپی ہوئی تھی۔“ لہ

اگر انبیائے کرام کے علوم و معارف کا ذکر آجائے تو علمائے دیوبند کی برداشت کا پیمانہ نہ صرف لبریز ہو جاتا ہے بلکہ اکثر اوقات اس طرح چھٹک اٹھتا ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر کفر و شرک کا فتویٰ بڑ دینا گویا تکیہ کلام بن جاتا ہے۔ لیکن یہی حضرات جب اپنے مولویوں کا ذکر کرتے ہیں تو سننے اور پڑھنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ جو دروازے ان کے بقول انبیائے کرام پر بھی بند تھے وہ علمائے دیوبند کے لیے کس طرح اور کس نے کھول دیے؟ اور پھر وہ غلط محسوس کیے بغیر نہیں رہتا کہ جن باتوں کے حصول کا یہ حضرات انبیائے کرام تک کے انکار کرتے ہیں، وہی باتیں اپنے علماء کے لیے کیوں ثابت کرتے رہتے ہیں؟ آخر یہ اپنے علماء کا مقام انبیائے کرام سے بھی اونچا دکھانے میں کیوں کوشاں رہتے ہیں؟ آئیے، قارئین محترم صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمائیے:

”حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی دیوبند سے گزرتے ہوئے جب اُس مقام پر پہنچے تھے، جہاں دارالعلوم کی عمارت کھڑی ہوئی ہے تو فرمایا تھا کہ مجھے اس جگہ سے علم کی بو آتی ہے۔“ لہ

جب مدرسہ دیوبند کی بنیاد رکھی گئی تو جھونپڑیوں میں کام شروع کیا گیا تھا۔ ذرا ابلاغ کی ہمہ گیری نے آج تو اعلان اور پروپیگنڈے کے انداز ہی بدل دیے۔ لیکن جب ذرائع حاصل نہ تھے اُس وقت بھی آخر تبلیغ اور پروپیگنڈے کے پسندیدہ طریقے مروج نہ تھے۔ نگہ کارِ سنان دارالعلوم دیوبند نے اُس وقت بھی اپنے پروپیگنڈے کی بنیاد کشف و کرام پر رکھی جو وہابیت و دیوبندیت کی ضد ہے۔ چنانچہ مفتی عزیز الرحمن ٹھٹھوری لکھتے ہیں کہ:

”جس وقت دیوبند کے مدرسہ میں چھپر پڑے ہوئے تھے، آپ (مولانا محمد یعقوب صاحب) نے خواب میں دیکھا کہ جنت میں مکان کچے ہیں اور اُن پر چھپر پڑے ہیں۔ جب بیدار ہوئے تو فرمایا کہ الحمد للہ، مدرسہ کے یہ مکانات مقبول ہیں۔“

مدرسہ دیوبند کے قائم کرنے کی ضرورت کس کو پیش آئی تھی؟ اس کے بانی، مدرسہ ادر پلانے والے کون حضرات تھے؟ اس سلسلے میں جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم، مولوی عبدالغنی قدوسی یوں لکھتے ہیں:

”ایسے میں چند ایسے حضرات میدان میں آئے جن کی پوری تربیت گورنمنٹ کے تعلیمی اداروں میں ہوئی تھی اور سرکاری ملازمت میں رہ کر وہ اپنے آپ کو گورنمنٹ کے مکمل وفادار ثابت کر چکے تھے۔ انھوں نے دیوبند میں ایک عربی دینی مدرسہ ”دارالعلوم“ کی بنیاد رکھ دی۔ اوپر کے بیان کردہ پس منظر میں دیکھا جائے تو دینی تعلیم کا یہ اہتمام، گورنمنٹ انگریزی کی منشا اور پالیسی کے مطابق تھا اور چونکہ اس پہلے دینی مدرسہ کے یہ بانی اور صدر مدرس، دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور سرکاری ملازمت میں رہ کر گورنمنٹ کا مکمل اعتماد حاصل کر چکے تھے، نیز یہ حضرات ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تھے، اس لیے قدرتاً انگریزی گورنمنٹ نے اُن کی حوصلہ افزائی فرمائی، بلکہ انگریزی ڈپلومیسی کی روشنی میں دیکھا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ اس مدرسہ کے قیام میں اُس (حکومت) کا کسی طرح کا ایما و تشاکی ہو۔“

قاری محمد طیب صاحب نے دارالعلوم دیوبند کے بانی، موسس، اراکین مجلس اور معاندین کا تذکرہ یوں کیا ہے:

”اس بنا میں خصوصیت سے حضرت حاجی سید عابد حسین صاحب قدس سرہ،

مؤرخین الرحمن نیشوری، مفتی: تذکرہ مشائخ دیوبند، ص ۱۷۷

”ہفت روزہ“ الاعتصام“ لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب قدس سرہ اور مولانا فضل الرحمن صاحب قدس سرہ قابل ذکر ہیں، جن کا ہاتھ ابتداء ہی سے تاسیس مدرسہ میں تھا۔ یہ حضرات خصوصیت سے حضرت نانوتوی صاحب قدس سرہ (مولانا محمد قاسم) کے دست و بازو رہے ہیں اور بنا کے بعد بھی اس کی ذمہ دار مجلس کے رکن کین کی حیثیت سے مدرسہ کے تمام امور میں عملاً شریک رہے ہیں۔ ۱

دارالعلوم دیوبند کا سب سے پہلا صدر المدرسین کون مقرر کیا گیا؟ پروفیسر محمد ایوب قادری یوں جواب دیتے ہیں:

”جب ۱۵ محرم الحرام ۱۲۸۳ھ کو مدرسہ اسلامیہ دیوبند قائم ہوا، تو مولانا محمد یعقوب صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اس وقت مولانا محمد یعقوب سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے تھے۔“ ۲

مولوی عبدالحق قدوسی نے موصوف کی تقرری کے بارے میں اپنے تنازعات کا اظہار یوں کیا ہے:

”قیام مدرسہ کے بعد سب سے پہلے صدر مدرس کی حیثیت سے جس شخص کا تقرر ہوا وہ مولانا مملوک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی تھے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ بزرگ بھی بانیان مدرسہ کی طرح ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے تھے۔ یہ بزرگ بھی ۱۸۵۷ء کے وقت اسی عہدہ پر فائز تھے۔“ ۳

بانیان مدرسہ اور اس کی مجلس کے خاص اراکین میں سے مولوی ذوالفقار علی دیوبندی اور مولوی فضل الرحمن دیوبندی نیز اس مدرسہ کے اولین صدر مدرس یعنی مولوی محمد یعقوب نانوتوی کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھتے ہوئے ان حضرات کی ملازمتوں کا اظہار ۱

۱۔ عبدالرشید ارشد، مولوی: میں بڑے مسلمان، ص ۶۶

۲۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد حسن نانوتوی، ص ۱۹۲

۳۔ ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۶

کئے اب بہت بڑی الجھن کو سلجھا دیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں :

”دہلی کالج کے فاضل مدرس، مولانا ملک العلی کے وطن و برادری کے جن حضرات نے مولانا کی سرپرستی میں تعلیم پائی وہ حضرات بھی تعلیمی نظام میں منسک نظر آتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن دیوبندی اور مولانا ذوالفقار علی دیوبندی ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا ملک العلی کے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی اجیر کالج میں مدرس مقرر ہوئے پھر بنارس، بریلی اور سہارنپور میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔“ ۱

مولانا ذوالفقار علی دیوبندی کے بارے میں ایک جگہ موصوف نے یوں مزید وضاحت فرمائی ہے :

”شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی بریلی کالج میں پروفیسر تھے۔ مولانا ذوالفقار علی کا بریلی میں کئی سال قیام رہا۔“ ۲

مدرس دیوبند کے اولین صدر مدرس مولوی محمد یعقوب نانوتوی اور مولوی فضل الرحمن دیوبندی کے بارے میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے :

”مولانا محمد یعقوب بھی بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس رہے۔ مولانا محمد حسن کی بیاض سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۵ء میں مولانا محمد یعقوب نانوتوی بریلی میں تھے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے والد مولانا فضل الرحمن دیوبندی بھی ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء میں بریلی میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ جب مولانا محمد احسن نے انقلاب ۱۸۵۸ء میں بریلی کو چھوڑا تو بعض معاملات و انتظامات ضروری مولانا فضل الرحمن ہی کے سپرد کیے تھے۔“ ۳

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۴۵

۳۔ ایضاً، ص ۴۶

اگر پروفیسر فردین روجی ناراض نہ ہوں اور ہمیں اس جسارت پر معذور سمجھتے ہوئے
 فرمادیں تو ہم ان کی خدمت میں یہ التجا بصداد بکرتے ہیں کہ وہ اپنے ممدوحین علمائے دیوبند
 یعنی برٹش گورنمنٹ کے پروردہ اور ریڈی میڈ نہیں، بلکہ تیار کردہ اینگلو انڈین علما
 بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری صاحب کا یہ بیان پڑھیں اور اسے اپنی تصنیف
 جس کا غلطی سے ”آئینہ صداقت“ نام لکھ بیٹھے ہیں، درج فرمائیں، کیونکہ درج ذیل
 بیان اگر ”آئینہ صداقت“ کے اگلے ایڈیشن میں ایڈ کر لیے جائیں تو ان کے پڑھ لینے
 بہتوں کا بھلا ہوگا۔ لیجے پہلا بیان موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

”مولانا ملک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے بھی دہلی کالج کی تعلیمی
 سرگرمیاں یقینی آگے بڑھیں اور مسلمانوں (اینگلو انڈین علماء) کی ایک ایسی
 کھیپ تیار ہوئی کہ جس نے نئے نظام تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات
 انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس
 بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی
 دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمن دیوبند
 (ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، تو خاص ان کے اعزہ و احباب ہیں۔ ان کے علاوہ
 شمس العلماء شیخ ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ،
 شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء محمد حسین آزاد
 (ف ۱۹۱۰ء)، پیر زادہ محمد حسین (سشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)،
 خان بہادر میرزا ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانیپتی
 (ف ۱۸۷۶ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۴ھ) وغیرہ بہت سے ایسے
 حضرات ہیں کہ جو اسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و
 بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات
 انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور حسن صلہ سے نوازا۔“

لے محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۷۷

جس مقصد کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے مدرسہ دیوبند قائم کرنے کا ان حضرات کو
اہام کیا تھا، حکومت کا وہ مقصد کہاں تک پورا ہو رہا تھا؟ حکومت نے اس امر کا
خفیہ طور پر جائزہ لیا۔ پڑتال کرنے والے انگریز افسر کے تاثرات یہ تھے:

”اس مدرسہ نے یوماً فیوماً ترقی کی۔ ۳۱ جنوری ۱۸۷۵ء بروز یکشنبہ
لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسٹی پامر نے اس مدرسہ کو دیکھا
تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے معائنہ کی چند
سطور درج ذیل ہیں جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپے کے
صرف سے ہوتا ہے وہ یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے۔ جو کام پرنسپل ہزاروں
روپیہ تنخواہ لے کر کرتا ہے وہ یہاں ایک مولوی چالیس روپیہ ماہانہ پر کر رہا ہے۔
یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں بلکہ مدد و معاون سرکار ہے۔ یہاں کے تعلیم یافتہ
لوگ ایسے آزاد اور نیک چلن (سلیم الطبع) ہیں کہ ایک کو دوسرے سے
کچھ واسطہ نہیں۔ کوئی فن ضروری ایسا نہیں جو یہاں تعلیم نہ ہوتا ہو۔ صاحب
مسلمانوں کے لیے تو اس سے بہتر کوئی تعلیم اور تعلیم گاہ نہیں ہو سکتی
اور میں تو یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ غیر مسلمان بھی یہاں تعلیم پاوے تو خالی نفع
سے نہیں۔ اے صاحب! سنا کرتے تھے کہ ولایت انگلستان میں اندھوں
کا مدرسہ ہے، یہاں آنکھوں سے دیکھا کہ دو اندھے تحریر اقلیدس کی شکلیں
کف دست پر ایسی ثابت کرتے ہیں کہ باید و نہاید“

ڈاکٹر عبدالحق قدوسی نے اس معائنہ پر جو تبصرہ کیا ہے، مردست وہ بھی ملاحظہ
فرمایا جائے۔ چنانچہ موصوف نے مذکورہ واقعہ نقل کرنے کے بعد یوں اپنے تاثرات کا
اظہار کیا ہے:

”معائنہ کرنے والے انگریز نے اپنی رپورٹ کے اس ٹکڑے میں دارالعلوم

دیوبند کی دو خصوصیات بتائی ہیں۔ (۱) موافق سرکار (۲) مدد و معاون سرکار۔ پہلی خصوصیت تو واضح ہے کہ اس مدرسہ میں کام کرنے والے لوگ سرکار انگریزی کے پورے پورے وفادار ہیں اور یہاں کسی قسم کی بغاوت کے جراثیم موجود نہیں، لیکن دوسری خصوصیت کہ یہ مدرسہ سرکار کا معاون بھی ہے، غور طلب ہے، سوال یہ ہے کہ ایک چھوٹا سا مدرسہ جس میں چند درویش منش بزرگ صبح و شام عموماً قال قال ابو حنیفہ کی تعلیم دیتے ہوں، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت سے کیا تعاون کر سکتے تھے؟ لے

مولوی عبدالحق قدوسی کو مسٹر پامر کی اس رپورٹ پر کہ یہ مدرسہ مدد و معاون سرکار حیرانگی تھی کہ چند ملاؤں کا جگہ سٹا، برطانیہ جیسی عظیم سلطنت کی کیا مدد کر سکتا تھا، لیکن مولوی اس رابطے کے منکر نہیں ہیں بلکہ اس امداد و اعانت کے بارے میں وہ خودیوں رقمطراز ہیں۔ یہ تو ہم نہیں کہتے کہ یہ لوگ ۱۸۵۷ء کے بعد میدان جنگ میں انگریزی فوج کے نشانہ نشانہ مجاہدین کے خلاف لڑے تھے اور نہ ہی ہمارے پاس کسی قسم کے مادی تعاون کا کوئی ثبوت ہے، ہاں اس میں شک نہیں کہ ۱۸۶۵ء میں بننے والے اس دینی مدرسہ نے جذبہ جہاد کو سرور کرنے کے لیے بڑا اہم کردار ادا کیا اور ہماری رائے میں یہی وہ خدمت جلیلہ ہے جسے مسٹر پامر اپنے الفاظ میں کہہ رہے ہیں، کہ یہ مدرسہ مدد و معاون سرکار ہے۔ لے

مدرسہ دیوبند کے چھ ماہ بعد اسی دہلی کالج کے پروردہ اور مولوی ملک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) کے شاگردوں نے ”مظاہر العلوم“ کے نام سے سہارن پور میں مدرسہ بھی قائم کر لیا۔ قدوسی صاحب لکھتے ہیں:

”اسی پرسکون ماحول میں علمائے احناف (دوبانی دیوبندی) علمائے ۱۸۶۷ء

مؤدار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی اور اس سے صرف چھ ماہ بعد مظاہر العلوم (سہارن پور) کا قیام عمل میں آیا۔ ان مدارس نے حیرت انگیز حد تک ترقی کی۔ اول الذکر مدرسہ کو بجا طور پر ایشیا کی سب سے بڑی اسلامی درسگاہ کہا جاسکتا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں مدرسے ۱۸۶۷ء میں قائم ہوئے لیکن ان کا تصور ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد بعض ذہنوں میں آچکا تھا، بلکہ مولانا عبید اللہ سندھی تو دارالعلوم دیوبند کو دہلی کا لچ کا ہی ایک حصہ قرار دیتے تھے۔ لے

این گلو انڈین علماء کی دوسری دینی درسگاہ یعنی مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کس نے قائم کیا؟ صدر مدرس اور پہلے شیخ الحدیث کون مقرر ہوئے؟ اس بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں وضاحت فرماتے ہیں:

”رجب ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں مولوی سعادت علی سہارن پوری نے ایک مدرسہ سہارن پور میں جاری کیا۔ مولوی سخاوت علی انبیٹھوی، مولوی عنایت علی اور حافظ قمر الدین مدرس مقرر ہوئے۔ تین مہینے کے بعد سوال ۱۲۸۳ھ / ۱۸۶۷ء میں مولانا محمد مظہر نانوتوی اس مدرسہ کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس مقرر ہوئے۔ جب مدرسہ کو ترقی ہوئی تو حافظ فضل حق نے اپنے مکان کو مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ مکان کی عمارت توڑ کر مدرسہ کی عمارت تعمیر کی گئی۔ حافظ فضل حق (ف ۱۳۰۲ھ) مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کے مرید اور مولانا محمد مظہر صاحب کے مخلص دوست تھے۔ مدرسہ تعمیر ہونے کے بعد مدرسہ کا نام ”مظاہر العلوم“ تجویز ہوا۔ مولانا احمد علی محدث سہارن پوری بھی اس مدرسہ کے معین و مددگار رہے تھے۔ مدرسہ مظاہر العلوم ہندوستان کی مشہور اسلامی درسگاہ ہے۔ اس نے مذہب و علوم اسلامی کی بڑی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ بڑے بڑے

نامور علماء اس درسگاہ سے فارغ التحصیل ہو کر مکے اور برصغیر پاک و ہند میں دین و ملت کی خدمات میں مصروف ہیں۔“ لے

درسہ مظاہر العلوم کے صدر مدرس مولانا محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء) کون تھے اور کہاں کے فیض یافتہ تھے؟ اس سوال کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقم فرماتے ہیں:

”مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔ ۱۸۲۳ء میں نانوتہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و حفظ قرآن اپنے والد حافظ لطف علی سے کیا۔ ”دہلی کالج“ میں تعلیم حاصل کی۔ مولانا مملوک العلی نانوتوی کے سامنے زانوئے ادب طے کیا۔ حدیث کی سند حضرت شاہ محمد اسحاق سے حاصل کی۔۔۔۔۔ مولانا محمد مظہر تحصیل علم کے بعد اجیر کالج میں ملازم ہو گئے، وہاں سے آگرہ کالج تبادلوں لے۔
مولوی محمد مظہر نانوتوی (المتوفی ۱۳۰۳ھ / ۱۸۸۵ء) کے دوسرے بھائی مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء) بھی مولوی مملوک العلی کے شاگرد اور دہلی کالج کے پروردہ تھے۔ تحصیل علم کے بعد موصوف بنارس کالج اور بریلی کالج میں تدریسی خدمات سرانجام دیتے رہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں قادری صاحب نے یوں وضاحت فرمائی ہے: ”اسی طرح مولوی مملوک العلی کے عزیز و تلمیذ مولانا محمد احسن جب تعلیم سے فارغ ہوئے تو ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں بنارس کالج میں بحیثیت مدرس اول فارسی ان کا تقرر ہوا۔“ لے

”بنارس میں مولانا ۱۲۶۳ھ / ۱۸۴۷ء میں پہنچے اور جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں مولانا محمد احسن کا تعلق بنارس سے یقیناً ختم ہو چکا تھا

لے محمد ایوب قادری، پروفیسر، مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۱۵۵

لے ایضاً: ص ۱۵۴

لے ایضاً: ص ۳۸

کیونکہ یہی زمانہ بریلی میں آنے کا ہے۔ ۱

مولانا محمد احسن صاحب فارسی شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور مولانا بنارس

سے جمادی الاول ۱۲۶۷ھ مطابق مارچ ۱۸۵۱ء میں تبدیل ہو کر بریلی

پہنچے۔ مولانا محمد احسن بریلی کالج میں شعبہ فارسی کے صدر مقرر ہوئے۔

جب عربی کا اجراء ہوا، تو دونوں شعبوں کی صدارت ان ہی کو تفویض ہوئی۔

مولوی محمد مظہر نانوتوی کے سب سے چھوٹے بھائی مولوی محمد منیر نانوتوی بھی دہلی کالج کے

پروردہ اور مولوی غلوک علی نانوتوی کے تلیذ تھے۔ موصوف دو سال دارالعلوم دیوبند کے

مہتمم بھی رہے تھے۔ قادری صاحب یوں لکھتے ہیں :

”مولانا محمد احسن نانوتوی کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے۔ ۱۸۳۱ء میں نانوتہ میں

پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد حافظ لطف علی سے حاصل کی پھر دہلی کالج

میں تعلیم حاصل کی ۱۳ مئی ۱۸۶۱ء میں بریلی کالج میں ملازم ہو گئے۔

مطبوعہ صدیقی بریلی کے مہتمم رہے اور اس کا نظم و نسق زیادہ تر ان ہی سے

متعلق رہا۔ بریلی سے پنشن پائی۔ ۱۲۹۴ھ / ۱۸۷۷ء کے بعد بریلی سے

تعلق ختم ہو گیا۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بہت گہرے تعلقات اور

دونوں بچپن کے ساتھی تھے مولانا محمد منیر صاحب قریب دو سال دارالعلوم

دیوبند کے مہتمم رہے۔ ایمان داری و دیانتداری میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ ۲

قارئین کرام ! یہ تھے دارالعلوم دیوبند اور مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور کی بنیادیں

رکھنے والے، دہاں پڑھانے والے اور انھیں چلانے والے۔ مذکورہ بالا حوالوں سے صاف

واضح ہے کہ پہلے ان حضرات کو دہلی کالج میں گورنمنٹ نے اپنے ڈھب پر تربیت دی۔

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۳۹

۲۔ ایضاً: ص ۳۳

۳۔ ایضاً: ص ۱۵۷، ۱۵۸

اس کے بعد بڑھاپے تک اُنھیں سرکاری ملازمت میں رکھ کر اچھی طرح اُن کی وفاداری کا سنا
تایا گیا۔ بعض حضرات کو کالجوں میں پروفیسر رکھا گیا اور دوسرے ڈپٹی انسپکٹر مدارس (کالے
پارری) بنا کر رکھے گئے۔ جب یہ صاحبان نازک سے نازک مواقع پر بھی اپنی مہربان حکومت
کے وفادار ہی ثابت ہوئے تو ریٹائر ہونے کے بعد ان کی طرف الہام کر دیا جاتا تھا کہ اب
آپ دین کے نام پر مسلمانوں کے دیندار طبقے کی رہنمائی کریں یعنی مسلمان آپ حضرات سے
دین بصد شوق حاصل کریں لیکن حکومت کے مکمل وفادار اور یہی خواہ رہنے کی تربیت دینی ہوگی
اور اُنھیں اُسی رنگ میں رنگنا ہوگا، جس میں آپ لوگوں کو رنگا گیا ہے۔

حکومت نوان مدارس کی اندرون خانہ سرپرستی کر رہی تھی اور یہ ساری مشینری
اسی دستِ غیب سے چل رہی تھی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو ادھر مائل کرنے کی غرض سے
دیوبندیوں نے کارکنان دارالعلوم دیوبند کے زہد و تقویٰ، خلوص و ولہیت اور کشف و
کرامت کے ایسے افسانے گھڑنے شروع کر دیے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے بھی کان کاٹ
لیے اور بھولے بھالے مسلمان ان کے جال میں پھنسے شروع ہو گئے۔ یہ جال ایسا طمساتی بنا گیا
کہ اُس وقت اس چکر کو کیا سمجھ سکتے تھے کہ پاک و ہند کے کتنے ہی مدعیان اسلام آج تک
اس کی تعلیمات کے زہرِ ہلاہل کو اُس کی ظاہری خوشنمائی کے پیشِ نظر سمجھ نہیں پائے اور
اس زہر کو تریاق سمجھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

وہابیت کا اصلی اور پہلا ایڈیشن مکمل طور پر ناکام ہوا۔ یہی سہی کسر معرکہ بالا کوٹ
نے نکال دی۔ علمائے کرام کا اس کی تردید اور بیخ کنی میں سرگرم ہو جانا اور عوام الناس
کا اس نئے مذہب والوں سے نفرت کرنا، ایسے امور تھے جن کی بنا پر یہ گروہ بڑھنے کی بجائے
مزید سکڑ کر رہ گیا اور ڈیڑھ صدی سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی، یہ شروع میں محمدی
گروہ پھر موحدین اور آجکل الحمد للہ کھلانے والے ہندوپاک میں انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔
آخر اس گروہ نے گورنمنٹ کی سرپرستی کے باوجود ترقی کیوں نہ کی، بات دراصل یہ ہے
کہ جب کتاب وہابیت کا دوسرا ایڈیشن دیوبندیت کے نام سے دارالعلوم دیوبند سے
شائع ہونے لگا تو یہ اتنا جیتھا اور خوشنماز ہر تھا کہ عوام الناس اس کی مضرت کو

محسوس نہ کر سکے اور اس کثرت سے اس زہرِ بلا ہل کے طلبگار ہونے شروع ہو گئے کہ حکومت بھی ہزار جان سے اس کی بلائیں لینے لگی اور اہلحدیث جماعت پر جو خصوصی نظر تھی وہ مع انصاف دارالعلوم دیوبند پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔

چند علمائے دیوبندی قسم کی روش اختیار کر کے دہلی کالج سے تربیت پاکر، یہ مشن جاری کیا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہ درخت پروان چڑھا، پھلا پھولا اور اس کی شاخیں پاک دہند کے گوشے گوشے میں پھیل گئیں کیونکہ بعض بھولے بھالے مسلمان ان حضرات کے زبردست پریکٹکس کے باعث انھیں خطرناک ترین وہابی نہیں بلکہ مصلح سمجھ بیٹھتے تھے۔ یہ اسلامی عقائد میں اس غیر محسوس طریقے سے کفریہ عقائد و نظریات کی آمیزش کر کے مسلمانوں کے دین و ایمان کو برباد کرتے رہے ہیں کہ مارے خوشی کے انگریزی حکام بھی پھڑک اٹھتے تھے اور عنایات و نوازشات کا اندرون خانہ وہ انتہام کیا کہ جس جماعت کی تعداد پانچ دس ہزار سے زائد نہ تھی ان کا مدرسہ دیوبند، چھپڑوں اور جھونپڑیوں سے ترقی کرتا ہوا، جامع ازہر کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مذہبی درس گاہ بن گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی گروہ کی ترقی گویا اہلحدیث حضرات کی تنزیلی کا پر دانہ تھا۔ اس کی ترقی کے ساتھ ہی یہ حضرات نیمی اور کس مہر سی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ اس دوران میں اس محمدی یا اہلحدیث گروہ کا دو چار مقامات پر انگریزوں سے ٹکراؤ بھی ہوا، لیکن حاصل کچھ نہ ہوا بلکہ نقصان ہی اٹھاتے رہے اور آخر کار یہ لوگ بھی اپنی اکثریت کے ساتھ متفق ہو کر حکومت کی وفاداری اور بھی خواہی پر ایمان لے آئے۔ میاں نذیر حسین

دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء)، نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی (المتوفی ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء) اور مولانا محمد حسین بنالوی وغیرہ حضرات کی سرکردگی میں ساری جماعت ہی حکومت کے قدم چومنے پر متفق ہو گئی۔ اس جماعت کی زندگی کے یہ تین ادوار ہیں یعنی پہلے دور میں گورنمنٹ کے منظورِ نظر، دوسرے دور میں اکثریت وفادار اور بعض حکومت کے خلاف اور تیسرے دور میں سب حکومت کے بھی خواہ اور منتظرِ نظر کر م۔

دارالعلوم دیوبند جو دہلی کالج کی شاخ اور وہابی حضرات کا دوسرا مرکز بنا، اس پر بھی

دو دور گزرے ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف۔ ابتدائی ایام اور پہلے دور میں انگریزوں کی مکمل سرپرستی اور تائید و حمایت حاصل رہی۔ خوب جی بھر کر عنایت سرکار کے مزے کُٹے۔ دوسرا دور وہ ہے جب متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں گاندھی کی آندھی چلی۔ ہندو نے خفیہ منصوبے کے تحت حکومت کے ہر محکمے میں فوج اور پولیس میں اپنے آدمی کثیر تعداد میں شامل کر لیے۔ تجارت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے ذریعے خوشحال ہونے لگے تو ہمدیوں کے جال بھاگ سود و سود کے چکر میں مسلمانوں کی جائیدادوں پر قابض ہونے شروع ہو گئے۔ غرضیکہ ہر قسم کی طاقت و قوت حاصل کر لینے کے بعد ہندوؤں نے حصول آزادی کی خاطر انگریزوں سے سرِ جنگ جاری رکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس دور میں علمائے دیوبند نے محسوس کیا کہ ہندو کی بے پناہ تیاریوں کے مقابلے میں اب انگریز زیادہ عرصہ ہندوستان پر قابض نہیں رہ سکتے اور وہ دن دور نہیں کہ ہندوستان کی فضاؤں میں اوم کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا ہوگا۔ صورتِ حالات کا اس طرح تجزیہ کرنے کے بعد علمائے دیوبند نے اپنے سرپرستوں اور محسنوں کو الوداعی سلام یکے بغیر متوقع حکمرانوں کے در کی گدائی شروع کر دی۔ کانگرس نے ان حضرات کی ناز بڑی اور تالیفِ قلب کا پورا پورا خیال رکھا اور انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر انھیں نوازتے رہے۔ اس دور میں یہ حضرات مکمل طور پر ہندو مفادات کی خاطر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹانے کے لیے تیار بیٹھے رہتے تھے۔ اس وقت یہ حضرات ہندوؤں پر کچھ اس طرح پروانہ دار نثار اور گاندھی جی کے پجاری ہو کر رہ گئے کہ ہندوؤں نے انھیں انگریز کی گولیوں کا نشانہ بننے کی ترغیب دی تو یہ لبیک کہہ کر سوراج کے دیوتا پر بھینٹ بن کر چڑھنے کے لیے تیار ہو جاتے اور ایسی موت کو شہادتِ عظمیٰ سے کسی طرح کم ماننے پر تیار نہ ہوتے اور اگر گاندھی جی یا پنڈت جو اہر لال نہرو نے انھیں مسلم مفادات پر کاری ضربیں لگانے کا حکم دیا یا ترغیب ہی دلائی تو یہ حضرات اپنے اصطلاحی مشرکوں اور بدعتیوں کو نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا کرتے تھے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانانِ پاک و ہند کے مفادات کو جتنا نقصان اس تحریک و ہابیت نے پہنچایا ہے اتنا مشرکینِ ہند بھی آج تک نہیں پہنچا سکے ہیں۔ اپنے دوسرے دور میں دیوبندی حضرات واقعی انگریزوں کے

مخالف بن کر بھی رہے لیکن ہندو مفادات کی خاطر مسلم مفادات کے لیے ان حضرات کا وجود مجہد خوارج کی طرح ہمیشہ ایک چیلنج بن کر ہی رہا ہے۔ باری تعالیٰ شانہ، ابنائے زمانہ کو سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر ہو۔ آمین۔

بقول مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۶۳ھ / ۱۹۴۲ء) دہلی کالج کا **علی گڑھ مرکز** انگریزی حصہ، اسی کالج کے تربیت یافتہ سر سید احمد خاں علی گڑھ لے گئے۔ گویا پہلے جو وہابی حضرات کا ماڈرن اور پُر اسرار مرکز، دہلی کالج مقرر ہوا تھا، آگے چل کر اُس کے دو حصے یا دو مراکز بن گئے، ایک دیوبند اور دوسرا علی گڑھ۔ اس دوسرے مرکز علی گڑھ کو مغربی تعلیم و تہذیب کے دلدادگان کا مرکز قرار دیا گیا اور آہستہ آہستہ پورے ملک میں اس کی براہین قائم کر دی گئیں جو مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مستقل مراکز کی حیثیت حاصل کرتی چلی گئیں۔ اس طرح پورے ملک میں مغربی علوم اور مغربی تہذیب چھا گئی اور یہ دونوں چیزیں اس طرح پاک و ہند کے باشندوں کے دماغ و اعصاب پر سوار ہوئیں کہ انگریزوں کو ہمارے ملک سے گئے ہوئے چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے لیکن ان مغربی لعنتوں سے چھٹکارا حاصل کرنا تو دُور کی بات ہے، خود مسلمان کھلانے والوں نے انھیں اس طرح اپنا ضابطہ حیات اور لائحہ عمل بنایا ہوا ہے، جیسے مسلمانوں کی کامیابی و کامرانی کا راز قرآن و سنت کے احکام کی پیروی میں مضمر نہیں بلکہ مغربی لعنتوں میں ہے۔ باری تعالیٰ شانہ، ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

علی گڑھ کالج کے بارے میں عرض کرنے سے پہلے اس حقیقت کا اظہار کر دینا ضروری نظر آتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد برٹش گورنمنٹ نے جو ایسی وضع کی اُس کو مولوی عبدالحق قدوسی کے لفظوں میں بیان کر دیا جائے:

”بات دراصل یہ ہے کہ، ۱۸۵۷ء کے تلخ تجربہ کے بعد انگریز سرکار اس قدر حساس ہو چکی تھی کہ وہ جب بھی ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں میں کسی قسم کے اضطراب و اشتعال کے آثار محسوس کرتی تو قبل اس کے کہ حالات خطرناک صورت اختیار کر جائیں، مسلمان قوم کے سامنے کوئی نئی چیز مسلمان لیڈروں

کے ہی ذریعے پیش کر دیتی، جس سے مشتعل قوم کا رخ خود بخود دوسری طرف پھر جاتا۔^۱

علی گڑھ کی مسلم یونیورسٹی کی تحریک کیوں چلائی گئی؟ مولوی سید سلیمان ندوی (الترغیہ) ۱۲۷۳ھ/۱۹۵۳ء نے اس پر اسرار حقیقت کے چہرے سے یوں پردہ ہٹایا تھا: ”واقعہ یہ ہے کہ اُس زمانہ میں طرابلس اور بلقان کے ہنگاموں کے سبب سے مسلمانوں میں بے حد جوش و خروش تھا اور انگریزوں کی طرف سے دلوں میں بے حد ناراضی اور نفرت پھیلی تھی اور اُن کی ذرا ذرا سی بات سے مسلمانوں کو چڑھتی تھی۔ حکام کے سامنے ان ناخوشگوار حالات کا تذکرہ از بس ضروری تھا۔ اس لیے بہترین تدبیر یہ تھی کہ ملک میں کوئی ایسی عالمگیر تحریک شروع کر دی جائے جو مسلمانوں کے رخ کو ادھر سے ادھر پھیر دے۔ یہ چیز ایک مسلم یونیورسٹی کا تخیل تھا، جس کو لے کر ہز بانس سرآغا خاں، جو اُس وقت کے مسلم قومی راہنما اور انگریزوں کے معتمد تھے، آگے بڑھے۔“

علی گڑھ کالج کے اصل کڑا دھڑا سر سید احمد خاں تھے۔ دہلی کالج سے تخریف شدہ مذہب یعنی وہابیت کو بشکل دیوبندیت لے کر آئے تھے لیکن علی گڑھ میں آکر کریم اور نیم پڑھ گیا، موصوف نیچریت کے بانی بن گئے اور اس طرح مسلمانوں کی خیر خواہی و اصلاح کے نام پر ساتھ ساتھ مقدس اسلام کی بیخ کنی کا فریضہ، جو حکومت کی طرف سے عائد ہوا تھا سرانجام دے کر گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرتے رہے۔ مسلمانوں کی خیر خواہی معیوب نہیں، انہیں تباہ کن حرکتوں کے نتائج سے خبردار کرنا دشمنی نہیں، دولت، علم و فن اور اخلاق و کردار میں مسلم قوم کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنا بدخواہی نہیں بلکہ یہ امور تو مستحسن ہیں اگر واقعی یہ مصلح اور ریفارمر بننے والے یہی کچھ کرنا چاہتے تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ

۱۔ ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء، ص ۵

۲۔ سلیمان ندوی، مولوی، حیاتِ شبلی، ص ۳۱

عیدِ مسلم کے دین پر عملِ جراحی کی مشق کس غرض سے فرمائی گئی تھی؟ مسلمانوں کے دین و ایمان کو تباہ و برباد کرنے والا کیا ان کی حقیقی خیر خواہی کے تصور سے بھی آشنا ہو سکتا ہے؟
 نیچریت پر گفتگو ہم انشاء اللہ تعالیٰ باب سوم میں کریں گے۔ دہلی کالج کا انگریزی حصہ علی گڑھ لایا گیا تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ علی گڑھ سے کہاں تک پھیلا۔ بریلی اور میرٹھ کی درس گاہوں کے بارے میں ملاحظہ ہو:

’بریلی کی یہ درس گاہ اور میرٹھ اسکول، دہلی کالج کی شاخ قرار پائے۔ ۱۸۴۸ء تک بریلی اسکول میں کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ ۱۸۵۰ء میں بریلی کا اسکول، کالج بنا دیا گیا‘۔ ۱

ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کی وجہ مولوی سید سلیمان ندوی (۳، ۱۳، ۱۹۵۲ء) نے یہ بتائی ہے:

’گورنمنٹ نے مسلمانوں کے اس زخم پر رکھنے کے لیے جو مرہم تجویز کیا اُس کا نام ڈھاکہ یونیورسٹی ہے۔ اس یونیورسٹی کی تجویز اور خاکہ بنانے میں اُن لوگوں کو بھی شریک کیا جو احرار کے سرگروہ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ نئے تعلیم یافتوں میں سے محمد علی مرحوم اور علماء میں سے مولانا شبلی کے نام اُس سب کمیٹی میں داخل ہوئے جو اسلامک سٹڈیز کے لیے بنی تھی‘۔ ۲

وہ زخم کیا تھا، جس پر ڈھاکہ یونیورسٹی کے قیام کا مرہم لگایا گیا؟ اس کا جواب مولوی عبدالحق قدوسی کی زبانی سنئے:

’اسی طرح ۱۹۱۰ء میں جب تقسیم بنگال کی تنسیخ کا فیصلہ ہوا تو مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہوا اور ایک اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گورنمنٹ نے اس کا علاج جو تجویز کیا، وہ ڈھاکہ یونیورسٹی کا قیام تھا‘۔ ۳

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، ص ۴۳

۲۔ سلیمان ندوی، مولوی، حیاتِ شبلی، ص ۵۲۰

۳۔ ہفت روزہ ”الاعتصام“ لاہور، بابت ۲۳ اکتوبر، ۱۹۵۰ء، ص ۵

یونیورسٹیوں کا قائم ہونا تھا کہ برصغیر پاک و ہند میں انگریزی اسکولوں اور کالجوں کا جال پھیلا دیا گیا اور انگریز نے ان کے ذریعے جس مقصد کو حاصل کرنا تھا وہ بڑی آسانی سے حاصل ہو گیا۔ انگریزی زبان کا سیکھنا اور سکھانا بڑا نہیں، یہ بھی دوسری زبانوں کی طرح ایک زبان ہے اور اس کا سیکھنا کسی طرح معیوب نہیں ہو سکتا۔ ان انگریزی کالجوں اور اسکولوں کی دو باتیں معیوب تھیں جو سنتِ نصاریٰ کے ظو پر آج تک کمال عقیدت کے ساتھ اپنائی ہوئی ہیں اور مسلمان کھلانے والے بھی ان معائب کو دور کر کے اپنی درس گاہوں کو بے حیو برکت کر دکھانے اور انھیں دنیا و عقبیٰ کی کامیابی و کامرانی کا ذریعہ بنانے سے کتراتے رہتے ہیں۔ ان سرکاری درس گاہوں کی دونوں خرابیوں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ ادارے مغربی تہذیب و تمدن سکھانے کی تربیت کا ہیں بنائے گئے ہیں اور دوسری خرابی یہ کہ اسلامی علوم و معارف سے طلبہ کو علمی اور عملی طور پر، بڑی حد تک دور ہی رکھا جاتا ہے۔ اگر تو مسلمانوں کو اور خصوصاً ان کے پڑھے لکھے طبقے کو دین سے ناواقف دیکھنا اور رکھنا چاہتا ہو لیکن پاکستان کی کسی حکومت نے آج تک یہ وضاحت کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اپنی درس گاہوں سے اسلام کو باہر نکال کر، مسلمانوں کی موجودہ نسل کو دین سے ناواقف رکھ کر کون سا مقدس مقصد حاصل کرنے کے درپے ہے؟

پاک و ہند میں انگریزی درس گاہوں کے محرک بننے کا جس ہستی کو حکومتِ وقت نے شرف بخشا تھا، وہ سر سید احمد خاں تھے۔ موصوف کے بارے میں شیخ اکرام صاحب اسی تعلیم سے متعلق یوں وضاحت کرتے ہیں:

”خود سر سید ۱۸۹ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں: تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے جاتے ہیں اور جس سے قومی بھلائی کی اُمید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم ہونے جاتے ہیں!“

اصل بات یہ ہے کہ ان درس گاہوں کے ذریعے حکومت یہی چاہتی تھی کہ مسلمان اپنے اس

رشتہ منقطع کر لیں اور حکومتِ وقت کے مکمل وفادار بن جائیں۔ شیخ اکرام صاحب نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :

”علی گڑھ تحریک کے راہنماؤں میں ذہنی آزادی کی کمی نہ تھی۔ قوم کو سلف کی سورانہ تقلید سے آزاد کرانے اور اس تقلید کے حمایتیوں کی مخالفت بڑاشت کرنے کے لیے بڑی جرأت اور صحیح آزاد خیالی کی ضرورت ہے اور سرسیدؒ، حالی اور اُن کے رفقاء میں یہ آزاد خیالی پوری طرح موجود تھی، لیکن اس کے باوجود ان بزرگوں کی تصانیف پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ انھیں مغرب سے ایک قسم کا حُسنِ ظن تھا اور مغربی تعلیم، مغربی ادب اور مغربی علوم و فنون سے انھیں ایسی توقعات تھیں جو زیادہ تر حقیقت یا ناواقفیت پر مبنی تھیں۔ مغرب سے ان بزرگوں کو تو فقط ایک حُسنِ ظن تھا لیکن جن لوگوں نے انگریزی کالجوں میں تعلیم پائی، اُن میں غلامانہ ذہنیت بڑی طرح جلوہ گر تھی۔ اُن کے نزدیک مغرب کی ہر ایک چیز اچھی تھی اور مشرق کی ہر ایک چیز بُری“۔ لے

علی گڑھ تحریک نے مغربی علوم و فنون کو متحدہ ہندوستان میں رائج کرنے اور مسلمانوں کو اُن کے دین و مذہب سے بے بہرہ رکھنے کی جس برطانوی پالیسی کی پیل منڈھے چڑھائی اُس کے بدترین نتائج آج بھی پوری قوم کو بھگتے پڑ رہے ہیں اور اب وہی لوگ قوم کی قسمت کے مالک اور ان کی کشتی کے ناخدا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد، جس اسلام کے نام پر پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے اُسی سے پاکستان کی برحکومت اس طرح ڈرتی اور بدکتی آئی ہے جیسے سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اور اسی خطرے کو ٹالنے کی خاطر اسلام کے رہے سے نشانات کو مٹانے کی اس طرح سے مسلسل کوشش کی جاتی رہی ہے کہ گویا اسلام دشمنی میں انگریز بھی ان کے شاگرد ہی تھے۔ ان درسگاہوں کی مضرت کا پہلو اہل نظر کو بروقت بھی نظر آتا تھا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے بھی اس حقیقت کا

ان لفظوں میں اعتراف کیا ہے :

”اگر آپ اُن بزرگوں کا معاملہ اُن کے ضمیر اور احساسِ فرض پر چھوڑیں اور ارکانِ مذہب کی ظاہری پابندی کو بھی ایک لمحے کے لیے نظر انداز کر دیں تب بھی علی گڑھ کی فضا میں اندر ہی اندر ایک عام ایمانی کمزوری اور روحانی کمزوری کا سراغ ملے گا۔“

اس قدر تسلیم کر لینے کے بعد بھی آج تک کالج اُسی دگر پر چلائے جا رہے ہیں، انود علّار شبلی نعمانی اور حالی پانی پتی بھی اسی نتیجے پر پہنچے تھے۔ ان دونوں حضرات کے متعلق یوں مذکور ہے :

”علی گڑھ کی علمی پستی سے مولانا (شبلی) کو جو شکایت تھی وہ بجا ہے اور ہم اس پرگزشتہ اوراق میں تفصیلی تذکرہ کر چکے ہیں۔ کالج کی یہ کوتاہی اس قدر افسوسناک تھی کہ اُس نے حالی جیسے فرشتہ خصلت انسان کو بڈل کر ڈالا۔ وہ سرسید کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ”چھبیس برس کے تجربے سے اُن کو اس قدر ضرور معلوم ہو گیا ہو گا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو دیسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمّی، فضول اور اصلی بیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔“

مسلم یونیورسٹی کے قیام، اسکولوں اور کالجوں کے اجراء اور ان کے ذریعے مغربی علوم و فنون اور تہذیب سے مسلمانانِ ہند کو بہرہ ور کرنے نیز اسلام سے کورا رکھنے کی جو سرسید احمد خاں صاحب اور حکومتِ وقت نے کوشش کی تھی، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟ اس حقیقت کے چرے پر آج تو مطلقاً کوئی پردہ ہی نہیں ہے۔ ہر صاحبِ نظر اپنی آنکھوں سے نو نہالانِ قوم کی حالتِ زار دیکھ کر خون کے آنسو روتا ہے کہ یہ ہے قوم کی

۱۔ محمد اکرام شیخ : موجِ کوثر ، ص ۱۵۱

۲۔ ایضاً : ص ۲۸۸

ہستہ گراں مایہ جن کے ہاتھوں میں کل ملت کی تقدیر ہوگی۔ جس قوم کی قسمت کے مالک یہ
 زہناں ہوں گے اُس کا مقدّر اندھیری رات میں بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ مغربی علوم و فنون
 سے فیض یاب ہونے والوں کی یہ افسوس ناک حالت پہلے ہی روز سے دکھائی دینے لگی تھی۔
 چنانچہ مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) کے شریک کار، فضل الدین احمد
 صاحب کا ایک بیان یوں منقول ہے:

یہ بات عام طور پر مستم ہو چکی تھی کہ نئی تعلیم یافتہ جماعت کو مذہب سے کوئی واسطہ
 نہیں اور اسکول اور کالج کی تعلیم اور مذہبی زندگی، دونوں ایک جگہ جمع نہیں
 ہو سکتیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی شخص ترکی ٹوپی اوڑھے ہوئے، نماز پڑھتا ہوا نظر
 اجاتا تو قرآن شریف کی کوئی آیت اُس کی زبان و قلم سے نکل جاتی تو لوگوں کو
 ایک نہایت تعجب انگیز اور غیر معمولی واقعہ معلوم ہوتا۔ ایک خاص واقعے کی
 طرح اُس کا ذکر کیا جاتا کہ فلاں شخص نے کالج میں تعلیم پائی ہے اور ساتھ ہی
 نماز بھی پڑھ لیا کرتا ہے، بے

تھے اینگلو انڈین علماء کے قائم کردہ دو مراکز جو دیوبند اور علی گڑھ میں قائم ہوئے۔ اول الذکر
 کے کارکنوں نے خود کو دینی تعلیم کی کمی دور کرنے اور مسلمانوں کو علوم دینیہ سے مالا مال کر دینے
 والے ٹھیکیداروں کی صورت میں ظاہر کرنا شروع کیا اور موخر الذکر نے ملت اسلامیہ کو بتانا
 شروع کیا کہ ہم تو آپ کی مادی حالت کو سنوار کر مسلمان قوم کو ترقی کی منزلوں پر لے جانا
 چاہتے ہیں لیکن ساتھ ہی دونوں مراکز سے دہا بیت کے دو نئے ایڈیشن بھی شائع ہوئے
 اور وہ مستقل فرقوں کی شکل میں منصفہ شہود پر جلوہ گر ہو کر مسلمانوں میں تفریق و تشنّت کا بیج
 بونگے۔ دونوں مراکز کے ظاہری طور پر بچے اگرچہ ایک دوسرے کی ضد تھے لیکن بہر صورت
 دونوں میں اشتراک عمل کا جذبہ موجود تھا۔ مثلاً:

”علی گڑھ اور دیوبند کے اخلاقیات اصولی تھے اور کسی بغض و عناد یا رشتہ

حسد پر مبنی نہ تھے۔ اس لیے ان میں تلخی کبھی نہیں آئی۔ اس کے علاوہ چونکہ دیوبند اور علی گڑھ قوم کی دو مختلف ضروریات (دینی اور دنیوی تعلیم) کو پورا کرتے تھے، اس لیے ایک وقت ایسا بھی آیا جب انھوں نے تقسیم کار کا اصول اختیار کیا اور اپنے مختلف مقاصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے سے اشتراکِ عمل کیا۔ لے

اہلسنت وجماعت کے ناجی گروہ میں سے مسلمانوں کو اغوا کر کے جو فرقے بنائے جارہے تھے ان کی تعداد یہاں آ کر تین ہو گئی تھی جن کی تفصیل حسب ذیل ہے :

۱۔ اہلحدیث — بانی مولوی محمد اسماعیل دہلوی

۲۔ دیوبندی — بانی مولوی محمد اسحاق دہلوی

۳۔ نیچری — بانی سر سید احمد خاں علی گڑھی

اہلحدیث جماعت کی ترقی تو کس میرسی کے باعث جامد ہو کر رہ گئی تھی مگر دین سے دلچسپی رکھنے والے بعض مسلمان دیوبندی گروہ کے جال میں پھنستے رہے، پھر بھی ایک دوسرے پورے ملک کے عوام پر کیا اثر انداز ہو سکتے تھے؟ لیکن جب سے ان حضرات نے اپنے تبلیغی وظائف کو اس امر پر مامور کر دیا کہ وہ اہلسنت کے عوام کو اغوا کریں اس وقت سے اس جماعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا ہے۔ نیچری مذہب خود تو ختم ہو گیا لیکن مرنے سے پہلے وارث چھوڑ گیا۔

۱۔ منکرین حدیث

۲۔ مرزائی

نیچریت سے بھی زیادہ نقصان، ملتِ اسلامیہ کو سرکاری اسکولوں اور کالجوں کی ندوہ تعلیم نے پہنچایا، جس کے باعث اکثر پڑھے لکھے صرف نام کے مسلمان رہ گئے اور بعض تو زے تنگ دین و ملت ہی ثابت ہوئے ہیں اور قوم کو ذہنی آوارگی اور پرانے

کی ترتیب دینے کا یہ سلسلہ ہنوز اُسی طرح جاری ہے۔ نو نہالانِ ملت ان دونوں چکروں میں پھٹے جا رہے تھے اور ان پڑھ مسلمان بھی، ان دونوں جماعتوں کی کامیابی کے راستے میں علمائے اہلسنت ہی مزاحم تھے لہذا ان حضرات پر قابو پانے کی غرض سے ندوة العلماء کا جال بچایا گیا۔ لیکن کیسی مزیدار ڈپلومیسی کے ذریعے یہ جال پھیلایا، مندرجہ ذیل حوالے کی تہ میں جھانک کر اس کا اندازہ کیجیے:

”اس عمدہ خیال (قیامِ ندوہ) کے محرک مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے، مگر اس کی تکمیل مولوی سید محمد علی کان پوری خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مراد آبادی کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی، جو اس کے بانی اور ناظمِ اول تھے۔ مولانا شبلی اور مولوی عبدالحق دہلوی صاحب تفسیر حقانی نے اس کے قواعد و ضوابط مرتب کیے۔ اکابر قوم مثلاً سر سید، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک نے بھی اس کے اغراض و مقاصد کو پسند کیا اور تحریر و تقریر کے ذریعے سے اس کا خیر مقدم کیا۔ ۱۸۹۸ء میں دارالعلوم کے کچھ ابتدائی درجے کھولے گئے اور ۱۸۹۹ء میں روسا شاہ جہان پور کی نیاضی سے کچھ زمینداری بطور وقف ندوة العلماء کو حاصل ہوئی۔ ایک عظیم الشان کتب خانہ کی بنیاد بھی ڈالی گئی۔“

وہ کون سی ضرورت یا مصلحت تھی جس کے تحت ”ندوة العلماء“ کا قیام عمل میں آیا؟
 ان بارے میں جناب شیخ محمد اکرام ایم۔ اے نے اپنے خیالات کا ان لفظوں میں اظہار فرمایا ہے:

”جدید علم الکلام بالعموم ان شخصوں نے ترتیب دیا، جو عربی اور فارسی کے فاضل تھے لیکن عام علماء کی جماعت سے انھیں کوئی تعلق نہ تھا اور بالعموم علماء نے ان کی مخالفت کی۔ مگر آہستہ آہستہ علماء میں بھی کچھ لوگ ایسے

پیدا ہو گئے جنہیں اس ضرورت کا احساس ہوا کہ اسلامی مدارس کا نصاب
ضروریاتِ زمانہ کے مطابق بنایا جائے اور قدیم علماء اور علی گڑھ پارٹی
کے بین بین ایک تعلیمی اور مذہبی طریقہ کار قائم ہو۔ چنانچہ اس مقصد کیلئے
۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم ہوا۔^۱

ندوہ کے بارے میں دیوبندی جماعت کے حکیم الامت مولوی اشرف علی تھانی
(المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) نے اپنے تاثرات کا مشاہدے کی روشنی میں اس طرح
اظہار کیا ہے:

”خود ندوہ کا جو حشر ہوا سب کو معلوم ہے کہ وہ ایسوں کے ہاتھ میں مدت
تک رہا جن کی طبیعت میں بالکل نیچریت تھی۔ وہی سرسید احمد خاں کے
قدم بقدم اُن کی رفتار رہی۔ وہی جذبات، وہی خیالات، کوئی فرق نہ تھا۔
یہ ندوی حضرات کے عقائد و نظریات کی بات تھی۔ مناسب نظر آتا ہے کہ علی گڑھ اور
دیوبندی خرابیوں کا ازالہ کرنے کا بیڑا اٹھانے والے، قوم کے دکھوں کا علاج کرنے والے
مسلمانوں کی کشتی کو بحسور سے نکال کر ساحل پر پہنچا دینے کا اعلان کرنے والے ندوی علماء
زہد و تقویٰ، خلوص و ملتیت اور خیر خواہی اسلام و مسلمین کی روحانیت سے لبریز اور سنی
کہانی مولوی ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۸ھ / ۱۹۵۸ء) کی زبانی پیش کر دی جا
ملاحظہ ہو:

”ندوۃ العلماء کے اجتماع سے مجھے روشن علماء کی جو حالت منکشف ہوئی کیونکہ
منتسبین ندوہ کی طرف میرا ایسا ہی حسنِ ظن تھا، اُس سے طبیعت کو اور
زیادہ مایوسی اور طبقہ علماء کی طرف سے سخت و سخت پیدا ہو گئی۔ مخالفین
ندوہ وہاں جو کچھ کہہ رہے تھے اُن کی نسبت تو خیال تھا کہ یہ روشن خیال نہیں

۱۔ محمد اکرام شیخ: موجِ کوثر، ص ۱۰۷

۲۔ ملفوظاتِ نضائی صاحب: الافاضات الیومیہ، جلد ۵، ص ۱۱۰

لیکن جو لوگ ندوہ کے لیے سرگرم تھے اُن کی بھی عجیب حالت نظر آتی تھی۔ چونکہ
پانچ چھ مہینے تک ان سرگرمیوں کو بالکل قریب سے دیکھتا رہا، اس لیے
اندرونی حالت بالکل میرے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بالکل چالاک دنیا داروں
کی سہی کارروائیاں کی جا رہی ہیں اور وہ تمام وسائل بے دریغ عمل میں لائے
جاتے ہیں جو اپنی کامیابی کے لیے ایک شاطر سے شاطر اور عیار سے عیار
جماعت کر سکتی ہے۔ لوگوں کو شامل کرنے کے لیے ہر طرح کی عباریاں کی جاتی تھیں۔
میرے سامنے ایک واعظ نے ندوے کے ایک سرگرم ایجنٹ سے
مشورہ کیا کہ مجلس وعظ میں کیونکر اُن کو اظہارِ جوش و خروش کرنا چاہیے اور کیونکر
آخر میں نالہ و بکا شروع کر دینا چاہیے۔ چنانچہ تجویز پختہ ہو گئی۔ اس کے بعد
واعظ نے جو نئی تنوی کی ایک حکایت شروع کی دوسرے صاحب نے معاً
کھڑے ہو کر حالی بازوں کی طرح حرکتیں شروع کر دیں۔ اس سے مجلس وعظ
میں بڑی رقت ہو گئی اور اس قدر آہ و بکا ہوا کہ اس پر وعظ ختم کر دیا گیا۔ اس
طرح کی سبھیوں باتیں روز میں دیکھنا تھا اور میرے دل میں اس بلیقے کی طرف
سے وحشت بڑھتی جاتی تھی۔ ۱۷

دوا العلماء کی وسیع عمارت کا سنگ بنیاد کس بزرگ نے رکھا تھا، یہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے:

”ندوہ کی تاریخ میں ۱۹۰۸ء کا سال ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس
سال صوبہ (یو۔ پی) کے گورنر نے دارالعلوم کی وسیع عمارت کا سنگ بنیاد
رکھا اور حکومت کی طرف سے ندوہ کو بعض مقاصد کے لیے پانچ سو روپے
ماہوار امداد ملنی شروع ہوئی۔ ۱۸

جب ندوۃ العلماء کی وسیع عمارت کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا تھا، اُس وقت رنگ بزرگ

حاضرین کا مجمع، ندوہ کے کرتادھرتنا، علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) کی روایت سے
 کو کس طرح مسور کر رہا تھا، اس کا اندازہ خود علامہ شبلی کے مندرجہ ذیل فخریہ بیان سے
 بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

”یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ترکی ٹوپیاں اور عمامے دوش بدوش نظر آتے تھے۔
 یہ پہلا ہی موقع تھا کہ مقدس علماء عیسائی فرمانروا کے سامنے دلی شکرگزاری
 کے ساتھ ادب سے خم تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ شیعہ و سنی ایک مذہبی
 درس گاہ کی رسم ادا کرنے میں برابر کے شریک تھے۔ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ
 ایک مذہبی درس گاہ کا سنگ بنیاد ایک غیر مذہب (یعنی انگریز) کے ہاتھ
 سے رکھا جا رہا تھا۔ غرض یہ پہلا ہی موقع تھا کہ ایک مذہبی سقف کے نیچے
 نصرانی، مسلمان، شیعہ، سنی، حنفی، وہابی، رند، زاہد، صوفی،
 واعظ، غرقہ پوش اور کجکلاہ سب جمع تھے۔“ لہ

جس مقصد کی خاطر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں لایا گیا تھا، سعی بسیار کے باوجود
 مقصد حاصل نہ کیا جاسکا۔ علمائے اہلسنت اس پُر فریب جال سے دُور ہی رہے۔ بعض
 سادہ لوح علماء جو بدقت صحیح اندازہ نہ لگا سکے وہ صورتِ حال کے سامنے آتے ہی مجتنب
 ہو گئے۔ شروع میں ندوہ ہر قسم کی بدنمذہبی کامعجون مرکب رہا اور نیچریت اس کا جزوِ غلط
 یہ معجون صلحِ کلیت کے زہریلے قوام سے تیار کی گئی تھی۔ علامہ سید سلیمان ندوی (المتوفی
 ۱۳۷۳ھ / ۱۹۵۳ء) کے آخری دور میں یہ ادارہ ”دارالعلوم دیوبند“ کی ایک شاخ ہی
 شمار کیا جانے لگا تھا۔

علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) اپنے آخری ایام میں کچھ دہشت کی طرح
 مائل ہوتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں جیسا کہ اُن کی تصنیف ”الکلام“ کے مطالعہ سے واضح
 ہوتا ہے۔ رہی موصوف کی ایجاد کردہ صلحِ کلیت، تو اس کے بعد گاندھویت کی بلاخیز آمد

ایسی ہمہ گیر بن کر چڑھی تھی کہ اس کے عظیم نقصانات کے سامنے صلح کلیت کے بگولے کی مضر توں کا چرچا بھی عام زبانوں سے اُتر جانا قدرتی امر تھا۔ گاندھویت اور گاندھوی علما کے کارناموں کی جھلک باب پنجم میں ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہے۔

انگریزوں نے جب بڑے صغیر پاک و ہند میں اپنے قدم جما لیے اور سارے مرزائے قادیان ملک پر قابض ہو جانے کے اُنھیں امکانات بھی نظر آنے لگے تو اُنھوں نے اپنے بعض پادریوں کو اس امر کا جائزہ لینے کی دعوت دی کہ مسلمانانِ ہند کے اندر، داخلی طور پر، مستقل اور پائدار انتشار و افراق کس طریقے سے پیدا کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ پادری حضرات نے جائزہ لے کر رپورٹ پیش کی، وہ علامہ خالد محمود سیالکوٹی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”یہاں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی اکثریت پیری مریدی کے رجحانات کی حامل ہے۔ اگر اس وقت ہم کسی ایسے غذا کو ڈھونڈتے ہیں کامیاب ہو جائیں جو ظلی نبوت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہو جائے تو اُس کے حلقہ نبوت میں ہزاروں لوگ جوق در جوق شامل ہو جائیں گے، لیکن مسلمانوں میں اس قسم کے دعویٰ کے لیے کسی کو تیار کرنا ہی بنیادی کام ہے۔ یہ مشکل حل ہو جائے تو اُس کی نبوت کو حکومت کے زیرِ سایہ پروان چڑھایا جاسکتا ہے۔ ہم اس سے پہلے بڑے صغیر کی تمام حکومتوں کو غذا تلاش کرنے کی حکمت عملی سے شکست دے چکے ہیں۔ وہ مرحلہ اور تھا۔ اُس وقت فوجی نقطہ نظر سے غداروں کی تلاش کی گئی تھی، لیکن اب جبکہ ہم بڑے صغیر کے چپے چپے پر حکمران ہو چکے ہیں اور ہر طرف امن و امان بھی بجالا ہو گیا ہے تو ان حالات میں ہمیں کسی ایسے منصوبے پر عمل کرنا چاہیے جو یہاں کے باشندوں کے داخلی انتشار کا باعث ہو۔“

اس رپورٹ کے بعد یا اس سے بھی پہلے انگریزوں نے یہ منصوبہ ضرور بنایا ہو گا معلوم
ایسا ہوتا ہے کہ ”صراط المستقیم“ کتاب سید احمد صاحب بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء)
کے دعویٰ نبوت کی تمہید ہی تھی، جس میں وحی باطنی، عصمت، باری تعالیٰ شانہ، ایک صورت
اور اس سے ہمکلامی تک کے دعویٰ بھرے پڑے ہیں لیکن دستِ قضا نے اُنھیں
منزلِ مقصود پر پہنچنے کی مُہلت نہ دی۔ اس کے بعد ”تذییر الناس“ کتاب بھی کچھ ایسے ہی
منصوبے کی تکمیل کا ساتھ دیتی ہوئی نظر آ رہی ہے لیکن اس کے مصنف مولوی محمد قاسم
نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۹ء) بھی اس بنیاد پر عمارت تعمیر کرنے یا تعمیر کروانے
سے پہلے ہی راہی ملکِ عدم ہو گئے اور مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) ہی ایسے
نکلے جو برٹش گورنمنٹ کے اس ناپاک منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچا سکے۔ مرزا صاحب کے
مذہبی خیالات و رجحانات کے بارے میں شیخ محمد اکرام صاحب کا خیال یہ ہے:

”مولوی چراغ علی صاحب سے مرزا صاحب کی خط و کتابت تھی اور جہاد کے
متعلق وہ مولوی صاحب کے ہم خیال تھے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کے
متعلق اُنھوں نے بشیرِ سرسید کے خیالات کی پیروی کی لیکن باوجودیکہ اُن
کی تعلیمات میں کئی باتیں نو معزلہ خیالات سے قریب تھیں، وہ اکثر اصولی
باتوں میں قدامت پسند تھے اور عام مسلمانوں سے اُن کے معتقدین بالخصوص
قادیانی گروہ کا اختلاف بشیرِ مرزا صاحب کے اپنے دعویٰ کے متعلق ہے۔
اُنھوں نے مسیح موعود، مہدی منتظر اور کرشن اوتار ہونے کا دعویٰ کیا اور
یہ ایسے دعوے ہیں، جن کو عام مسلمان غلط سمجھتے ہیں۔ نبوت کا دعویٰ کر کے
اور ایک نیا فرقہ کھڑا کر کے اُنھوں نے مسلمانوں میں جو اختلاف پیدا کیا اُسے
بھی اکثر مسلمان ناپسند کرتے ہیں۔“ لے

مرزا غلام احمد قادیانی، جہاں سرسید احمد خاں اور اُن کے دستِ راست مولوی

چراغ علی صاحب کے متبع یا ہم خیال تھے وہاں اُنھیں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) سے بھی بڑی عقیدت تھی، چنانچہ دیوبندی عالم مولوی عبدالرشید ارشد نے اس سلسلے میں یوں وضاحت کی ہے:

”مرزا غلام احمد قادیانی جس زمانے میں براہین لکھ رہے تھے اور اُن کا اخبارات میں چرچا ہو رہا تھا، اُس وقت اُن کو حضرت امام ربانی (یعنی گنگوہی صاحب) سے عقیدت تھی۔ اُس طرف جانے والوں کو پوچھا کرتے تھے کہ حضرت مرزا اچھی طرح ہیں؟ اور دہلی سے گنگوہ کتنے فاصلے پر ہے؟ راستہ کیسا ہے وغیرہ۔ اُسی زمانہ میں حضرت نے ایک دفعہ یوں فرمایا تھا کہ ”کام تو یہ شخص اچھا کر رہا ہے مگر پیر کی ضرورت ہے ورنہ گمراہی کا احتمال ہے“۔ لے

بہر حال یہ راز دنیا کی باتیں ہیں جنہیں ہمارے جیسے نا اہل افراد سمجھ ہی نہیں سکتے کہ مرزا صاحب کو مولوی رشید احمد گنگوہی سے عقیدت کیوں ہوئی؟ گنگوہی صاحب نے مرزا صاحب کو مرد صالح کیوں قرار دیا تھا اور اُن کے کاموں کو کس بنا پر سراہا جا رہا تھا؟ نہیں معلوم کہ موصوف کو مرزا صاحب کے بے پیر رہنے اور پیر کی ضرورت ہونے کا کس طرح علم ہوا، یا خود اُن کے پیر ہونے کا شرف حاصل کرنے کے خواہشمند تھے؟ ہم یہ عقدہ بھی حل کرنے سے عاجز ہیں کہ ادھر تر گنگوہی صاحب اپنی روحانیت سے قادیان کے ایک فرد کی گمراہی کا احتمال بھی دیکھ لیا کرتے تھے لیکن دوسری طرف اُنھیں وہ لوگ بھی نظر نہیں آتے تھے جو گنگوہ، انبٹھ، سہارن پور اور دیوبند میں بیٹھ کر باری تعالیٰ شانہ کو جھوٹا بتاتے رہتے تھے۔ اس راز کو دیوبندی حضرات تو یقیناً سمجھتے ہوں گے۔

پروفیسر ابو زبرہ مصری نے مرزا غلام احمد قادیانی کا تعارف یوں کر دیا ہے:

”انگریز جو مغربی تہذیب و ثقافت کو دیا رہند میں لائے تھے، مغربی تہذیب کے دلدادہ مسلمانوں سے بڑا لگاؤ رکھتے، اُنھیں تقرب بارگاہ سے مشرف کرتے

اور بڑے بڑے عہدوں سے نوازتے تھے۔ اس قسم کے مسلمان حاکم اُن دیار میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ یہی وجوہات تھے جن کی بنا پر سرزمین ہند گمراہ فرقوں کی قرار گاہ بن گئی۔ غالباً قلتِ تعداد کے علی الرغم اُن فرقوں میں زیادہ نمایاں، قوی تر اور ترقی یافتہ قادیانی گروہ تھا۔ قادیانی فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔ اس کے بانی و مؤسس مرزا غلام احمد قادیانی تھے، جن کی وفات ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء میں ہوئی۔ اُس کی نسبت قادیان کی طرف سے جو ایک قصبہ ہے اور لاہور سے ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ مرزا غلام احمد وہاں مدفون ہیں۔ اُن کی قبر پر ”مرزا غلام احمد موعود“ کے الفاظ مرقوم ہیں۔ موعود سے مراد یہ ہے کہ مرزا صاحب وہی مہدی ہیں جن کا انتظار کیا جاتا تھا کہ وہ اگر شریعت کی احیاء و تجدید کریں گے۔“ لہ

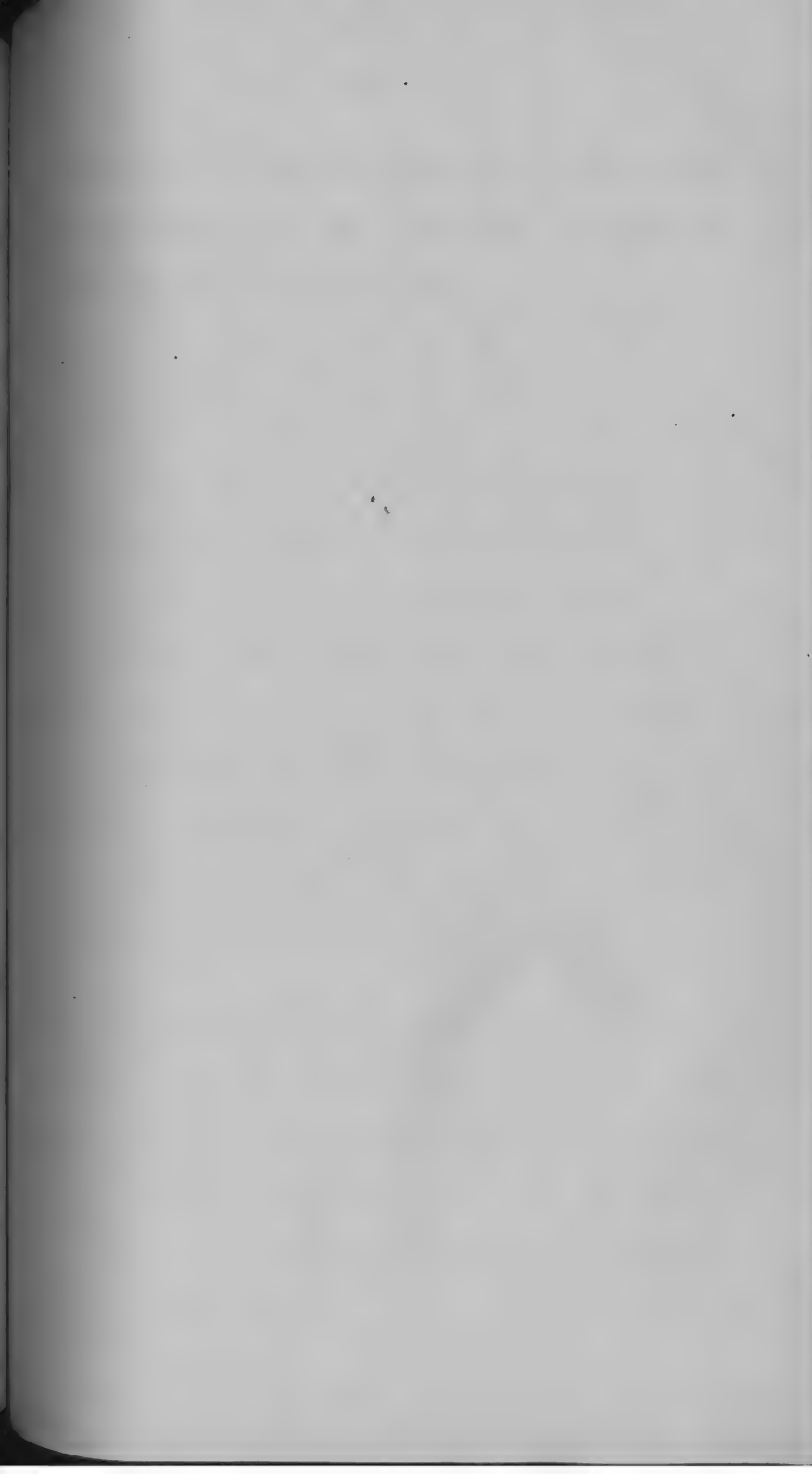
مرزا غلام احمد قادیانی کی تعلیمات کے بارے میں مذکورہ مصری فاضل کی رائے قابلِ غور ہے، فرماتے ہیں،

”حق بات یہ ہے کہ آپ کا قریبی تعلق ائمہ شیعہ سے ہے۔ شیعہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اُن کے ائمہ معصوم و ملہم ہیں اور اُن کے ہاتھوں معجزات کا صدور ہوتا ہے تاہم وہ یہ نہیں کہتے کہ اُن پر وحی نازل ہوتی ہے یا وہ خدا سے شرفِ ہم کلامی حاصل کرتے ہیں۔ بہر حال مرزا صاحب کی تعلیمات کا اسلام سے کوئی سروکار نہیں۔“ لہ

قارئین کرام! جن حضرات کے ذریعے برٹش گورنمنٹ نے تخریبِ دین اور افتراقِ بین المسلمین کا منصوبہ پالیہ تکمیل کو پہنچایا تھا، اُن میں سے بعض حضرات کا گزشتہ سطور میں مختصر سا تذکرہ کر دیا ہے۔ یہی تھے وہ حضرات جنہیں پُر اسرار طریقے پر، پروپیگنڈا مشینری کے بل بوتے پر

پورے برطانوی دور میں مسلمانوں کے رہنما منوایا جاتا رہا اور آج تک انگریزوں کی اسی سنت پر کمال سعادت مندی سمجھ کر عمل کیا جا رہا ہے۔ حقیقت تو ہر چشم بینا کے سامنے واضح ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی نے الٹی گنگا بہائی ہوئی ہے یعنی :۔

دائیں خضرہ کی قبا چھین کر
رہنما بن گئے ، دیکھتے دیکھتے



باب سوم

اعلانِ حق

علامہ جزِ رضائے تو نجوم
 جزِ آں را ہے کہ فرمودی نہ پویم
 ولیکن گر بایں ناداں بگوئی
 خرے را اسپ تازی گو ، نہ گویم
 (علامہ اقبال)

فرقہ سازی

قارئین کرام! گزشتہ باب میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ برٹش گورنمنٹ نے انتہائی رازداری کے ساتھ کن علماء کے ذریعے سچے اسلام کو بدلنے اور مسلمانوں کی جمعیت کو منتشر و پریشان کرنے کا کام لیا۔ کہاں کہاں اُن کے مراکز قائم کیے۔ حکومت اور اُس کے کارندے اس منصوبے میں یہاں تک کامیاب ہوئے کہ اہلسنت میں سے جن لوگوں کو اغوا کر کے مختلف جماعتیں علیحدہ علیحدہ قائم کر لیں، اُن جماعتوں کو کافروں اور مشرکوں سے مقابلہ کرنے کی تو آج تک توفیق نصیب نہیں ہوئی لیکن اُن کے نمائندے اور کارندے مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے آج تک برسہا برس بیکار چلے آتے ہیں، جو برطانوی منصوبے کی منزل مقصود تھی۔ مسلمانوں کی سابقہ جماعت سے علیحدہ ہوں تو کتنی ہی ٹوٹیاں بنائی گئیں لیکن برصغیر پاک و ہند میں آج اُن میں سے پانچ قابلِ ذکر اور مستقل فرقے موجود ہیں، جو مذکورہ برطانوی منصوبے پر اب بھی آٹو میٹک مشین کی طرح سرگرم عمل میں۔ وہ سارے جدید فرقے یہ ہیں:

۱۔ اہلحدیث فرقہ اس گروہ کے بانی بلکہ برصغیر پاک و ہند میں جتنے بھی فرقے برٹش گورنمنٹ کے منحوس دور میں پیدا ہوئے اُن سب کے مورثِ اعلیٰ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۶۶ھ / ۱۸۳۱ء) ہیں۔ سب جماعتوں کا سلسلہ نسب

یہاں آکر ہی قتا ہے جبکہ موصوف کی اصل جماعت وہی تھی جو آج فرقہ اہلحدیث کے نام سے متعارف ہے۔ شروع ایام میں یہ فرقہ ”محمدی گروہ“ کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ جب مسلمانانِ اہلسنت و جماعت نے کتنا شروع کر دیا کہ واقعی یہ محمدی ہیں کیونکہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے پیرکار جو ہیں۔ اس نشانِ دہی سے بچنے کی خاطر ان حضرات نے اپنا سابقہ لیبیل ہٹا کر خود کو ”محمد کنا“ شروع کر دیا۔ علمائے اہلسنت کہنے لگے کہ یہ حضرات چونکہ عقیدہ رسالت کے ایسے افراد میں قائل ہیں جو انکار رسالت سے چنداں مختلف نہیں، لہذا انکار رسالت ہونے کی صورت میں انہوں کی طرح نرے محمد ہی تورہ گئے، اگرچہ ان کا عقیدہ توحید بھی خانہ سازی یا خواجہ دالہ ہے۔

آخر اس لیل سے بھی یہ فرقہ بدکنے اور کترانے لگا۔ ان حالات میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے اس جماعت کا نام اپنی مہربان سرکار سے اہلحدیث منظور کروایا، سرکاری کاغذات میں لکھوایا اور ملک کے ہر گوشے میں برٹش گورنمنٹ نے یہ حکم پہنچایا کہ آئندہ اس جماعت کو اہلحدیث کے نام سے موسوم کیا جائے۔ چند سال محمدی اور موحد کہلانے کے بعد ۱۸۸۸ء سے یہ فرقہ اہلحدیث کے نام سے موسوم چلا آ رہا ہے۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان کے ذریعے خارجیت اور صراط المستقیم نصاب سے رفض پھیلا یا تھا۔ اہلحدیث حضرات نے موصوف کے رفض کو چھوڑ کر ان کی خارجیت و ظاہریت کو اپنے دین کی بنیاد بنا رکھا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر دیکھا جائے تو یہ حضرات اب محمد بن عبدالوہاب نجدی کے بالکل نزدیک اور رفض چھوڑنے کے باعث مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے کافی دور ہو چکے ہیں۔

یہ فرقہ بھی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا تتبع اور موصوف کا عاشق زار ہے۔
۲۔ دیوبندی فرقہ اس فرقہ کے جماعت اہلحدیث سے جدا ہونے کی وجہ اور علیحدہ تشخص کی ضرورت ان کی مخصوص ذہنیت اور سابقہ جماعت کی ناکامی سے سبق حاصل کرنا ہے۔ اس جماعت کا سنگ بنیاد مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء) نے رکھا۔ اس گاڑی کو باقاعدگی سے چلانے کی غرض سے علماء کی کھپ مولوی مملوک علی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ/ ۱۸۵۱ء) نے دہلی کالج میں تیار کی جب مدرسہ دیوبند قائم ہو گیا، اُسے مرکز قرار دے کر علیحدہ جماعت کی تشکیل ہونے لگی تو اس نوزائیدہ گروہ کے مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ/ ۱۹۰۵ء) اور مولوی محمد قاسم نانوتوی (المتوفی ۱۲۹۷ھ/ ۱۸۷۹ء) سرگروہ قرار پائے۔ وہابیوں کا یہ ٹولہ خود کو سنی حنفی ظاہر کر کے انتہائی دلفریب انداز میں بھولے بھالے اور حقیقت حال سے بے خبرستیوں کو رات دن اغوا کرنے میں مصروف ہے۔ یہ گروہ اس لحاظ سے وہابیوں کی جملہ جماعتوں سے خطرناک ہے کہ ان کے وہابی ہونے کا عوام تو اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ علاوہ بریں اس جماعت کے تقبی بند تبلیغی رضا کار اس درجہ تالیفِ قلوب اور دلفریبی کے ساز و سامان سے مسلح ہو کر سنیوں کو اغوا کرنے اور اپنی جماعت میں ملانے کی خاطر نکلتے اور ملک کے کونے کونے میں پھیلتے ہیں کہ اس پراسرار جال

نوش نصیب مسلمان ہی بچتے ہیں ورنہ کہتے ہی اس ظاہری دلفریبی سے دھوکا کھا کر خود اس جال میں پھنسنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔

۳۔ نیچری فرقہ یہ بھی محمدی گروہ کی ایک شاخ اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے معتقدین علی گڑھی نے رکھا تھا۔ اس کا مرکز علی گڑھ کالج قرار پایا۔ موصوف کے معاونین میں ابراہیم خان خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سمیع اللہ خاں دہلوی وغیرہ حضرات تھے۔

مذہبی معاملات میں ان کے مشن کو مولوی چراغ علی (المتوفی ۱۸۹۵ء)، رائٹ آنر بیل سید امیر علی جنسوری (المتوفی)، وقار الملک (نواب مشتاق حسین)، محسن الملک (سید مہدی علی خاں) اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ نے پروان چڑھانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا بلکہ ہمہ وقت نیا مذہب گھڑنے اور مقدس اسلام کو ذبح کرنے میں مصروف رہے۔

جب عبد اللہ چکڑاوی، مولوی محمد اسلم جیرا چوری اور ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے ہاتھوں میں نیچری مذہب پہنچا تو اس نے چکڑاویت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ فرقہ عقیدہ رسالت اور احادیث مطہرہ کے خلاف ایک چیلنج ہے۔ قرآنی تعلیمات کے علمبردار ہونے کا مدعی لیکن کلام الہی کے خلاف پراسرار سازش ہے۔ دعویٰ مسلمان ہونے کا ہے لیکن ان کے نظریات اسلامی تعلیمات کو مسخ کرتے ہیں۔ آج کل اس فرقے کے سربراہ، پروفیسر غلام احمد پریز ہیں۔ موصوف نے چکڑاویت میں کمیونزم اور سوشلزم کو بھی شامل کر کے ایک طلسمی معجون تیار کی ہوئی ہے جو پریزیت کے نام سے متعارف اور ۲۵ بی گبرگ لاہور سے دستیاب ہے۔

۴۔ مرزائی فرقہ اس فرقے کے بانی مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء) ہیں۔ موصوف نے دعویٰ نبوت کو کے اپنے متبعین کے دائرہ اسلام میں رہنے یا مسلمان کہلاتے جانے کا سوال ہی ختم کر دیا۔ مرزا صاحب شروع یام میں نیچریت کی طرف مائل تھے۔ دیوبندیت سے کسی قدر پیار اور مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کے بھی درپردہ عاشق زار تھے۔ شیعہ حضرات کی صحبت، ہدایت کے مطالعے اور گورنمنٹ کی حوصلہ افزائی سے نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے، جس کی جسارت

کوئی مسلمان کہلانے والا ہرگز ہرگز نہیں کر سکتا۔ موصوف کی جماعت بھی دو گروہوں میں بٹ گئی ہے، (۱) قادیاہی (۲) احمدی لاہوری

قادیاہی حضرات مرزا صاحب کو نبی مانتے ہیں اور لاہوری پارٹی والے موصوف کے دعویٰ نبوت کی تاویل کر کے اُنھیں چودھویں صدی کا مجدد قرار دیتے ہیں۔ نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھا جائے تو آپ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے حضرات کو سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نبی، مجدد یا محض ایک مسلمان بھی نہیں بلکہ دجال ٹھہرایا ہے اور ایسے دجالہ کی فہرست کا اعلان فرماتے ہوئے اُن کی تعدد بھی نہیں بتائی ہوئی ہے۔ چونکہ قادیاہی اور لاہوری مرزائی خود کو مسلمان ہی کہتے ہیں، لہذا ہماری دعا ہے کہ باری تعالیٰ شانہ ان حضرات کو مسلمان ہی بنادے اور ہمیں اسلام پر قائم رکھے۔ امین

مذکورہ چاروں فرقوں کے علاوہ، جو برٹش گورنمنٹ کے منحوس دور کی زندہ یادگار ہیں، اور بھی چند فرقوں کا سنگ بنیاد رکھا گیا، جن کا یہاں ذکر کر دینا بے جا نہ ہوگا۔ وہ یہ ہیں :

۵۔ صلح کلیت و دہریت بالکل دینی اور دوسرا سراسر دنیاوی معلوم ہوتا تھا۔ لہذا بعض حضرات کی رائے ہوئی کہ ایک ان کے مابین راستہ قائم کیا جائے۔ اس خیال کے پیش نظر ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا۔ علامہ شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۲۲ھ/ ۱۹۱۴ء) اس کے کوئٹہ دھرتا تھے۔ موصوف نے اپنی مخصوص ذہنیت و خیالات کے تحت ندوے سے تین فائدے حاصل کرنا چاہے :

- ۱۔ علمائے اہلسنت کو برٹش گورنمنٹ کے جال میں پھنسانا۔
- ۲۔ صلح کلیت کی تبلیغ کہ ہر کلمہ گو مسلمان ہے، خواہ وہ خدا کا انکار کرے یا رسالت کا منکر ہی کیوں نہ ہو۔ صحابہ کرام کو گالیاں دے یا نبوت کا دعویٰ کرے، قرآن و سنت کا منکر ہو یا عقائد اسلامیہ سے منحرف، کسی حالت اور کسی صورت میں اُس کے

مسلمان ہونے پر کوئی حرج نہیں آتا۔

۳۔ دہریت کا پرچار

مؤرخانہ ذکر نظر یہ چونکہ دیوبندی حضرات نے ٹھکرا دیا تھا لہذا اعلیٰ گزشتہ حضرات بھی دب گئے۔ علمائے اہلسنت کو اس جال میں چھنسانے کی اسکیم بھی ناکام رہی، لہذا باقی رہ گئی صرف صلح کلیت، جس کو تحریک خلافت نے اپنا امتیازی علم بنا کر گاندھی صاحب کی چوٹی پر بصد عقیدت لہرا دیا۔ جب یہ علم بھی دیوبندی حضرات کے ہاتھوں میں آگیا تو علامہ سلیمان ندوی کے دور سے مددہ اعلیٰ ایک دیوبندی ادارہ ہو کر رہی رہ گیا۔ ندویوں نے رنگ تو بہت سے بدلے لیکن خدا کا شکر ہے کہ کوئی نیا فرقہ بنانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۴۔ خاکسار پارٹی اس فرقے کے بانی علامہ عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۳ھ) اٹھاتھا لیکن نصف صدی ہی گزرنے پائی تھی کہ بلیے کی طرح بیٹھ گیا۔ اس جماعت کا نام تو موجود ہے لیکن وجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے برائے نام ہی رہ گیا۔

۵۔ جماعت اسلامی اس گروہ کے بانی مہمانی جناب ابوالاعلیٰ مودودی ہیں۔ یہ جماعت دینی کم اور سیاسی زیادہ ہے۔ محمد بن عبدالوہاب نجدی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سیاسی عزائم اس جماعت کی منزل مقصود ہے۔ دینی لحاظ سے بھی اس فرقے کا ذہن مخصوص ہے جو اہلحدیث اور دیوبندی حضرات میں سے کسی کے ساتھ مکمل اتفاق اور مطابقت نہیں رکھتا۔ چونکہ اس جماعت کا سیاسی اور مذہبی مزاج مودودی صاحب کی ذات کے گرد گھومتا ہوا نظر آتا ہے، دریں حالات امید یہی ہے کہ اس فرقے ہر بھی خاکسار پارٹی سے چنناں مختلف نہیں ہوگا۔ اگر مودودی صاحب کے بعد یہ جماعت باقی رہی بھی تو محض ایک سیاسی جماعت کے طور پر باقی رہے گی۔ واللہ اعلم بالصواب

مذکورہ فرقوں کی اصل وہابیت اور اس کا سنگ بنیاد رکھنے والے، متحدہ ہندوستان کے اس کی نشر و اشاعت کرنے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) ہیں۔ اس باب کے اندر ہم نے اسی امر کی وضاحت پیش کرنی ہے کہ دہلوی صاحب موصوف

اور دیگر فرقوں کے بانیوں نے نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس دین پر عمل چڑا کر
 کی مشقیں کر کے، ان کے نزدیک دین میں خدا اور اس کے آخری رسول سے جو غلطیاں
 ہو گئی تھیں ان کی اصلاح کر کے، جو نئے نئے اسلام گھڑے تھے وہ تعلیمات و نظریات
 کیا ہیں جو محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین سے متضاد و اور رُوح اسلام کے راز
 منافی ہیں۔ وباللہ التوفیق وبہ الوصول الی سرری التحقیق اللہم ارنا الحق
 حقاً والباطل باطلاً والحقنا بالصالحین آمین یا ارحم الراحمین
 بحق سید المرسلین و صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ محمد و علی آلہ وصحبہ
 اجمعین الی یوم الدین۔

رئیس المبتدین مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تخریب کاری

جیسا کہ قبل ازیں وضاحت کی جا چکی ہے کہ متحدہ ہندوستان میں فرقہ بازی کا سنگ بنیاد
 مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے رکھا۔ موصوف نے اپنی رسوائی
 اور ایمان سوز کتاب تقویۃ الایمان کے ذریعے خارجیت کی تبلیغ کی۔ اس کے ساتھ ہی دائرہ
 ظاہری کے انکار تقلید اور معتزلہ کے مزار پر فرقہ سے امکان کذب کا عقیدہ لے کر سب کو
تقویۃ الایمان میں اکٹھا کیا گیا تقویۃ الایمان کی اصل بنیاد تو محمد بن عبد الوہاب نجدی کی کتاب تہذیب
 پر رکھی گئی لیکن اس میں ظاہری المذہب اور اعتزال کی قباحتوں کے لیے بھی پوری پوری گنجائش
 رکھی گئی۔ دوسری طرف صراط المستقیم کتاب کے ذریعے رفض کی بھی کھل کر اشاعت کی
 شیعہ حضرات جو اپنے ائمہ کی شان بیان کیا کرتے ہیں، انھیں صاحب وحی و عصمت اور امام
 کرام سے بھی افضل بتاتے ہیں، موصوف نے یہ تمام صفات اپنے پیروی میں بتا دیں بلکہ انھیں
 اتنا بڑھایا چڑھایا کہ اگرچہ دعویٰ نہیں کیا مگر ہر قدم پر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے
 بھی افضل و اعلیٰ ہی منوانے کی کوشش کی۔ یہ امر صراط المستقیم کتاب سے بخوبی واضح ہے
 اس کا روشن بیان عنقریب آنے والا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔ موصوف کے کارہائے
 کے چند اہم گوشے ملاحظہ ہوں :

انکارِ تقلید کی طرف مولوی محمد اسماعیل کیوں راغب ہوئے جبکہ اُن کے پیشوا
 ۱۔ ترکِ تقلید نجدی دہابی بھی تقلید کے منکر نہیں بلکہ حنبلی ہونے کے مدعی تھے۔ حقیقت
 یہ ہے کہ تقلیدِ ائمہ دین ہی ایک ایسی چیز ہے جو مسلمانوں میں فرقہ بازی اور دین میں فتنہ و فساد
 برپا کرنے والوں کے راستے میں دیوارِ چین کی طرح حائل ہو جاتی تھی۔ حکومت نے محسوس کیا
 کہ تحریک کاروں کے راستے کی اس رکاوٹ کا سب سے پہلے دُور ہونا از بس ضروری ہے
 تاکہ ان کے بعد جس پر بھی محقق، مصلح، ریفارمر اور شمس العلماء کا لیبل لگا کر کھڑا کیا جائے،
 اسلاف سے انکارِ تقلید کی بدولت رابطہ منقطع ہونے کی وجہ سے، بہت سے مسلمان اُن کے
 پیچھے لگ جائیں گے۔ چونکہ ہر مصلح و ریفارمر کی تعلیم جدا ہوگی لہذا جتنے ریفارمر کھڑے کیے
 جائیں گے اتنے ہی فرقے باسانی بن سکیں گے۔ اس برطانوی منصوبے کے تحت موصوف
 نے مسلمانوں کا رشتہ اکابر سے منقطع کرنے اور فرقہ سازی کے لیے دروازہ کھولنے کی غرض
 سے تقلید کو شرک اور گیارہ سو سالہ مسلمانوں اور اُمتِ محمدیہ کو مشرک و جہنمی ٹھہراتے ہوئے صاف
 صاف مشرک کہہ دیا اور اپنے خاندانی اکابر کو بھی دوزخ سے بچانے کی پروا نہ کرتے ہوئے
 لکھ دیا :

لبت شعری کیف یجوز التزام	یعنی میں کیسے جانوں کہ ایک شخص کی تقلید
تقلید شخص معین مع تمكن الرجوع	کو لیے رہنا کیونکہ حلال ہوگا جبکہ اپنے
الی الروایات المنقولة عن النبی	امام کے مذہب کے خلاف صریح حدیثیں
صلی اللہ علیہ وسلم الصریحة الدالة	پاسکے۔ اس پر بھی امام کا قول چھوڑ
على خلاف قول الامام فان لم یترك	تو اس میں شرک کا میل ہے۔
قول امامه فقیہ شاذیة من الشرک	(نعوذ باللہ من ذلک)

مشرک کہنے کے ساتھ موصوف نے تقلیدین کو زالی جرأت مندی سے نصرانی بھی ٹھہرایا ہے۔
 چنانچہ لکھتے ہیں :

اتباع شخص معین بحیث یتمسک
بقولہ وان ثبت علی خلافہ
دلائل من السنۃ والکتاب وبأدل
الحی قولہ ثوب من النصرانیۃ
وحظ من الشریک والعجب من
القوم لا یخافون من مثل هذا
الاتباع بل یخیفون تاسرکہ - ۱۰

یعنی ایک امام کی پیروی کہ اُس کی
بات کی سند پکڑے اگرچہ اُس کے خلاف
کتاب و سنت سے ثابت ہو اور
اُنھیں آیات و احادیث کو اُس
قول کی طرف پھیرے۔ یہ نصرانی ہونے
کا میل اور شرک کا حصہ ہے اور تعجب
کہ وہ لوگ خود تو اس تقلید سے ڈرتے
نہیں بلکہ اِس کے چھوڑنے والے کو
ڈراتے ہیں۔

ائمہ مجتہدین و اکابر اسلاف سے مسلمانوں کو رشتہ تعلق منقطع کرنے کی موصوف نے
کنا یہ تلقین کرتے ہوئے تقلید کے بارے میں اپنے خیالات کا یوں اظہار کیا ہے:
”اس زمانہ میں دین کی بات میں لوگ کتنی راہیں چلتے ہیں، کتنے پہلوں کی رسموں
کو پکڑتے ہیں، کتنے قصے بزرگوں کے دیکھتے ہیں اور کتنے مولویوں کی باتوں کو
جو اُنھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکالی ہیں سند پکڑتے ہیں اور کوئی اپنی
عقل کو دخل دیتے ہیں۔ ان سب سے بہتر راہ یہ ہے کہ اللہ اور رسول کے
کلام کو اصل رکھیے، اُس کی سند پکڑیے۔“

یہ بالکل بجا کہ اللہ و رسول کا کلام اصل ہے، سند بھی اُسی کی پکڑنی چاہیے۔ لیکن
سوال یہ ہے کہ اللہ و رسول کے کلام کو سند کو نہ پکڑے، عالم یا جاہل، جاہل تو اللہ و
رسول کے کلام کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ یقیناً وہ علمائے کرام کی طرف ہی رجوع کرے گا
یا تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے تو بزرگوں کی آسان تصانیف سے دین سمجھنے کی کوشش کرے گا

۱۰ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تنویر العینین

۱۰ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۲۵، ۲۶

اُن بزرگوں کی تصانیف سے جن پر اُمتِ محمدیہ کا اعتماد رہا ہے لیکن دہلوی صاحب فرماتے ہیں کہ خواہ تم قرآن و حدیث کا ایک لفظ نہیں جانتے، اُس زبان سے مطلقاً ناواقف ہو لیکن پہلے بزرگوں کی باتیں مت مانو، وہ تو اُنھوں نے اپنے ذہن کی تیزی سے نکال کر کھڑی کر دی تھیں، پس قرآن و حدیث کی سند پکڑو۔ لیکن یہ نکتہ نہیں سمجھا یا کہ وہ ناواقف کس طرح قرآن و حدیث کی سند پکڑیں؟ نیز جب پہلے بزرگ اور مولوی سب ناقابلِ یقین ہیں تو خود یہ حضرتِ ناصح کہاں سے قابلِ اعتماد بن کر آگئے تھے اور خود لوگوں کو کیوں تلقین کرنے اور تقویۃ الایمان و دیگر تصانیف پڑھنے کی اور اپنی تقریریں سننے کی تلقین فرمانے لگے تھے؟ کیا موصوف کے ارشادات کا نام کتاب و سنت ہے؟

عوام الناس کو اکابر سلف سے رشتہ منقطع کرنے کا درس دینے اور براہِ راست قرآن و حدیث سے استفادہ کرنے کی تلقین فرما تو دمی لیکن کھٹکا ہوا کہ کہاں متحدہ ہندوستان کے مسلمان اور کہاں قرآن و حدیث کی تعلیمات۔ یہ بیچارے تو عربی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ ضرور وہ عرض کریں گے کہ حضرت! ہم قرآن و حدیث سے براہِ راست کس طرح ہدایت حاصل کریں؟ جب اسلاف کی تعلیمات پر کان ہی نہیں دھرنا تو موجودہ علماء میں ہی کون سے سرخاب کے پرگلے ہوئے ہیں کہ یہ اپنے ذہن کی تیزی سے باتیں نہ نکالیں گے یا خدا نے ان کے ماتھے پر لکھ دیا ہے کہ یہ ضرور کتاب و سنت کے حقیقی ترجمان ہیں۔ لہذا ان کوشتہ و موجودہ علماء کو چھوڑا، سب سے منہ موڑا، لیکن ہم تو قرآن و حدیث میں الف کے نام ب نہیں جانتے۔ اب بتائیے دین کیسے حاصل کریں؟ موصوف اسی خدشے کے پیشِ نظر یوں تلقین کرتے ہیں،

”یہ جو عوام الناس میں مشہور ہے کہ اللہ و رسول کا کلام سمجھنا بہت مشکل ہے، اس کو بڑا علم چاہیے۔ ہم کو وہ طاقت کہاں کہ اُن کا کلام سمجھیں۔ اُس راہ پر چلنا بڑے بزرگوں کا کام ہے، ہماری کیا طاقت کہ اس کے موافق چلیں، بلکہ ہم کو یہی باتیں کفایت کرتی ہیں جن پر چلے جاتے ہیں۔ سو یہ بات بہت غلط ہے۔ اس واسطے کہ اللہ صاحب نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں باتیں بہت صاف و صریح ہیں، ان کا سمجھنا مشکل نہیں۔“ لے

ناخواندہ مسلمانوں کے سوال کا موصوف کے پتے جواب تو کوئی نہیں تھا لیکن چونکہ اُنھیں اسی راستے پر لگانا مقصود تھا لہذا حوصلہ دینا پڑا کہ چاہے ایک لفظ کا بھی پتہ نہ چلے لیکن بات قرآن و حدیث سے کرو۔ یہ خطرہ نزدیک بھی نہ آنے دو کہ ہم بے علم ہیں۔ بس اتنا سمجھ لو کہ قرآن و حدیث کو سمجھنے کے لیے علم کی ضرورت ہی کب ہے؟ اور قرآن و حدیث کے سمجھنے میں الجھن ہی کہاں ہے جو تم ڈرتے پھر رہے ہو؟ اللہ کا نام لے کر خود کو مفسر اور محدث سمجھنا شروع کرو۔ آگے یوں تسلی دے دی ہے:

”اللہ ورسول کا کلام سمجھنے کو بہت علم نہیں چاہیے کہ پیغمبر تو نادانوں کے راہ بتانے کو، جاہلوں کے سمجھانے کو اور بے علموں کے علم سکھانے کو آئے تھے“۔
آگے سورہ جمعہ کی آیت ۶۲ پیش کر کے، قرآنی تحریف کے مرتکب ہو کر یوں ایٹمی حکم سُنادیا: ”جو کوئی یہ آیت سُن کر پھر یوں کہنے لگے کہ پیغمبر کی بات سوائے عالموں کے کوئی نہیں سمجھ سکتا اور اُن کی راہ پر سوائے بزرگوں کے کوئی نہیں چل سکتا، سو اُس نے اس آیت کا انکار کیا اور اس نعمت کی قدر نہ سمجھی۔“

ہمیں اپنی اس کوتاہ علی کا اعتراف کرتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی کیونکہ باوجود سعی بسیار کے یہ معلوم کرنے سے ہم آج تک قاصر رہے کہ دہلوی صاحب موصوف کا اصطلاح میں عالم اور بزرگ کی تعریف کیا ہے؟ آخر یہ منکر قرآن ہونے کا حکم کس دلیل سے ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ مذکورہ آیت میں جس حقیقت کا واضح ثبوت ہے اُسی کی ضد پر دہلوی صاحب اسے دلیل بنا لائے ہیں۔ یعنی آیہ کریمہ میں ہے تین امور کا تذکرہ ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مشاغل یہ ہیں:

- ۱۔ لوگوں پر قرآن پڑھنا
- ۲۔ انسانوں کا تزکیہ نفوس کر کے اُنھیں پاک کر دینا۔
- ۳۔ اُنھیں کتاب و حکمت سکھانا۔

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی تقویۃ الایمان، ص ۶۶

۲۷ ایضاً: ص ۲۷

آپ کے بعد یہ فرائض علمائے کرام و اولیائے عظام کے سپرد ہیں۔ لوگوں کو قرآن کریم نے ترغیب دی ہے کہ وہ کتاب و حکمت سیکھنے کے لیے علمائے کرام کی طرف اور تزکیۂ نفوس کے لیے اولیائے عظام سے رجوع کریں۔ چنانچہ حکم خداوندی ہے:

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ۔ ۱۵
جو کچھ تم نہیں جانتے وہ اہل علم (علماء) سے دریافت کرو۔

دوسرے مقام پر بزرگانِ دین کے اتباع کے بارے میں یوں واشگاف لفظوں میں فرما دیا گیا ہے:

وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ
الْحَقَّ۔ ۱۶
اُس کا اتباع کرو جو میری طرف رجوع لایا۔

لیکن مولوی محمد اسماعیل دہلوی معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت باری تعالیٰ شانہ کے حریف بن کر کھڑے ہو گئے کہ وہ مسلمانوں کو علمائے کرام اور اولیائے عظام کی طرف رجوع کرنے کا حکم فرماتا ہے تو موصوف اُس کے احکام کو قرآن کے خلاف اور انکار آیاتِ الہیہ بنا کر علماء و اولیاء سے کنارہ کش ہو کر خود قرآن و حدیث کو سمجھنے کی تلقین فرماتے ہیں حالانکہ جب تک علمائے کرام کی طرف رجوع نہ کیا جاتے قرآن و حدیث کا ایک لفظ بھی کوئی جان نہیں سکتا۔ دہلوی صاحب کی اس تلقین سے جو نتائج برآمد ہوتے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ انکارِ تقلید کی وجہ سے فرقہ بازی و فتنہ پر داری کا دروازہ کھل گیا۔

۲۔ قرآن و حدیث کے علوم حاصل کرنے کی غرض سے دہائی حضرات اپنے علماء کی طرف تو رجوع کرتے ہیں لیکن تیرہ صدیوں کے اکابر سے ان حضرات نے اپنا رشتہ حقیقتاً منقطع کر لیا ہے۔ تعلق کا صرف نام باقی ہے۔

۳۔ تزکیۂ نفس کے لفظ سے یہ لوگ آشنا ہوتے ہیں، لیکن اُس کی حقیقت ان کے لیے

عنقا ہو کر رہ گئی ہے۔

۲۔ توہینِ الوہیت مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے معتقدین یہی ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ جب دنیا شرک کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی تو موصوف نے مسلمانوں کو توحید سے آگاہ کیا اور شرک و کفر سے بچایا، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس نظر آتی ہے۔ جب وہ خارجیت کا علم لے کر کھڑے ہوئے تو باری تعالیٰ شانہ کو کس طرح معاف کر سکتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے باری تعالیٰ شانہ کو جھوٹا بتانے اور منوانے کی خاطر یوں اپنی منطق دانی کا اظہار کیا ہے :

”لانسلم کہ کذب مذکور محال بمعنی مسطور باشد چہ عقد قضیہ غیر مطابق الواقع والقاتے آں بر ملائکہ و انبیاء خارج از قدرت الہیہ نیست والا لازم آید کہ قدرت انسانی ازید از قدرت ربانی باشد“ ۱

اسی سلسلے میں موصوف نے مزید یوں کھل کر وضاحت کی ہوئی ہے :

”عدم کذب را از کمالات حضرت حق سبحانہ می شمارند و اُدرا جل شانہ باں مدح میکنند برخلاف انحرس و جماد و صفت کمال ہمیں است کہ شخصہ قدرت بنکلم بکلام کاذب دارد و بنا بر رعایت مصلحت و مقتضائے حکمت تنزیہ از ثوب کذب تکلم بکلام کاذب ننماید، ہماں شخص ممدوح می گردد و بخلاف کسے کہ لسان او مآؤف شدہ یا ہر گاہ ارادہ تکلم بکلام کاذب نماید آواز بند گردد یا کہ دہن او را بند نماید، ایں اشخاص نزد عقلاء قابل مدح نیستند۔ بالجملہ عدم تکلم بکلام کاذب ترفعا عن عیب الکذب و تنزیما عن التلوٹ بہ از صفات مدح است“ ۲

اس مسئلے کے بارے میں چونکہ اسی مجموعے کے اندر ایک مستقل عنوان کے تحت بحث

موجود ہے لہذا یہاں کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یہ ناپاک نظریہ ۱۲۲۶ھ / ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے اندر دفن ہو گیا تھا لیکن اٹھارہ سال بعد برٹش گورنمنٹ کے ایما و اشارے پر ۱۳۰۴ھ / ۱۸۸۷ء میں گنگوہ سے پھر ظہور پذیر ہوا اور براہین قاطعہ جیسی شرمناک کتاب کے صفحات پر پھیل قدمی کرتا ہوا دیکھا گیا۔

موصوف صرف خدا کو جھوٹا ہی نہیں جانتے تھے بلکہ اُسے مجسم مانتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ شخص خدا کو زمان و مکان و جہت سے پاک جانتا اُس کی رویت بغیر جہت و محاذات کے مانتا تو ایسے شخص کو بدعت حقیقیہ کا مرتکب یعنی کافر ٹھہراتے تھے۔ چنانچہ ان امور کی تصریح موصوف نے یوں کی ہے:

”تذریعہ اُوّٰیّٰ اَزْ زَمَانِ وَ مَکَانَ وَ جَہَتِ وَ اثْبَاتِ رَوِیْتِ بِلَا جَہَتِ وَ مَحَاذَاتِ
..... ہِمَّ اَزْ قَبِیْلِ بَدْعَاتِ حَقِیْقَیْہِ اسْتِ، اِگرْ صَاحِبِ آاں اِعْتِقَادَاتِ مَذْکُورَہ
رَا اَزْ جَنْسِ عَقَائِدِ دِیْنِیَہِ شِمَارِ دُ، مُطْخَا لَہ

موصوف کی اس تصریح سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

۱۔ جب مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے نزدیک اللہ تعالیٰ زمان و مکان میں گھرا ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ کے بارے میں دَہْوِیْجَلْ شَکْیْیْہِ مُحْیِطْ کیسے کہا جاسکے گا؟ اس طرح تو زمان و مکان کو ہر چیز پر محیط ماننا لازم آتا ہے، جن کے احاطے سے خالق بھی باہر نہ رہا۔

۲۔ اس صورت میں اللہ اکبر کہنا کس طرح درست قرار پاتے گا، جبکہ زمان و مکان اللہ تعالیٰ پر بھی محیط بنا دیئے اور تسلیم نہ کرنے پر بدعت حقیقیہ کا خطرہ سُنا دیا۔

۳۔ اولاً جو زمان و مکان میں گھرا ہوا ہے، ثانیاً جس کا دیدار بغیر جہت و محاذات کے نہ ہو سکے، یقیناً وہ مجسم قرار پاتا ہے اور ہر مجسم فانی ہے اور جو فانی ہو وہ الوہیت کے لائق نہیں۔ اب کیا فرماتے ہیں توحید کا فرضی دھول بجا کر مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے

علماء، کہ اُن کے امام نے الوہیت کا خاتمہ اور وجود باری تعالیٰ شانہ کے انکار کی یہ بنیاد کس غوشی میں رکھی تھی؟

دہلوی صاحب موصوف نے اپنی نزالی توحید کی ترنگ میں باری تعالیٰ شانہ کا عالم الغیب ہونا اپنے مخصوص اندازِ فکر سے اس طرح بیان کیا ہے:

”ظاہر کی چیزوں کو دریافت کرنا لوگوں کے اختیار میں ہے، جب چاہیں کریں، جب چاہیں نہ کریں۔ سو اسی طرح غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو، جب چاہے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے۔“ لہ

یہ عبارت بالکل آسان اُردو میں ہے۔ ہر معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی بخوبی اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ کوئی مشکل یا غیر ملکی زبان کی فلسفیانہ عبارت تو ہے نہیں، جس کا مفہوم و مطلب باسانی معلوم نہ کیا جاسکے۔ موصوف نے اس دو طرزی عبارت میں کئی قسم کا زہر گھولا ہے۔ لیکن یہاں اظہار کرنا صرف اس امر کا مقصود ہے کہ اُنھوں نے اپنے اللہ صاحب کی علمی شان کس قسم کی بیان کی ہے۔ اس عبارت سے جو کچھ ہم سمجھ سکے، وہ یہ ہے:

۱۔ دہلوی صاحب کے نزدیک اُن کا خالق عَالِمُ الْغَيْبِ نہیں اور نہ اُس کے متعلق وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ہی کہنا درست ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غیب پر اُس کا کنٹرول ہے۔ جب چاہتا ہے کسی خفیہ بات یا جملہ مغیبات سے باخبر ہو بیٹھتا ہے نہ چاہے تو دنیا و مافیہا سے آنکھیں بند کر کے ایک مجذوب کی طرح پڑا رہتا ہے۔

۲۔ موصوف کے نزدیک علم الہی قدیم اور واجب نہیں۔ اسی لیے تو دریافت کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ اُن کے نزدیک باری تعالیٰ شانہ کا جہل ممکن ہے، نہ صرف ممکن بلکہ شانِ الہی کا ایک جزو ہے۔ کیونکہ جس بات کو دریافت کرتا ہے، قبل ازیں اُس سے بے خبر ہوگا، اسی لیے

تو دریافت کرے گا۔ (نعوذ باللہ من ذلک - وما قدرہ اللہ حق قدرہ)

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۸۱ء)

۳۔ توہینِ شانِ رسالت کا محبوب ترین مشغلہ توہینِ تنقیصِ شانِ رسالت تھا۔

موضوع اس میدان کے ایسے اہلیے شہسوار تھے کہ اگلے پچھلے سارے گستاخوں کے کان کر لیں۔
 سب سے اُستادی کا لوہا منوالیا۔ قرآنِ کریم سامنے رکھ لیجیے۔ انبیائے کرام کی شان میں
 نکروں اور گستاخوں نے جو بیہودہ کلمات استعمال کیے اُنہیں کھ لیجیے۔ پھر احادیثِ نبوی
 کے ذخائر اور کتبِ تواریخ و سیر سے گستاخوں کے سارے نازیبا کلمات نکال کر اسی فہرست
 میں شامل کر لیجیے۔ اب اس مجموعہ خرافات کا تقویۃ الایمانی مغالطات سے مقابلہ کیجیے۔ اگر دل میں
 انبیائے کرام کی عظمت و رفعت کا تصور موجود ہے اور کسی بے دین کے چہچہے لگ کر یہ رُوحِ ایمان
 ضائع نہیں کی ہے تو ہر مصنف مزاج ذی علم اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ ابتدائے افرینش سے آج تک
 شانِ رسالت میں جتنے گستاخانہ کلمات استعمال کیے گئے ہیں، مصنفِ تقویۃ الایمان اُن
 سب پر سبقت تلے گیا اور موضوع نے اس میدان کی بین الاقوامی چیمپئن شپ جیت لی ہے۔
 اُن نازیبا کلمات کے نقل کرنے سے دل دہلتا اور قلم شق ہوتا ہے لیکن حالات کی ستم ظریفی اور
 نقلِ کفرِ نباشد کے پیشِ نظر، اہل اسلام کی خیر خواہی کی غرض سے چند عبارتیں طبعیہ پر پختہ
 رکھ کر نقل کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ وہ دیکھتے ہیں :

بِقِصَاصٍ ظَلُمْتُ بَعْضَهُمَا فَوْقَ بَعْضٍ	بِقِصَاصٍ ظَلُمْتُ بَعْضَهُمَا فَوْقَ بَعْضٍ، اَز
زنا کے دوسو سے اپنی بی بی کی مجامعت	و سوسہ زنا خیالِ مجامعتِ زوجہ خود بہتر
کا خیال بہتر ہے اور شیخ یا اُسی جیسے	ست و صرف ہمت لبوئے شیخ و امثال
بزرگوں کی طرف خواہ جناب رسالتا	آں از مغفلین گو جناب رسالتا باشند
ہی ہوں، اپنی ہمت کو لگا دینا، اپنے	بچندیں مرتبہ بدتر از استغراق در صورت
بیل اور گدھے کی صورت میں مستغرق ہونے	گاؤ غرود ست، کہ خیالِ اتقِ تعظیمِ اجلال
سے زیادہ بُرا ہے۔ کیونکہ شیخ کا خیال	لبویدلے دل انسان می چسپد، بخلاف
تو تعظیم اور بزرگی کے ساتھ انسان کے	خیالِ گاؤ و خوکہ نہ آن قدر چسپیدگی می بود
دل میں چٹ جاتا ہے اور بیل اور گدھے	و تعظیم بکہ ماں و محقر بود و این تعظیمِ اجلال
کے خیال کو نہ تو اس قدر چسپیدگی ہوتی ہے	غیر کہ در نماز ملحوظ مقصود می شود بشرک
اور نہ تعظیم، بکہ حقیر اور ذلیل ہوتا ہے اور	می کشد، نہ

غیر کی تعظیم اور بزرگی جو نماز میں ملحوظ ہو
وہ شرک کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔

مذکورہ بالا عبارات کا مفہوم کتنا ایمان سوز، عبارت کا ہر تیور کتنا کفر بیگز و کفر بیز ہے۔
قرآن کریم کو اول سے آخر تک پڑھیے، انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین کے مبارک
تذکروں سے بھرا ہوا ہے۔ اُن مقدس ہستیوں کا ذکر اُن کے خالق و مالک نے انتہائی پیار سے
اندا میں کیا، وہ تذکرے اُمتِ محمدیہ کی ترغیب و تشویق کی خاطر اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم پر نازل فرماتے، اُن محبت بھرے بیانات، تعظیم و اجلال کے اعلانات کا نمازوں میں بھی
پڑھنا مسلمانوں کے لیے لازمی قرار دیا گیا۔ جو اُن بزرگوں کے خطبے، زبانِ الہی میں نمازوں کے
اندر نہ پڑھے، اُن کے کمالاتِ عالیہ عین حالتِ نماز میں بیان نہ کرے، اُن کے گُن نہ گائے اُس
کی نماز ہرگز نماز ہی نہیں ہے۔ اسی طرح ہر نماز میں محبوب پروردگار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی
بارگاہِ عالی میں ہدیہ سلام پیش کرنا ہوتا ہے۔ آپ پر اور آپ کی آل پر جب تک صلوٰۃ و تسلیم کے
پھول بچھاوے نہ کیے جائیں نماز مکمل نہیں ہوتی۔ یہی وہ مبارک طریقہ ہے جو تیرہ سو سال سے
اُمتِ محمدیہ میں جاری تھا اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ امام اہلسنت علیہ الرحمہ
نے ایسے حضرات کو یوں فہمائش کی تھی :

ذکرِ خدا جو اُن سے جدا چاہو نجدیو!

واللہ ذکرِ حق نہیں، کنجی سقر کی ہے

دہلوی صاحب موصوف کے اس اصطلاحی شرک سے وہ آدمی بچ سکتا ہے جو نمازوں
میں قرآن کریم کی تلاوت کے نزدیک بھی نہ جائے۔ نمازوں میں درودِ پاک پڑھنے، تشہد میں
عرضِ سلام کرنے سے پرہیز کرے ورنہ آنجناب کے نزدیک وہ شرک کے اتھاہ سمندر میں
ڈوب جائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف کے اس اصطلاحی شرک سے مسلمان رہتے
ہوئے بچنے کا کون سا راستہ ہے ؟

یہ اجلال و تعظیم جب نماز میں شرک ٹھہرائی تو دوسری عبادتوں میں بھی شرک جزو ایمان تو نہیں بن جائے گا، وہاں جائز کیسے ہو جائے گا، کیا خدا کو صرف نماز کی حالت کا شرک ہی ناپسند اور باقی عبادتوں میں مقبول و پسندیدہ ہے، ہرگز نہیں، جو امر نماز میں شرک ہے دوسری عبادتوں کے درمیان اگر اُس کا ارتکاب کیا گیا تو وہاں بھی شرک ہی ٹھہرے گا۔ پس جس نے بطریقہ پڑھتے ہوئے محمد رسول اللہ کہا وہ بھی شرک کے سمندر میں گرا۔ درودِ پاک کا تو برفظِ گلے میں شرک کا پھندا ڈالے گا۔ اذان و اقامت کے وقت بھی یہی ماجرا پیش آئے گا۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنے بیٹھے تو ہر آیت شرک ساگر میں غوطہ دے گی۔ اس وبا کی شرک سے بچنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں کہ جملہ عبادتوں بلکہ اسلام ہی کو خیر باد کہہ کر، بیک بینی و دو گوش شہرِ خوشال کا مکین ہو جائے (نعوذ باللہ من ذلک) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ایسے باطل نظریات اور گمراہ گروں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین

انبیائے کرام و اولیائے عظام کا تصور لانے، دل میں خیال جانے کے بارے میں موصوف کا نظریہ پیش کر دیا گیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اُن مقدس ہستیوں کے علوم مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی نظر میں کیا تھے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

”جو کچھ اللہ اپنے بندوں سے معاملہ کرے گا، خواہ دنیا میں، خواہ قبر میں، خواہ آخرت میں، سو اُس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں۔ نہ نبی کو، نہ ولی کو، نہ اپنا حال، نہ دوسرے کا۔“

دوسرے مقام پر موصوف نے یوں وضاحت کی ہوئی ہے :

”اسی طرح کچھ اس بات میں بھی اُن کو بڑائی نہیں ہے کہ اللہ صاحب نے غیب دانی اُن کے اختیار میں دے دی ہو کہ جس کے دل کا احوال جب چاہیں معلوم کر لیں، یا جس غائب کا احوال جب چاہیں معلوم کر لیں کہ وہ جیتا ہے کہ مر گیا، یا کس شہر میں ہے، یا کس حال میں، یا جس آئندہ بات کو جب ارادہ کریں

تو دریافت کر لیں کہ فلاں کے ہاں اولاد ہوگی یا نہ ہوگی، یا اس سوداگری میں اُس کو فائدہ ہوگا یا نہ ہوگا، یا اس لڑائی میں فتح پائے گا یا شکست، کہ ان باتوں میں بھی بندے بڑے ہوں یا چھوٹے سب یکساں بے خبر ہیں اور نادان۔“ لے

ایک اور جگہ اسی رسوائے عالم کتاب میں اس طرح تصریح کی گئی ہے :
کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلاں کے دل میں کیا ہے، یا فلاں کی شادی کب ہوگی، یا فلاں درخت کے کتنے پتے ہیں، یا آسمان میں کتنے تارے ہیں، تو اس کے جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ و رسول ہی جانتے ہیں، کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟“ لے

منافقینِ مدینہ نے سرورِ کون و مکان، عالمِ علومِ اَدَلین و آخِرین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں ایک مرتبہ کہا تھا ”مَا يُدْرِيكَ بِالْغَيْبِ“ موصوف نے اُن دشمنانِ دین و ایمان کے ساتھ پورے طور پر موافقت کرتے ہوئے، اُن کا وہی نازیبا فقرہ اپنی زبان میں یوں دہرایا کہ ”غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟“ نیز اُدیاتے کرام و انبیاء علیہم السلام کو دنیا و آخرت میں اپنے اور دوسروں کے حال سے بے خبر بتا دیا، جرأت و جسارت کی حد کرتے ہوئے نادان تک لکھ دیا (نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْهَا)، رسول دشمنی کا رنگ اور چڑھا تو درختوں کے پتے اور آسمان کے تارے بھی غیب ہو کر رہ گئے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ رسول کسی درخت کے پتوں کی گنتی جانتے ہیں تو دہلوی صاحب کے نزدیک اُس شخص نے رسول کو خدا بنا دیا۔ موصوف نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علومِ غیبیہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے :

”کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، مجھوت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب

کی بات معلوم کر لیں، بلکہ اللہ صاحب اپنے ارادہ سے کبھی کسی کو حقیقی بات چاہتا ہے
خبر کر دیتا ہے۔ سو یہ اپنے ارادہ کے موافق، نہ اُن کی خواہش پر۔ چنانچہ حضرت
پیغمبر صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بارہا ایسا اتفاق ہوا ہے کہ بعضی بات دریافت
کرنے کی خواہش ہوئی اور وہ بات معلوم نہ ہوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا
ارادہ ہوا تو ایک آن میں بتا دی، لے

یہ تصویر کا ایک رُخ تھا کہ انبیائے کرام و اولیائے عظام غیب سے قطعاً بے خبر بتا دئے،
ایک چیز کا علم بھی وہ اپنی مرضی اور اپنے ارادے سے نہیں جان سکتے کیونکہ موصوف کے نزدیک
نورِ نبوت میں بھی اتنی نورانیت نہیں کہ ایک درخت کے پتے تک معلوم کر سکیں۔ اب اسی تصویر کا
دوسرا رُخ ملاحظہ ہو کہ دہلوی صاحب کے خارجی گروہ میں شامل ہونے والے، انبیائے کرام
کے گستاخوں میں اپنا نام لکھوا لینے والوں کی حالت کیا ہو جاتی تھی اور موصوف اپنے متبعین کو
کس طرح عرش و فرش اور جنت و دوزخ کی سیر کروایا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:
”برائے انکشافِ حالتِ سموات و ملاقاتِ ارواح و ملائکہ و سیرِ جنت و نار
و اطلاع بر حقائقِ اُن مقام و دریافتِ امکانہ آنجا و انکشافِ امرے از
لوح محفوظ، ذکرِ یَاحِیِّ یَا قَیُّوْمُ مُست۔“ لے

وہابی حضرات نے اپنے امام کی اس عبارت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”آسمانوں کے حالات کے انکشاف اور مقاماتِ ارواح اور ملائکہ اور بہشت
و دوزخ کی سیر اور اُس مقام کے حقائق پر اطلاع اور اُس جگہ کے مکانوں کے
دریافت اور لوحِ محفوظ سے کسی امر کے انکشاف کے لیے یَا حِیِّ یَا قَیُّوْمُ کا ذکر
کیا جاتا ہے۔“ لے

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۵۴

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۴

لے صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۲۶۱

دوسرے مقام پر موصوف نے اسی بات کو اور کھل کر یوں بیان کیا ہوا ہے:

”برائے کشف ارواح و ملائکہ و مقاماتِ آئنا و میراکنہ زمین و آسمان و جنت و نار و اطلاع بر لوح محفوظ شغل دورہ کند و باستعانت ہمہ شغل بہر مقامیکہ از زمین و آسمان و بہشت و دوزخ خواهد متوجہ شدہ بسیراں مقام احوال آنجا دریافت کند و باہل آن مقام ملاقات سازد“ لہ

اس عبارت کا ترجمہ خود وہابی حضرات نے یوں کیا ہے:

”کشف ارواح اور ملائکہ اور اُن کے مقامات اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی سیر اور لوح محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے دورے کا شغل کرے پس زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے جس مقام کی طرف متوجہ ہو، اسی شغل کی مدد سے وہاں کی سیر کرے اور اُس جگہ کے حالات دریافت کرے، وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کرے“ لہ

فاریں کرام! یہ ہیں اس تصویر کے دونوں رخ کہ دہلوی صاحب کے نزدیک انبیاء کرام کو اپنے یا کسی کے خاتمے تک کا پتہ نہیں، آئندہ کی ہر بات سے اُنھیں بے خبر اور نادان بتا دیا، حتیٰ کہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے منقلب بھی کہہ دیا کہ اگر وہ کسی ایک بات کو معلوم بھی کرنا چاہتے تو معلوم نہ کر سکتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک باری تعالیٰ شانہ نے اپنے محبوب کو ایسی کوئی طاقت نہ دی تھی اور اس قسم کا کوئی طریقہ نہیں سکھایا تھا، جس کے ذریعے وہ کسی بات کو معلوم کر لیا کرتے لیکن دوسری طرف مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنے مجہین و معتقدین کو ایسے عملیات سکھا دیے اور شائع فرما دیے تھے کہ اُن کے عامل جب چاہیں انبیاء و ملائکہ سے ملاقات کر سکتے تھے، جنت اور دوزخ کی سیر کر سکتے تھے جس گزشتہ یا آئندہ واقعے کو معلوم کرنا چاہتے، اپنے یا کسی اور کے خاتمے کا حال معلوم کرنا منظور ہوتا تو لوح محفوظ سے پڑھ

کے تھے۔ گویا باری تعالیٰ شانہ، تو انبیائے کرام بلکہ سید الانبیاء کو بھی اس طرح معلوم کر لینے کا کوئی طریقہ نہیں بتا سکا لیکن مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنے خدمت گزاروں پر چودہ طبقہ روشن کر کے دکھا دیے۔ یعنی جو کام اللہ تعالیٰ سے بھی نہ ہو سکا تو وہ دہلوی صاحب موصوف نے کر دکھایا اور جن علوم کے دروازے انبیائے کرام پر بھی بند رہے وہ دہلی کے ایک عالم نے اپنے معتقدین کے لیے چوٹ کھول کر دکھا دیے۔ اندر کی طرح باہر کی آنکھیں بھی بند کر داتے اور چند لحظات میں دنیا و مافیہا کے جلوے دکھا دیا کرتے تھے۔ یہ فیصلہ اب قارئین ہی کر سکتے ہیں کہ علوم عطا کرنے میں دہلوی صاحب نے خود کو خدا سے کمتر بتایا ہے یا ذات باری سے بھی اپنے آپ کو بڑھا کر دکھایا ہے، نیز موصوف کی تصریحات کے پیش نظر، علوم غیبیہ پانے میں انبیائے کرام بڑھ کر رہے یا دہلوی صاحب کے خدام بھی اُن حضرات سے ہزاروں گنا سبقت لے گئے؟

پیارے قارئین! سنا تو یہی ہے کہ کسی تصویر کے زیادہ سے زیادہ دورُخ ہو سکتے ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ معلمِ خارجیت اس قید سے بھی آزاد تھے۔ موصوف کے پاس بعض ایسی تصویریں بھی تھیں جن کے بے شمارُخ تھے۔ زیر بحث تصویر کے آپ نے دورُخ ملاحظہ فرمائیے دوسرا رُخ یہ تھا کہ دہلوی صاحب نے اپنے معتقدین کو ایسے عملیات بھی بتا دیے تھے کہ اُن کی مدد سے جب وہ چاہتے تو ارواح و ملائکہ سے ملاقات کر لیتے، جنت و دوزخ کی سیر فرما سکتے، لوح محفوظ سے گزشتہ و آئندہ کے واقعات اور ساری کائنات کے حوادث اور تقدیریں پڑھ لیتے، ہر مقام کا اُن کے لیے کشف ہو جانا اور ہر جگہ پر وہ بنفسِ نفیس پہنچ سکتے تھے۔ اب اسی تصویر کا صرف تیسرا مزیدارُخ ملاحظہ ہو:

”اس آیت (۱۱۵) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میرے پاس ایسا کچھ علم ہے کہ جب چاہوں اس سے غیب کی بات دریافت کر لوں اور آئندہ باتوں کا معلوم کر لینا میرے قابو میں ہے، سودہ بڑا جھوٹا ہے کہ دعویٰ خدائی کا رکھتا ہے۔“ لے

دوسرے مقام پر اپنے عملیاتی پتھر اور دعویٰ کشف کے بارے میں خود یوں فیصلہ صادر فرمایا ہے۔
 "اس آیت (۳۱) سے معلوم ہوا کہ یہ سب جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں
 کوئی کشف کا دعویٰ رکھتا ہے، کوئی استخارہ کے عمل سکھاتا ہے، کوئی
 تقویم اور پترانکا کتاب ہے، کوئی رمل اور قرعہ پھینکتا ہے، کوئی فالنامہ لیے پھرتا
 ہے، یہ سب جھوٹے ہیں اور دغا باز۔ ان کے جال میں ہرگز نہ پھنسنایا جائیگا۔"

اوسر تومسوف نے اپنے معتقدین پر چڑاہ طبق روشن کر دئے ہیں لیکن ادھر فرما رہے ہیں کہ
 کشف کا دعویٰ رکھنے والے سب جھوٹے اور دغا باز ہیں، ان کے جال میں ہرگز نہیں پھنسنایا
 جائیگا کیونکہ ایسا دعویٰ کرنے والا خدا کی کا دعویٰ رکھتا ہے۔ وہابی حضرات اپنے امام کی ان تقریرات
 پر غور کریں، حق و باطل میں تمیز کریں اور کسی کی بے جا محبت و طرفداری میں ایمان جیسی متاعِ عزیز
 کو گونا گونا کون سا نفع بخش سودا اور کہاں کی عقلمندی ہے؟ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو کل بروز
 قیامت خود فیصلہ ہو جائے گا۔ حقیقت کا بھیجہ کھلنے پر اس وقت کفِ افسوس ملنا کیا کار
 آئے گا؟ ہم نے اپنا فرض تبلیغ ادا کر دیا، باری تعالیٰ شانہ، قبول فرمائے اور یہ دعوت کہ
 اے خدا راہِ ہدایت اُس مسلمان کو دکھا

لذتِ ایمان کی دولت سے جو محروم ہے

اب قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ ادبیاتِ عظام و انبیائے کرام بلکہ سید الانبیاء والمرسلین
 علیہم الصلوٰۃ والسلام کے خداداد تصرفات کے بارے میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی
 (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کا نظریہ کیا تھا؟ باری تعالیٰ شانہ نے جس محبوب کو اَنَا اعْطٰی
 الْكَوْثَرَ اور رَسَنَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا کے مژدے سنائے اُسی مالکِ تسنیم و کثر
 اور باری تعالیٰ شانہ کے خلیفہ اعظم و ناجدار دو جہاں کے بارے میں موصوف یوں رقمطراز ہیں
 "جس کا نام محمد یا علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں"۔ لٹ

اختیار و تصرف کے مسئلے سے قطع نظر، اس طرزِ تکلم کے تیور تو ملاحظہ ہوں۔ کیا ان الفاظ سے کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی اس امر کا ملتا ہے کہ ان الفاظ کا لکھنے والا، نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا امتی ہو۔ خالق و مالک جلّ جلالہ نے اپنے جس بے مثل بندے کو پورے قرآنِ کریم میں ایک مرتبہ بھی نام لے کر مخاطب نہ کیا، جس کی آواز سے کوئی اپنی آواز بلند کرے تو اُسے سائے اعمال کے ضائع ہو جانے کی وعید سنا دی ہو، بزرگانِ دین نے جس مولائے کائنات کے ادب کی یوں تلقین فرمائی ہو:۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر

نفسِ گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اسی ہستی کا تذکرہ اس عامیانہ انداز میں! اگر گولڑ میں بسنے والا جھنگ کا فضا کی وسعتوں کو دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتا، ایک چمکا ڈر مہرِ درخشاں کی تابانیوں کا نظارہ نہیں کر سکتا، جو ہڑکا مینڈک محیطِ بیکان کی وسعتوں سے قطعاً نا آشنا ہے تو اس سے فضا کی وسعتوں، سورج کی تابانیوں اور سمندر کی بیکرانی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ یہ تو خود جھنگ کی کوتاہ نظری، چمکا ڈر کی محرومی اور جو ہڑکے مینڈک کی تنگ دامانی ہے۔

یہاں بعض حضرات یوں مغالطہ دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ موصوف نے یہاں اختیار ذاتی نہ بارے میں ایسا لکھا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ذاتی اختیار ہی کے متعلق نہیں بلکہ موصوف عطاۃ العیاد بھی ناپسند ہی کرتے رہے تھے ورنہ ہر فرد تصریح فرما دیتے، اس صورت میں لب و لہجہ کے علاوہ نفسِ مسئلہ میں اُن سے اختلاف ہی کیوں ہوتا؟ علاوہ بریں ایسی تاویلوں کی دہلوی صاحب نے خود یوں جڑ کاٹی ہوئی ہے:

”اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی۔“

ایک اور مقام پر موصوف ثوب کھلے ہیں اور وہاں اسی امر کی تصریح کرتے ہوئے یوں اپنے دل کی گنجائی ہے:

اس آیت (۲۳-۸۹) سے معلوم ہوا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا مگر اپنے بتوں کو اس کی جناب میں وکیل سمجھ کر مانتے تھے، اسی سے کافر ہو گئے۔ سوا ب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اس کو مانے، سو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اس کے مقابل کی طاقت اس کو ثابت نہ کرے۔ لہ

مسلمانوں کو مشترک ٹھہرانے کی دھن میں موصوف خارجیت کے سیلاب میں بہتے ہوئے حقانیت سے کتنی دور نکل گئے کہ انھیں اللہ جل شانہ کے خلیفہ اعظم اور اینٹ پتھر کی مورتوں کے اختیارات میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ انبیائے کرام اور نبی الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام تو بات ہی اور ہے ایک جاہل مطلق اور معمولی سمجھ دار آدمی بھی زید و عمر اور اینٹ پتھروں کے اختیارات کو اپنے منشا ہرے کی بنا پر کبھی ایک جیسا ماننے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ زید و عمرو کتنے ہی بے اختیار مسمیٰ لیکن پھر بھی قدرت نے انھیں بہت سے اختیارات دیے ہوئے ہیں لیکن اینٹ پتھر محض بے اختیار و بے جس۔ اس کے باوجود کیا کہنا ہے ان علماء کی بے بصیرت جنھیں اللہ تبارک و تعالیٰ کے خلیفہ اعظم اور اینٹ پتھروں کے اختیارات و تصرفات میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ اس کے باوجود ایسے نین سکھ حضرات کو مسلمانوں کے مصلح اور ریفارمر وغیرہ منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جاتا ہے تاکہ اس کے زمانے میں مسلمانوں کی اگر کوئی ایک آدھ آنکھ کھلی ہوئی ہے تو اسے بھی ٹپم کر دیا جائے اور اپنے اسی کارنامے پر نازاں ہیں کہ وہ اسلام کی بے مثال خدمت کر رہے ہیں، ایمان کا نور پھیلا رہے ہیں۔ کاش! یہ حضرات کبھی تنہائی میں سوچیں اور اپنی روش پر نظر ثانی کریں۔ موصوف نے انبیائے کرام حتیٰ کہ سید الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کے خداوند تصرفات و اختیار کا یوں کھل کر انکار کر دیا لیکن اہل انصاف ملاحظہ فرمائیں کہ اپنے

پیرجی وغیرہ کی شان یوں بیان کی ہے :

داربابِ این مناصب رفیعہ ماذون مطلق در تصرف عالم مثال و شہادت
می باشند - این کبار اولی الایدی والابصار رومی رسد کہ تمامی کلیات را
بسوئے خود نسبت نمایند - مثلاً ایشان رومی رسد کہ بگویند کہ از عرش تا
فرش سلطنت ماست ! ل

اب اسی عبارت کا ترجمہ وہابی حضرات کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایا جاتے :

”اسی طرح ان مراتبِ عالیہ اور مناصبِ رفیعہ کے صاحبان عالم مثال و
شہادت میں تصرف کرنے کے مطلق ماذون و مجاز ہوتے ہیں اور ان بزرگواروں
کو پہنچتا ہے کہ تمام کلیات کو اپنی طرف نسبت کریں - مثلاً ان کو جائز ہے کہ کہیں
عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے ! ل

کیا اس ستم ظریفی کی داد کوئی دے سکتا ہے کہ اُدھر یہ حکم کہ ”جس کا نام مستد یا
علی ہے وہ کسی چیز کا مختار نہیں“ لیکن پیرجی وغیرہ کو دنیا و مافیہا کے اختیارات حاصل ہیں اور
وہ کہہ سکتے ہیں کہ ”عرش سے فرش تک ہماری سلطنت ہے“ مقررینِ بارگاہِ الہیہ کا معاملہ تھا
تو بتایا کہ ”اللہ صاحب نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی“ اور پیرجی وغیرہ
کی شان بیان کرنے کا وقت آیا تو بتا دیا کہ یہ عالم مثال و شہادت میں تصرف کرنے کے
مطلق ماذون و مجاز ہوتے ہیں“

وہابی صاحبو! کیا قیامت نہیں آتے گی؟ کیا حساب و کتاب نہیں ہوگا؟ تمام انبیائے کرام
کے خداداد اختیارات و تصرفات کا اس طرح انکار کر کے اپنے پیرجی کے خبطے پڑھنا، انہیں
انبیائے کرام سے بھی ہزاروں درجہ بڑھا چڑھا کر دکھانا، یہ پیرجی کی نبوت کی بنیادیں اٹھانا تھا
یا اس میں کوئی اور ہی راز پنہاں ہے؟ آخر بتائیے تو سہی، یہ تماشا ہے کیا؟ نیز انبیائے کرام

کے لیے یہ تصرفات ماننے پر شرک کا خطرہ بار بار سُنا یا ہوا ہے لیکن اپنے پیر جی وغیرہ کو کس مصلحت یا منفعت کے تحت خدا کا شریک بنا کر دکھایا ہوا ہے ؟

۵ پیہم سجد پاتے صنم پر دزم و دواع
مومن خدا کو جھول گئے اضطراب میں

مقررین بارگاہِ الہیہ کے خداداد تصرفات و اختیارات کے پیشِ نظر اگر کوئی مسلمان اُن سے استعانت و استمداد کرنا ہے یا ذوق و شوق میں مذابیہ کلمات استعمال کرتا ہے تو جملہ خوارج کی طرح مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے نزدیک ایسا شخص مسلمان ہی نہیں رہتا بلکہ مشرک ہو جاتا کیونکہ موصوف کے نزدیک اینٹ پتھروں کو پکارنا اور انبیاء و اولیاء کو پکارنا ایک ہی جیسا ہے اور اُن کا مشابہہ یہی بتاتا تھا کہ بُتوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے مقبول ترین بندے بھی بے حس و حرکت اور نفع و نقصان پہنچانے سے عاجز ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ بکھتے ہیں:

”اکثر لوگ جو دعویٰ ایمان کا رکھتے ہیں سو وہ شرک میں گرفتار ہیں۔ اگر کوئی

سمجھانے والا اُن لوگوں کو کہے کہ تم دعویٰ ایمان کا رکھتے ہو اور افعال شرک

کے کرتے ہو، سو یہ دونوں راہیں کیوں ملائے دیتے ہو؟ اُس کو جواب

دیتے ہیں کہ ہم تو شرک نہیں کرتے، بلکہ اپنا عقیدہ انبیاء اور اولیاء کی جناب

میں ظاہر کرتے ہیں۔ شرک جب ہوتا کہ ہم اُن اولیاء انبیاء کو، پیروں شہید

کو، اللہ کے برابر سمجھتے بلکہ ہم اُن کو اللہ ہی کا بندہ جانتے ہیں اور اُسی کا مخلوق

یہ قدرت تصرف کی اُسی نے اُن کو بخشی ہے۔ اُس کی مرضی سے عالم میں

تصرف کرتے ہیں۔ اُن کا پکارنا عین اللہ ہی کا پکارنا ہے۔ اُن سے مدد مانگنی

عین اُسی سے مدد مانگنی ہے۔ وہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں، جو چاہیں سو

کریں۔ اُس کی جناب میں ہمارے سفارشی میں اور وکیل۔ اُن کے طے

سے خدا ملتا ہے اور اُن کے پکارنے سے اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور

جتنا ہم اُن کو مانتے ہیں، اتنا اللہ سے ہم نزدیک ہوتے ہیں۔ اسی طرح

کی خرافات بکھتے ہیں“

کسی کو اللہ تعالیٰ جیسا جانتا یا باری تعالیٰ جیسی صفات یا کسی صفتِ مختصہ کا حامل ماننا شرک ہوتا ہے۔ لیکن موصوف کی سینہ زوری اور ستم ظریفی کا اندازہ کون کر سکتا ہے جبکہ مسلمان کہتے ہیں کہ ہم انبیائے کرام و اولیائے عظام کو اللہ تعالیٰ کے بندے اور اُسی کی مخلوق جانتے ہیں۔ ان بزرگوں کے تصرفات کو باری تعالیٰ شانہ کا اعام و عطیہ مانتے ہیں، جس کا مدّ نہی سے ہو تو معجزہ اور ولی سے ہو تو کرامت کہلاتا ہے۔ اس کے باوجود موصوف اسے شرک قرار دیتے اور اسلامی و ایمانی وضاحت کو خرافات کہنا چھڑاتے ہیں۔ جب مسلمان اپنے بزرگوں کو نہ خدا جیسا یا اُس کے برابر مانتے ہیں اور نہ خدا کی صفاتِ مختصہ کا حامل جانتے ہیں پھر شرک کہاں سے آگیا؟ اگر مشبہین کے دلائل موصوف کے نزدیک ناقابلِ یقین تھے تو وہ اس عقیدے کو زیادہ سے زیادہ غیر ثابت کہہ سکتے تھے، دلائل کو کمزور ٹھہرا سکتے تھے لیکن جب مسلمان اپنے بزرگوں کو خدا کی ذات و صفات میں شریک نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ دہلوی صاحب نے ہی مسلمانوں کو مشترک قرار دے کر اپنا شوقِ تکفیر پورا کرنے کی غرض سے اللہ تعالیٰ کو مقامِ اُلُوہیت سے اتار کر بندوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ آخر وہ بھی مخلوق میں شامل ہو اور اُس کے تصرفات بھی کسی کے عطا فرمودہ ہوں تب ہی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے تصرفات سے مطابقت ہوگی اور شرک لازم آسکے گا۔ لیکن اس شرک کو ثابت کرنے سے پہلے اُلُوہیت سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو مخلوق اور اُس کے اختیارات کو عطا فی ماننا لازم آتا ہے ورنہ شرک کا حکم صادر فرمانا محض ایک خیالِ خام، نہ اتنا حکم اور سینہ زوری کے سوا اور کچھ نہیں۔ موصوف مزید لکھتے ہیں:

”جن کو لوگ پکارتے ہیں اُن کو اللہ نے کچھ قدرت نہیں دی نہ فائدہ پہنچانے کی نہ نقصان کرنے کی۔ اور جو کہتے ہیں، یہ لوگ ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے پاس سویر بات اللہ نے تو نہیں بتائی۔ پھر کیا تم اللہ سے زیادہ خبردار ہو؟ سو اُس کو بناتے ہو جو وہ نہیں جانتا۔ اس آیت (۱۱۱) سے معلوم ہوا کہ تمام آسمان وزمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانیے اور اُس کو پکاریے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔“

وہابی صاحبو! آخر قیامت نے اگر رہنا ہے۔ حساب و کتاب ضرور ہوگا۔ جہلا یہ ستم ظریفی کس پر تے پر ہے کہ آیت پیش کردہ میں لفظ (يَعْبُدُونَ) موجود، خود اس کا ترجمہ کیا پوچھتے ہیں، اس کے باوجود تشریح کرتے وقت لکھ دیا کہ ”جن کو لوگ پکارتے ہیں“۔ کیا يعبدون یعنی پوجنے کا مطلب پکارنا ہے؟ آخر اتنی دیدہ دلیری سے قرآنی آیات کے مفہوم و مطالب میں دن دھاڑے یہ معنوی تحریف کس پر تے پر ہے؟ اگر آپ حضرات خوفِ خدا سے عاری نہیں ہو گئے اور صبحِ قیامت کے منکر نہیں تو خدا کے لیے ان امور پر غور تو فرمائیے:

۱۔ اس آیت کے کون سے لفظ کا یہ مطلب ہے کہ انبیاء و اولیاء نفع و نقصان کی قدرت نہیں رکھتے؟

۲۔ آیت میں کون سا لفظ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ انبیاء و اولیاء مسلمانوں کے سفارشی نہیں ہیں؟

۳۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین میں کوئی کسی کا سفارشی نہیں ہے؟

۴۔ آیت تو بتوں کے بارے میں ہے لیکن آپ کے امام کو کہاں سے معلوم ہوا کہ انبیاء و اولیاء بھی بتوں کی طرح اینٹ پتھر ہیں؟

قارئین کرام! پہلے سورہ یونس کی زیر بحث آیت کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں تاکہ مفہوم سمجھنے میں آسانی رہے:

”وَيَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ وَيَقُولُونَ هَؤُلَاءِ شُفَعَاءُ عِنْدَ اللَّهِ قُلْ أَتُنَبِّئُونَ اللَّهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي السَّمَوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى عَمَّا يُشْرِكُونَ“

خود مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”اور پوجتے ہیں ورے اللہ کے ایسی چیزوں کو کہ نہ کچھ فائدہ دیں ان کو، نہ کچھ نقصان۔ اور کہتے ہیں، یہ لوگ سفارشی ہیں اللہ کے پاس۔ کہہ، کیا بتاتے ہو تم اللہ کو جو نہیں جانتا وہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں؟ سو وہ نہ والا ہے ان سب سے جن کو یہ شریک بناتے ہیں“۔

یہ آیت بُت پرستوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جملہ مفسرین نے مِنْ دُونِ اللہ سے بُت مراد لیے ہیں۔ علاوہ بریں تفسیر قرآن بالقرآن سب سے مقدم و اعلیٰ ہے۔ مِنْ دُونِ اللہ کی تفسیر خود اس آیت میں مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ سے باری تعالیٰ شانہ نے کی ہوئی ہے۔ نفع و نقصان پہنچانے میں بُت ہی مجبور محض ہیں۔ انسان کو مجبور محض ٹھہرانا، ایمان کے ساتھ ہی عقل کی آنکھ پر ٹھیکری رکھنا نہیں تو اور کیا ہے؟ انسانوں میں زید و عمرو سے لے کر ادیبائے کرام و انبیائے کرام علیہم السلام تک سب کو باری تعالیٰ شانہ نے علی قدر مراتب نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت دی ہے۔

دہلوی صاحب موصوف نے یہاں ہاتھ کی صفاتی کا جو کتب دکھایا وہ محیر العقول ہے۔ آنجناب کو بُت پرستوں کا نہ تو برضا و رغبت کفر میں پڑے رہنا کفر نظر آیا، نہ اُن کا بُتوں کو پُر جادہلوی سرکاریں کفر ٹھہرا، اُن کا کفر بس یہی بتایا کہ وہ بُتوں کو اپنا سفارشی مانتے تھے۔ موصوف کی نظر صرف اس آخری کفر پر کیوں پہنچی اور پہلے دونوں کفریات سے کیوں نظریں پچاگئے؟ وجہ یہ ہے کہ وہ انبیائے کرام کی عداوت میں اتنے مغلوب الحال ہو چکے تھے کہ مقربین بارگاہ الہیہ کو مجبور محض ثابت کرنے کی تلاش میں رہتے تھے۔ غوارج کو اس کے سوا رچاؤ کا رہی نہیں کہ وہ تسکین خاطر کے لیے جو آیات بُتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہیں انہیں انبیاء و ادیباء پر چسپاں کر کے، اس طرح بزرگوں کو بُتوں کی طرح مجبور محض ٹھہرا کر اپنے دل کی گئی بھالیائیں اور مسلمانوں پر شرک و کفر کی توپ داغنے رہیں۔ موصوف نے ایک مقام پر انبیائے کرام کو بُتوں کی طرح مجبور محض ٹھہرا کر، دین و ایمان کے ساتھ شرافت کی حد بھی توڑ دی۔ مسلمانوں سے اتنا حس ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمّتی کی حیثیت سے اس جبارت پر غور کریں:

”اللہ سے زبردست کے ہوتے ہوئے ایسے عاجز لوگوں کو پکارنا کہ کچھ فائدہ او
نقصان نہیں پہنچا سکتے، محض بے انصافی ہے کہ ایسے بڑے شخص کا مرتبہ ایسے
ناکارہ لوگوں کو ثابت کیجے“

اے مدعی اسلام، اے کلہ طیبہ کے ہمراہی! کیا انبیائے کرام تک کے لیے، عاجز لوگوں اور ناکارہ لوگوں سُننا تجھے گوارا ہے؟ خدا نہ کرے کہ تیرا جواب اثبات میں ہو تعظیم رسالت جو جانِ ایمان ہے، جس کے بارے میں تَعَزُّدُ دُؤْہ و تَوْقِرُ دُؤْہ ارشادِ رحمن ہے کیا اپنے نبی کو عاجز اور ناکارہ کہنا تعظیم و توقیر ہے یا توہین و تنقیص؟ کیا اُس سرکارِ ابد قرار کی توہین کرنے والا دولتِ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے یا مسلمانوں کا رہبر، پیشوا، مصلح اور رفیقِ مرہن جاتا ہے؟ جانِ برادر! شانِ رسالت کی توہین کر کے بیجا تاویلوں کا سہارا تلاش کرنا غضبِ الہی کو اور جوش میں لانا ہے۔ اس سے بھی زیادہ توہین آمیز الفاظ اور ملاحظہ فرمائے جاسکتے ہیں، چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

”ہمارا جب خالق اللہ ہے اور اُسی نے ہم کو پیدا کیا تو ہم کو بھی چاہیے کہ اپنے کاموں پر اُسی کو پکاریں اور کسی سے ہم کو کیا کام؟ جیسے جو کوئی ایک بادشاہ کا غلام ہو چکا تو وہ اپنے ہر کام کا علاقہ اُسی سے رکھتا ہے، دوسرے بادشاہ سے نہیں رکھتا اور کسی چوہڑے چار کا تو کیا ذکر؟“

وہابی صاحبو! انبیائے کرام کو بارگاہِ الہیہ کے چوہڑے چار کہتے ہوئے کوئی شرم تو محسوس نہیں ہوتی ہوگی؟ مانا کہ آپ مقررینِ بارگاہِ الہیہ سے استمداد کرنے کے منکر ہیں، لیکن امتی ہونے سے تو کھل کر انکار نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ ننگی گالی کس عقیدت کے تحت دی؟ اس کی صحت ثابت کرنا کون سی دین کی خدمت ہے؟ کیا آپ صاحبان کو کلہ گوئی کا بھی کوئی لحاظ نہیں؟ آخر انبیائے کرام و اولیائے عظام نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو اس درجہ گرسے ہو الفاظ اُن کی شان میں جاری کیے جاتے ہیں؟ کیا دین و دیانت کی طرح شرافت و اخلاق بھی آپ کے نزدیک بے معنی چیزیں ہیں؟ معلوم نہیں کہ ایمان آپ نے کس جانور کا نام رکھا ہے اب موصوف کا ایک عجیب و غریب اور اسلام دشمنی کا ایٹمی فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ لکھتے ہیں:

”پیغمبرِ خدا کے وقت میں بھی کافر اپنے بتوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے

بلکہ اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ سمجھتے تھے اور اُن کو اُس کے مقابل کی طاقت ثابت نہیں کرتے تھے مگر یہی 'پکارنا'، 'مَنیں ماننی'، 'نذر و نیاز کرنی'، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی کسی سے یہ معاملہ کرے، گو اُس کو اللہ کا بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابوجہل اور وہ شرک میں برابر ہیں۔" ۱

معلوم ہوتا ہے کہ موصوف انبیائے کرام کی دشمنی میں اتنے مغلوب الجال ہو چکے تھے کہ اُن کے نزدیک صرف وہی امور کفر و شرک ہو کر رہ گئے تھے جن سے عظمتِ انبیاء کا اظہار ہوتا ہو۔ مذکورہ عبارت میں دہلوی صاحب کو نہ تو کفار کا کافر ہونا نظر آیا، نہ اُن کا بتوں کو پوجنا ہی موصوف کی توحید کے خلاف تھا بلکہ وہ لوگ جو اپنے بتوں کو مدد کے لیے پکارتے، اُن کی مَنیں مانتے، نذر و نیاز چڑھاتے اور اُنھیں اپنا وکیل و سفارشی سمجھتے، اُن کے کفر کا صرف اِسی میں حصر کرتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ "یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔" مانا کہ بتوں کے ساتھ یہ معاملہ رکھنا یقیناً کفر و شرک ہے کیونکہ نہ اُن کے اندر نفع و نقصان پہنچانے کی صلاحیت اور نہ خدا نے اُنھیں کسی کا وکیل و سفارشی بنایا۔ لیکن بتوں کے مجبور محض اور مبعوض ہونے کو انبیاء و اولیاء پر چسپاں کر کے یہ اپنی خارجیت پر مہر تصدیق ہی کی ہے۔ وہابی علماء عوام الناس میں اپنا بھرم رکھنے کی غرض سے لکھ دیا کرتے ہیں کہ ہم ہرگز شفاعت کے منکر نہیں بلکہ انبیاء و اولیاء کی شفاعت کے قائل اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو شفیع المذنبین مانتے ہیں۔ لیکن دہلوی صاحب بتا رہے ہیں کہ جو کسی کو اپنا سفارشی سمجھے وہ ابوجہل جیسا شرک ہے۔ کیا وہابی حضرات کے لیے اپنے امام کے فتوے سے بچنے، خارجی یا ابوجہل جیسا ہو جانے سے بچاؤ کا کوئی راستہ ہے؛ تسلی کے لیے مزید عبارتیں ملاحظہ فرمائیے:

"کوئی کسی کی حمایت نہیں کر سکتا۔" ۲

”کوئی کسی کا وکیل اور حمایتی نہیں بننے والا۔“ ۱

آپ حضرات کی مزید تسلی کے لیے موصوف نے خود زبانِ رسالت سے اعلان کر دیا ہے:

چنانچہ لکھتے ہیں:

”میں آپ ہی ڈرتا ہوں اور اللہ سے ورے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو دوسرے کو کیا بچا سکوں گا؟“ ۲

”اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔“ ۳

آگے موصوف نے سورۃ زمر کی ایک آیت پیش کر کے یوں اپنا ایٹمی فتویٰ داغ دیا ہے:

ملاحظہ ہو:

”اس آیت (۳۹) سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے، گو یہی

جان کر کہ اس کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی

مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکر۔“ ۴

قارئین کرام حیران ہوں گے کہ مصنفِ تقویۃ الایمان نے انبیائے کرام کی شفاعت کو

برحق جاننا کیوں شرک ٹھہرایا؟ شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت کا یقین رکھنے

والوں کو ابو جہل جیسا مشرک کیوں بتایا؟ وجہ یہ ہے کہ وہابی حضرات کو شفاعت کی ان کے گمان

کے مطابق ضرورت ہی نہیں رہی تھی، کیونکہ ان کے رب (معلوم نہیں وہ ہندی تھا یا بڑائی)

نے اس سارے نوزائیدہ گروہ کی بخشش کا وعدہ کر لیا تھا۔ موصوف خود یوں رقمطراز ہیں:

”ازاں طرف حکم شد کہ ہر کہ بردست تو بیعت خواہد کردگو لکھو کھا باشند ہر یک

را کفایت خواہم کرد۔“ ۵

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۳۲ ۲۔ ایضاً: ص ۶۴

۳۔ ایضاً: ص ۶۴ ۴۔ ایضاً: ص ۳۲

۵۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۵۵

مذکورہ بالا عبارت کا وہابی حضرات نے خودیوں ترجمہ کیا ہے :

”جو شخص تیرے (سید احمد صاحب کے) ہاتھ پر بیعت کرے گا اگرچہ وہ

کھوکھا ہی کیوں نہ ہوں ہم ہر ایک کو کفایت کریں گے“ لہ

تاریخ حضرات اب اس تصویر کے دونوں رخ اپنے سامنے رکھ کر غور فرمائیں کہ

دہلوی صاحب نے انبیائے کرام کو شفیع و حمایتی ماننا شرک بتایا ایسے لوگوں کو ابو جہل کے برابر شرک

ٹھہرایا اور سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے حق میں تصریح فرمادی کہ وہ قیامت میں

اپنی بیٹی فاطمہ تک کے کام نہ آسکیں گے۔ یہ جملہ انبیائے کرام کی شان ہے دوسری طرف دہلوی صاحب

کے پیرو مشد سید احمد رائے بریلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) ہیں کہ انھوں نے دنیا میں

ہی اپنے سارے تابعین کو بخشوا لیا۔ معلوم نہیں انبیائے کرام اور سید الانبیاء علیہم السلام کا

زتبہ ادبچارہ یا سید احمد صاحب رائے بریلوی کا؟ وہابی حضرات اپنے امام کی تصریحات کو سامنے

رکھ کر کوئی فیصلہ تو کریں۔ اب اسی تصویر شفاعت کا خارجی فلم اسٹوڈیو میں تیسرا رخ جو دکھایا

وہ بھی ملاحظہ فرمائیے :

”وہ توبادشاہ کا امیر ہے، نہ چوروں کا تنہا نگہی، جو چور کا حمایتی بن کر اس کی

سفارش کرتا ہے تو آپ ہی چور ہو جاتا ہے۔ اس کو شفاعت بالاذن

کہتے ہیں“ لہ

معلوم نہیں اپنے سارے مریدین کو بخشوانے والے سید احمد صاحب کیوں خدا کے شریک

بن بیٹھے تھے اور دوسری طرف کیوں چور یا چوروں کا تنہا نگہی بننے کا شوق پورا کیا۔ اگر کوئی وہابی

عالم یہ فرمائیں کہ سید احمد صاحب نے سفارش نہیں کی بلکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی کرم نوازی سے

ایسا وعدہ فرمایا تھا، تو اس سلسلے میں ہماری درج ذیل گزارشات پر غور فرمایا جاتے :

۱۔ اگر آپ حضرات یہ فرمائیں کہ مریدین میں سے کسی نے سید احمد صاحب سے سفارش

لے صرف مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۳۱

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۶۹-۷۰

کرنے کی درخواست نہیں کی تھی کہ مشرک قرار پاتا، سید احمد صاحب نے بھی اپنے مریدین کی بخشش کے لیے سفارش نہیں کی تھی تاکہ یہ کہا جاسکے کہ وہ خدا کے شریک بن بیٹھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے یہ بخشش کا مژدہ سنایا تھا اور سید احمد صاحب کی بیعت منسلک کر دیا تھا۔ تو ہم عرض کریں گے کہ کیا آپ کے نزدیک باری تعالیٰ شانہ اپنا شریک بنایا کرتا ہے؟

- ۲۔ یہ وعدہ بخشش یا مژدہ کفایت سید احمد صاحب کی بیعت پر ہی کیوں منحصر کیا گیا؟
- ۳۔ بقول دہلوی صاحب اُدھر تو سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تختِ جگر فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک کے بارے میں ایسا مژدہ نہ سنایا گیا لیکن اُدھر سید احمد صاحب کے جمیع مریدین کے متعلق یہ خوشخبری سنائی گئی، تو ان حالات میں خاتونِ جنت سے سید احمد صاحب کے ہر مرید کی شان آپ حضرات کی نظر میں زیادہ ہوئی یا نہیں؟
- ۴۔ دہلوی صاحب کے نزدیک شفیع المذنبین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی تک کو نہ بخشوا سکے بلکہ قیامت میں بھی نہ بچا سکیں گے لیکن سید احمد صاحب نے اپنے جملہ مریدین کو دنیا میں ہی بخشوا لیا۔ ان حالات میں نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مرتبہ اونچا رہا یا سید احمد صاحب کا؟
- ۵۔ دہلوی صاحب کی تصریحات کے تحت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، شفیع المذنبین ہوئے یا سید احمد صاحب؟

- ۶۔ سید احمد صاحب تو چور یا چوروں کے تھاگی نہ بنے لیکن اُن کے رب نے اُنھیں چور اور چوروں کا تھاگی بنا دیا یا نہیں؟

۷۔ اے چشمِ اشک بار ذرا دیکھ تو سہی!
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

تو بینِ انبیا کا عالمی ریکارڈ موصوف اپنے نبی کو افضل الرسل ضرور کہتے ہیں لیکن اُس کے خصائص کے قائل نہیں، بلکہ دیگر رسولوں کے مقام پر رکھتے تھے چنانچہ اُنھوں نے خود یوں تصریح کرتے ہوئے اپنے

نبی کے دوسرے مقام کا ذکر کیا ہے :

”جو غیبیاں اور کمالات اللہ نے مجھ کو بخشے ہیں، سو بیان کرو، وہ سب رسول کہہ دینے میں آجاتے ہیں، کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی مرتبہ نہیں ہے“

یہ درست ہے کہ آدمی کے حق میں رسالت سب سے بڑا مرتبہ ہے لیکن قرآن کریم کی تصریح کے مطابق تِلْكَ الرُّسُلُ فَتَلَدُّ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم افضل الرسل اور نبی الانبیاء ہیں۔ آپ کو بعض ایسے کمالات سے بھی نوازا گیا ہے جو دوسرے رسولوں کو نہیں ملے۔ اگر آپ کے سارے کمالات رسول کہہ دینے میں آسکتے تو یقیناً آپ کے مخصوص کمالات دیگر انبیاء کو بھی ملے ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ آپ کی جملہ خوبیوں کو رسول کہہ دینے میں محصور بنانا، خالص مصطفیٰ سے چشم پوشی کا مرض ہے، جو خارجیت کا خاصہ ہے۔ موصوف دوسرے مقام پر یوں تصریح کرتے ہیں :

”اُس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک کلم کن سے چاہے نو کروڑوں نبی اور ولی، حجت اور فرشتے، جبرائیل اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔“

قدرت خداوندی کے انکار کی کس مجال، لیکن امکانِ نظیر کا یہ نظریہ، خالص مصطفیٰ کا انکار کرنے کی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسے ایک آن میں کروڑوں پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ یہ عقیدہ چونکہ سراسر غیر اسلامی ہے اور خالص مصطفیٰ کے انکار کا مترادف ہے اسی لیے علمائے اہلسنت کو اس سے اختلاف رہا۔ جب موصوف نے دہلی میں اس نظریے کا پرچار کرنا شروع کیا تو علمائے کرام نے اُن کا محاسبہ شروع کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں احقر چند عروضات پیش کرتا ہے :

۱۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باری تعالیٰ شانہ نے آخری نبی بنایا اور قرآن کریم میں

اس امر کا واضح اعلان فرمایا ہے۔ بقول دہلوی صاحب اگر آپ کے کروڑوں ہمسروں میں ایک بھی پیدا فرمایا جاتے تو آخری نبی ہمارے آقا رہیں گے یا آنے والا نبی؟ اگر انہوں نے آخری نبی نہیں ہوگا تو ہمسرہاں ہوا، اگر وہی آخری نبی ہوگا تو یہ کلام الہی کی تکذیب ہوگی جو محال ہے۔ دریں حالات آپ کا مثل کیسے پیدا ہوگا؟

۲۔ حبیب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو رحمۃ اللعالمین بنایا گیا اور کلام الہی میں اعلان فرمایا گیا کہ عالمین کے دائرے میں ساری مخلوق آتی ہے۔ جو پیدا ہو چکے اور پیدا ہوں گے، ان میں سے ایک فرد بھی اس زمرے سے باہر نہیں۔ آپ کے ہمسر بن کر آنے والے نبی بھی اس زمرہ سے باہر نہیں ہوں گے، وہ بھی ہمارے آقا کی رحمت کے محتاج ہوں گے۔ پھر برابری کہاں ہوئی؟ اگر اُس آنے والے کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے بھی رحمۃ للعالمین بنایا گیا تو فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین نہ رہے بلکہ اُس آنے والے کی رحمۃ للعالمین کے محتاج ہو گئے اور یہ صورت بھی کلام الہی کی تکذیب پر منتج ہوگی۔ پھر ہمسر کیسے آتے گا؟

۳۔ اسی طرح بے شمار خصائص موجود جن میں دوسرے کی شرکت محال ہے مثلاً آپ یوم میثاق سب سے پہلے بلی فرمانے والے، سب سے پہلے آپ کا نور پیدا ہوا، آپ باعث ایجاد عالم ہیں۔ بھلا دوسرے کو یہ اوصاف اب کیسے حاصل ہوں گے؟ اسی طرح آپ کا دین آخری دین، آپ کی شریعت آخری شریعت، قرآن کریم آخری کتاب، دوسرا آتے تو کلام الہی کی تکذیب اور انوکھییت کا خاتمہ ہوا اور یہ محال۔ پھر کروڑوں کہاں سے پیدا ہوں گے؟ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بروزِ حشر سب سے پہلے اُٹھیں گے، لواء الحمد آپ کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا، جملہ نبی آپ کے جھنڈے تلے ہوں گے، مقامِ محمود پر آپ رونق افروز ہوں گے، پہلا سے سب سے پہلے آپ گزریں گے، آپ سے پہلے شفاعت کی کوئی بھی جرأت نہ کر سکے گا اور سب سے پہلے آپ جنت میں داخل ہوں گے وغیرہ بہت سے کمالات ایسے ہیں جو صرف آپ کو عطا ہوں گے لیکن باری تعالیٰ نے اُن کا اعلان اپنے حبیب

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کہہ دیا ہے۔ اگر کسی دوسرے کو یہ صفات دی جائیں تو خدا اور رسول کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا اور دوسرے کو اگر یہ کمالات نہ دیے گئے تو وہ آپ جیسا کہاں ہوا؟ گویا: نہ

رُخِ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ نہیں جس کے رنگ کا دوسرا
نہ کسی کے وہم و گمان میں، نہ وہ کانِ آئینہ ساز میں

فائزین کرام کا شاید یہ گمان ہو گا کہ دہلوی صاحب صرف اپنے نبی کے خصائص سے چڑتے تھے
لیکن دوسرے رسولوں کے برابر اُن کا مرتبہ ضرور مانتے ہوں گے۔ لیکن صورتِ حال یہ بھی نہیں ہے۔
جب خصائص و یکتائی کی کرسی سے اتار کر عام رسولوں والی دوسری کرسی پر بٹھایا ہے تو اعزاز
و اکرام کے لیے کبھی ایسا نہیں کیا جاتا۔ موصوف یہاں سے بھی اٹھا کر اپنے نبی کو ایسے انبیاء
والی تیسری کرسی پر بٹھا گئے، جن پر ایمان لانا ضروری نہیں، جن کو ماننا محض غبطہ ہے۔ آئیے
اس منصب کی کہانی خود موصوف کی زبانی ہی سُن لیجیے:

”جتنے پیغمبر آئے سو وہ اللہ کی طرف سے یہی حکم لاتے کہ اللہ کو مانیں اور اُس کے
سوا کسی کو نہ مانیں“ ۱

”میرے سوا کسی کو حاکم و مالک نہ جانیں اور کسی کو میرے سوا نہ مانیں۔“ ۲
”اللہ کے سوا کسی کو نہ مان“ ۳

”اور وہ کو ماننا محض غبطہ ہے“ ۴

”آدمی کتنا ہی گناہوں میں ڈوب جاتے، محض بے جا ہی بن جائے، پر ایمان
کھانے میں کچھ قصور نہ کرتے اور کچھ بھلائی برائی کا امتیاز نہ کرے مگر تو بھی شرک
کرنے سے اور اللہ کے سوا اُسے اور کسی کو ماننے سے بہتر ہے“ ۵

۱۔ تفسیر تفسیر دہلوی، مولوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۴ ۲۔ ایضاً: ص ۴۷

۳۔ ایضاً: ص ۳۲

۴۔ ایضاً: ص ۴۹
۵۔ ایضاً: ص ۸۹

یہ تھی وہ تیسری کرسی جس پر دہلوی صاحب نے اپنے نبی کو بٹھایا کہ وہ نبی تو ضرور ہیں لیکن
 اُن پر ایمان لانا نہ صرف غیر ضروری اور نہ اخط ہے بلکہ شرک کی طرح قابلِ اِقتناب اور محض
 بے جیا بن جانے سے بھی بدتر ہے۔ کوئی پوچھے کہ ان حالات میں دہلوی صاحب کے نبی کی
 شرعی حیثیت کیا ہے؟ شرعی حیثیت بنانے کی غرض سے موصوف نے اپنے نبی کو وہاں سے
 بھی اٹھا کر چوتھی کرسی پر بٹھادیا اور اُس کے بیٹھنے والے کی شان یہ بتائی ہے،
 ”انبیاء و اولیاء کو جو اللہ نے سب لوگوں سے بڑا بنایا ہے سو اُن میں یہی بڑا
 ہے کہ اللہ کی راہ بتاتے ہیں اور بُرے پھلے کاموں سے واقف ہیں، سو لوگوں
 کو سکھاتے ہیں“ ۱۷

دہلوی صاحب نے خود اپنے نبی کی زبان سے بھی یہی اعلان کروادیا تاکہ سند رہے اور بوقتِ
 کام آئے:

”سب لوگوں سے امتیاز مجھ کو یہی ہے کہ اللہ کے احکام سے میں واقف ہوں۔

اور لوگ غافل، سو اُن کو اللہ کا دین مجھ سے سیکھا چاہیے“ ۱۸

چوتھی کرسی پر بٹھا کر دہلوی صاحب نے اپنے نبی کا تعارف یوں کروایا ہے کہ وہ بھلے
 کام سے واقف تھے اور لوگوں کو سکھایا کرتے تھے یعنی ایک مولوی صاحب ہی سمجھ لیجئے۔ اگرچہ
 عمل والا معاملہ یہاں زیر بحث نہیں کہ دین کی جو واقفیت تھی اُس کے مطابق وہ خود بھی عمل کرتے
 یا نہیں۔ یہاں پہنچا کر بھی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تسکین نہ ہوئی کیونکہ مولوی صاحبان
 منصب بھی کسی قدر قابلِ احترام ہے، لہذا موصوف نے اپنے نبی کو یہاں سے اٹھا کر پانچویں
 کرسی پر بٹھایا اور ذرا لاگ لپیٹ کے ساتھ اپنے نبی کا تعارف یوں کروایا:

”جیسا ہر قوم کا چودھری اور گاؤں کا زمیندار، سو ان معنوں کو ہر پیغمبر اپنی اُمت
 کا سردار“ ۱۹

موصوف نے سمجھا دیا کہ ہمارے نبی کا احترام محض اسی طرح کا ہے جیسے گاؤں کے چودھریوں اور زمینداروں کا ہوتا ہے۔ گویا دہلوی صاحب کے نبی اپنی اُمت کے چودھری صاحب تھے۔ اس گُرسی پر بھٹا کہ بھی موصوف کو پچھتا نا پڑا کہ شرعی حیثیت نہ سہی لیکن نبی صاحب دنیوی لحاظ سے تو اب بھی معظم رہ گئے۔ ہمت کر کے اپنے نبی کو یہاں سے بھی اٹھا کر چھٹی گُرسی پر بٹھادیا اور یوں اُن کا تعارف کروانا شروع کیا :

”انسان آپس میں سب بھائی ہیں، جو بڑا بزرگ ہو وہ بڑا بھائی ہے۔ سو اُس کی بڑے بھائی کی سنی تعظیم کیجیے۔“ ۱

”جتنے اللہ کے مقرب بندے ہیں، وہ سب انسان ہی ہیں اور بندے عاجز اور ہمارے بھائی۔“ ۲

موصوف کو انبیائے کرام کی بڑائی سے تو خاص چڑھتی پہلی عبارت میں جھول کر اپنے نبی کو بڑا بھائی، ساری اُمت کا بڑا بھائی اور بڑے بھائی کی سنی تعظیم کے لائق کہہ بیٹھے تھے لیکن فوراً سنبھل گئے اور اگلی عبارت میں بتادیا کہ بڑے چھوٹے کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں بس اتنا یاد رکھو کہ ہمارے یہ نبی صاحب ہمارے بھائی ہیں۔ حقوڑی دیر بعد اس پر بھی تملدا اُٹھے کہ موصوف دہلی کے مشہور و معروف خاندان کے ایک فرد تھے۔ کسی کو اپنے برابر سمجھیں یہ ذرا مشکل بات تھی۔ لہذا فوراً اپنے نبی صاحب کو یہاں سے بھی اٹھایا اور ساتویں گُرسی پر بٹھا کر اُن کے منصب و مرتبہ کا لحاظ رکھنے کی یوں تلقین کرنی شروع کر دی :

”کسی بزرگ کی شان میں زبان سنبھال کر بولو اور جو بشر کی سنی تعریف ہو، سو ہی کرو، سو اُس میں بھی اختصار ہی کرو۔“ ۳

یعنی اپنے نبی کا مقام مطلق بشر جیسا بتایا، ہر ایراغیرا ننھو غیرا جتنی تعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے، بس اُتنی کا حقدار بتایا جو ایک عام انسان سے بھی کم ہو۔ اتنے پر بھی دہلوی صاحب کے دل کو تسکین نہ ہوئی کیونکہ عام انسان بھی آخر اشرف مخلوق کا ایک فرد ہوتا ہے۔ لہذا اپنے

نبی کو آٹھویں کرسی پر بٹھا کر یوں اعلان کیا گیا:

”اس بات میں اولیاء اور انبیاء، جن اور شیطان میں، بھوت اور پری میں کچھ فرق نہیں ہے۔“

”خواہ یہ عقیدہ انبیاء اور اولیاء سے رکھے، خواہ پیر اور شہید سے، خواہ امام اور امام زادے سے، خواہ بھوت اور پری سے۔“

”کسی انبیاء و اولیاء کی، پیر شہید کی، بھوت پری کی یہ شان نہیں۔“
 ”پھر جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی، اماموں شہیدوں کی، بھوت پری کی، اس قسم کی تعظیم کرے۔۔۔۔۔ سو ان سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔“
 ”جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جن اور فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور شہید کو یا نجومی اور رمال کو یا جفار کو یا فال دیکھنے والے کو یا برہمن اشی کو یا بھوت اور پری کو ایسا جانے اور اس کے حق میں یہ عقیدہ رکھے، سو وہ مشرک ہو جاتا ہے اور اس آیت (۶/۹۰) سے منکر۔“

”جو لوگ پہلے اور پچھلے، آدمی اور جن بھی سب مل کر جبرائیل اور مغیرہ ہتی سے ہو جائیں تو اس ملک الملک کی سلطنت میں ان کے سب کچھ رونق نہ بڑھ جائے گی اور جو سب لوگ مل کر شیطان اور دجال ہی سے ہو جائیں تو اس کی رونق گھٹنے کی نہیں۔“

موصوف نے اعلان فرمادیا کہ ہمارے نبی صاحب علم و اختیار میں جن، بھوت اور پری جیسے ہیں تعظیم و توقیر کے لحاظ سے انہیں جن و بھوت و پری کے زمرے میں ہی رکھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ان کے وجود سے خدا کی بادشاہت میں کوئی رونق نہیں ہے۔ لیکن

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی تقویۃ الایمان، ص ۳۳ ۲۔ ایضاً: ص ۳۶

۳۔ ایضاً: ص ۳۸، ۳۹

۴۔ ایضاً: ص ۳۶

۵۔ ایضاً: ص ۶۸

۶۔ ایضاً: ص ۵۴

موصوف کی تسلی اس پر بھی نہ ہوئی۔ اپنے نبی صاحب کو یہاں سے اٹھا کر نویں کرسی پر بٹھایا جاتا ہے اور اُن کا ایسا مرتبہ بتایا جاتا ہے جس سے کم رتبے کی کوئی چیز کائنات میں نہیں مل سکتی۔ مثلاً:

”سب انبیاء اور اولیاء اُس کے روبرو ایک ذرۂ ناپیز سے بھی کم تر ہیں۔“ لہ

”اور یہ یقین جان لینا چاہیے کہ ہر مخلوق بڑا ہو یا چھوٹا وہ اللہ کی شان کے آگے چار سے بھی ذلیل ہے۔“ لہ

یہ بے دہلوی صاحب کے نبی کی آخری شان، امتیازی مقام کہ اگر اُسے ایک ذرۂ ناپیز کے ساتھ موصوف بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتے ہیں، تو اُن کا جھوٹا خدا، اُن کے البیلے نبی کو اُس ذرۂ ناپیز سے بھی کم تر شمار کرتا ہے اور دوسری دفعہ جب وہ اپنے نبی کو ساری مخلوق سمیت بارگاہِ خداوندی میں مقابلے کے لیے حاضر کرتے ہیں، تو ذرۂ مخلوق سے الگ دہلوی صاحب کا دریافت کر وہ کوئی چہار بھی ہے، وہ بھی حاضر ہو جاتا ہے۔ خدا سے موصوف مقابلہ کرواتے ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی اس مقابلے کا نتیجہ خودیوں سناتے ہیں کہ خدا کے مقابلے میں چہار اتنا ذیل نہیں ہے جس قدر ساری مخلوق اور موصوف کا خیالی نبی ذیل ہے۔ (نحو ذالہ منہا)

یہ تھا مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) اور اُن کے جملہ تابعین و حقیقین کا نبی۔ لیکن ہمارے نبی وہ ہیں جو صرف ہمارے ہی نہیں بلکہ ساری کائنات حقی کہ سائے نبیوں کے نبی اور جملہ رسولوں کے سردار و سرور ہیں۔ دونوں جہانوں میں جس کو جو نعمت، رحمت، عظمت، فضیلت ملی یا ملے گی وہ اُنہی کے صدقے، اُنہی کے ہاتھوں ملی اور ملے گی کیوں کہ باری تعالیٰ شانہ نے اُنہیں رحمۃ للعالمین اور اپنی نعمتوں کا تقسیم کرنے والا بتایا ہے۔ اُنہیں اپنا خلیفہ اعظم و نائب اکبر بنایا اور ساری کائنات کو اُسی محبوب کی خاطر وجود کا لباس پہنایا ہے۔ ہمارے خالق و مالک نے اپنے فضل و کرم سے ہمارے پیارے نبی کو کوئین کا آقا و مولیٰ، ملجا و ماویٰ اور دونوں جہانوں کا تاجدار بنا کر، متاعِ کل و حاکمِ کل و مالکِ کل اور مازون و مختار و

بہارِ نبی ہے۔ یعنی یہ

خالقِ کل نے آپ کو مالکِ کل بنا دیا
دونوں جہاں میں آپ کے قبضہ و اختیار میں

ہمارا نبی، ہمارا اور ساری کائنات کا دو جگ میں سہارا ہے ہمارا نبی وہ ہے ہم جیسے تمام گنہگاروں کی اَنَّا لَہَا کہہ کر اُس روز شفاعت فرماتے گا۔ جب جلالِ خداوندی کو دیکھ کر جملہ انبیاء کرام نفسی نفسی پکار رہے ہوں گے۔ ہمارے نبی نے شَفَاعَتِی لَا حَیْلَ اِلَّا بِکَ یَا کَیْنُ جَاں بخش و روح پرور مژدہ سنا کر، ہم جیسے گناہگاروں اور سیاہ کاروں کے مردہ جسموں میں جان ڈالی ہوئی سبھ۔ وہی اَوَّلِ شَاخ، اَوَّلِ مُشْفَع، ساتی کوثر و تسنیم اور صاحبِ مقامِ محمود ہے۔ بروزِ حشر اولین و آخرین سب ان کی معرفت میں رطبِ اللسان ہوں گے، سب ان کا منہ تھکیں گے، انہیں کا سہارا تلامش کر یں گے۔ اُس روز لواءِ الحمد ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں ہوگا۔ جب سورج سوانیرے پر ہوگا، زمین تپ کر تانبے کی طرح ہوگئی ہوگی، اُس روز اِس جھنڈے کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا۔ جس کو پناہ ملی اسی جھنڈے کے نیچے مل سکے گی۔ جو ان سے پھر اُوہ خدا سے پھرا، جو ان سے مستغنی ہوا اُوہ خدا سے مستغنی ہوا۔ ان کی گستاخی تو دور کی بات جو ان کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا کر دے اُس کے بھی ساری زندگی کے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں۔

ہمارے پیارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہ مانتے والا مسلمان ہی نہیں۔ ایمان انہیں ماننے، انہیں جاننے اور ان کی تعظیم و توقیر کرنے ہی کا نام ہے۔ ان کی محبت جانِ ایمان، ان کا ذکر راحتِ جان، ان کی فرمانبرداری بخشش کا سامان، ان کی پیاری پیاری اداؤں کو اپنالنا رحمہم اللہ اور ضابطہٴ حیات بنانے والے پکا مسلمان، دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران۔ ہمارا نبی دستِ قدرت کے کمال کا شاہکار ہے۔ ان جیسا کہ آج تک کوئی ہوا ہے نہ آئندہ ہو سکتا ہے۔ سب کے کمالات اِس جانِ جہاں میں موجود ہیں لیکن ان کے مخصوص کمالات کسی کو بھی نہیں ملے۔ ہمارا نبی ساری کائنات میں سب سے معزز و مکرم ہے۔ انہیں باری تعالیٰ شانہ نے کارخانہٴ ہستی کا شاہد بنایا، انہیں اولین و آخرین کا علم عطا فرمایا، مَا کَانَ وَمَا یُکُوْنُ

انہیں دکھایا اور بتایا ہے۔ لوح و قلم کے علوم ہمارے آقا کے معلومات کا ایک حصہ اور اسی بحر کی ایک لہر ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ آلہ وصحبہ وسلم۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) نے علامہ ابن تیمیہ حنفی تکفیر مسلمین (المتوفی ۷۲۸ھ/۱۳۲۸ء) اور محمد بن عبد الوہاب نجدی (المتوفی ۱۲۰۶ھ) سے بھی چار قدم آگے بڑھ کر اس بے دردی سے مسلمانوں کی تکفیر کی کہ ساری امت محمدیہ کو مشرک و کافر بتانے میں ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں کی۔ چنانچہ اپنے مخصوص پروگرام کے تحت مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی بنیادیوں رکھی تھی:

”سُننا چاہیے کہ مشرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب۔ لیکن اکثر لوگ مشرک و توحید کے معنی نہیں سمجھتے۔ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، حالانکہ مشرک ہیں گرفتار ہیں۔“

موصوف نے چونکہ ایمان کا دعویٰ رکھنے والوں کو مشرک بتانا تھا، اسی لیے عوام کے ذہنوں کو تیار کرنے کی خاطر یہ شگوفہ چھوڑ دیا کہ ”مشرک لوگوں میں بہت پھیل رہا ہے اور اصل توحید نایاب“ اب اپنے شرکیات کی فہرست یوں شروع کرتے ہیں:

”اکثر لوگ پیروں کو، پیغمبروں کو، اماموں کو، شہیدوں کو، فرشتوں کو، پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں۔ اُن سے مرادیں مانگتے ہیں، اُن کی منتیں مانتی ہیں۔ حاجت برآنے کے لیے اُن کی نذر و نیاز کرتے ہیں۔ بلا کے ٹالنے کے لیے اپنے بیٹوں کو اُن کی طرف نسبت کرتے ہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا نام عبد اللہ رکھتا ہے، کوئی علی بخش، کوئی حسین بخش، کوئی پیر بخش، کوئی مدار بخش، کوئی سالار بخش، کوئی غلام محی الدین۔ اُن کے جینے کے لیے کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بدھی پہناتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بٹری ڈالتا ہے۔ کوئی کسی کے نام کے جانور کرتا ہے۔ کوئی مشکل کے وقت

دُہائی دیتا ہے، کوئی اپنی باتوں میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔ غرض جو کچھ ہندو اپنے بتوں سے کرتے ہیں، وہ سب کچھ یہ جھوٹے مسلمان انبیاء اور اولیاء سے اماموں اور شہیدوں سے، فرشتوں اور پریوں سے کر گزرتے ہیں اور دعویٰ مسلمانوں کا کیے جاتے ہیں۔ سبحان اللہ! یہ منہ آوریہ دعویٰ! لے

موصوف کے یہ شرکیات یاد رکھیے اب دوسری فہرست ملاحظہ ہو:

”شُرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ نے اپنے واسطے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے ذمہ نشانِ بندگی کے ٹھہرائے ہیں، وہ چیزیں اور کسی کے واسطے کرنی۔ جیسے سجدہ کرنا، اُس کے نام کا جانا اور کرنا، اُس کی منت ماننی، مشکل کے وقت پکارنا، ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور قدرتِ تصرف کی ثابت کرنی، سو ان باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ پھر اللہ سے چھوٹا ہی سمجھے اور اُسی کا مخلوق اور اُسی کا بندہ“ لے

اب مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کے شرکیات کی تیسری فہرست ملاحظہ ہو،

”جو کوئی کسی کا نام اُٹھتے بیٹھتے لیا کرے، دُور نزدیک سے پکارا کرے، بلا کے مقابلے میں اُس کی دُہائی دے اور دشمن پر اُس کا نام لے کر ہلہ کرے، اُس کے نام کا ختم پڑھے یا شغل کرے یا اُس کی صورت کا خیال باندھے اور یوں سمجھے کہ جب میں اُس کا نام لیتا ہوں، زبان سے یاد دل سے، یا اُس کی صورت کا، یا اُس کی قرب کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اُس کو خبر ہو جاتی ہے۔ اُس سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی اور جو مجھ پر احوال گزرتے ہیں جیسے بیماری اور تندرستی، کشائش اور تنگی، مرنا اور جینا، غم اور خوشی، سب کی ہر وقت اُسے خبر ہے۔

جہاں میرے منہ سے نکلتی ہے وہ سب سُن لیتا ہے اور جو خیال و وہم میرے
دل میں گزرتا ہے، وہ سب سے واقف ہے۔ سو ان باتوں سے مشرک
ہو جاتا ہے۔ لے

موصوف کے بتاتے ہوئے مشرکوں میں مندرجہ ذیل امور کے قائلوں کا بھی شمار کر لیا جائے:
”جو کوئی کسی اور کو ایسا متصرف ثابت کرے، اُس سے مراد مانگے، اس توقع پر
نذرینا کرے، اُس کی منقبت مانے، مصیبت کے وقت اُس کو پکارے، سو
مشرک ہو جاتا ہے۔ لے

موصوف کے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست تو کافی طویل ہے۔ لہذا اسی فہرست میں مزید اضافہ
یوں بھی کیا ہے:

”بعض کاتم تعظیم کے لیے اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ اُن کو عبادت کہتے ہیں۔
جیسے سجدہ اور رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اُس کے نام پر مال خرچ کرنا،
اُس کے نام کا روزہ رکھنا، اُس کے گھر کی طرف دُور دُور سے قصد کر کے سفر
کرنا اور ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے یہ لوگ اُس کے گھر کی زیارت
کو جاتے ہیں اور رستے میں اُس مالک کا نام پکارنا، نامعقول باتیں کرنے سے
اور شکار سے بچنا اور اُسی فید سے جا کر طواف کرنا، اُسکے گھر کی طرف سجدہ کرنا،
اُس کی طرف جانور لے جانے، وہاں منقبت ماننی، اُس پر غلات ڈالنا، اُس
کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دُعا مانگنی، التجا کرنی اور دین و دنیا کی مرادیں
مانگنی، ایک پتھر کو بوسہ دینا، اُس کی دیوار سے اپنا منہ اور چھاتی ملنی، اُس کا
غلات پکڑ کر دُعا کرنی، اُس کے گرد روشنی کرنی، اُس کا مجا در بن کر اُس کی
خدمت میں مشغول رہنا، جیسے جھاڑ و دینی، روشنی کرنی، فرش بچھانا، پانی

پلانا، وضو غسل کا لوگوں کے لیے سامان درست کرنا، اُس کے کنوئیں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر پانی ڈالنا، آپس میں بانٹنا، غائبوں کے واسطے لیجانہ رخصت ہوتے وقت اُٹے پاؤں چلنا، اُس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا، یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا، مولیشی نہ چگانا، یہ سب کام اللہ نے اپنی عبادت کے لیے اپنے بندوں کو بتائے ہیں۔

پھر جو کوئی کسی پیر پیغمبر کو، یا بھوت پری کو، یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو، یا کسی کے تھان کو، یا کسی کے چلے کو، یا کسی کے مکان کو، یا کسی کے تبرک یا نشان یا تابوت کو، سجدہ کرے، یا رکوع کرے یا اُس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو، یا جانور چڑھائے، یا ایسے مکان میں دُور دُور سے قصد کر کے جاوے، یا وہاں روشنی کرے، غلاف ڈالے، چادر چڑھائے، اُن کے نام کی چھڑی کرے، اُن کی قبر کو بوسہ دے، مورچیل جھلے، اُس پر نشا میا نہ کھڑا کرے، چوکھٹ کو بوسہ دے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، مجاور بن کر بیٹھ جائے، رخصت ہوتے وقت اُٹے پاؤں چلے، وہاں کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی قسم کی باتیں کرے، سو اُس پر شرک ثابت ہوتا ہے۔“ لے

دہلوی صاحب کے شریکات کا دریا اپنی پوری طغیانوں پر تھا، لہذا اتھمنا کہاں؟ دیا بیت کی گنگا میں جہنا کہاں؟ قارتیں ابھی نہ اُگنا تیں۔ مسلمانوں کو مشرک بتانے کی دہلوی صاحب نے جو فہرست تیار کی اُس میں یہ بھی شامل ہیں:

”جو کوئی کہ انبیاء و اولیاء کی اماموں شہیدوں کی، بھوت پری کی اس قسم کی تعظیم کرے، جیسے آڑے کام پر اُن کی نذر مانے، مشکل کے وقت اُن کو پکارے، بسم اللہ کی جگہ اُن کا نام لے، جب اولاد ہو اُن کی نذر نیاز کرے، اپنی اولاد کا نام عبدالنبی، امام بخش، پیر بخش رکھے۔ کھیت اور باغ میں اُنکا

حقہ لگائے۔ جو کھیتی باڑی سے آئے پہلے اُن کی نیاز کرے جب اپنے کام میں
لائے، دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کے جانور پھرائے، پھر اُن جانوروں
کا ادب کرے، پانی دانے پر سے نہ ہائے، لکڑی پتھر سے نہ مارے، کھانے
پینے پھننے میں رسوں کی سند پڑے کہ فلا نے لوگوں کو چاہیے فلا نہ کھانا نہ کھائیں،
فلا نہ پکڑا نہ پھنیں، حضرت بی بی کی صمنک مرد نہ کھاتیں، لونڈی نہ کھائے، جس
عورت نے دوسرا خصم کیا ہو وہ نہ کھاتے، شاہ عبدالحی کا تو شہ حقہ پینے والا
نہ کھاتے، برائی اور بھلائی جو دنیا میں پیش آتی ہے اُس کو اُن کی طرف نسبت
کر کے فلا نا اُن کی چٹکار میں آکر دیوانہ ہو گیا، فلا نے کو بھوں نے راند ا تو
محتاج ہو گیا، فلا نے کونوازا تو اُس کو فتح و اقبال مل گیا، قحط فلا نے ستارے
کے سبب سے پڑا، فلا نا کام جو فلا نے دن شروع کیا تھا یا فلا فی ساعت میں
سو پورا نہ ہوا، یا یوں کہیں کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں آؤں گا، یا پیر چاہے گا
تو یہ بات ہو جائے گی، یا اُس کے تئیں بولنے میں یا معبود، داتا، بے پروا،
خداوند خدائیں گاں، مالک الملک، شہنشاہ بولے، یا جب حاجت قسم کھانے
کی پڑے تو پیغمبر کی، یا علی کی، یا امام کی یا پیر کی یا انکی قبروں کی قسم کھاتے۔ سو
ان سب باتوں سے شرک ثابت ہوتا ہے۔ ۱۰

اب ذرا سجدہ تعظیمی کے بارے میں آنجناب کی تحقیقِ انیق ملاحظہ فرمائی جائے۔ چنانچہ
کھتے ہیں،

اِس آیت (۲۴) سے معلوم ہوا کہ ہمارے دین میں یوں ہی فرمایا ہے: سجدہ
کرنا حقِ خالق ہی کا ہے سو کسی مخلوق کو نہ کیا جائے کہ مخلوق ہونے میں چاند
اور سورج، نبی اور ولی برابر ہیں۔ جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی کسی
مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے، جیسے فرشتوں نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت

یعقوب نے حضرت یوسف کو، توہم بھی اگر کسی بزرگ کو کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سو یہ بات غلط ہے۔ آدم کے وقت کے لوگ اپنی بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے۔ چاہیے یہ لوگ ایسی ایسی جنتیں لانے والے اپنی بہنوں سے نکاح کر لیں۔ اصل بات یہی ہے کہ بندے کو اللہ کا حکم ماننا چاہیے جب اُس نے جو حکم فرمایا اُس کو جان و دل سے قبول کر لینا چاہیے اور حجت نہ نکالے کہ اگلے لوگوں پر تو یہ حکم نہ تھا، ہم پر کیوں ہوا؟ ایسی جنتیں لانے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔^۱

بزرگوں کے سامنے ادب سے کھڑا ہونا بھی شرک ہے۔ لیجیے موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

”اس آیت (۲۱/۱۶) سے معلوم ہوا کہ ادب سے کھڑا ہونا، اُس کو پکارنا اور اُس کا نام جینا، اُنہیں کاموں میں سے ہے کہ اللہ صاحب نے خاص اپنی تعظیم کے لیے ٹھہراتے ہیں اور کسی سے یہ معاملہ کرنا شرک ہے۔“^۲

دہلوی صاحب اپنے اصطلاحی مشرکوں کی فہرست پیش کرتے ہوئے آگے بڑھ کر وضاحت فرماتے ہیں:

”اس قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کے لیے نہ کیا جاتے ہیں۔ کسی کی قبر یا چلتے پڑیا کسی کے تھکان پر دور دور سے قصد کرنا، سفر کی رنج و تکلیف اٹھا کر، میلے کھیلے ہوئے وہاں پہنچنا، وہاں جا کر جانور چڑھانے، نیتیں پوری کرنی، کسی کی قبر یا مکان کا طواف کرنا، اُس کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرنا یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا اور اسی قسم کے کام کرنے اور اُن سے کچھ دین و دنیا کے فائدہ کی توقع رکھنا۔ یہ سب شرک کی باتیں ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔“^۳

اسی سلسلہ شریکات و مایہ کی آخری عبارت پیش خدمت ہے۔ اس کے شریکات عجیب سے عجیب تر ہیں:

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقویۃ الایمان، ص ۷۷۔ ۲۔ ایضاً: ص ۷۹۔

۳۔ ایضاً: ص ۸۰۔

”اس آیت (۱۳۵) سے معلوم ہوا کہ جانور کسی مخلوق کے نام کا نہ ٹھہرائیے اور وہ جانور حرام اور ناپاک۔ اس آیت میں کچھ اس بات کا مذکور نہیں کہ اُس جانور کے ذبح کرنے کے وقت کسی مخلوق کا نام لیجیے جب حرام ہو۔ بلکہ اتنی ہی بات کا ذکر ہے کہ کسی مخلوق کے نام پر جہاں کوئی جانور مشہور کیا کہ یہ گائے سید احمد بکیر کی ہے، یا یہ بکر اشیش سدو کا ہے، سودہ حرام ہو جاتا ہے، پھر کوئی جانور ہو، مرغی یا اونٹ، کسی مخلوق کے نام کا کر دیجیے، ولی کا یا نبی کا، باپ کا یا دادے کا، بھوت کا یا پرسی کا، وہ سب حرام ہے اور ناپاک، اور کرنے والے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔“
 مناسب نظر آتا ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) جن جن کاموں کے کرنے والوں کو مشرک بتایا اُن کی مذکورہ عبارات کی روشنی میں ایک فہرست پیش کر دی جائے جو اس طرح بنتی ہے:

- ۱۔ جس نے مشکل کے وقت کسی نبی یا ولی کو پکارا تو مشرک۔
- ۲۔ اُن کی متین مائیں تو مشرک۔
- ۳۔ اُن کی نذر و نیاز دی تو مشرک۔
- ۴۔ بلا ٹھننے کے لیے اپنے کسی بیٹے کو اُن کی طرف منسوب کیا تو مشرک۔
- ۵۔ اپنے کسی بیٹے کا نام عبدالنبی، علی بخش، حسین بخش، پیر بخش، ملا بخش یا غلام محی الدین وغیرہ رکھا تو مشرک۔
- ۶۔ کسی بزرگ کے نام کے غریبوں کو کپڑے پہنائے، کھانا کھلایا تو مشرک۔
- ۷۔ کسی بزرگ کے نام کا جانور ذبح کیا تو مشرک۔
- ۸۔ کسی بزرگ کے نام کی قسم کھائی تو مشرک۔
- ۹۔ کسی کو سجدہ تعظیمی کیا تو مشرک۔
- ۱۰۔ کسی کو اللہ کا بندہ سمجھ کر بے طاعتی الہی حاضر و ناظر سمجھا تو مشرک۔

- ۱۱ — کسی بزرگ کو خدائی عطا سے صرف کی قدرت مافی تب بھی مشرک۔
- ۱۲ — اُٹھتے بیٹھتے وقت کسی بزرگ کا نام لیا جیسے کلمہ یا درود کا ورد کرتا رہے تو مشرک۔
- ۱۳ — دُور سے کسی بزرگ کو پکارا تو مشرک۔
- ۱۴ — نزدیک سے کسی بزرگ کو پکارا تب بھی مشرک۔
- ۱۵ — مصیبت کے وقت کسی بزرگ کی دہائی دی تو مشرک۔
- ۱۶ — کسی بزرگ کا نام لے کر دشمن پر ہتھ کیا جیسے عواماً مجاہدین یا علیؑ کہہ کر حملہ کرنے پر تو مشرک۔
- ۱۷ — کسی بزرگ کے نام کا ختم پڑھا، جیسا کہ تمام سلاسل میں صد ہا سال سے مروج تو مشرک۔
- ۱۸ — اپنے پییر یا کسی بزرگ کا شغل کیا، جیسا کہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؑ قدس سرہ نے خاص طور پر تعلیم دی ہے، تو مشرک۔
- ۱۹ — کسی بزرگ کی صورت کا خیال کیا تو مشرک۔
- ۲۰ — کسی بزرگ کو اپنے حالات سے خبردار مانا، جیسے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) نے پیروں کی شان بتائی ہے، تو مشرک۔
- ۲۱ — جو کسی بزرگ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا، وہ مشرک۔
- ۲۲ — جس نے کسی بزرگ کے نام پر مال خرچ کیا، وہ مشرک۔
- ۲۳ — جو کسی بزرگ کے گھر کی طرف صفر کر کے گیا، تو مشرک۔
- ۲۴ — جو کسی بزرگ کی طرف جاتے ہوئے نامعقول باتیں کرتے ہوئے نہ گیا، وہ مشرک۔
- ۲۵ — جو بزرگ کی طرف جاتے وقت شکار کرتا ہوا نہ گیا، وہ مشرک۔
- ۲۶ — کسی بزرگ کے لیے جانور لے گیا، تو مشرک۔
- ۲۷ — کسی بزرگ کے مزار پر چادر ڈالی، تو مشرک ہو گیا کیونکہ چادر تو دہلوی صاحبہ خدا کے مزار پر ڈالنی چاہیے تھی۔
- ۲۸ — کسی بزرگ کے آستانے پر جا کر خدا سے دعا مانگی تو مشرک۔

- ۲۹ — کسی کے مزار پر جا کر اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا کی مرادیں مانگیں تو مشرک۔
- ۳۰ — کسی بزرگ کے آستانے کی کسی دیوار سے اپنا منہ لگایا یا چھاتی ملی تو مشرک۔
- ۳۱ — کسی بزرگ کے مزار کا غلاف پکڑ کر خدا سے دُعا مانگی تو مشرک۔
- ۳۲ — کسی مزار پر روشنی کی، تو مشرک۔
- ۳۳ — جس نے کسی مزار کے پاس فرش بچھایا تو مشرک۔
- ۳۴ — جس نے مزار کا مجاور بن کر کسی کو پانی پلایا تو مشرک۔
- ۳۵ — جس نے مزار پر آنے جانے والوں کی خاطر وضو و غسل کے پانی کا خیال رکھا، تو مشرک۔
- ۳۶ — جس نے مزار کا خدمت گار بن کر وہاں بھاڑ و دی، وہ مشرک۔
- ۳۷ — جس نے کسی بزرگ کے کنوئیں کے پانی کو برکت والا سمجھا تو مشرک۔
- ۳۸ — دُہ پانی بدن پر ڈالا تو مشرک۔
- ۳۹ — اُسے آپس میں بانٹا تو مشرک۔
- ۴۰ — اُسے غائبوں کے واسطے لے گیا تو مشرک۔
- ۴۱ — کسی بزرگ یا مزار سے لوٹتے وقت اگر اُس کی طرف پیٹھ نہ کی تو مشرک۔
- ۴۲ — کسی بزرگ کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کیا تو مشرک۔ جیسا کہ ازروٹے احادیث سلمان بنہ ملیحہ اور اس کے گرد و پیش کو حرم مانتے اور ان مقامات کا ادب کرتے ہیں، ایسا ادب کرنے والے موصوف کے نزدیک سب مشرک۔
- ۴۳ — وہاں شکار نہ کیا تو مشرک۔
- ۴۴ — وہاں کے درخت نہ کاٹے تو مشرک۔
- ۴۵ — وہاں کی گھاس نہ اکھاڑی تو مشرک۔
- ۴۶ — وہاں مویشی نہ چگاتے تو مشرک۔
- ۴۷ — کسی بزرگ کی قبر کو بوسہ دیا تو مشرک۔
- ۴۸ — مورچہ چل جھلا تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدا نے اپنے لیے خاص کیا ہوا ہے کہ اُسی پر مورچہ چل جھلا جاتے۔
- ۴۹ — کسی بزرگ کے مزار پر نشا میا نہ کھڑا کر دیا کہ آنے والوں کو دھوپ کی تکلیف نہ ہو

تو مشرک، کیونکہ یہ کام بھی موصوف کے خدانے اپنے ساتھ خاص کیا ہوا ہے۔

۵۰۔ جس نے اپنے کھیت یا باغ میں کسی بزرگ کا ازراہ عقیدت و خدمت حصہ رکھا وہ مشرک۔

۵۱۔ کھیتی باڑی میں سے جو حصہ آتے اُس میں سے پہلے کچھ کسی بزرگ کی نذر کر دیا، تو مشرک۔

۵۲۔ دھن اور ریوڑ میں سے اُن کے نام کا جانور چٹھرا دیا، تو مشرک۔

۵۳۔ ایسے جانور کا کوئی ادب لحاظ کیا، تو مشرک۔

۵۴۔ اُس جانور کو پانی پینے سے نہ روکا، تو مشرک۔

۵۵۔ اگر اُس جانور کو کٹمی یا پتھر سے نہ مارا تو مشرک۔

۵۶۔ کھانے پینے میں رسم و رواج کی سنہ پڑی، تو مشرک۔

۵۷۔ اگر کھانے یا پینے پر کسی قسم کی مصلحت بھی پابندی عائد کی، تو مشرک۔

۵۸۔ اگر بی بی کی صحنک کا کھانا، شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز اور اُن کے سارے

خانوادے کی طرح مردوں کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۵۹۔ یہی کھانا اگر دوسرا خاوند کرنے والی عورت کو نہ کھلایا تو مشرک۔

۶۰۔ شاہ عبدالحی کا توشہ اگر حقہ پینے والے کو نہ کھلایا، تو مشرک۔

۶۱۔ اگر کسی نے یہ کہا کہ یہ آدمی فلاں بزرگ کی گستاخی کرنے کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہے

تو ایسا کہنے والا مشرک۔

۶۲۔ اگر کسی کی محتاجی کا سبب اُس کا بزرگوں کی بارگاہ میں گستاخ ہونا بتایا، تو مشرک۔

۶۳۔ اگر کہے کہ فلاں شخص کو کسی ولی یا نبی نے نوازا تھا، تو ایسا کہنے والا مشرک۔

۶۴۔ کسی ساعت کو نجس مانا، تو مشرک۔

۶۵۔ اگر کہا کہ اللہ و رسول چاہے گا تو میں آؤں گا، یا فلاں کام کر سکوں گا، تو ایسا

کہنے والا بھی مشرک۔

۶۶۔ اگر خدا کے سوا کسی کو داتا کہا، تو مشرک۔

- ۶۷۔ اگر خدا کے سوا کسی کو بے پروا کہہ دیا، تب بھی مشرک۔
 ۶۸۔ اگر کسی انسان کو شہنشاہ کہہ دیا، تو مشرک۔
 ۶۹۔ کسی بزرگ کے نام کی قسم کھائی، تو مشرک۔
 ۷۰۔ اگر سجدہ تعظیمی کو مشرک نہ سمجھا تو اس کے خلاف قرآن وحدیث سے دلائل پیش کر لے لگا، تو کافر۔

- ۷۱۔ اگر کسی بزرگ کے سامنے بے ادبی کے انداز میں کھڑا نہ ہوا، تو مشرک۔
 ۷۲۔ اگر کسی بزرگ کے پاس میلے کچیلے کپڑوں سے پہنچا، تو مشرک۔
 ۷۳۔ اگر کوئی کہے کہ یہ گاتے سید احمد کبیر کی ہے، وہ مشرک۔
 ۷۴۔ کہے کہ یہ بکرا شیخ سدوکا ہے، تو مشرک۔
 ۷۵۔ اگر کہہ دیا کہ یہ مرغی میری بیوی کی ہے، تو مشرک۔
 ۷۶۔ کہہ بیٹھا کہ یہ اونٹ میرے لڑکے کا ہے، تو مشرک۔
 ۷۷۔ کہہ دیا کہ یہ بھیڑ میرے والد محترم کی ہے، تو مشرک۔
 ۷۸۔ اگر کہا کہ یہ بھینس میرے دادا جان کی ہے، تو مشرک۔
 ۷۹۔ جو حرمت کے لیے بوقت ذبح غیر خدا کا نام لینا مراد لے، وہ مشرک۔
 ۸۰۔ جو ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام اور ناپاک تسلیم نہ کرے، وہ مشرک۔ لاجول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

۸۱۔ آہ یہ ظالم تلخ حقیقت جتنے سینے غرق ہوئے

اکثر اپنی موج میں ڈوبے، طوفان سے ٹکرائے کم

قارئین کرام! یہ تھا مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کا ایک
 اپنے بچے اور سیکھے سکھاتے منصوبے کے تحت مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کا زبانی جمع خرچ۔
 اس فہرست کو سامنے رکھیے، تقویۃ الایمان سے مطابقت کر کے سوچیے! اگر تعلیمات قرآن و
 حدیث اور تصانیف علمائے دین پر نظر ہے تو بتائیے کیا موصوف کے اس خانہ ساز مشرک سے
 نسبت محمدیہ کا کوئی ایک فرد بھی بچ سکا ہے؟ بات دراصل یہ تھی کہ موصوف نے محمد بن عبد الوہاب

(المتوفی ۱۲۰۶ھ) کی طرح مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرا کر اپنے خارجی ہونے کا عملی ثبوت بھی پیش کرنا تھا۔ مسلمانوں سے قتل و قتال کر کے اپنی ہوس ملک گیری کو تسکین دینی تھی۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے حصولِ قتل و قتالِ مسلمین کی خاطر مسلمانوں کو کافر و مشرک ٹھہرانے کے لیے تقویۃ الایمان کتاب

لکھی، تاکہ برٹش گورنمنٹ کے حکم کے مطابق پنجاب کے سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کیا جائے اور جس طرح محمد بن عبدالوہاب نجدی نے مسلمانوں کے خون سے مہولی کھیل کر آل سعود کے سہارے خارجی حکومت قائم کی تھی، متحدہ ہندوستان میں بھی اُسی طرح انگریزوں کے سہارے اپنی سلطنت قائم کرنے کا شوق دامگیر ہوا۔ سکھوں سے لڑنے کی خاطر پنجاب و سرحد کے خوانین و رؤسا کا تعاون ضروری تھا۔ جب یہ حضرات اپنی جمیعت سمیت نواحِ پشاور میں پہنچے تو جن خوانین کو آپ کی اطلاع ہوتی گئی وہ بڑی غوشی سے دستِ تعاون بڑھاتے تھے۔ کیونکہ ابتداءً وہ انھیں رحمتِ خداوندی شمار کرتے تھے۔

۱۲ ربیع الثانی ۱۲۴۲ھ کو ہند کے مقام پر مجمعِ عوام و خواص یعنی خوانین و رعایا نے سید احمد صاحب کے ہاتھ پر امامت کی بیعت کی۔ آپ کو امیر المومنین بن لیا، جمعہ میں آپ کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سید صاحب کی مہر اسْمُہُ اَحْمَدُ اور آپ کے مشیر خاص و سپہ سالار افواج یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی مہر دَا دِکُرُ فِی الْکِتَابِ اِسْمَاعِیْلُ مقرر ہوئی۔ عمال اور قاضی مقرر کیے گئے، علاقے کا انتظام سنبھال لیا، زکوٰۃ و عشر کا وصول کرنا شروع کیا۔ مقدمات کی سماعت کرنے لگے تو جن مسلمانوں نے انھیں تالیفِ قلوب کے سارے اسباب سے لیس دیکھ کر رحمتِ خداوندی سمجھا تھا، انھیں چند روز میں ہی معلوم ہونے لگا کہ ظلم و ستم کے اصل بانی نیز ہلاک و اور چینگیز خاں کے اصلی نشین یہی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان پر حقیقت بھی منکشف ہو گئی کہ مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھانے اور ان کی آبروریزی کا سلسلہ اس لیے جاری ہے کہ یہ اہلِیٰ مجاہد خارجیت کے مرض میں گرفتار اور مسلمانوں کو مشرکین و کافروں سمجھتے ہیں۔ برطانوی ڈپلومیسی میں پورے ماہر ہیں کہ جو امیران سے تعاون کا اعلان کرتے ہیں اس کا علاقہ زیر نگین و خزانہ زیر تصرف۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر جو رئیس ذرا پیچھے ہٹا، اسے

باغی اور منافق قرار دے کر واجب القتل ٹھہرا دیا۔ موقع ملنے پر حملہ کر دیا، مسلمانوں کے خون سے غب ہوئی کھیلی، قیدیوں کو لوٹڈی غلام بنایا اور جو مال ہاتھ لگا وہ کافروں کا مال ٹھہرا کر، مالِ غنیمت شمار کیا اور جس نکال کر باقی فوج میں تقسیم کر دیا جاتا۔

یار محمد خاں حاکمِ یاغستان نے اس بھیڑ چال کو دیکھا تو آٹا راپھے نظر نہ آئے کہ ان سواٹیوں کے ساتھ لگ کر سکھوں کی منظم قوم کی دشمنی مول لی جاتے اور مسلمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کو خطرے میں ڈالا جاتے۔ لہذا وہ پیچھے ہٹنے لگا تو خارجیت کی پیشانی پر بل آگئے، وہابیت کے تیر بدل گئے اور مسلم کشی کا دریا جوش میں آگیا۔ یار محمد خاں کے بارے میں مختلف خطوط میں وضاحت کی گئی، سید احمد صاحب نے مختلف لوگوں کو اُس کا کافر، منافق، دشمنِ اسلام، کافروں کا یار و رازدار، فریبی، مکار وغیرہ ہونا بتایا اور اپنے ارادہ مسلم کشی کے لیے راہ ہموار کرتے رہے۔ سوانح احمدی کا تیسرا مکتوب جو اعلام ہے، اُس میں سید احمد صاحب نے یہی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے:

”سردار مذکور نے اگرچہ اس نور کے ظہور کے آغاز کے وقت ہی اپنے حد بھرے دل میں مخالفت کا ارادہ رکھا تھا اور اپنے سینہ پر کینہ میں لڑائی جھگڑا کا تخم بویا تھا۔ آخر کار ایسے وقت میں جبکہ دشمن کے مقابلہ میں لڑائی کا سمندر موجیں مار رہا تھا اور توپ و بندوق کی گرج دار آوازیں معرکہ و جدال کی داد دے رہی تھیں، بدبختی اور جھگڑے کی بنیاد پڑ گئی اور اُس نے مسلمانوں کی فوج کو ترتر بتر کر دیا اور جہاد کے معاملہ کو لیت و لعل میں ڈال دیا اور دغا و مکر کی چال چلی اور اپنے زعم میں کفر و فساد کی جڑیں مضبوط کر دیں اور اسلام و جہاد کی بنیاد متزلزل کر دی۔ اس طرح ایک جھوٹی باطل حکومت کی تنظیم کی اور سچی امامت میں خلل ڈال دیا۔ اس کے علاوہ اس خاکسار کی ہلاکت اور اس ناچیز کو برباد کرنے میں سخت جد و جہد کرتا رہا اور سچی ناکام میں مصروف رہا۔“

یار محمد خاں حاکمِ پاکستان ذمی شعور آدمی تھا، حکمتِ علی کے ساتھ سکھوں سے نباہ کر کے اسلامی علاقوں کو اُن کی دستِ بُرد سے بچاتے ہوئے تھا کیونکہ خوانین بھی آپس میں متفق و متحد نہیں تھے۔ شروع میں تو دیگر بعض خوانین کی طرح موصوف نے بھی بیعت کر لی لیکن صورتِ حال سے آگاہ ہونے پر وہ شرعی اور سیاسی لحاظ سے تعاون نہ کرنے پر مجبور تھا۔ جس کے وجہ حریفانہ

۱۔ اس بیعت کی شرعی حیثیت وہی تھی جیسے کوئی بے خبر مسلمان اپنے وقت کے کسی اہلِ غیرِ حلالیہ حوانی یا محمد بن عبدالوہاب نجدی یا مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھ پر بیعت کر بیٹھا۔

۲۔ موصوف کو جب آگاہی ہوئی کہ وہ لشکرِ علی المرتضیٰ کے قلب میں خوارج کو جگہ دے رہے

محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بھیڑوں کے ریوڑ میں محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پرہیزگار بھیڑیوں کو داخل کر چکے، مسلمانوں کو کافر و مشرک جاننے والوں کو اُنھوں نے اپنی گردنوں پر مسلط کر دیا۔ تو حکمتِ علی سے چھٹکارے کی صورت نکالتی اور اس بلائے ناگوار سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنا شرعی اعتبار سے ضروری ہو گیا تھا۔

۳۔ یہ معلوم ہونے پر کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی تو انگریزوں کی فوج کا ہراول دستہ ہے اُنھوں نے محسوس کیا کہ اس جھگڑے کی جتنی بھی مدد کی جاتے گی اُس کا فائدہ براہِ راست انگریزوں ہی کو پہنچے گا، کیونکہ سید احمد صاحب کی کامیابی انگریزوں کو ایک ہی جہت میں سنبھلنے سے کابل و قندھار تک پہنچا دے گی۔

۴۔ پانچ سو علماء و مشائخ نے پنجاب کے مقام پر جمع ہو کر ان حضرات کو فہمائش کی کہ اُسے اپنے غیر اسلامی عقائد و نظریات ترک کر دیں، تاکہ مسلمان دل کھول کر اُن کی مدد کر سکیں سکھوں سے بڑی آسانی کے ساتھ نبٹ سکیں، نیز انگریزوں کے آلہ کار بننے سے اجاہیں لیکن یہ دونوں باتیں نامنتظر ہوئیں۔

یار محمد خاں نے پیچھے ہٹنے کی وجہ بتائی اُسے اسی اعلام کے اندریوں بیان کیا گیا ہے: "اُس کافر و سیاہ (یار محمد خاں) کا عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ کہتا یہ ہے کہ کافر ملعون سے دوستی محض شعائرِ دین کی حفاظت کے واسطے ہے، مسلمانوں کے مقاصد اور جان و مال بچانے کے لیے ہے، یہ بھی مذہبِ اسلام کی

خدمت گزاری کا ایک طریقہ اور سنت سید الانام کے پاس و لحاظ کا ایک ذریعہ ہے۔ غرض یہ صریح مکر و فریب اور گمراہی اور اپنے عیب کو چھپانے کا جید ہے۔ دین کے احکام کی پاسداری کا دعویٰ بھی خوب ہے یہ تو اللہ کا نہیں اُس کا اپنا دین ہے۔ ۱

وقت سے بڑا منصف کون ہے؟ ایک صدی بھی گزرنے نہیں پائی تھی کہ سید احمد صاحب کے قلعین کے فتوے، ایک ٹھینٹ مشرک، بکے بُت پرست، یعنی گاندھی جی کی جنبش لب کے ساتھ گردش کرنے لگ گئے تھے۔ کچھ عرصہ بعد مسلمانوں کو ہنود کی دست برد سے بچانے اور اسلامی اصولوں کے تحت زندگی بسر کرنے کی خاطر ”پاکستان“ کا نعرہ بلند ہوا، تو ان حضرات نے سورا ج (اکھنڈ بھارت) کی تائید اور مشرکین ہنود کو اپنا ان و اتا بنائے رکھنے کی حمایت میں قیام پاکستان کی اتنی سر توڑ مخالفت کی جتنی ہنود کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔ یار محمد خاں حاکم پاکستان کے بارے میں سید احمد صاحب کے اس ریمارک کو سامنے رکھتے ہوئے کیا فیصلہ ہے موصوف کے معقدین کا کیا فیصلہ ہے کانگریسی اور رتنار دوست، گاندھی عوامی علماء کے بارے میں؟ ان کے متعلق دیوبندی مولوی ظفر علی خاں تو یوں مثنیٰ خواں تھے:

رسول اللہ کے گھر میں یہ کیسا انقلاب آیا
کہ گاندھی جی کی کٹیا عالمان دین کا ڈیرا ہے

بہر حال، یار محمد خاں کے بارے میں سید احمد صاحب نے جو فیصلہ کر لیا تھا، اُنہیں کی زبانی ملاحظہ ہو:

”سردار مذکور کی منافقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہر عقلمند، ہوشیار، تجربہ کار کی رائے میں جہاد قائم رکھنا بغیر ایسے فتنہ برپا کرنے والوں کے استیصال کے ممکن نہیں۔ ان حالات کے تحت لکھا جاتا ہے کہ اُس کے ساتھ قتل و جہال اور اُس کی بیخ کنی بھی ایک صورت ہے ازالہ فساد کی۔ اُن لوگوں کی

توہین اور بیخ کنی اقامتِ جہاد میں شامل ہے۔ جہاد کے نفاذ اور اُن کے مقابلہ کے لیے ہم مامور ہیں اور اُن سے ہاتھ پائی کرنا ہمارے لیے باعثِ ثواب ہے۔ ہماری فوج کا ہر مبارز غازی ہے اور اللہ تعالیٰ کی فوج کا سپاہی ہے اور اُن کے لشکر کا مقتول گنہگار ہے اور ہمارا شہید اللہ کے پاس مقبول اور مومن ہے اور اُن کا مقتول مردود و ملعون۔ اور یہ حکم اسلام کے چاروں مقررہ اصولوں یعنی کتاب و سنت، اجماع اور قیاس سے ثابت ہے۔ لیکن قرآن کی رُو سے پھر یہ کہتا ہوں کہ سردارِ مذکور منافقین کی ایک قسم میں شامل ہے اور اُن کے قتال پر خلاق جہاں جلّ شانہ کی آیات بلحاظ استحقاق ناطق ہیں۔ بلاشبہ وہ منافقین میں سے ہے۔ کفارِ بد انجام کے ساتھ موالات اور بد بختِ فاجر و ل سے بھائی چارہ وہ اس حد تک رکھتا ہے کہ اُس کے آثار روزِ روشن کی طرح ظاہر ہیں اور اُن سے باہم دوستی ہی نفاق کی علامت ہے۔

کیا سید احمد صاحب کے اسی فیصلے کی رُو سے ہندوؤں سے نہ صرف موالات کرنے والے بلکہ اُن کے بندہ بے دام بننے والے حضرات بھی منافق قرار پائیں گے یا نہیں؟ اگر جواب نفی میں ہے تو اُس کی وجہ؟ کیا سید احمد صاحب کے تابعین پر قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس کا کوئی حکم اتنا انداز ہونے کی اہمیت نہیں رکھتا؟ تعصب کو بالاتے طاق رکھتے ہوئے غور تو فرمائیے کہ سکھوں سے دوستی رکھنے کا یا رِ محمد خاں پر الزام لگا کر اُسے منافق بتلایا گیا اور اُس پر فوج کشی کی گئی۔ اُسے شکست ہوئی تو اُس کی ساری فوج کو لشکرِ کفار سمجھ کر اُن کے جنگی قیدیوں کو غلام بنایا گیا، اُن کا مال، غنیمت کا مال شمار ہوا۔ لیکن جب یہی خارجی ٹولہ گاندھی صاحب کا علی الاعلان نعلیٰ بزار، ہنود کا یار و غمخوار اور مسلمانوں سے بیزار و برسرِ پیکار تھا کیا اُن دنوں مسلمانوں کو بھی یہ حق حاصل تھا یا نہیں کہ وہ سید احمد صاحب کے ان فتوؤں پر عمل کرتے ہوئے ہندو نواز حضرات کو منافق اور واجب القتل قرار دے کر، قرآن و حدیث

اور اجماع و قیاس کے بتاتے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا شروع کر دیتے، جس طرح کہ سید احمد صاحب
 اینڈ کمپنی نے یار محمد خاں حاکم یاغستان کے خلاف عمل کر کے دکھایا تھا؛ داد دیجیے مسلمانوں کے
 حوصلے کی اور فیصلہ کیجیے کہ کون مفسد ہے اور مصلح کون ہے؟

سید احمد صاحب نے اپنے فتوے پر عمل کیا۔ یار محمد خاں پر لشکر کشی کی اور اُسے شکست
 ہوئی۔ اس سلسلے میں مولوی عاشق الہی میرٹھی کی مندرجہ ذیل وضاحت بھی نظر انداز کرنے کے
 قابل نہیں۔ موصوف لکھتے ہیں؛

”مولوی عبدالحی صاحب لکھنوی، مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی اور مولوی
 محمد حسن صاحب رامپوری بھی ہمراہ تھے۔ یہ سب حضرات سید صاحب کے ہمراہ
 جہاد میں شریک تھے۔ سید صاحب نے پہلا جہاد سٹی یار محمد خاں حاکم یاغستان
 سے کیا۔“

یہ تو میرٹھی صاحب کی تاریخ وافی اور صحت بیانی کا ادنیٰ کرشمہ ہے کہ کس مولوی
 عبدالحی صاحب لکھنوی اور کس سید احمد صاحب کی یہ رزم آرائیاں؛ لیکن یہ بات قابلِ غور ہے
 کہ موصوف کے نزدیک سید صاحب کا پہلا جہاد یہی تھا کیونکہ اس میں مسلمانوں کے خون
 سے ہاتھ رنگے گئے تھے، اس سے پہلے جولاٹیاں ہوتیں، شاید وہ موصوف کے نزدیک
 جہاد نہ تھیں۔

خاندین خان حاکم ہنڈ اور یار محمد خاں حاکم یاغستان اور دیگر غواہین ورڈ ساکو کا فرو مشرک
 اور مرتد واجب القتل ٹھہرانے کے سلسلے میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا عجیب و غریب اور
 سنسنی خیز بیان ملاحظہ ہو؛

”اس موقع پر ذرا تامل سے کام لینا چاہیے کیونکہ یہاں دو معاملے درپیش ہیں؛
 ایک تو مفسدوں اور مخالفوں کے ارتداد کا ثابت کرنا اور قتل و خون کے
 جواز کی صورت نکالنا اور اُن کے اموال کو جائز قرار دینا، اس بات سے

قطع نظر کہ وہ اُن کے ارتداد پر یا اُن کی بغاوت پر مبنی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا
آیا کوئی سبب ہے یا کچھ اور ہے، جبکہ بعض اشخاص کے مقابلہ میں اُن کا مرتد ہونا
ثابت ہو چکا ہے اور بعض کے متعلق بغاوت یا اس کا کوئی اور سبب۔ اگرچہ کہ
پہلا طریقہ ہمارے پاس وہی یعنی تحقیق اور تفتیش کرنا ہے کیونکہ ہم ان فتنہ پردازوں
کو فی الحقیقت مرتدوں بلکہ اصل کافروں میں شمار کرتے ہیں اور ان کو اہل کتاب
کے مثل جانتے ہیں۔ ۱

مسلمانوں کے قتل و خون اور اُن کے اموال کا جواز نکال کر دہلوی صاحب موصوف نے میرٹھ علی
کو یوں مطلع کیا تھا

”جناب والا (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر لازم ہوئی۔ جو
شخص جناب والا کی امامت کو ابتداء میں قبول نہ کرے یا قبول کرنے کے بعد
اس سے انکار کر دے، تو یہ سمجھ لیجئے کہ وہ باغی، مکار اور فریبی ہے۔ اُس کا قتل
کرنا کافروں کے قتل کی طرح عین جہاد ہے اور اُس کی ہتھک کرنا تمام فساد
کرنے والوں کی ہتھک کرنے کے مماثل ہے اور پروردگار کی عین مرضی پر مبنی۔
ان اشخاص کی مثال حدیث متواتر کی رو سے کتوں کی سی ہے اور یہ تمام ملعون
شریر النفس ہیں۔ اس عاجز کا مذہب اس معاملہ میں یہی ہے۔ پس معترضین
کے جوابات اس خصوص میں اس عاجز کے پاس تو اُن کو تلوار کے گھاٹ
اتارنا ہے، نہ کہ تخریر اور تقریر ہے۔“ ۲

سید صاحب کے سوانح نگار مولوی ابوالحسن علی ندوی نے دہلوی صاحب کا یہ
فتویٰ یوں ادیبانہ رنگ میں نقل کیا ہے :

”پس آپ (سید احمد صاحب) کی اطاعت تمام مسلمانوں پر واجب ہوئی۔ جو

آپ کی امامت سرے سے تسلیم ہی نہ کرے یا تسلیم کرنے سے انکار کر دے ،
وہ باغی مستحل الدم ہے اور اُس کا قتل کفار کے قتل کی طرح عین جہاد اور
اُس کی بے عزتی تمام اہل فساد کی طرح خدا کی عین مرضی ہے۔ اس لیے کہ
ایسے لوگ بحکم احادیث متواترہ ، کلاب النار اور ملعونین اشرار ہیں۔ اس مسئلہ
میں اس ضعیف کا یہی مذہب ہے اور معتضین کے اعتراضات کا جواب تلوار ہے
نہ کہ تحریب و تقریر۔“ لے

مولوی محبوب علی صاحب بھی مسلمانوں کے کفر پر مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور دوسرے
وہابی حضرات کی طرح متفق تھے۔ موصوف نے فتویٰ بھی جاری کیا تھا ، جس کا خلاصہ مرزا حیرت
دہلوی نے یوں نقل کیا ہے :

”سکتوں سے زیادہ ان کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔“ لے

وہابی حضرات کی طرف سے یار محمد خاں پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی فوجوں کے
ساتھ جنگِ شیدہ میں شامل ہوا۔ اپنے بھائیوں اور دیگر خاںین کو بھی ساتھ لایا لیکن تماش
دیکھتا رہا ، لڑائی میں علما کوئی حصہ نہیں لیا اور اس فعل کو اُس کی غداری پر محمول کیا جاتا ہے ،
مثلاً غلام رسول مہر لکھتے ہیں :

”اس مدت (دورانِ جنگ) میں یار محمد خاں اپنی سپاہ کے ساتھ بے حسن و
حرکت کھڑا رہا۔ نہ یورش میں شریک ہوا ، نہ لڑائی میں حصہ لیا۔“ لے

سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگار وضاحت کرتے ہیں کہ یار محمد خاں جنگِ شیدہ
کے دوران اُن کے مجاہدوں کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور جملہ وہابی حضرات کا یہی فیصلہ ہے
کہ یار محمد خاں کا یہ اقدام اُس کی منافقت ، سکتہ دوستی ، مسلمان دشمنی اور غداری ہے۔ لیکن
ان حضرات کی خدمت میں ہماری ایک درمندانہ التماس ہے کہ فیصلہ تو آپ صادر فرما چکے لیکن

لے ابو الحسن علی ندوی ، مولوی سیرت سید احمد شہید ، جلد اول ، ص ۴۸۵

لے حیرت دہلوی مرزا : حیات طیبہ ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۱۸

لے غلام رسول مہر : سید احمد شہید ، مطبوعہ لاہور ، ص ۴۰

اگر نظر ثانی کی گنجائش باقی ہو، تو اپنے ہی مرزا حیرت دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے،

”مولانا شہید (اسماعیل دہلوی) نے پہلے سکھوں کے خونخوار حملہ کو روکا مگر جب دیکھا کہ سید صاحب تو بیہوش پڑے ہوئے ہیں اور اُن کا ہاتھی جنبش نہیں کھاتا اور وہ عنقریب سکھوں کے قبضہ میں آنے کو ہیں۔ آپ نے میدان سکھوں کے ہاتھ سوئپ کے سید صاحب کو سنبھالا اور بمشکل کئی آدمیوں کی مدد سے آپ گھوڑے پر بٹھا کے صاف میدان جنگ سے نکل آئے۔ جب مجاہدین نے سید صاحب اور مولانا شہید کو اپنے میں نہ پایا، اُن کے پیروں پر بھی اُکھڑ گئے۔ نہ کوئی کمانڈر تھا نہ انھیں کوئی خالد جیسا لڑانے والا اور نہ کوئی ثنی جیسا حملہ آوروں کے پنجے سے نکالنے والا تھا۔ جدھر اُن کا سینک سپاہیاں سراسیمہ ہو کے بھاگے۔ سکھوں نے تعاقب کیا اور مظلوم مسلمانوں کو نہایت بے بسی کی حالت میں قتل کیا۔ اُن کا سامان لُٹ رہا تھا اور اُن کی جانیں ضائع ہو رہی تھیں۔ ادھر سید صاحب کے لینے کے دینے پڑ رہے تھے اور اُدھر مجاہدین کی جانوں پر بن رہی تھی۔ بہت سے مسلمان سکھوں نے قید کر کے لاہور روانہ کیے جہاں وہ نہایت بے رحمی سے قتل کیے گئے۔“ لے

جناب غلام رسول مہر نے اس لڑائی کے بارے میں ابتدائی فتح کی وضاحت بھی یوں فرماتی ہے:

”جو سکھ نالے کے مورچے چھوڑ کر بھاگے تھے وہ پیچھے ہٹ کر ایک اور جگہ اوٹ میں کھڑے ہو گئے۔ ستمہ کے غازیوں نے اس اوٹ پر بھی تہ بول دیا اور دشمن کو جہاروب کی طرح صاف کرتے ہوئے سکھ لشکر گاہ کی سنگھ کے پاس پہنچ گئے۔ اس اثنا میں گودڑی شہزادہ اپنے مجاہدوں کو لے کر گاؤں سے نکلا اور ہر کاوٹ بہ زور ہٹاتا ہوا سکھ لشکر گاہ میں گھس گیا۔ غازیانِ ستم

اور گودڑی شہزادے کی یورش نے سکھوں میں ہل چل مچا دی اور ان کی توپیں بھی بند ہو گئیں۔ اب منظر بظاہر اسلامیوں کی فتح میں شبہ باقی نہیں رہا تھا، بلکہ ایک شخص نے سید صاحب کو فتح کی مبارک باد بھی دے دی، لے

لیکن یہاں یہ بات بھی تو جائے غور ہے کہ جس لشکر کی حالت یہ دیکھی جا رہی ہے کہ اس کا سپہ سالار بیمار داری کرتا پھر رہا ہے۔ یہ نہیں کیا کہ سید صاحب کو بعض انتخاب کے ذریعے کسی محفوظ مقام پر پہنچا کر ہزاروں مسلمانوں کی جانوں کا خیال کرتے اور لشکر کو جنگی تدابیر کے مطابق دشمن سے لڑاتے بلکہ پیر و مرشد کو لے کر میدان جنگ سے فرار ہو گئے اور ہزاروں مسلمانوں کو جنگ کی جھڑپ میں جھونک گئے، موت کے منہ میں ڈال دیا۔ کیا اس مزے کی سپہ سالاری اور ایسی قیادت روئے زمین پر کہیں اور بھی نظر آئی ہے؟

اس کے باوجود یہ حضرات جھگڑے اور مسلمانوں کے بدخواہ نہیں بلکہ اس دُوبنی کشتی کے ناخدا ہی رہے لیکن جن حضرات نے ان کی ملائیت کا کرشمہ اور جنگی سوجھ بوجھ کا بچشم خود معائنہ کر کے اپنے ساتھی مسلمانوں کو بچانے کی تدبیر کی وہ خدا، باغی، منافق، مرتد اور اصل کافر قرار پا گئے۔ کیا سپہ سالار کے بھاگ جانے کے بعد کسی فوجی یا اس جنگ میں حصہ لینے والوں میں سے کسی جان بچانے والے کو از روئے شرع سپہ سالار سے زیادہ لازم یا گناہگار ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ غضب تو یہ ہے کہ بھاگتے وقت کسی کو اپنا قائم مقام بھی مقرر نہیں کیا۔ سرداروں کی کوئی مجلس مشورہ بھی چند منٹ کے لیے نہ بلائی گئی کہ صورت حال سے کس طرح نبٹا جائے گا۔ بس خرابی نظر آئی تو یار محمد خاں کی، کہ اس نے اپنے ساتھیوں کو بچایا کیوں؟ گاجر مولیٰ کی طرح سکھوں کے ہاتھوں کٹوا کر برطانوی امیر المومنین سے خوشنودی کا سرٹیفکیٹ کیوں حاصل نہ کیا؟ بہر حال اسی جرم کی سزا یار محمد خاں کو یہ ملی کہ جنگِ زیدہ میں شکست کھائی اور ستمبر ۱۸۲۹ء میں ان حضرات کے ہاتھوں قتل کیا گیا۔ ہنڈ کے سردار خادی خاں کو یار محمد خاں سے بھی پہلے اگست ۱۸۲۹ء میں اس کے قتل کے اندر شہید کر دیا تھا۔ حالانکہ خادی خاں تو حضرت آخون صاحب کا

مرید اور سچا مسلمان تھا۔ لیکن پیرو مرشد نے ان حضرات کی خارجیت کو بجانب لیا تھا، پہلے فہمائش کی، باز نہ آئے تو تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا اور خادی خان کو بھی علیحدگی کا حکم دیا۔ بانکے مجاہدوں نے حقیقی اسلام قبول کرنے کے بجائے خادی خان کو بھی موت کے گھاٹ اتار کر جیشِ فتح منالیا۔

خادی خان سردارِ ہند کو ان حضرات نے کس درجے کا کافر سمجھا، یہ واقعات کی روشنی میں

ملاحظہ ہو:

”میں (مولانا اسماعیل دہلوی) یہ کہتا ہوں کہ خادیخان نے امیر المومنین کے ہاتھ پر اعلان کے بعد بیعت کی تھی کیونکہ وہ صاحبِ مدوح کی امامت سے منحرف ہو گیا ہے اور اپنے محفوظ مکان پر، جس سے مراد قلعہ ہنڈ ہے بھروسہ کیا اور کافروں سے امداد طلب کر کے حضرت امام کی مخالفت پر کمر باندھ لی، اس لیے حضرت موصوف نے اُس کو کیفرِ کردار کو پہنچایا اور اُس کا مال تقسیم کر دیا، بلکہ اُس کے ہتھیاروں اور گھوڑوں کو بھی ضرورت کے وقت استعمال فرمایا اور اُس کے دوسرے مال کو ضبط کر کے حفاظت کی خاطر مجاہدین پر تقسیم فرمادیا۔“

یار محمد خاں حاکمِ پاکستان، اُس کے ساتھیوں اور اُن کے اموال کے بارے میں موصوف کا فتویٰ یہ تھا، جس پر ان حضرات نے عمل کر کے درانیوں کے سینوں میں خنجر گھونپ دیے تھے:

”یار محمد خاں بلا شک و شبہ اس معاملہ میں ظلم و تعدی کا رہبر تھا۔ ایسے رہبر کا قتل اور اُس کا مال ضبط کرنا بلکہ اُس ظالم رہبر کی فوج کا قتلِ عام اور اُس کی فوج کے تمام مال پر ہر قسم کا تصرف کرنا، یعنی اُس کی فروخت اور تقسیم حسبِ شیعہ جائز ہے۔“

لے سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۲۴۴

لے ایضاً: ص ۲۴۵

ہر مسجد آدمی کے ذہن میں یہاں یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب جب دور دراز کا سفر کر کے وہاں پہنچے تو آپس میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں انہیں دور کرنے کی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی گئی اور حالات پر قابو پا کر اتفاق و اتحاد کی فضا کیوں پیدا نہ کی گئی؟ یا خوانین و رؤسا ہی بدنیت تھے کہ وہ کسی طرح اتحاد پر آمادہ نہیں ہوتے تھے، یا ان کی کوئی فاسد نرغز تھی؟ اس سلسلے میں خود سید صاحب کا یہ ارشاد قابل غور ہے:

”میں نے ہرگز ہرگز منافقوں کے ساتھ کوئی مصالحت نہیں کی ہے اور نہ کبھی ان سے موافقت کی کوئی راہ نکالی ہے۔“

خادمی خان اور یار محمد خان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا، اُس نے نواحِ پشاور کے عام مسلمانوں کے کان بھی کھول دیے اور وہ سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے کہ کون سی بُری گھڑی میں اس بلائے ناگہانی کو اپنے گھر میں بٹھالیا۔ لیکن خانہ جنگی سے بچتے ہوئے نباہ کرتے چلے گئے۔ صرف سلطان محمد خان نے ایک دفعہ ان سے ٹکری مگر شکست کھائی۔ علمائے سرحد کے نام اپنے مکتوب میں سید احمد صاحب نے اپنی جماعت کے متعلق بعض شکایات یوں کی ہیں:

”ان ہتھان لگانے والوں کے الزامات کے منجملہ ایک الزام یہ ہے کہ نہ صرف اس فقیر کو بلکہ مجاہدین کے گروہ کو وہ طمہ و زندقہ کہتے ہیں۔ یعنی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان مسافروں کی جماعت کا کوئی مذہب ہی نہیں ہے اور نہ ان کا کوئی مسلک ہے بلکہ یہ لوگ اپنی نفسانی خواہشات کے غلام ہیں اور کسی نہ کسی طرح لذتِ جسمانی کے جویاں رہتے ہیں، خواہ وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔“

”اُن افراد پر دازوں کا یہ اتہام بھی ہے کہ میں ظلم و ستم ڈھاتا ہوں کہ یہ فقیر بلا وجہ مسلمان کی جان و مال پر دست درازی کرتا ہے اور اس خصوص

میں چرب زبانی اور جلد سازی سے کام لیتا ہے۔ سبحانک ہذا بہستان
عظیمہ..... جو کچھ تنبیہ اور سزا اُس بادشاہ جبار کی طرف سے اس
ذوہ ناپسند کے ہاتھ سے بعض مرتدوں، اشرار اور بدخصلت منافقوں کو پہنچی ہے
اُن کو میں اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں اور اپنی مقبولیت کے آثار
اپنے میں پاتا ہوں بلکہ دین کی اعانت کی غیرت اور دشمنوں کی اہانت کی طرف
رغبت تو ایمان کا لازمہ ہے، ۱

”جو کچھ خدائے قادر مطلق کی جانب سے اس فقیر کے ذریعہ خادی خان اور
یار محمد خان کی دار و گیر ہوئی ہے، اُس کی وجہ سے ان مجاہدین اور مہاجرین کو
ظلم و ستم کرنے کا لازم سمجھتے ہیں اور اُن باغیوں اور فتنہ پردازوں کو حتی بجانب
سمجھتے ہیں، ۲

مذکورہ اعلانات کے تحت علمائے اہلسنت اکٹھے ہو کر آتے۔ ان حضرات سے
بالمشاہد گفتگو کی، مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے عقائد کو غیر اسلامی ثابت کر کے اُنہیں توبہ
پر مجبور کیا۔ موصوف نے دفع الوقتی کے لیے توبہ کر لی لیکن بعد میں پر نالہ اُسی جگہ رکھا۔ اس
مناظرے کا تذکرہ محمد جعفر تھانی سیری نے یوں کیا ہے :

”صد ہا مولوی اور عالم، کابل، تندرہ اور سمرقند اور مارواہ النہر وغیرہ کے
جمع ہو کر بمقام پنجناہ مسئلہ وجوب تقلید میں آپ سے بحث کرنے کو آئے تھے
چنانچہ ایک ہفتہ تک یہ بحث رہی۔ آخر کار وہ سب مولوی لا جواب ہو کر
عدم وجوب تقلید شخصی کے قائل ہو گئے اور کہنے لگے کہ شیخ توفیق قرآن و حدیث
ما حافظ اور محقق اور اس میں غوطہ لگاتے ہوئے ہے، اس سے کون
جیت سکتا ہے۔ لیکن اس فتح یابی کے باوجود متبید صاحب نے مولوی محمد اسماعیل

صاحب سے فرمایا کہ یہ وقت ترکِ تقلید کا نہیں ہے۔ ہم کو اس وقت کفار سے
بہاد کرنا ہے، تقلید کا جھگڑا اٹھا کر اپنے اندر تفرقہ ڈالنا بہتر نہیں ہے۔“ ۱

سید احمد صاحب کی فہمائش بجا اور بر موقع لیکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اس
مناظرے کا جو فیصلہ سنایا ہے وہ سمجھ بوجھ سے بالاتر ہے۔ اگر وہ صد ہا علماء لاجواب ہو گئے ہوتے
تو یقیناً ان میں سے کتنے ہی دہلوی صاحب کی طرح منکرِ تقلید ہو جاتے۔ ہزاروں دُرّانی اور پٹھان
وہابیت قبول کر لیتے، اصلی اختلاف مٹ جاتا اور جنگ و جدل والا معاملہ ہی کچھ اور ہوتا لیکن
ایسا نہیں ہوا۔ اس سے معلوم یہی ہوتا ہے کہ مولوی محمد اس معیل دہلوی مغلوب اور تائب
ہوتے۔ توبہ کرنا دفعِ الوقتی تھی ورنہ مذہبِ اہلسنت قبول کرنا مرتے وقت تک بھی منظور نہ
ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دُرّانیوں اور پٹھانوں نے ہرگز ہرگز ان کی خارجیت و وہابیت کو
قبول نہ کیا بلکہ نفرت کی نگاہوں سے ہی دیکھتے رہے۔ اسی لیے جناب ابوالاعلیٰ مودودی کو یوں
مرثیہ خوانی کرنا پڑی:

”یہی وجہ ہے کہ آج صوبہ سرحد میں ان دونوں شہیدوں کا اور ان کے کام کا
کوئی اثر ڈھونڈے نہیں ملتا، حتیٰ کہ وہاں کے لوگ ان کے ناموں سے اب
کچھ اُردو لٹریچر کی بدولت واقف ہونے لگے ہیں۔“ ۲

غیرتِ ایمانی کچھ عجیب ہی خدائی عطیہ ہے، حالانکہ سید احمد صاحب نے خادی خان کے
دلالتوں کو یوں تحریریں دلائی تھی:

”بیزا اس (خادی خان) کے ورثا کو بھی اس کی ترغیب دی، اگر وہ آئیں
اور اطاعت قبول کر لیں، تاکہ تمہارے مورث کا مال تم کو دے دیا جائے لیکن
اُن استقیاء نے امام کی اطاعت پر ہرگز تسلیمِ خم نہ کیا بلکہ اُنہوں نے بغاوت
اور فساد کے معاملہ میں اُن باغیوں کی تقلید کی۔“ ۳

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۱۱۱

۲۔ سخاوت مرزا: ترجمہ مکتوباتِ سید احمد شہید، ص ۲۴۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۴۲

یاد محمد خاں کے ورثا، ساتھیوں اور فوجیوں کو تحریریں دلانے میں کوئی کمی نہ کی، لیکن یہ جانتے ہوئے کہ ان کے غیر اسلامی نظریات نہ صرف عوام بلکہ اجلہ علمائے کرام تک پر واضح ہو چکے ہیں اور وہ سب انھیں خارجی المذہب شمار کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مذہب اہلسنت قبول کرنے یا مصلحت کی کوئی راہ تلاش کرنے کی بجائے سیاسی رشوت ہر کسی کے سامنے پیش کرنے لگے۔ چنانچہ سید صاحب نے دُرانیوں کو اپنے خط میں یوں لکھا:

”بعض کلمہ گو منافقین نے کفار کی محبت اور خیر خواہی کو اپنے منافقت بھرے دل میں جگہ دی ہے اور تمام مسلمانوں کی بدخواہی کو عام طور پر اور خاص کر بڑے بڑے علماء کے دل میں مہاجرین اور مجاہدین کے حق میں اس قدر عداوت پیدا کر دی ہے کہ ان کی نقصان رسانی کافروں کے نقصان پہنچانے کے مقابلہ میں بہت زائد اور بے انتہا ہے اور ان کی عداوت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ایمان والوں کو جہاد قائم رکھنے سے باز رکھا ہے۔ لہذا جس شخص کو اپنا ایمان عزیز ہے اور دین اسلام کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور حضرت محمد رسول اللہ کو اپنا پیشوا جانتا ہے اور قیامت میں آنحضرت کی شفاعت کا امیدوار ہے، اُس پر لازم ہے کہ وہ خود کو مجاہدین کی صف میں شریک کر دے اور غیرت ایمانی اور اسلامی حمایت کو کام میں لائے اور کافروں کی خیر خواہی اور منافقوں کا ساتھ دینا چھوڑ دے اور اپنے دل سے ان دونوں بدبخت جماعتوں کی محبت کو نکال دے اور مجاہدین کے لشکر میں منسلک ہو جائے اور جو کچھ کافروں اور منافقوں کی رفاقت میں اُس کو دنیوی فائدہ حاصل ہوا ہے اُس سے کہیں زائد مراتب اللہ تعالیٰ نے چاہا تو اُس کو حاصل ہوں گے اور دنیا و آخرت میں اُس کو بزرگی اور سرخروئی حاصل ہوگی۔ غرض جو شخص ایمان والوں کی شرکت کا ارادہ رکھتا ہے اُس پر لازم ہے کہ وہ اس عاجز کو اس سے اطلاع کر دے تاکہ صورت حال کا جائزہ لے کر اُس کی گزر بسر کا تعین کر دیا جائے۔“

پشاور اور اُس کے گرد و نواح کے مسلمانوں نے ان حضرات کی موافقت سے منہ موڑ لیا، اُن کے نزدیک یہ اعلاءِ کلمۃ الحق کی خاطر نہیں بلکہ اپنی مہربان سرکار کی ملکیت کی حدود کو وسیع کرنے آئے تھے، مجاہد نہیں بلکہ مفسد نظر آ رہے تھے، مسلمانوں کے غیر خواہ نہیں بلکہ مسلم کشی کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے تھے۔ لہذا سید صاحب بھی علی الاعلان اُنہیں منافق اور واجب القتل قرار دے کر اُن کے استیصال کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ اسی مقصد کی خاطر رئیسِ قلات خان خانان خلیجائی کے نام اپنے مکتوب میں سید احمد صاحب نے یوں تحریر کیا تھا:

”بالخصوص جہاد کے نفاذ اور بغاوت و فساد کے فرو کرنے کے متعلق نیز اور بھی محبت و خلوص کی باتیں جو آپ نے تحریر فرمائی ہیں اُن کو پڑھ کر دل کو بیحد سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا..... اگر اُس طرف جناب اپنا فاتحانہ قدم اٹھائیں گے تو منافقین اور مفسدین فتنہ و فساد برپا کریں گے۔ لہذا نہایت مناسب اور مصلحت یہ ہے کہ ایسا کیا جائے کہ سب سے پہلے تو منافقوں کے استیصال کے متعلق انتہائی کوشش کی جائے اور جب جناب والا کے قریب جوار کے علاقہ میں ان بدکردار منافقین کا قلعہ پاک ہو جائے تو پھر اطمینانِ خاطر اور دل جمعی کے ساتھ اصل مقصد کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔ اس لیے مصلحتِ وقت یہی ہے کہ پہلے تو منافقین کے فتنہ و فساد کے دفعیہ کے لیے سخت کوشش فرمائی۔ ان منافقین کے ساتھ جنگ کرنے اور فساد کو دور کرنے کی تدابیر کے متعلق خود جناب والا خوب جانتے ہیں اور لشکر کشی اور کشور کشائی کے فن میں بھی آپ کو کمال مہارت حاصل ہے، لیکن میری رائے میں مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ گو آپ کا دل ہیبت و جلال کا مرکز ہے۔ آپ اس بڑی مہم کے انجام دینے کے لیے بغیر کسی کی اعانت کے قدم نہ اٹھائیں۔ اگر منافقین کے استیصال میں جناب کی سیشِ قدمی سے فتنہ و فساد اور شورش کے بڑھ جانے کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر کسی کی امداد کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی فوج اور قبیلہ کو جمع کر کے جناب والا خود غزنی کے نواح میں منافقین پر چھاپے مارنا شروع کر دیں اور اپنے ساتھیوں

میں سے بعض کو قباہل اور فوج کی کثیر تعداد کے ساتھ کابل کے اطراف مقرر فرمائیں تاکہ یہ بھی منافقین پر شب خون مار کر اُس مقام کو تاخت و تاراج کر دیں اور میں بھی ادھر سے پشاور کے منافقوں کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ جب منافقین بدکار کی موجودگی سے وہ مقام پاک ہو جائے تو میں جلال آباد پہنچ جاؤں گا اور اسی طرح پھر وہاں سے کابل جاؤں گا۔ اس طرح مردود منافقین جو پشاور سے قندھار تک پھیلے ہوئے ہیں اُن کے پاؤں ایسے اکھڑ جائیں گے اور ہر شخص جو اپنے خیال میں خود گرفتار ہے، بے دست و پا ہو کر آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کر سکے گا اور اُن کا باہم اتحاد اور اجتماع دشوار ہو جائے گا۔ اگر جنابِ اِلا اس سلسلے میں اپنے استقلال کو شورش اور فساد کا باعث تصور فرمائیں اور یہ گمان ہو کر دُرانی قوم اپنی قومیت و ریاست باہمی کے اتحاد کی وجہ سے اپنے قباہل کے ساتھ جمیع اوجہ بناب سے مقابلہ پر متحد ہو جائے گی، تو پھر اس بات کی ضرورت ہوگی کہ اُن کے سرداروں کو اپنے ساتھ شریک کر لیا جائے اور اربابِ سلطنت سے امداد بھی طلب کر لینی چاہیے۔

ایک مسلمان حکمران کو دوسرے مسلمانوں کے خلاف کس جوش و خند بے سے ابھارا جا رہا ہے۔ مسک کشی کا جھوٹ کس بُری طرح سوار ہے کہ خان قلات جو ان حضرات کے ماڈرن اسلام سے بے خبر اور انھیں اسلام و مسلمین کا خیر خواہ سمجھ بیٹھا تھا۔ موصوف نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں یوں جھوٹے الہاموں اور تحریص کی دھول جھونکی ہے:

”ہم پر لازم ہے کہ جان و مال، بھائی بندوں اور اوطان کی محبت کو پس پشت ڈال کر حق تعالیٰ کی رضا مندی کو اپنی ہمت کا قبلہ بنائیں اور دینِ متین کی فتح کی نیت سے پروردگارِ عالم کے کلمہ کی اشاعت کے لیے کمر ہمت باندھیں اور اُس کے لشکر میں شامل ہو کر معرکہ جنگ و قتال میں خود کو دھکیل دیں۔ انشاء اللہ

تعالیٰ اُس سلسلے میں بموجب کلام الہی جس کا وعدہ پتا ہے، فتوحات کے دروازے کھل جائیں گے اور ان اشعار و کفار منافقین کے بے شمار خزانوں، ملک و مال اور شہروں پر ضرور بالفرد قبضہ حاصل ہو جائے گا۔ لیکن ان تمام دنیاوی چیزوں اور مادی منافع پر جہاد کا ہرگز وار و مدار نہیں ہونا چاہیے، بلکہ جہاد کے لیے بلند ہمتی سے کام لینا چاہیے۔ پس جس وقت آپ اس نیت پاک سے خود کو مجاہدین کی جماعت میں منسلک کر لیں گے تو بلاشبہ اللہ کے لشکر میں آپ کا شمار ہوگا اور اللہ کے سچے وعدے کے مطابق فتح و نصرت حاصل ہوگی۔ اس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اس فقیر کو بار بار پردہ غیب سے وارد ہونے والی روحانی باتوں اور ربانی الہام کے ذریعہ جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے دفعیہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے اور چونکہ الہامی وعدے اُس بادشاہ حقیقی کے کلام کے مطابق ہوا کرتے ہیں اس لیے ان کو ضرور مان لینا چاہیے اور ان پر عمل کرنا چاہیے۔

یہ اعلان سید صاحب اور ان کے متبعین نے الہام کے نام سے بارہا کیا۔ ان الہامی اور فتح کی بشارتوں کا جو انجام ہوا، وہ سب پر ظاہر ہے کہ فتح و نصرت کے بجائے آپ کو شکست اور عبرت ناک ہزیمت کے سوا اور کچھ نصیب نہ ہو سکا۔ اول سے آخر تک سارے الہامات جھوٹے ثابت ہوتے گئے۔ موصوف کے سچے ہونے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ جملہ دعاوی و الہامات اور بزرگی و کمالات سے دست بردار ہو کر صاف طور پر اقرار کر لیا جائے کہ یہ الہامات خدا کی طرف سے نہیں بلکہ برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہو رہے تھے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان حضرات کے لیے حقیقت کا تسلیم کر لینا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کتنے ہی دعاوی و الہامات جھوٹے ثابت ہوئے لیکن بزرگی پر حرف نہ آیا، مسلمانوں ہی کو کچھ گئے تھے لیکن انھیں

میں جاتے قوم بتانا اور منوانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اسی منصوبے کے تحت سید احمد صاحب نے
فولاد جنگ بہادر کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

”آپ اپنے ایک فاتح لشکر کو اس طرف روانہ فرمائیں اور مجاہدین کی اعانت
کے لیے کرمیت باندھ کر خزانہ کھول دیں تاکہ جناب والاکہ شرکت پروردگارِ عالم
کے دین کا پرچم بلند کرنے، کافروں اور اہتمام لگانے والوں کا استیصال کرنے
کے متعلق اچھی طرح منظرِ عام پر آجائے اور آیت کریمہ فضل اللہ المجاہدین
باموالہم وانفسہم علی القاعدین کی بے حد لذت اور مرتبہ آپ کو حاصل
ہو جائے، جس طرح کہ اس دنیا کی ریاست اور امارت میں بنی نوع انسان
ممتاز ہیں، اسی طرح جنتِ نعیم کے مدارجِ عالیہ اور مقامِ صدق پر اُس
صاحبِ بخشش و کرم کے سایہ میں آپ کو فخرِ دناز ہو۔ اللہ نے چاہا تو کلامِ الہی
کے سچے وعدوں کے مطابق کہ فرمایا ہے ”کان حقاً علینا نصر المومنین
— وان تنصر اللہ ینصرکم ویثبت اقدامکم نیز غیبی اشاروں اور
بشارتوں کے بموجب، جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں، جس کی اس فقیر کو
بشارت دی گئی ہے۔ عنقریب فتح و نصرت ظہور پذیر ہوگی اور بے شمار خزانے
ذلیل و خوار کافروں (مسلمانوں) کے شہروں سے لے کر دریائے سیلج تک
نیک لوگوں کے قبضہ میں آجائیں گے۔“

یار محمد خاں کے معتمد و متوسل یعنی احمد خاں ابن لشکر خاں کے نام سید صاحب نے اپنے

مکتوب میں لکھا ہے:

”جب تک ان (مسلمانوں) کا بلیا میٹ کرنا متحقق نہ ہو اُس وقت تک کافروں
اور دشمنوں کے خلاف جہاد کی کوئی صورت نہیں اِس بنا پر اِس عاجز، خاکسار،
فِرّہ بے مقدار نے چند نیک مہاجرین کے ساتھ بموجب حکمِ خداوندی یا ایہا

النبی جاہد الکفار والمنافقین الخ جو قابلِ تعمیل ہے ہم نے کمر باندھ لی ہے اور موضعِ پنجتر تک پہنچ گئے۔ اللہ نے چاہا تو اُس بادشاہ جبار اور مالک و قہار کے دبدبہ و قوت سے ان تمام بدکردار منافقوں کی شان و شوکت آسانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں خاک میں مل جائے گی انشاء اللہ آپ اُس قادرِ مطلق کی قدرت کا ناشائستہ لحاظ فرمائیں اور منافقوں کے ساتھ رواداری کو پروردگارِ عالم کی خاطر اور رضا جوئی پر قربان کر دیں۔ جو کچھ اِس زمانہ کے سردار دنیوی فائدوں کے حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں اُس سے دُکھی توقع اُس شہنشاہِ حقیقی سے جو اس جہان کا خالق ہے، توقع رکھنی چاہیے۔ بارگاہِ الہی سے قوی امید ہے کہ آپ ذلِ جمعی کے ساتھ یکسو ہو کر دینِ متین کے معاونین میں منسلک ہو جائیں گے تو آپ کو دنیاوی فوائد بھی اِس قدر حاصل ہوں گے جو وہم و خیال میں بھی نہیں آسکتے۔“ لے

جہاں مقصود اعلیٰ کلمۃ الحق ہوتا ہے وہاں مادی ترغیب و تحریریں کا ایسا سیاسی جال بچانے کی ہرگز کوشش نہیں کی جاتی۔ سید صاحب نے جس قسم کا جال مسلمانوں کے خلاف بچایا خود مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو قتل کروانے کی کوشش کرتے رہے اور اِس طرح غیب و تشوینِ دنیا سے دُفی سے اپنی حمایت کا دم بھرنے والوں کو مسلم کشی پر ابھارنے کی لیر محمد بن عبدالوہاب نجدی کے علاوہ اور کہیں نظر نہیں آتی۔ چنانچہ نجدی صاحب نے امیرِ عیینہ کو اپنی تحریک و ہابیت میں شامل ہونے کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا:

”اگر تم لا الہ الا اللہ کی امداد کے لیے آمادہ ہو جاؤ تو میں امید کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غالب کرے گا اور نجد اور اہل نجد کی باگ تمہارے ہاتھ میں ہوگی۔“ لے

اِسی طرح محمد بن سعود امیرِ درعیہ کو تحریک و ہابیت کا معاونِ کاربنے کی دعوت دی تو امیر

مذکور نے دو شرطیں عائد کیں۔ پہلی شرط یہ تھی کہ فتح کے بعد آپ ہمارا ساتھ نہ چھوڑنا اور دوسری شرط یہ تھی کہ اہل درعیہ سے وہ فصل کے وقت کچھ محصول لیا کرتے تھے اُس سے نہ روکا جائے۔ ابن عبد الوہاب نے دونوں شرطیں منظور کیں۔ دوسری شرط کو اُس نے جن لفظوں میں منظور کیا اُن کا ترجمہ یوں منقول ہے:

”رہی دوسری شرط، سو انشاء اللہ تمہیں فتوحات اور غنیمتوں میں اتنا کچھ مل جائیگا کہ اُس خراج کا خیال بھی دل میں نہ آئے گا۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی یہ تحریک جہاد و ہابیت کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اُسی کے زیر اثر شروع کی گئی تھی۔ ان حضرات نے بھی مسلمانوں کو مشرک اور منافق ٹھہرا کر اُنہیں سخل الدم قرار دیا، اُن کے قتل و قتال سے لطف و لذت حاصل کرتے رہے، اُن کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر لوٹتے رہے، جس طرح ان سے پہلے محمد بن عبد الوہاب نجدی کرتا رہا تھا۔ اگر ان برطانوی مجاہدوں سے کوئی کہتا کہ آپ مسلمانوں کو کیوں قتل کر رہے ہیں تو جواب یہی دیا جاتا کہ ہم تو مشرکوں اور منافقوں کو قتل کرتے ہیں، مسلمانوں کی جان و مال میں تو ہم ذرا بھی دست اندازی کرنا گناہِ عظیم سمجھتے ہیں۔ لیکن مسلمانوں سے اُن کی مراد اُن کے ہم عقیدہ خارجی لوگ تھے یا وہ حضرات جو اس جنگ جوئی میں اُن کے معاون و مددگار بن گئے تھے۔ ابن عبد الوہاب پر جب مسلم کشی کا الزام لگایا جاتا تھا، تو وہ بھی یہی جواب دیا کرتا تھا محمد ولی پر و فیسر محمد مسعود احمد صاحب نے ہندی و نجدی خوارج کے اس مفسدانہ طرز عمل کے بارے میں کیسی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں:

”اگر مسلمانوں کے اعمال کا اتنی سختی سے محاسبہ کیا جائے تو پھر ہم میں کتنے لوگ ہیں جو زندہ رہنے کے قابل ہیں؛ شاید لاکھوں میں معدودے چند ہوں تو ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ تاریخ اسلام میں اس قسم کے بہت سے رُوح فرسا مناظر سامنے آتے ہیں جبکہ مسلمانوں نے آپس میں ایک دوسرے کا خون بہایا ہے“

مگر یہاں ذکر اُس شخص کا ہے جو پیغمبرِ آں بان کے ساتھ توحید و رسالت کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ کم از کم ایسی شخصیت میں پیغمبرانہ صفات کو تلاش کیا جائے اور اُسی معیار سے پرکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مگر یہاں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم زندگی بھر کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے خلاف آمادہٴ پیکار رہے مگر یہاں جو کچھ ہے مسلمانوں کے خلاف ہے۔

ان برطانوی مجاہدوں کا منصوبہ یہی نہیں تھا کہ مسلمان خوانین و رؤساء سے دوسرے مسلمانوں کی گزنیں کٹوائی جائیں اور اس طرح مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے بلکہ یہ حضرات غوثی پشا اور اُس کے گرد و نواح کے اہل اسلام کو ختم کرنے کا عزم بالجبرم کر چکے تھے چنانچہ سید صاحب نے شہزادہ کامران کو خط لکھتے ہوئے وضاحت کر دی تھی کہ:

”چونکہ منافقوں اور فساد برپا کرنے والوں نے سرکش کفار کی حمایت پر کمر باندھ لی ہے اور مجاہدین سے دشمنی برت رہے ہیں، اس لیے اُن کی گوشمالی اور کفر و فساد کے خلاف جہاد کی مہم کا چلانا ضروری ہے، اسی بناء پر میں نے تمام مجاہدین کو منافقین کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی ترغیب دی ہے۔“

۱۲ محرم ۱۲۴۲ھ کے مکتوب بنام ملک فیض اللہ خاں میں سید صاحب نے یوں وضاحت کی تھی:

”جناب والا جیسے روشن دماغ پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عزم نہانی کا اشارہ اس عاجز کی پشا ورا آمد کی طرف ہے تاکہ مجاہدین ہندوستان کو منافقین کے گرد و غبار سے اور دشمنوں اور شقی صفت اشخاص کے روڑوں اور کانٹوں سے پاک صاف کر دیں اور یہ معاملہ تو ہرگز کوئی ایسا پوشیدہ راز نہیں ہے بلکہ میں نے تو اس کو طامیرِ عالم اخوندزادہ سردار سلطان محمد خاں کے وکیل کے دو بدو علی الاعلان

۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر: مواظظ مظہری، مطبوعہ کراچی، ص ۳، ۴، ۵،

۲۔ سخاوت مرزا، ترجمہ مکتوبات سید احمد شہید، ص ۵۶

کہا ہے اور اس معاملہ سے متعلق نہ تو کوئی بات پوشیدہ کہی اور نہ جناب کے مہربانی نامہ کے جواب میں اشارتاً کچھ کہا۔ البتہ میں نے کوئی مدت مقرر نہیں کی ہے، یعنی یہ کہ کس وقت اس مہم کو سرانجام دیا جائے گا اور اس عبادت کی کس لمحہ اور گھڑی کوشش کی جائے گی، کیونکہ ہر کام کا تعلق اس قاعدہ مطلق کے ہاتھ ہے۔ بہر حال میں کچھ ایسا ہی ارادہ رکھتا ہوں، ۱۰

سردار امیر عالم خاں باجوڑی کو مطلع کرتے ہوئے سید صاحب نے اپنے ایک مکتوب میں یوں تحریر فرمایا تھا:

”اب صورت یہ ہے کہ منافقین کے ساتھ جہاد کرنا بحکم مقدمہ الواجب، ایک واجب معاملہ ہے۔ اس لیے خاکسار سچے مسلمانوں کے ساتھ شہر نشین اور اور قُرب و جوار سے بدکردار منافقوں کی گندگی کو پاک کرنے کا مصمم ارادہ کر کے موضع پنجٹار تک پہنچ گیا ہے اور اُس زبردست حاکم برحق کے فرمان عالی شان کے بموجب جس کا ذکر کلام موثق یعنی کلام اللہ میں ہے کہ جاهد الکفار والمنافقین و اغلظ علیہم۔ ہم نے کمر ہمت باندھ لی ہے..... شہر مذکور کی طرف چل پڑے..... سرکش کفار، منافقین اور خسارہ اٹھانے والوں کے استیصال کی حتی الوسع جدوجہد کریں گے“ ۱۱

اپنے ایک خط میں سید صاحب شاہ کا شعر کو مسلم کشی کی اطلاع دیتے ہیں اور اُس صورت حال سے بے خبر حکمران کو اس حرکت قبیلہ میں شمولیت کی کیسے پُر اسرار انداز میں ترغیب و تشویق دیتے ہیں اور اُس کی آنکھوں میں دھول چھونکنے کی غرض سے یوں وضاحت کرتے ہیں:

”اس مختصر حصہ میں ضلع سوات، بنیر و مہمند، خلیل، غلجائی اور وڑائی کے تمام مسلمان اور پشاور کے رہنے والے اور اس شہر کے امراء کے تمام فوجی سپاہیوں

نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ پائندہ قبیلے کی دولت اور اُن کی شان و شوکت کو پامال کیے بغیر ہرگز جہاد کا دروازہ کھلنے والا نہیں ہے۔ اُنھوں نے اس فقیر کو اسی بات کی ترغیب دی ہے کہ ماہ رمضان المبارک گزر جانے کے بعد بدعت منافقوں کے استیصال کی طرف توجہ کریں، یعنی شہر لپٹا ور کو ان منافقوں کی گندگی سے پاک کرنے کا بیڑا اٹھائیں۔ چنانچہ اس بات کو اس فقیر نے نیز تمام ایمان والوں نے بہت پسند کیا۔ لہذا رمضان شریف کے گزر جانے کے انتظار میں ہم سوات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جو نہی مبارک ماہ مذکور ختم ہو جائے گا تو غازیوں کی تیاری کا وقت پہنچ جائے گا۔ اس معاملہ میں بظاہر ملاقات جمائی کے لیے فی الحال بعض اعتراضات مانع تھے لیکن ایک وجہ سے ملاقات کا سجدہ اشتیاق پیدا ہو گیا۔ کیونکہ اس فقیر کے پُر خلوص دل کا منشاء تھا کہ آپ جیسے برادر عزیز کو بھی دونوں جہان کی دولت اور ہمیشہ کی سعادت میں اپنا شریکِ حال بنالوں اور آپ کو بھی طرح طرح کی ترغیب اور تحریص دلا کر اس عظیم الشان مہم کو انجام دینے کے لیے کشتاں کشتاں لے آؤں تاکہ اگر آپ اس عظیم مہم میں بنفس نفیس شریک ہو جائیں تو اس سے بڑھ کر آپ کی کیا سعادت ہو سکتی ہے۔ البتہ چار دنا چار آپ کو اس بات پر آمادہ کرتا ہوں کہ اپنے لشکرِ ظفر پیکر سے تھوڑی فوج اور مجاہدین کے لیے اپنے حسب استطاعت کچھ مسارف اس عاجز کے پاس بھیجا دیں۔“ لہ

مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کیا کسی ہستی نے مصلح کا روپ دھا کر مسلمانوں کو ختم کرنے اور اُن کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے کی اتنی منظم کوشش کبھی کی تھی؟ یقیناً تاریخ اس کا جواب نفی میں دیتی ہے۔ مسلم کشی کی غرض سے اور مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے کی خاطر خود مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے کے خلاف کر کے، ایک کو غازی و مجاہد

اور دوسرے کو مشرک و منافق ٹھہرا کر، اُن میں کشت و خون کرانے کا پارٹ اس انداز میں کسی اور نے بھی ادا کیا تھا، محمد بن عبدالوہاب نجدی کے علاوہ اس میدان میں ان حضرات کا حریف کوئی نہیں لیکن جہاں مزارات کے منہدم کرنے اور قبہ شکنی میں ابن عبدالوہاب کا نظیر کوئی نہیں، اسی طرح مسلم کشی میں ان حضرات نے ایک نیا ہی عالمی ریکارڈ قائم کر دکھایا تھا۔ کاشش! مسلمانوں کو مشرک اور منافق قرار دے کر، اُنھیں یہ مستحل الدم ٹھہرانے والے، اُن کے جان و مال اور تنگ و ناموس سے کھیلنے والے کبھی اپنے گریبان میں بھی جھانک کر دیکھ لیتے کہ: یہ بُت توڑنا تو فرض ہے، لیکن یہ شرط ہے
دل میں بھی جھانک، اس میں کوئی بُت چھپا نہ ہو

ان حضرات کے جہاد کی کہانی تو کچھ اسی قسم کی ہے لیکن بڑا ہوسیاسی مصالح اور بعض ہستیوں کو اسباباً من دون اللہ بنا لینے کا، کہ بعض ایسے حضرات جو تحقیق کے علمبردار کہلاتے ہیں اور کسی بڑی سے بڑی ہستی کو تنقید سے بالا تر نہیں سمجھتے، جب وہ اپنے اکابر کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو اُن کی ہر بھونڈی سے بھونڈی ادا، ہر گندے سے گندا فعل، ہر بُرے سے بُرا عقیدہ، ہر مضرت مضر اقدام بھی دل موہ لینے والا قرار پاتا ہے۔ سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تحریک جہاد کے بارے میں جناب ابوالاعلیٰ مودودی یوں رقمطراز ہیں:

”انھوں نے اتنے وسیع پیمانے پر، جو انیسویں صدی کے ابتدائی دور میں ہندوستان جیسے برسرِ تنزل ملک میں بمشکل ہی ممکن ہو سکتا تھا، جہاد کی تیاری کی اور اس تیاری میں اپنی تنظیمی قابلیت کا کمال ظاہر کر دیا۔ پھر غایت تدبیر کے ساتھ آغا دیکار کے لیے شمال مغربی ہندوستان کو منتخب کیا، جو ظاہر ہے کہ جغرافی و سیاسی حیثیت سے اس کام کے لیے موزوں ترین خطہ ہو سکتا تھا۔ پھر اس جہاد میں ٹھیک وہی اصول اخلاق اور قوانین جنگ استعمال کیے جن سے ایک دنیا پرست جنگ آزما کے مقابلہ میں ایک مجاہد فی سبیل اللہ ممتاز ہوتا ہے اور اس طرح انھوں نے دنیا کے سامنے پھر ایک مرتبہ صحیح معنوں میں رُوحِ اسلامی کا مظاہرہ کر دیا۔ اُن کی جنگ، ملک و مال، یا قومی عصبیت، یا کسی دنیوی غرض

کے لیے نہ تھی بلکہ خالص فی سبیل اللہ تھی۔ اُن کے سامنے کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ خلق اللہ کو جاہلیت کی حکومت سے نکالیں اور وہ نظام حکومت قائم کریں جو خالق اور مالک الملک کے منشاء کے مطابق ہے۔ اس غرض کے لیے جب وہ رطے تو حسبِ قاعدہ اسلام یا جزیہ کی طرف پہلے دعوت دی اور پھر اتمامِ حجت کر کے تلوار اٹھائی، اور جب تلوار اٹھائی تو جنگ کے اُس مہذب قانون کی پوری پابندی کی جو اسلام نے سکھایا ہے۔ کوئی ظالمانہ اور وحشیانہ فعل اُن سے سرزد نہیں ہوا۔ جس سبقت میں داخل ہوئے مصلح کی حیثیت سے داخل ہوئے نہ کہ مفسد کی حیثیت سے۔ ۱۷

موصوف کے یہ جملہ وعادی اُن کی اسمعیل پرستی کی بنا پر بغیر کسی تحقیق و ثبوت کے ہیں۔ سید صاحب اور مولوی محمد اسمعیل دہلوی کا طرزِ عمل اور خود وہابی حضرات کی تاریخیں موصوف کے ان بیانات کی تائید و تصدیق کرنے سے قاصر ہیں۔ ان حالات میں راقم الحروف انصاف کا اس طرح حُسن کرنے والوں کے متعلق یہی کہہ سکتا ہے کہ : ۱۸

بنے کیونکہ کہ ہے سب کار اُنٹا
ہم اُنٹے، بات اُلٹی، یار اُلٹا

یہاں تک بیان اس امر کا تھا کہ ان حضرات نے مسلمانوں کے شہروں پر قبضہ کرنے اور انہیں مستقل الدم قرار دینے کی غرض سے کیسے کیسے غیر اسلامی اور چنگیز خانی بہانے تلاش کیے۔ اب ان لوگوں کی مسلم کشی کے چند واقعات پیش کرتا ہوں۔ قلعہ ہنڈ پر قبضہ کرنے اور خادی خاں کے خون سے ہاتھ رنگنے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی نے یوں تصریح کی ہے :

”ابھی صبح کی پوچھڑی تھی کہ آپ (مولانا محمد اسمعیل دہلوی) قلعہ ہنڈ کی دیواروں کے نیچے جا پہنچے کل ڈیڑھ سو آدمی ساتھ تھے اور باقی ماندہ (ساڑھے پانچسویں) پیچھے رہ گئے تھے۔ آپ نے خاموشی سے بارہ بندوچویوں کو بھیج دیا کہ تم دروازہ

کے پاس اس ٹیلہ کے پیچھے چھپ کے کھڑے ہو جاؤ۔ جونہی دروازہ کھول کر قلعہ میں سے لوگ نکلیں اور شہر کی طرف جانے لگیں، تم فوراً قلعہ میں گھس جانا اور انہیں گولیاں مار دینا۔ بھاگتے ہوؤں کو روکنا نہیں، مقابلہ کرنے والے کو تہ تیغ کرنا۔ ابھی بہت روشنی نہ ہوئی تھی، نسیم سحری طفلانہ اٹکھیلیاں کرتی ہوئی چل رہی تھی اور خادی خاں کو خبر دے رہی تھی کہ تیرا یہ خوابِ نوشیں زہرا لودہ ہے! مگر وہ کچھ اپنے قلعہ کی مضبوطی میں ایسا منحور تھا کہ اُسے نسیم سحری کے بھوکوں کی اطلاع کی بھی ذرا خبر نہ تھی۔ جونہی مولانا شہید نے بندو قوں کی آواز سنی، آپ بھی فوراً بندو ق چھتیاٹے ہوئے معہ ہراپیوں کے داخل قلعہ ہوئے، ہتھیار اٹھانے کی بھی فرصت نہ دی اور سب کو خوف دے کر باہر نکال دیا۔ قلعہ کے دوسرے حصہ میں خادی خاں سوتا تھا۔ ٹھائیں ٹھائیں بندو قوں کی آواز ہوئی اور لوگوں کا غل سنائی دیا تو بے خبر نیس بڑبڑا کے اٹھا اور پریشان باہر نکل آیا۔ دیکھا تو گل ہی اور کھلا ہوا ہے۔ فوج کے سرداروں کو ڈراؤنی صدا میں پکارا۔ وہاں کسی کا بھی پتہ نہ تھا۔ پھر وہ اپنے کمرہ کے زینہ سے قلعہ کی چھت پر چڑھ گیا اور وہاں سے غل دشور مچانا شروع کیا۔ سراسیمہ ادھر ادھر بھاگا پھرتا تھا۔ آخر ایک مسلمان کی گولی نے اُسے تھل بیڑے سے جھٹایا۔ لے

یار محمد خاں حاکمِ یاغستان سے معرکہ آرائی کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یوں رقمطراز ہیں:

”مولانا شہید گھوڑے پر سوار تھے اور دو سو آدمی اور بھی آپ کے ساتھ قدم بستم علاوہ چار سو پیدلوں کے آ رہے تھے۔ مولانا شہید کی پہلی نظریں توپوں پر لگ رہی تھیں، آپ سب سے پہلے اُن ہی پر جا پڑے۔ گولہ انداز نے مہتابی کو روشن کر کے چاہا کہ پہلے مولانا کو اڑا دوں کہ مولانا نے تلوار کا پھرتی سے وار کر کے اُس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے فوراً وہ دونوں توپیں درانیوں کی طرف پھیر کے فیر کرنے شروع کیے۔ ایک

وفادار ہندو، جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا دراجہ رام (گولہ اندازی پر مقرر ہوا)۔
 اُس نے اس قدر چھڑتی سے گولہ اندازی کی کہ دُڑانیوں کے پیر اکھڑ گئے۔
 اُدھر مولانا شہید اُن پر گر پڑے۔ تبکیروں کی آوازیں خوب زور شور سے بلند
 ہو رہی تھیں۔ بھلا اب دُڑانی کیونکر میدان میں ٹھہر سکتے تھے؟ اپنا کل سامان
 چھوڑ کے بھاگے۔ جب وہ فرار ہو رہے تھے، سید صاحب بھی اُن پر آ پڑے۔
 جتنے دُڑانی مارے گئے ان کی تعداد ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں، ہاں جن مُردوں کو وہ
 میدان میں چھوڑ گئے تھے، وہ چار سو سے زیادہ شمار میں تھے۔ مولانا شہید کی فوج کا
 ایک آدمی بھی زخمی نہ ہوا! لے

یار محمد خاں کی فوج کے جتنے مال کو مالِ غنیمت قرار دے کر ان برطانوی مجاہدوں نے ہضم
 کیا اُس کی مکمل تفصیل تو کسی سوانح نگار نے بیان نہیں کی۔ بعض اشیاء کی فہرست جناب
 غلام رسول قمر کی زبانی ملاحظہ ہو:

”مولانا نے مالِ غنیمت جمع کر لیا تو مندرجہ ذیل چیزیں تھیں۔ ایک ہاتھی، ساٹھ ستر
 اونٹ، کچھ کمین سوگھوڑے، چھ توپیں، پندرہ سولہ شاہینیں، تلواروں اور
 بندوقوں کا شمار نہ تھا۔ ملکی لوگ جو مال اٹھائے لیے جا رہے تھے اُسے حسنِ تدبیر
 سے واپس لیا۔ بستر اور خیمے سب محفوظ پڑے تھے۔ اکثر لوگ جوتے بھی چھوڑ
 گئے تھے۔ پلاؤ کی دیگیں تیار پڑی تھیں۔ منوں خشک میوہ موجود تھا۔“ لے

خادی خاں اور یار محمد خاں کو ٹھکانے لگانے کے بعد مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے
 رازداری کے ساتھ مسلمانانِ ستم کو بزورِ شمشیر زیر کرنے کا ایک پروگرام بنایا اور سید احمد صاحب
 سے منظوری لے کر اُس پر یوں عمل کیا گیا:

”پانڈہ خاں سے مصالحت کی صورت پیدا ہو گئی تو قاضی سید محمد جان نے یہ

تجویز پیش کی کہ علاقہ ستم میں سرکشی کے آثار نمودار ہیں۔ جن لوگوں نے عود بخود ادا ئے عشر کا اقرار کیا تھا، وہ بھی بے پردا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کچھ لشکر میرے ہمراہ کر دیں تو میں وعظ و نصیحت سے سارے اہل ستم کو حلقہ بگوش بنادوں۔ جو نہ مانیں اُنھیں بزور راضی کروں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ مجھے اُس لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات دے دیے جائیں، اس لیے کہ میں مقامی آدمی ہوں اور اپنے اہل وطن کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں، ایسا آدمی یہاں کوئی اور نہیں۔ مولانا شاہ اسماعیل کو میرے ساتھ کر دیں تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا و رسول کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو مولانا روک دیں۔ سید صاحب کو یہ تجویز بہت پسند آئی۔ لے

اس پروگرام کے مطابق سب سے پہلے موضع کھلاوٹ پر فوج کشی کی گئی۔ جناب غلام رسول مہر نے یہ کارنامہ یوں بیان کیا ہے:

”کھلاوٹ سے ایک کوس پر نماز ظہر ادا کی۔ جب بستی پاؤ کو کس پر رہ گئی تو قاضی صاحب نے حکم دیا کہ سب ٹھہر جائیں۔ پھر رسالدار عبدالحمید خاں سے کہا کہ آپ یہاں تیار کھڑے ہیں، ہم پیادوں کو لے کر آگے بڑھتے ہیں، جب ہماری طرف سے بندوق چلے تو فوراً باگیں اٹھا کر بستی کی جنوبی سمت سے حملہ کر دیں۔ قاضی صاحب نے شمالی سمت میں ایک ٹیلے پر زنبورک لگا کر گولہ باری شروع کر دی۔ اس اثنا میں رسالے کے ایک سوار کو پیشاب کی حاجت ہوئی، وہ اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھا، گھوڑے کی باگ پاؤں کے نیچے دبا کر پیشاب کے لیے بیٹھ گیا۔ دفعۃً گھوڑا بدکا اور اُس کی باگ پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ رسالدار نے آواز دی کہ لینا جانے نہ پاتے۔ دو دو چار چار سوار اُس کے تعاقب میں نکلنے لگے

قاضی صاحب نے سمجھا کہ سواروں نے ہتھ بول دیا، چنانچہ انھوں نے بھی گولہ باری چھوڑ کر حملہ کر دیا۔ اس طرح ایک معمولی سا واقعہ کامیاب یورش کی شکل اختیار کر گیا۔ پیادہ فوج بستی میں داخل ہو گئی۔ سرداروں کا مقابلہ صرف دو آدمیوں نے کیا اور دونوں مارے گئے۔ غازیوں میں سے کسی کے چرکہ بھی نہ لگا اور کھلاٹ فتح ہو گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں مقابلے کے لیے پانچ ہزار آدمی فراہم تھے، لے

اس کے بعد مرغز، ٹھنڈ کوٹی، کدا اور پنچ پیر پر جوش ملک گیری میں اپنی فتح کے جھنڈے گاڑے گئے۔ ان سرگرمیوں کی کہانی دہائیوں کے مورخ نامدار، عالیجناب غلام رسول مہر کی زبانی ہی ملاحظہ فرمائیے :

”کھلاٹ کے اصلی خاں (یعنی سردار) ابراہیم خاں اور اسماعیل خاں تھے۔ قاضی صاحب نے ابراہیم خاں کو خانی کی مسند پر بٹھایا، چار سوار اس کی حفاظت کے لیے مقرر کیے۔ اسماعیل خاں کو اپنے ساتھ رکھا اور مرغز پہنچے، جو کھلاٹ سے ایک میل پر تھا۔ مرغز کے لوگ مجاہدین کے آنے کی خبر سنتے ہی مطیع ہو گئے۔ وہاں جس غاصب نے خانی پر قبضہ کر رکھا تھا، وہ بھاگ گیا۔ قاضی صاحب نے مرغز کو وہاں کے اصلی خاں، سرفراز خاں کے حوالے کر دیا۔ چار سوار اس کی حفاظت کے لیے بھی چھوڑے اور خود ٹھنڈ کوٹی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹھنڈ کوٹی اور اس کے بعد کدا میں بھی مرغز کی سی صورت پیش آئی، یعنی دونوں بستیوں کے لوگوں نے بلے چون و چرا فرما کر نبرداری کا عہد کر لیا۔ مرغز کی ناز قاضی صاحب نے زبیدہ اور کدا کے درمیان ایک نالے پر ادا کی اور وہیں مع لشکر ٹھہر گئے۔ اسی جگہ پنچ پیر کے خان نے خود کراہت کا اقرار کیا۔ اس طرح ایک دن میں کھلاٹ، مرغز، ٹھنڈ کوٹی، کدا اور پنچ پیر زیر فرمان آ گئے، لے

لے غلام رسول مہر: سید احمد شہید، ص ۵۹۸، ۵۹۹

لے ایضاً: ص ۵۹۹

اب قلعة ہند کی فتح کی تفصیلات ملاحظہ ہوں :

”ہند وہاں سے قریباً تین کوس کے فاصلے پر تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں اپنے موار اور چار ضرب زنبورک لے کر ہند چلا جاؤں۔ اگر حالات سازگار دیکھوں گا تو وہیں ٹھہر جاؤں گا۔ صبح کے وقت آپ بھی پیادوں کو لے کر آجائیں۔ اگر دیکھوں گا کہ ٹھہرنا مناسب نہیں تو چلا آؤں گا۔ دونوں اور قاضی صاحب دونوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا چنانچہ رسالدار بے توقف ادھر روانہ ہو گیا۔ جب ہند ایک گولی کے فاصلے پر رہ گیا تو چند گھوڑے زور سے ہنسنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد قلعے کے چاروں برجوں پر اتنی روشنی ہوئی کہ ارد گرد کی ہر شے دور دور تک صاف نظر آنے لگی۔ رسالدار نے سواروں کو وہیں روک دیا پھر آہستہ آہستہ انھیں جنوبی سمت میں تالاب کے کنارے کی اوٹ میں پہنچا دیا۔ وہاں زنبورک لگا کر قلعے پر چار پانچ گولے پھینکے۔ بعد ازاں سارے سوار قاضی صاحب کے پاس لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔ صبح صادق نمودار ہوتی تو دو آدمیوں نے آکر یہ خوشخبری سنائی کہ ہند خالی پڑا ہے، آپ قلعے کے انتظام کے لیے وہاں تشریف لے چلیں، پھر ایک ملا آیا اور اُس سے ہند کے تخیلے کی تصدیق ہو گئی۔“

اب ہوتی مردان کی فتح کی کہانی، جناب غلام رسول مہر کی زبانی سنیں اور اس جہاد کا رنگ روپ دیکھیے :

”ہوتی مردان کے تیس احمد خاں کو بھی بلایا گیا۔ اُس کی طرف سے جواب آیا کہ آٹھویں روز ملاقات کروں گا۔ قاضی صاحب نے سمجھا کہ شاید اُسے کوئی ضروری کام ہو گا۔ اس اثناء میں گوجر گڑھی کے ایک غازی اخوند خیر الدین آئے اور بتایا کہ احمد خاں اپنے بھائی رسول خاں کو نائب بنا کر خود ترائیوں سے

زوج مدینے کے لیے پشاور چلا گیا ہے۔ دو تین روز میں پے در پے اس خبر کی تصدیق ہوتی رہی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ ان حالات میں مردان کو بزور مسخر کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ چنانچہ سب کے مشورے سے مردان پر پیش قدمی کا فیصلہ ہو گیا۔ ۱

مردان پر حملے کے لیے نیاری کا حکم دینے کے بعد قاضی سید محمد جتان نے دوہلی آدمیوں کو صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ خبر لاتے کہ ہوتی کی گڑھی میں بیس پچیس اور مردان کی گڑھی میں تیس چالیس آدمی ہوں گے۔ سونا موجود ہے اور احمد خاں پشاور گیا ہوا ہے۔ حملے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ اگر انتظار کیا جاتا تو درانیوں کا لشکر آ جاتا۔ ۲

”رہبروں کو آگے بھیج دیا تاکہ وہ پورے حالات دیکھ کر مزید خبر لائیں اور بسم اللہ کہہ کر قدم آگے بڑھانے کا حکم دے دیا۔ جب ہوتی آدھ کو کس پر رہ گیا تو مغبروں کا انتظار کرنے لگے۔ بستی میں نقارہ زور سے بج رہا تھا۔ لوگوں کا شور و غل بھی سنائی دیتا تھا۔ غازیوں کے گھوڑے بدستور ہنسنارہے تھے۔ اس اثنا میں مغبر خبر لاتے کہ ہوتی کی گڑھی سے گولی کی زد کے فاصلے پر بہمت جنوب کھلیاں ہیں، وہاں چالیس پچاس آدمی بندوقیں لیے بیٹھے ہیں۔ بستی کے دروازے پر بھی کافی جمعیت ہے۔ البتہ گڑھی سے مغربی سمت کا میدان خالی ہے اور شمالی سمت میں بھی کوئی نظر نہیں آتا۔ قاضی صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی سے کہا کہ آپ حبیش کو لے کر کھلیاں کی طرف جائیں۔ رسالدار عبدالعجید خاں کو حکم دیا کہ سواروں کو لے کر مغربی جانب کے میدان میں پہنچ جائیں۔ جب کھلیاں کی سمت سے بندوقوں کی آواز آئے تو نقارہ بجاتے ہوئے بستی پر

حملہ کر دیں۔ خود دروازے کا قصد کیا، جہاں دشمن کی بھاری جمعیت کی اطلاع ملی تھی۔ ملکینوں کو قاضی صاحب نے صفِ اول میں رکھا اور ہندوستانیوں کو صفِ دوم میں۔ دُعا کے بعد تینوں حبش اپنے اپنے مقامات کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۱۷

”مولانا نے رسالہ دار عبد الحمید خاں کو حکم دیا کہ چالیس سپاہی سواروں کو بستی میں بھیج دیجیے۔ وہ گھوڑے چھوڑ دیں۔ شاہینیں لے کر پیدل چلیں اور شاہینوں کو گڑھی کے بُرجوں کو خالی کرائیں۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ گڑھی مردان کے چھ برج تھے سب پر گولہ باری شروع ہو گئی۔ دو شاہینیں صرف اُس بُرج کے خلاف لگائی گئیں جس کی گولیوں سے قاضی سید جان اور دوسرے غازی شہید ہوئے تھے۔ بہر حال شاہینوں نے دشمن کا عزم مزاحمت مضحل کر کے رکھ دیا۔ گڑھی کے پانچ بُرجوں پر خاموشی چھا گئی، صرف ایک باقی رہ گیا، جس سے گولیاں آرہی تھیں۔ اس اُٹھانیں لعل محمد قندھاری اُس بُرج کے نیچے پہنچ گئے اور باوازِ بلند پشتوں میں پکارے: ”اندر پائی را در ا — اندر پائی را در ا“ یعنی سیڑھی لاؤ، سیڑھی لاؤ۔ حالانکہ کوئی سیڑھی پاس نہ تھی۔ یہ سن کر بُرج والوں پر ہر اس طاری ہو گیا اور اُٹھوں نے سواگلی کی درخواست پیش کر دی۔ قرار داد کے مطابق پہلے ہتھیار نیچے پھینک دتے، پھر ایک ایک کر کے اُتر آتے۔ ۱۸

جنگِ یامار کے بعد بعض دُرانی ہوتی مردان میں جمع ہو گئے تھے جن کی وجہ سے عارضی طور پر سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کا وہاں سے قبضہ اٹھ گیا تھا۔ بھلا یہ حضرات اپنے جیتے جی کس طرح یہ صورتِ حال برداشت کر سکتے تھے؟ چنانچہ فوراً مسلمانوں پر فوج کشی کر کے اپنے جذبِ جہاد کو تسکین پہنچانے کا سامان فراہم کیا۔ مثلاً:

”غرض مولانا ہوتی کے قریب پہنچے تو وہاں کی گڑھی سے گولیاں آئیں۔ اس پر

مولانا (محمد اسماعیل دہلوی) نے حکم دے دیا کہ ہر غازی اپنے چاروں طرف چار چار
 قدم کا فاصلہ چھوڑ کر چلے۔ پھر گڑھی کے جنوبی دروازے کے پاس سے ہوتے
 ہونے آگے بڑھے۔ مردان سے باہر مغربی سمت میں ایک باغ تھا، جس میں
 بڑے بڑے درخت تھے اور اُس کی زمین ذرائشی تھی، اُس میں جا بیٹھے۔ گڑھی
 مردان کے برجوں سے گویاں آنے لگیں، لیکن مولانا نے بیٹھنے کے لیے ایسی جگہ
 تجویز فرمائی تھی کہ کسی غازی کو نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔ ایک گھڑی کے بعد
 گویاں مدھم پڑ گئیں اور چند ملا صاحبان حاضر ہو کر مولانا کی خدمت میں عرض پراز
 ہوئے کہ حکم ہو تو کھانا لائیں۔ مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں کا ارادہ یہ معلوم ہوتا ہے
 کہ باقی غازیوں کو زہر آؤد کھانا کھلا کر ختم کر دیں۔ خبردار ہو جائیے، ہونہیں دُرانیوں
 سے غنیمت میں ملی ہیں، اُنھیں ابھی منگا لینا ہوں۔ اُن کے آنے ہی گڑھی کو مسمار
 کر ڈالوں گا۔ ملاؤں نے معذرت کی اور کہا کہ یہ احمد خاں کے آدمیوں کا کام ہے
 جو جاہل ہیں۔ اُنھیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ لڑائی کے بغیر گڑھی حوالے کر دی تو
 خان، نمک حرامی کا طعنہ دے گا۔ اُدھر مولانا نے سید صاحب کے پاس آدمی
 بھیج کر شاہینیں منگا لیں۔ اُدھر جب بستی والوں کو معلوم ہوا کہ توپیں آ رہی ہیں
 تو بے تابانہ صلح کے خواستگار ہوئے۔ احمد خان کے بھائی رسول خاں نے
 پیغام بھیجا کہ میں فرمانبردار ہوں، البتہ دُرانیوں کی آمد کے باعث بے بس
 ہو گیا تھا، لے

پانڈہ خاں رئیس آنب سے لڑائی کر کے اُس کا قلعہ چھینا اور مسلمانوں کا کشت و خون
 کیا گیا۔ یہاں فوج کشی کی ابتداء کیوں اور کس طرف سے ہوئی، یہ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی
 زبانی سنئے؛
 محکم کیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ پانڈہ خاں اپنے ملک میں جنگ کی تیاری

کر رہا ہے، اس واسطے سید صاحب کے لیے بھی لازم ہو گیا کہ ایک لشکر اسلام اس طرف روانہ کریں۔۔۔۔۔ اس مہم کا مولانا محمد اسماعیل صاحب کو امیر مقرر کر کے بجانب آنہ روانہ کر دیا۔۔۔۔۔ یہ لشکر دو حصے ہو کر، ایک حصہ زیرِ حکم سید احمد علی ہمشیر زادہ سید صاحب کے عشرہ کو گیا اور ایک حصہ مولانا محمد اسماعیل صاحب کے ساتھ فروسہ میں پہنچا اور خود سید صاحب بھی پنجاب سے روانہ ہو کر اسی نواح کے لوگوں کو لشکر اسلام کی تائید کے واسطے آمادہ کرتے تھے۔^۱ جناب غلام رسول مہر نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی اس موقع کی جنگی سکیم کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے :

”آپ غور فرمائیں کہ مولانا کی جنگی سکیم کتنی عمدہ تھی؛ اگر پائندہ خان عشرہ کی جانب بڑھتا تو مولانا گلنگڑی کے راستے امب پہنچ سکتے تھے۔ اگر وہ خود گلنگڑی کے راستے فروسہ پر پیش قدمی کرتا تو ستخانہ کی فوج عشرہ اور امب پر قابض ہو جاتی۔ اگر وہ امب میں بیٹھا رہتا تو مولانا جنوب اور شمال مغرب دو سمتوں سے امب پر بڑھتے۔“^۲

لیکن پائندہ خاں نے ان لوگوں کی جنگی اسکیم کو ناکام بنا دیا، جس پر مہر صاحب یوں نوحہ کرناں ہوئے:

”پائندہ خاں کو کنیڑی پر غازیوں کے قبضے کی اطلاع ملی تو اُسے معلوم ہو گیا کہ اب ان کی دوہری زد سے بچنا مشکل ہے۔ گھبرا کر اُس نے صلح کا جال بچایا۔۔۔۔۔ غرض پائندہ خاں کے فریب صلح کے باعث غازیوں کے ہر حبش کی ساری جنگی تدابیر معطل ہو گئیں۔“^۳

”پائندہ خاں اب تک عشرہ میں تھا اور اپنے آدمیوں کو لکار لکار کر لڑائی کا

^۱ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، ص ۲۵۰، ۲۵۱

^۲ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۵۵۳

^۳ ایضاً: ص ۵۵۴

حملہ دلا رہا تھا۔ سواروں اور پیادوں کو بھاگتے دیکھا تو غود بھی عشرہ کو چھوڑ کر
امب کی جانب روانہ ہو گیا۔ ۱

شیخ ولی محمد کوٹہ سے پہاڑ کے اوپر اور امب کے قریب پہنچ گئے۔ پابندہ
خان انھیں دیکھتے ہی امب کو چھوڑ کر چھتر باٹی چلا گیا، جو چند میل شمال میں تھا۔
شیخ ولی محمد گولیوں کی آواز سن کر کئیڑی کی طرف آئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ
صرف غازیان کئیڑی کو شدید نقص سے نجات ملی بلکہ عشرہ اور کوٹہ پر بھی
قبضہ ہو گیا۔ ۲

چھتر باٹی کی گڑھی پر جو معرکہ آرائی ہوئی وہ غلام رسول مہرنے اس طرح بیان کی ہے :
امب سے چھتر باٹی کے دور استے تھے، ایک زیریں راستہ جو دریا کے کنارے
کھارے جاتا تھا، دوسرا پہاڑی راستہ۔ رسالہ دار عبد الحمید خان پہاڑی
راستے سے گئے۔ مولانا نے زیریں راستہ اختیار کیا۔ گڑھی سے ایک گولی
کے فاصلے پر دروازے کے بالمقابل ٹھہر گئے اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی
کے تینوں جانب مورچے بنالینے کا حکم دے دیا۔ چنانچہ جا بجا آٹھ مورچے
بنالیے گئے۔ تین شمال و مغربی کونے میں، تین جنوبی و مغربی کونے میں، دو
جنوبی سمت میں جدھر گڑھی کا دروازہ تھا۔ محاصرہ اگرچہ بڑا سخت تھا لیکن
گڑھی کے فتح ہونے کی کوئی صورت نہیں بنتی تھی۔ مولانا نے امب سے
توپ منگا کر گولہ باری بھی کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخر یہ سارے حالات سید صاحب
کو لکھ بھیجے کہ آپ امب پہنچ جائیں اور گڑھی کو مسخر کرنے کی کوئی تدبیر فرمائیں۔
سید صاحب نے امب پہنچ کر فیصلہ کیا کہ چھتر باٹی پر حملے کے لیے پتھار
سے توپیں منگا لینیں چاہئیں۔ چنانچہ آپ نے شیخ بلند سخت دیوبندی کو پچیس تیس

اور شجاع اور پہلوان اُس دن مارے گئے۔ غازیوں کے صرف بیس آدمی شہید ہوئے اور اسی قدر مجروح ہوئے۔ میدان غازیوں کے ہاتھ رہا اور توپیں اور شاہین اور بندوقیں اور گھوڑے اور خیمے اور ظروف وغیرہ مال غنیمت غازیوں کے ہاتھ آیا۔ فتح کے بعد ظہر اور عصر کی نماز سید صاحب نے اُس میدان میں ادا کی اور مغرب کی نماز سے پہلے سید صاحب مال غنیمت کو ساتھ لے کر مظفر منصور موضع ہیار میں پہنچے اور وہیں شب بائش ہوئے۔ لے

فارتین کرام ! یہ تھا ان حضرات کے جہاد کا اصلی رخ، اب ان کی اخلاقی حالت پیش کرنے سے پہلے جناب ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا نظریہ ان کی تحقیق کی روشنی میں پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے سید احمد صاحب کے رفقاء کو ان کے کردار کی روشنی میں کیا کچھ پایا؛ چنانچہ موصوف رقمطراز ہیں :

”انھوں (سید احمد و محمد اسماعیل صاحبان) نے عامۃً خلّاق کے دین، اخلاق اور معاملات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور جہاں جہاں ان کے اثرات پہنچ سکے، وہاں زندگیوں میں ایسا زبردست انقلاب رونما ہوا کہ صحابہ کرام کے دور کی یاد تازہ ہو گئی۔“ لے

مودودی صاحب کی عقیدت کے ان مرکزوں کا دین و ایمان کچھ اسی فصل کی گزشتہ سطور میں پیش کیا چکا ہے، کچھ چند صفحات کے بعد پیش کیا جائے گا، نیز اسی کتاب میں اکثر جگہ ان حضرات کے دین ہی کی توضیح موجود ہے۔ معاملات کی صفائی، ان کی مسلم کشی اور انگریز دوستی سے عیاں ہے۔ رہا اخلاق والا معاملہ تو اُس کا بیان چند سطور میں پیش ہونے والا ہے۔ پہلے موصوف کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے۔ لکھتے ہیں :

”ان کو ایک چھوٹے سے علاقہ میں حکومت کرنے کا جو حقّور اسامو قع ملا۔ انھوں نے ٹھیک اُسی طرز کی حکومت قائم کی جس کو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کہا گیا ہے۔“

لے محمد جعفر تھامسیری : حیات سید احمد شہید، ص ۲۶۸، ۲۶۹

لے ابو الاعلیٰ مودودی، مولوی : تجدید و احیائے دین، بار ہشتم، ص ۱۱۵

وہی فقیرانہ امارت، وہی مساوات، وہی شورشی، وہی عدل، وہی انصاف،
 وہی حدود شرعیہ، وہی مال کو حق کے ساتھ لینا اور حق کے مطابق صرف کرنا،
 وہی مظلوم کی حمایت اگرچہ ضعیف ہو اور ظالم کی مخالفت اگرچہ قوی ہو، وہی
 خدا سے ڈر حکومت کرنا اور اخلاقی صالحہ کی بنیاد پر سیاست چلانا۔ غرض ہر پہلو
 میں اُنھوں نے اُس حکمرانی کا نمونہ ایک مرتبہ پھر تازہ کر دیا، جو صدیق و فاروقؓ
 نے کی تھی، لے

معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ عالیجناب مودودی صاحب کی نظر میں کسی بہتر سے بہتر
 حکومت و امارت میں جو اوصاف ہونے چاہئیں وہ اُنھوں نے لکھ لیے، اُن کا ایک خوشنما
 ہار بنایا، پھر اپنی عقیدت کے مندر میں تشریف لے گئے اور وہ ہار اپنے ہٹل (اسمعیل دہلوی)
 کے گلے میں لٹکا دیا۔ اس چنگیز خانی و ہلاکو خانی کو صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مقدس
 دور جیسا بتانے کی جرأت بھی ویسا ہی شخص کر سکتا ہے، جن کی بخشش کا سید احمد صاحب نے
 اپنے خدا سے وعدہ لے لیا تھا۔ آئیے مولوی محمد اسمعیل دہلوی کے عاشق زار و سوانح نگار
 یعنی مرزا حیرت دہلوی سے پوچھتے ہیں کہ سید احمد صاحب کے ساتھی اور اُن کے مقرر کردہ اُمّال
 کیسے تھے، موصوف بتاتے ہیں :

”مجاہدین میں سب طرح کے آدمی تھے، بُرے بھی اور بھلے بھی۔ بلکہ یہ اندازہ کیا گیا
 کہ بُرے زیادہ اور بھلے کم تھے۔ کبھی علانیہ طور پر سید صاحب کے کسی ساتھی کو
 سزا نہیں دی گئی، حالانکہ اکثر ناجائز افعال اُن سے سرزد ہوا کرتے تھے۔ لے
 ان حضرات کو چند سال تک جو ایک مختصر سے علاقے پر جہان بینی و جہانداری کا موقع ملا،
 وہاں آئیں سلطنت کیا تھا، شانِ حکمرانی کیا تھی، اس کا اندازہ مرزا حیرت دہلوی کے اس
 حیرت انگیز بیان سے کیا جاسکتا ہے :

لے ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی، تجدید و احیائے دین، بارہم شتم، ص ۱۱۶، ۱۱۷

لے حیرت دہلوی مرزا : حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۲۲

دُونِ اللّٰہِ بتائے ہوئے ہیں۔ وہ اگر ایسے بیانات داغتے رہے ہیں تو کیا جائے شکایت ہے۔ لیکن مودودی صاحب، جو محقق ہونے کے مدعی ہیں اور خود تحقیق کیے بغیر کسی بڑی سے بڑی ہستی کے بھی فیصلے کو تسلیم کرنے کے عادی نہیں، جب راقم الحروف نے موصوف کی زبانی ”تجدید و احیائے دین“ کتاب کے صفحات پر اس قسم کی اسمعیل پرستی دیکھی تو حیرت و استعجاب کی کوئی انتہاء نہ رہی کہ ترجمہ پاک دہندہ میں ایک ایسا غیر مرئی ”میل“ بھی ہے جس کی عقیدت میں مبتلا ہوجانے کے بعد بڑے بڑے مدعیان تحقیق و تدقیق کو بھی یہ جرات نہیں ہوتی یا توفیق نہیں ملتی کہ وہ نظر اٹھا کر اتنا ہی دیکھ سکیں کہ جس کے حضور میں وہ جھکے ہوئے ہیں وہ عقیدتوں کا مرکز محض ایک پتھر کی مورتی ہے یا کسی سامری وقت کے ہاتھوں کا گھڑا ہوا سنہری بھڑا۔ مودودی صاحب جیسے مدعی عبقریت و بالغہ عصر کہلانے والے کی بارگاہ میں اگر ہمارا جیسی ارضی مخلوق کو بھی اذن لب کشائی حاصل ہے تو یہ ناچیز عرض کرنے کی جسارت کرے گا کہ جناب والا! اگر طبع مبارک پر گراں نہ گزرے تو ذرا اپنے ان بڑوں کے دین و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی کہانی، خود اپنوں کی زبانی سُن لیجیے :

”سید صاحب نے صد ہا غازیوں کو مختلف عہدوں پر مقرر فرمایا تھا کہ وہ شریعہ محمدی کے موافق عمل درآمد کریں، مگر اُن کی بے اعتدالیاں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں۔ وہ بعض اوقات نوجوان عواتین کو مجبور کرتے تھے کہ اُن سے نکاح کر لیں اور بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر دو تین دوشیزہ لڑکیاں جا رہی ہیں، مجاہدین میں سے کسی نے اُنھیں پکڑا اور زبردستی مسجد میں لے جا کر نکاح پڑھا لیا۔“

کیا فرماتے ہیں علمائے اہل حدیث و مقبلیان دارالعلوم دیوبند و سہارن پور اور محققینِ حیات اسلامی اس بارے میں کہ راستہ چلتے ہوئے کسی کی فوجان لڑکی کو زبردستی پکڑ کر نکاح کر لینے سے جبکہ اُس لڑکی کی قطعاً رضامندی نہ ہو، اُس کے ولی کی اجازت نہ ہو، بلکہ ولی کو خبر تک نہ ہو کیا ایسا جبری نکاح شرعاً جائز ہے یا زنا محض؟ ایسے نکاح سے جو اولاد پیدا ہوگی اُس کا

شرعی حکم کیا ہے؟ اس طرح مسلمانوں کی نوجوان لڑکیوں کو جبراً اپنے گھروں میں ڈال لینے والے، ان کی عصمتوں پر ڈاکہ ڈالنے والے، صحابہ کرام کی یاد تازہ کر رہے تھے یا بدکاری کا دنیا میں زلزلہ بیکارڈ قائم کر رہے تھے؟ یہ صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور کا غونہ پیش کیا جا رہا تھا یا بیزید پلید سے لے کر آج تک کے مسلمان کھلائے والے جملہ بدچلن اور بد قماش حکمرانوں کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ توڑ کر بین الاقوامی چیمپیئن شپ حاصل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی؟

خار کو گل اور گل کو خار جو چاہے کرے

تو نے جو چاہا کیا، اسے یار جو چاہے کرے

اسی سلسلے میں تسکین خاطر و اطمینان قلب کی غرض سے ذرا یہ عبارت بھی ملاحظہ فرمائی جائے:

”ایک نوجوان خاتون نہیں چاہتی کہ میرا نکاح ثانی ہو مگر مجاہد صاحب زور نے

رہے ہیں، نہیں، ہونا چاہیے۔ آخر ماں باپ اپنی نوجوان لڑکی کو حوالہ مجاہد

کرتے تھے اور ان کو کچھ چارہ نہ تھا۔“

اگر مودودی صاحب اور دیگر دینی علماء کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے تو اس طرز عمل پر مزاحمت دہلوی کا تبصرہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے:

”یہ محض ناگہن تھا کہ نوجوان عورت رانڈ ہو کے عدت کی مدت گزر جانے پر بے ضابطہ

بٹھی رہے۔ اس کا جبراً نکاح کیا جاتا تھا، خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو۔ پشاور

میں بڑے بڑے سرداروں میں نکاح ثانی کی رسم نہ تھی اور اسے سخت حقارت

کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہ مانا کہ نکاح ثانی قرآنی حکم ہے، مگر جس ناگوار طریقہ

سے وہ پبلک کے آگے پیش کیا گیا تھا، وہ ناقابل برداشت تھا۔“

یہ بیانات کسی تعارف و تبصرہ کے محتاج نہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دہلوی

حضرات کی خدمت میں اُن کے برطانوی صدیقیوں اور فاروقوں کا طرزِ عمل بھی اس سلسلے میں پیش کر دیا جائے۔ مرزا حیرت دہلوی نے اپنے مَن مندر کے پردہ مہتوں کو بچاتے ہوئے، لپیلا پوتی سے کام لیتے ہوئے، اُن کے بارے میں یوں وضاحت کی ہے:

”بدقسمتی سے ایک نیا گل کھلا۔ گل کیا کھلا، گویا غازیوں یا مجاہدوں کی زندگی کے شیرازے کو اُس نے پراگندہ کر دیا۔ باہم یہاں کے کل عمال نے جن کی تعداد ہزار سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی تھی، ایک فتویٰ مرتب کیا اور اُسے پوشیدہ مولوی تھیل کی خدمت میں بھیج دیا۔ فتویٰ کا مضمون یہ تھا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے یا نہیں؟ مولانا شہید کیا واقف تھے کہ ملک پشاور میں یہ آگ پھیل رہی ہے اور اس وقت اس فتویٰ کی اشاعت سخت غضبناک ہوگی۔ آپ نے سادہ طور پر، اُس پر اپنی مہر کر دی اور سید صاحب کی بھی اُس پر مہر ہو گئی اور پھر وہ فتویٰ قاضی شہر پشاور، سید مظہر علی صاحب غازی کو بھیج دیا گیا۔ اُنھوں نے اس فتویٰ کی اشاعت ہی پر قناعت نہ کی بلکہ یہ اعلان دے دیا کہ تین دن کے عرصہ میں، ملک پشاور میں جتنی رائیں ہیں، سب کے نکاح ہو جانے ضرور ہیں، ورنہ اگر کسی گھر میں بے نکاح رائہ رہ گئی، تو اُس گھر کو آگ لگا دی جائے گی!“

سید احمد صاحب نے اپنے ساتھیوں کے پاس خاطر سے، صدیق و فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے دور کی جناب ابوالاعلیٰ مودودی کی نظر میں یاد تازہ کرنے کی غرض سے، کیسے کیسے کلے قانون رائج کیے۔ اس امر کا اندازہ کرنے کے لیے مذکورہ فتویٰ ہی کون سا کم ہے لیکن مزید تسلی کی خاطر ان کے خانہ ساز امیر المومنین کا ایک اعلانِ عام پیش کرتے ہیں۔ کسی یورپین مورت کا بیان ہے، جسے مرزا حیرت دہلوی نے اپنے لفظوں میں یوں نقل کیا ہے:

”آپ کے ساتھی غریب الوطن تھے اور اب اُنھیں جو رُخوں کی بھی خواہش تھی، تو آپ (سید صاحب) نے ایک فرمان جاری کیا کہ جتنی کنواری لڑکیاں ہیں وہ سب

ہمارے لیفٹننٹ کی خدمت میں مجاہدین کے لیے حاضری جائیں گی، اگر اُن کی شادی بارہ دن میں نہ کر دی گئی۔ قوم کی قوم اس اعلان سے بھڑک اُٹھی، اے سرحد کے مسلمانوں نے طوعاً و کرہاً ان حضرات کے ہر ظلم کو برداشت کیا۔ مجبوراً ان کے جو دستم کی پکی ہیں پستے رہے لیکن آئے دن اُن کے تنگ و ناموس سے جو کھیل جاتا تھا یہ معاملہ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔ لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا اور کسی بھی مقام سے پھٹنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا۔ لیکن پھٹنے کا موقع آیا تو زمین ہی کھل گئی۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا فتویٰ جاری ہو گیا کہ بیوہ کا نکاح ثانی فرض ہے۔ قاضی مظہر علی نے پورے ملک میں اس فتوے کو مشتر کر کے اعلان کر دیا کہ تین دن میں جملہ بیوگان کے نکاح ہو جانے ضروری ہیں ورنہ جس گھر میں کوئی بیوہ پائی گئی، اُس گھر کو آگ لگا دی جائے گی، خود سید صاحب یوں گرجے کہ علاقے کی ساری کنواری لڑکیاں مجاہدین کے لیے ہمارے پاس پہنچا دینی چاہئیں، بارہ روز کی مہلت ہے۔ یہ ہے ان حضرات کے دین و دیانت اور تقویٰ و طہارت کی کہانی۔ معلوم نہیں مودودی صاحب اور دیگر جملہ وہابی علماء و موثر خین اپنے اس اینگلو انڈین بد چلن گروہ کے اخلاقیات کو کون سے پیمانے سے ناپ کر صحابہ کی یادگار بتا دیا کرتے ہیں، آخر قیامت ایک روز ضرور آکر رہے گی۔ اگر حق و باطل کا فیصلہ کرنا یہاں منظور نہیں، بلکہ ان حضرات کو یہاں اِس دھاندلی میں فائدہ نظر آتا ہے، رات کو دن اور دن کو رات بتانے میں ہی کوئی منفعت دکھائی دیتی ہے، تو ان حضرات کی زبان اور قلم پر پہرہ کون بٹھا سکتا ہے، لیکن کیا بروز قیامت بھی یہ دھاندلی، یہ چھکیلے بیانات، یہ خوشنما اعلانات، یہ سمجھانے والوں پر بہتانات کچھ کام آسکیں گے، یہ چرب زبانی و رنگِ تحریر اور یہ زور قلم و سلیقہ تحریر کیا بوقتِ حساب کچھ کام آجائے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ اس طرزِ عمل نے، اس بے غیرتی و بداندیشی نے جو رنگ دکھانا تھا وہی سامنے آیا۔ جو خیال و خواب میں بھی نہیں تھا وہ دن دیکھا پڑا۔ اقتدار کی بدستی میں فکرِ انجام سے بے خبر ہو کر ہوسہاہ کاریاں کی جا رہی تھیں وہ رنگ لائیں۔ دنیا میں ہی روزِ حساب آیا۔ وحی و عصمت اور

کشف و کرامت کے سارے جھوٹے دعوے رفوچکر ہو گئے، خدا کی لاسٹھی بے آواز ہے، اُس کی پکڑ سے چھڑانے والا کون؟ ہوا کیا؟ ملاحظہ فرمائیے:

”اس اعلان کا شائع ہونا تھا تمام ملک مجاہدین کے خلاف قہرِ شیرِ یدست ہو گیا۔ بہت دھوم دھام سے سازشیں ہونے لگیں اور ایک عام کہرام تمام ملکِ پشتاور میں مچ گیا۔ بڑے بڑے خوانین جو اپنی رائڈ لڑکیوں کا نکاح کرنا سخت عیب خیال کرتے تھے بڑے برا فروختہ ہوئے اور انھوں نے باہم یہ مشورہ کیا کہ تین دن کی مدت میں ان سب کو ہمیں تر تیغ کر ڈالو۔ مجاہدین نے بھی آخر وقت میں جا کے، جب سب سامان ہو چکا تھا، اُن کے تیور پہچانے اور اب وہ خائف ہو کر سید صاحب کو لکھنے لگے کہ یہاں یہ کیفیت نظر آتی ہے۔ سید صاحب کچھ ایسے بے پروا ہو گئے تھے کہ انھوں نے کچھ بھی خیال نہ کیا، نہ مخبروں کی خبروں پر کچھ توجہ کی، جو دم بدم یہ پرچہ گزار رہے تھے کہ آپ جلد فوج لے کر اس طرف روانہ ہوں، ورنہ خاتمہ ہی ہوا چاہتا ہے۔ سید صاحب نے مطلق توجہ نہیں کی۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ حکم اعلیٰ مولوی سید مظفر علی صاحب، جو اس آتش فشاں فتوے کے بانی مبنی اور اشاعت دہندہ تھے اور جنھیں سید صاحب نے بڑے اعتبار اور بھروسہ سے مقرر کیا تھا، سلطان محمد حاکم پشاور کے دربار میں مع ساتھیوں کے بلاتے گئے اور فوراً اُن کا سر قلم کیا گیا اور عام حکم دے دیا گیا کہ ایک ایک مجاہد قتل کیا جائے۔ ساری رات میں کل مجاہدوں کی، جو بطور منتظم مختلف حصص میں متعین تھے، گردنیں اڑادی گئیں اور نہایت بے کسی کی حالت میں، اُن میں سے اکثر سڑکوں پر بکروں کی طرح قمار کے ذبح کیے گئے۔“

لڑکیوں کو زبردستی چھیننا، زبردستی نکاح کا ڈھونگ رچا کر اپنی شیطنیت پالنا تو ایک طرف رہا جن مسلمانوں کو واجب القتل، مستحل الدم قرار دیا گیا، جنھیں اصل کافر اور اہل کتاب

ٹھہرایا گیا، جس کے مال کو غنیمت کا مال سمجھ کر ٹوٹتے رہے، جنھیں کلاب النار اور ملعونین اشرار تک بتایا گیا، آفران سے اور کسی سلوک کی توقع کس بنا پر رکھی جاسکتی تھی، کشتی کو بھنور میں پھنسا کر انھیں بند کر لینے سے طوفان ٹل نہیں جاتا، ظلم و ستم کی آندھی جب چڑھتی ہے تو اُس کی ہونا کی کتنے ہی دلوں کو ہلا دیتی اور کئی ہرے بھرے اور تنومند درختوں کو بھی نیچ دین سے اکھاڑ پھینکتی ہے لیکن چند ساعتیں گزرنے کے بعد کہیں اُس کا نام و نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یہ حضرات مسلمانوں پر ظلم و ستم کی آندھی بن کر چھا تو گئے لیکن ساحرِ برطانیہ نے انھیں کس درجہ مسحور کیا تھا، اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہی حقیقت کافی ہے، کہ انبیائے کرام سے بھی آگے بڑھ کر جو قدم قدم پر الہاموں کے دعوے کر رہے تھے، وہ اپنے افعال و کردار پر مطلع ہونے کے باوجود تازیست نوشتہ دیوار پڑھنے سے عاجز رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عذابِ الہی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو طاقت و جمعیت ہونے کے باوجود، ہمت جواب دے گئی، اوسان خطا ہو گئے، سارے وسائلِ حرفِ غلط کی طرح بے معنی نظر آنے لگ گئے۔ اُس وقت ان حضرات کی جو حالت تھی، اُس کی منظر کشی یوں کی گئی ہے :

”یہ خونی خبر و خشتناک آگ کی طرح، بہتجار میں سید صاحب کے گوشِ حقیقت نیوش میں بھی پہنچی۔ آپ یہ خبر گوش گزار فرما کے خون کے آنسو روئے اور ایسا صدمہ ہوا کہ کل ارادے پست ہو گئے اور ایسی مایوسی چھائی کہ انتقام کی بھی ہمت نہ رہی۔ پیارے شہید کا دل سب سے زیادہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ سخت حرمانی کی بھری ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ اب کیا تھا، کمر ٹوٹ چکی تھی اور پیروں کے نیچے سے زمین نکل چکی تھی۔ ظاہر تھا کہ کئی برس خونِ پسینہ ایک کر کے پنجاب کے بڑے حصہ پر سکتہ بٹھایا تھا اور وہ آنا فانا میں یوں خیر باد ہو گیا کہ کثیر التعداد مجاہدین کا مارا جانا بھی قہرناک تھا اور پشاور کا ملک چھن جانا تو سب سے ہی زیادہ خونی اثر پیدا کرنے والا تھا۔ ان تمام ناگفتہ بہ غمناک صورتوں نے مولانا شہید کو بٹھادیا اور پھر اس شیر میں بھی یہ اولوالعزمی نہ رہی کہ وہ اپنے دوستوں کا عوض لیتا۔ اب اُس نے اپنی شکستہ دلی

انسان اپنی یا کسی کی غلطی کو محسوس کرے تو اُس سے بچنا ممکن رہتا ہے لیکن جب غلطی کی صحت پر اُسے اصرار ہو تو یہ اصلاح کے مسدود و مفقود ہو جانے کا مقام ہوتا ہے اور اُسے جہل کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ محمد جعفر تھانیسری اور خصوصاً مہر صاحب کی نظر میں سراسر قصور وار ہیں تو مسلمانانِ ستہ اور خاص طور پر سلطان محمد خاں۔ چنانچہ جناب غلام رسول مہر تو اپنی موزناہ اور ادبیانہ شان کے ساتھ سوال کرتے ہیں کہ بآئِ ذَنْبٍ قُتِلْتُ یعنی یہ جماعت کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی؟ لیکن اگر موصوف سے کوئی سوال کرتا کہ ہزاروں مسلمانوں کو ان حضرات نے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا تھا اور انھیں جھوٹے الہاموں کا سنہارا لے کر مسلمانوں کا امیر المومنین بن گئے اور بیعت سے انکار کرنے پر اُنھیں واجب القتل ٹھہرانے کا حق کون سی شریعت نے دیا تھا؟ تو یہ حمایتی حضرات اس جہان میں یا خدا کی بارگاہ میں کیا جواب دیں گے؟ اس بارے میں اپنی نصیحت کو برقرار رکھنے کی خاطر سید صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کو بزورِ قلم بچاتے ہوئے مرزا حیرت دہلوی نے یوں حقیقت بیان کی ہے:

”مولانا شہید نے تو اس محنت اور جان نثاری سے ملک پنجاب کے اتنے بڑے حصہ کو مسلمانوں کے لیے صاف کر دیا تھا اور ناتجربہ کاروں نے چند بے اعتدالوں سے اپنی جانیں بھی کھوئیں اور مفتوحہ ملک چھنوا دیا، ایسا کہ تسمہ تک لگا ہوا باقی نہ چھوڑا۔ وہ عظیم الشان بہادر جس نے رنجیت سنگھ جیسے شیر پنجاب کے خونخوار پنجوں سے اتنا بڑا ملک چھین لیا تھا، خود داغ ملاؤں نے اس آسانی سے اپنی جانوں کے ساتھ اُسے بھی کھو دیا۔“

موصوف نے ان حضرات کی غلطیوں اور کوتاہیوں پر ان لفظوں میں بھی تبصرو کیا ہے:

”حقیقت میں یہ صحیح ہے کہ ناتجربہ کاروں کی ہمارے ایک مدبرِ اعلیٰ کی لائقہ تادیب کو بد نما لباس پہنا دیتی ہے۔ جو کچھ پیارے شہید نے کیا، اُس کے کاموں کا بہت سا حصہ ہر عیب و خطا سے پاک ہے، ہاں بعض بعض امور ملکی میں اس

مفت غلطیاں سرزد ہوئیں، لیکن پھر بھی اُن غلطیوں کا اثر اُسی کی ذات تک رہا،
 دوسرے اُس کے ساتھیوں پر نہ پڑا۔ مگر حیف صد حیف، اُس کے ہمراہیوں نے
 تولدِ انسانیہ اور اپنی خردمانی سے لٹیا ہی ڈبودی اور ایسا ستیاناس کر دیا کہ
 اُسے ملکِ پنجاب چھوڑتے ہی بن پڑا۔ ۱

مرزا میرت دہلوی نے الحمد للہ ہونے کی بنا پر اپنے مدد و حین کی خارجیت اور اُن کے سنے
 مذہب کا تذکرہ نہیں کیا لیکن جن سیاسی امور کا تذکرہ کیا ہے، اُن میں اس جماعت کے غلط طرزِ عمل کا
 حقیقت پسندی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کیونکہ یہی چیز تو تھی جو اُن کی تباہی کا باعث بنی، جبکہ
 غلام رسول مہر نے محض سخن سازی کے ذریعے حقیقت کو غتر بود کرنے کی کوشش ہی کی ہے۔ تاہم
 کلام سے التماس کروں گا کہ اس کتاب میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد صاحب کے
 بارے میں راقم الحروف کی گزارشات کو سامنے رکھیں، جو دلائل اُن کی نصانیف یا اُن کے بارے
 میں دیگر کتابوں سے نقل کیے گئے ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیے اور پھر حاکمِ پشاور، سلطان محمد خاں کے
 اس بیان کو پڑھیں جو اُس نے سید احمد صاحب کے ایک مکتوب کے جواب میں تحریر کیا تھا:
 ”جہاد کی باتیں ابلہ فریبی کا کرشمہ ہیں۔ تم لوگوں کا عقیدہ بُرا اور نیت فاسدہ ہے۔

بظاہر فقیر بنے بیٹھے ہو، دل میں امارت کی ہوس ہے۔ ہم نے خدا کے نام پر
 کر باندھ لی ہے کہ تمہیں قتل کریں، تاکہ زمین تمہارے وجود سے پاک ہو جائے۔“

جنگِ یار میں سلطان محمد خاں نے شکست کھائی، مصالحت ہونے پر حاکمِ پشاور نے بوقتِ
 ملاقات سید صاحب کو ہندوستانی علماء کا ایک محضر بنا دیا۔ اُس میں کیا درج تھا؟ یہ جناب
 غلام رسول مہر کی زبانی سنئے:

”اس ملاقات میں سلطان محمد خاں نے ایک فتویٰ یا محضر خریطے سے نکال کر
 سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اُس پر بہت سی مہریں ثبت تھیں۔ محضر

میں خو انین ستم سے خطاب تھا۔ مضمون یہ تھا کہ سید احمد چند عالموں کو اپنے ساتھ ملا کر، تھوڑی سی جمعیت کے ہمراہ افغانستان گئے ہیں۔ وہ بظاہر جہاد فی سبیل اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن یہ اُن کا فریب ہے۔ وہ ہمارے اور تمہارے مذہب کے مخالفت ہیں۔ ایک نیا دین اُنھوں نے نکالا ہے۔ کسی ولی یا بزرگ کو نہیں مانتے، سب کو بُرا کہتے ہیں۔ انگریزوں نے اُنھیں تمہارے ملک کا حال معلوم کرنے کی غرض سے جاسوس بنا کر بھیجا ہے۔ اُن کی باتوں میں نہ آنا عجیب نہیں تمہارا ملک چھوڑ دو جس طرح بھی ہو سکے، اُنھیں تباہ کرو۔ اگر اس باب میں غفلت اور سستی برتو گے تو بچتاؤ گے اور مذمت کے سوا کچھ نہ پاؤ گے۔

اس محفّر کی، جو مہر صاحب کے لفظوں میں نقل کیا گیا ہے، مندرجہ ذیل باتیں قابلِ غور ہیں؛

- ۱۔ علمائے ہند نے سید احمد صاحب ایٹھمپنی کے دعویٰ جہاد کو فریب کیوں بتایا؟
- ۲۔ اُن علمائے اس جماعت کا مذہب ہندوستانی اور سرحدی مسلمانوں کے مذہب کے خلاف بتایا۔

۳۔ ان جہاد کا دعویٰ کرنے والوں کے متعلق کہا کہ اُنھوں نے نیا دین رائج کیا ہے۔

۴۔ سید احمد صاحب اور اُن کے رفقاء کو انگریزوں کے ایجنٹ قرار دیا۔

اگر یہ الزامات محض بے بنیاد تھے تو اس سے زیادہ سنگین الزام کسی مسلمان کھلانے والے پر اور کیا لگایا جاسکتا ہے؟ چاہیے تھا کہ جناب غلام رسول مہر جیسا بال کی کھال نکالنے والا اور دلائل کی روشنی میں ان دعاوی کو بے بنیاد ثابت کر دکھاتا۔ لیکن موصوف نے اپنی ضخیم تصنیف میں جہان متی کا کتبہ جوڑنے اور اپنے مدوح کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے توڑنے کی خوب کوشش کی لیکن ان الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے کے نام ہی سے دل دہلے لگا ہوا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہو گا۔ خیر جانے دیجیے، یہ ہندوستانی علمائے خیالات تھے۔ علمائے پشاور کے سامنے ان حضرات کی گزشتہ تاریخ نہیں تھی۔ وہ ان لوگوں کے سابقہ کردار

اور حالاتِ زندگی سے بے خبر تھے۔ پشاور کی علمی عالم نے ان حضرات کے بارے میں جو رائے قائم کی وہ عین یقین اور مشاہدات کی بنا پر قائم کی، علماء پشاور کے تاثرات ان حضرات کے بارے میں کیا تھے مہر صاحب کی بانی تھے،

”شاہ اسماعیل کے مجموعہ مکاتیب میں دو مکتوب ایسے ہیں جو پشاور کے دس علماء کے نام بھیجے گئے۔ پہلا ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ (۲۰ اکتوبر ۱۸۲۹ء) کو دوسرا، اشوال ۱۲۴۵ھ (۱۱ اپریل ۱۸۳۰ء) کو۔ ان سے ظاہر ہے کہ ان علماء کی طرف سے سید صاحب اور آپ کے رفقاء پر کئی الزام لگائے گئے تھے۔ مثلاً:

۱۔ سید صاحب اور آپ کے رفقاء الحاد و زندقہ میں مبتلا ہیں۔ ان کا کوئی مذہب و مسلک نہیں نفسانیت کے پیرو ہیں اور لذتِ جسمانی کے جویا۔

۲۔ وہ ظلم و تعدی کے خوگر ہیں۔

۳۔ بلاوجہ شرعی مسلمانوں کے اموال و نفوس پر دست درازی کرتے ہیں۔

۴۔ سید صاحب انگریزی رسالے میں ملازم تھے۔ مولانا اسماعیل اور بعض دوسرے لوگوں نے انھیں ہمدی موعود قرار دیا۔ انگریزوں نے انھیں ملک سے نکال دیا۔

۵۔ وہ مکہ معظمہ پہنچے وہاں سے براہِ مسقط و بلوچستان قندھار گئے۔

۶۔ خادے خاں کو ملا عبد الغفور (انخوند سوات) کے ذریعے سے صلح کے بہانے بلایا اور قتل کر دیا۔

۷۔ وہ افغانوں کی لڑکیوں کو جبراً جدید الاسلام ہندوستانیوں کے حوالے کرتے ہیں“ لے

معلوم یہ ہوتا ہے کہ مہر صاحب نے ان الزامات کو اپنے پسندیدہ الفاظ کا جامہ پہنایا ہے تاکہ وہ ان خود ہی غلط نظر آنے لگ جائیں مثلاً۔ ”انگریزوں نے انھیں ملک سے نکال دیا ہے۔“ یا مکہ معظمہ سے قندھار پہنچنا یا خادی خاں کو ہلاک کرنا وغیرہ۔ موصوف نے ان الزامات کے

بارے میں اپنا فیصلہ یوں صادر فرمایا ہے :

”ان الزامات کی تردید میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ سراسر بے اصل ہیں
مکن ہے یہ الزامات بھی اُسی محضر سے ماخوذ ہوں، جو سلطان محمد خاں نے
 پیش کیا“ ۱

اگر مہر صاحب ذرا صاف گوئی سے کام لیتے اور الزامات کو پڑھ کر لرزہ طاری نہ ہو جاتا،
 تو اس طرح بھی کھکتے نہ تھے کہ : ”علمائے سرحد کے الزامات کی تردید کرنے کی ہمارے کسی بڑے
 سے بڑے میں ہمت نہیں۔ اس لیے کہ الزامات حقیقت کے عین مطابق ہیں۔ اگر موصوف صرف
 اتنا لکھنے کی ہمت کر لیتے تو یہ ایک فقہ اُن کی سولہ سالہ کاوش یعنی کتاب سید احمد شہید سے سولہ سو گنا
 بڑا کارنامہ ہوتا، لیکن مقتدر نے یاوری نہ کی اور ۱۳۹۱ھ / ۱۹۷۱ء میں اپنے مالک حقیقی سے جالے
 موجودہ دہائی علماء و مؤرخین علمائے سرحد کے الزامات پر حقائق کی روشنی میں غور و فکر کریں اور
 دیکھیں : ۲

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیرِ پالان
 طوقِ زرّیں ہمہ در گردنِ خمی بینم

جناب غلام رسول مہر کی تحقیق کے مطابق سید احمد صاحب کی پیدائش
خوابِ نبوت تکبیرائے بریلی کے مشہور سادات خاندان میں، ۶ صفر ۱۲۰۱ھ / ۲۹ نومبر
۱۸۸۶ء کو ہوئی۔ جب چار سال، چار ماہ، چار دن کے ہوئے تو پڑھنے کے لیے مکتب میں
بجائے گئے۔ ابتدائی تعلیمی حالت یہ تھی:

”کوششوں کے باوجود سید صاحب کی طبیعت تحصیلِ علم کی طرف مائل نہ ہوئی۔
مخزنِ احمدی کا بیان ہے کہ تین برس تک برابر مکتب جاتے رہے لیکن اس مدت
میں قرآنِ پاک کی چند سورتیں حفظ کر سکے اور مفرد حروف کے سوا کچھ لکھنا نہ آیا۔ آپ
کے بڑے بھائی سید ابراہیم اور سید اسحاق بار بار لکھنے پڑھنے کی تاکید کرتے
رہتے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ والد بزرگوار اس تاکید کو بالکل بے سود سمجھ چکے تھے۔
چنانچہ وہ فرماتے ہیں: اس کا معاملہ خدا پر چھوڑ دو، جو کچھ اس کے لیے مستحسن اور
اولیٰ ہوگا، ظہور میں آجائے گا۔ ظاہراً تاکید مفید نظر نہیں آتی“ لے

مولانا محمد جعفر تنہا نیسری نے آپ کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں یوں وضاحت کی ہے:
”تین برس آپ مکتب میں رہے مگر سوائے قرآن کی چند سورتوں کے آپ کو کچھ
بھی یاد نہ ہوا“ لے

مرزا حیرت دہلوی نے سید صاحب کی تحصیلِ علم کے بارے میں اپنی تحقیق یوں پیش کی ہے:
”یہ تعجب سے نظر کیا جاتا ہے کہ بزرگ سید بچپن میں اپنے غیر معمولی سکوت کی وجہ
سے پرلے درجے کا غبی مشہور ہو گیا تھا اور لوگوں کا خیال تھا، اسے تعلیم دینا
بے سود ہے، کبھی کچھ آئے جائے گا نہیں۔ میں ذہن کی بابت کوئی رائے
قائم نہیں کر سکتا، صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ سید بچپن میں کیا پوری
عنقریب جوانی میں بھی لکھنے پڑھنے کی طرف طبیعت رجوع نہ تھی“ لے

لے غلام رسول مہر، سید احمد شہید، ص ۶۱ لے محمد جعفر تنہا نیسری، حیات سید احمد شہید، ص ۵۳

لے حیرت دہلوی مرزا، حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۴

موصوف نے سید صاحب کے ذہن کے بارے میں اپنی کوئی رائے تو ظاہر نہیں کی لیکن سید صاحب کے علم سے کورے رہنے اور اُن کے ذہن کی کیفیت و تیزی ضرور بیان کر دی ہے۔ مثلاً وہ تصریح کرتے ہیں :

”یہ نہیں تھا کہ پیارا اور واجب الاحترام سید سبق کے یاد کرنے میں محنت نہ کرتا ہو اور شرارت سے ڈھیٹ بنا خاموش بیٹھا رہتا ہو۔ نہیں، وہ بخوبی محنت بھی کرتا تھا۔ میاں جی کے کہنے کے موافق مکتب کے وقت کی بھی پابندی کرتا تھا، اس پر بھی اُسے یاد نہ ہوتا تھا۔ اُس کے ذہن اور یادداشت کا یہ اتار چڑھاؤ دیکھ کے یہ خیال آتا تھا کہ جیسے چلتی گاڑی میں کوئی روڑا اٹکا دیتا ہے اور پھر وہ بیلوں کی قوت سے بھی نہیں چلتی، سوائے اس کے کہ اُس پر اتنا درجے کا زور لگایا جائے تو پیتہ دو چار انچ زمین سے رگڑ کھاتا ہو بمشکل آگے بڑھے گا۔ یہی کیفیت بعینہ بزرگ سید کی تھی۔ جب وہ ایک ایک جملہ کو گھنٹوں جپے جاتا تھا، تب کہیں کسی قدر یاد ہوتا تھا اور دوسرے دن تماشا یہ تھا کہ وہ بھی چوٹ۔ جب یہ کیفیت ہوئی تو والدین اور میاں جی کی تنبیہ بڑھنے لگی اور گھر کی، جھڑکی، آنکھیں نکالنے سے گزر کے مار پیٹ تک نوبت پہنچ گئی۔ اس سے بھی والدین کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ جب اُنہوں نے یہ دیکھا کہ قدرتی طور پر اس کے دماغ میں قفل لگ گیا ہے اور یہ کسی طرح کی تنبیہ سے بھی نہیں پڑھ سکتا تو ناچار ہو کے پڑھنے سے اُٹھالیا اور زیادہ جبر کر کے معصوم جان کو گھٹنے نہ دیا۔“

جناب غلام رسول مہر نے سید صاحب کی نوجوانی کے دور میں ذہنی اور تعلیمی حالت کے بارے میں جبکہ وہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) کے پاس تھے یوں وضاحت کی ہے :

”مولوی عبدالقیوم کا بیان ہے، اثنائے تحصیل علم میں سید صاحب کی یہ کیفیت

ہوئی کہ جب کتاب کو دیکھتے تو حروف اُن کی نظروں سے غائب ہو جاتے۔ خیال ہوا کہ شاید کوئی بیماری ہو گئی ہے۔ طبیبوں سے رجوع کیا گیا، مگر یہ کیفیت زائل نہ ہوئی۔ شاہ عبدالعزیز تک یہ بات پہنچی تو اُنھوں نے فرمایا: جالی وغیرہ باریک چیزوں پر نظر مجاؤ اور دیکھو کہ وہ بھی نظروں سے غائب ہوتی ہیں یا نہیں؟ کوئی باریک سے باریک چیز غائب نہ ہوئی، تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ پڑھنا چھوڑ دو۔ جب کسی نیاز مند نے اس حکم کا سبب پوچھا تو فرمایا: اگر اور باریک چیزیں غائب نہیں ہوتیں تو معلوم ہوا کہ یہ مرض نہیں۔ ظاہر اِیہ معلوم ہوتا ہے کہ علم ظاہری ان کی قسمت میں نہیں۔“ لے

ان تصریحات کی روشنی میں مرزا حیرت دہلوی کا بیان بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب بحسن تو کیا جوانی میں بھی علم کی دولت سے محروم رہے کیونکہ اُن کے دماغ میں طفل لگا ہوا تھا۔ بائیس تیس سال کی عمر تک یہی تعلیمی کیفیت اور ذہنی حالت رہی۔ باقی عمر میں علم کے نزدیک تک جانے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چونکہ حالت نیم مجذوبانہ تھی، اسی لیے ادعاے نبوت کے لیے کسی کی نگاہوں میں نہ چل گئے۔ انگریزوں سے ملاقاتیں شروع ہو گئی ہوں گی کہ نواب امیر خاں کی ملازمت کے دوران ہی الہامات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ادھر کسی انگریز حاکم کی طرف سے رازداری کی بات ہوتی، اُسے خدا کی طرف منسوب کر کے، الہام کے نام سے شہر کرنا شروع کر دیا جاتا تھا۔ ادھر مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے صراطِ مستقیم کتاب لکھ کر موصوف کے اندر نبوت کے تمام اوصاف بدرجہ کمال بتا دیے بلکہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مثال ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا جا رہا تھا۔ جب سوانح نگاروں اور حاشیہ برداروں کی باری آئی تو اُنھوں نے سید صاحب کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات میں ایسا رنگ بھرنا شروع کر دیا کہ اگر اُنھیں کوئی، بعد از خدا بزرگ توئی، کے منصب پر سرفراز نہ بھی سمجھے تو سہرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے برابر مانے بغیر تو چارہ نہ رہے۔ سید احمد صاحب ابھی

شکم مادر میں تھے کہ اُس وقت بھی اُن کا وجود نورِ مصطفویٰ جیسا نظر آیا۔ چنانچہ یہی کچھ منوانے کی خاطر غلام رسول مہرنے وقائع احمدی کی ایک گھڑنت یوں مشترک کی ہوئی ہے:

”سید صاحب جب والدہ کے پیٹ میں تھے تو اُس محترمہ نے ایک روز خواب دیکھا کہ میرے خون سے ایک کاغذ نکھا گیا ہے جو تمام عالم میں اڑتا پھرتا ہے۔ اس پر مشوش ہوئیں۔ یہ خواب اُن کے داماد عبد السبحان نے سنا تو کہا کہ تشویش کی ضرورت نہیں۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ جو کچھ آپ کے پیٹ میں ہے، وہ دنیا میں بہت نامور ہوگا۔ ایامِ حمل تکمیل کے قریب پہنچے تو یکایک حمل کے ظاہری آثار میں کمی آگئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ وضع کا زمانہ ابھی دور ہے۔ تھوڑے دن بعد سوکر اُسٹھیں تو پھر پورے آثار نمودار ہو گئے۔ صفر کی چھٹی تاریخ کو سید صاحب پیدا ہوئے۔“

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی والدہ ماجدہ کا خواب میں تو سید صاحب کو یہ حضرات کیسے پہنچے رہ جانے دیتے۔ لہذا خواب تیار کر لیا۔ لیکن یہ حضرات اگر فی تعبیر سے مس رکھتے تو اس خواب کو جس طرح غریب شہر کر رہے ہیں، اس سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتے، کیونکہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ وارد ہونے والا کسبِ رزق کے بعض ناجائز ذرائع کا مروج و موجد ہوگا، اس لیے کہ قرآن کریم میں جن چار اشیاء کی حرمت یحجاز مذکور ہے، اُن میں سے ایک (وَالدَّم) یعنی خون ہے۔ علاوہ بریں آنے والا يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ یعنی فتنہ و فساد اور قتل و خونریزی میں شہرت و ناموری حاصل کرے گا۔ یہ ہے اس خواب کی تعبیر، جس میں سے صرف شہرت و ناموری کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

اب بیان مذکورہ کا دوسرا حصہ ملاحظہ فرمائیے۔ حقیقتِ محمدیہ چونکہ نور بلکہ جانِ نور ہے۔ اسی وجہ سے جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم شکمِ مادر میں تھے تو ظاہری آثار کم ہی محسوس ہوئے اور ایامِ حمل کی تکالیف و ثقل وغیرہ میں سے کچھ نہ تھا۔ اگر سید صاحب کے بارے میں کوئی ایسی گھڑنت نہ کی جاتی تو غرض و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حقیقی مرتبے سے ان کا بناوٹی رتبہ کم رہ جاتا۔ اسی

قبل از وقت اس صفت و معجزے کا انتظام یوں کیا گیا:

نہرچند آپ (سید صاحب) کے استاد اور باپ بھائی، آپ کی تحصیل علم کے واسطے
کوشش کرتے تھے مگر آپ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ آثار اُمیت، نبی اُمی کے
مثل، جو بطور میراث آپ کی حقیقت میں امانت تھے روز بروز ظاہر ہونے لگے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمی ہونا آپ کا معجزہ اور خصائص میں سے ہے۔ غیر انبیاء کا ان پڑھ
رہنا نقص اور محرومی ہے۔ سید صاحب کی محرومی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے اُن کی اُمیت کا ذکر ہو گیا
چنانچہ ایک بدترین جبارت ہے۔ اگر محبوب پروردگار سے اس طرح مشیت قائم کی جائے لگے تو دنیا
کے کون سے جاہل اجد کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نظیر منوانے کی کوشش نہ کی جاسکے گی؟
کیا زید و عمر کو آپ جیسا بنانے کی قیامت برپا نہ ہونے لگے گی؟ محمد جعفر تھانیسری نے اُمیت کا
انسانہ خود نہیں گھڑا بلکہ مولانا محمد اسماعیل دہلوی نے ہی اس طائفہ کو یہ سبق پڑھایا ہے:

از بیکہ نفس عالی حضرت ایشان بر کمال	چونکہ آپ (سید صاحب) کی ذات
مشابہت جناب رسالتاں علیہ	والاصفات ابتدائے فطرت سے
افضل الصلوٰۃ والتسلیمات و بدو	جناب رسالتاں علیہ فضل الصلوٰۃ والتسلیمات
فطرت مخلوق شدہ بناء علیہ لوح	کی کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی،
فطرت ایشان از نقوش علوم رسمیه و	اس لیے آپ کی لوح فطرت، علوم
راہ دانشمندان کلام و تحریر و تفسیر	رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشمندان
مصطفیٰ ماندہ بود۔	کی راہ و روش سے خالی تھی۔

سید صاحب ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۶ء میں شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے
جب حضرت شاہ صاحب نے موصوف کو ابتدائی مشاغل کی تعلیم و تربیت دینی شروع کی اور

مولانا جیات سید احمد شہید، ص ۵۳

مولانا محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراط مستقیم، مطبع ضیائی ۱۲۸۵ھ، ص ۴
مولانا محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراط مستقیم، مطبع لاہور، ص ۸۸

تصویرِ شیخ کی تعلیم فرمانے لگے تو سید صاحب کو آسمان پر بٹھانے کی غرض سے اُن کے سر ایک عجیب و غریب واقعہ منظر دیا گیا۔ مثلاً محمد جعفر تھانیسری کیسی سیدھی سادی بات کا بنگلہ اور رائی کا پہاڑ بنا کر یوں دکھاتے ہیں،

”اِس کے بعد شغلِ برزخ کہ جس میں تصویرِ شیخ کا مراقبہ کرتے ہیں، آپ کو تسلیم دینی چاہی، اُس وقت سید صاحب نے بہت ادب اور عاجزی سے مولانا سے عرض کیا کہ اِس شغل میں اور بُت پرستی میں کیا فرق ہے؟ اُس میں صورت سگی یا قرطاسی ہوتی ہے اور اِس میں صورت خیالی، جو تہہ دل میں جگہ پکڑتی ہے، تعلیم کی جاتی یا پوجی جاتی ہے۔ تب مولانا نے یہ شعر حافظ شیرازی کا پڑھا، سہ

بے سجادہ رنگیں گُن گرت پیرِ مغاں گوید
کہ سالک بے خبر بود ز راہ و رسم منزلہا

تب سید صاحب نے عرض کیا کہ اگر حکمِ مے نوشی کا جو گنا و کبیرہ ہے، کیجیے تو اُس کی تعمیل کو بھی حاضر ہوں مگر یہ عمل تصورِ تصویرِ شیخ کا، خصوصاً غلبتِ شیخ میں اُس تصویر سے توجہ اور استعانت چاہنا جو بعینہ بُت پرستی اور شرکِ صریح ہے، مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اگر اِس کے جواز کے واسطے کوئی سندِ قرآن و حدیث یا اجماعِ اُمت کی موجود ہو تو بھی مضائقہ نہیں ہے۔ اِس تقریر کے سننے اور سمجھنے کے بعد مولانا صاحب نے سید صاحب کو اپنی بغل میں لے کر اور آپ کے رخسار اور پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا کہ اے فرزندِ دلہند! حضرت حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و انعام سے ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء کی، جو افضل ولایتوں کی ہے، تم کو عطا کی ہے۔ اُس وقت سید صاحب نے مولانا ممدوح سے عرض کی کہ ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء میں فرق کیا ہے؟“

جناب غلام رسول مہر نے اس واقعے کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کیا ہے:

پھر شغلِ برزخ کا حکم ہوا، جس میں صورتِ شیخ کا تصور صوفیہ میں مروج تھا۔ تصور صورتِ شیخ کا حکم سنا تو سید صاحب نے ادب سے عرض کیا کہ حضرت! اس شغل اور بت پرستی میں کیا فرق ہوا؟ مفصل ارشاد ہو۔ شاہ عبدالعزیز نے جواب میں خواجہ حافظ کا یہ مشہور شعر پڑھا: ۷

بے سجادہ رنگیں کن گرت پیرِ مفاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلِ ما

سید صاحب نے دوبارہ عرض کیا کہ میں بہر حال فرماں بردار ہوں، اس لیے کہ کسبِ فیض کی غرض سے آیا ہوں، لیکن تصورِ شیخ تو صریح بت پرستی معلوم ہوتا ہے۔ اس خدشے کو زائل کرنے کے لیے قرآن و حدیث سے کوئی دلیل پیش فرمادیں، ورنہ اس عاجز کو ایسے شغل سے معاف رکھیں۔ شاہ صاحب نے یہ سنئے ہی سید صاحب کو سینے سے لگالیا، رخساروں اور پیشانی پر بوسے دیے اور فرمایا: اے فرزندِ ارجمند! خدا نے اپنے فضل و رحمت سے تجھے ولایتِ انبیاء عطا فرمائی ہے۔ ۸

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے پروفیسر ڈیڑھ گھنٹے کو مخزنِ احمدی اور وقائعِ احمدی میں محفوظ کیا گیا۔ بانی علماء و مورخین نے اُن بیانات کو وحیِ الہی سمجھ کر، راہِ طریقت سے نا آشنا ہونے کی بنا پر، بعینہ نقل کرنا، ماننا اور منوانا شروع کر دیا۔ ان تحریروں سے واضح ہو رہا ہے کہ سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے جملہ معتقدین، بیعت، شغلِ برزخ، کسبِ فیض، ولایتِ اولیاء اور ولایتِ انبیاء کے معانی و مفہوم سے مطلقاً ناواقف ہیں اور جن حضرات کو اس مسئلے میں کچھ معلومات حاصل ہیں وہ اپنے بڑوں کی بے راہ روی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے تباہلِ عارفانہ سے کام لیتے رہتے ہیں۔ جہل کماں تصور اور کہاں یہ قیل و قال؟ وہاں تو کسی ثنائی اللہ کے ہاتھ پر بکنا ہے بکنا نہیں۔ یہ مکالمہ محض اسی غرض سے گھڑا گیا ہے کہ ان بزرگانِ دین

اور خلاصہ روزگار ہستیوں سے سید صاحب کو ممتاز ثابت کیا جائے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ولایت، خاص قُربِ خداوندی کو کہتے ہیں۔ یہ دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جو انبیائے کرام کو اعطایا جاتا ہے، پہلے اور نبوت کے ساتھ حاصل ہے، اسے ولایتِ انبیاء کہتے ہیں اور دوسری جو غیر انبیاء کو حاصل ہوتی ہے، اُسے ولایتِ اولیاء کہا جاتا ہے۔ سید صاحب کے لیے ولایتِ انبیاء ثابت کرنا اور وہ بھی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ”چچہ دلاور است موزوں بکف چراغ دارد“ والا معاملہ ہے۔ یہ محض اپنی بدعتی کے لیے حضرت شاہ صاحب کی آڑ لی گئی ہے۔

سب سے دل چھیننے والی ادا کہ تصویر شیخ کو سید صاحب نے صریح شرک اور بُت پرستی بتا کر گویا سارے خاندانِ عزیزی دہلوی کو، اُن کے جملہ پیرانِ عظام کو، حتیٰ کہ حضراتِ مجددانِ ثانیِ قدس سرہ تک کو صریح مشرک و بُت پرست ٹھہرا دیا، لیکن کسی سوانح نگار نے یہ تصدیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ اس گھڑنت کے بموجب حضرت شیخ مجددِ سرہندی سے لے کر شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم تک کو مشرک اور بُت پرست ٹھہرایا جائے یا سید احمد صاحب و مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے آج تک کے وہابیوں کو اکابرِ اہلسنت کا مخالف، ولی اللہی خاندان کو مشرک و بُت پرست سمجھنے والے اور تصوف کی ابتداء بھی بے بہرہ مانا جائے؟ بہر حال جس شعلِ برزخ کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے القول الجمیل میں قُربِ خداوندی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بتایا، اُسی کے حاشیہ میں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو سب سے سیدھا راستہ بتایا، حضرت امام ربانی شیخ احمد سرہندی فاروقی قدس سرہ (المتوفی ۱۰۴۳ھ/۱۶۲۴ء) نے اپنے ایک مرید کو اس کی مشق ہو جانے پر تحریر فرمایا تھا کہ یہ دولت خوش نصیب لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، اُسی کو اگر کوئی ازراہِ بے خبری شرک و بُت پرستی بتاتا ہے تو ایسے حضرات سے سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ: ۷

لطفِ ے تجھ سے کیا کہوں زاہد!
ہاتے کم بخت! تو نے پی ہی نہیں

غلام رسول مہرنے اس معاملے کو سلجھانے کی غرض سے کچھ سخن سازی سے کام لینے کی کوشش ضرور کی ہے، لیکن جس طرح ایک فلسفی جتنا عقلی دلائل سے ڈور کو سلجھانا چاہتا ہے اُسی قدر الہیات کی ڈور اور الجھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ مہر صاحب کو پیش آیا، وہ سلجھانے بیٹھے لیکن سہرا تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی، یا بل نہ سکا، اسی لیے ڈور کو مزید الجھاتے ہی گئے مثلاً اس سلسلے میں اُنھوں نے وضاحت کی ہے کہ :

”مکن ہے اس سے کسی صاحب کو دوسرے پیدا ہو کہ شاہ عبدالعزیز جیسا یگانہ عالم دین اس حقیقت سے ناواقف تھا کہ تصور صورت شیخ کے لیے قرآن وحدیث میں کوئی سند موجود نہیں یا اس تصور کو عام صنم پرستی سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ میں اس بارے میں تحقیقی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیال یہ ہے کہ صوفیہ نے طالب کی توجہ جہان کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے، اُن میں سے ایک طریقہ تصور صورت شیخ کا بھی تھا، جس سے یہ بزرگ کام لیتے رہے۔ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک و مرکز تھی کہ اسے قبول نہ کر سکی۔ شاہ صاحب چونکہ طبیب عاذق تھے، اس لیے سمجھ گئے کہ یہ دوا سید کے مزاج کے لیے سازگار نہ ہوگی، لہذا اسے چھوڑ دیا۔ جب یہ مقصود دوسرے طریقوں سے بروہ احسن حاصل ہو سکتا تھا تو تصور شیخ پر اصرار کی ضرورت نہ تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہیے کہ جس عمل کے لیے کتاب وسنت میں کوئی مبنی موجود نہ ہو، ہر مدعی اسلام کے نزدیک لازماً ناقابل قبول ہونا چاہیے، کیونکہ دین کا ماخذ کتاب وسنت ہیں، نہ کہ کسی طبقے کا عمل۔“

قطع نظر اس کے کہ شغل برزخ کا ثبوت کتاب وسنت میں ہے یا نہیں، وہابی مؤرخین کی تصریحات کے مطابق اس صنم پرستی کی زد میں سب سے زیادہ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ آئے ہیں، جنھوں نے تصور شیخ کو باقاعدہ طور پر اپنی تعلیمات کا ایک جزو بنایا اور اس میں مہارت

حاصل کر لینے والوں کو خوش نصیب بتاتے رہے۔ اس نشانے پر آتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے جملہ متشیخ جن سے آپ نے یہ شغل سیکھا، اپنے مریدوں کو سکھایا اور اپنی کتاب "القول الجمیل" میں اسے قرب الہی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ٹھہرایا۔ اس کی زد میں آتے ہیں شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ جو اسے قرب خداوندی حاصل کرنے کا سب سے سیدھا اور آسان راستہ بتاتے تھے اور عمر بھر اس کے عامل و مبتغ رہے۔ مہر صاحب بتاتے ہیں کہ سید صاحب کی طبیعت اتنی پاک اور مز کی تھی کہ شغلِ برزخ کو قبول نہ کر سکی۔ گویا حضرت محمد الف ثانی، شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہم کی طبیعتیں ناپاک اور گندی تھیں کہ اس بُت پرستی کو وہ حضرات قبول کرتے رہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ حقیقت یہ ہے کہ وہابی حضرات خواہ مخواہ تصوف کے معاملات میں ٹانگ اڑا بیٹھتے ہیں جبکہ وہابیت اور تصوف دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ مہر صاحب نے اپنے بارے میں ذرا جرأت سے کام لے کر یوں اعتراف بھی کیا ہے:

"ان تمام امور یا شغلِ برزخ کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ خود اس کو کچھ سے نا بلد ہوں۔"

جملہ حالات و کوائف کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنے کے بعد معلوم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس سارے ڈرامے کی ابتدا مولوی عبدالحی دہلوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) سے ہوئی۔ حقیقت کا حال تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے، ویسے اس قسم کے سازشی معاملے کاموں سے ہی پہچانے جاتے ہیں ورنہ جعفر و صادق کو کس نے انگریزوں سے معاہدہ کرنے دیکھا تھا اور کون سا تحریری ثبوت اُن کی انگریز دوستی اور ملک و ملتِ فردوسی کا دیباچا سننا ہے؟ موصوف سے سر ڈیوڈ آکٹر لونی وغیرہ نے تعلقات پیدا کر کے آمادہ کیا ہوگا۔ انھوں نے مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کو تیار کیا۔ موصوف نجد کے محمد بن عبدالوہاب اور بنگال کے حاجی شریعت اللہ کی تحریکوں سے متاثر تھے یا متاثر ہو گئے۔ سید احمد صاحب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

کے دستِ حق پرست پر بیعت ہو گئے تھے۔ انگریزوں نے ان کی نیم مجذوبانہ حالت دیکھی تو اس
ڈرائے کا اہم ترین پارٹ ادا کرنے کے لیے وہ بڑے موزوں نظر آئے ہوں گے۔ مولوی عبدالحی و
محمد اسماعیل صاحبان نے انہیں سرانگمہوں پر جگہ دے کر رغبت دلائی ہوگی کہ وہ ایک اصلاحی تنظیم بنانا
اور ہم ملنا چاہتے ہیں۔ موصوف کے رضامند ہونے پر تیلٹ قائم ہو گئی۔

سید احمد صاحب چونکہ غیر معروف تھے لیکن شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت
سے کچھ فیضیاب ہونے لگے ہوں گے کہ اس پیکر میں چھنس گئے۔ یار لوگوں نے حضرت شاہ صاحب
کے فیضان کا نام کر کے اپنی مقصد برآری کے لیے سید صاحب کو آسمان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ اُن
کے ہر معمولی واقعے کو کرامت اور معجزہ بنا کر دکھایا جاتا۔ اُن کی پاکی کے پیچھے پیچھے دوڑنا اپنی سعادت
باتے، موصوف کے آگے خود دم نہ مارتے۔ جب علماء کو یہ کچھ کرتے دیکھا گیا تو بہت سے لوگ
عنیت کے جال میں پھنسنے لگے اور خاصی شہرت حاصل ہو گئی۔

سید احمد صاحب کو آسمان پر بٹھانے اور اُن کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر
جمعیت فراہم کرنے کی غرض سے اُن کے ملفوظات کا بہانہ کر کے مولوی عبدالحی و مولوی محمد اسماعیل
صاحبان نے صراطِ مستقیم کتاب گھڑی اور اُس میں بڑی رازداری کے ساتھ اپنے پیر کو انبیاءِ کرام
بصفت میں کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی۔ دعویٰ صرف امامت کا تھا لیکن صفات نبوت کی ثابت
بارہی تھیں۔ مثلاً ایک عبارت ملاحظہ ہو:

صِدِّیقِ مَنْ وَجَّهَ انْبِیَاءَ کَاسِیْرٍ وَاوْرَمِنْ وَجَّ	صِدِّیقِ مَنْ وَجَّهَ مَقْلِدِ انْبِیَاءِ مِی بَاشَنْدَو
شَرْعِیَّتِ کَا مَحَقِّقِ هُونا هے۔ پس اگر	مَنْ وَجَّهَ مَحَقِّقِ دَرْ شَرْائِعِ - پس اگر
صِدِّیقِ زِکِی الْقَلْبِ سِت رَضَا و	صِدِّیقِ زِکِی الْقَلْبِ سِت رَضَا و
اَقْوَالِ اور اَفْعَالِ مِیْنِ خُدَا سَے تَعَالٰی	کَرَا هِیْتِ حَضْرَتِ حَقِّ دَرِ اَفْعَالِ و
کِی خُوشنُودِی اور نَارِضَا مَنَدِی کُو	اَقْوَالِ مَخْصُوصَہٗ وَصَحَّتِ دِیْطَلَانِ دَر
اور مَخْصُوصِ عَقَائِدِ کَے صَحِیحِ اور غلط ہونے	عَقَائِدِ خَاصَہٗ وَ مَحْمُودِیَّتِ وَ نَدَمِیَّتِ دَر
اور خَاصِ لوگوں کَے عَادَاتِ اور اسْتَعْدَادِ	اَخْلَاقِ و مَلْکَاتِ شَخْصِیَّہٗ نَبَوِّیَّہٗ جَلِّیَّہٗ خُودِ رِیَافِتِ
کَے جَلَا بُرا ہونے۔ کُو اپنی طَبِیْعَتِ	مِی نَمَائِدِ۔ لے

کے نور سے معلوم کر لیتا ہے۔ لے

ذرا آگے چل کر اسی امر کو تفصیل سے بیان کیا اور یوں دن و رات قیامت ڈھائی ہوئی ہے :

پس احکام ایں امور مذکورہ اور ابد و
وجہ معلوم می شود ، یکے بشهادت
قلب خود خصوصاً و دیگر بسبب اندراج
اور کلیات شرع عموماً ۔ و علم کہ بوجہ
ادل حاصل شدہ تحقیقی ست و ثانی
تعلیدی ۔ و اگر زکی العقل ست نور
جلی اویسوئے کلیات اُورا رہنمائی
می فرماید ۔ پس علوم کلیہ شرعیہ و حکم
و احکام ملت اُورا شاگرد انبیاء ہم می
توان گفت و ہم استاد انبیاء ہم ۔
و نیز طریق اخذ آنهم شعبہ الیت
از شعب وحی کہ آن را در عرف
شرع بنفت فی الردع تعبیر
می فرمایند و بعض اہل کمال
آنرا بوحی باطنی می نامند ۔ لے

پس ان امور مذکورہ کے احکام ان کو
دو وجہ سے معلوم ہوتے ہیں ۔ ایک
تو دل کی شہادت سے جو خاص کر
ان امور سے متعلق ہے ۔ دوم عام
طور پر کلیات شرع میں ان کے
مندرج ہونے کے سبب سے ۔
اور جو علم کہ پہلے طریق سے اُس کو
حاصل ہوا ہے وہ تحقیقی ہے اور جو
علم کہ دوسرے طریق سے حاصل
ہوا ہے وہ تعلیدی ہے ۔ اور وہ
صدیق زکی العقل ہے تو اُس کے
طبعی نور کی ان کلیات حقہ کی طرف
رہنمائی کی جاتی ہے ۔ پس کلیات
شرعیہ اور احکام دین میں اُس کو
انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا شاگرد
بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کا ہم استاد
بھی کہہ سکتے ہیں ۔ اور نیز اس کے
اخذ کا طریق بھی وحی کی شاخوں میں
سے ایک شاخ ہے ، جس کو

لے صراط مستقیم اردو ، ص ۸۸

لے محمد اسماعیل دہلوی ، مولوی : صراط مستقیم ، ص ۳۹

شریعت کی اصطلاح میں نفث فی
الروع کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور
بعض اہل کمال اس کو وحی باطنی
کہتے ہیں۔ ۱

مذکورہ دونوں عبارتوں میں موصوف نے تصریح کر دی کہ ایسے افراد کو نبی کا مقلد اور انبیاء
کی تقلید سے آزاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ اُسے اپنے نورِ جلی سے کتاب و سنت کے بغیر خود بھی
باری تعالیٰ کی رضا مندی و ناراضگی اور عقاید و افعال و اقوال کا اچھا یا بُرا ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔
چونکہ بعض علوم ان حضرات کو انبیائے کرام کی وساطت کے بغیر ہی اپنے قلب کی شہادت سے
ماصل ہو جاتے ہیں اسی لیے جہاں انھیں انبیائے کرام کا شاگرد کہا جاسکتا ہے وہاں انبیاء
کا ہم استاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ براہِ راست شریعت حاصل کرنے کے اس شعبے کو نفث فی الروع
اور وحی باطنی کہا جاتا ہے۔ موصوف کی یہ تصریحات عقایدِ اہلسنت و جماعت کے سراسر خلاف
غیر انبیاء کو نبی بتانا اور روافض کا مذہب قبول کرنا ہے۔ موصوف کی اصطلاح میں اخس
علوم شریعہ کے اس طریقے کو حکمت کہتے اور اس مرتبے کو امامت و وصایت سے تعبیر کرتے ہیں۔
پچو آگے دیکھتے ہیں:

اس معنی کو امامت اور وصایت کے	ہیں معنی را امامت و وصایت تعبیر
ساتھ تعبیر کیا کرتے ہیں اور ان کے	می کنند و علم ایشان را کہ بعینہ علم
علم کو جو بعینہ پیغیروں کا علم ہے، لیکن	انبیاء است لیکن وحی ظاہری
ظاہری وحی سے حاصل نہیں ہوئے لہذا	متعلق نشدہ بہ حکمت می نامند۔ ۲
حکمت کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ۳	

۱۔ صراطِ مستقیم، اردو: ص ۸۹

۲۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۴۰

۳۔ صراطِ مستقیم اردو، مطبوعہ لاہور، ص ۹۱

کیا فرماتے ہیں دہلوی، ائمہ دین اور جماعت اسلامی کے مفتی صاحبان و محقق حضرات اور حقانیت کے علم بردار بننے والے! اگر مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی محبت آپ حضرات کے دل میں گوسالہ سامری کی طرح سما نہیں گئی ہے اور آپ حضرات نے محمد عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقدس دین پر دہلوی موصوف کے دین کو ترجیح نہیں دے دی ہے تو کیا مذکورہ بیانات و اعلانات کے خلاف اسلام ہونے میں کوئی شک و شبہ ہے؟ کیا یہ غیر انبیاء کو مقام نبوت پر فائز کرنا نہیں ہے؟ کیا روافض کے علاوہ کوئی گمراہ سے گمراہ فرقہ بھی ان تصریحات کی تائید کرے گا؟ یہ آپ کی دینداری کے امتحان کا موقع ہے کہ آپ خدا اور رسول پر ایمان رکھتے ہیں یا اپنے نبوت بانٹنے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی ہی آپ کی نظر میں سب کچھ ہیں۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ تو اس بارے میں یہ ہے:

معرفت احکام شرعیہ بدوں توسیط
احکام شرعیہ کا معلوم ہونا، نبی کی
وساطت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔
نبی ممکن نیست۔ ۱

اہلسنت و جماعت کے مایہ ناز محقق علامہ عبدالغنی نابلسی علیہ الرحمہ یوں فرماتے ہیں:

هذا القول كفر لا محالة
بالاجماع من وجوه منها دعوى
تلقى الاحكام الشرعية من
الله تعالى بلا واسطة نبی
وذلك دعوى نبوة - ملخصاً -
یہ قول باجماع اُمت کئی طرح
کفر ہے۔ اُن میں سے ایک وجہ
یہ ہے کہ اس میں نبی کی وساطت
کے بغیر اللہ تعالیٰ سے شرعی احکام
معلوم کر لینے کا ادعا ہے اور یہ نبوت
کا دعویٰ کرنا ہے۔ ۲

دہلوی موصوف نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ اپنے مدد چین کو اُنھوں نے وحی باطنی سے سرزد کر کے پیغمبروں کی طرح معصوم بھی بنا دیا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے خود یوں وضاحت کی ہوئی ہے:

لابد اُوراً بحافظتِ مثلِ محافظتِ انبیاء
پس وہ ضرور انبیاء کی اُس محافظت
کہ مسمی بہ عصمت است فائز کی کند
جیسی نگہبانی کے ساتھ کامیاب ہوتا ہے
جس کو عصمت کہا جاتا ہے۔ لے

اسی وحی باطنی اور انبیاء کے کرام جیسی عصمت کو پراسرار طریقے سے اپنے پیرو سید احمد صاحب
بہک پہنچانے کی خاطر مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے ایسے حضرات کی موجودگی کا یوں صراحت سے
بیان دانا تھا؛

ندانی کہ اثباتِ وحی باطن و حکمت و
یہ سمجھنا کہ باطنی وحی اور حکمت اور
وجاہت و عصمت مرغیر انبیاء را
وجاہت اور عصمت کو غیر انبیاء کے
مخالفتِ سنت و از جنسِ اختراع بدعت
واسطے ثابت کرنا خلافِ سنت اور
است و ندانی کہ ارباب
اختراع بدعت کی جنس سے ہے
ایں کمال از عالم منقطع شدہ
..... اور یہ میت سمجھنا کہ اس کمال والے
لوگ جہان سے منقطع ہو چکے ہیں لے

مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنے پیرو جی کے لیے وحی و عصمت وغیر نبوت کے تمام
لازمات تو جمع کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ایسی کرامتیں گھڑ کر سنانی شروع کر دی تھیں کہ
معجزات کو بھی پیچھے چھوڑتی جا رہی تھیں۔ ان حالات میں ایک خدشہ ضرور تنگ کرتا تھا کہ
ابھی تک سارا معاملہ زبانی جمع خرچ تک محدود تھا اور حقیقت کے میدان میں اُس کا کوئی شائبہ
بھی نظر نہیں آ سکتا تھا، وریں حالات یہ تصور پریشان ضرور کرتا ہو گا کہ اگر کسی نے آجکل میں ایسی
کرامت کا مطالبہ کر دیا جس کی صحت کا آنکھوں سے مشاہدہ کیا جاسکے یا امیرِ سلطنت بننے
کے بعد جب نبوت کا دعویٰ کیا جائے گا تو اُس وقت معجزہ طلب کرنے والے کو طاقتِ استعمال
کرنے کے علاوہ اور کیا جواب دیا جاسکتا ہے؟ چنانچہ قبل از وقت اُس کی پیش بندی یوں

لے محمد اسماعیل، مولوی: صراطِ مستقیم فارسی، ص ۴۱ لے صراطِ مستقیم اردو: ص ۹۳
لے محمد اسماعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۴۲ لے صراطِ مستقیم اردو: ص ۹۴، ۹۵

غیظ و غضب کے عالم میں فرمائی جاتی ہے :

”اور جس شخص سے معجزہ و کرامت نہ ہو اُس کو پیغمبر اور ولی نہ سمجھنا وغیرہ ہزاروں رسمیں اور عادتیں سب یہود اور نصاریٰ اور مجوس اور منافقوں کی اور مکہ والے اگلے مشرکوں کی ہیں اور سوا اس کے اور ہزاروں رسمیں ہندوؤں کی ہیں کہ لوگوں نے اپنے یہاں رائج کر لیں کہ پیغمبر خدا ایسی باتوں کے مٹانے، ایسی ہی رسموں کے دفع کرنے کے لیے آئے اور قرآن نازل ہوا۔ پھر جو شخص ایسی رسمیں اور عادتیں اختیار کرے اور مسلمانوں میں جاری کرے تو وہ شخص اس حدیث کے بموجب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغضوب ہے، رانداگیا، خدا کے غضب میں گرفتار اور خدا کے دشمنوں میں شمار“ لے

اپنے امام کی اس ستم ظریفی پر وہابی حضرات داد و تحویب دیتے ہوں گے کہ جس شخص سے کئی کرامت ظاہر نہ ہو اُسے ولی اور جو معجزہ نہ دکھائے اُسے نبی ماننے سے لوگ انکار کریں تو یہ منجملہ اُن باتوں کے ہے جن سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بقول دہلوی صاحب منع فرما دیا تھا۔ کیا وہابی حضرات ہمیں سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وہ ارشادِ گرامی دکھانے کی رحمت گوارا کر لیں گے جس میں آپ نے فرمایا ہو کہ میرے بعد جب کوئی نبی آئے اور وہ تمہیں معجزہ نہ دکھائے تو اُس کی نبوت کا انکار نہ کرنا۔ اگر روئے زمین کا کوئی وہابی، کوئی مولوی اسماعیل دہلوی کا عقیدت مند ہمیں ایسی ایک ہی حدیث دکھا دے تو ہم اُس کے بیحد ممنون ہوں گے فَاِنَّ لَكُمْ تَفْعَلُوْا وَلٰكِنْ تَفْعَلُوْا اِنَّا نَتَّقُوْا النَّارَ اَلَّتِیْ وَفُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ط

مثل مشہور ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کی خاطر سیکڑوں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اس کی واضح مثال دہلوی صاحب کی مذکورہ بالا عبارت بھی ہے، جس میں ادعا ئے نبوت کے فرائد کو چھپانے کی خاطر بیسیوں جھوٹ بولنے پڑے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو ایسی عادتِ بد سے محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)۔ معراج ہمارے آقا و مولیٰ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کے عظیم معجزات سے ہے۔ معراج شریف میں جہاں تک آپ کی رسائی ہوئی وہاں
 بہ کسی دوسرے نبی تو کیا کلیم و خلیل علیہما السلام جیسے جلیل القدر اور اللہ تعالیٰ کے لاڈلے پیغمبروں
 کو بھی نہ ہوئی۔ لیکن وہاں بیت ہی کیا ہوئی جو حبیبِ خدا سے اپنے پیروں کو بڑھا کر نہ دکھاتے نبی کریم
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن کریم بتاتا ہے کہ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ
 لیکن اپنے پیروں کے متعلق مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے لکھا ہے :

نسبت پر خود تا اینکہ روزے حضرت	ایک دن حضرت حق جل و علانے
جل و علا دستِ راست ایشاں را	آپ کا دایہا تختہ خاص اپنے
بدستِ قدرت خاص خود گرفتہ و چیرے	دستِ قدرت میں پکڑ لیا اور کوئی چیز
را از امور قدسیہ کہ بس رفیع و بدیع	امور قدسیہ سے کہ نہایت رفیع اور
بود پیش روئے حضرت ایشاں کردہ	بدیع تھی، آپ کے سامنے کر کے
فرمود کہ نرا ایں چنین دادہ ام و چیز ہائے	فرمایا کہ ہم نے تجھے ایسی چیز عنایت
دیگر خواہم داد۔ لے	کی ہے اور اور چیزیں بھی عطا کرینگے۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی اسی گھڑنت کو موصوف کے اولین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر
 تھامیری نے سوانح احمدی میں بھی خوب مزے لے لے کر بیان کیا ہے۔ اُن کی یہ کتاب
 کراچی سے حیات سید احمد شہید کے نام سے شایع ہوئی ہے، جس کا مقدمہ پروفیسر
 محی الدین قادری نے لکھا ہے۔ مذکورہ بیان اُس کتاب مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۶۴ پر ملاحظہ فرمایا
 جاسکتا ہے۔ یہاں میں علمائے دین کہلانے والے اُن حضرات کی توجہ اس عبارت کی جانب
 مبذول کرانا چاہتا ہوں جو مولوی اسماعیل دہلوی کی محبت و عقیدت میں شرعی حدود کو توڑ کر بہت
 دُور جا چکے ہیں کہ یہ اللہ جل شانہ سے مصافحہ کرنا اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر لین دین کا
 شرف خلاصہ نوعِ انسانی یعنی حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام میں سے بھی کسی کو حاصل

لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی : صراطِ مستقیم ، ص ۱۷۵

لے صراطِ مستقیم اردو ، ص ۳۷۰

ہوا تھا، اگر جواب اثبات میں ہے تو اس کا ثبوت کیا ہے، بصورت دیگر انبیائے کرام علیہم السلام
بلکہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سید احمد صاحب کا درجہ کنوسی دیانت داری کے تحت
بلند و بالا دکھایا جا رہا ہے؟ کیا روزِ محشر کسی فرضی قصے کہانی کا نام ہے؟ کیا باری تعالیٰ جہاںِ آفرین
کی بارگاہ میں مرنے کے بعد ایک روز حاضری اور باز پرس نہ ہوگی؟

سہ پند ہا وادیم و حاصل شد فراغ
مَا عَلَيْنَا يَا أَخِي إِلَّا الْبَلَاغُ

قرآن کریم میں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ جب
ثُمَّ دَنَىٰ فَتَدَلَّىٰ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ اُکی وہ رفعت حاصل ہوئی جو کائنات میں
کسی فرد کو حاصل ہوئی نہ حاصل ہو سکتی ہے تو دہلوی صاحب کو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وسلم کی یہ انفرادیت ایک آنکھ نہ بھائی اور اپنے نیم مجذوب پیر، سید احمد صاحب کا
اللہ جل شانہ سے مصافحہ اور لین دین جا کر دایا۔ اُدھر جب محبوب پروردگار کو دینی کی گودی
میں لے کر فنا کے لنگر اٹھائے جا رہے تھے تو فَاَوْحَىٰ اِلَىٰ عَبْدِهٖ مَا اَوْحَىٰ کا عیدِ النظر
منصبِ مرحمت ہوا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے سوچا کہ ساری کائنات میں سے یہ منصب
اگرچہ کسی دوسرے کو حاصل نہیں ہوا لیکن پیرِ جی کے لیے یہ مقام ثابت نہ کیا تو افراتو فرات کی خوشین
لارڈ وارن ہیٹنگ سے ملی ہے وہ اور کس کام آئے گی؟ لہذا صاف لکھ دیا کہ:

مکالمہ و سامرہ بدست می آید۔ لے
ہم کلامی اور سرگوشی کے سر و پا
ہاتھ آتے ہیں۔ لے

دوسرے مقام پر حقیقی ہم کلامی کی موصوف نے یوں تصریح کی ہوئی ہے اور وہ بھی ایک آدھ بار
نہیں بلکہ بار بار:

گا ہے کلام حقیقی ہم ملیشود۔ لے
ادھ بھی کلام حقیقی بھی ہو جایا کرتا ہے۔ لے

لے محمد اسماعیل، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۱۳
لے محمد اسماعیل دہلوی، مولوی، صراطِ مستقیم، ص ۱۵۴
لے صراطِ مستقیم، اردو: ص ۳۶
لے صراطِ مستقیم، اردو: ص ۳۲۴

مالک مسلمانوں کے نزدیک یہ باتیں کسی غیر نبی کے لیے ثابت کرنا کفر ہیں جس پر اُمت محمدیہ کا اجماع ہے۔ چنانچہ ملتِ اسلامیہ کے اس اجماعی عقیدے کو محدث کبیر حضرت قاضی عیاض مالکی رحمہ اللہ علیہ نے یوں بیان کیا ہے :

فذلك كفر باجماع المسلمين	یہ باجماعِ مسلمین کفر ہے اور اسی
وكذلك من ادعى مجالسته	طرح جو اللہ تعالیٰ سے ہم نشینی، اُس
الله تعالى والعروج اليه	تک صعود و عروج اور اُس سے
ومكالته - ملخصاً	باتیں کرنے کا مدعی ہو (یہ باتیں بھی

اُسی طرح کفر ہیں)

اگر مولوی محمد اسماعیل دہلوی اس مقام پر اتنی سی وضاحت فرمانے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ ہر جی کا یہ مصافحہ ولین دین اور صعود و کلامِ حقیقی کے واقعات پروردگارِ عالم کی بارگاہ سے متعلق نہیں ہیں بلکہ یہ حالات تو اُن کے مجازی خداوندِ نعمت یعنی لارڈ وارن ہیسٹنگز کی سرکار میں پیش آیا کرتے تھے، تو اُن کی اس کرم نوازی سے پاک و ہند کے مسلمان اس دور کی ایک المناک برائے اسرارِ الجہن میں پھنسنے سے محفوظ رہ جاتے۔ لیکن بُرا ہو اس حرص و ہوا کا جو کیسے کیسے خداؤں کے افراد کو نہ صرف گمراہ کر دیتی ہے بلکہ گمراہ گری کی ایسی مشین بنا دیتی ہے جس میں مژدہ تک کتنے ہی گمراہ ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شَرِّ دُوْرِ اَنْفُسِنَا۔

تمام وہابیہ کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیائے کرام و اولیائے عظام کو غیب کا علم قطعاً نہیں ہوتا۔ دیوبندی حضرات تو سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ترجمانی ان لفظوں میں کر دیتے ہیں کہ واللہ لا ادري ما يفعل بي ولا بكم (الحديث) اور شیخ عبدالحق روایت کرتے ہیں کہ مجھ کو اللہ کے سچے کا علم نہیں اس عقیدہ کو اُن حضرات کے امام علی الاطلاق، یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنے مخصوص انداز میں نکیہ کلام سمیت یوں بیان کیا ہے :

”کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، بہت اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں“ ۱

لیکن اس ستم ظریفی کی داد کون دے کہ جو دروازے موصوف نے ادبیائے عظام بلکہ انبیائے کرام علیہم السلام تک کے لیے بند کر دیے تھے، جن کا کسی کے لیے کھولنا عقیدہ توحید سے بغاوت اور کفر و شرک تھا، وہی دروازے موصوف نے بڑی فیاضی اور دلیری سے پیر جی کے لیے اس طرح کھول کر دکھا دیے کہ گویا تمام خزانِ الہیہ کے وزیرِ خزانہ بلکہ مجاز و مختار ہی مولوی محمد اسلم دہلوی تھے۔ چنانچہ آنجناب نے اس بارے میں لکھا ہے:

برائے انکشاف حالاتِ سموات و

آسمانوں کے حالات کے انکشاف
ملاقات ارواح و ملائکہ و سیرِ جنت
و نار و اطلاع بر حقایق آں مقام
اور ملاقاتِ ارواح اور ملائکہ اور
بہشت و دوزخ کی سیر اور اُس
مقام کے حقایق پر اطلاع اور اُس
جگہ کے مکانوں کے دریافت اور
امرے از لوح محفوظ ذکر یا حی یا قیوم
است“ ۲

لوح محفوظ سے کسی امر کے انکشاف
کے لیے یا حی یا قیوم کا ذکر
کیا جاتا ہے۔ ۳

دوسرے مقام پر موصوف نے اپنی اس فیاضی کے دربابوں بہائے ہیں:

برائے کشف ارواح و ملائکہ و مقامات کشف ارواح و ملائکہ اور ان کے مقامات

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: تقوینہ الایمان، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، ص ۵۴

۲۔ محمد اسماعیل، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۱۲۴

۳۔ ایضاً: ص ۲۶۱

آہنا وسیرا مکثہ زمین و آسمان و
جنت و نار و اطلاع بر لوح محفوظ شغل
دورہ کند و باستغانت ہماں شغل ہر
مقامی کہ از زمین و آسمان و بہشت
و دوزخ خواہد متوجہ شدہ بسر آن مقام
احوال آنجا دریافت کند و باہل آن
مقام ملاقات سازد۔ لہ

اور زمین و آسمان اور جنت و نار کی
سیر اور لوح محفوظ پر مطلع ہونے کے لیے
دورے کا شغل کرے۔۔۔۔۔ پس
زمین و آسمان اور بہشت و دوزخ کے
جس مقام کی طرف متوجہ ہو، اسی شغل
کی مدد سے وہاں کی سیر کرے اور اُس
جگہ کے حالات دریافت کر کے وہاں
کے رہنے والوں سے ملاقات کرے۔

معلوم نہیں وہابی حضرات اپنے اس دین و ایمان پر کتنے نازاں ہوں گے کہ ایک جانب
”سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم“ تک میں لبطائے الہی ایسی کوئی طاقت تسلیم کرنے کے لیے
تقلاتیار نہیں، جس کے ذریعے وہ حضرات چھپی ہوئی چیزوں (غیب) کو معلوم کر سکیں، لیکن دوسری
جانب امام الوہاب صاحب نے اپنے تبقین کو شغل دورہ کا ایسا پیٹنٹ نسخہ بتا دیا جس کے ذریعے
جلد غیب، تمام چھپی ہوئی چیزوں کا خود بخود انکشاف ہوتا چلا جائے۔ اس کے ذریعے جس وہابی کا
جب دل چاہے جنت اور دوزخ میں گشت کر آتے، زمین و آسمان میں جس جگہ چاہے جا دھکے،
جب چاہے لوح محفوظ سے اپنا یا غیروں کا ریکارڈ نوٹ کر کے لے آئے۔ آخر یہ کیا شعبہ بازی
ہے؟ یہ کیسی کرشمہ کاری ہے؟

کیا انصاف اور دین و دیانت اسی کا نام ہے کہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کو
پس دیوار سے بے خبر بتایا جاتے اور اپنے ملاؤں پر چوہ طبق روشن دکھائے جائیں۔ اگر عقیدہ یہی
درست ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کو ایسی طاقت نہیں ملی تو وہابی ملاؤں کو پوری
کائنات کے مشاہدے کی طاقت کہاں سے مل جاتی ہے؟ کیا آپ حضرات کے نزدیک

دورے کا شغل حصول کمال میں کوئی نبوت سے بھی بلند و بالا مقام ہے؛ آخر یہ اپنے مُلاؤں کو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے کونسی دیانت داری کے تحت بڑھایا گیا ہے؛ بصورت دیگر اگر واقعی اُن مُلاؤں کا مقام یہی ہے تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا علم تو آپ حضرات کی تصریحات کے مطابق اُن مُلاؤں کے مقابلے پر نہ ہونے کے برابر ہی رہ جاتا ہے۔ کیا یہی ہے آپ کا رسول پر ایمان لانا؛ کیا اُمتی کا عقیدہ یہی ہونا چاہیے؛ کیا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اس درجہ شان گھٹانے والے اُمتی ہی کہلاتے اور جنت میں جانے کے واقعی حقدار رہ جاتے ہیں؛ افسوس! سید احمد صاحب کو نبی منوانے کی خاطر کیسے کیسے پُر اسرار طریقوں سے زمین ہموار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یعنی گند ذہن ہونا، لکھنے پڑھنے سے رغبت نہ رکھنا، کما کر کھانے سے عاری ہونا، حقوق العباد سے بے اعتنائی برتنا، علوم شرعیہ سے کورے رہ کر جینا، تصوف کے ابجد سے بھی ناواقف رہنا، یہ تمام امور ایسے ہیں جو اُن کی ذات میں جمع ہو کر بزرگی کا ساز و سامان قرار پا جاتے ہیں۔ اگرچہ دوسروں کے حق میں اُن کا عیب ہونا سب کے نزدیک مسئلہ ہے، لیکن سید احمد صاحب کی ذات میں اُن باتوں کا پایا جانا معلوم نہیں کس طرح ایسی ولایت کی سند ہے جو منصبِ نبوت کو بھی شرمناک ہے۔ آخر یہ شعبہ بازی کیا ہے کہ:۔

تمھاری زلفت میں آئی تو حُسن کہلائی

وہی تیرگی جو مرے نامہ سیاہ میں ہے

جب آپ اپنا نظریہ یا کوئی مسئلہ بیان کریں تو اُس کے دلائل کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن خوابوں کا پورا باب ایسا ہے جس کا ثبوت کوئی نہیں ہوتا، ماسوائے اس کے کہ سچے خواب کا کتاب و سنت کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ غلط کار لوگوں نے جب بھی اپنی بزرگی کا جال بچھانا چاہا تو ہمیشہ فرضی خوابوں اور جھوٹے الہاموں کا سہارا ہی حاصل کیا، کیونکہ اُن کا قرآن و حدیث سے ثبوت پیش نہیں کرنا پڑتا۔ کوئی نہیں پوچھ سکتا کہ قرآن کریم میں دکھا دیجیے کہ واقعی آپ نے یہ خواب دیکھا ہے؛ نیز یہ کوئی نہیں کہے گا کہ واقعی آپ کو یہ الہام ہوا ہے اس کا حدیث سے ثبوت پیش کیجیے۔ اسی لیے لصوصِ دین کی ساری بزرگی کا دار و مدار جھوٹے خوابوں اور فرضی الہاموں ہی کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ اب ہم سید احمد صاحب کی مخصوص بزرگی کے بارے

میں چنایا ہے ہی خواب پیش کرنے کی جبارت کر کے انصاف پسند خدائے کو دعوت غور و فکر دیتے ہیں۔
موصوف کے اولین سوانح نگار مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا ہے :

جب تہائی رات باقی رہ گئی تو اُس وقت دو آدمیوں نے آکر آپ کا ہاتھ پکڑ کر جگایا۔ آپ نے خواب ہی میں دیکھا کہ آپ کے دانے طرف رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور بائیں طرف حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیٹھے ہیں اور آپ سے فرما رہے ہیں کہ اے احمد ! جلد اٹھ اور غسل کر سید صاحب ان دونوں بزرگوں کو دیکھ کر نہایت شرم کے ساتھ دوڑے ہوئے حوض مسجد کی طرف چلے گئے۔ اس کے باوجود کہ موسم سرما کی وجہ سے حوض کا پانی اُس وقت تک ہو رہا تھا مگر اُس سرد پانی سے آپ غسل کرنے لگے اور اُٹنا غسل میں حضرت کو اور حضرت ابوبکرؓ کو اُسی جگہ پر بیٹھا ہوا دیکھ رہے تھے۔ آپ بہت جلد غسل سے فارغ ہو کر اُن حضرات کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا کہ اے فرزند ! آج شبتہ ہے۔ تو یاد الہی میں مشغول ہو جا اور دعا و مناجات کرتا رہ۔ اس ارشاد اور تلقین کے بعد دونوں حضرات تشریف لے گئے۔

اُس رات سید احمد صاحب نے کیا دیکھا : یہ بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے :

”صاحبِ مخزن لکھتے ہیں کہ سید صاحب بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اُس رات میں بفضلِ الہی واردات عجیب اور واردات غریب میرے دیکھنے میں آئے کہ تمامی درخت اور پتھر وغیرہ اشیا دنیا کی سجدے میں سر رکھے ہوئے تجمید و تھلیل و تسبیح میں مصروف تھے۔ مگر طر ف یہ کہ ان ظاہری آنکھوں سے ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مگر چشمِ قلب سے سجدے میں پڑی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اُس وقت میں بھی سجدے میں سر رکھ کر شکر الہی کا بجالایا اور دعا و

مناجات مناسب وقت کرنا شروع کیا۔ اُس وقت فنا گئی اور استغراق کامل
مجھے حاصل ہوا اور اُسی حالت میں صبح تک سجدے میں پڑا رہا۔ ۱

قارئین کرام! ذرا یہ تصریح بد نظر رہے کہ سید احمد صاحب کی باری آئی تو وہابی علماء و
مؤرخ بڑی خوشی سے چشمِ قلب کا وجود بھی تسلیم کر لیتے ہیں اور سید احمد صاحب کے لیے چشمِ قلب
ایسی بنیاد تسلیم کی ہے کہ ایک ہی وقت میں تمام دنیا کی اشیاء اور جملہ اشجار و اجار کارات ہر
معاینہ فرماتی رہی کہ یہ تمام چیزیں سجدے میں پڑی ہوئی ہیں اور موصوف کے لیے بڑی مسرت کے
ساتھ ایسے کان بھی تسلیم کر لیے گئے جو دنیا کی تمام چیزوں کی تحمید و تحلیل و تسبیح کو سنتے رہے اور وہ
بھی ایسی حالت میں جبکہ اُن کی آواز بھی نہیں نکل رہی۔ گھر کی بات آئی تو مشرق و مغرب اور شمال
و جنوب تک دوری نزدیک کی کا سوال اُٹھ گیا۔ دیکھنا اور سُنانا سب امر واقعہ ہو کر کمال بن گیا۔ لیکن
اس ستم ظریفی کی کوئی حد بھی ہے کہ جو قلم سید احمد صاحب ایندھ کمپنی کے لیے ایسے علوم و اختیارات
بڑی فیاضی کے ساتھ تقسیم کرتے نظر آئے ہیں اور بڑے فخر کے ساتھ اُن کی تشہیر کرتے ہیں لیکن
جب غیروں کا تذکرہ آئے یعنی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے بارے میں بکھنا پڑے تو یہی
قلم بکھر خشک ہو جاتے ہیں۔ اُن سے فیاضی کی جگہ اس طرح بخیلی ٹپکنے لگتی ہے کہ دین و دیانت کا
دن و ماڑے خون ہو کر رہ جاتا ہے۔ عقل و خرد اپنا سر پیٹ کر رہ جاتی ہے۔ اس بخیلی کا جائزہ
لینے کی خاطر سارے وہابی پیرے کے ناخدا مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیے:

”ہر چیز کی خبر برابر وقت رکھنی، دُور ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کھلی، اندھیرے
میں ہو یا آجالے میں، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا
سمندر کی نہر میں، یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں۔“ ۲

یہ موصوف نے اپنا عقیدہ اور قاعدہ کلیہ بیان کر دیا ہے جو سید احمد صاحب پر قطعاً لاگو ہوتا
نظر نہیں آ رہا۔ اب اس کلیہ کی روشنی میں تصویر کا دُور سرائخ یعنی انبیائے کرام علیہم السلام کا

ذکرِ خیر میں، وہ لکھتے ہیں:

”غیب کا دریافت کرنا اپنے اختیار میں ہو، جب چاہیے کر لیجیے، یہ اللہ صاحب ہی کی شان ہے، کسی نبی اور ولی کو، جن اور فرشتے کو، پیر اور شہید کو، امام اور امام زادہ کو، مجتہد اور پری کو اللہ صاحب نے یہ طاقت نہیں بخشی کہ جب وہ چاہیں غیب کی بات معلوم کر لیں۔“ لے

قارئینِ کرام! ابھی آپ نے صراطِ مستقیم کتاب سے مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی وہ عبارتیںلاحظہ فرمائی ہیں جن میں اُنھوں نے اپنے پیر جی کے بتائے ہوئے شغلِ دورہ کا ذکر کیا اور اُس کا اثر یہ بتایا تھا کہ اس شغل کی مدد سے جب چاہے کوئی بھی وہابی زمین و آسمان کی جس جگہ کے چاہے حالات معلوم کر سکتا ہے۔ جنت و دوزخ کی سیر میسر آ سکتی ہے، فرشتوں اور روحوں سے ملاقات کی جا سکتی ہے، لوحِ محفوظ سے جس امر کو دریافت کرنا مطلوب ہو اُس کا بچشمِ خود مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیا ستمِ ظریفی اور کیسا عقیدہ ہے کہ علم کے جو دروازے انبیائے کرام اور اولیائے عظام کے لیے قطعاً بند کیے ہوئے تھے اور اُنھیں خدا کے لیے خاص بتایا ہے، وہی دروازے ہر وہابی کے لیے چوڑے کھولے ہوئے ہیں۔ آخر یہ دین و مذہب کو باز پُچھ اطفال بنانے کے سوا اور کیا ہے؟ اس ستمِ ظریفی کی انتہا تو یہ ہے کہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے لیے علم کا یہ دروازہ قطعاً پندہ بتایا گیا ہے۔ وہاں بھی چشمِ قلب کا کوئی تصور تک نہیں آتا جو پیر جی کے لیے مسلم ہے۔ چنانچہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے صاف صاف لکھ دیا،

”چنانچہ حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ بعضی بات دریافت کرنے کی خواہش ہوئی اور وہ بات معلوم نہ ہوئی۔ پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہوا تو ایک آن میں بتا دی۔ چنانچہ حضرت سلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں منانتوں نے حضرت عائشہؓ پر تہمت کی اور حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بڑا رنج ہوا کئی دن تک بہت تحقیق کیا پر کچھ حقیقت معلوم نہ ہوئی اور بہت فکر و غم میں رہے۔“

پھر جب اللہ صاحب کا ارادہ ہوا تو بتا دیا کہ منافق جھوٹے ہیں اور عایشہؓ پاک ہیں۔
 قطع نظر اس کے کہ امام الوہاب نے منافقین مدینہ کی ہمنوائی کرتے ہوئے واقعہ کو قطعاً غلط لکھ
 دیا ہے، ہم یہاں اپنے موضوع کی مناسبت کے لحاظ سے یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ
 تعالیٰ علیہ وسلم بھی ان زلزلے موحدوں کی نظر میں کسی بات کو معلوم نہیں کر سکتے تھے، بجز وحی کے،
 کیونکہ نہ ان کے پاس سید احمد صاحب کی طرح چشم قلب تھی اور نہ انہیں وہابی کشتی کے ہر سوار
 کی طرح دورے کا شغل آتا تھا، جس کی مدد سے عرش و فرش اور جنت و دوزخ تک کی خبریں معلوم
 کر لیا کرتے یا لوح محفوظ سے پڑھ کر معلوم کر لیا کرتے۔ معلوم نہیں اس کے باوجود نبی آخر الزماں
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو زبانی طور پر کس طرح ساری کائنات کا سردار اور بعد از خدا بزرگ توفیق
 مختصر کا مصداق ٹھہراتے ہیں جبکہ وہابیوں کا ایک ملا جی بھی ان کے نزدیک علم و اختیار میں
 سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بڑھا ہوا ہے اور سید احمد صاحب کی شان کا تو سننا ہی
 کیا؟ وہابی حضرات کی تصریحات کے مطابق تو علم و اختیار کی رو سے سید صاحب ہی بعد از
 خدا بزرگ نظر آنے لگ جاتے ہیں۔ اسی ستم ظریفی کی مزید حد کرتے ہوئے موصوف نے یہ بھی
 لکھا ہے:

”کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلان کے دل میں کیا ہے یا فلان کی شادی کب
 ہوگی یا فلان درخت کے کتنے پتے ہیں یا آسمان میں کتنے تارے ہیں تو اس کے
 جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ و رسول ہی جانے۔ کیونکہ غیب کی بات اللہ ہی جانتا ہے
 رسول کو کیا خبر؟“

ادھر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کسی ایک درخت کے پتوں کی تعداد بتانے سے اور
 آسمان کے تاروں کا شمار جاننے سے بے خبر بنایا جا رہا ہے کہ معاملہ غیروں کا ہے لیکن ادھر
 سید احمد صاحب کو روئے زمین کی تمام اشیاء، دنیا کے سارے اشجار و اجار سے خبردار

اور اُن کی تسبیح و تہلیل وغیرہ کا سامع بتایا گیا ہے، کیونکہ یہ معاملہ اپنوں کا ہے۔ کیا وہابی حضرات اپنے امام علی الاعلاق کے بتائے ہوئے اس نظریہ پر کبھی نظر ثانی کی زحمت گوارا کریں گے کہ ایک درخت کے پتے جانے کو غیب دانی شمار کر کے دہلوی صاحب اُن کی گنتی سے سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بے خبر ٹھہراتے اور اُن کے لیے اتنا سا علم ثابت کرنا بھی توحید کی جان پر چڑھری بتاتے ہیں، لیکن سید احمد صاحب کو دنیا و مافیہا سے خبردار ٹھہرانا کیوں شرک نہ ٹھہرا؟ اس طرح وہابی حضرات کی نظر میں سید احمد صاحب کی علمیت اور وقعت کم رہی یا زیادہ؟

ہو سکتا ہے کہ بعض وہابی مناظر یہ کہنے لگیں کہ دہلوی صاحب اُس علم کو شرک ٹھہرا رہے ہیں جو ہمیشہ حاصل رہے جبکہ سید صاحب کا معاملہ صرف ایک رات کی بات ہے۔ تو ایسے حضرات کے اس موقف کا مطلب یہی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لیے کسی کو اپنا شریک نہیں بتاتا ماں ایک رات کے لیے بنا لیا کرتا ہے۔ نعوذ باللہ من ذلک۔

قارئین کرام! آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ سید احمد صاحب کو کیسی رازداری اور غیر محسوس طریقے پر علم مقربین بارگاہ الہیہ بکرمی الانبیاء سیدنا وشفیعنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی زیادہ علوم و اختیارات والا دکھایا جا رہا ہے۔ اس کزوت سے نہ ان حضرات کے عقیدہ توحید سافق آتا ہے اور نہ اُمتی ہونے میں۔ بہر حال ذکر تھا سید صاحب کا کہ وہ رات بھر کائنات کی تمام اشیاء کو اُن کی باطنی حالت میں چشم قلب سے دیکھتے رہے اور جس خاموش زبان میں بھی تمام اشیاء تسبیح و تہلیل بیان کر رہی تھیں اُسے سید صاحب رات بھر سماعت فرماتے رہے۔ اب اسی ڈرامے کا اگلا پارٹ بھی ملاحظہ ہو:

”جب بعد اوائے اشراق بخدمت مولانا صاحب (شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ) کے حاضر ہو کر سلام علیک کہا تو بہت مسرور اور محفوظ ہو کر آپ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آپ آج کی شب اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ پس اُس روز کے بعد سے آنا فنا آثار ترقیات و علودرجات و معاملات عجیب و واردات غریب آپ پر ظاہر ہونے لگیں۔“

جائے تعجب ہے کہ جو دروازے انبیاء کرام علیہم السلام تک کے لیے دہائی حضرات کے امام
 علی الاطلاق نے بند بنائے ہیں تو وہی دروازے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے لیے
 انھوں نے کس طرح کھلا ہوا تسلیم کر لیا؟ آخر یہ عقدہ کوئی تو حل کرتا کہ حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمہ
 کو کیسے معلوم ہوا کہ سید احمد صاحب آج اپنی مراد کو پہنچ گئے ہیں؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان
 حضرات نے اپنی ہی اصطلاح کے مطابق عَلَیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ بھی مان لیا اور اس کے
 باوجود نہ صرف شرک کی زد سے بچے رہے بلکہ توحید کے ٹھیکیدار بھی بن گئے۔ اب اسی المناک سلسلے
 کا ایک ایسا خواب بھی ملاحظہ فرمائیے جو مسلمانوں کے قلب و فکر کو چھلنی کر دیتا ہے۔ لکھا ہے،
 ”اس معاملہ عجیبہ کے بعد صاحب مخزن نے بحوالہ صراطِ مستقیم لکھا ہے کہ ایک
 خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین چھوہارے اپنے دست مبارک سے
 سید صاحب کے منہ میں ایک دوسرے کے بعد رکھ کر بہت پیار اور محبت سے
 کھلاتے اور جب آپ بیدار ہوتے تو ان چھوہاروں کی شیرینی آپ کے ظاہر و
 باطن سے ہو جاتا تھی۔ اس کے بعد ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور جناب سیدہ
 فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہما کو سید صاحب نے خواب میں دیکھا۔ اُس رات
 کو حضرت علیؑ نے اپنے دست مبارک سے آپ کو نہلایا اور حضرت فاطمہؑ نے لیک
 لباس اپنے ہاتھ سے آپ کو پہنایا۔ ان واقعات کے بعد کمالاتِ طریقہ نبوت
 کے غایت آب و تاب کے ساتھ آپ پر جلوہ گر ہونے لگے۔“

احقر کم از کم یہ نہیں سمجھ سکا کہ کسی چالیس سالہ جیتے جاگتے آدمی کو نہلانے کا مطلب کیا؟ کاش
 مولوی محمد اسماعیل دہلوی کا قلم اس خواب کو گھڑ کر سپردِ قلم کرنے سے پہلے خشک ہو گیا ہوتا۔
 خاتونِ جنت رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سید احمد صاحب کو اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے، خدا
 نہ کرے کہ کوئی دہائی شرم و حیا کو اس درجہ گھول کر پی گئے ہوں کہ انھیں ان لفظوں کے صریح
 گالی تسلیم کر لینے میں کسی قسم کا تامل ہو۔ تامل کرنے والے سے، خواہ وہ بڑے سے بڑے

علامہ زماں ہو، کہا جاسکتا ہے کہ حضور والا! آج رات جب میں غسل کر کے فارغ ہوا تو آنجناب کی والدہ محترمہ یا حضور والا کی نگیم صاحبہ یا حضرت جی کی صاحبزادی صاحبہ نے مجھے اپنے ہاتھ سے پرے پہنانے تھے۔ اس کے بعد دیکھنا کہ علامہ صاحب کیا جواب دیتے ہیں۔ مارے غصے سے آپ سے باہر ہوتے ہیں یا نہیں؟ کیسے کیسے سانپ کی طرح بل کھائیں گے۔ آخر غصہ کیوں نہ آئے کہ ان کی عزت پر حملہ کیا ہے۔ لیکن یہی بات جب امام حسن و امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی والدہ محترمہ، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زوجہ مطہرہ اور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی لاڈلی صاحبزادی بلکہ جگر کے ٹکڑے کے بے لکھی جائے تو کیا یہ کھلی گالی نہیں ہے؟

۷ میں اس عارفانہ تجاہل کے صدقے

ہر اک دل کو چھیدا مراد دل سمجھ کے

جب سید احمد صاحب بیت کا کاروبار شروع کرتے ہیں تو براہ راست اپنے پروردگار سے اس کی مرضی پوچھتے ہیں اور ادھر سے جواب بھی مرحمت فرما دیا جاتا ہے۔ اولین سوانح نگار کے لفظوں میں یہ واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے اور مفہوم و معانی کے سمندر میں تقویت الایمان سامنے رکھ کر غلط لگایا جاتے۔ وہ بڑے فخر و غور کے ساتھ اپنے کفیل و شفیع المذنبین سید احمد صاحب کا رویوں کرتے ہیں:

”پس اس معاملہ اخذ بیعت میں تیری کیا مرضی ہے؟ جناب باری سے حکم

ہوا کہ جو کوئی تیرے ہاتھ پر بیعت کرے گا، خواہ وہ لاکھوں ہوں، ہر ایک کی

کفایت کروں گا“ لے

بہر حال یہ تو سید احمد صاحب کی اس شفیع المذنبین کا تذکرہ تھا جو وہابی حضرات کے نزدیک ہر طرح مسلمہ ہے اگرچہ ان کے نزدیک سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی یہ منصب حاصل نہیں کیونکہ یہاں بغیر استدعا کیے تمام مریدان سید صاحب کی مغفرت کا وعدہ ہو گیا۔ اسی مسئلے میں دوسرے مقام پر یوں لکھا ہے:

”قصہ مجاہدین میں قیام کے دوران وہاں ایک عجیب واردات ظہور میں آئی۔ ایک روز حضرت سید صاحب بعد نماز فجر کے مراقب بیٹھے رہے..... حمد و ثنا کے بعد آپ سجدے میں گر پڑے اور سجدے سے سر اٹھا کر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ آج ہاتھ غیب نے مجھے بشارت دی ہے کہ اس وقت تجھ کو اور تیرے کل ہمراہیوں کو میں نے بخش دیا اور اس ندا کے بعد ایک ہاتھ غیب سے ظاہر ہوا۔ اُس ہاتھ نے اس مسجد کو جنت الماویٰ میں لے جا کر داخل کر دیا۔ اُس وقت آپ نے فرمایا کہ اس مسجد میں جس قدر آدمی موجود ہیں ان سب کے نام ایک کاغذ پر لکھ لو اور ان کو اصحاب بدر کی طرح بارگاہ ایزدی کے مقبول و منظور تصور کرو۔“

مہذب مسلمانوں کو یہ یاد کرانے کی لگاتار کوشش کی جائے کہ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو اپنی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بھی کام نہیں آئیں گے۔ آپ اللہ کے یہاں اُن کی فرماری اٹھانے، بخشش کروانے سے بھی جواب دے بیٹھے تھے لیکن سید احمد صاحب کے ساتھ لگنے سے بغیر کسی عرض معروض ہی کے مغفرت کی بشارت مل جاتی ہے تو ادھر جانے کے بجائے کیوں نہ ادھر آئیں گے کہ دنیا ہی میں بخشش سے نواز دیے جائیں۔ کیا تالیفِ قلوب کے اس جال اور شعبہ بازی کے کمال کا کوئی جواب ہے، مسجد توجنت الماویٰ میں داخل ہو گئی لیکن بیٹھے بٹھائے سید صاحب کے ہمراہی اصحاب بدر کی طرح بارگاہ ایزدی کے مقبول و منظور کی طرح ہو گئے جبکہ یہ خصوصیت پوری اُمتِ محمدیہ میں سے دیگر صحابہ کرام تک کو حاصل نہ ہو سکی؟ آخر یہ سید احمد صاحب کو بعد از خدا بزرگ منوانے کا منصوبہ تھا یا اور کچھ؟ مزید لکھا ہے:

”اس بستی (فتحپور) میں جو نماز عصر کے بعد آپ مراقب بیٹھے تو نمازِ مغرب کے قریب سر اٹھا کر فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ آج اُس رب العزت نے تمام اولیاء مقبولین سلف سے مجھ کو ممتاز کر کے ارشاد فرمایا کہ جو کوئی تیرے

ہاتھ پر بیعت کرے گا اُس کو تمام مکروہات دنیا و آخرت سے محفوظ رکھ کر اپنی رضا مندی اور انعام سے سرفراز کروں گا (اس بشارت میں آپ کے خلیفوں اور خلیفوں کے خلیفوں کی بیعت بھی شامل ہے)۔ اُس وقت میں نے عرض کیا کہ اے کریم و رحیم! میرے آبا و اجداد کو بھی میری بیعت سے مشرف کر، تاکہ وہ بھی اس وعدہ مغفرت میں شامل ہو جائیں۔ کئی روز اس آخری دعا کی قبولیت میں توقف رہا۔ اس عرصہ میں سید صاحبِ وطن میں واپس پہنچ گئے۔ وطن میں پہنچ کر اس دعا کی قبولیت کے واسطے آپ بہت گڑا گڑائے۔ آخر اُس کریم و رحیم نے اپنے فضلِ عمیم سے اس دعا کو قبول فرمایا اور حکم دیا کہ سید محمد (مولف مخزن احمدی) کو اپنے آبا و اجداد کی طرف سے وکیل کر کے اُن کی طرف سے ان سے بیعت لے لے۔

اس عبارت میں بھی سید احمد صاحب کو نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اُنچا دکھانے کا جذبہ ہی کا فرمانظر آ رہا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے والدین کریمین کو زندہ کر کے اپنی اُمت میں شامل فرمایا تھا تو سید صاحب نے سارے آبا و اجداد کو اپنی بیعت سے مشرف کر کے وعدہ مغفرت میں شامل کر دیا۔ بات کی ہوا تو باندھ دی لیکن سرورِ کون و مکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تو اپنے والدین کریمین کو دوبارہ زندہ کر کے مشرف باسلام کیا تھا۔ یہ ایسا حذل نظر آیا ہماں زبانی جمع خرچ سے کام چل نہیں سکتا تھا، لہذا مؤلف مخزن احمدی کو وکیل قرار دینے کی راہ نکال لی۔ رہے سید صاحب کے مرید تو وہ سلسلہ در سلسلہ اور نسلوں کی نسلیں بخشتی جا رہی تھیں۔ تھوک کے حساب سے مغفرت لٹ رہی تھی جبکہ سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کا متی بننے سے پرچون کے حسابوں بھی وعدہ مغفرت کا دیا بی حضرت قحط بتاتے رہتے ہیں۔ امام الوہابینے خود لکھا ہے :

”اس آیت سے معلوم ہوا کہ تمام آسمان و زمین میں کوئی کسی کا ایسا سفارشی نہیں کہ اُس کو مانے اور اُس کو پکاریے تو کچھ فائدہ یا نقصان پہنچے۔“

لے محمد جعفر تھانیسری، مولوی حیات سید احمد شہید، ص ۱۶۶

لے محمد اسماعیل دہلوی، تقویۃ الایمان، ص ۳۱

انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا ماننا تو نفع نقصان سے خالی تھا یا لیکن سید احمد صاحب کے ساتھ لگنا کتنا فائدہ مند کہ فوراً وعدہ مغفرت و اصحاب بدر کا درجہ حاصل کیا۔ کیا یہ مسلمانوں کا رُخ مقررین بارگاہ الہیہ کی طرف سے اپنے برطانوی امیر المومنین کی جانب پھرنے کا طاغوتی منصوبہ نہیں تھا؟ دہلوی صاحب نے مزید لکھا ہے :-

”اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی کسی کو اپنا حمایتی سمجھے گو یہی جان کر کہ اس کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل ہوتی ہے، سو وہ بھی مشرک ہے اور جھوٹا اور اللہ کا ناشکر“ ۱

اگر بندگانِ خدا کسی کی قطعاً حمایت نہیں کر سکتے تو سید احمد صاحب جو اپنے ساتھیوں کی حمایت پر قدم پر کرتے اور انھیں جنت و مغفرت کی بشارتیں سناتے رہے انھیں کیوں دردِ لگو شمار نہ کیا؟ اگر بزرگوں کے سبب سے خدا کی نزدیکی حاصل نہیں ہوتی تو سید احمد صاحب کے پیچھے آنا بڑا لاؤ لشکر کیا سیر و تفریح کرنے کے لیے اکٹھا ہوا تھا اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے پیچھے وہاں بیانِ پاک و ہند کس خوشی میں لگے ہوئے ہیں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے :-

”اس آیت سے معلوم ہوا کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت کے کافر بھی اس بات کے قائل تھے کہ کوئی اللہ کے برابر نہیں اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر اپنے بتوں کو اُس کی جناب میں وکیل سمجھ کر مانتے تھے۔ اسی سے کافر ہو گئے۔ سوا ب بھی جو کوئی کسی مخلوق کا عالم میں تصرف ثابت کرے اور اپنا وکیل ہی سمجھ کر اُس کو مانے سو اُس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ گو کہ اللہ کے برابر نہ سمجھے اور اُس کے مقابل کی طاقت اُس کو ثابت نہ کرے“ ۲

قطع نظر اس کے کہ بتوں کو اللہ کی بارگاہ میں اپنا وکیل سمجھنے کے باعث مشرکین مکہ کافر ہوئے تھے یا اس کی اور بھی بے شمار وجوہات تھیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ انبیائے کرام اور

ادیانے عظام کو تصرف ثابت کرنا اور وکیل ماننا شرک سہی لیکن امام الوہاب بیہ کی اس خانہ ساز
شریعت کے احکام کا سید احمد صاحب پر کیوں اطلاق نہیں ہوتا؟ سید صاحب کے لیے تصرف
قدم قدم پر ثابت کیا جا رہا ہے، انھیں وکیل اور حمایتی مانا جا رہا ہے لیکن کوئی وہابی یہ نہیں کہتا
کہ ہم شرک کے سمندر میں غوطے لگا رہے ہیں۔ انبیاء و اولیاء کے خلاف محاذ ہنار سید احمد صاحب
ایہ کہہ پکڑی کہ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ بنا رہے ہیں۔ ذرا مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی یہ البیسی تصریح
سچی ملاحظہ ہو:

”اللہ صاحب نے اپنے پیغمبر کو حکم کیا کہ لوگوں کو سنا دیوں کہ میں تمہارے نفع و
نقصان کا کچھ مانگ نہیں اور تم جو مجھ پر ایمان لائے اور میری امت میں داخل ہوئے
سو اس پر مغرور ہو کر حد سے مت بڑھنا کہ ہمارا پایہ بڑا مضبوط ہے اور ہمارا وکیل
زبردست اور ہمارا شفیع بڑا محبوب ہے۔ ہم جو چاہیں صو کریں۔ وہ ہم کو اللہ
سے بچالے گا۔ کیونکہ یہ بات محض غلط ہے، اس واسطے کہ میں آپ ہی ڈرتا
ہوں اور اللہ سے ورے اپنا کوئی بچاؤ نہیں جانتا، سو دوسروں کو کیا بچا سکوں؟
چلے یونہی سہی! گو یا پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تو خود ہی ڈرتے رہے اور انھیں بچاؤ
کے لیے کوئی جگہ نہ مل سکی لہذا دوسرے کا بچاؤ ان حالات میں وہ کر بھی کیا سکیں گے؟ لیکن
نیرے آپ کے سید احمد صاحب تو نہ صرف دنیا میں ہی مغفرت سے نوازے گئے بلکہ ان کے
ساتھیوں کو بخش دیا گیا تھا بلکہ جو ان کے خلفاء اور خلفاء کے خلفاء سے بیعت ہو جائے وہ بھی
بخشا گیا تھا۔ ان حالات میں صاف نظر آ رہا ہے کہ سید احمد صاحب پر اللہ تعالیٰ کی جتنی
نظر کرم ہے اتنی تو اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی نہیں۔ ان حالات میں وہابی
حضرات کیا ہمیں بھی یہ بتانے کی رحمت گوارا فرمائیں گے کہ انھوں نے محبوبیت میں نبی کریم
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سید احمد صاحب کو بڑھا کر اپنے برطانوی امیر المومنین کو مقام
ربوبیت پر بٹھایا تھا یا سید احمد صاحب سے علوم و اختیارات میں سردار کون و مکاں صلی اللہ

تعالیٰ علیہ وسلم کو کم بتا کر حبیب پروردگار، شافع روز شمار کے خلاف پراسرار محاذ بنایا ہوا ہے؛ کیونکہ جن کاموں کی مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے زبان رسالت سے نفی کر دائی ہے ان سارے کاموں کو سرانجام دیتے ہوئے سید احمد صاحب کو دکھایا جا رہا ہے۔ آخر یہ کیسا دین ہے؛ یہ کیا تماشا ہے؟

خیر یہ تو باتیں تھیں سید احمد صاحب کی بین الاقوامی ولایت کی، جس کے باعث وہ کار ساز، مشکل کشا، شفیع المذنبین اور کیا کچھ نظر نہیں آتے تھے۔ اب سید صاحب کے کسب فیض و حصول منصب کے بارے میں جہالت آمیز و مضحکہ خیز بیان مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

”اس کے بعد ایک روز ارواح مقدسہ جناب غوث الثقلین سید عبدالقادر گیلانیؒ و حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ متوجہ حال سید صاحب ہوئیں اور قریب ایک ماہ تک کسی قدر تنازعہ ان دونوں رُوحوں کے درمیان رہا۔ ہر ایک رُوح ان دونوں رُوحوں میں سے سید صاحب کو اپنی طرف جذب کرنا چاہتی تھی۔ آخر بعد انقضائے ایام تنازعہ کے دونوں رُوحوں کی بالاشتراك جذب کرنے پر صلح ہو گئی۔ اب دونوں ارواح مقدسہ نے بالاشتراك آپ پر جلوہ گر ہو کر ایک پتر تک بنفس نفیس مجتوجہ قوی اور تاثیر زور آور فرمائی کہ اُس ایک پتر میں نسبت ان دونوں خاندانوں کی آپ کو حاصل ہو گئی۔“

اسی قسم کا ایک مضحکہ خیز بیان اور پیش کیا جاتا ہے، جس سے ان حضرات کی سلوک و تصوف سے ناواقفیت اظہار من الشمس ہو جاتی ہے اور صاحب فہم و فراست پر ان کی دروغ گوئی اور کذب بیانی پورے طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ لیجیے وہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

”اس کے بعد ایک روز سید صاحبؒ حضرت خواجہ خواجگان خواجہ بختیار کاکی قدس سرہ کے مرقہ مبارک پر مراقبہ میں بیٹھے تھے اور اُس وقت رُوح پُر فتوح

خواجہ صاحب مرحوم سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اُس مقدس روح نے آپ کے اوپر
توجہ فرمائی۔ اُسی وقت نسبت خاندانِ چشتیہ کی بھی حاصل ہو گئی اور اس کے بعد
نسبت مجددیہ، شافعیہ وغیرہ غرض کل مشہور خاندانوں کی نسبت خود بخود آپ کو
حاصل ہو گئی۔

بعد تکمیل ان دونوں سلوکوں کے ایک روز عالمِ مراقبہ میں آپ کی
ملاقات روحِ پُرفوتوح تجتبیار کا کی رحمتہ اللہ علیہ سے ہوئی۔ اُس وقت سید صاحب نے
دیکھا کہ ایک پتر نور مقدس کا خواجہ صاحب ممدوح کے سر پر سایہ کر رہا ہے۔ پھر اُسی
وقت یہ بھی آپ کو دکھائی دیا کہ آپ کے سر پر دو پتر نور مقدس کے سایہ کر رہے ہیں۔
چونکہ سید صاحب اپنے کو کترینِ مریدانِ خواجہ سے شمار کرتے تھے۔ یہ معاملہ معکوس
دیکھ کر آپ کو بہت شرم آئی اور فوراً مراقبہ سے باہر آ کر لڑزاں و زرساں مولانا شاہ
عبد العزیز صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نہایت خوف اور شرمندگی سے اس
کو مولانا صاحب کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت مولانا صاحب نے نہایت فرحان
و خنداں اس کے جواب میں فرمایا، اے فرزند! جائے تعجب نہیں ہے، ولایتِ
نبوت کے ایسے ہی آثار ہوتے ہیں۔ اے عزیز! ابھی تو اس کی ابتدا ہے
اور مشتے از خروار اور ایک قطرہ از بحرِ ناپیدا کنار تم پر ظاہر ہوا ہے۔ آئندہ اس
سے بڑھ چڑھ کر ہزار ہا اس قسم کی باتیں تم پر ظاہر ہوا کریں گی۔

ولایتِ نبوت تو اُسے کہتے ہیں جو نبی کو اعلانِ نبوت سے قبل حاصل ہوا کرتی ہے لیکن سید صاحب
کے لیے حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی اس کا اعلان کروانا ظاہر کر رہا ہے
کہ اندرونِ خانہ اعلانِ نبوت کی تیاریاں ہو رہی ہوں گی جس کی خاطر وحی و عصمت کے دعوے
کیے جا رہے تھے اور وقت آنے پر سید صاحب کی مہرِ اسمُہُ اَحْمَدُ مقرر ہوئی تھی۔

تمام باتوں سے قطع نظر ان مذکورہ بالا دونوں بیانات کو پھر ملاحظہ فرمائیے۔ پہلے واقعے

میں حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق غوث الثقلین کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی جنوں اور انسانوں کی فریاد کو پہنچنے والے۔ کیا یہ تقویۃ الایمانی دھرم میں ٹھیٹھ شرک و کفر تو نہیں؟ یا تقویۃ الایمان کے ایٹمی ٹکڑے صرف مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کی غرض سے گھڑے گئے تھے؟ یہ بزرگوں میں جھگڑا دکھانا، بیٹھے بٹھائے نسبتوں کا حاصل ہو جانا، رُتبے میں سلطان الہند خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ سے اونچے بننا، کیا اس میں حقیقت کا کسی عاقل کو ادنیٰ سا شبہ بھی نظر آتا ہے؟ اب وصایا وزیری کے حوالے سے یہ واقعہ بھی ملاحظہ ہو:

”ایک روز اپنے حجرے میں لیٹے ہوئے سید صاحب کے خیال مبارک میں گزرا کہ نامعلوم اس جہاں کے قطب الاقطاب جہاں کون بزرگ ہیں؟ یہ خیال کر کے جناب باری تعالیٰ میں دعا کی کہ اُس بزرگ کا مجھ پر حال کھول دیں اور اُن کی زیارت سے مجھ کو مشرف کر۔ یہ دُعا قبول ہوئی اور اُسی دم اللہ رب العزت نے اپنی قدرت کاملہ سے ہوا کو حکم دیا کہ آپ کو معہ بستر اُٹا فانا اُس بزرگ قطب الاقطاب کے مسکن پر پہنچا دے۔ چنانچہ آپ بہت سے فمالک اور پہاڑوں اور جنگلوں کا تماشا دیکھتے ہوئے ایک دم میں ملک شام میں پہنچ گئے۔ آپ نے اُس بزرگ سے کہا کہ مجھ کو تمھاری ملاقات سے حصولِ رضا مندی باری تعالیٰ کے باوجود اور کچھ مقصود نہیں ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی وہ بزرگ کچھ متوجہ نہ ہوئے۔۔۔۔۔ اُس گھڑی چالیس اشخاص غیبی مؤکل کی حیثیت سے، دنیا کی نظروں سے پوشیدہ اور آپ کے سامنے عیاں، آپ کی خدمت میں تعینات ہو گئے اور یہ اشخاص غیبی اُس شخص کے ساتھ تعینات رہتے ہیں جس کو مرتبہ قطب الاقطاب کا عنایت ہوتا ہے۔ غیر اس انعام تازہ کے بعد جس طرح رب العزت آپ کو وہاں لے گیا تھا اُسی طرح واپس لے آیا۔۔۔۔۔ جب اس وقوعہ کے چند سال بعد سید صاحب ملک خراسان کو تشریف لے گئے تو اُن پہاڑوں اور میدانوں کو دیکھ کر آپ فرمایا کرتے تھے کہ اِہیں پہاڑوں اور میدانوں کے اوپر سے اس ملک شام میں میرا سفر ہوا تھا۔“

جن خوش نصیب حضرات نے تصوف سے تھوڑا بہت حصہ بھی پایا ہو وہ بخوبی جان سکتے ہیں کہ یہ واقعہ محض کثرت اور فضاؤں میں محل تعمیر کرنے والوں کا تیار کردہ عقلی ڈھکوسلا ہے۔ عبارت کا ہر فقرہ اس شعبہ بازی کی زبانِ حال سے گواہی دے رہا ہے چلیے سید صاحب کو زبانی جمع خرچ سے قلبِ الاقطاب تو بنالیا، لہذا کچھ ممکن ہے کہ اپنے پیرو مشد سے اُونچے ہونے کا اعلان نہ کرتے۔ اس سلسلے میں پہلے یہ بیان ملاحظہ ہو:

”مولانا (مرفی خاں صاحب) لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے مجھ سے اپنا ایک روز کا حال اس طرح بیان کیا کہ میں ایک دن مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اُس وقت آپ کے پاس مولوی رشید الدین صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میں بہت دیر انتظارِ خلیہ، دالان میں ٹھہرا رہا کہ جب یہ صاحب تشریف لے جائیں تو میں مولانا سے کچھ عرض کروں۔ اس ٹہلنے کی حالت میں مجھ کو یہ الہام ہوا کہ اگر تو بندوں کی طرف التجا کرے گا تو ہم تیری دستگیری نہ کریں گے۔“

واقعہ کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کو وہاں کسی انگریز نے دیکھ لیا ہوگا۔ اُسے یقیناً یہ بات ناگوار گزری ہوگی اور صاف کہہ دیا ہوگا کہ اگر تم نے شاہ صاحب سے رابطہ رکھا تو ہمارا تمھارا بھاء نہیں ہوگا اور ہماری نظر کم تمھاری جانب سے ہٹ جائے گی۔ بہر حال اس واقعے کو مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام کا رنگ دے کر بزرگی کی سند بنا دیا گیا۔ اب اس واقعے کے متن پر بار لوگوں کی حاشیہ آرائی بھی دیدنی ہے۔ لکھتے ہیں:

”یہ قصہ لکھنے کے بعد مولوی مرفی خاں صاحب اپنی رائے اور اپنے اجتہاد سے یہ لکھتے ہیں کہ اس الہام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُن ایام میں سید صاحب کا درجہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے بڑھا ہوا تھا۔ جامع لکھتا ہے کہ یہ بات تو میں نے بہت لوگوں سے سنی ہے کہ جب سید صاحب حج کو تشریف لے گئے تو اُس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کو سید صاحب کی علومِ مرتبت کا حال

غیب سے معلوم ہوا۔ اُس وقت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ سید صاحب کی واپسی کے بعد میں اُن کے ہاتھ پر بیعت کر کے، وہ شرف جس کا وعدہ ہے، ضرور حاصل کروں گا۔ مگر افسوس کہ مولانا کی اُمید برباد آئی کیونکہ سید صاحب کے دوبارہ دہلی آنے سے پہلے مولانا صاحب کا وصال ہو گیا تھا۔

جس ذہن نے یہ واقعات گھڑے اور جس قلم نے کاغذ کے سینے پر انھیں جڑا، اُس کی ستم ظریفی کا اندازہ مجھ کو ن کر سکتا ہے، جس نے اس شعبہ بازی کو ایسا خوشنما رنگ دے دیا کہ پڑھنے والے لوگوں کو بھی اس کی حقیقت تک پہنچنے کا راستہ نہیں ملتا۔ وہ جال کی خوشنمائی تو دیکھتے ہیں لیکن جال کی حقیقت کو دیکھنے سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ ایسے پُر اسرار چکر کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے؟

چوں قلم در دست خدارے بود
لاجرم منصور بر دارے بود

ابھی سید احمد صاحب کی البیلی ولایت جو منصب نبوت کو بھی شرمناک ہے، اُس کا ایک پہلو قارئین کرام اور ملاحظہ فرمائیں کہ اگر سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فراق میں اُستنِ حناء روایات تھا تو سید احمد صاحب کو دہائی حضرات کس طرح کم رہ جانے دیتے؟ اس کمی کو انھوں نے یوں پورا کیا ہے:

”جس فجر کو آپ روانہ بریلی ہونے والے تھے، اُس رات کو آپ کے نئے مکان کی رُوح بہ ہیئتِ انسانی ظاہر ہوئی اور آپ کی جُدائی میں بہت رنج و ملال ظاہر کر کے ایک دوسری مخلوقِ الہی سے، جو وہاں حاضر تھی، مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ کل ہمارا آقا نے نامدار ہم کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ یہ کہہ کر ایسا زار و قطار رونما شروع کیا، اس گریہ و زاری کا اثر سید صاحب پر بھی ہو گیا اور آپ بھی رونے لگے اور چونکہ اُس وقت سید صاحب کو خود کچھ حضوریِ الہی ہو رہی تھی،

آپ نے اللہ رب العزت سے عرض کیا کہ یہ سب تیرا فضل و کرم ہے، اس روح کی یہ الفت تیرے ہی انعام کے سبب سے ہے ورنہ میرے جیسے ہزار ہا آدمی اپنے اپنے مکانات کو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، کبھی کوئی مکان اُس کے واسطے رنج و ملال نہیں کرتا۔ سوائے رب! تو ہی اپنے فضل سے اس مکان کو تسکین دے مئی وقت جناب باری سے حکم ہوا کہ اس مکان کو بھی ہم جنت میں داخل کریں گے یہ خطاب اُس روح مکان نے خود بھی سنا اور میں نے بھی یہ عمل مکمل الہی اُس کو یہ بات سنا دی تب اس مکان نے خوش خرم ہو کر تسلی پائی۔

ایک جانب سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا سیدہ احمد صاحبہ کو مد مقابل دکھانا اور دوسری طرف اللہ جل شانہ سے بالمشافہ کلام کرنے کا دعویٰ کرنا جبکہ یہ خصوصیت موسیٰ علیہ السلام اور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علاوہ دوسرے انبیائے کرام کو بھی حاصل نہ ہوئی لیکن یار لوگوں نے ستم ظریفی سے سیدہ صاحبہ کو زبان زوری سے اُسی منصب پر فائز کر دیا۔ اسی قسم کا ایک حیرت انگیز واقعہ اور ملاحظہ فرمایا جائے۔ لکھا ہے :

”یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ ظہور میں آیا اور وہ یہ کہ سمندر کی روحانیت ایک ہمیت ناک صورت بن کر حضرت کے سامنے آئی اور بہت غرور اور تکبر سے بولی کہ تو اپنی جان سے سیر ہو کر، ایسی جسارت کر کے، میرے اندر ہلاک ہونے کو کیوں آیا ہے؟ تو نہیں جانتا کہ میں سمندر ہوں، جس نے ایک لمحہ میں فرعون کو ہلاک کر ڈالا تھا اور میں وہ ہوں کہ ہزاروں جہاز اور کشتیاں ہر سال میرے سامنے تباہ ہوتی ہیں اور میں وہ بحر محیط ہوں کہ ساری زمین کو مع ساکنانِ مین کے گھرے ہوئے ہوں۔ اگر میں چاہوں تو ایک لمحہ میں سارے ساکنانِ زمین کو غرقِ آب کر دوں۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ تو اپنی جان سے بیزار ہو گیا ہے، مگر اپنے ساتھ اتنی خلقت کو کیوں ہلاک کرنا چاہتا ہے؟

سیدہ صاحبہ نے جب یہ کلمات نخت آمیز سمندر سے سُنے تو اُسی

وقت آپ کو یہ الہام ہوا کہ تو سمندر سے کہہ دے کہ تو کیسی غرور اور تکبر کی بات کرتا ہے، میں اور تو دونوں غلامانِ غلام اُس جبار و قہار کے ہیں، تو اللہ سے ڈر اور میرے روبرو اس قدر سخی نہ بگھار۔ نیز کیا اختیار ہے کہ تو کسی کو غرق کرے؟ اہل علم و دانش پر بخوبی آشکار ہے کہ یہ واقعہ محض گھڑت اور اندھی عقیدت کی کرشمہ سازی ہے جس نے عقل و فہم سے کام لینے کا موقع بھی نہ دیا۔ مقررینِ بارگاہِ الہیہ کے حضور سرکشوں کے سوا کون ہے جو دم مارے؟ سمندر یا اُس جیسی کس چیز کی مجال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں سے اس طرح کی گفتگو کرے؟ لیکن جعلی ولایت کے لیے اصلی کرامتیں کہاں سے آئیں؟ اسی طرح فرضی فتوہ کہانیوں کو کرامت کا رنگ دے کر جہانِ منی کا کتبہ جوڑا جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک فرضی فتوہ تیمارداری کے سلسلے میں ملاحظہ فرمائیے:

”اس رات کو اٹھائے راہ میں سید صاحب نے رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ حضرت بمعیت امیر المؤمنین علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت خاتونِ جنت اور حسنین رضی اللہ عنہم اجمعین کے آپ کی عیادت کے واسطے تشریف لاتے اور ہر ایک بزرگ نے حضرت سید صاحب کے سینہ مبارک پر ہاتھ رکھ کر تسلی و تشفی کی اور آپ کو بہت سی بشارتیں دیں۔“

جب پانچوں حضرات کی تشریف آوری کا ذکر کر کے لکھ دیا کہ ہر ایک بزرگ نے سید صاحب کے سینے پر ہاتھ رکھا تو مطلب یہی ہوا کہ حضرت خاتونِ جنت، جگر گوشہٴ رسول، زہرہ بول رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بھی سید صاحب کے سینے پر اپنا دست مبارک رکھا ہو گا۔ وہابی صاحب! کیا قیامت نہیں آئے گی؟ باز پرس نہ ہو گی؟ یہ کس کی والدہ، کس کی زوجہ مطہرہ، کس کی نحتِ جگر کے بارے میں یہ بیہودہ الفاظ سپردِ قلم کیے ہیں؟ کیا اپنے ملاؤں کی سامری کے بچڑ کی طرح پرستش کرنا اور بزرگوں کے ننگ و ناموس سے کھیلنا ہی آپ حضرات کے دین کا کارِ عظم

اور تہجد کی سند ہو کر لے گیا ہے ؟ آخر یہ کیا قیامت ہے ؟

حصہ ششم تم کو مگر نہیں آتی

سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو وصال کے روزے رکھنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا تھا : ابیت عند ربی یطعمنی ویسقیہ - یعنی میں اپنے رب کے حضور رات گزارتا ہوں ، وہی مجھے کھلاتا پلاتا ہے ۔ بلکہ شمع رسالت نے اپنے اُن بے مثل پروانوں سے فرمادیا تھا کہ : اَیْسَکُمْ مِثْلُی یعنی تم میں مجھ جیسا کون ہے ؟ صحابہ کرام تو اپنے دل و دماغ کے کسی گوشے میں اُس سرکار سے مشیت کا تصور بھی نہیں لاسکتے تھے لیکن وہابیوں نے اپنے سید صاحب کو کھینچ پھیر کر فخر و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بالمقابل کھڑا کر ہی دیا ، کیونکہ جب مانچنے ہی کو نکلے تو گھونگھٹ کیسا ؟ چنانچہ لکھا ہے :

”آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو کچھ مجھ کو حاصل ہوا ، وہ سب تہجد کی نماز کی برکت سے ہوا ۔ اور تیر نے کی بھی آپ کو ایسی مشق تھی کہ آپ غوطہ مار کر تہہ دریا میں دو رکعت نفل پڑھ لیتے تھے اور بایں تن و توش و شجاعت کے آپ کھانا بہت کم کھاتے تھے ، بلکہ ایک روز آپ نے فرمایا کہ بھائیو ! یرمت سمجھو کہ میری حیات کا باعث کھانا پینا ہے بلکہ ایسا ہرگز نہیں ہے میری حیات کا سبب فقط یاوالہی ہے ۔ اگر یاوالہی سے ذرا بھی غافل ہو جاؤ تو میرا دم نکل جائے ۔“

جب سید صاحب غوطہ مار کر تہہ دریا میں دو نفل پڑھ لیا کرتے تھے تو معرکہ بالا کوٹ کے اندر دلہل میں چھلانگیں لگاتے وقت تو زمین پر دوبارہ قدم لگنے سے پہلے فضاؤں میں ہی پانچ سات نفل تو ضرور پڑھ لیا کرتے ہوں گے ، معلوم نہیں ان خدا کے بندوں نے دین و دیانت کے ساتھ ہی عقل و دانش سے بھی کیوں دشمنی گانٹھ لی ؟ چند روزہ زندگی کے آرام و راحت کی خاطر ایسے پراسرار ڈھونگ ، اس پر بھی متبعین حضرات آج تک خوشی کے مارے پھولے نہیں ساتے اور اُن کی تعریف و توصیف میں زمین و آسمان کے فلا بے ملاتے ہی چلے جاتے ہیں ۔ وہابی حضرات کی غایت کوشش یہی نظر آتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کو جو فضائل و کمالات اور خصوصیات حاصل ہیں وہ سید احمد صاحب میں ضرور دکھائی جائیں گے تاکہ آسانی سے مسلمانوں کا رُخ اُدھر سے اُدھر پھیرا جاسکے۔ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں جنّاتِ حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوا کرتے تھے جس پر قرآن کریم کی سورۃ جنت بھی شاہد ہے۔ اب سید احمد صاحب کے بارے میں وہابی علماء و مورخین کے خیالات ملاحظہ ہو:

”معتبر راویوں کا بیان ہے کہ اس سفر (روانگی از جدّہ) میں بہت سے جتوں اور شاہِ جنّات کو مثل اپنے جدِ امجد حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آپ نے ہدایت کی اور لاکھوں جنّ آپ کی بیعت سے فیضیاب ہوئے“ ۱

اویس کرام کے دشمن جب اپنے پیرو مشد کو ولی کامل بنانے پر آئے تو کسی قسم کی کمیوں رہنے دیتے، اب سید احمد صاحب سے فیضیاب ہونے والے جنّات کا عالم الغیب ہوتا اور سارے وہابیوں کا اُن پر صدقِ دل سے ایمان رکھنا اور اسے سید صاحب کے کمالات میں گننا ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں :

”اور یہ بھی آپ (سید احمد صاحب) فرمایا کرتے تھے کہ اس جماعتِ قدسیہ (رجال الغیب و ارواح و جنّات) کا دوسرا حال یہ ہے کہ ہمارے مقام کے وقت یہ جماعت ہمارے لشکر سے تھوڑے فاصلے پر اُترتی ہے اور جب ارادہ الہی ہمارے کسی طرف کوچ کرنے کا ہوتا ہے تو یہ جماعت اُس طرف کو چلنے لگ جاتی ہے، تب اُن کی روانگی کو دیکھ کر میں بھی خود بخود اُس طرف کو چل پڑتا ہوں اور یہی وجہ تھی کہ آپ بعض جگہ مہینوں تک ٹھہرے رہتے تھے اور پھر یک بیک چل دیتے تھے“ ۲

یہ بھیجید تو وہابی حضرات ہی کو معلوم ہوگا کہ سید صاحب کی جماعتِ قدسیہ کو ارادہ الہی کس طرح معلوم ہو جاتا تھا؟ انبیائے کرام علیہم السلام کے لیے علمِ غیب کا انکار کرنے والے

جنوں کی غیب دانی پر ایمان معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت لے آئے؟ اور اس سے اُن حضرات کی
ساتھ توجید کے علمبردار ہونے پر کوئی حرج تو نہیں آیا؟ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حاشل اپنے
سید صاحب کو دکھانے کی خاطر یہ سارا ڈھونگ رچایا گیا تھا، چنانچہ اپنے اسی قلبی راز کا اظہار
تقدیر پر وہابی قلم کاروں نے کیا ہوا بھی ہے۔ ایک مقام پر لکھا ہے:

”سید صاحب کی تعلیمات بھی مثل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہت سیدھی سادی
تھیں، جن سے عالم و جاہل دونوں برابر مستفید ہوتے تھے۔“

اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ سید صاحب مبلغ اسلام نہیں تھے بلکہ اُنھوں نے
خود ایک مذہب وضع کیا اور اُسی کی نشر و اشاعت مقصود تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب
کی دینی تعلیمات بھی وہابی حضرات کے نزدیک سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی
تعلیمات کی طرح سیدھی سادی تھیں۔ مسلمانوں کے فقہی لحاظ سے حنفی، شافعی، مالکی اور
حنبل چار مذاہب ہیں اور بلحاظ طریقت بھی چار مشہور سلسلے نقشبندی، قادری، چشتی اور
سہروردی ہیں۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اہلسنت و جماعت سے علیحدہ اپنی جماعت تشکیل
دی اور اُس کا نام محمدی گروہ رکھا۔ سید صاحب نے چاروں مشہور سلاسل سے الگ
نئی طریقت وضع کیا، جس میں فرضی کرامتوں کے افسانے تو ضرور تھے لیکن تصوف سے دور
اسطہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ سید صاحب نے مسلمانوں کے چاروں فقہی مذاہب اور طریقت
کے چاروں سلاسل کے بارے میں یہ تاثرات پھیلائے تھے:

”یہ چاروں فقہاء کے مذاہب میں کون سا مذہب آپ کو پسند ہے؟ آپ نے
جواب دیا کہ ان میں سے کوئی مذہب بھی مجھ کو پسند نہیں ہے اور فرمایا کہ ان میں کوئی مذہب
میرے طور اور طریقے پر نہیں ہے، سب سے افراط و تفریط ہو گئی ہے۔“

آپ نے عرض کیا کہ ان مشہور طریق اولیاء اللہ میں کون سا طریقہ حضور کے
طور پر ہے؟ جناب امیر نے فرمایا کہ ان میں بھی کوئی طریقہ میرے طور پر نہیں ہے۔

ہر طریقے میں کچھ کچھ چیزیں میری مرضی کے خلاف لوگوں نے ایجاد کر لی ہیں اور اس وجہ سے سب کے سب ہمارے طور اور طریقے سے دُور جا پڑے ہیں۔ لہ

یعنی صاحبِ اجمہدین عظام کے فقہی مذاہب افراط و تفریط کا شکار، اکابر اولیاء اللہ کے چاروں سلاسل بھی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے طور طریقے سے دُور کہ اُن میں لوگوں کی ایجادات شامل ہو گئیں۔ مسلمانوں کی جگہ تو محمدی گروہ (دوبانی) مقبول بارگاہِ خداوندی ہو گیا۔ فقہی مذاہب کی جگہ خارجیت کو شرفِ قبولیت حاصل ہو گیا اور طُرُقِ اکابر طریقہ محمدیہ کے سامنے حرفِ غلط ہو گئے کیونکہ برٹش گورنمنٹ نے منصب و مقام ہی ایسا پاک صاف اور بلند و بالا مرحمت فرمادیا تھا کہ اُس کے مقابلے پر دُوسری کسی بڑی سے بڑی ہستی کا وزن ہی کچھ نہ رہا تھا۔ بہتر ہو گا کہ سید احمد صاحب کا اس بارے میں اپنا نظریہ اور معمول بھی ملاحظہ فرمالیا جائے۔

لکھا ہے :

”آپ کا دستور تھا کہ بااذن بلند طریقہِ حشمتیہ اور قادریہ و نقشبندیہ و مجددیہ میں اول بیعت لے کر پھر طریقہ محمدیہ میں بیعت لیتے تھے۔۔۔۔۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چار مشہور طریقِ طریقت میں آپ کا اول بیعت لینا اور توجہ دینا محض بطور حکمتِ خلائق کو رجوع کرنے کے لیے تھی ورنہ آپ کی اصل تعلیم اور دلی دعوت طرفِ طریقہ محمدیہ کے تھی، جس کی سب سے آخر میں آپ بیعت لیتے تھے۔“ لہ

اگر دوبانی حضرات کی بارگاہوں میں ہمیں بھی اذنِ لب کشائی ہے تو ہم صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ حضراتِ آپ کے امیر المؤمنین کا رائج فرمودہ طریقہ تصوف بنام طریقہ محمدیہ آج کہاں ہے؟ کیا اس وسیع دنیا کے کسی گوشے میں اُس کا کہیں نام و نشان موجود ہے؟ قرآنی اور ایمانی فیصلہ تو یہی ہے کہ جاء الحق و زهق الباطل ان الباطل

کان دھوگا۔ جب حق آتا ہے تو باطل مٹ جاتا ہے کیونکہ باطل ٹٹنے کے لیے ہے۔ اگر طریقہ محمدیہ حق تھا اور مسلمانوں کے چاروں طریقے باطل تھے تو طریقہ محمدیہ کو باقی رہنا تھا اور مسلمانوں کے چاروں طرق کو مٹ جانا چاہیے تھا۔ لیکن معاملہ برعکس سامنے آیا کہ مسلمانوں کے چاروں طریقے پوری آب و تاب سے موجود ہیں۔ لیکن طریقہ محمدیہ کارورئے زمین سے حرف غلط کی طرح نام و نشان مٹ چکا ہے۔ وہابی حضرات ذرا تھوڑی دیر کے لیے غصے کو تھوک دیں، دلوں پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہ طریقہ محمدیہ کا ٹٹنا ان کے نزدیک حق کا ٹٹنا ہے یا باطل کا؟ یہ حضرات جو چاہیں فیصلہ کر سکتے ہیں لیکن اتنا یاد رہے کہ یہی فیصلہ قبر میں بھی ان کے ساتھ کیا جائے گا، حشر و نشر میں ان کے ساتھ رہے گا اور ان کے نامہ اعمال میں مرقوم ہوگا۔ اگر ہم سے پوچھنا چاہیں تو مجددائے حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے اس کا قاعدہ کلیہ ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے :

مٹ گئے، مٹتے ہیں، مٹ جائیں گے اعدائے

نرمٹا ہے نہ مٹے گا کبھی چرچا قیرا

وہابی علماء و مؤرخین نے بتایا کہ سید احمد صاحب کی تعلیم نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جیسی سیدھی سادی، سید صاحب کے ساتھی اصحاب بدر کی طرح مقبول بارگاہ خداوندی بن جو حضرات اس پر اسرار برطانوی گاڑی کو چلانے میں پہیوں کا کام دے رہے تھے، انہیں اپنے پروردگاروں کی جانب سے کیا منصب ملا تھا؟ اس بارے میں لکھا ہے :

”آپ کے بڑے ساتھیوں میں مولوی محمد اسماعیل اور مولوی عبدالحی صاحب ہیں۔

یہ دونوں بزرگ بمنزلہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے آپ کے

خلفائے راشدین سے تھے۔ مولوی عبدالحی صاحب کا مزاج بوجہ بردباری

اور وقار حضرت ابوبکرؓ سے اور حضرت مولانا شہید کی طبیعت بوجہ اشداء

علی الکفار و فجار حضرت عمرؓ سے زیادہ تر مشابہ تھی، ل

یہ حضرات تو سید احمد صاحب کے خلفائے راشدین تھے اور حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مشابہ لیکن خود سید صاحب اپنی تمام تر علمی بے مائیگی یعنی ناخواندگی کے باوجود، جیسا کہ خود ان کے سوانح نگاروں نے بتایا ہے، کس کے مشابہ تھے؟ اس کا مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے یوں جواب دیا ہے:

از بسکہ نفس عالی حضرت ایشان بر	چونکہ آپ کی ذات والا صفات ابتدا
کمال مشابہت جناب رسالت مآب	فطرت سے جناب رسالت مآب
علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات در	علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیمات کی
بدو فطرت مخلوق شدہ بناء علیہ	کمال مشابہت پر پیدا کی گئی تھی،
لوح فطرت ایشان از نقوش	اس لیے آپ کی لوح فطرت علوم
علوم رسمیه و راہ دانشمندان کلام و	رسمیہ کے نقش اور تحریر کے دانشمندان
و تحریر و تقریر مصطفیٰ ماندہ بود	کی راہ و روش سے خالی تھی۔ ۱

اس ستم ظریفی کا جواب تو مل رہا ہو گا کہ سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا اُمی ہونا تو معجزہ ہے لیکن عوام کا علم سے کورا رہنا کمال نہیں بلکہ نقص ہے۔ اس نقص کو اُس کمال کے برابر درجہ دینا اور دونوں کو مشابہ ٹھہرانا وہ جبرأتِ باغیانہ ہے جس کا ایک اُمّتی کھلانے والا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ آخر یہ ساری کارگزاری سید احمد صاحب کو منصبِ نبوت پر بٹھانے کے لیے نہیں تھی تو اور کس غرض سے تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ دعویٰ نبوت کے لیے راہ ہموار کی جا رہی تھی، جس کی خاطر ابھی امامت اور مہدیت کے دعوے تک ہی پہنچے تھے جیسا کہ مشہور دیوبندی عالم مولوی عبید اللہ سندھی (المتوفی ۱۳۱۲ھ) کا بیان منقول ہے:

مولانا سندھی نے ایک دفعہ بڑے دکھ سے فرمایا، حضرت سید احمد شہید

۱۔ محمد اسماعیل دہلوی، مولوی: صراطِ مستقیم، ص ۴

۲۔ صراطِ مستقیم اردو، ص ۱۶

کتھے بڑے بزرگ تھے لیکن دیکھو! وہ بھی اسی رو میں بہہ گئے۔ بجائے اس کے کہ وہ افغان نمائندوں پر مشتمل ایک جمہوری نمائندہ حکومت بناتے، وہ خود امام اور مہدی بن گئے اور اس طرح سارا معاملہ غر بود ہو گیا۔ ۱

یہی مولوی عبید اللہ سندھی دوسرے مقام پر سید صاحب کی مہدیت کے بارے میں فرماتے ہیں: سید صاحب حبیبی نبویوں کا آدمی ملنا مشکل ہے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے امام و مہدی بننے سے اتنی اچھی تحریک کس طرح تباہ ہوئی۔ ۲

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے سابق استاد جناب محمد سرور صاحب نے سید احمد صاحب کی امامت و مہدیت کے دعوای اور ان کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اپنے تاثرات کو ان لفظوں میں قلمبند کیا ہے:

”مولانا کے نزدیک سید احمد شہید کی جماعت نے سرحد میں جو شکل اختیار کی وہ نشانے حقیقی کے خلاف تھی۔ ان کی حکومت موقتہ (یعنی عارضی اور -PROVISI ONAL) تھی۔ اصل مرکز دہلی تھا۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ سید صاحب نے امامت اور مہدیت کے دعوے کر دیے۔ اس سے خواہ مخواہ سرحد کے امراء و خوانین میں بد مزگی پیدا ہوئی۔ دوسری طرف امامت اور مہدیت کے بعد جماعتی فیصلوں کی اہمیت نہ رہی۔ اس سے عوام بچھان بھی بگڑ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سید صاحب شہید ہو گئے۔ طبعاً مہدی اور امام کی شہادت سے ان کے متبعین کے دل ٹوٹ گئے اور ان سے منتسب تحریک، اہل حدیث رفع یدین تک محدود ہو کر رہ گئی۔ ۳

سید احمد صاحب کی مہدیت تو بالاکوٹ میں دفن ہو گئی یا بقول ان کے متبعین غائب ہو گئی لیکن یہی جھوٹا دعویٰ مرزا غلام احمد قادیانی کے لیے راستہ صاف کر گیا۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ مرزا غلام احمد والے جلد مرا حل سید احمد صاحب ہی نے طے کرنے ہوں گے لیکن
 بخت نے یاوری نہ کی اور موت نے مہلت نہ دی جس کے باعث لعنت کا آتنا بڑا طوق مرزا کے
 قادیان کو زیب گلو کرنا پڑا۔ سندھی صاحب نے خود فرمایا تھا:

”اس قسم کے روایاتی ماحول اور امام مہدی کے انتظار کی فضا میں مرزا غلام احمد
 نے مہدی کے آنے اور نزولِ مسیح کے عقیدے پر بحث کی۔ اب بجائے اس کے
 کہ وہ سرسید کی طرح اُن روایات کو موضوع قرار دیتے، جیسی کہ وہ ہیں، وہ خود
 مہدی اور مسیح بن گئے اور اس طرح ایک لغویت کی جگہ دوسری لغویت پیدا ہو گئی!“

جو لغویت بالاکوٹ میں دفن ہو جانے کے باوجود بڑش گورنمنٹ نے پھر قادیان سے پیدا
 کر دکھائی تھی، اُس خشتِ اول کے بارے میں سید احمد صاحب کے ایک عاشقِ زار یعنی
 پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب نجدی اور ہندی و ہابیت کا نقطہ اختلاف
 بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”ہندوستانی و ہابیت کا دوسرا طرہ امتیاز ایک مرحلے پر مہدوی تحریک سے
 اس کا اتفاق تھا۔ مہدی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی و ہابیوں نے
 کثیر لٹریچر فراہم کر لیا تھا۔ اسی کے بعد سید احمد صاحب نے رحلت کی۔
 مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما نہ ہوا۔“

سید احمد صاحب کی اس تحریکِ مہدیت کے بارے میں اسی نام نہاد جماعتِ مجاہدین کے
 ایک سرگرم کارکن اور مشہور غیر مقلد عالم مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی نے ایک عجیب و غریب
 انکشاف کیا ہے۔ قارئینِ کرام فوراً انصاف کی رُو سے حالات کی تمہ میں جھانکنے اور حقیقت
 تک پہنچنے کی سعی فرمائیں۔ اُنہوں نے لکھا ہے:

”اوائل میں ایک دفعہ میں نے سید احمد صاحب کو شہید بتایا تو آپ

لے محمد سرور: افادات و ملفوظاتِ سندھی، ص ۳۵۱

لے محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر: ہندوستان میں دہائی تحریک، مطبوعہ کراچی، ص ۵۷

(مولوی فضل الہی صاحب) سخت ناراض ہوئے اور مجھے دھکا دے کر چارپائی سے نیچے گرا دیا اور فرمایا کہ وہ زندہ اور غائب ہیں، عنقریب ظاہر ہوں گے۔ نیز آپ نے اُس جماعت کا شایع کردہ رسالہ بنام خلاصہ مجھے دکھایا، جس میں یہ حدیث تھی:

اِذْ مَضَتْ الْفِ وِصَاٰتُہٗنَا وَاَرْبَعُوْنَ سَنَۃً لِّعَثَ اللّٰہُ الْمَہْدِی فِیْہَا یَعِیْ عَلٰی سَیْدِہٖ خَلَقَ کَثِیْرًا ثُمَّ یُعِیْہِ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی رِتْدُوْنِہٖ اِلٰی دِیْنِ اٰبَآءِہُمْ اِلَّا مَنْ اَتٰہُ کِتَابُ اللّٰہِ وَ سُنَّۃُ نَبِیِّہٖ۔ مگر یہ روایت کسی حدیث کی کتاب میں بھی نہیں بلکہ جو ذخیرہ موضوعات کے نام سے علمائے کرام نے جمع فرمایا ہے، یہ روایت اُس میں بھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کی شہادت کے بعد اسے وضع کیا گیا ہے اور ایک روایت یوں بھی بیان کی ہے:

فِی قَاتِلِ کُفْرَہٗ لَاہُور۔ اور اس قسم کے بے سرو پا حکایات وقتے سوانح احمدی (جو کراچی سے حیات سید احمد شہید کے نام سے شایع ہوئی ہے) میں بھی درج ہیں، مگر تقسیم ہند کے بعد مولوی صاحب مرکز چمر قند سے اپنے وطن میں واپس تشریف لائے تو میرے روبرو کئی بار آپ نے سید صاحب کو شہید بتایا اور میری مار مفت میں ٹھہری۔ اچھا خیر استادوں کی مار بھی دراصل پیار اور عمر سدا رہے!

مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی صاحب کے پیش کردہ مذکورہ حوالے اور اُس میں درج شدہ دونوں جعلی وضعی روایات سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب نے اپنے مہدی ہونے کا بڑی شد و مد سے دعویٰ کر رکھا تھا۔ جو اُن کی تحریک کوناکامی کے گڑھے میں پھینکنے کا باعث بنی۔ اس کے ساتھ ہی جس قسم کی کرامتوں اور الہاموں کی تشہیر کی گئی، جن کا حقیقت سے قطعاً کوئی رابطہ ثابت نہیں ہوتا نیز وحی و عصمت کے جو دعویٰ کیے گئے اُن سے صاف ظاہر یہی ہوتا ہے کہ موصوف کی منزل مقصود وہی تھی جہاں مرزا غلام احمد قادیانی

نے پہنچ کر دم لیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ سید صاحب کی عمر نے ساتھ نہ دیا اور وہ اس جہانِ فانی سے عالمِ جادوئی کی طرف بصدِ حسرت و یاس یہ کہتے ہوئے سدھار گئے ہوں گے :۔

قسمت تو دیکھیے کہاں پہ ٹوٹی ہے کمنہ

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

قارئینِ کرام نے سید احمد صاحب کے کشف و کرامت سے متعلق کتنے ہی واقعات پڑھے۔ اُن کی وحی و عصمت کے بارے میں بیانات ملاحظہ فرمائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہابی حضرات پر ہمارے تاثرات شاق گزریں اور اُن کی طبعِ نازک ہمارے بے لاگ اور خیر خواہانہ تبصرے کی متحمل نہ ہو سکے تو ہم مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سوانح نگار اور میدانِ وہابیت کے شہسوار جناب مرزا حیرت دہلوی کے تاثرات پیش کر دیتے ہیں۔ موصوف نے لکھا ہے :

چند سوانح نویسوں نے افسوس ہے کہ سید صاحب کی وہ باتیں بیان کی ہیں جن سے اُن کی اصلی شان بھی مٹ گئی۔ اُن کے سوانح کا دیکھنے والا کبھی کسی انسانِ صفت پر خیال نہیں جاسکتا۔ کہیں تو اس پارسانیک مرد کو لغو ذبا لہ نبی بنا دیا ہے کہیں اُس کی تمام حرکات و سکنات کو مافوق الفطرت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کہیں اُن میں وہ قوتِ عجیبی گئی ہے جو ایک دیو میں بھی نہیں ہو سکتی۔ کہیں اُن کے بول سے ایک عظیم الشان کھیت کو جلایا گیا ہے۔ کہیں اُن کے لیے آسمانوں سے حلوے کا طباقی اتروایا گیا ہے۔ کہیں میلہ ہنود میں لے جا کے اُنھیں بیہوش کیا گیا ہے۔ اگر خود سوانح نویس خیال کر لیتے اور دینِ اسلام کے واجب الاعتصام بانی کے اُنھیں سوانحِ عمری یاد ہوتے تو وہ کبھی ایسی مضحکہ خیز اور طفلانہ باتیں اس بزرگ سید پر عاید کر کے اُس کی اصلی ذاتی لیاقت اور اصلی جوہر کو نہ مٹا دیتے۔ موصوف نے اس ستم ظریفی کے پیش نظر سید صاحب کے سوانح نگاروں اور اُن کے تحریر کردہ حالات و واقعات پر یقین رکھنے والوں کے ضمیروں کو دوسری مرتبہ یوں جھنجھوڑا ہے :

”میں کہتا ہوں کہ سید احمد صاحب کے سوانح عمری میں صرف اُن مذکورۃ الصدد باتوں کا تذکرہ ہو جن سے نبی آخر الزماں کی ذات مقدس بہت مستعبد تھی، تو پڑھنے والا سید احمد صاحب کو کیا سمجھے؟ کیا خیال کرے؟ آیا اُنھیں قطب سمجھے، غوث جانے یا نبی کہے؟“ لے

اگے موصوف مرزا نے مذکورہ واقعات کے بارے میں اپنی واضح رائے یوں ظاہر فرمائی ہے:

”اُن کے سوانح نویسیوں اور بعض سادہ لوح ساتھیوں نے ناحق بزرگ سید کی ذات پر یہ گھڑی ہوئی باتیں عائد کیں اور بے فائدہ اپنی ترانسی ہوئی گپیں اُس کے سر چسپیں۔“ لے

جہاں تک سید احمد صاحب کی بزرگی کے واقعات کے بارے میں بیانات کا گھڑی ہوئی باتیں اور گپیں ہونے کا تعلق ہے تو مرزا حیرت دہلوی کی اس رائے سے ہم بھی اتفاق کرتے ہیں لیکن اسے سوانح نویسیوں اور سادہ لوح ساتھیوں کے سر تھوپنا کسی مرحلے پر بھی حقیقت قرار نہیں پاسکتا کیونکہ اول سے آخر تک یہ ساری کارگزاری خود سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے سرانجام دی۔ سید صاحب کے مکتوبات اور صراطِ مستقیم کتاب اس بات پر شاہد ہیں، جن سے کتنے ہی بیانات اور اقتباسات پیچھے مذکور ہوئے اور بعض عبارتیں آگے ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔ سوانح نگاروں نے تو کبیر کے فقیر بن کر کتھی پر کتھی ماری ہے اور برٹش گورنمنٹ کی تیار کردہ سازش کو کامیابی سے ہمکنار کروانے میں ان حضرات کا اتنا ہاتھ بٹایا ہے کہ سازش کو بٹنے اور ظاہر نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ اُس کی سرپرستی کا بار گراں مرزا غلام احمد قادیانی نے اٹھالیا۔ امید ہے کہ وہابی حضرات ہماری حق گوئی سے ناراض ہوتے وقت مرزا حیرت دہلوی جیسے حضرات کا خیال ضرور رکھا کریں گے:۔

یوں نظر دوڑے نہ برچی تان کر

اپنا بیگانہ ذرا پہچان کر

مرزا حیرت دہلوی، حیاتِ طیبہ، ص ۳۵۲

لے ایضاً، ص ۳۵۳

سید احمد صاحب اور اُن کے دستِ راست یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی

مسئلہ غیبوبیت جب بالاکوٹ میں کھیت رہے۔ وحی و عصمت کے تمام دعوے جھوٹے ثابت گئے۔ پیشگوئیاں فراڈ ثابت ہو کر رہیں تو موصوف کے خلفاء نے یہ شوشہ چھوڑ دیا کہ ہمارے امیر المؤمنین مرے نہیں ہیں بلکہ زندہ سلامت ہیں اور اُنھیں اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے غائب رہنے کا حکم ملا ہے کبھی مناسب وقت پر دوبارہ تشریف فرما ہو کر اپنے کیے ہوئے وعدوں، سُنائے ہوئے الہاموں کو سچا ثابت کر کے دکھائیں گے، غرضیکہ اسی طرح جھوٹ بولتے اور دُنیا کو بہکاتے ہوئے قریباً ڈیڑھ صدی گزرنے والی ہے لیکن وہابی حضرات ہیں کہ اپنے اکابر کی روغلوئی کا سببھی طرح اعتراف کرنے کی جانب آتے ہی نہیں۔ بہر حال غیبوبیت کے بارے میں محمد جعفر تھانیسری نے لکھا تھا:

”میدان صاف کرنے کے بعد سید صاحب مثل شیر کے اپنی جماعت میں کھڑے تھے کہ ایک بیک آپ نظروں سے غائب ہو گئے۔ مولوی جعفر علی نقوی چاچا کا باڈی گارڈ تھا اور کندھے سے کندھا ملائے کھڑا تھا لکھتا ہے کہ: جناب حضرت امیر المؤمنین درہم جماعت از نظر من غائب شدند۔ یہ واقعہ جگہ سوز ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو واقع ہوا۔ اُس وقت آپ کے غائب ہو جانے کی وجہ سے سارے لشکرِ اسلام میں ہل چل سی مچ گئی۔“

اس واقعہ کے ساٹھ سال بعد تک لوگوں کی رائے غیبوبیت کے بارے میں کیا رہی، اس سلسلے میں بھی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے یوں وہابی حضرات کی آراء کا تذکرہ کر دیا ہے:

”ایسی بھی بہت سی روایتیں ہیں کہ اس واقعہ بالاکوٹ کے بعد متعدد لوگوں نے سید صاحب اور اُن کے رفیقوں کو دیکھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کی شہادت اور غیبوبیت میں روزِ اول سے اختلاف ہے، مگر اب ساٹھ برس سے بھی زائد زمانہ گزر جانے کے بعد خیالِ غیبوبیت خود بخود لوگوں کے

دلوں سے محو ہوتا جاتا ہے۔ سید صاحب کی چھوٹی بیوی صاحبہ، جن سے معرکہ بالاکوٹ سے میلہ بننے اپنی غیوبیت کی پیشگوئی کی تھی اور سید صاحب کے اکثر اقرباء اور اہل نافلہ آپ کی غیوبیت کے قائل تھے۔ ۱

موصوف کا یہ بیان بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں، کیونکہ جو جعفر علی تقوی غیوبیت کے ڈھنڈورچی تھے اور سید صاحب کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے تھے، وہی از نظر من غائب شدند کہنے والے کا بیان یہاں برعکس ہے۔ علاوہ بریں اس عبارت میں سید صاحب کے دو ساتھیوں کا غائب ہونا بھی لکھا ہے۔ چنانچہ مرقوم ہے :

”مولوی جعفر علی تقوی یہ بھی لکھتے ہیں کہ بعد میں لوگوں کی زبانی اس امر کی تصدیق ہوئی ہے کہ سید احمد صاحب کی ٹانگ پر ایک گولی کا زخم بھی لگا تھا۔ اس زخم کے نگنے کے بعد آپ ایک پتھر پر بیٹھے ہوئے روبرو قبلہ دعا مانگ رہے تھے کہ اُسی پتھر سے غائب ہو گئے۔“

یہ بھی اسی مولف کا بیان ہے کہ موضع شملی میں پہنچ کر ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سید صاحب موضع مٹی کوٹ میں (جو گجروں کا گاؤں میدان جنگ بالاکوٹ سے ملا ہوا تھا) گجروں کے گھر میں زندہ موجود ہیں اور اُس پتھر پر سے جہاں آپ دعا مانگ رہے تھے، گجروں کو آپ کو اٹھا کر اپنے گاؤں میں لے گئے تھے اور بعض لوگوں کا یہ بھی بیان ہے کہ مولوی نظام الدین حسینی کاندھلوی جو بنجارا اور کشمیر اور کانغان کے سفیر ہو کر گئے تھے اور مولوی عبداللہ صاحب دونوں شخص میدان جنگ سے سید صاحب کے ساتھ ہی غائب ہو کر آپ کے رفیق غیوبیت ہو گئے۔

مولوی جعفر علی تقوی پلہ شہادت کو غلبہ دیتے ہیں۔ ۲
اب اسی غیوبیت کے طلسم کی کہانی مشہور و بابی مورخ اور سید صاحب کے سوانح نگار،

غلام رسول مہر (المتوفی ۱۳۹۱ھ / ۱۹۱۱ء) کی زبانی سُنئے کہ وہ بابی علماء و مورخین کے فرادہ کا ردِنا کس طرح روتے ہیں، اُنھوں نے لکھا ہے:

”سید صاحب کی شہادت کے بعد نیاز مندوں کے ایک گروہ نے اُن کی غیبت کا مسئلہ کھڑا کیا اور مدت تک اس عقیدے کی اشاعت پورے اہتمام سے جاری رکھی۔ عوام کے ایسے معتقدات بحث و نظر کے محتاج نہیں ہوتے۔ اُن کے دل و دماغ ہر وقت عجائب کاریوں کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہتے ہیں اور وہ کسی واقعے کے قبول و پذیرائی میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے، جب تک اُسے باعتبار وقوع مروجہ اصول و ہمارے صریح منہرف نہ پائیں۔ لیکن حیرت ہے کہ سید صاحب کے بعض اکابر خلفائے بھی اسے قبول کیا۔ نہ محض قبول کیا بلکہ اسے مدت تک دعوتِ اتحاد کا مرکز بنائے رکھا۔“

سید صاحب کے تربیت یافتہ اور اُن کے خاص متوسلین کی غیبت کے بارے میں جھوٹی شہادتیں، عوام الناس کو چھلنے اور پیٹ پرستی کی خاطر جھوٹے بیانات جناب غلام رسول مہر کی زبانی سُن لیجیے:

”سرحہ کے بعض اکابر کہہ رہے تھے کہ اُنھوں نے واقعہ بالاکوٹ کے بعد سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے مثلاً جھنگول کے اخوند محمد ارم، جن کا ذکر پہلے آچکا ہے، مولوی خیر الدین مشیر کوٹی اور مولوی محمد قاسم پانی پتی چند افراد کے ہمراہ اسی بناء پر جھنگول میں ٹھہر گئے کہ اُنھیں سید صاحب کے زندہ ہونے کا یقین تھا۔“

اب سید صاحب کے اُن خلفاء کا نظریہ ملاحظہ فرمائیے جو صادق پوری تھے اور جنھوں نے سید صاحب کی اس نام نہاد تحریک جہاد کو پیٹ پرستی کا جھوٹے پروپیگنڈے کے بل بوتے پر کاروبار بنالیا تھا۔ جناب غلام رسول مہر نے آپ کے خلفاء کی کتاب رسائل تسعہ کے صفحہ ۶۶،

۶۰ کے حوالے سے مولوی ولایت علی خلیفہ سید احمد صاحب کا بیان بھی نقل کیا ہے۔ چنانچہ
مہر صاحب نے بڑے تعجب کے ساتھ لکھا ہے:

”حد درجہ تعجب اس پر ہے کہ ارادت مندوں کے حلقہ خاص میں سے اہل صادق پور
نے عقیدہ غیبت کو پورے کاروبار جہاد کا مدار و محور بنایا۔ مولانا ولایت علی مرحوم نے
دعوت کے نام سے ایک رسالہ مرتب کیا تھا۔ اُس میں لکھتے ہیں کہ بالاکوٹ میں
شکست اس لیے ہوئی کہ ایمان والوں کے دل میں غرور کا میل جنے نہ پائے۔

شکست کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت کو چیدہ گزاری اور دُعا و زاری کے لیے پہاڑوں
پر بلایا۔ سچ ہے خلوت بھی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے۔ حضرت یونسؑ مچھلی کے

پیٹ میں رہے، حضرت موسیٰؑ کوہ طور پر، حضرت عیسیٰؑ کو آسمانوں پر اٹھایا۔ ہمارے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی روز غارتوں میں چھپایا۔ سید صاحب کی شہادت

کی خبر شیطان نے جھوٹی مشہور کی۔ کیوں نہ ہو؟ یہ (سید صاحب) بھی تو اُن

لوگوں (انبیائے کرام) کے پیرو ہیں۔ اُن کی سنتوں سے کیونکر محروم رہیں۔۔۔

اور ہمارے حضرت (سید صاحب) کی خلوت کوئی عیسیٰ علیہ السلام کی سی نہ

سمجھے کہ کسی سے ملاقات نہیں ہوتی یا ظہور میں اُن کے عرصہ بعید گزرے گا۔

یہاں تو اکثر لوگ جب چاہتے ہیں تھوڑی سی کوشش سے حضرت کی زیارت سے

مشرف ہو جاتے ہیں اور انشاء اللہ عرصہ قریب میں مثل خورشید درختاں کے

ظاہر ہو کر عالم کو اپنے انوار ہدایت سے منور فرمائیں گے۔“ لے

جناب غلام رسول مہر کی زبانی اس کذب و افتراء کی کہانی کے بارے میں مزید عینے۔ وہ لکھتے ہیں:

”سید صاحب کی جماعت کو امداد دینے والوں کے خلاف ایک مقدمہ ۱۸۶۴ء میں

انبالہ میں چلا تھا، جسے انگریزوں کی اصطلاح میں وہابیوں کا بڑا مقدمہ کہا جاتا ہے

اس میں مولانا نجفی علی صادق پوری، مولانا عبدالرحیم صادق پوری، مولوی جعفر

تھانیسری اور بعض دوسرے اصحاب ماخوذ تھے۔ اس مقدمے میں کئی اصحاب نے
 گواہیاں دی تھیں کہ صادق پور کے مرکز میں جتنے لوگ پہنچتے تھے، انہیں باقاعدہ
 تلقین کی جاتی تھی کہ سید صاحب کا ظہور قریب ہے، وہ امام وقت ہیں، ہر مسلمان کا
 فرض ہے کہ اُن کے ظہور سے پہلے مقام ظہور (یعنی سرحد) پر پہنچ جائے۔ مولوی
 محمد جعفر تھانیسری صاحب تواریخ عجیبہ بھی سید صاحب کو زندہ مانتے تھے اور اُن
 کا دعویٰ تھا کہ دو مرتبہ زیارت جسمانی کا شرف حاصل ہو چکا ہے اور حضرت کے زندہ
 ہونے کا مجھے ایسا یقین ہے جیسا کہ اپنی موت کا۔ مولانا مظفر حسین کاندھلوی فرمایا
 کرتے تھے کہ سید صاحب سے دس باتیں سنی تھیں، نوپوری ہو چکی ہیں، ایک
 باقی ہے یعنی غیبت کے بعد ظہور، لے

مولوی محمد جعفر تھانیسری، غلام رسول مہر اور غلیوبیت کے دوسرے قائلین، جن کے بیانات
 پیش کیے گئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی نامور عالم دین نہیں، ہاں بعض حضرات کو اُن کے مکتول
 میں اُونپے پائے کا تاریخ دان شمار کیا جاتا ہے اب ہم وہابی علماء کے بیانات پیش کرنا چاہتے
 ہیں۔ مشہور غیر مقلد عالم مولوی عنایت اللہ اثری وزیر آبادی اور اُن کے استاد مولوی فضل الہی
 صاحب کے بیانات گزر چکے۔ مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کے
 سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم مولوی عاشق الہی میرٹھی لکھتے ہیں:

حب لاشیں سنبھالی گئیں تو سید صاحب اور اُن کے ساتھیوں کا پتہ نہ لگا۔ لوگ
 تلاش میں نکلے اور ادھر ادھر جستجو کرنے لگے۔ چند چند آدمی مختلف دیہات اور
 پہاڑوں میں جا کر ڈھونڈا کرتے تھے اور کسی کو نہ ملتے تھے۔ گاؤں میں برابر
 پتہ چلتا جاتا تھا کہ یہاں تھے، وہاں تھے۔ ایک شخص نے بیان کیا کہ مجھے سخت
 بخار تھا۔ اسی حالت میں میں نے تینوں شخصوں کو جاتے دیکھا، جن میں ایک
 سید صاحب تھے۔ میں نے غل مچایا کہ حضرت آپ ہم کو کہاں چھوڑ گئے اور کیوں ہم

علیہ ہو گئے؛ سب لوگ آپ کے روبرو ہیں۔ میرے غل چانے پر حضرت سید صاحب نے منہ پھر کر مجھے دیکھا، کچھ جواب نہ دیا اور چلے گئے۔ میں بوجہ سخت بیماری کے اٹھ نہ سکا، غل چایا کیا۔

دوسرے شخص نے بیان کیا کہ ہم انھیں دنوں سید صاحب کو ایک پہاڑ میں تلاش کر رہے تھے۔ دفعتاً کچھ فاصلہ پر گڑ بڑاٹ سنا۔ میں وہاں گیا تو دیکھوں کیا سید صاحب اور ان کے دو ہمراہی بیٹھے ہیں۔ میں نے سلام و مصافحہ کیا اور عرض کیا کہ حضرت کیوں غائب ہو گئے؛ سب لوگ بغیر آپ کے پریشان ہیں۔ مجبور ہو کر ہم نے فلاں شخص کو اپنا خلیفہ بنالیا ہے اور ان سے بیعت کی ہے۔ آپ نے اس پر تسکین کی اور فرمایا؛ ہم کو اب غائب رہنے کا حکم ہوا ہے، اس لیے ہم نہیں آسکتے۔ اتنا فرما کر قافلہ والوں کی خیریت اور حالات پوچھے اور پھر روانہ ہو گئے۔ میں نے بھی ہمراہ ہونے کے لیے عرض کیا تو منع فرمایا اور پھر کوشش کر کے جو میں نے پیچھے چلنا چاہا تو میرے ہاتھ پاؤں وزنی ہو گئے۔ میں تو کھڑا اکھڑا رہ گیا۔ حیران اور مایوس تھا کہ یا اللہ! کیسے چلوں؛ اور حضرت سید صاحب معہ ہمراہیوں کے نظر سے غائب ہو گئے۔

تیسرے ایک اور شخص نے بیان کیا کہ سید صاحب کو ڈھونڈتے ہم ایک گاؤں میں ایک بگڑا ترے، وہاں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ قبر جو ڈھنکی ہوئی تازہ پڑی ہے، اس کو سید صاحب ابھی ڈھوا کر گئے ہیں، کیوں کہ اونچی تھی۔ ادھر ادھر دیکھا تو کہیں پتہ نہ لگا۔

مفتی محمد ابراہیم صاحب نے کہا کہ سید صاحب تیرہویں صدی کے آغاز میں پیدا ہوئے تھے ادا ب ۱۲۱۸ھ میں ممکن ہے کہ حیات ہوں۔ انھوں نے جب لفظ ممکن کہا تو حضرت امام ربانی (یعنی مولوی رشید احمد گنگوہی) نے ارشاد فرمایا؛ بلکہ ممکن اور فرمایا کہ سید صاحب انبٹھ میں بھی تشریف لائے، یہ

پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ اور سید احمد صاحب کے عاشق زار جناب ڈاکٹر قیام الدین احمد نے
مشہور غیبت پر عجیب فلسفیانہ رنگ میں اپنے تاثرات پیش کر کے صورت حال کو غتر بود کرنے کی
حتی الامکان کوشش کی ہے لیکن اتنے عظیم فراڈ کے باعث وہاں بیان ہند کے ماتھے پر جو گلنگہ
ٹیکہ لگا ہوا ہے اُسے صحیح ثابت کرنے کے راستے مسدود پا کر اظہار برأت کی توفیق بھی نہیں پائی۔
چنانچہ موصوف نے لکھا ہے :

”سب سے آخر میں اُن (سید صاحب) کو ایک گھمسان دست بدست معرکہ میں
لڑتے دیکھا گیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئے کسی نے اُن کو گرتے ہوئے اپنی
آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس لیے وہاں یوں کے ایک طبقے میں یہ خیال چکر لگاتا رہا
کہ سید احمد شہید نہیں غائب ہو گئے ہیں اور آئندہ کسی وقت پھر ظاہر ہوں گے۔
منطق اور عقل کی روشنی میں سید احمد قطعاً اسی جنگ میں شہید ہو گئے مگر بالا کوٹ
کے باقی ماندہ لوگوں اور اُن کے بہت سے رفقاء و متبعین کے لیے یہ ناگہانی
شدید ضرب ناقابلِ برداشت تھی۔ انھوں نے ایک مقصد عالی کے حصول کے لیے
اپنی تمام مادی املاک قربان کر دی تھی اور سید احمدؒ کے ساتھ ناقابلِ قیاس دُکھ
جھیلے تھے، لیکن اب قسمت کی ہوشربا ناگہانی بگڑتگی سے سب مٹ رہا تھا۔
غیبت کے نظریے کا پس منظر یہی ہے۔ دراصل یہ ایک ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اُن
کے مادی حرکات و سکنات کے منظر سے اُن کے محبوب سردار و رہنما کے یکسایہ
اُٹھ جانے اور مرجانے پر یقین کرنا اُن کے لیے دُشوار تھا۔ یہ نظریہ اُن کے اس
راسخ عقیدے کا ایک مقدس سایہ بھی تھا کہ سید احمدؒ حتمی طور پر فنا ہو گئے ہوں
تو ہو گئے ہوں مگر ان کا مشن فنا نہیں ہو سکتا۔“

ڈاکٹر قیام الدین احمد صاحب کو کم از کم اب تو یقین ہو چکا ہو گا کہ سید احمد صاحب کا مشن اب
مکمل طور پر فنا ہو چکا اور اُس کا ثنائیہ تک باقی نہیں رہا۔ رہا یہ نظریہ غیبت کون سے راسخ

عقیدے کا سایہ ہے، اس حقیقت کے چہرے پر وہابی علماء و مورخین نے جتنے بھی تہہ بر تہہ پرے
 اے ہوئے ہیں انشاء اللہ تعالیٰ اسی عتوان کے تحت آئندہ سطور میں ہم نے اُن تمام پردوں کو
 با حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب کا دوسرا فلسفہ ملاحظہ ہو :

”ہمارا در سبھا ش چندر بوس کی موتیں ہمارے عصر کے واقعات ہیں۔ ان کی موتیں
 بھی پرۂ راز میں مخفی تھیں۔ اول الذکر کی موت کے متعلق حکومت ہند کی مسلسل
 تحقیقات کے باوجود ان دونوں لیڈروں کے ہم وطنوں کے ایک طبقے میں اُن
 کی زندگی کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔ اگر محض سیاسی لیڈروں کے لیے ایسی
 محکمہ وفاداری و جان نثاری ہو سکتی ہے تو ایسے شخص کے لیے جو صرف سیاسی لیڈر
 نہیں بلکہ حسنات و خیرات کا کامل نمونہ تھا، اُس کے متبعین میں جو گرجوشی اور شرارتی
 محبت و عقیدت پیدا ہوتی ہوگی، قیاس کی جاسکتی ہے۔“

ڈاکٹر صاحب کے حکم سے قیاس تو ضرور کرنا پڑے گا لیکن سید صاحب کی پیشگوئیاں کدھر جائیں گی؟
 نبوت کے بعد جو سید صاحب کے خلفاء اور متبعین اُن سے ملاقات و گفتگو کرنے کے دعوے
 بناتے رہے کیا ایسے بیانات کو محبت و عقیدت ہی پر قیاس کیا جائے یا ایسی باتوں کا رد و نکل
 اور جلسا سازی سے بھی کوئی رشتہ ناطہ ہے؟ شیعہ حضرات کا اپنے امام مہدی کو غائب ماننا اور وہابی
 اہل بیت کا سید احمد صاحب کو مہدی بتانا اور غائب ماننا، کیا دونوں جماعتوں کا یہ نظریہ درست ہے؟
 اگر ایک جماعت کا بوجہ محبت و عقیدت ہے تو کیا دوسری جماعت کا بوجہ بغض و عداوت ہے؟
 اگر دونوں جگہ ایک ہی جذبہ کار فرما ہے تو دونوں کا حکم مختلف کیوں؟ موصوف نے مزید لکھا ہے:
 ”صادق پور کے ارکان خاندان خصوصاً ولایت علی برانگیز اور ہندوستانی مصنفین
 نے سید احمد کے ظہور ثانی عقیدہ کی اشاعت پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ اُن پر اس
 عقیدے کی اشاعت میں دانتہ بے ایمانی کا الزام عاید کیا گیا ہے کہ ولایت علی
 نے اس مقصد سے یہ قدم اٹھایا ہے کہ تحریک کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو پھر اُبھارا

جاسکے اور اس جدوجہد میں اپنی سرکاری بحال رکھی جائے۔

جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ عقیدہ ایک وقتی ہیجانی ردِ عمل تھا۔ اس پر سختی سے نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس تحریک کی خدمت جو ولایت علی اور ان کے بھائی عنایت علی نے انجام دیں وہ اتنی ٹھوس تھیں کہ اتنے سے موہوم فائدہ کے کمزور سہارے کی محتاج نہ تھیں۔“ ۱

چلیے وہابی حضرات کے اس عقیدے پر ہم بھی سختی سے نظر نہیں کرتے اور یہی باور کر لیتے ہیں کہ تحریک اس عقیدے کا فائدہ کمزور اور موہوم تھا، لیکن وہابی حضرات ٹھنڈے دل و دماغ سے کبھی یہ بتانے کی زحمت بھی گوارا فرمائیں گے کہ رسائلِ تسعہ میں جو مولوی ولایت علی صاحب کار سال بنام دعوت شامل ہے، اُس رسالے میں مولوی ولایت علی صاحب نے سید صاحب کی عیوب و غیبت اور ظور ثانی وغیرہ کے متعلق جو دو حدیثیں اپنے دماغ سے گھڑ کر شامل رسالہ کی ہوئی ہیں آخر اس جلسہ سازی کا سہارا لینے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ اگر یہ وضاحت بھی فرمادی جائے کہ حدیثیں گھڑنے والے کو شریعتِ مطہرہ کس نظر سے دیکھتی ہے، تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا ہر کسی کے لیے انتہائی آسان ہو جائے۔ کیا وہابی علماء ہماری درخواست پر اتنی سی تکلیف اٹھالیں گے؟

مولوی دین میں کہہ جاگ خدا لگتی کچھ

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

آئیے ہم بتاتے ہیں کہ سید احمد صاحب کے خلفاء اور تبعین کو ان کی عیوب و غیبت اور ظور ثانی کا عقیدہ کیوں اختیار کرنا پڑا؟ اس سلسلے میں ہم اپنی جانب سے کچھ کہیں، اس سے پہلے سید احمد صاحب کے چند ذاتی بیانات پیش کرنے مناسب ہیں تاکہ فیصلہ قارئین خود کر سکیں۔ چنانچہ سید صاحب نے عازم سرحد ہوتے وقت ایک پیشگوئی فرمائی تھی۔ مولوی محمد جعفر تھانی سری نے اُسے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بروقت روانگی خراسان آپ اپنی ہمیشہ یعنی والدہ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ اے میری بہن میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہندو کا شرک اور ابران کا رخص اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے ہو کر ہر مردہ سنت زندہ نہ ہو جائے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از طور ان واقعات کے کوئی شخص میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پہ حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا، تو تم اُس کے قول پر بزرگ اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ وثاق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔ آپ کے سفر جہاد سے پہلے (غالباً سفر حج میں) آپ کو یہ الہام ربانی ہوا تھا کہ ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے دریائے ستلج تک مثل ملک ہندوستان کے رشک افزائے چین ہو جائے گا، چنانچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر ایک مرید واقف تھا۔

ہندو ہائی حضرت اور فارسیں حضرت سے گزارش ہے کہ خوفِ خدا اور خطرہ روزِ جزا کو سامنے رکھو! اھم اھم! اھم! اھم! مسوؤلوں کے بگڑے زادینے والے منظر کو سامنے رکھ کر غور فرمائیے کہ سید صاحب نے ہندو کا شرک، ایران کا رخص، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق اپنی زندگی میں مٹا دیا تھا؛ کیا ہر مردہ سنت اُن کے ہاتھوں زندہ ہو گئی تھی؟ کیا واقعی انھوں نے اپنے لشکرِ کردہ الہام کے مطابق پشاور سے ستلج تک پنجاب کو فتح کر لیا تھا؟ اگر ان میں سے جیسا کہ ظاہر ہے، سید صاحب کوئی ایک کام بھی نہ کر سکے تو خود فیصلہ فرمائیے کہ موصوف کے یہ جملہ دعاوی اور الہامات ربانی تھے یا مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح یہ جملہ الہامات محض شیطانی تھے؟ کیا برٹش گورنمنٹ کی ہدایات پر کمال رازداری سے الہام کا لیبیل تو نہیں لگایا جاتا تھا؟ خدا اور نظرِ غائر سے کام لیتے ہوئے یہ فیصلہ بھی فرمالینا کہ سید صاحب کا پشاور سے ستلج

ملک پنجاب کو فتح کرنے کا مقصد اس علاقے کو بھی اسی قسم کا رشک افزائے چمن بنانا تھا، جیسا کہ
ہندوستان برٹش گورنمنٹ کی غلامی سے بن چکا تھا۔ اس بیان کی روشنی میں ذرا یہ سمجھئے اور سمجھانے
کی سعی فرمائی جائے کہ سید صاحب اسلام اور مسلمانوں کی کوئی خدمت کرنا چاہتے تھے یا ان کی ساری
ملک و دو انگریزی راج کی حدود کو وسیع کرنا تھا؟ اس امر کا فیصلہ کرتے وقت اگر محمد جعفر تھانی
کے درج ذیل بیان کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو معاملے کی تہہ تک پہنچنا بڑی حد تک آسان
ہو جائے گا۔ موصوف نے ان الہامات کی تاویل کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

”ملاحظہ مکتوبات احمدی، جن میں سید صاحب کا اصل مافی الضمیر بڑی صراحت کے
ساتھ بیسیوں مختلف واقعات پر ظاہر کیا گیا ہے اور اکثر موقوفوں کی تحریر سے واضح
ہوتا ہے کہ وعدہ فتح پنجاب کے الہام کا آپ کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اس کو
سراسر صادق اور ہونے والی بات سمجھ کر بارہا فرمایا کرتے تھے اور اکثر مکتوبات میں
لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں وسوسہ شیطانی اور شائبہ نفسانی کو ذرا بھی دخل
نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو
موت دے آئے گی۔“

لیکن واقعہ بالاکوٹ خواہ شہادت ہو خواہ غیبی بیت، بظاہر اس یقینی
الہام کے سراسر غلط ہوا۔ اب اس کا جواب یہی ہے کہ از روئے اصول شریعت
محمدی کے الہام ایک نطفی چیز ہے اور اس کی تاویلوں وغیرہ میں سو طرح کی غلطیوں
کا گمان ہوا ہے۔ یہ تو ضرور ہوا کہ اس وقوعہ کے پندرہ برس بعد سلطنت پنجاب
متعصب اور ظالم حکموں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد
اور لائندہ قوم کے ہاتھ میں آگئی کہ جس کو ہم مسلمان اپنے ہاتھ پر فتح ہونا
تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل میں ہوگی، جو
ظہور میں آئی۔“

قارئین کرام نے تھانیسری صاحب کی تاویل تو ملاحظہ فرمائی اب فیصلہ کرنا باقی ہے کہ سید صاحب کا مقصد اس تحریک جہاد سے برٹش گورنمنٹ کی حدود کو وسیع کرنا ہی تھا یا کچھ اور؛ نیز اُن کے اہامات ربانی تھے یا شیطانی؛ یہ فیصلے ہم قارئین کی صوابدید پر چھوڑ کر اس امر کا ذکر کرتے ہیں کہ جعفر تھانیسری صاحب نے بتایا ہے کہ فتح پنجاب کے الہام کا تذکرہ سید صاحب نے اپنے مکتوبات میں سبیل سے زائد مقامات پر تصریح کیا ہے۔ ہم اتنے تو نہیں ہاں چند مقامات کی نشان دہی کر دیتے ہیں تاکہ کوئی صاحب اسے تھانیسری صاحب کا افتراء بتا کر غلام رسول مہر صاحب کی طرح گلو خلاصی کرانے کی کوشش نہ کرتے پھریں۔ چنانچہ سید صاحب نے یار محمد خاں حاکم پاکستان کے نام خط لکھتے ہوئے تصریح فرمائی جس کا ترجمہ پیش خدمت ہے:

یہ فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بناء پر مامور ہے اور اُس مبشر کی اس بشارت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی دوسوہ اور نفسانی خواہش کا شائبہ اس الہام ربانی میں نہیں ہے۔ ۱

فقیر مڈناں کنھوی کے نام خط لکھتے ہوئے سکھوں کے استیصال کرنے یعنی پنجاب پر قابض ہونے کے الہام کا ذکر جن لفظوں میں کیا، اُن کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

”اب رہا الہام۔ وہ یہ ہے کہ اس فقیر کو پردہ غیب سے کفار یعنی لائبے بال والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ رحمانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار مجاہدین کو اُن پر غلبہ پانے کی بشارت دینے والا مقرر کیا گیا ہے۔ ۲

رہیں قلات خان خاناناں خلجائی کے نام جو مکتوب بھیجا گیا، اُس میں سید احمد صاحب نے پنجاب کے الہام کا جن لفظوں میں تذکرہ کیا اُن کا ترجمہ بغرض سہولت پیش خدمت ہے:

”اس کے علاوہ عرض یہ ہے کہ اس فقیر کو بارہا پردہ غیب سے وارد ہونے والی

روحانی باتوں اور ربانی الہام کے ذریعے جہاد کے نافذ کرنے اور کفر و فساد کے دفعیہ کے لیے صاف اور صریح اشاروں کے ساتھ مامور کیا گیا ہے اور فتح و کامیابی کی سچی بشارتوں کی خبر دی گئی ہے“ ۱

مکتوب بنام شاہ بخارا میں سید صاحب نے اسی بات کو یوں دہرایا ہے:

”قیام جہاد کے معاملے اور کفر و فساد کے دفع کرنے کے لیے الہام اور روحانی مکالمہ کے ذریعے غیبی امامت سے اس فقیر کو مشرف فرمایا اور ہم کو فتح و نصرت کے متعلق ایسی بشارتوں کا مخبر اور اس پروردگار عالم کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے مؤثر کارروائی کے لیے اور سید المرسلین کی سنت کے احیاء اور سرکش کافروں کی بیخ کنی اور بنیاد کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے مامور فرمایا ہے اور اپنے سچے وعدوں کے بموجب مظفر و منصور کے لقب سے ملقب فرمایا ہے“ ۲

اپنے درجہ امامت سے ہر خاص و عام وہابی اور نام نہاد مجاہدین کے ہر فرد کو مطلع کرنے کی غرض سے سید صاحب نے ایک سرکھریا اشتہار عام منشر کروایا، جس میں یہ تصریح بھی فرمائی گئی:

”اللہ کا شکر اور احسان ہے کہ اُس مالک حقیقی اور بادشاہ تحقیقی نے اس گوشہ نشین فقیر عاجز اور خاکسار کو پہلے تو غیبی اشاروں اور اپنے الہامات کے ذریعے، جن میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے، خلافت کا اہل ہونے کی بشارت دی۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت اور خاص و عام کی تالیف قلوب کے لیے مرتبہ امامت سے مجھ کو مشرف فرمایا۔ چنانچہ بتاریخ ۱۲ جمادی الثانی روزِ پنجشنبہ ۱۲۴۲ھ ساداتِ کرام، علماء، مشاہیر اور بڑے بڑے مشائخ اور باحشمت صاحبزادوں اور بلند مرتبت خوانین نے معہ تمام

خاص و عام مسلمانوں کے میرے ہاتھ پر بیعت کر کے، مجھ کو اپنا امام قرار دیا اور میری امامت اور حکومت کو تسلیم کر کے میری اطاعت پر تسلیم خم کر دیا اور اُس روز سے اب تک یہ بیعت اس فقیر کے ہاتھ پر جاری ہے اور تمام مسلمانوں میں اس کا پرچا ہے۔“ ل

سلطان محمد خاں والی پشاور کے مشیر و دبیر جناب فیض اللہ خاں مہمند کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے انہیں اسی الہام کا قائل بنانے اور اپنی حمایت پر آمادہ کرنے کی خاطر یوں سیاست رانی تھی :

”آپ کے ذہن و دماغ پر اس خاکسار کا معاملہ آفتاب نصف النہار کی طرح ظاہر و باہر ہے کہ میں قوم سکھ جیسے دشمنوں کے ساتھ جہاد کے لیے مامور ہوں اور فتح و نصرت کا مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اُس بادشاہِ مٹان کے وعدوں کے خلاف یہ سب وہم و گمان، کافروں اور گمراہوں کے وسوسے ہیں نہ کہ دینداروں اور اور ایمان والوں کی سمجھ بوجھ ہے۔“ ل

سید صاحب کا اس الہام کی بار بار تشہیر کرنا کہ پنجاب میرے ہاتھ پر ضرور فتح ہو گا نیز یہ شکوئی کرنا کہ میرے ہاتھوں جب تک ہندوستان کا شرک، چین کا کفر، ایران کا رفس اور افسانہ نگان کا نفاق نہ مٹ جائے گا، اُس وقت تک اللہ تعالیٰ مجھے موت نہیں دے گا اور اگر میری موت کی کوئی حلیفہ شہادت بھی دے پھر بھی اُسے سچا نہ جاننا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جنہوں نے موصوف کے خلفاء اور متبعین کو مجبور کیا کہ سید صاحب کی موت کا انکار کر کے غیوبیت کا منہ کھڑا کر دیں تاکہ لوگ اُن کے الہامات کو محض ایک فراڈ نہ سمجھنے لگیں اور انہیں حقیقت نفس الامری کا پتہ نہ لگ جائے۔ اگر دہائی حضرات سید صاحب کی غیوبیت کا افسانہ نہ گھڑتے تو دہائی صاحبوں کو سید صاحب کو بزرگ بنانے کی قطعاً گنجائش باقی نہ رہی تھی بلکہ اُنھیں

شروع سے مسلمان مرزا غلام احمد دہانی کا پیشرو اور قائد جاننے لگ جاتے، اُن کے اہل اہل کی حقیقت سے واقف ہو جاتے اور ہندوستان سے جو ان نام نہاد مجاہدین کے لیے اہل دین رہی تھی اُس کا سلسلہ قطعاً بند ہو جاتا۔ یہ تین ضرورتیں تھیں جنہوں نے اُن کے خلفاء کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کا یہ پُراسرار ڈرامہ پیش کر دیں جو تاریخ کا المناک سانحہ اور وہابیہ کی افسوسناک شرارت کے سوا اور کچھ نہیں۔ نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُورِ اَنْفُسِنَا۔

دشمن مصطفیٰ کی نسل منقطع
سرسبزین پاک و ہند میں ہزاروں اولیائے کرام آرام فرما ہیں۔
جنہوں نے اپنی زندگیاں اعلیٰ کلمۃ الحق کے لیے وقف کر رکھی تھیں اور اُن میں سے ہر ایک نے بے شمار غیر مسلموں کو سلقہ بگوش اسلام کیا، جس کے باعث آج بھی وہ مرجع خلافت ہیں اور مسلمانوں کے دلوں پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ اُنہوں نے خود کو پیکرِ تسلیم و رضا بنا کر رکھا تھا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دل اُن کی جانب جھکا دیے۔ مزاراتِ بزرگانِ دین اُن حضرات کی مقبولیت اور مرجع خلافت ہونے کے زندہ ثبوت ہیں لیکن اس کے باوجود وہابی حضرات کی خواہش ہے کہ اولیاء اللہ کی جانب سے مسلمانوں کی توجہ پھیر کر اپنے اَرَبِا بَا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہ کی جانب مبذول کرائیں، اسی مقصد کی خاطر مشہور وہابی عالم مولوی محمد جعفر تھانیسری نے لکھا تھا:

”مولوی عبد اللہ صاحب معرفت جتوڑے سے (جو ایک اولیاء کامل صاحب کشفِ ملتان میں تھے) کسی نے پوچھا کہ ہند کے اولیاء اللہ میں سے سب سے برتر مقبول خدا ولی کون سا بزرگ ہے، اُنہوں نے جواب دیا کہ عالم ارواح کی سیر میں، میں نے دیکھا ہے کہ سب سے بڑا درجہ اولیائے ہند میں مولوی محمد اسماعیل شہید کا ہے، کیونکہ میں نے مولانا شہید کو جنت میں ایک چھپر کھٹ پر لیٹے ہوئے اور کتاب صراط المستقیم کا مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا ہے۔“

قطع نظر اس کے کہ مولوی اسماعیل دہلوی کے نزدیک کشف کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے اور
مکار ہیں جیسا کہ تقویۃ الایمان میں لکھا ہے اور قطع نظر اس کے کہ چھپر کھٹ پر لیٹنے والا اولیاء اللہ
سے بزرگس طرح ہو گیا اور قطع نظر اس کے کہ قرآن و حدیث کی جگہ صراط المستقیم نامی کتاب کا
پڑھنے والا کیونکر سرتاج اولیاء ہو گیا؟ کیا داتا گنج بخش علی ہجویری، خواجہ معین الدین اجمیری،
خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، حضرت فرید الدین شکر گنج، حضرت نظام الدین اولیاء اور
حضرت مجدد الدلت ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہم جیسی ہستیاں مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے
کمتر تھیں؟ خدا کے بند و اگر جھوٹ بولتے ہوئے مخلوق سے شرم نہیں آتی تو کم از کم خالق سے
توڑنا چاہیے۔ اور نہ سہی تو دہلوی صاحب کی قبر کہاں تک مرجع خلایق ہے، اُسی کی جانب
توجہ کر کے کوئی عقل کی بات کہہ دیا کیجیے۔ موصوف کی قبر کے بارے میں تھانیسری صاحب
رقطراز ہیں؛

”افسوس ہے کہ ایسے شخص کفر و شرک کے قاطع کی قبر پر اب وہاں کے لوگ
نسوار چڑھا کر منتیں اور مرادیں آپ سے مانگتے ہیں“

تھانیسری صاحب شکوہ تو کرنے بیٹھ گئے لیکن اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟
جانب والا! جیسے وہ بزرگ تھے ویسے ہی اُن پر چڑھاوے چڑھ رہے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ ہمت
اور توفیق دے تو کبھی اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر بھی دیکھ لیجیے کہ مخلوق خدا کیسے والہانہ انداز
میں اُن کی جانب دوڑتی چلی جاتی ہے۔ ہر وقت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ فیض کے دریا رواں ہیں
اور پیاسے جھوم جھوم کر اُن کی جانب دوڑتے چلے جا رہے ہیں۔ سعادت مند اُن حضرات کی
بدولت فیوض و برکات سے خوب سیراب ہوتے اور عنایات سے مالا مال ہوتے رہتے ہیں۔
لیکن دہلوی صاحب کی قبر پر اگر نسوار نہ چڑھانی جاتی تو اور کیا چیز چڑھانی چاہیے تھی۔ کاش!
موصوف کے قلعین و معتقدین کبھی اس جانب بھی توجہ فرمائیں کہ نسل منقطع تو دشمنانِ رسول
کی ہوتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: **إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ** اور جس کی

زندہ مثال یہ بھی ہے کہ یزید جیسے دشمن اہل بیت کی اولاد سے آج ایک فرد بھی دنیا میں موجود نہیں لیکن ساداتِ کرام کا کوئی شمار نہیں۔ اسی طرح توہین و تنقیصِ شانِ رسالت کے باعث موجود اپنے سارے خاندان ہی کو لے ڈوبے، جیسا کہ تھانیسری صاحب نے بھی لکھا ہے،

”مولوی محمد عمر صاحب آپ کے صاحبزادے تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں وہ بھی لاؤلدر اس جہان سے رخصت ہو گئے اور اس دنیا کے ناپائیدار کی حقیقت پر بڑا افسوس ہے کہ اس خاندانِ عالی، شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ میں، جس میں بیسیوں عالمِ فاضل موجود تھے، اب ایک شخص بھی نہیں رہا۔ بالکل خاندانِ بھر کا خاتمہ ہو گیا۔“

اگر اپنے مولویوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے والے حضرات کبھی حقیقت کو سامنے رکھ لیا کریں، کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا کہہ دیا کریں تو اس میں قباحت ہوگی نہیں بلکہ جو حضرات اس غلط پروپیگنڈے کے باعث گمراہ ہوتے چلے جاتے ہیں، وہ گمراہی سے بچ جائیں اور غرور و دُکڑنے والوں کے سروں پر کم از کم دوسروں کو گمراہ کرنے کا وبال تو نہ پڑے۔

اے کاش ترے دل میں اُتر جائے مری با

وہابی علماء و مورخ ایک عرصہ سے کتاب التوحید و تقویۃ الایمان کی مماثلت یہی شور مچاتے آرہے ہیں کہ ہمارے مولوی محمد اسماعیل صاحب دہلوی جب اپنے قافلے سمیت ۱۲۳۸ھ میں حج بیت اللہ کی غرض سے گئے تھے تو اُن کی اصحابِ محمد بن عبد الوہاب نجدی سے قطعاً ملاقات نہیں ہوئی تھی اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کا ۱۲۰۶ھ میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس سے وہ حضرات بھولے بھالے مسلمانوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ مولوی اسماعیل دہلوی پر وہاں بیت کا لیل لگانا انصاف سے بعید اور برطانوی سازش ہے۔ وہاں بیت کی نسبت سے وہ حضرات فوراً سیخ پا ہو جاتے ہیں اور تحریروں و تقریر میں اس نسبت کو برٹش گورنمنٹ کی شرارت قرار دینا ہی کافی و دشنامی جواب گردانتے ہیں:

ہمیں ہر دست اس بات سے کوئی واسطہ نہیں کہ دہلوی صاحب اینڈ کمپنی کی قاضی شوکانی سے ملاقات ہوئی تھی یا نہیں؟ اس بات سے بھی کوئی واسطہ نہیں کہ لفظ وہابیت کے استعمال میں برٹش گورنمنٹ کی منشاء کو دخل ہے یا نہیں؟ ہمیں صرف یہ دیکھنا اور دکھانا ہے کہ محمد بن عبد الوہاب نجدی اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے عقاید و نظریات میں کوئی مماثلت پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اس امر کا جائزہ لینے کی خاطر ہم نجدی امام الوہابیہ کی کتاب التوحید صغیر کی بعض عبارتیں حضرت مولانا فضل رسول بدایونی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۲۸۹ھ / ۱۸۷۲ء) کی تصنیف لطیف سیف الجبار کے حوالے سے پیش کرتے ہیں اور ان کے بالمقابل مولوی اسماعیل دہلوی کی تقویۃ الایمان سے عبارتیں پیش کرتے جاتیں گے۔ ایسا کرنے سے ہماری غرض صرف یہی ہے کہ قارئین کرام خود فیصلہ فرمائیں کہ نجدی و ہندی وہابیہ کے مذہبی خیالات اور کتاب التوحید و تقویۃ الایمان میں کوئی تضاد پایا جاتا ہے یا پوری پوری مطابقت ہے؟

خیال رہے کہ کتاب التوحید صغیر وہی تصنیف ہے جسے نجدی امام الوہابیہ نے علمائے حرمین کی خدمت میں بھیجا تھا اور ان بزرگوں نے اس خرافات کے پلندے کا وہی جواب دیا تھا جو دین کے خادموں اور علم ہمیر کے وارثوں کو دینا چاہیے تھا۔ اب قارئین کرام دونوں کتابوں کی عبارتیں اور ان کے تیور ملاحظہ فرمائیں:

(۱)

تقویۃ الایمان

سننا چاہیے کہ شرک لوگوں میں بہت
پھیل رہا ہے اور اصل توحید
نایاب لیکن اکثر لوگ شرک اور توحید
کے معنی نہیں سمجھتے سچ فرمایا
اللہ صاحب نے سورہ یوسف میں
وما یومن اکثرہم باللہ

کتاب التوحید صغیر

اعلموا ان الشک قد شاع
فی هذا الزمان وذاع والامر
قد ال الى ما وعد الله
وقال وما یومن اکثرہم
باللہ الا وہم مشرکون -

الا وہم مشرکون۔ لہ

(۲)

و ظہر ما قال رسول اللہ لا تقوم
الساعة حتى تلتحق قبائل من
أمتی بالمشرکین و حتی تعبد قبائل
من امتی الاوثان رواہ الترمذی
وعن عائشہ قالت سمعت رسول
اللہ يقول لا یذهب اللیل والنہا
حتى تعبد اللات والعزى
فقلت یا رسول اللہ انی کنت
لا ظن حین انزل اللہ هو الذی
ارسل رسولہ بالهدی و
دین الحق یظہرہ علی الدین
کله ولو کرہ المشرکون ان
ذلك سیکون باتاً قال انہ
سیکون ما شاء اللہ ثم بیعت
اللہ ریحاً طیبہ فتوفی من
کان فی قلبہ حبیۃ من خردل
من ایمان فی بقی من لا
خیر فیہ فیرجعون الی
دین اباہم رواہ مسلم

اللہ صاحب نے سورہ براءۃ میں فرمایا
ہے کہ اللہ صاحب نے اپنے رسول
صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا ہے ہدایت
اور سچا دین دے کر کہ اس کو غالب
کرے سب دینوں پر، اگرچہ مشرک
لوگ بہتیرا ہی برہانیں سو حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا نے اس آیت سے سمجھا کہ
اس سچے دین کا زور قیامت تک رہے گا
سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
کہ اس کا زور تو مقرر ہو گا جب تک
اللہ چاہے گا، پھر اللہ آپ ایسی
ایک باؤ (ہوا) بھیجے گا کہ سب اچھے
بندے جن کے دل میں تھوڑا سا
بھی ایمان ہو گا، مرجائیں گے اور
وہی لوگ رہ جائیں گے جن میں کچھ
بھلائی نہیں۔ یعنی نہ اللہ کی تعظیم نہ
رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ
باپ دادوں کی رسموں کی سنت پڑنے
لگیں گے سو اس طرح شرک میں

فانا نرى عامة مومنى هذا
الزمان مشركا۔
پڑجائیں گے، کیونکہ اکثر پرانے باپ
دادے جاہل مشرک گزرے ہیں جو کوئی
اُن کی راہ و رسم کی سند پکڑے، آپ بھی
مشرک ہو جاوے۔

(۳)

فقد ثبت بالنصوص القرآنية
ان من اعتقد النبى وغيره
وليته فهو وابو جهل في
الشرك سوا۔
اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ صاحب
نے کسی کو عالم میں تصرف کرنے کی قدرت
نہیں دی.... مگر یہی پکارنا، بتیں مانتی
نذر و نیاز کرنی، اُن کو اپنا وکیل اور سفارشی
سمجھنا، یہی اُن کا کفر و شرک تھا۔ سو جو کوئی
کسی سے یہ معاملہ کرے، گو اس کو اللہ کا
بندہ اور مخلوق ہی سمجھے، سو ابو جہل اور وہ
شرک میں برابر ہیں۔

(۴)

والشرك الاكبر هو الاشراك
فيما خصصه الله تعالى لنفسه
وهو كشركنا ذكر شيئا
منه ليقاس عليه غيره فنقول
هو اربعة اقسام۔ الاول الاشراك
في العلم اعني اثبات مثل
علم الله لغيره بكونه حاضراً
اب یہ بات تحقیق کی چاہیے کہ اللہ صاحب
نے کون کونسی چیزیں اپنے واسطے خاص
کر رکھی ہیں کہ اُن میں کسی کو شریک نہ
کیا چاہیے۔ سو وہ باتیں بہت ساری
ہیں مگر کئی باتوں کا ذکر کر دینا اور اُن کو
قرآن و حدیث سے ثابت کرنا ضرور ہے
تا اور باقی باتیں اُن سے لوگ سمجھ لیں۔

و ناظر آتی کل مکان و مطلعاً علیٰ کل شیء و فی کل ان بعیداً
 کان او قریباً خفیاً کان او جلیاً
 فمن اعتقد انه اذا ذکر اسم نبی فیطمع هو علیہ
 لصار مشرکاً و هذا الاعتقاد شرك سواء کان مع نبی
 او ولی او ملک او جنی او صنم و وشن و سواء کان یعتمد حصو
 له بذاته او باعلام الله تعالیٰ بای طریق کان
 یصیر مشرکاً۔

سوا اول بات یہ ہے کہ ہر جگہ حاضر و ناظر رہنا
 اور ہر چیز کی خبر برابر ہر وقت رکھنی، دور
 ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کھلی، اندھیرے
 میں ہو یا اجالے میں..... یہ اللہ ہی کی
 شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں۔ سو
 جو کوئی کسی کا نام اٹھتے بیٹھتے لیا کرے،
 دور و نزدیک سے پکارا کرے.... اور
 یوں سمجھے کہ جب میں اُس کا نام لیتا ہوں
 زبان سے یا دل سے.... تو وہیں اُس کو
 خبر ہو جاتی ہے، اُس سے میری کوئی بات
 چھپی نہیں رہ سکتی.... سو ان باتوں سے
 مشرک ہو جاتا ہے.... خواہ یہ عقیدہ انبیاء و
 اولیاء سے رکھے، خواہ پیرو شہید سے، خواہ
 امام اور امام زادے سے، خواہ بھوت اور
 پری سے۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ بات اُن کو
 اپنی ذات سے ہے، خواہ اللہ کے دینے
 سے انرض اس عقیدے سے ہر طرح شرک
 ثابت ہوتا ہے۔ لہ

(۵)

والثانی الاشراک فی التصرف
 اعنی اثبات مثل تصرف اللہ
 دوسری بات یہ ہے کہ عالم میں ارادے
 سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا۔

لغیرہ سواء اعتقد ان قدرہ
 المصروف له بذاته تعالیٰ
 او باعطاء الله تعالیٰ۔
 کا ساقصوف ثابت کرنا محض شرک ہے
 پھر خواہ یوں سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت
 ان کو خود بخود ہے خواہ یوں سمجھے کہ اللہ نے
 ان کو ایسی طاقت بخشی ہے، ہر طرح شرک
 ثابت ہوتا ہے۔

(۶)

والثالث الاشراك في العبادة
 ای تعظیم غیر اللہ کتعظیمہ اعنی
 الاعمال التي خصها الله
 تعالیٰ لتعظیمہ مثل السجود و
 الرکوع والتمثل قائماً يقف
 عند احدكما يقف في الصلوة
 له والصوم له وشد الرحل
 الى بيته والتشكل الخاص
 بالاحرام والطواف والدعاء
 من الله ههنا والتقبيل واليقاد
 السرج والمجاورة والتبرك
 بالباء والرجعة التمجیدی
 وتعظیم حرمہ وامثال ذلك
 فمن فعل بنبی او ولی او قبره
 واشاره او مشاهدہ وما
 تیسری بات یہ ہے کہ بعضے کام تعظیم
 کے اللہ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں کہ
 ان کو عبادت کہتے ہیں جیسے سجدہ اور رکوع
 اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اُس کے
 نام پر مال خرچ کرنا، اُس کے نام کا روزہ
 رکھنا، اُس کے گھر کی طرف دُور دُور سے
 قصد کر کے سفر کرنا..... اور رستے میں
 اُس ماک کا نام پکارنا، نام مقول باتیں کرنے
 اور شکار سے بچنا اور اسی قید سے جا کر
 طواف کرنا، اُس گھر کی طرف سجدہ کرنا،
 اُس کی طرف جانز لے جانے، وہاں منتیں
 ماننی، اُس پر غلاف ڈالنا، اُس کی چو کھٹ
 کے آگے کھڑے ہو کر دُعا مانگنی.....
 اُس کے گرد روشنی کرنی، اُس کا مجاور
 بن کر اُس کی خدمت میں مشغول رہنا.....

يتعلق به شيئاً من السجود والركوع وبذل المال له والصلوة له والصوم له والتمثل قائماً وقصداً لسفراليه والتقبيل و الرجعة القهقري وقت التذيع وضرب الخباء وارضاء الستارة والستر بالشوب والدعاء من الله ههنا والمجاورة والتعظيم حواله واعتقاد كون ذكر غير الله عبادةً وتذكره في الشدايد ودعاءه بخوبيا محمديا عبد القادر يا حداد يا سمان فقد صار مشركاً كافراً بنفس هذه الاعمال سواء اعتقد استحقاقه لهذا التعظيم بذاته اولاً۔

اس کے کنویں کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا ،
 بدن پر ڈالنا ، آپس میں بانٹنا ، غائبوں کے
 واسطے لے جانا ، رخصت ہوتے وقت اٹے
 پاؤں چلنا ۔۔۔۔۔ پھر جو کوئی کسی پر پیغمبر کو یا
 جھوت پری کو یا کسی کی سچی یا جھوٹی قبر کو یا
 کسی کے تھان کو ۔۔۔۔۔ سجدہ کرے یا کرے
 کرے یا اُس کے نام کا روزہ رکھے یا ہاتھ
 باندھ کر کھڑا ہو یا جانور چڑھائے یا ایسے
 مکان میں دُور دُور سے قصد کر کے جائے
 ۔۔۔۔۔ چوکھٹ کو بوسہ دے ، ہاتھ باندھ کر
 التجا کرے ، مراد مانگے ، مجاور بن کر بیٹھ جائے
 رخصت ہوتے وقت اٹے پاؤں چلے ، وہاں
 کے گرد و پیش کے جنگل کا ادب کرے اور اسی
 قسم کی باتیں کرے ، سو اُس پر شرک ثابت
 ہوتا ہے ۔ اس کو اشراک فی العبادہ کہتے
 ہیں ، یعنی اللہ کی سی کسی کی تعظیم کرنی ۔ پھر
 خواہ یوں سمجھے کہ یہ آپ ہی اس تعظیم کے
 لائق ہیں یا یوں سمجھے کہ ان کی اس طرح کی
 تعظیم کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور
 اس تعظیم کی برکت سے اللہ مشکلیں کھول
 دیتا ہے ۔ ہر طرح شرک ثابت ہوتا ہے ۔

(۹)

فمن ائبته لغيره نبياً كان
او ولياً صنماً او وثناً ملكاً او
جنياً فقد اشرك بالله -
اور جو کوئی کسی نبی اور ولی کو یا جن اور
فرشتہ کو یا امام اور امام زادہ کو یا پیر اور
شہید کو یا نجومی اور رمال کو یا مجنوت
اور پری کو ایسا جانے اور اُس کے حق
میں یہ عقیدہ رکھے سو وہ مشرک ہو جاتا ہے !

(۱۰)

وعن عائشة قالت من اخبر
لشان محمداً يعلم الخمس
التي قال تعالى ان الله عنده
علم الساعة الاية فتداعظم
الفريه -
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:
جو کوئی خبر دے تجھ کو کہ حضرت پیغمبر خدا
صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے وہ پانچ
باتیں کہ اللہ نے مذکور کی ہیں ان اللہ عنده
علم الساعة (الایة) سو بے شک
اُس نے بڑا طوفان باندھا۔ ۱۰

(۱۱)

الفصل الثالث في سدا الاشراك
في التصرف -
اس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں کا ذکر
ہے جن سے اشراک فی التصرف کی برائی ثابت
ہوتی ہے۔ ۱۱

(۱۲)

والانبياء اذا يأمهم الله
بشيئ يخافون ولا يستطيعون
اُس کے دربار میں ان کا تو یہ حال ہے کہ
جب وہ حکم فرماتا ہے، یہ سب رعابیں
والا نبیاء اذا یأمرهم اللہ
بشیئ یشافون ولا یشطیعون

التفتیش فی حکم السنوٰل اگر بے حواس ہو جاتے ہیں۔ ادب اور
عنه ثانیاً۔ دہشت کے مارے دوسری بار اُس بات
کی تحقیق اُس سے نہیں کر سکتے۔ لے

—————(۱۳)—————

فانہا لا تصون الآبات مگر اُس امیر سے دب کر اُس کی سفارش
یکون الشفیع وجیہا مان لیتا اور چور کی قصیر معاف کر دیتا ہے
فیخاف الشفوع الیہ من کیونکہ وہ امیر کی سلطنت کا بڑا رکن ہے
عدم قبول شفاعتہ اور اُس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے
فوات مطالب مهمۃ برجوها رہا ہے۔ سو بادشاہ یہ سمجھ رہا ہے کہ ایک
من الشفیع لکونہ ظہیراً جگہ اپنے غصہ کو تمام لینا اور ایک چور سے
ومعاوناً۔ درگزر کر جانا بہتر ہے اس سے کہ اتنے
بڑے امیر کو ناخوش کر دیجئے کہ بڑے بڑے
کام خراب ہو جاویں اور سلطنت کی رونق
گھٹ جاوے۔ لے

—————(۱۴)—————

واما ان یکون الشفیع دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی بادشاہ اور
محبوباً فیستألم من عدم میں سے یا بیگمات میں سے یا کوئی
رضاء و ہذا ان یتحیلان بادشاہ کا معشوق اُس چور کا سفارشی
فی شانہ تعالیٰ عما یصنون۔ ہو کر کھڑا ہو جائے اور چوری کی سزا نہ
دینے دے۔ بادشاہ اس کی محبت سے

لاچار ہو کر اُس چور کی تعمیر معاف کر دے،
 تو اُس کو شفاعتِ محبت کہتے ہیں۔ یعنی
 بادشاہ نے محبت کے سبب سے سفارش
 قبول کر لی اور وہ یہ بات سمجھا کہ ایک بار
 غصہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا
 بہتر ہے اُس رنج سے کہ جو اُس محبوب
 کے روٹھ جانے سے مجھ کو ہو گا۔ ل

(۱۵)

واما الشفاعة بالاذن التي كلا
 شفاعة وهو المذكور في
 القرآن والحديث فحالها
 انها لا تكون لاهل الكبائر
 الذين ماتوا بلا توبة ولا
 للمصرين وكيفية
 الشفاعة ان الحكيم العدل
 لما يرى من عبده توبة و
 ندامة وانا بة اليه لا الى
 غيره يرحم عليه و لكن
 حكمه وفعله كله عدل لا
 يشوبه جور وظلم فلا يستطيع
 العفو بلا سبب وان عفا عنه
 تيسري صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثوابت
 ہو گئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں... مگر
 نفس کی شامت سے قصور ہو گیا۔ سو
 اُس پر شرمندہ ہے۔ رات دن ڈرتا ہے
 بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر وزیر
 کی پناہ نہیں ڈھونڈتا۔ رات دن اُس
 کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھے میرے حق
 میں کیا حکم فرمائے۔ سو اُس کا یہ حال
 دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اُس پر ترس
 آتا ہے، مگر آئین بادشاہت کا خیال
 کر کے بے سبب درگزر نہیں کرتا کہ
 کہیں لوگوں کے دلوں میں اُس کے
 آئین کی قدر گھٹ نہ جائے۔ سو کوئی امیر وزیر

و غفر له بلا سبب اختل قاعدة العدل وانتقص شان حكمه في اعين الناظرين ويحاجونه فياذن لمن يشاء ان يشفع له فيشفع فيعفو في الحقيقة برحمته وفي الظاهر باسم شفاعته الشفيع حفظاً لقاعدة -

اُس کی مرضی پا کر اس تقصیر وار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اُس امیر کی عزت بڑھانے کو ظاہر میں اُس کی سفارش کا نام کر کے اُس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے سو اللہ کی جناب میں اس قسم کی شفاعت ہو سکتی ہے اور جس نبی و ولی کی شفاعت کا قرآن و حدیث میں مذکور ہے سو اُس کے معنی یہی ہیں۔ لے

(۱۶)

الی ان قال یا فاطمة انقذی نفسك من النار سلینی من مالی ما شئت فانی لا اغنی عنك من الله شیئاً انظروا قنط النبی قرابتہ حتیٰ ابنتہ من نفعہ لهم عند الله فما ل هؤلاء المجانین یرجیون شفاعتہ لهم عند الله -

سو انھوں نے سب کو، اپنی بیٹی تک کو کھول کر سنا دیا کہ قرابت کا حق ادا کرنا اُسی چیز میں ہو سکتا ہے کہ اپنے اختیار میں ہو، سو یہ میرا مال موجود ہے، اس میں مجھ سے کچھ بخل نہیں۔ اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا اور کسی کا وکیل نہیں بن سکتا۔ سو وہاں کا معاملہ ہر کوئی اپنا درست کرے اور دوزخ سے بچنے کی ہر کوئی تدبیر کرے۔ لے

(۱۷)

الفصل الرابع فی ردة الاشرارک سو اس فصل میں مذکور ہے کہ قرآن و

حدیث میں اللہ کی تعظیم کے لوگوں کو کون کون
سے کام بتائے ہیں تاکہ اور کسی کے لیے
وہ کام نہ کیجیے کہ شرک لازم آئے۔ لہ

(۱۸)

ولا یغترسجدة الملائكة لآدم
و یعقوب لیوسف کما یقولہ
الجاهل فانہ صار منسوخاً
عن النکاح مع الاخت۔

جو کوئی یہ بات کہے کہ اگلے دینوں میں کسی
مخلوق کو بھی سجدہ کرتے تھے جیسے فرشتوں
نے حضرت آدم کو کیا اور حضرت یعقوب
نے حضرت یوسف کو تو ہم بھی اگر کسی بزرگ
کو کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں۔ سو یہ بات
غلط ہے۔ آدم کے وقت کے لوگ اپنی
بہنوں سے نکاح کر لیتے تھے چاہے یہ
لوگ ایسی ایسی حجتیں لانے والے اپنی
بہنوں سے نکاح کر لیں۔ لہ

(۱۹)

ثبت بهذه الآية ان السفر
الى قبر محمد ومشاهدة
ومساجده واثاره وقبر
نبي وولى وسائر الاوشان
وكذا طوافه وتعظيم حرمه
وترك الصيد والتحرر عن

سو اس قسم کے کام کسی اور کی تعظیم کیلئے
نہ کیا چاہئیں کسی کی قبر پر یا چلنے پر یا
کسی کے تھان پر دُور دُور سے قصد کرنا
سفر کی رنج و تکلیف اٹھا کر، میلے کپیلے
ہو کر وہاں پہنچنا، وہاں جا کر جانور چڑھانے،
مقبور پوری کرنی، کسی قبور یا مکان کا طواف کرنا

قطع الشجر و غیرہا شرک
اصبر فان الله تعالى خصص
هذه الامور لذاته وانزل
هذه الآية لبيانہ۔
اُس کے گرد پیش کے جنگل کا ادب کرنا
یعنی وہاں شکار نہ کرنا، درخت نہ کاٹنا،
گھاس نہ اکھاڑنا اور اسی قسم کے کام
کرنے اور اُن سے کچھ دین و دنیا کے
فائدہ کی توقع رکھنا، یہ سب شرک کی باتیں
ہیں، ان سے بچنا چاہیے۔ ۱

(۲۰)

الفصل الخامس في سرّة الاشراك
في العادة۔
اس فصل میں اُن آیتوں اور حدیثوں کا ذکر
ہے جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی
اپنے دنیا کے کاموں میں جیسا معاملہ اللہ
سے رکھتا ہے اُس کی تعظیم طرح طرح سے
کرتا ہے ویسا ہی معاملہ اور کسی سے
نہ کرے۔ ۲

(۲۱)

عن قيس ابن سعد قال اتيت
الحيرة فرأيتهم يسجدون
لمرربان لهم فقلت يا رسول الله
انت احق ان يسجد لك
قال اُمرأت لو مردت بقبري
أكنت أسجد له فقلت لا ففعل
ابو داؤد نے ذکر کیا کہ قیس بن سعد نے
نقل کیا کہ گیا میں ایک شہر میں جس کا نام
حیرہ ہے۔ سو دیکھا میں نے وہاں کے
لوگوں کو کہ سجدہ کرنے تھے اپنے راجہ کو۔
سو کہا میں نے البتہ پیغمبر خدا صلی اللہ
علیہ وسلم زیادہ لایق ہیں کہ سجدہ کیجیے اُن کو۔

۱۔ اسماعیل دہلوی: تقویۃ الایمان، ص ۸۰
۲۔ ایضاً، ص ۹۱

لا تفعلوا اخرجه ابوداؤد انظروا
 اعتذر النبی صلی اللہ تعالیٰ
 علیہ والہ وسلم بمنع
 السجود لکونه سنة فی قبرہ۔
 پھر آیا میں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے
 پاس۔ پھر کہا میں نے، گیا تھا میں حجرہ کو،
 سو دیکھا میں نے اُن لوگوں کو کہ سجدہ کرتے
 تھے اپنے راجہ کو، سو بہت لایق ہو کہ

سجدہ کریں ہم آپ کو۔ تو فرمایا مجھ کو، بجلا
 خیال تو کر جو تو گزرے میری قبر پر کیا
 تو سجدہ کرے اُس کو؟ میں نے کہا نہیں۔
 فرمایا تو مت کر ایسا۔ یعنی میں بھی ایک
 دن مکر مٹی میں ملنے والا ہوں تو کب سجدہ
 کے لائق ہوں۔ لے

بہ چند عبارتیں بطور نمونہ بالمقابل پیش کر دی ہیں، ان سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ کتاب التوحید
 اور تقویۃ الایمان کے نقطہ نظر میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ ہندی امام الوہابیہ نے نجدی امام الوہابیہ
 کے عقاید و نظریات ہی کو پیش کیا ہے اور تقویۃ الایمان حقیقت میں کتاب التوحید صغیر ہی کا
 ترجمہ اور شرح ہے جیسا کہ مذکورہ عبارتوں سے واضح ہے۔ علاوہ بریں تقویۃ الایمان کے باب
 فصل اور جملہ آیات و احادیث وہی ہیں جو کتاب التوحید صغیر میں ہیں۔ ان حالات میں مولوی
 محمد اسماعیل دہلوی کو مذہب اہلسنت و جماعت کا پیروکار اور اپنے خاندانی بزرگوں مثل
 شاہ عبدالرحیم محدث دہلوی (المتوفی ۱۱۳۱ھ / ۱۷۱۸ء)، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
 (المتوفی ۱۱۷۶ھ / ۱۷۶۲ء)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (المتوفی ۱۲۳۹ھ /
 ۱۸۲۴ء)، شاہ عبدالقادر دہلوی (المتوفی ۱۲۴۲ھ / ۱۸۲۷ء) اور شاہ رفیع الدین
 دہلوی (المتوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) رحمۃ اللہ علیہم کا تتبع سمجھا جائے یا محمد بن
 عبد الوہاب نجدی کی خارجیت و وہابیت کا مبلغ مانا جائے، حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد اسماعیل

دہلی کا مذہب اہلسنت و جماعت کو ترک کرنا ایک اٹل حقیقت ہے جسے چیلنج نہیں کیا جاسکتا اور ان کا مبلغ خارجیت و وہابیت ہونا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ان حالات میں قاضی فضل احمد صاحب نقشبندی لدھیانوی نے فریاد المسکین کے صفحہ ۹۰ سے فخر خاندان دہلی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو بیان متعلقہ مولوی محمد اسماعیل صاحب نے نقل فرمایا ہے وہی حقیقت معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب موصوف نقل کرتے ہیں:

”میری طرف سے کوہ اس لڑکے نام را ذکر کہ جو کتاب (کتاب التوحید) بمبئی سے آتی ہے، میں نے بھی اُس کو دیکھا ہے، اُس کے عقائد صحیح نہیں ہیں بلکہ وہ بے ادبی، بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔ میں آجکل بیمار ہوں۔ اگر صحت ہو گئی تو میں کتاب التوحید کی تردید لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ تم (مولوی محمد اسماعیل) ابھی نوجوان بچے ہو، ناحق شور و شر برپا نہ کرو“۔

چونکہ کتاب التوحید اور تقویۃ الایمان ایک ہی چیز یا ایک ہی مضمون کے دو نام ہیں، لہذا جو کچھ شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ نے کتاب التوحید کے بارے میں فرمایا یہی آپ کا نظریہ تقویۃ الایمان کے بارے میں ہونا چاہیے، یعنی:

- ۱۔ تقویۃ الایمان کے عقاید بھی صحیح نہیں ہیں۔
- ۲۔ تقویۃ الایمان بے ادبی اور بے نصیبی سے بھری پڑی ہے۔
- ۳۔ اگر آپ صحت مند ہو جاتے تو کتاب التوحید کی طرح تقویۃ الایمان کے رد کا ارادہ ظاہر فرماتے۔

۴۔ تقویۃ الایمانی عقاید و نظریات کی نشر و اشاعت کرنا حقیقت میں ناحق شور و شر برپا کرنا ہے۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

امام الوہاب بیہ کا اقرار می کفر
مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے مشکوٰۃ شریف کے باب
لا تقوم الساعة الا على اشرار الناس سے ایک

حدیث نقل کی، جس کا ترجمہ موصوف کے لفظوں میں یہ ہے:

”مسلم نے ذکر کیا کہ نقل کیا حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کہ: سنا میں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے، فرماتے تھے: نہیں تمام ہونے کے رات اور دن یعنی قیامت نہ آئے گی یہاں تک کہ پوجیں لات اور عترتی کو۔ سو کہا میں نے اے پیغمبر خدا! بیشک میں جانتی تھی کہ جب اتاری اللہ نے یہ آیت **هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ** الخ کہ بیشک یوں ہی رہے گا آخر تک۔ فرمایا:

بے شک ہوگا اسی طرح جب تک چاہے گا اللہ، پھر بھیجے گا اللہ ایک باواچی، جان نکال لے گی جس کے دل میں ہوگا ایک رائی کے دانہ بھر ایمان، سورہ جائیں گے وہی لوگ کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ سو پھر جاویں گے اپنے باپ دادوں کے دین پر۔

اس حدیث پر موصوف نے جو فائدہ جڑا ہے اُس کا درج ذیل حصہ قارئین لغور ملاحظہ فرمائیں! دیکھیں کہ اس کی تہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے۔ موصوف نے لکھا ہے:

”سو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کا زور تو مقرر ہوگا، جب تک اللہ چاہے گا، پھر اللہ آپ ایسی ایک باوا (ہوا) بھیجے گا کہ سب اچھے بندے جن کے دل میں تھوڑا سا بھی ایمان ہوگا، مرجاویں گے اور وہی لوگ رہ جائیں گے کہ جن میں کچھ بھلائی نہیں۔ یعنی نہ اللہ کی تعظیم، نہ رسول کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ باپ دادوں کی رسموں کی سند پکڑنے لگیں گے۔ سو اس طرح شرک میں پڑ جائیں گے۔ کیونکہ اکثر پرانے باپ دادے جاہل مشرک گزرے ہیں۔ جو کوئی اُن کی راہ و رسم کی سند پکڑے، آپ بھی مشرک ہو جاوے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخر زمانہ میں قدیم شرک بھی رائج ہوگا۔ سو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے کے مطابق ہوا۔“

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں مندرجہ ذیل امور خاص طور پر سامنے

آتے ہیں:

- ۱۔ پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق مذکورہ ہوا چل چکی ہے۔
- ۲۔ جن کے دل میں تھوڑا سا ایمان بھی تھا وہ سارے مر چکے ہیں۔
- ۳۔ اب صرف وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جن میں بھلائی کا نشان بھی نہیں۔
- ۴۔ اب مسلمان کہلانے والے بھی شرک میں پڑ چکے ہیں۔
- ۵۔ باپ دادوں کی رسموں کی سید پڑنے کے باعث مسلمانوں میں قدیم شرک بھی رائج ہو گیا ہے۔

موصوف کی اس تفسیر و تشریح کو اگر درست تسلیم کر لیا جائے تو خود مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور اُن کے سارے قبیعین کو بھی مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ اُن کی تحقیق یہی ہے کہ جن کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان تھا وہ مر گئے اور مشرک ہی مشرک باقی رہ گئے ہیں۔ دس حالات یہ دہلوی صاحب کا اقرار ہی کفر قرار پاتا ہے پس مولوی اسماعیل صاحب کو سچا ماننے کی صورت میں سارے وہابیوں کو امام الوہاب یہ سمیت مشرک ماننا ضروری ہو جاتا ہے اور اگر انھیں مشرک نہ کہا جائے تو مصنف نقویۃ الایمان کو جھوٹا، دروغ گو اور مکفر المسلمین ماننا لازم آئے گا۔ یہ وہابی حضرات کی اپنی پسند ہے کہ دونوں میں سے وہ کس راستے کو پسند کرتے ہیں؟

کاشش! دہلوی صاحب کے قبیعین کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ وہ اور اُن کے امام صاحب اس زمین کے پردے کے علاوہ تحت الثریٰ میں تو بستے نہیں تھے نواب اور کہیں رہتے ہیں کہ شرک کے اس عالمگیر فتوے کی زد سے بچ جائیں۔ لامحالہ یہ خود اپنے مشرک ہونے کا اقرار ہے۔ مسلمانوں کو بات بات پر بلا وجہ مشرک ٹھہرانے کی قدرت نے دنیا میں یہ سزا دی کہ موصوف نے خود اپنا اور اپنے قبیعین کا مشرک ہونا تسلیم کیا، جو آج تک برابر مشہور ہوتا آ رہا ہے۔ کذلک العذاب ولعذاب الآخرة اکبر لئو کانوا

یعلمون ۵

۲۔ فرقۃ الہدیت کی تخریب کاری

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے محمدی گروہ نے جب حالات کے تحت تین قسم کی ٹولیاں بنالیں تو موصوف کی اصل جماعت کچھ عرصہ موحد کہلاتی رہی لیکن بعد میں الہدیت کے نام سے مشہور ہونا شروع کر دیا۔ وہابیوں کی تینوں میں سے اس اولین جماعت کی باقاعدہ سرپرستی اور گروہی تنظیم میان نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) نے کی۔ مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) اُن کے سیاسی اور مذہبی دست راست تھے۔ اس جماعت کے افراد کا انگلیوں پر گنا جانا وہابیت کے پاک و ہند میں غیر مقبول ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے، جس کے باعث دیگر پراسرار وہابی جماعتیں کھڑی کی گئیں۔

مولوی محمد اسماعیل دہلوی بانی وہابیت نے اپنی جماعت کا جماعت کا الہدیت نام نام محمدی گروہ رکھا تھا۔ مسلمانوں نے کہنا شروع کر دیا کہ واقعی یہ محمد بن عبد الوہاب نجدی کے پیروکار ہونے کے باعث محمدی ہی تو ہیں۔ وہابی حضرات نے اس نسبت کو چھپانے کی غرض سے خود کو موحدین کہنا شروع کر دیا۔ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت کہتے کہ واقعی یہ نمکین شان رسالت ہونے کے باعث سکھوں کی طرح بڑے موحد ہی تو ہیں۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی تو میان نذیر حسین دہلوی کی سرکردگی میں مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنی مہربان سرکار سے درخواست کی کہ مسلمانانِ ہند آپ کے اس خود کاشتہ نجدی پودے کو وہابی کہتے ہیں۔ انہیں قانونی طور پر اس نام سے روکا جائے اور ہماری جماعت کا نام سرکاری طور پر اہل حدیث رکھ دیا جائے۔ گورنمنٹ نے جو جواب دیا وہ پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ ہو :

”انہوں (مولوی محمد حسین بٹالوی) نے ارکانِ جماعتِ الہدیت کی ایک دستخطی درخواست لیٹیفینٹ گورنر پنجاب کے ذریعے سے والسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کی۔ اس درخواست پر سر فہرست شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی تائیدی

تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسب ضابطہ منظوری
 آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے اہلحدیث کا لفظ استعمال کیا جائے۔
 لیفٹیننٹ گورنر پنجاب نے اس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اس
 طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۱۵ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲۷
 گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۷ اور گورنمنٹ
 یو۔ پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶، گورنمنٹ سی۔ پی۔
 کی طرف سے ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰۷، اور گورنمنٹ بمبئی کی طرف
 سے ۴ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۷۲۲، اس امر کی اطلاع مولوی
 محمد حسین کو ملی۔

یہ ہے ان حضرات کے اہل حدیث ہونے کی کل کائنات۔ یہ چودہ دواڑہ مسلمانوں کو دو طرح
 دھوکا دینے کی خاطر ایجاد فرمایا گیا تھا۔ اولاً اس لیے کہ مسلمانوں کو یہ تاثر دیا جائے کہ یہ لوگ حدیث
 سے بہت ہی لگاؤ رکھنے کے باعث خود کو اہلحدیث کہتے ہیں۔ ثانیاً اس غرض سے کہ محدثین حضرات
 کے لیے تصانیف علمائے کرام میں لفظ اہلحدیث بھی عام استعمال ہوتا رہا ہے، لہذا
 اس سے مسلمانوں کو دھوکا دینا آسان ہو جائے گا کہ صاحبو! ہماری جماعت کوئی نوزائیدہ
 ذیالکرین کا خود کاشتہ پودا تو نہیں بلکہ ہمارے گروہ کا نام تو بڑے بڑے علمائے اعلام
 کی تصانیف عالیہ میں بھی اوّل زمانہ ہی سے مذکور ہوتا آ رہا ہے۔ یہ ہے ان حضرات کے
 چل میں بل۔

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا

موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

یہ جماعت چونکہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے متبعین و معتقدین کی
 پہلی جماعت ہے اس لیے موصوف کے تمام عقاید و نظریات

امتیازی نشانات

اور مخصوص افعال پر بڑی شدت سے کاربند ہے۔ اپنے پیشوا کے فیصلے کو قرآن و حدیث کے صریح خلاف دیکھتے ہوئے بھی برگزائے غلط یا قابلِ ترمیم تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے بلکہ آیات و احادیث کے مفہوم و مطالب میں نہرا کھینچنا ثانی کر کے اُس کے موافق دکھانے کی کوشش کریں گے۔ ان کے مذہب کا اصل ماخذ تقویۃ الایمان ہے۔ قرآن و حدیث کو دوسرا اور تیسرا درجہ حاصل ہے، جنہیں تقویۃ الایمانی نظریات کی تائید میں پیش کر کے مسلمانوں سے اپنی حقانیت کا اعتراف کروانے میں شُب و روز کو شاں رہتے ہیں۔ ان حضرات کے نزدیک مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے اپنی تقویۃ الایمان میں جو کچھ لکھا ہے، اُس میں سے کسی بات کا غلط تسلیم کرنا تو ہزاروں منزل دور کی بات ہے، کسی بات کو قابلِ ترمیم اور کمزور مان لینا بھی گوارا نہیں، خواہ قرآن و حدیث کے کتنے ہی واضح نصوص اُس کے خلاف کیوں نہ پیش کر دیئے جائیں۔ بعینہ یہود کے اندر شخصیت پرستی کی یہی مثالیں موجود تھیں، جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَتَّخَذُوا اَحْبَادَهُمْ وَرُءُفَايَاہُمْ
اَرْبَابًا بَدَلًا دُونِ اللّٰهِ ۔ ۱۰

انہوں نے اپنے پادریوں اور جوگیوں کو اللہ کے سوا رب بنالیا۔

موصوف کو رب کا درجہ دینے کے شرک میں مبتلا ہونے کے باعث ان حضرات کو جملہ مسلمان مشرک ہی نظر آتے ہیں جیسے ساون کے اندھے کو ہر اہی ہر اسوجھتا ہے۔ جس طرح مسیحی کے بچرے کی محبت سے بعض یہود کے قلوب لبریز ہو گئے تھے، اسی طرح دہلوی صاحب معرفت کی عقیدت کا سمندر ہر وہابی صاحب کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا ہوتا ہے۔ اس انتہائی وابستگی کا اندازہ یوں کیا جاسکتا ہے کہ موصوف کے کسی نظریے کے خلاف پچائش آئیں یا سنجیدہ پیش کر کے کسی وہابی عالم کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے تو آیات و احادیث کے مفہوم و معانی میں وہ تاویل کرنے اور تقویۃ الایمانی نظریہ کے مطابق دکھانے پر تواپڑی چوٹی تک کا زور لگا دے گا لیکن امام الوہابیہ کے اُس نظریہ کے قابلِ ترمیم

ہونے کا تصور اُس کے دماغ کے کسی بھی گوشے میں پیدا نہیں ہوگا۔ دہلوی صاحب کے نظریات کے اُل ہونے پر ان کے نزدیک نہ آیات و احادیث اتنا انداز ہو سکتی ہیں نہ کوئی اور چیز۔ یہ ہے ان حضرات کے دلوں کا وہ مرض ہے جنہیں مسلمانانِ اہلسنت و جماعت سے مفاہمت کرنے اور اختلاف کو مٹانے پر کسی بھی وقت آمادہ نہیں ہونے دیتا۔

یہ حضرات اپنے امام علی الاطلاق یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی بتائی ہوئی وہابی توحید اُسی خارجی توحید کو طرہ امتیاز بنائے ہوئے ہیں، جس کی مخالفت کے باعث خوارج نے امیر المؤمنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کافر و مشرک ٹھہرایا تھا۔ زمانہ حال کے خارجیت زدہ حضرات کو سچے مسلمان بھی اُسی طرح کافر و مشرک نظر آتے ہیں۔ امام ابوہامیہ نے تو ایضاح الحق وغیرہ میں ایک دو جگہ تجسیم کا نظریہ پیش کیا تھا لیکن اہل حدیث کہلانے والے حضرات نے اُس سیوج و قدوس کو مجسم منوانا ڈنکے کی چوٹ جاری رکھا ہوا ہے۔ چنانچہ وہابیہ کے مسئلہ عالم مولوی وحید الزمان خاں حیدر آبادی نے اپنے ترجمہ قرآن میں آیہ کریمہ وَسَبِّحْ كُرْسِيِّهُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ کے حاشیے پر ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں لکھا ہے:

”جب کسی پر بیٹھا ہے تو چار اُنکل بھی بڑی نہیں رہتی ہے اور اُس کے بوجھ سے چرچر کرتی ہے“۔

یہ مولوی وحید الزمان خاں صاحب بعض آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:

ثُمَّ اسْتَوٰی اِلٰی السَّمَاءِ فَسَوَّھِٔ پھر آسمان کی طرف چڑھ گیا اور
سَبَّحَ سَمَوَاتٍ۔ سات آسمان ہوا رکھے۔

۱۔ وحید الزمان خاں، مولوی، محشی و مترجم قرآن مجید، ص ۶۰

۲۔ پ ۱، سورہ البقرہ، آیت ۳۰

۳۔ وحید الزمان خاں، مولوی، تبویب القرآن، ص ۴

الزَّحْمَنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوَى ۝
وہ بڑے رحم والا تخت پر چڑھا۔ ۴

ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ۔ ۵
پھر تخت پر جا بیٹھا۔ ۴

یہ کرسی پر بیٹھنا اور کرسی کا اُس کے بوجھ سے چرچر کرنا صاف ظاہر کرتا ہے کہ یہ حضرات اللہ رب العزت کو مجسم مانتے ہیں جس کا وزن ہے اور اُس کے بوجھ کو کرسی اٹھا لیتی ہے۔ بلکہ چرچر کرنے لگتی ہے۔ وہ ان حضرات کے نزدیک عرش پر چڑھتا اور بیٹھتا ہے۔ کاش کہ یہ حضرات کبھی اتنا سوچنے کی زحمت گوارا کر لیتے کہ ہر مجسم حادث ہوتا ہے اور حادث خدا نہیں ہو سکتا۔ اس طرح یہ حضرات توحید کے ٹھیکیدار بنتے ہوئے بھی شرعاً منکر الوہیت قرار پاتے ہیں اگر یہ بھی غور فرمائیں کہ جو ذات کرسی و عرش میں سلجھاتی ہے اُس کا وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيط ہونا کس طرح مانتے ہیں؟

حقیقت ہے کہ خارجیت و وہابیت عقیدہ رسالت کے خلاف ایک عقیدہ رسالت کھلا ہوا چیلنج ہے۔ ان حضرات کے نزدیک بد قسمتی سے توہین رسالت کا نام توحید ہے۔ وہابیہ کا مخصوص میدان تنقیصِ شانِ رسالت ہے۔ ان حالات میں دیگر انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی توہین کرنا ضمنی معاملہ ہے کیونکہ جو صفات سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذات والاصفات میں تسلیم نہیں کرتے تو ان کا حصول باقی مقررین بارگاہِ الہیہ کے لیے کس طرح مان لیں؟ یہ حقیقت ہے کہ وہابی حضرات نے فرمودہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں ایسے ایسے گندے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کی دیگر مذاہب والے غیر مسلموں کو بھی کبھی جرأت نہ ہوئی۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں شانِ رسالت کے خلاف جن انتہائی گستاخانہ نظریات کی تبلیغ کی ہے، ان حضرات دین کا رکنِ اعظم یہی توہینِ مصطفیٰ ہے، جس پر ڈیڑھ سو سال سے ڈٹے ہوئے ہیں اور

۴ پ ۱۶، سورہ ظہ، آیت ۵

۳ پ ۱۸، سورہ الفرقان، آیت ۵۹

۴ وحید الزمان خاں، تبویب القرآن، ص ۴۷

۵ وحید الزمان خاں، تبویب القرآن، ص ۵۰

نہائش کا فریضہ ادا کرنے والے علمائے کرام سے آج تک برسہا برس بیکار چلے آ رہے ہیں۔ دہلوی صاحب نے حدیث و تشدد الرجال سے اشاروں کنایوں میں روضۃ اطہر کی زیارت کو ناجائز قرار دیا تھا لیکن غیر مقلدین حضرات نے کھل کر مسلمانوں کو اس ایمانی و روحانی سعادت سے محروم رکھنے کی ہم چلائی ہوئی ہے، چنانچہ مآظ عبد اللہ غیر مقلد نے لکھا ہے:

”طلب علم اور دیگر ضروریات کے لیے سفر کا کوئی ہرج نہیں، صرف کسی جگہ کی طرف جس میں قبر نبوی بھی داخل ہے ثواب کی نیت سے سفر کرنا جائز نہیں۔“ لے

جانب صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی کا اس سلسلے میں نوابی فیصلہ یہ ہے:

والسفر لمجرّد الزیارة فیہ صرف زیارت کے واسطے سفر کرنے دے
نزاع ومن سافر ممجد قد بر حکم میں اختلاف ہے اور جس نے محض
فلمیذر زیارة شرعیة بل کسی قبر کی جانب سفر کیا تو یہ شرعی زیارت
بدعة۔ ۲ نہیں بلکہ بدعت ہے۔

مولوی محمد بن اسماعیل عینی نے روضۃ انور کے بارے میں یہ ایمان سوز فیصلہ صادر کیا تھا:

(فان قلت) هذا قبر رسول الله اگر تو کہے، یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلی الله علیہ وسلم قد عمرت کی قبر ہے، اس پر بہت سامان خرچ
علیہ قبہ عظیمة انفق فیہا کیا ہوا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حقیقت
الاموال (قلت) هذا جمل یہ بہت بڑی حالت ہے۔

عظیم بحقیقۃ الحال۔ ۳

مولانا اسماعیل غزنوی نے اس سلسلے میں خارجیت کے نشے سے بدست ہو کر یوں لکھا ہے:

”ابکل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبتے بنائے گئے ہیں وہ بھی بطور ایک بُت کے ہیں۔“ ۴

۴ صدیق حسن خاں، مولوی: حلاۃ الصدیق، ص ۹۷

۵ اسماعیل غزنوی، مولوی: تحفہ دہلیہ، ص ۵۹

۶ مآظ عبد اللہ، مولوی: مسئلہ سماع موتی، ص ۱۱۹

۷ مولانا اسماعیل عینی، مولوی: تطہیر الاعتقاد، ص ۲۶

مساک سے کسی مسلک کے ساتھ کلی وابستگی نہیں رکھنی چاہیے۔ خُذْ مَا صَفَادَع
ماکد پر عمل ہونا چاہیے ۱

اس عبارت سے یہ تاثر بھی سامنے آتا ہے کہ اخاف یا دُومرے مساک میں اور
موصوف کے پائے کا ایک بھی عالم پیدا نہیں ہوا کہ موصوف کو سیکڑوں جزئیات فقہ کا
ہونا نظر آگیا لیکن وہ حضرات انھیں دیکھنے سے قاصر رہے۔ اگر غیر مقلدین حضرات بُرائے من
ہم پر عرض کیے دیتے ہیں کہ اُن حضرات کی تو خاک پا بھی آپ کے ان خانہ ساز محققین
عالم تھی، ہاں بعض مسائل میں آپ کو کجی یا کوتاہی جو نظر آتی ہے، اس کے لیے ذرا غور
دیکھ لیجیے کہ یہ آپ حضرات کا اپنا ہی جھینگاپن تو نہیں ہے؛ علاوہ بریں غیر مقلد حضرات
ایک بھی مسلمہ محقق عالم دین کی نشان دہی نہ کر سکیں جس نے یہ کہا ہو کہ مروجہ مساک میں
ایک کے ساتھ کلی وابستگی نہیں رکھنی چاہیے خُذْ مَا صَفَادَع ماکد پر عمل ہونا چاہیے
ہم صرف اتنی سی گزارش کریں گے کہ فاتقوا الناس التي وقودها الناس والحجارة
اپنی جانوں پر نرس کھاؤ اور اُس آگ سے خود کو بچا لو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔
اب نمونے کے طور پر سرگروہ غیر مقلدین یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولوی

محمدی رحیم آبادی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۱۹ء) کا دلخراش تبصرہ اور چاند کی طرف تھوکنے والا
بات یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ سے چونکہ حدیث کی روایت ندارد ہے الا ماشاء اللہ
اور یہ فن حدیث میں بے مائیگی اور نقصان اجتہاد کی دلیل تھی، لہذا نعمانی لوگ اس کے
یوں مٹانا چاہتے ہیں کہ امام صاحب کو شروط روایت میں شدت و احتیاط تھی
بجلا امام صاحب کو روایت میں تو یہ احتیاط تھی اور قیاس میں احتیاط نہ ہوئی
کہ شریعت محمدی میں بلاتامل اپنی عقل پر اعتماد کر کے حکم شرع لگا دیا اور علیٰ ہذا
یہ کہنا کہ امام صاحب نے یہ اصول قائم کیے، یہ سب بے سرو پا باتیں ہیں جو
کا کوئی ثبوت نہیں اور علمائے مقبولین کی تصریحات اس کے خلاف موجود ہیں

۱۔ محمد اسماعیل، مولوی، مقدمہ حسن البیان، ص ۱۷

۲۔ عبدالعزیز رحیم آبادی، مولوی، حسن البیان مطبوعہ لاہور، بار سوم، ص ۸۶، ۸۳

اگر موصوف کی اس ذہرافشانی میں ذرا بھی صداقت تسلیم کر لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ امتِ محمدیہ کے اکثر اکابر جو حضرت امام المسلمین قدس سرہ کی شان میں رطب اللسان رہے ہیں اور ہمیشہ ان کی علیت کو خراج عقیدت پیش کرتے آئے ہیں، ان میں سے ایک بھی زیورِ علم اور تقویٰ و ہدایت سے آراستہ نہیں تھا کہ علم حدیث سے ناواقف اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کو مسخ کرنے والے کی امامت پر متفق رہے۔ کاش! یہ مبتدعین حضرات اس طرح امتِ مرحومہ کو امتِ ملعونہ ٹھہراتے وقت کبھی گریبانوں میں جھانک کر بھی دیکھ لیا کریں اور ان بزرگوں کے حضور اپنی لیاقت کا اندازہ کر کے کچھ تو خوفِ خدا اور خطرہٴ روزِ جزا کو ملحوظ رکھا کریں۔ موصوف نے امام المسلمین قدس سرہ سے کدورت رکھنے کا یوں بھی اظہار کیا ہے:

”ان (محدثین) کا اسناد تو کتاب و سنت و آثارِ صحابہ ہی پر ہے البتہ جن لوگوں کے پاس قیاس کا ہتھکنڈہ موجود تھا انھوں نے طلبِ حدیث میں زحمتِ سفر و مشقت اٹھانے کی نہ ضرورت دیکھی نہ کی۔ جو مسئلہ پیش آیا اُسی ہتھکنڈے (قیاس) سے فوراً جواب دے دیا۔ ایسے لوگ اُس وقت قیاس کہلاتے تھے، جیسا کہ صاحبِ سیرۃ النعمان نے حصہ اول میں خود اقرار کیا ہے۔ علاوہ امام ابوحنیفہ کے مناظرے جو آپ نے نقل کیے ہیں، وہ بھی اسی کے شاہد ہیں کہ امام ابوحنیفہ نے قیاس ہی سے جواب دئے ادلہٴ شرعیہ کا وہاں نام بھی نہ تھا“۔

یہ ہے مبتدعینِ زمانہ کا چاند کی طرف تھوکنے اور ساری امتِ محمدیہ کو شریعتِ محمدیہ کا مخالف ٹھہرانا کہ جو شخص ادلہٴ شرعیہ سے واقف ہی نہیں تھا، اُسے امامِ الائمہ اور سراجِ امتِ محمدیہ مانتے چلے آ رہے ہیں۔ بہر حال وہ اکابر جو اپنے اپنے دور میں سرمایہٴ روزگار تھے اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بارگاہ میں نذرانہٴ عقیدت پیش کرتے آئے، ان کے مقابلے پر چند مبتدعینِ زمانہ کی غوغا آرائی کہاں قابلِ التفات ہے؟ علاوہ بریں جبران حضرات نے تو ہین و تنقیصِ شانِ رسالت کو اپنا محبوب مشغلہ اور اپنے دین کا رکنِ اعظم بنایا ہوا ہے، تو امام المسلمین قدس سرہ

کی ایسے لوگوں کی زبان و قلم سے تنقیص ہونا کون سا محلِ تعجب یا زالی بات ہے؟ ان حضرات کی ایسی زہر افشانیوں کا جائزہ ہم نے ایک مقالے میں لیا ہے جو انشاء اللہ تعالیٰ دوبارہ نئی آب و تاب سے منظرِ عام پر جلوہ گر ہونے والا ہے۔

چونکہ وہابی حضرات تقلید سے آزاد اور محقق بن کر شتر بے مہار کی طرح غلاظت پسندی من مانی کرتے ہیں اس لیے شریعتِ محمدیہ کو ایک کھلونا یا بازیچہ اطفال بنا لیا ہے۔ منی کے بارے میں ان کے شیخ الکمل یعنی میاں نذیر حسین دہلوی کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

”بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ منی پاک ہے“ ۱

یہ بڑے میاں کی تحقیق تھی اب ایک چھوٹے میاں کی زبانی سنیے اور ان کی طہارت پسندی کی داد دیجئے۔ انھوں نے بھی بڑی دھوم دھام سے اپنی تحقیق انیق کے وہابیہ کی خاطر یوں انمول موتی بکھیر دیں

”لیکن صحیح قول یہی ہے کہ منی پاک ہے“ ۲

”صواب یہ ہے کہ دونوں (مرد و عورت) کی منی پاک ہے“ ۳

ان حضرات کی طہارت پسندی کا اس سے بھی بڑا تمغہ ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”جب پچھو عورت کی فرج سے باہر نکلے اور اُس پر فرج کی رطوبت ہو، تو وہ بھی

پاک ہے“ ۴

”زیادہ تر صحیح قول یہ ہے کہ کُتے اور خنزیر کے سوا اور سب جانوروں کی منی

پاک ہے“ ۵

وہابی حضرات اپنی یا کسی اور کی یا کُتے اور خنزیر کے سوا کسی بھی جانور کی منی میں لتھڑے ہوئے ہوں تو اُن کی پاکی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اب وہ نماز کی تیاری کریں گے۔ وضو کے لیے کیسا پانی درکار ہے؟ چنانچہ کنوئیں کے

۱۔ نذیر حسین دہلوی، فتاویٰ نذیریہ، جلد اول، ص ۱۹، ۲۔ ابوالحسن، مولوی، فقہ محمدیہ، ص ۴۱

۳۔ ایضاً، ص ۲۳

۴۔ ایضاً، ص ۴۱

۵۔ ایضاً، ص ۴۱

پانی کی پاکی ناپاکی کے سلسلے میں میانِ تذہبِ حسین صاحب سے سوال ہوتا ہے جو مع جواب ملاحظہ ہو :
 سوال : چہ فرمایند علمائے دین دریں مسئلہ کہ اگر سگ در چاہ افتاد چہ حکم است۔ بتیوا۔
 جواب : حکم چاہ مذکور آنست کہ اگر آب آن چاہ از افنادن سگ متغیر نہ شدہ است
 بلکہ بر حال خود است آن چاہ طاهر است۔ ۱۷

اب مولوی عبدالستار دہلوی کی مٹن لیجیہ کہ اس بارے میں وہ کیا فرماتے ہیں :
 ”کنویں میں چو پا وغیرہ گر جائے تو کنواں ناپاک نہ ہوگا کیونکہ آنحضرت صلعہ کے زمانہ
 میں مدینہ کے نواح میں بڑا بڑا تھا، جس میں حیض کے کپڑے، مردار کے گوشت
 کی ہڈیاں گرتی تھیں، لوگ اُس سے پانی پیتے تھے۔ آپ کو بھی اُس سے پانی دیا
 جاتا تھا۔ آپ سے اگل مسئلہ پوچھا گیا تو فرمایا : ان الماء طہور لا ینجسہ
 شئی۔ کہ پانی پاک ہے، اُس کو کوئی چیز پلید نہیں کرتی۔ ۱۸

اپنی غلاطت پسندی کی عادت کو پورا کرنے کی خاطر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر بھی
 افتراء کر دیا۔ سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو کسی کیسی نجاستوں، غلاظتوں کے پلا
 دینے کا دعویٰ کر دیا، پھر پانی کے کسی صورت میں ناپاک نہ ہونے کا حکم بھی اُس سرکار کی جانب
 زبانِ زوری سے منسوب کر دیا۔ مزید ملاحظہ ہو :

سوال (۵۰۱) : ایک لڑکی جس کی عمر تقریباً دس بارہ سال تھی، کنویں میں گر کر
 مر گئی اور مردہ حالت میں باہر نکالی گئی، جس کا سر بالکل پھٹا ہوا تھا۔ کنویں کی
 گہرائی تقریباً ۲۵ گز سے ۴۰ گز ہے۔ اس میں تقریباً پانی آٹھ فوٹ موجود
 رہتا ہے۔ اس کی صفائی کا حکم کس طرح ہے ؟ تقریباً اُس لڑکی کی لاش کنویں میں
 دو گھنٹہ رہی۔

جواب : صورتِ مسئلہ میں واضح ہو کہ پانی کا مژہ یا بو یا رنگت بدل گیا ہے

تو تمام پانی نکالاجائے گا ورنہ کوئی ضرورت نہیں۔ لقولہ علیہ السلام
 الماء طهور لا ینجسہ شیء الا ما غلب مریحہ او طعمہ او لونہ
 بنجسہ تحدث فیہ۔ نیز نبی علیہ السلام کا فرمان ہے: اذا کان الماء
 قلیتین لم یحمل الخبث۔ یعنی جبکہ دو قلیے پانی ہو تو وہ ناپاک نہیں ہوتا۔
 اب خواہ اس کو کوئی استعمال کرے یا نہیں کرے لیکن شرعاً وہ ناپاک نہیں۔

غیر مقلدین حضرات کے نزدیک قلتین یعنی دو بڑی مشکوں کے برابر پانی کسی جگہ موجود ہو تو وہ جاری پانی
 کا حکم رکھتا ہے اور جب تک اس کا رنگ، مزہ یا بونہ بدلے کسی نجاست کے باعث اس پر
 ناپاکی کا حکم جاری نہیں ہوتا۔ وہ پاک ہی قرار دیا جاتا ہے۔ چنانچہ میاں نذیر حسین دہلوی نے
 لکھا ہے:

”مراد پانی سے یہاں پانی قلیل (دو بڑی مشکوں سے کم) ہے، اگر کثیر (دو بڑی
 مشکوں کے برابر) ہو، حکم جاری کا رکھتا ہے اور نجس نہیں ہوتا پیشاب وغیرہ۔
 یہ سب غیر مقلدین حضرات کی شان تحقیق اور یہ ہے ان کی حدیث سے وابستگی جس کے بل بوتے پر
 ائمہ دین کے منہ آتے اور بزرگان دین کو قرآن و حدیث سے ناواقف ٹھہراتے ہیں لیکن خود
 یہ عالم ہے کہ ابوسفیان ظریف بن شہاب جیسے ضعیف و متروک راوی کی حدیث کے سہارے
 سارے جہان کی پلیدی اپنے لیے پاک ٹھہرائی، حالانکہ محدثین نے حدیث قلتین کو مضطرب اور
 بعض حضرات نے موضوع قرار دیا ہے۔ خود یہ حدیث پر عمل کہ صحیح احادیث کو چھوڑ کر مضطرب و
 موضوع کو دین و مذہب بنائیں اور اسی بل بوتے پر ائمہ دین کی تحقیقات جلیلہ میں کیڑے بتائیں۔
 اللہ تعالیٰ عقل و دانش عطا فرمائے، آمین۔

کاش! غیر مقلدین حضرات کبھی یہ سوچنے کی زحمت بھی گوارا فرمائیں کہ اگر ان کے ایسے
 مسائل سے غیر مسلم آگاہ ہو جائیں تو مسلمانوں، اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں وہ

کی نظر یہ قائم کریں گے؛ اگر انھیں معلوم ہو جائے کہ ان لوگوں کے نزدیک دو بڑی مشکوں کے برابر پانی کسی جوہر میں ہوا اور اتنے سے پانی میں پیشاب، پانچلہ یا مرا ہوا کتا، بلی، چوہا یا کوئی اور نجس چیز پڑی ہوئی ہو، تو یہ پانی غلاظتوں کا مجموعہ ہونے کے باوجود یہ لوگ پاک سمجھتے ہیں۔ اس سے وضو غسل کر کے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اسے بے دھڑک پی سکتے ہیں۔ پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی ایسی تربیت کی تھی کہ جس کنوئیں سے پانی پیتے تھے، اُسی میں حیض کے قطرے کے قطرے ڈالے جاتے، اُسی میں مردہ جانوروں کا گوشت اور ہڈیاں پھینک دیتے تھے اور بے دھڑک اسی پانی کو نہ صرف خود پیتے رہتے بلکہ اپنے نبی کو پلاتے اور مسلمانوں کا نبی انھیں اس حرکت سے روکنے کے بجائے ایسی حرکتوں پر اور ابھارتا کہ خود اس پانی کو پی لیتا اور اُس کے پاک صاف ہونے کا حکم صادر فرما دیتا تھا۔ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَهِّرِينَ۔ اللہ پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے لیکن غیر مسلم کہہ سکتے ہیں کہ اگر اسلام میں پاکی ناپاکی کا معیار یہی ہے جو غیر مقلدین پیش کرتے ہیں تو اس طرح اسلام میں پاکیزگی کا تصور تک نہیں پایا جاتا اور غلاظت پسندی کے باعث یہ ہرگز خدا کے پسندیدہ بندے نہیں ہو سکتے۔ امید ہے کہ یہ زائل تحقیق ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔

غیر مقلدین کی شانِ عبادت گزاری
دہائی حضرات اگرچہ قطعاً پلید جوہر کے پانی سے وضو و غسل کر کے بے تکلف عبادات ادا کر سکتے ہیں، لیکن انھیں اس سے بڑھ کر بھی سہولت حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو کہ جنبی و محدث کا اذان پڑھنا صاف جائز قرار دیا ہوا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے؛

”وجائز است تا ذین محدث اگرچہ بطلہارت افضل است“ ۱

اب سجدہ تلاوت کے بارے میں ان حضرات کے سرگروہ کی تحقیق ملاحظہ ہو۔ موصوف نے لکھا ہے؛

”پس اس حدیث سے جو از سجدہ تلاوت بے وضو نیز ثابت ہوتا ہے“ ۲

اب ذرا ان حضرات کے غسل کی مزید کیفیت ملاحظہ فرمائی جائے۔ مولوی محمد ابوالحسن صاحب
کتبتے ہیں :

اگر سارا حشفہ غائب نہ ہو بلکہ بعض غائب ہو اور بعض باہر رہے تو اُس کے ساتھ
کوئی حکم متعلق نہیں ہوتا۔ نہ اُس پر غسل واجب ہوتا ہے نہ کوئی اور حکم اُس کے
ساتھ متعلق ہوتا ہے۔ ۱

اب میان نذیر حسین دہلوی کے شاگرد مولوی محمد سعید صاحب کی عجیب و غریب تحقیق ملاحظہ ہو جس سے
غیر مقلد حضرات روزانہ فائدہ اٹھاتے اور مزے لُٹتے ہوں گے۔ اُنہوں نے لکھا ہے :
جو اپنی بیوی سے جماع کرے اور انزال نہ ہو تو اُس کی نماز بغیر غسل کے درست ہے۔ ۲
اب وہابی صاحب وضو کی جانب رجوع فرماتے ہیں۔ اس میں بھی جدت ملاحظہ ہو :
”کافی ہے مسح کرنا پگڑی پر۔“ ۳

دوسرے غیر مقلد صاحب کا جو ش تحقیق اور شانِ محققانہ بھی قابلِ دیدنی ہے۔ اُنہوں نے لکھا ہے :
”وضو میں بجائے پاؤں دھونے کے مسح فرض ہے۔“ ۴

وہابی مرد و زن اکٹھے نماز پڑھیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ چنانچہ لکھا ہے :
”اسی طرح اگر عورت مردوں کے ساتھ کھڑی ہو جاوے تو جمہور علماء کے نزدیک
اُس کی نماز بھی نہیں ٹوٹی اور حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر عورت مرد کے برابر کھڑی ہو جائے
تو مرد کی نماز ٹوٹ جاتی ہے اور عورت کی نہیں ٹوٹی، لیکن یہ قیاس مع الفارق ہے۔
بلکہ غیر مقلدین حضرات کے شیر پنجاب نے تو اس سے بھی جرأت مندانہ فیصلہ صادر فرمایا ہوا ہے۔“

۱۔ محمد ابوالحسن، مولوی، فقہ محمدیہ کلاں، ص ۶۵

۲۔ محمد سعید، مولوی : ہدایتِ قلوب قاسمیہ، ص ۳۶

۳۔ صدیق حسن خاں، مولوی : فتح المغیث، ص ۶

۴۔ محمد ابراہیم، مولوی : فتاویٰ ابراہیمیہ، مطبوعہ الہ آباد، ص ۲

۵۔ محمد ابوالحسن، مولوی، فقہ محمدی کلاں، ص ۱۵

ملاحظہ ہو:

سوال: کوئی شخص عورتوں کو عید گاہ میں لے جانے کی کوشش کرے تو اُس کی مخالفت کرنی جائز ہے یا نہیں؟

جواب: ہرگز مخالفت جائز نہیں۔ ۱

غیر سے غیر مقلد حضرات اپنی عورتوں کو ساتھ لے کر نماز میں مشغول ہو گئے اب مردوں اور عورتوں کی منی خارج ہونے لگتی ہے تو اُس صورت کے بارے میں انھیں یہ تلقین فرمائی گئی ہے: ”اسی طرح اگر منی اُتر کر ذکر کے درمیان آوے اور وہ شخص نماز کے اندر ہو، وہ اپنے ذکر کو کپڑے کے اوپر سے پکڑ رکھے اور منی باہر نہ نکلے، یہاں تک کہ سلام پھیرے تو اُس کی نماز درست ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ پاک ہے یہاں تک کہ منی باہر نہ نکلے اور عورت کا حکم بھی مانند مرد کی ہے۔“ ۲

مندرجہ بالا احوالِ جنات سے وہابی حضرات کی نماز کا نقشہ اُن کی محققانہ شان کے باعث یوں سامنے آتا ہے کہ غیر مقلد صاحب اپنی اہلیہ محترمہ سے صحبت کر رہے تھے کہ کسی مسجد سے اذان کی آواز سنی، انزال ابھی نہیں ہوا تھا کہ دونوں اُسی طرح لتھڑے ہوئے نماز کی جانب دوڑے، دونوں نے اُس کنویں کے پانی سے وضو کیا جس میں گُنا گُرا گیا تھا یا کوئی لڑکی گر گئی تھی اور اس کا سر بھی چھوٹ گیا تھا یا گاؤں کے جوہر پر جا پہنچے جس میں گاؤں کی بھینسیں روزانہ پیشاب گو بر کرتی ہیں لیکن اُس میں پانچ دس بڑی مشکوں کے برابر پانی ہے۔ وضو کرتے ہوئے وہابی صاحب نے پکڑی پر مسح کیا حالانکہ اللہ جل مجدہ نے وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ فرمایا ہے لیکن نرالے محققوں نے وَامْسَحُوا بِعَمَامَتِكُمْ بنا لیا ہے اور وہابین صاحبہ نے دوپٹے پر مسح کر لیا ہوگا۔ اتنی دیر میں ایک صاحب نے حالتِ جنابت میں اگر اذان پڑھ دی مولوی صاحب حنفی والا مذکورہ تماشا کر ہی رہے تھے کہ اذان کی آواز سن کر سابقہ وضو سے نماز پڑھانے

لے ثناء اللہ امرت سہری، مولوی: فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۳۴

لے محمد ابوالحسن: فقہ محمدی کلاں، ص ۶۹

مصلے پر کھڑے ہو گئے۔ انزال سے پہلے نماز کی جانب دوڑ آنے والا جوڑا، مولوی صاحب کی اہلیہ محترمہ اور موذن صاحب پیچھے کھڑے ہو گئے۔ سابقہ کر توت کا خیال آتے ہی مذکورہ جوڑے اور مولوی صاحب و مولون صاحبہ کی منی خارج ہونے لگی۔ فوراً چاروں حضرات کے دائیں ہاتھ اپنے اپنے اُن مقاموں پر ہی پہنچ گئے جہاں پہنچانے کی اُن کے بڑوں نے یقین فرمائی ہے۔ موذن صاحب نے جب راجہ اندر کے اکھاڑے کا بیڑہ تماشا دیکھا تو اُن کے جذبات بھی بے قابو ہو گئے۔ مجبوراً انہیں بھی اپنا دایاں ہاتھ مقام خاص پر پہنچانا پڑا۔ پانچوں حضرات کا ایک ایک ہاتھ قیام ہوا یا قعدہ، رکوع ہو یا سجدہ ہر حالت میں اُسی مقام پر ڈٹا ہوا ہے جہاں اُس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے اور جہاں پانچوں کی توجہ مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ رفع یدین کا مسئلہ بھی بگڑ کر رفع یدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ سلام پھیرتے ہی پانچوں بغیر دُعا مانگے اُسی طرح ہاتھوں سے صورت حال کو سنبھالتے ہوئے جلد از جلد باہر دوڑ گئے۔ اگر دُعا مانگتے تو ہاتھ ہٹانے پڑتے، جس سے مضحکہ خیز سیل رواں آجاتا۔ یہ تھی وہ محققانہ نماز جس سے پانچوں نے فراغت پائی۔ بجز غیر مقلد حضرات کے ایسی عبادت گزار کی کس کے حقے میں آئی۔ اللہ تعالیٰ جلد مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرماتے۔ آمین۔

غیر مقلدین کے دیگر محبوب مشغلے
 مولوی محمد اسماعیل دہلوی تو اس مرحلے تک وہابی و نجدی حضرات قبر شکنی میں شہرہ آفاق ہیں پہنچنے سے پہلے ہی پٹھانوں کے ہاتھوں ذبح ہو چکے تھے۔ غیر مقلد حضرات کے ہاتھوں میں ہزار جتن کے باوجود صرف قلم ہے، جس سے وہ اکابر دشمنی کی بھڑاس نکال لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ مولوی محمد اسماعیل غزنوی نے لکھا ہے:

”آج کل صالحین کی قبور پر جو گنبد اور قبۃ بنائے گئے ہیں، وہ بھی بطور ایک بُت کے ہیں۔“

اب غیر مقلد حضرات کا دوسرا مشغلہ ملاحظہ فرمائیے۔ مولوی عبدالستار دہلوی جواب دیتے ہیں:

سوال (۷۰) زید کہتا ہے کہ مسجد میں محراب بنانا ناجائز ہے اور عمرو

کہتا ہے کہ جائز ہے۔ جواب طلب امر یہ ہے کہ قولین میں سے کون سا قول صحیح اور قابل قبول ہے؟ (عبدالودود - قصبہ جھالو)

جواب: بے شک مساجد میں محراب مرقبہ کا بنانا ناجائز اور بدعت ہے۔^۱ نیز مشغلہ کہ نوافل کی کثرت اور شب بیداری بھی ان حضرات کے نزدیک ممنوع و بدعت ہے۔ مولوی عبدالستار صاحب سے اس کے متعلق سوال ہوا جو مع جواب ملاحظہ فرمائیے:

سوال (۸۱) شب برات یعنی ۴ تا ۵ ربیع الثانی شعبان کو اکثر عورتیں مرد نفلیات رات بھر پڑھتے ہیں، اس کا ثبوت شریعت محمدیہ میں ہے یا نہیں؟

جواب: شب برات کو رات بھر نفلیات وغیرہ پڑھنا بدعت ہے اور اپنی جانب سے دین اکمل کے اندر زیادتی کرنی ہے جو کہ شرعاً ممنوع ہے۔^۲

چوتھا مشغلہ سالانہ ہے، جس پر یہ حضرات عید الاضحیٰ کو عمل پیرا ہوتے ہوں گے:

سوال (۲۹۰) معروض آنکہ زمانہ حال میں چیزوں کی گرانی حد سے بڑھ

گئی ہے۔ اس وجہ سے امسال قربانی کا جانور پندرہ بیس روپے سے

کم ملنا دشوار ہے۔ بندہ نے سنا تھا کہ پہلے کسی صحیفہ میں یہ مضمون نکل چکا ہے

کہ مرغ کی قربانی بھی جائز ہے۔ فرمان نبوی اَللّٰہُ یُسِّرُ اور فرمان الہی

مَا جَعَلَ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرْجٍ کے عموم کے ماتحت اگر آپ مرغ کی قربانی

جائز سمجھتے ہوں تو بندہ کی تحقیق کرا دیں۔ (از مولوی محمد ضلع فیروزپور)

جواب: ”شرعاً مرغ کی قربانی جائز ہے۔“^۳

پانچواں مشغلہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو مشرک و بدعتی سمجھنا اور ان سے مقاطعہ کرنا بھی

لاحظہ ہو:

۱۔ عبدالستار، مولوی، فتاویٰ ستاریہ، جلد اول، ص ۶۳

۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۳۔ فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۶۲

سوال : نام کا مسلمان ، شرکیہ افعال کرنے والے کا نکاح موحہ عورت سے جائز ہے یا ناجائز ؟

جواب : حرام ہے۔“ لے

سوال (۱۱) : عند اللہ وعند الرسول نکاح کس بات سے ٹوٹ جاتا ہے ؟
جواب : عورت موحہ مسلمہ صوم و صلوٰۃ کی پابند ہو اور خاوند مشرک ، بدعتی ، مولود پرست ، گیارہویں پرست ، تعزیر پرست وغیرہ یا تارک صوم و صلوٰۃ ہو وغیرہ وغیرہ یا اس کے برعکس ، بس نکاح ٹوٹ گیا۔ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ۔“ لے

اگر غیر مقلد حضرات کے ایسے فتوؤں کو شرعی حکم کے منظر سمجھ لیا جاتے تو کتنے فیصد نکاح آج درست قرار پا سکتے ہیں ؟ غیر مقلد حضرات خود تو فرماتیں کہ اُن کے فتوؤں کی رو سے کتنے مدعیان اسلام بلکہ اُن کے ہم مشرب بھی ولد الزنا قرار پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جملہ مدعیان اسلام کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ آمین۔ اسی تصویر کا یہی افسوسناک رُخ قارئین حضرات مزید ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ مرقوم ہے :

سوال (۳۵۴) : اگر نام کا خنفی باپ ہو یا ماں ہی کیوں نہ ہو ، اُن کی دنیاوی خدمت بجالانی کیسی ہے اور اُن کا جنازہ پڑھنا چاہیے یا نہیں ؟
مخالف اسلام ہونے کی وجہ سے دل تو اُن کی خدمت کو بھی نہیں چاہتا۔

جواب : والدین کی دنیاوی امور میں اطاعت خدمت کرنی چاہیے لقولہ تعالیٰ وصاحبہما فی الدنیا معروف (الایہ) اور اگر بے نماز مشرک ہیں تو نماز جنازہ نہیں پڑھنی چاہیے۔“ لے

لے فتاویٰ ستاریہ ، جلد اول ، ص ۴

لے ایضاً : ص ۸

لے عبدالستار ، مولوی : فتاویٰ ستاریہ ، جلد سوم ، ص ۳۸

سوال (۲۶۸) مشرک بدعتی کو سلام کرنا یا سلام کا جواب دینا ، میل جول رکھنا جائز ہے یا نہیں ، اگرچہ وہ کلمہ گو ہو۔

جواب : مشرکین بتدعین کو سلام کرنا یا اُن سے اسلامی تعلقات و موالات قائم رکھنا شرعاً سخت معیوب و مذموم ہے۔ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو سلام کہلا بھیجا تو عبداللہ بن عمر صحابی رسول نے اُس کا جواب نہیں دیا۔۔۔۔۔ پس حدیث ہذا سے اظہر من الشمس و ابین من الامس ہو گیا کہ مشرکین بتدعین بدین فساد و فحار کے ساتھ نشست و برخاست کرنا ، اُن کے ساتھ سلام و کلام کرنا اُن کے سلام کا جواب دینا معیوب و مذموم ہے۔ الخ“ لے

مسلمانانِ اہلسنت و جماعت یعنی سوادِ اعظم کے ساتھ غیر مقلد حضرات کا یہ سلوک کہ اُن سے سلام و کلام تک معیوب و مذموم لیکن انگریز کی دشمن اسلام حکومت کی چوکھٹ پر ناصیہ فرسائی اور گاندھی جیسے کھڈے مشرک ، ٹھٹھٹ بُت پرست کے سامنے سجدہ ریزی۔ آج اُن غیر مسلموں کے سامنے یہ فتوے کیوں دماغوں سے نکل گئے ؟ غیر مقلد حضرات کے ایسے فتوے سنی مسلمانوں کے خلاف ہونے چاہیے تھے یا نصاریٰ و ہنود کے متعلق ؟

جس طرح وہابی حضرات کے لیے ہر میدان بڑا وسیع اور اُس وہابی خور و نوش میں من مانی کی عام اجازت ہے ، اسی طرح کھانے پینے کی چیزوں میں ان حضرات کے ماکولات و مشروبات کی فہرست بھی کچھ نرالی اور تعجب خیز قسم کی ہے۔ پہلا پسندیدہ مشروب ملاحظہ ہو :

سوال : اُونٹ کا پیشاب پینا مریض کے لیے حدیث میں ہے مگر بڑی مکروہ چیز ہے۔ کیسے جائز ہوا ؟ ہندو لوگ عورت کو نفاس کی حالت میں گلے کا پیشاب پلاتے ہیں۔ کیا باعثِ اعتراض نہیں ہے ؟

جواب: حدیث شریف میں بطور ردوائی استعمال کرنا جائز آیا ہے، جس کو نفرت ہو وہ نہ پئے، لیکن حلت کا اعتقاد رکھے۔ ایسا ہی گاٹے بکری کے بول کے متعلق بھی آیا ہے: لا بأس ببول مایوکل لحمہ: ۱۷

اب غیر تقلیدین کے دوسرے مشروب مرغوب کا ذکر ہو جانا چاہیے جس کی نہریں تقریباً ہر گھر میں رواں ہیں کسی صاحب کے سوال پر ان حضرات کے شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلوی کا جواب ملاحظہ ہو:

سوال: ایک شخص زوجہ اپنی سے ہم خلوت تھا اور غلیان شہوت بوقت مجامعت کے زوجہ اپنی سے مساس کرتے ہوئے پستان منہ میں لے گیا اور زوجہ اس کی طفل کیسا کہ دودھ پلاتی تھی، اُس شخص کے حلق کے اندر ایک باریک دو بار دودھ چلا گیا۔ آیا وہ شخص زوجہ اپنی کا فرزند رضاعی ہو گیا یا کہ شوہر رہا اور اس فعل کے باعث سے زوجہ اُس کے نکاح میں داخل رہی یا کہ نہ رہی؟

سوال دیگر: یہ کہ مدت رضاعت کی آیا خور و سالی میں ہے یا کہ جوانی میں رہے گی اور عورت کا دودھ اگر کسی زخم میں یا کہ ذکر کے سوراخ میں یا کان میں بہت کئے طبیب کے ڈالاجائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ بینوا تو جبرو۔

الجواب: وہ شخص اپنی زوجہ کے دودھ پینے کی وجہ سے اپنی زوجہ کا فرزند رضاعی نہیں ہو گیا بلکہ وہ علیٰ حالہ شوہر رہا اور اُس کی زوجہ اُس کے نکاح میں داخل رہی۔ اس وجہ سے کہ مدت رضاعت میں دودھ پینے سے حرمت رضاعت ثابت ہوتی ہے اور بعد مدت کے ثابت نہیں ہوتی اور مدت رضاعت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ڈھائی برس ہے صاحبین اور علماء جہور کے نزدیک دو برس ہے اور کسی زخم یا سوراخ ذکر یا کان میں عورت کا دودھ ڈالنے سے حرمت رضاعت ثابت نہیں واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ حررہ سید شریف حسین عفی عنہ۔ سید محمد نذیر حسینؒ

ثناء اللہ امرت سری، مولوی فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۵۵

لے نذیر حسین دہلوی، مولوی فتاویٰ نذیریہ، جلد دوم، ص ۳۹۶

غیر مقلد حضرات نے اس مرحلے پر اپنی شانِ تحقیق سے ایک عجیب و غریب مسئلہ گھڑا اور عیاشی و
 نفس پستی کی کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کر کے بے راہ رو اور عیاش طبقے سے خراجِ تحسین
 حاصل کر لیا ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ کوئی عورت کسی مرد کو دودھ (اپنی پستان سے) پلا دے
 تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس مرد کا دودھ پلانے والی عورت کو اور اس عورت کا دودھ پینے والے
 مرد کو دیکھنا جائز ہو جائے گا۔ ناشر غیر مقلدیت، نواب آف بھوپال جناب مولوی صدیق حسن خاں
 فتویٰ صاحب رقمطراز ہیں:

وَيَجُوزُ اَرْضَاعُ الْكَبِيرِ وَلَوْ كَانَ ذَا الْحَيَاةِ لَتَجَوَّزَ النَّظَرُ ۝
 دوسرے ناشر غیر مقلدیت مولوی وحید الزمان خاں حیدر آبادی یوں لکھتے ہیں:
 وَيَجُوزُ اَرْضَاعُ الْكَبِيرِ وَلَوْ كَانَ ذَا الْحَيَاةِ لَتَجَوَّزَ النَّظَرُ خِلَافًا
 لِلْجَمْعِ هُودٍ ۝

یعنی بڑے آدمی کو دودھ پلانا جائز ہے خواہ وہ دارِ ہی والا ہی کیوں نہ ہو اور یہ اس لیے ہے کہ
 اس عورت کو دیکھنا جائز ہو جائے اگرچہ یہ نظریہ جمہور کے خلاف ہے۔
 اب غیر مقلد حضرات کے خصوصی اور ناپسندیدہ ماکولات کا ذکر ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ
 مولوی عبدالستار دہلوی نے گوہ کی حلت کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:
 ”صَبَّ یعنی گوہ حلال ہے“ ۝

مصنف نے اسی تفسیر کی کتاب کے اسی صفحے پر اپنی اس تحقیق سے بھی نوازا ہے:
 ”کچھوا حلال ہے“ ۝

پھر نواب صاحب پر کسی گھوڑے نے دولتی جھاڑ دی ہوگی، لہذا یوں فتویٰ داغ دیا جاتا ہے:

۱۔ صدیق حسن خاں بھوپالی، مولوی: روضۃ النذیر، ص ۲۳۶

۲۔ وحید الزمان خاں، مولوی: نزل الابرار، جلد دوم، ص ۷۷

۳۔ عبدالستار: تفسیر ستاری ضمیمہ د، ص ۲۶۶

۴۔ ایضاً: ص ۲۶۶

”گوشتِ اسپِ حلال است۔“

مولوی عبدالستار صاحب سے بچو کی حلت و حرمت کے بارے میں سوال ہوا۔ موصوف نے

مقبوع حدیث بن کر جو جواب مرحمت فرمایا وہ قارئین کے پیشِ خدمت ہے:

سوال (۲۷۷): ایک شخص بنام منشی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے بچو کے متعلق فرمایا ہے کہ بچو حلال ہے۔ جو شخص بچو کا کھانا حلال نہ جانے، وہ

منافی بے دین ہے۔ اس کی امامت ہرگز جائز نہیں۔ دوسرا شخص بنام محمد

کہتا ہے کہ بچو کا کھانا حلال نہیں، ہاں شکار جائز ہے اور بچو کے حلال نہ جاننے

والے کو منافی و بے دین کہنا جائز نہیں بلکہ تشدد ہے۔ دونوں میں سے کس کا

قول صحیح ہے؟ (سائل حاجی محمد صاحب بہاولپوری)

جواب: منشی کا قول صحیح ہے اور موافق حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ بچو

گوشتاً مکروہ منوع ہے مگر شرعاً منوع نہیں۔“

یہاں تک تو ان حضرات کا ذکر ہے جن سے صرف ایک آدمی جانور ہی حلال ٹھہرایا جاسکا

لیکن جب غیر مقلدین کے بقیتہ السلف و عہدۃ الخلف مولوی ثناء اللہ امرت سہری کی باری آئی تو

انھوں نے شیرِ پنجاب بن کر وہ دلیری دکھائی کہ سانس، گلے، سپیرے اور چینی بھی ہاتھ ملے

رہ گئے۔ ان کے جملہ ماکولات غیر مقلدین نے اپنے لیے حلال ٹھہرا لیے۔ اب موصوف کا وہ فتاویٰ

لاحظہ فرمائیے:

سوال: کچھوا، کوکرا اور گھونگا حرام ہیں یا حلال؟ از روئے قرآن و حدیث

جواب ہو۔

جواب: قرآن و حدیث میں جو چیزیں حرام ہیں ان میں یہ تینوں نہیں اور حدیثِ شریف

میں آیا ہے ذرونی ماترکتہ۔ جب تک شرع بند نہ کرے، تم سوال نہ کیا کرو۔

لے نور الحسن خاں، عرف المجادی، ص ۱۰

لے عبدالستار، فتاویٰ ستاریہ، جلد دوم، ص ۲۱

ان تینوں سے شرع شریف نے بند نہیں کیا، لہذا حلال میں۔ ۱۔

دہابی حضرات ذرا ان اشیاء کی فہرست تو پیش کریں جن کو قرآن و حدیث نے حرام قرار دیا ہے۔ تاکہ ہم ان کے حلال جانوروں کی فہرست میں بیش بہا اضافہ کر دیں۔ فہرست پیش کرنے پر غیر مقلد حضرات کہتی ہی ان چیزوں کو حلال ماننا پڑے گا جو حلال ہرگز نہیں ہیں یا انھیں بر ملا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قرآن و حدیث نے حلال و حرام کے بارے میں کچھ اور ہی ضابطہ مقرر فرمایا ہے جسے یہ نام نہاد محققین عوام الناس سے چھپاتے ہیں تاکہ شریعت محمدیہ کا ہر طرف سے اپریش کرتے رہیں۔

غیر مقلدین کی ازدواجی بے ضابطگی کا کام ہے یا اُس کی عطا سے حبیب خدا،

خاتم الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم دیگر انبیائے کرام علیہم السلام کو حاصل تھا۔ اہل علم کا کام حلال کو حرام قرار دینا نہیں بلکہ اللہ و رسول (جل جلالہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے احکامات کو بیان کرنا ہے۔ غیر مقلدین حضرات نہ صرف محقق بن کر ائمہ مجتہدین کے مقام پر سینہ زدوری سے ناز ہونا چاہتے ہیں بلکہ اندرون خانہ اللہ اور رسول کا کام بھی خود ہی سنبھال کر حلال و حرام قرار دینے بیٹھ جاتے ہیں۔ مٹھوٹ کاری کی طرح اس میدان میں بھی ان حضرات نے اپنی تحقیق سے غلبہ ہی گل کھلائے اور مضحکہ خیز فتوے داغے ہیں، چنانچہ نواب آف بھوپال، مولوی سید حسن خاں قنوجی کے فرزند مولوی نور الحسن خاں نے اپنے ہی نطفے کی لڑکی سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں:

و نیست وجه از برائے منع نکاح اُس بیٹی سے ممانعت نکاح کی کوئی وجہ

بادختریکہ ایں کس با مادرش زنا نہیں جس کی ماں سے اُس شخص نے زنا

کردہ زیر کہ تحویم محارم محرمات کیا ہو، کیونکہ محرمات کا ذمی محرم کے لیے

بشرع است و شرع تحریم بنت حرام ہونا شرع سے ہے اور شریعت میں

شرعی آمدہ و ایں دختر بنت شرعی شرعی بیٹی کی حرمت برآئی ہے جبکہ مذکورہ لڑکی

نیست تا داخل باشد زیر قولہ شرعی بیٹی نہیں ہے کہ حکم ربانی بیٹیاں تھیں

ثناء اللہ امرت سری، مولوی، فتاویٰ ثنائیہ، جلد اول، ص ۵۵

تعالیٰ وَبَنَّا شُكُّهُ وَتَوَّاسُ گُفَت
 کہ اسم بنت لاسحق مخلوقہ بہادوست
 زیرا کہ ایں طوق اگر بشرع است
 پس باطل است و اگر مردانست
 کہ غیر شرعی است پس مضرانست
 چرا اگرچہ مخلوق از آب اوست لیکن
 ایں آب نہ آبے است کہ ہاں
 طوق نسب ثابت شدہ یکہ آبے
 است کہ صاحب اور اجز حجر
 حاصل دیگر نیست۔ ۱۷

لیے حرام ہیں کے حکم میں داخل ٹھہرے اور ہم
 نہیں کہہ سکتے کہ بیٹی کا نام اُس کے مخلوق پانی
 کی وجہ سے ہے۔ کیونکہ (بیٹی کہنا) اگر لے
 شرعی قرار دیں تو باطل ہے اور اگر اس سے
 مراد یہ ہے کہ (بیٹی ہونا) غیر شرعی ہے، تو یہ
 بات ہمارے لیے مضر نہیں ہے کیونکہ اگرچہ
 یہ لڑکی اُس کے نطفے سے پیدا ہوئی ہے،
 لیکن یہ نطفہ وہ نطفہ نہیں ہے جس سے نسب
 ثابت ہو جاتے یکہ ایسا نطفہ ہے جس سے
 پتھر کے سوا اور کچھ حاصل نہیں۔

اب عالی جناب مولوی وحید الزمان خاں صاحب حیدر آبادی کی تحقیق انیق ملاحظہ ہو:

وَلَوْ زَنَّا بِمَرْأَةٍ تَحِلُّ لَهٗ
 اُمُّهَا وَبَنَّتُهَا۔ ۱۸

اور اگر کسی عورت سے زنا کیا تو اُس آدمی
 کے لیے مذکورہ عورت کی ماں اور بیٹی جائز ہے۔

یہی حیدر آبادی صاحب غیر متقلدین کے لیے مزید گنجائش یوں پیدا فرماتے ہیں:

ولو جامع احد زوجة ابیہ
 سوا مکان بالغاً وغیر بالغ
 صغیراً او مراہقاً لم تحرم
 علی ابیہ لما قدمنا ان
 حرمة المصاهرة لا تثبت
 بالزنا۔ ۱۹

اگر کسی نے اپنے باپ کی زوجہ سے مجامعت
 کی، خواہ وہ بالغ ہو یا نابالغ، چھوٹا ہو یا
 بچہ۔ اُس کے باپ پر وہ عورت حرام
 نہیں ہوگی، جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں
 کہ زنا سے حرمت مصاہرت ثابت نہیں
 ہوتی۔

۱۷ نور الحسن خاں، مولوی، عرف الجادی، ص ۱۰۹

۱۸ وحید الزمان خاں، نزل الابرار، ج ۲، ص ۲۱ ۱۹ ایضاً: ص ۲۸

اب ذرا اسی تصویر کا رخ ملاحظہ فرما کر ان حضرات کی جرأت و جسارت کا اندازہ کیجیے کہ شریعت محمدیہ کو انگیز بہادر کے وطنیوں کی خاطر کس طرح نیچے کے ہاتھ کا کھلونا بنایا ہوا تھا؛ چنانچہ لکھا ہے :

و كذلك لوجامع من وجبة اسی طرح اگر کسی نے اپنے بیٹے کی زوجہ سے ابنہ لا تحرم علی ابنہ۔ جماع کیا تو وہ عورت اُس کے بیٹے پر حرام لے نہیں ہوگی۔

و ابی مذہب کیا ہوا، عیاشی کے مفت پرٹ تقسیم کرنے والوں کی منڈ لی ہو گئی۔ اپنے نطفے کی لڑکی سے نکاح جائز، ہو سے زنا کیا تو وہ لڑکے پر حرام نہ ہوئی، لڑکے نے باپ سے بدلہ لیا اور سوتیلی ماں سے زنا کیا تو وہ باپ پر حرام نہیں ہوئی جس سے زنا کیا اُس کی ماں اور بیٹی سے نکاح حلال۔ سارے مزے و ہابیوں کے گھر میں جمع ہو گئے۔ خیر یہ چھوٹے میاؤں کے فتوے تھے ان پر بڑے میاں اور اُن کے شیخ اکمل، مولوی نذیر حسین دہلوی کی مہر تصدیق دکھا دی جائے تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔ سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں :

سوال : کیا فرمانے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ایک شخص نے باغوائے نفس اتار کر ایک عورت سے زنا کیا۔ بعد اس کے مزنیہ کی لڑکی سے نکاح کیا اور بعد نکاح کے بھی دونوں سے وطی کی، تو نکاح درست ہوا یا نہیں؛ بر تقدیر عدم جواز صورت نباہ کی ہے یا نہیں؛ بنیوا تو جو دار۔

الجواب : نکاح مذکور درست ہوا، اس لیے کہ یہ عورت اُن عورتوں میں سے نہیں جن سے نکاح حرام ہے۔ لے

عیاشی کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی خاطر چودھوی صدی کے محققین نے متعدد کی اباحت کا حکم بھی صادر فرمایا ہوا ہے تاکہ ضرورت مند حضرات مزے اڑائیں اور نرالی محققین کا شکریہ ادا کریں۔ چنانچہ لکھا ہے :

لے وجہ الزماں خاں : نزل الابرار ، ج ۲ ، ص ۲۸

لے نذیر حسین دہلوی : فتاویٰ نذیریہ ، جلد دوم ، ص ۱۷۶

وَكَذَلِكَ بَعْضُ اصْحَابِنَا فِي
كُلِّهِ الْمَتْعَةُ فَجُوزُهَا لَا يَنْهَى
كَانَ ثَابِتًا جَائِزًا فِي الشَّرِيعَةِ
عَمَّا ذَكَرَهُ فِي كِتَابِهِ فَمَا

اسْتَمْتَعْتُ بِهِ مِنْهُنَّ فَأَتَوْهُنَّ
اجُودَهُنَّ قِرَاءَةُ ابْنِ بَنِ كَعْبٍ وَ

ابْنِ مَسْعُودٍ فَمَا اسْتَمْتَعْتُ بِهِ مِنْهُنَّ

الْحِجْلُ مَسْعُودٌ يَدُلُّ صِرَاحَةً

عَلَى إِبَاحَةِ الْمَتْعَةِ فَلَا إِبَاحَةَ

قَطْعِيَّةً لَكُونَهُ قَدْ وَقَعَ الْإِجْمَاعُ

عَلَيْهِ وَالتَّحْرِيمُ ظَنِّي ۱۰

ان محققین نے گھر کے اندر اور باہر عیاشی کے پرمٹ تقسیم فرمادیے۔ خالص زنا پر اباحت و
جواز کی شرعی مہریں لگا دیں۔ بعدہ خیال آیا ہو گا کہ بعض آدمی ایسے بھی ہوتے ہیں جو نہ گھر میں
کسی سے زنا کر سکیں نہ متعہ کی استطاعت رکھتے ہوں، اُن کی سہولت کے پیش نظر مُشت زنی
کو مباح بلکہ واجب تک قرار دے دیا گیا، تاکہ وہابی شریعت کی بہتی گنگا میں وہ بھی ہاتھ
دھولیں اور محروم نہ رہیں۔ چنانچہ سبق پڑھایا ہے،

بِالْحِجْلِ اسْتَنْزَالُ مَنِي بَكْفٍ وَبِخَيْرِ

الْزَّجْمَاتِ نَزْدُوعَا تُعَاجِزُ

مَبَاحُ اسْتِوَالِ سِيَمَا چُونِ فَاعِلِ

خَاشِي اَزْ دَوْعِ وَرَقْتَنِيَا مَعْصِيَتِ

كَمْ اَقْلُ اَحْوَالِشْ نَظَرِ بَازِ لِيَسْتِ

الغرض منی کا ہاتھ سے یا جمادات کی قسم سے
کسی چیز کے ساتھ خارج کر دینا بوقتِ
ضرورت مباح ہے، خاص طور پر جب
فاعل کو قنہ یا معصیت میں پڑنے کا خطرہ
ہو، کہ اُس کی نگاہ نے اُسے مجبور کر دیا ہو

ہاں کہ دریں عین مندوب است تو ایسے موقع پر (مشت زنی) مباح ہے
بلکہ گاہے واجب گردے۔ لے بلکہ کسی وقت واجب بھی ہو جاتی ہے۔

۷ کیا خبر تھی کہ لے کر چراغِ مصطفوی
جہاں میں آگ لگاتی پھرے گی بولہبی

مومن نے اسی کتاب میں دوسرے مقام پر اس کا رد و لائق صد نفرین حرکت کو خوفِ خدا اور
خطرہ روزِ جزا سے عاری ہو کر صحابہ کرام علیہم الرضوان کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے:

بعض اہل علم نقل ایں استثناء بعض اہل علم نے مشت زنی کو صحابہ سے
از صحابہ نزد غیبت از اہل خود نقل کیا ہے کہ جب کوئی اپنے اہل و عیال سے
کردہ اند و در مثل ایں کار حرجے دور ہو تو اس وقت اس کام کے کرنے
نیست بلکہ سچو استخراج دیگر میں کوئی حرج نہیں ہے بلکہ جسم کے دوسرے
فضلات موزیہ بدن است۔ لے نقصان پہنچانے والے فضلات کی طرح

خارج کرنا ضروری ہے۔

اگر غیر مسلم ان حضرات کی تعلیمات کو دیکھیں تو جائے غور ہے کہ وہ دینِ برحق کے بارے
میں کیا راتے قائم کریں گے؟ کیا یہی ہیں وہ اسلامی تعلیمات جن کے متعلق اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ
نِعْمَتِي فرمایا گیا؟ کیا یہی ہیں وہ اخلاقِ حسنہ جن کی تکمیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے سرورِ کون و
مکان صلی اللہ علیہ وسلم کو صاحبِ خلقِ عظیم بنا کر مبعوث فرمایا تھا؟ ہاں افسوس! اپنے
ہاتھوں اپنے دین کی بیخ کنی۔ شاہین بچوں کو خاکِ بازی کھانا اور عنادِ دل کو زراغِ ولوم بنانا
کس کا غرہِ خونی زہ ہے؟ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

سید احمد بریلوی (المتوفی ۱۲۶۶ھ / ۱۸۳۱ء) نے تو
غیر مقلدین کی الہام بازی الہامات کے ڈھیر لگائے ہی تھے اور وحی و عصمت کے

دعویٰ کرتے ہوئے مہدیت کے دعویٰ تک ہی پہنچے تھے کہ یہ فتنہ ہمیشہ کے لیے بالاکوٹ میں دفن ہو کر رہ گیا۔ پٹھانوں کے خنجر نے مسلمانوں کی بروقت دستگیری کی اور برٹش گورنمنٹ کے ایسے خودکاشتہ پودے بیج دیے کہ پٹھانوں سے اٹھاڑ کر پھینک دیے گئے۔ جو بات سید احمد صاحب شروع ہو کر مرزا غلام احمد قادیانی کے ہاتھوں پوری ہوئی اُسی کی درمیانی کڑیاں مولوی محمد قاسم نانوتوی بانی مدرسہ دیوبند اور مولوی عبداللہ غزنوی غیر مقلد وغیرہ بھی ہیں۔ جب نبوت کا دعویٰ کرنے کی غرض سے مولوی صاحب تیاریاں کر رہے تھے تو اُن کی جانب سے شب و روز الہامات کی بارش برساتی جا رہی تھی کہ مسلمان اُن کی رُوحانیت اور مقام و منصب کے قائل ہو کر معتقد بن جائیں۔ تاکہ بوقت دعویٰ کچھ تو اَمْتًا و صِدْقًا کہنے والے مل جائیں۔ اب الہامات سنئے:

(۱)

جب میں الہام کو سمجھتا تھا اور توحید سے بخوبی واقف نہ تھا، ایک بار اپنے دادا محمد شریف کی قبر کے پاس جو اُس دیار میں مرجع اور مقبول انام ہے، گیا تو القا ہوا، لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، لیکن اُس وقت میں نے غلطی کی اور میں نے خیال کیا کہ یہ وردِ مجذوب کو وظیفہ کرنے کے لیے سکھایا گیا ہے۔ اب میں نے جان لیا کہ وہ اللہ کی طرف سے الہام تھا کہ میرے سوا دوسروں کی طرف رجوع کرنا عبادت اور استعانت میں شرک ہے۔ اکیلے اللہ کی طرف پوری توجہ چاہیے۔ قبروں پر اس نیت سے جانا کہ میرا فلان مطلب حاصل ہو جائے توحید میں رخنہ ڈالتا ہے اور کلمہ شہادت یعنی اَشْهَدُ اَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ کے معنی کے مخالف ہے۔ ۱

(۲)

بارِ ما مجذوب کو الہام ہوا ہے: یا عبادِی ہذا کتابی و ہذا عبادی فاقروا کتابی علی عبادی۔ یعنی اے میرے بندے! یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے بندے ہیں۔ پس پڑھ میری کتاب میرے بندوں پر۔ اور یہ بھی الہام ہوتا ہے: وَلَنْ اتَّبَعَ اَهْوَاءَهُمْ بَعْدَ الَّذِي جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ۱

سکندر پرور کے باغ میں، جو ہزارہ کے علاقے میں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے فجر کی نماز کے بعد یہ القاء ہوا، ولا ترکوا الی الذین ظلموا فتمسکوا النامر۔ اور ظالم کی تعریف ان لفظوں سے معلوم کرائی، والظالمون هم الذین یخالفون عن امر ربهم ثم لا یتوبون۔ یعنی ظالم وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشادوں کی مخالفت کرتے ہیں اور باز نہیں آتے۔ اور جن لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے ان کو اس مضمون کے ساتھ آگاہ کیا، واصبر نفسك مع الذین یدعون ربهم بالغداوة والعشوی یریدون وجهہ۔ اور فرماتے تھے کہ الہام ہوا، فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ۔ یعنی جو کچھ الہام ہوتا ہے اُس کے لفظیاد رکھ اور اُس کا بیان کرنا اور تفسیر ہمارا ذمہ ہے اور فرماتے تھے الہام ہوا، واعامن خاف مقام ربہ (الایۃ) یعنی وہ شخص کہ ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے۔ اور یہ الہام ہو کہ ہمیشہ بدل خود مطالعہ کر رہا باشن مبادہ کدورتے از ما سوا بنشیند یعنی ہمیشہ اپنے دل میں جھانکتے رہو، ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کدورت بخشد جاوے۔

اور شہر دہلی میں یہ الہام ہوا، ولا تمدن عینیک الی ما متعنا بہ امر واجامنہم مہرۃ الحیوۃ الدنیا۔ اور مت پھیلا اپنی آنکھیں طرف اُن کی کہ فائدہ دیا ہم نے ساتھ اُس کے بھانت بھانت لوگوں کو زندگانی دنیا کی تازگی سے۔ اور باغ سکندریہ میں یہ الہام ہوا، قل لا امر داجک واولادک واتباعک قوموا للہ قانتین یعنی کہ دے اپنی پیلیوں اور اولاد اور تابعداروں کو کہ کھڑے ہو جاؤ اللہ کے لیے تابعدار ہو کر اور اس کے اخیر میں یہ الہام ہوا، انا حبیبک وانیسک فلا تحزن۔ یعنی میں تیرا مددگار ہوں، تو غم نہ کھد اور یہ بھی الہام ہوا، ما اودعت فی قلبک فان رؤیا المؤمن جزء من سنتہ اربعین جزءا من النسبۃ۔ یعنی جو تذکرہ اور فکر قرآن کا تیرے دل میں ہم نے ڈال دیا ہے اُس کو مت بھول کیونکہ مومن کا خواب ایک حصہ ہے نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے۔

اور فرماتے تھے دہلی میں یہ الہام ہوا، ولا تطعم من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا

واتبع هواہ وکان امرہ فرطاً۔ اور فرمانبرداری نہ کر اُس شخص کی جو غافل کیا ہم نے اُس کے دل کو اپنی یاد سے اور پیچھے پڑا اپنی خواہش کے اور بے کام اُس کا حمد سے بڑھا ہوا۔ یعنی غافلوں کی غفلت میں پیروی نہ کر۔ اور یہ بھی القاء ہوا: کن فی الناس کا حد من الناس۔ یعنی ہر تو لوگوں میں جیسے دوسرے لوگ ہیں۔ اور القاء ہوا: اگر وقت غفلت شد تدارک اُن وقت دیگر لازم است یعنی کسی وقت غفلت ہو جاوے تو دوسرے وقت میں اُس کا تدارک لازم ہے۔^{۱۷}

(۴)

فرماتے تھے، تین بار الہام ہوا: واللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً۔ اور واسطۃ اللہ کے ہے اوپر لوگوں کے حج کرنا بیت اللہ کا جو طاقت رکھے طرف اُس کی راہ کی۔ اور فرماتے تھے، الہام ہوا: ولسوف یعطیک ربک فترضی۔ یعنی اور البتہ جلدی دے گا تجھ کو رب تیرا پھر تو خوش ہو جاوے گا۔ اور فرماتے تھے، الہام ہوا: الم نشرح لك صدرک۔ یعنی کیا نہیں کھولا ہم نے سینہ تیرا؟۔^{۱۸}

(۵)

جنگل کی کسی غار میں اکیسے جا کر چھپ گئے اور کچھ مدت پوشیدہ رہے۔ اُن دنوں میں یہ الہام ہوا: فقطع دابر القوم الذین ظلموا فالحمد للہ رب العالمین۔

(۶)

مولوی عبدالرحمن بن شیخ محمد بارک اللہ (لکھوی) کہ وقت کے عالموں سے مشہور عالم ہیں اور زہاد و تقویٰ اور صلاحیت میں اپنے زمانے کے امام، آپ (مولوی عبداللہ غزنوی) کی صحبت بابرکت سے فیض حاصل کرنے کے لیے ملک پنجاب سے سفر کر کے ملک غزنوی تک، جو دو ماہ کی مسافت ہے گئے، راستے میں جو انھوں نے مخالفوں سے کچھ کلمات آنجناب

(غزنوی صاحب) کی نسبت سُنئے توحیران ہوتے۔ اسی رات اُن کو یہ الہام ہوا: فوسب السماء والارض انه لحق مثل ما انکم تنطقون۔ دوسری بار یہ الہام ہوا: والله لمن المصطفین الاخيار۔ تیسری بار یہ الہام ہوا: ان هو الا عبد اعننا عليه۔ لہ

فارئین کرام! یہ ہم نے غیر مقلدوں کے مولوی عبداللہ غزنوی کے چھ عنوانات کے تحت صرف بانس الہام پیش کیے ہیں جن میں سے تین الہام مولوی عبدالرحمن لکھوی کے بھی ہیں۔ مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور اُن کے دین و ایمان پر دن دھاڑے ڈاکے ڈالنے کی خاطر جو یہ پراسرار جال بچایا تھا اُس کا شیطانی ہونا خود واضح ہے جس کے لیے کسی خارجی دلیل کی چدال ضرورت نہیں۔ اللہ جل مجدہ پر اہتمام کے ساتھ افتراء پر دازی، کلام الہی کے ساتھ قدم قدم پر مذاق، نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے برابری کہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ اور اَلَمْ نُشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ کو اپنے اوپر چسپاں کرنا، حالانکہ پوری کائنات ارضی و سماوی میں ایسی ذات صرف غمخیز و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ہے جس کی رضا پروردگار عالم کو مطلوب ہے ورنہ اور سب رضائے الہی کے طالب ہیں۔ یکس درجہ ستم ظریفی ہے کہ سرور کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا مد مقابل کسی مولوی مُلاں کو تسلیم کر لیا جائے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ دین و ایمان سے اس درجہ بناوٹ کرنے والے حضرات کو بزرگ اور صاحب کشف و کرامت تسلیم کر کے بزرگ منوانے کی مہم چلائی جاتی ہے۔

غیر مقلد حضرات کی قرآن و حدیث میں تحریفیات، ائمہ دین پر بہتانات اور سہل پسندی کے تحت مسائل کی خانہ ساز ایجادات کے بارے میں مشعلِ راہ جلد دوم کا انتظار فرمائیے۔ وہاں بفضلہ تعالیٰ میر ہن کر دکھایا ہے کہ مجدد مآثرہ حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے ان حضرات کی تخریب کاری کا کس طرح محاسبہ کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھایا تھا۔ تفصیل سے بچنے کی خاطر ہم نے یہاں اُن مسائل کا ذکر نہیں کیا جو غیر متقلبین حضرات نے شریعت سازی کے تحت اختلاقی بنا کر رکھ دیے ہیں۔ ہاں مشعلِ راہ جلد دوم میں ایسے بعض مسائل کا تفصیلی ذکر آئے گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔ بات مولوی عبداللہ غزنوی

کے الہامات کی بہرہی تھی۔ ذرا موصوف کے سوانح نگار مولوی عبدالجبار غزنوی کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

”جو الہام اور خواہیں آپ کو کتاب و سنت پر ثابت رہنے اور خلق اللہ کو کتاب و سنت کی طرف بلانے اور تقویٰ اور توکل اور صبر اور خشیت اور زہد و قناعت و ترک ماسوی اللہ اور انابت اور آپ کے مقام امانت میں پہنچنے اور آپ کی حفظ اور نصرت اور مغفرت کے وعدہ پر بھونے ہیں، وہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں تک پہنچتے ہیں۔ ان کے جمع کے لیے ایک بڑی کتاب چاہیے۔“

یہ صرف ایک مولوی صاحب کی بات ہے۔ اسے صرف نمونہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اگر ہم دوسرے غیر مقلد مولویوں کے الہامات اور کشف و کرامت پر مبنی بیانات لکھنے شروع کر دیں تو یقیناً ہمیں بھی یہی کہنا پڑے گا کہ انھیں بیان کرنے کے لیے علیحدہ ایک بڑی سی کتاب چاہیے۔

بہر حال ماقول و کفی خیر متاکثر والہی۔ اللہ تعالیٰ اپنا زمانہ کو سچی ہدایت نصیب فرماتے۔ آمین

۳۔ دیوبندی جماعت کی تخریب کاری

جب وہابیہ کی اولین جماعت، جس نے محمدی گروہ سے اہلحدیث تک کے اپنے اوپر لیبیل لگائے وہ مسلمانوں میں ذرا بھی مقبولیت حاصل نہ کر سکی اور برٹش گورنمنٹ کا خواب افراق بین المسلمین شرمندہ تعبیر ہونے سے مجبور ہو کر رہ گیا تو حکومت نے کتاب وہابیت کا دوسرا ایڈیشن شایع کیا، جو آج دیوبندیت کے نام سے متعارف اور اہل حق کے لیے مکمل درد سر کا باعث ہو کر رہ گیا ہے۔

غیر مقلد حضرات چونکہ اپنے بعض مخصوص افعال یعنی آمین بالجہر، سینے پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا، رفع یدین کرنا اور آٹھ تراویح ایک وتر وغیرہ کے باعث پہچان لیے جاتے تھے اور ایک جاہل مسلمان بھی ان کے پھندے میں نہیں پھنستا تھا۔ نہ مسلمانوں نے اس

ہم کی کوئی جماعت دیکھی یا سنی تھی اور نہ یہ افعال اس طرح اُن کے مشاہدے یا علم میں آئے تھے اس لیے وہ چند سر پھرے بتدعین کی کوئی بات سُننا گوارا ہی نہیں کرتے تھے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کی خاطر وہابیوں کی دوسری جماعت ایسی تیار کی جو پُر اسرار طریقے پر وہابیت کی نشر و اشاعت کرے۔ دیوبندی حضرات نے منافقت اور قیاری کی انتہا کرتے ہوئے اپنے کام کا آغاز کر دیا۔ یہ حضرات دعویٰ سنی حنفی ہونے کا کرتے ہیں، پیری مریدی تک کا ڈھونگ رچاتے ہیں لیکن کام سارا وہابیت کا کرتے ہیں۔ یہ خوشنمائل محض اس غرض سے لگاتے ہیں کہ مسلمانانِ اہلسنت و جماعت انھیں وہابی شمار نہ کریں بلکہ سنی حنفی جان کر برضا و رغبت ان کے جال میں پھنستے چلے جائیں۔ جال بھی ان حضرات کے پاس ایسے خوشنما ہیں جو نابلیفِ قلوب کے ساز و سامان سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہیں۔ اب ان حضرات کی چند خصوصیات پیش کی جاتی ہیں، و باللہ التوفیق۔

اسمعیل پستی یہ جماعت بھی اہلحدیث اور دیگر وہابی حضرات کی طرح مولوی محمد اسمعیل دہلوی کو منصب الوہیت پر فائز کیے ہوئے ہے، جو قرآنِ کریم کی اصطلاح میں اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰہ بنانا کہلاتا ہے۔ دیوبندی حضرات بھی قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب میں تبدیلی کر لیں گے لیکن مولوی اسمعیل دہلوی کی کسی گندی سے گندی بات کو غلط تسلیم کر لیں، یہ ان حضرات سے بہت بعید ہے۔ عملاً ان حضرات کے نزدیک دین کا اولین ماخذ و سوائے زمانہ تصنیف یعنی تقویۃ الایمان ہے۔ اس کتاب کے پیش کردہ غیر اسلامی عقاید، غلط مسائل اور مقرہین بارگاہِ الہیہ کی شان میں جاری کیے ہوئے یہودہ کلمات و مغلطیات کو غلط مان لینا دیگر وہابیہ کی طرح ان حضرات کے بس سے باہر ہے۔ دیوبندی حضرات بھی قرآن و حدیث کی کسوٹی پر تقویۃ الایمان کو پرکھنے کی ہرگز اجازت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، ہاں تقویۃ الایمانی مندرجات کی صحت ثابت کرنے کی غرض سے آیات و احادیث کو کھینچ تان کر اس کی تائید و حمایت میں پیش کرنے کی جسارت ضرور کرتے رہتے ہیں۔

تقویۃ الایمان کو اسلام کا نچوڑ ثابت کرنے کی خاطر آیات و احادیث میں معنوی تحریف کرنا دیوبندیوں کے نزدیک قطعاً جرم نہیں، گناہ نہیں، ہاں اس بات کو ضرور اپنے ساختہ دین و

کو ہدایت کرنے والے تھے اور تمام عمر اسی حالت میں رہے آخر کار فی سبیل اللہ جہاد میں کفار کے ہاتھ سے شہید ہوئے۔ پس جس کا ظاہر حال ایسا ہو وہ دلی اللہ اور شہید ہے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے: ان اولیاء الا للمتقون اور کتاب تقویۃ الایمان نہایت عمدہ کتاب ہے اور وہ شرک و بدعت میں لاجواب ہے۔ استدلال اس کے بالکل کتاب اللہ اور احادیث سے ہیں۔ اُس کا رکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام ہے اور موجب اجر کا ہے۔ اس کے رکھنے کو جو بڑا کہتا ہے وہ فاسق اور بدعتی ہے۔ اگر اپنے جہل سے کوئی اس کتاب کی خوبی نہ سمجھے تو اس کا تصور فہم ہے کتاب اور ٹولف کتاب کی کیا تقصیر؟ بڑے بڑے عالم اہل حق اس کو پسند کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر کسی گمراہ نے اُس کو بڑا کہا تو وہ خود ضال و مضل ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ الراجی حقہ ربہ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

(۵)

جواب: بندہ کے نزدیک سب مسائل اُس (تقویۃ الایمان) کے صحیح ہیں اگرچہ بعض مسائل میں نظام ہر شدہ ہے اور تو برکنا اُن کا بعض مسائل سے محض افتراء اہل بدعت کا ہے اور اگر اُن کو بزرگ نہ جانے، جھوٹے حالات اُن کے سن کر، تو معذور ہے اور اگر کتاب کے خلاف عقیدہ رکھتا تو وہ مبتدع فاسق ہے اور وہ فرماتے تھے کہ حبت تک حدیث صحیح غیر منسوخ ملے، اُس پر عامل ہوں ورنہ ابو حنیفہ کی رائے کا منقلد ہوں اور سید صاحب کا بھی یہی مشرب تھا اور محمد بن عبد الوہاب کے عقاید کا مجھ کو مفصل حال معلوم نہیں اور نہ خلفاء سید صاحب کا۔ اور مولوی اسماعیل صاحب وعظ و رد بدعت میں مصروف رہے پھر جہاد میں جا کر شہید ہو گئے۔

سلسلہ بیعت کا کہاں جاری کرتے اور تمام تقویۃ الایمان پر عمل کرے۔ فقط

رشید احمد گنگوہی عفی عنہ

مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور تقویۃ الایمان کے بارے میں دیوبندی جماعت کے

لے رشید احمد گنگوہی، مولوی، فتاویٰ رشیدیہ محبوب، ص ۱۴

لے ایضاً، ص ۴۴

رخیل و سنگ بنیاد رکھنے والے مولوی رشید احمد گنگوہی کے خیالات فتاویٰ رشیدیہ سے بغیر کسی تنقید و تبصرہ کے پیش کر دیے ہیں۔ طوالت کے خوف سے دیگر اکابر دیوبند کے اس بارے میں خیالات پیش کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ لہذا ان پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

یہ خبیث عقیدہ جو کبھی مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے گھڑا اور اپنے رسالہ **امکان کذب** بیکروزی کے ذریعے مشہور کیا تھا اور جو پوری شریعت مطہرہ کو باطل ٹھہرانے کے لیے کافی ہے، ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء میں بالاکوٹ کے اندر دفن ہو گیا تھا۔ غیر مقلد حضرات نے اس باطل نظریہ سے دامن چھڑانے کی کوشش کی اور اپنی تصانیف میں اس کی جانب سے خاموشی برتی۔ اٹھاون سال بعد مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب نے اس مُردے کو دوبارہ زندہ کیا اور ہزار رد و تردید کے باوجود جیتے جی اسے مرنے نہ دیا۔ شاید مولوی محمد حسن دیوبندی کے اس شعر سے

مُردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا

اس مسیحائی کو دیکھیں ذہری ابنِ مریم

کا صحیح مفہوم یہی ہے کہ ۱۳۰۴ھ میں براہین قاطعہ کے اندر دوبارہ یہ مسئلہ چیل قدمی کرتا ہوا نظر آیا، جسے اپنے شاگرد مولوی خلیل احمد انبٹھوی کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ چنانچہ اُس میں لکھا ہے:

”امکان کذب کا مسئلہ تو اب جدید کسی نے نہیں نکالا بلکہ قدام میں اختلاف ہوا ہے

کہ خلف و عید آیا جائز ہے کہ نہیں“۔ لے

اگلے صفحے پر موصوف نے اسی بات کو یوں دہرایا ہے:

”امکان کذب کہ خلف و عید کی فرع ہے جو قدام میں مختلف فیہ ہو چکا ہے“۔ لے

مشعل راہ کی جلد دوم میں انشاء اللہ تعالیٰ اس مسئلے پر مفصل بحث ہوگی، اس لیے ہم یہاں کسی قسم کی تنقید و تبصرہ کرنے کا حق محفوظ رکھتے ہیں۔ وہاں واضح کیا جائے گا کہ دیوبندی

حضرات وقوع کذب تک کے قائل ہیں۔

سید احمد صاحب دعویٰ نبوت کی تیاریاں کر رہے تھے لیکن ہدایت کے
انکار ختم نبوت دعویٰ تک ہی پہنچے تھے کہ پٹھانوں کے خجروں نے بنابنیا کھیل بگاڑ دیا۔
 ان کے بعد دارالعلوم دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کو تیار کیا گیا۔ موصوف نے
 تحذیر الناس کتاب لکھ کر عقیدہ ختم نبوت پر پیشہ زنی کی اور خاتمیت مرتبی کے نام سے تقریباً
 تیرہ صدیوں کے بعد ایک خاتمیت گھڑی جس کے سننے سے مسلمانوں کے کان نا آشنا بنے تھے۔
 یہ تھا دعویٰ نبوت کے لیے چور دروازہ تیار کرنا، لیکن عمر نے وفانہ کی اور کتاب کے منظر عام پر
 آنے کے چند سال بعد راہی ملک عدم ہو گئے اور موصوف کا کھولا ہوا دروازہ مرزا غلام احمد قادیانی
 کے کام آیا۔ اب ملاحظہ ہو کہ نانوتوی صاحب نے اُس عقیدہ ختم نبوت کو، جس کی تشریح خود
 نبی آخر الزماں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے لَا نَبِيَّ بَعْدِي کے لفظوں میں فرمائی تھی، اسی خاتمیت
 کو موصوف نے بے وقوفوں کا خیال اور خلاف قرآن بتایا ہے، چنانچہ لکھا ہے،
 ”عوام کے خیال میں تو رسول اللہ کا خاتم ہونا بایں معنی ہے کہ آپ کا زمانہ انبیاء
 کے زمانہ کے بعد اور آپ سب میں آخری نبی ہیں، مگر اہل فہم پر روشن ہوگا کہ
 تقدم یا تاخر زمانے میں بالذات کچھ فضیلت نہیں۔ پھر مقام مدح میں دلکن
 رسول اللہ و خاتم النبیین فرمانا اس صورت میں کیونکر صحیح ہو سکتا ہے
 ہاں اگر اس وصف کو اوصاف مدح میں سے نہ کیے اور اس مقام کو
 مقام مدح نہ قرار دیکھے تو البتہ خاتمیت باعتبار تاخر زمانی صحیح ہو سکتی ہے، مگر میں
 جانتا ہوں کہ اہل اسلام میں سے کسی کو یہ بات گوارا نہ ہوگی کہ اس میں ایک تو
 خدا کی جانب لغو باللہ زیادہ گوئی کا دہم ہے۔ آخر اس وصف میں اور قد و قات
 و شکل و رنگ و حسب و نسب و سکونت وغیرہ اوصاف میں جن کو نبوت یا اور
 فضائل میں کچھ دخل نہیں، کیا فرق ہے، جو اس کو ذکر کیا اوروں کو ذکر نہ کیا؟
 دوسرے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب نقصان قدر کا احتمال، کیونکہ اہل کمال
 کے کمالات ذکر کیا کرتے ہیں اور ایسے ویسے لوگوں کے اس قسم کے احوال

بیان کیا کرتے ہیں۔ اعتبار نہ ہو تو تاریخوں کو دیکھ لیجیے۔ باقی یہ احتمال یہ دین آخری
 دین تھا، اس لیے سد باب اتباع مرعیان نبوت کیا ہے جو کل جھوٹے دعویٰ کر کے
 خلائق کو گمراہ کریں گے، البتہ فی حد ذاتہ قابل لحاظ ہے پر جملہ ماکان محمد ابا
 احد من رجالکم اور جملہ ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین میں کیا
 تناسب تھا جو ایک کو دوسرے پر عطف کیا اور ایک مستدرک نہ اور دوسرے کو
 استدراک قرار دیا اور ظاہر ہے کہ اس قسم کی بے ربطی اور بے ارتباطی خدا کے کلام
 معجز نظام میں متصور نہیں۔ اگر سد باب مذکور ہی منظور تھا تو اس کے لیے اربیسوں
 موقع تھے، لے

اب اس سے آگے موصوف یوں اپنے اظہارِ مدعا کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں:
 ”تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ موصوف بالعرض کا قصہ موصوف بالذات پر
 ختم ہو جاتا ہے، لے

اسی بات کو نانوتوی صاحب نے ذرا یوں کھل کر بیان کر دیا ہے:

”آپ موصوف بوصف نبوت بالذات ہیں اور سوا آپ کے اور نبی موصوف بوصف
 نبوت بالعرض۔ اور وہ کی نبوت آپ کا فیض ہے پر آپ کی نبوت کسی اور کا فیض
 نہیں۔ آپ پر سلسلہ نبوت مختتم ہو جاتا ہے، لے

اب اس بات کو بالذات وبالعرض سے علیحدہ ہو کر خاتمیت مرتبی و خاتمیت زمانی کی اصطلاحوں
 میں دیکھیے اور نانوتوی صاحب کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ موصوف نے لکھا ہے:
 ”ہاں اگر بطور اطلاق یا عموم مجاز اس خاتمیت کو زمانی اور مرتبی سے عام لے لیجیے
 تو پھر دونوں طرح کا ختم مراد ہوگا پر ایک مراد ہو تو شایان شان محمدی صلعم خاتمیت
 مرتبی ہے نہ زمانی، لے

اور موصوف کی زبانی اُن کی گھڑی ہوئی خاتمیت مرتبی کا فائدہ بھی سُن لیجئے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

”غرض اختتام اگر بایں معنی تجویز کیا جاتے جو میں نے عرض کیا تو آپ کا خاتم ہونا انبیاء گذشتہ ہی کی نسبت خاص نہ ہوگا بلکہ اگر بالفرض آپ کے زمانے میں بھی کہیں اور کوئی نبی ہو جب بھی آپ کا خاتم ہونا بدستور باقی رہتا ہے۔“ لے

خاتمیت مرتبی کا نانوتوی صاحب نے دوسرا فائدہ یہ بتایا ہے:

”ہاں اگر خاتمیت بمعنی اتصاف ذاتی بوصف نبوت لیجیے جیسا کہ اس سمجھانے میں عرض کیا ہے تو پھر سوا رسول اللہ صلعم اور کسی کو افراد مقصود بالخلق میں سے مماثل نبوی صلعم نہیں کہہ سکتے بلکہ اس صورت میں فقط انبیاء کی افراد خارجی ہی پر آپ کی افضلیت ثابت نہ ہوگی افراد مقدرہ پر بھی آپ کی افضلیت ثابت ہو جائے گی بلکہ اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی صلعم بھی کوئی نبی پیدا ہو تو پھر بھی خاتمیت محمدی میں کچھ فرق نہ آئے گا، چچ جائیکہ آپ کے معاصر کسی اور زمین میں یا فرض کیجیے اسی زمین میں کوئی اور نبی تجویز کیا جائے۔“ لے

اگر کوئی کہے کہ اللہ و رسول نے تو خاتمیت سے مراد خاتمیت زمانی بتائی تھی، اُمتِ محمدیہ نے یہی سمجھی اور آنے والوں کو تیرہ سو سال تک سمجھائی تھی۔ نانوتوی صاحب! آپ اُس خاتمیت زمانی کا تو انکار بلکہ بیخ کنی کر رہے ہیں اور اُس کی جگہ ایک خانہ ساز خاتمیت پیش کر رہے ہیں جس کو خاتمیت مرتبی کا نام دیا ہے۔ کیا یہ بزرگوں کی توہین نہیں کہ اُنھیں ایسے ضروری عقیدہ سے جاہل ٹھہرایا جا رہا ہے ورنہ بصورتِ دیگر آپ دین میں ایک نیا عقیدہ پوری اُمتِ محمدیہ کے خلاف داخل کر کے مداخلت فی الدین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں نانوتوی صاحب کا جواب ملاحظہ ہو:

”باقی رہی یہ بات کہ بڑوں کی تاویل کو نہ مانیں تو اُن کی تحقیر لغو ذرا لاشہ لازم آئیگی،

یہ انھیں لوگوں کے خیال میں آسکتی ہے جو بڑوں کی بات فقط ازراہ بے ادبی نہیں
مانا کرتے۔ ایسے لوگ اگر ایسا سمجھیں تو بجا ہے۔ المرء یقیس علی نفسہ۔
اپنا یہ طریقہ نہیں۔ نقصان شان اور چیز ہے اور خطا و نسیان اور چیز۔ اگر بوجہ
کم التفاتی بڑوں کا فہم کسی مضمون تک نہ پہنچا تو اُن کی شان میں کیا نقصان آگیا؟
اور کسی طفلِ نادان نے کوئی ٹھکانے کی بات کہہ دی تو کیا اتنی بات سے وہ عظیم الشان
ہو گیا؟

گاہ باشد کہ کودکِ نادان

بلغت بر بدتِ زندِ تیرے

ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ بانی دارالعلوم دیوبند ہی نے عقیدہ ختم نبوت پر تیشہ زنی کی لیکن
دیوبندی حضرات کے نزدیک اس سے نا تو تو ہی صاحب کی بزرگی میں بال برابر فرق نہ آیا۔ اس
کے ثبوت پر پردہ ڈالنے بلکہ بے خبر مسلمانوں کو دھوکے میں رکھنے کی خاطر عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ
میں علمائے دیوبند شروع ہی سے علمائے اہلسنت سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرتے رہتے
ہیں، حالانکہ حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا جاٹے تو صاف نظر آنے لگے کہ: ص
قائد مرزا انھیں کا صاحبِ تحذیر ہے

تفقیص رسالت کی ناقابلِ فہم جسارت
مولوی خلیل احمد انبٹھوی نے اپنی
رسوائے زمانہ کتاب براہین قاطعہ میں
فرمود عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیط زمین کے حصولِ علم سے انکار کرتے ہوئے صاف
لکھ دیا:

”الحاصل غور کرنا چاہیے کہ شیطان و ملک الموت کا حال دیکھ کر علمِ محیط زمین کا
فخرِ عالم کو خلافِ نصوصِ قطعیہ کے بلا دلیل محض قیاسِ فاسدہ سے ثابت کرنا
شرک نہیں تو کون سا ایمان کا حصہ ہے۔ شیطان و ملک الموت کو یہ وسعت

نص سے ثابت ہوئی، فخرِ عالم کی وسعتِ علم کی کون سی نص قطعی ہے کہ تمام
نصوص کو رد کر کے ایک شرک ثابت کرتا ہے۔ ۱

انبٹھوی صاحب نے جب علم محیطِ زمین مخلوق میں سے شیطان و ملک الموت کے لیے
تسلیم کر لیا اور وہ بھی نصوص سے، تو ثابت ہوا کہ یہ ایسا علم ہے جو مخلوق کو حاصل ہو سکتا ہے
اور باری تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں۔ اس حقیقت کے پیشِ نظر مذکورہ عبارت کے بارے
میں چند سوال ذہن میں اُبھرتے ہیں:

۱۔ فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے محیطِ زمین کے علم کا حصول شرکِ ٹھہرانا جو
خاصہ باری تعالیٰ ابھی نہیں، ایسی جبارت کا باعث شانِ رسالت سے بغض و
عداوت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

۲۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وسعتِ علم پر تو قرآن و حدیث کی سیکڑوں نصوص
شاہد ہیں گنگوہی و انبٹھوی صاحبان پوچھتے ہیں کہ کون سی نص قطعی ہے کہیں
یَخْتَلَمُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ
غِشَاوَةً وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ والا معاملہ ہی تو نہیں ہے۔

۳۔ جب اس علم کا حصول فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تک کے لیے ثابت کرنا
شرک ہے تو شیطان و ملک الموت کے لیے ثابت ماننا کیوں شرک نہ ہوا؟ کیا
ان دونوں کو خدا کا شریک بنانا جائز ہے؟

۴۔ جس علم کا مخلوق کے لیے اثبات شرک ہے، وہ قرآن و حدیث نے شیطان و
ملک الموت کے لیے ثابت کر کے خود شرک کی تعلیم دی یا نہیں؟

عداوت و محبت کا رنگ اپنی اپنی جگہ نہ لانا ہوتا ہے۔ جس طرح محبت کبھی محبوب کی خرابی
سامنے نہیں آنے دیتی اسی طرح عداوت خوبیوں کو نگاہوں سے اوجھل رکھتی ہے۔ گنگوہی و
انبٹھوی صاحبان حقیقت میں سرورِ کون و مکار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عداوت میں اتنے

پتہ کار ہو چکے تھے کہ اولین و آخرین کے علوم کی جامع ہستی کا علم ان صاحبان کو نہ شیطان کے برابر نظر آتا تھا، نہ ملک الموت کے برابر، بلکہ ایک امتی کے برابر بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ موصوف کے اُسی زہر آلود و ایمان سوز قلم نے یہ بھی لکھا ہوا ہے:

”ان ادویاء کو حتیٰ تعالیٰ نے کشف کر دیا کہ اُن کو یہ حضورِ علم حاصل ہو گیا۔ اگر اپنے فخرِ عالم علیہ السلام کو بھی لاکھ گونہ اس سے زیادہ عطا فرما دے ممکن ہے، مگر ثبوتِ فعلی اس کا کہ عطا کیا ہے، کس نص سے ہے کہ اس پر عقیدہ کیا جائے؟“

جدا عقل کی اس نارسائی، بخت کی تیرگی اور نورِ ایمان سے محرومی کا رونا کہاں تک رویا جائے کہ جس سرکار کے غلاموں کے لیے بذریعہ کشف اس علم کا حصول خود تسلیم کر لیا، اُسی آقائے کائنات کے بارے میں اندر اور باہر کی سب آنکھیں بند ہو گئیں، قلم کی روشنائی اور زبان کی قوتِ گویائی وہی غلاموں خادموں جیسا علم تسلیم کرنے سے جواب دے گئی اور اس پر عقیدہ قائم کرنے کے لیے ایک نص بھی نظر نہ آئی یا بینائی نے ساتھ نہ دیا بلکہ بیوتِ فعلی کا انکار کر کے کائناتِ ارضی و سماوی کی اُس سب سے بڑی بارگاہ کے عقیدت مندوں، خادموں اور غلاموں کے قلب و جگر پر خنجر چلاتے ہوئے اسے ایسا شرک رکھ دیا جس میں ایمان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

وہی انصاف سے کہہ دیں کہ ہے کس کی جبکہ اچھی
بنغل میں ان کی ہم، پہلو میں وہ دشمن کے بیٹھے ہیں

اُدھر مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) سے ایک طویل سوال ہوا۔ جس کے آخر میں سائل نے لکھا ہے: ”زید کا یہ استدلال اور عقیدہ و عمل کیسا ہے؟ تھانوی صاحب نے جواب میں یہ بھی لکھا:

”آپ کی ذاتِ مقدسہ پر علمِ غیب کا حکم کیا جانا اگر بقول زید صحیح ہو تو دریافتِ طلب یہ امر ہے کہ اس غیب سے مراد بعض غیب ہے یا کل غیب؟ اگر بعض علومِ غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے، ایسا علم غیب تو زید و عمر و بلکہ ہر صبی

و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے کیونکہ ہر شخص کو کسی نہ کسی ایسی بات کا علم ہوتا ہے جو دوسرے شخص سے مخفی ہے۔ تو چاہیے کہ سب کو عالم الغیب کہا جائے۔ پھر اگر زید اس کا التزام کر لے کہ ہاں میں سب کو عالم الغیب کہوں گا تو پھر علم غیب کو منجملہ کمالات نبویہ شمار کیوں کیا جاتا ہے۔ جس امر میں مومن بلکہ انسان کی بھی خصوصیت نہ ہو وہ کمالات نبوت سے کب ہو سکتا ہے اور التزام نہ کیا جاوے تو نبی و غیر نبی میں وجہ فرق بیان کرنا ضرور ہے اور اگر تمام علوم غیبیہ مراد ہیں، اس طرح کہ اُس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل عقلی و عقلی سے ثابت ہے یہ۔

اس عبارت میں تھانوی صاحب نے علم غیب کی دو قسمیں کی ہیں (۱) بعض غیب (۲) کل غیب۔ مؤخر الذکر کے بارے میں موصوف نے صاف لکھ دیا کہ: "اگر تمام علوم غیبیہ مراد ہیں، اس طرح کہ اُس کی ایک فرد بھی خارج نہ رہے تو اس کا بطلان دلیل عقلی و عقلی سے ثابت ہے۔" اب باقی رہ گئی پہلی قسم یعنی بعض غیب۔ اس کے بارے میں موصوف نے بغیر کسی ہیر پھیر کے صاف لکھ دیا کہ: "اگر بعض علوم غیبیہ مراد ہیں تو اس میں حضور کی ہی کیا تخصیص ہے؟ ایسا علم غیب تو زید و عمر و بلکہ ہر صبی و مجنون بلکہ جمیع حیوانات و بہائم کے لیے بھی حاصل ہے۔" اس ناپاک عبارت میں تھانوی صاحب نے علی الاعلان کہہ دیا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسا علم غیب تو زید و عمر و بلکہ بچوں، پاگلوں اور جانوروں کو بھی حاصل ہے (نعوذ باللہ من ذالک)۔ موصوف سے اس عبارت کو بدلنے اور اسلامی بنانے یا میدانِ مناظرہ میں اگر اسلامی ثابت کر دکھانے کا ہمیشہ مطالبہ رہا لیکن وہ اپنے کفریہ الفاظ کو بدلنے پر عمر بھر تیار نہ ہوئے نہ تقریر و تحریر کے میدان میں اسے اسلامی ثابت کر سکے، نہ موصوف کا کوئی حمایتی اس کفریہ عبارت کو ہرگز اسلامی ثابت کر سکتا ہے کیونکہ اس میں کسی اسلامی و ایمانی پہلو کی تادیل کے لیے گنجائش ہی نہیں ہے۔ موجودہ دیوبندی حضرات کو اللہ تعالیٰ راہِ ہدایت و چشم بصیرت عطا فرمائے۔ آمین

اہلسنت کو اپنے بزرگوں سے عقیدت ہے اور ہونی چاہیے۔ دیوبندیوں کی پیرپرستی یہ رشتہ اُن کی ظاہری زندگی میں جس طرح قائم رہتا ہے بعد ازاں بھی اُس میں کوئی فرق نہیں آتا۔ عقیدت مندوں کی جانب سے مزارات پر حاضری اور بزرگوں کی جانب سے نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت تک جاری رہے گا۔ مبتدعین زمانہ کے نزدیک اظہار عقیدت کے جملہ طریقے شرک قرار پاتے ہیں اور اپنی اسی خاندان ساز منطق کے تحت وہابی حضرات کو مسلمانانِ اہلسنت و جماعت مشرک اور پیرپرست نظر آتے ہیں، حالانکہ سنیوں کے نزدیک بزرگانِ دین نہ خدا ہیں نہ خدا کی میں حصہ دار۔ ہاں وہ خدا کے بند ہیں لیکن اُس کے تابع دار اور مقرب بارگاہ ہیں۔ اب ہم قارئین کو دکھاتے ہیں کہ اہلسنت و جماعت کو پیرپرست بتانے والے دیوبندی حضرات خود اپنے پیروں کو کیا سمجھتے ہیں۔ مولوی رشید احمد گنگوہی کی وفات پر اُن کے مرید خلیفہ مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) نے مثنیہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ ہے:

جنید و شبلی و ثمانی ابو مسعود انصاری
رشید ملت و دیں، غوثِ اعظم، قطبِ ربانی

اس شعر میں مولوی محمود الحسن صاحب نے اپنے پیر مولوی رشید احمد گنگوہی کو غوثِ اعظم ہی بتایا ہے۔ مسلمان اگر حضور سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غوثِ اعظم کہتے ہیں تو وہابی حضرات کے نزدیک یہ صریح شرک قرار پاتا ہے کیونکہ اُن حضرات کے نزدیک صرف اللہ رب العزت ہی غوثِ اعظم ہے بلکہ دیوبندیوں کے مولوی غلام اللہ خاں صاحب (اولیٰ پٹنہ) تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے غوثِ اعظم لکھ کر آگے جلّ جلالہ بھی رقم فرماتے ہیں۔ معلوم نہیں اب وہ اپنے گھریلو غوثِ اعظم کو جلّ جلالہ سے یاد کریں گے یا نہیں؟ اگلا مرتبہ ملاحظہ ہو:

وہ تھے صدیق اور فاروق پھر کیسے عجب کیا ہے
شہادت نے تہجد میں قدمبوسی کی گر ٹھانی

یہاں سیدنا صدیق اکبر و فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی بڑھا کر دکھا دیا۔ اسی پر بس نہیں آگے چلیے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کس منصب پر فائز تھے تو جواب دیا گیا ہے : یہ

مسیحائے زماں پہنچا فلک پر، چھوڑ کر سب کو
چھپا چاہ لحد میں وائے قسمت ماہ کنعانیؑ

یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب مسیحائے زماں اور ماہ کنعانی یعنی حضرت یونس علیہ السلام تھے۔ اگر کوئی پوچھے کہ گنگوہی صاحب کیا اعجاز میں عیسیٰ علیہ السلام کے ہی برابر تھے تو اسے جواب دیا جا رہا ہے : یہ

مردوں کو زندہ کیا، زندوں کو مرنے نہ دیا
اس مسیحائی کو دیکھیں ذری ابن مریمؑ

یہاں بتا دیا کہ گنگوہی صاحب کا مرتبہ عیسیٰ علیہ السلام سے اعجاز میں بڑھ کر ہے کیوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو صرف مردے ہی زندہ کر سکتے تھے لیکن گنگوہی صاحب مردوں کو زندہ کر دینے کے ساتھ ہی زندوں کو مرنے نہیں دیا کرتے تھے۔ اسی لیے کہہ دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی اگر حقیقی مسیحائی دیکھنا چاہتے ہیں تو گنگوہی صاحب کی مسیحائی کو آکر دیکھیں۔ جب گنگوہی صاحب کو عیسیٰ علیہ السلام سے بھی بڑھ کر صاحب اعجاز بنا دیا تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کا مرتبہ کون سے نبی کے برابر تھا۔ اس کا یہ جواب دیا ہے : یہ

زباں پر اہل ابہوا کی ہے کیوں اعلیٰ و ہبل شاید
اٹھا عالم سے کوئی بانی اسلام کا تانیؑ

یعنی ہوا پرست لوگ جو بتوں کی بانیں کرنے لگے ہیں تو شاید یہ اسی وجہ سے ہے کہ بانی اسلام یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے ہمارے گنگوہی صاحب دنیا سے اٹھ گئے ہیں۔ علاوہ بریں دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی رشید احمد گنگوہی بعض کمالات میں نذر دعات

سید عوبد عجم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی بڑھ کر تھے۔ مثلاً نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے استمداد کرنا، حاجت روائی چاہنا دیوبندیوں کے نزدیک شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب کو خدا کا شرک ٹھہرا لینے میں اُن کے نزدیک کوئی حرج نہیں کیونکہ وہ ان کے قبلہ حاجات تھے۔ چنانچہ اپنے اس ایٹمی شرک کو یوں شیر مادر سمجھ کر بغیر ڈکار ہضم کیا ہوا ہے :۔

عاج دین و دنیا کے کہاں لے جائیں ہم یارب

گیا وہ قبلہ حاجاتِ روحانی و جسمانیؑ

اس قسم ظریفی کی جھلا کوئی حد ہے کہ خدا سے ہی سوال کیا ہے کہ اب ہم اپنی دین و دنیا کی حاجتیں کس سے پوری کروایا کریں گے کیونکہ ہمارا قبلہ حاجاتِ جسمانی و روحانی جلا گیا ہے؛ اب نہ انھیں مخلوق میں کوئی اور قبلہ حاجات نظر آتا ہے نہ خالق ہی سے ایسی توقع۔ لہذا اسی حیرانی میں چیخ پکار مچائی جا رہی ہے۔ علاوہ بریں فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ان کے نزدیک گنگوہی صاحب کو دوسری فوقیت یہ حاصل تھی کہ :۔

قبولیت اسے کہتے ہیں مقبول ایسے ہوتے ہیں

عبیدِ سود کا ان کے لقب ہے یوسفِ ثانیؑ

یعنی کسی کو عبد النبی، عبد الرسول کہو تو دیوبندی حضرات کے نزدیک شرک ہو گیا۔ سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا عبد ہونا ان کے نزدیک یقینی شرک ہے لیکن گنگوہی صاحب کا عبد ہونا قطعاً شرک نہیں کیونکہ گنگوہی صاحب کے عبیدِ سود یعنی کالے عبد بھی یوسف علیہ السلام کی طرح حسین و جمیل تھے۔ تیسری خصوصیت جو دیوبندی حضرات کے نزدیک گنگوہی صاحب کو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ممتاز کرتی ہے، یہ ہے :۔

خدا اُن کا مرتبی، وہ مرتبی تھے خلافت کے

مرے مولیٰ، مرے ہادی تھے بیشک شیخِ ربّانیؑ

مسلمانوں کا تو یہی عقیدہ ہے کہ اللہ جل شانہ ہی خلّاق کا مرتّی ہے یعنی رب العالمین اُس کی ذات ہے لیکن دیوبندی حضرات بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رب العالمین نہیں ہے بلکہ صرف گنگوہی صاحب کا مرتّی ہے اور جناب گنگوہی صاحب باقی ساری کائنات کے مرتّی ہیں۔
چوتھی خصوصیت یہ بتائی ہے : ۷

پھر جس تھے کعبہ میں بھی پوچھتے گنگوہ کا رستہ
جو رکھتے اپنے سینوں میں تھے ذوق و شوق عرفانیؑ

یعنی دیوبندی حضرات کو کعبہ میں پہنچ کر بھی کوئی سرور نہیں ملا بلکہ وہاں ایسے رہتے ہیں جیسے جیل خانے میں قیدی اور وہاں سے گنگوہ جانے کا راستہ پوچھتے رہتے ہیں۔ اگر گنگوہی صاحب کو سرور کون دیکھا
صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے متماثل سمجھا گیا ہوتا تو گنگوہ کے بجائے مدینہ منورہ کا راستہ پوچھتے۔
پانچویں خصوصیت یہ بتائی ہے : ۷

چھپائے جامہ فانوس کیونکہ شمع روشن کو
تھی اُس نور مجتہم کے کفن میں وہ ہی عسر باقیؑ

دیوبندی حضرات کے نزدیک نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جسمانی لحاظ سے ہرگز نور نہیں ہیں لیکن گنگوہی صاحب نور مجتہم یعنی سراپا نور تھے، جن کی شعاعیں کفن سے باہر بھی نکل رہی تھیں۔ یہاں اگر ایک سیدھے سادے مسلمان کی حیرت کا پیمانہ بھی چھک اٹھا ہے کہ جو باتیں فخر و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے ثابت ماننا ان حضرات کے نزدیک کفر و شرک ہیں وہی باتیں گنگوہی صاحب سے منسوب ہونے پر کس طرح عین ایمان ہو گئیں؟ مسلمانوں کی اس حیرانی کو دور کرنے کی خاطر دیوبندیوں کے شیخ الہند صاحب نے صاف لکھ دیا ہے
تمہاری قربتِ انور کو دے کر طور سے تشبیہ
کہوں ہوں بار بار آری مری دیکھی بھی نادانیؑ

گنگوہی صاحب کی فکر کو طور سے، خود کو موسیٰ علیہ السلام سے اور گنگوہی صاحب کو رب العالمین سے تشبیہ دے کر شیخ الہند صاحب بار بار کہہ رہے ہیں سَبِّ اَرَفِّ اَنْظُرْ لَيْكَ - یعنی اے میرے رب! تو مجھے اپنی ذات دکھانا کہ میں تیرا دیدار کروں۔ معلوم ہوا کہ فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے گنگوہی صاحب کو بایں وجہ فوقیت دی جا رہی تھی کہ مولوی محمود الحسن صاحب انصاف منصب الوہیت پر فائز نہ کیچکے تھے۔ اب ایک دلخراش خواب ملاحظہ ہو:

”حضرت گنگوہی کے بیعت ہونے سے پیشتر حضرت حاجی صاحب نے خواب دیکھا تھا، جس کی تعبیر حضرت گنگوہی کا مرید ہونا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ آپ کی بھادج آپ کے مہانوں کا کھانا پکا رہی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپ کی بھادج سے فرمایا: اُٹھ تو اس قابل نہیں ہے کہ امداد اللہ کے مہانوں کا کھانا پکائے۔ اس کے ہمان علماء ہیں، اس کے مہانوں کا کھانا میں پکاؤں گا۔“

کیا گنگوہی صاحب کے لیے فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس لیے کھانا پکانے تشریف لائے تھے کہ گنگوہی صاحب نے سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے علم کو علمِ شیطان سے کم بتانا تھا اور اُمتی کہلاتے ہوئے اُس سرکار کے خلاف دیوبندی فرقے کے نام سے ایک متصل محاذِ قائم کرنا تھا، دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے گنگوہی پیر کا رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو باورچی اس لیے دکھا رہے ہیں کہ کائنات میں گنگوہی صاحب کے مرتبے کی کوئی اور ہستی نظر ہی نہ آئی۔ یہی مفتی صاحب اب گنگوہیت کا دھماکوں بجاتے ہیں:

”حضرت قدس سرہ کے کمالات اور اوصاف کہاں تک بیان کیے جائیں۔ اس شعر پر آپ کا تذکرہ ختم کرتا ہوں:

حسن یوسف، دم علی، یدِ بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری“

یعنی جو کمالات انفرادی طور پر انبیائے کرام کو ملے تھے اُن سارے کمالات کی جامع سرکار گنگوہیت مآب مولوی رشید احمد صاحب کی ذات ہے۔ اب مولوی محمد یعقوب صاحب کا تلامذہ ملاحظہ فرمائیے:

”جس زمانہ میں ملک کی تاجپوشی کا جلسہ ہوا، اُس زمانہ میں مولانا محمد یعقوب صاحب دلی میں تھے اور اکثر غائب رہا کرتے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت! آپ کہاں غائب رہتے ہیں؟ فرمایا: مجھے حکم ہوا ہے کہ دلی میں جس جس جگہ تمہارا قدم جائے گا اُس جگہ کو آباد کر دیں گے۔ اس لیے شہر اور حوالی شہر میں گشت کیا کرتا ہوں تاکہ ویران مقلات آباد ہو جائیں“۔

اب مولوی رفیع الدین صاحب دیوبندی اور اُن کے بھائیوں کا مقام ملاحظہ ہو۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

”مشہور ہے کہ رات کو اکثر لوگوں نے آپ (شاہ رفیع الدین صاحب دیوبندی) کی قبر سے قرآن شریف پڑھنے کی آواز سنی ہے۔ آپ کے چار بھائی اور تھے: محمد صابر، بلند بخت، مقصود علی، سید احمد۔ تینوں مؤخر الذکر حضرات معرکہ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ ان تینوں حضرات کے بارے میں مشہور ہے کہ مولانا فرید الدین صاحب (اپنے والد) کے انتقال کے وقت اُن کے جنازہ میں شریک تھے اور بعد ازین کے غائب ہو گئے“۔

مصنف تذکرہ مشایخ دیوبند کے اُستاد اور مدرسہ دیوبند کے مدرس کی زبانی مولوی محمود الحسن دیوبندی کے بارے میں یہ عجیب و غریب افسانہ تراشا گیا اور ٹانڈومی صاحب اُس کے مُصدق بن گئے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں:

”جب میں پتھر تھا اور حضرت (مولوی محمود حسن صاحب) کے زنان خانے میں آتا جاتا تھا تو ایک دینی میں نے حضرت کے کمرہ کے کواڑوں کے جھردوں سے

جہاں کر دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت کے جسم کے تمام اعضاء، سر و دھڑ
علیحدہ علیحدہ پڑے ہوئے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر گھبرا گیا اور بھاگ آیا اور باہر آ کر
حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی سے بیان کیا تو مولانا نے فرمایا: خاموش!
کسی سے نہ کہنا، کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔

اب پراہین قاطعہ جیسی رسوائے زمانہ اور ایمان سوز کتاب کے مصنف مولوی خلیل احمد انبٹھوی
(المتوفی ۱۳۷۵ھ / ۱۹۲۶ء) کی شان اُن کے تذکرہ نگار، مولوی عاشق الہی میرٹھی کے
لفظوں میں ملاحظہ ہو:

حضرت (انبٹھوی صاحب) کے کمالات کا بیان کرنا میری طاقت سے باہر ہے
کہ اُن کا ادراک مجھ جیسے ناکارہ کی تو کیا حقیقت، بڑوں کو بھی مشکل تھا۔
اب اُسی ادراک سے باہر کمال کی حقیقت تذکرہ نگار موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:
”ج پنچم میں جس وقت حضرت مسجد الحرام میں طوافِ قدوم کے لیے تشریف لائے
تو احقر مولانا محب الدین صاحب کے پاس دھوکہ اعلیٰ حضرت حاجی کے خلفاء
میں تھے اور صاحب کشف مشہور تھے، بیٹھا تھا مولانا اُس وقت درود شریف
کی کتاب کھولے اپنا ورد پڑھ رہے تھے کہ دفعہ میری طرف مخاطب ہو کر فرمانے
لگے، اس وقت حرم میں کون آ گیا کہ دفعہ سارا حرم انوار سے بھر گیا میں خاموش
رہا کہ اتنے میں حضرات طواف سے فارغ ہو کر باب الصفا کی طرف سعی کے لیے
چلے تو مولانا محب الدین صاحب کے پاس کو آئے کہ وہی جگہ مولانا کی نشست
کی تختی۔ مولانا کھڑے ہو گئے اور فرمایا: میں بھی تو کوں آج حرم میں
کون آ گیا۔ یہ کہہ کر مصافحہ و معانقہ ہوا اور حضرت سعی کے لیے آگے بڑھ گئے۔
مولانا محب الدین صاحب اپنی جگہ بیٹھ گئے اور مجھ سے فرمایا: میاں ظفر!

علامہ الرجن نہٹھوی، مفتی، تذکرہ مشایخ دیوبند، ص ۲۳۲

علامہ عاشق الہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الخلیل، ص ۳۵۸

مولانا خلیل احمد تونوری نور ہیں۔ ان میں نور کے سوا کچھ نہیں۔ پھر فرمایا کہ میں نے مولانا رشید احمد صاحب کو نہیں دیکھا اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ وہ قطب الارشاد تھے مگر میں نے مولانا کے خلفاء کو دیکھ کر سمجھ لیا کہ واقعی وہ قطب الارشاد تھے جو ایسے ایسے کامل بنا گئے۔^۱

جس شخص نے حبیب پروردگار اور عالم علوم اولین و آخرین کا شیطان سے کم علم بتایا اور جس کے کفر و ارتداد پر علمائے عرب و عجم کا اتفاق ہے، اُسے کامل بتانا، نور ہی نور ٹھہرانا، حرم کو اُس سرپائے ظلمت سے چکانا اور مولوی رشید احمد گنگوہی جیسے اللہ و رسول کے کُٹے دشمن کو قطب الارشاد قرار دینا معلوم نہیں کیسی دینداری اور کہاں کی دیانت داری ہے؟ اب گنگوہی صاحب کے دوسرے خلیفہ مولوی حسین علی پھر انوی کا ایک واقعہ خود اُن کی زبانی سنئے انھوں نے لکھا ہے:

”میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مجھے بصورتِ معانقہ دوزخ کے پلصراط پر لے گئے۔۔۔۔۔ و رأیت انہ یسقط فامسکتہ و اعتصمتہ عن السقوط اور میں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا کہ آپ گر رہے ہیں تو میں نے آپ کو ختم کر گرنے سے بچایا۔“^۲

مولوی محمد قاسم نانوتوی صاحب بھی دیوبندیوں کے نزدیک چھوٹے موٹے ولی نہیں۔ اُن کی جانب بھی بے شمار کرامتیں منسوب کی جاتی ہیں۔ موصوف کی ایک عظیم النظیر کرامت ملاحظہ ہو:

”مولانا (نانوتوی صاحب) بچوں سے ہنستے بولتے اور جلال الدین صاحبزادہ محمد یعقوب سے جو اُس وقت بچے تھے، بڑی ہنسی کیا کرتے تھے۔ کبھی ٹوپی اُتارتے، کبھی مکر بند کھولتے تھے۔“^۳

^۱ عاشق الہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الخلیل، ص ۲۵۹، حسین علی، مولوی: بشارات بلقہ الحیران، ص ۸

^۲ اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایات اولیاء، ص ۳۱۷

دیوبندی حضرات کے نزدیک نانوتوی صاحب کا مقام انسانیت سے برتر تھا۔ چنانچہ خود لکھا ہے:

مولانا رفیع الدین صاحب فرماتے تھے کہ میں پچیس برس حضرت مولانا نانوتوی کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں اور کبھی بلا وضو نہیں گیا۔ میں نے انسانیت سے بالا درجہ اُن کا دیکھا ہے۔ وہ شخص ایک فرشتہ مقرب تھا، جو انسانوں میں ظاہر کیا گیا، ۱

کیا دیوبندی حضرات دوسروں کو بھی یہ وجہ بتا سکتے ہیں کہ بارگاہِ نانوتوی صاحب میں یہ متواتر پچیس سال تک با وضو حاضر ہونے کی پابندی اُن کی شریعت کے مطابق کیسی ہے؟ نیز یہ بھی کہ فرشتے کا مقام کیا انسانیت سے بالاتر ہے؟ افسوس!

۲ راہزن خضر راہ کی قبا چھین کر
رہسنا بن گئے دیکھتے دیکھتے

اب دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر یعنی مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب کا وہ منصب ملاحظہ فرمائیے جس پر وہ دیوبندی حضرات کے نزدیک فائز ہیں جبکہ موصوف کا مقصد حیات اور ن کے کارناموں کا مرکزی نقطہ صرف گاندھی جیسے مشرک کی پیروی اور اُس کے ارشادات کو آنِ وحیث کے مطابق قرار دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ چنانچہ اُن کے بارے میں ڈنکے کی چوٹ اعلان کیا گیا تھا:

”ایک خاص نعمت جو اللہ تعالیٰ نے آپ (مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب) کو عطا فرمائی تھی، وہ تھی رؤیا، اس پیکرِ عصمت کی زندگی نے سیدنا یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام سے جہاں تقدس واستقامت علی الحق، باطل کے مقابلے میں سینہ تان کے السجن احب الی متابید عونہ کا لغو بلند کرنے کا ترکہ پایا تھا، وہیں تاویل احادیث کے تمام شعبے بالخصوص تعبیر رؤیا

کا کمال بھی حاصل فرمایا تھا، ۱

حضرت یوسف علیہ السلام جیسے کمالات ایک گاندھی جیسے مشرک و بت پرست کے پیروکار میں ثابت کرنے کی جرأت وہ حضرات تو کر سکتے ہیں جن کے نزدیک کفر و ایمان میں کوئی فرق نہ ہو یا آخرت کی باز پرس جن کے نزدیک ایک فرضی قصہ کہانی سے زیادہ اور کوئی حیثیت نہ رکھتی ہو اور اس پر ستم ظریفی یہ گاندھی موصوف کو معصوم قرار دیتے ہوئے اُن کے لیے پیکر عصمت کا لفظ لکھ دیا حالانکہ عصمت گروہ انبیاء و ملائکہ کا خاصہ ہے۔ اب قارئین کرام ذرا دیوبندی حضرات کی ملامت پرستی کا ایک المناک ڈرامہ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام گویا کسی شہر میں جامع مسجد کے قریب ایک حجرہ میں تشریف فرما ہیں اور متصل ایک دوسرے کمرے میں کتب خانہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کتب خانے سے ایک جلد کتاب اٹھائی، جس میں دو کتابیں تھیں، ایک کتاب کے ساتھ دوسری کتاب تھی، وہ خطبات جمعہ کا مجموعہ تھا۔ اس مجموعہ خطب میں وہ خطبہ نظر انور سے گزرا جو مولانا حسین احمد مدنی خطبہ جمعہ پڑھا کرتے ہیں۔ جامع مسجد میں بوجہ مصلیوں کا مجمع بڑا ہے مصلیوں نے فقیر سے فوائش کی کہ تم حضرت خلیل اللہ سے سفارش کرو کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام مولانا مدنی کو جمعہ پڑھانے کا ارشاد فرمائیں۔ فقیر نے جرأت کر کے عرض کیا تو حضرت خلیل علیہ السلام نے مولانا مدنی کو جمعہ پڑھانے کا حکم فرمایا۔ مولانا مدنی نے خطبہ پڑھا اور نماز جمعہ پڑھائی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مولانا مدنی کی اقتداء میں نماز جمعہ ادا فرمائی۔ فقیر بھی مقبول میں شامل تھا۔ فالحمد لله علی ذالک حمداً کثیراً کثیراً۔

حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام ضعیف العمر تھے۔ ریش مبارک سفید تھی، ۲

یہ بات تو اپنے عرفانی ذوق، ایمانی حرارت اور عقل سلیم سے تعلق رکھتی ہے کہ ایک نبی اور وہ بھی خلیل حبیبی جلیل القدر ہستی کی اقتداء کے لیے کس کے دل میں تمنا نہیں مچلتی ہیں اور خلیل اللہ کو نظر انداز کر کے اپنے ملاؤں کو امام بنانے بلکہ ایک جلیل القدر پیغمبر کو اُن کی اقتداء پر مجبور کرنے کی

جارت کون لوگ کیا کرتے ہیں؟ کیا انبیائے کرام سے اس طرح اپنے علماء کو بڑھا کر دکھانا انھیں
 رَبَّانَا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ بنانے کی ایک کڑی تو نہیں ہے؟ خواب تو گھڑ لیا، ٹانڈوی صاحب کو
 عرض پہنچا کر تو دکھا دیا لیکن اتنا خیال نہ آیا کہ اس طرح تمام نمازیوں کے ساتھ گاندھوی صاحب
 کو بھی انبیائے کرام کا گستاخ مان لیا کہ لوگوں کی یہ غلط اور غیر اسلامی خواہش دیکھ کر بھی انھوں نے
 یہیں فرمایا کہ خلیل خدا کا مجھے امام بنا کر کیوں اپنے ساتھ میرے بھی دین و ایمان کا بیڑہ غرق کرتے ہو؟
 یہی تو اتنا ہی کہہ دینے کہ ہماری سعادت اسی میں ہے کہ ہم انبیائے کرام کی اقتداء کریں۔ لیکن:
 ۷۔ وہ منزل میں سب گم ہیں مگر افسوس تو یہ ہے
 امیر کارواں بھی ہیں انھیں گم کردہ راہوں میں

اب مولوی حسین احمد گاندھوی صاحب کا یہ منصب و مقام بھی تو ملاحظہ فرمائیے:

اب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ (مولوی حسین احمد صاحب) عالم نور میں رہتے ہیں۔ اُن
 کی آنکھوں میں بھی نور ہے، اُن کے داہنے نور ہے، اُن کے بائیں نور ہے،
 اُن کے چاروں طرف نور ہی نور ہے، وہ خود نور ہو گئے ہیں۔ ۱۷

جب یہی الفاظ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کی زبان سے سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ
 علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوتے ہیں تو دیوبندی حضرات کفر و شرک کی توپوں سے دھواں دار
 گولہ باری شروع کر دیتے ہیں اور اس عقیدے کو قرآن و حدیث کی تعلیمات سے سراسر
 بغاوت قرار دیتے ہیں لیکن وہی عقیدہ اگر سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بجائے
 گاندھوی صاحب سے متعلق کر دیا جائے تو عین ایمان ہو جاتا ہے۔ اب نہ کفر و شرک رہا،
 نہ قرآن و حدیث کی تعلیمات سے بغاوت رہی۔ اس ستم ظریفی کا جواب کیا؟ اسلام کو اس
 طرح بازیچہ اطفال بنانے والوں کو اللہ تعالیٰ ہی راہ ہدایت دکھائے۔ آمین

جامعہ حقانیہ اکوڑہ خٹک کے مدرس مولوی سمیع الحق صاحب نے ٹانڈوی صاحب کے
 بارے میں اُن کے گاندھوی منصب کے پیش نظر اپنے تاثرات یوں قلمبند فرمائے ہیں:
 ”میں کہا کرتا ہوں، حضرت مدنی کی نظیر نہیں ہے۔ اُن جیسا جامع الصفات

تمام عالم اسلام میں نہیں تھا۔ ۱

نجم المدارس کلاچی ضلع ڈیرہ اسماعیل خاں کے منتقم مولوی عبد الکریم دیوبندی نے ٹانڈوی صاحب کے بارے میں اسی بات کو یوں اپنا مشاہدہ بنا کر سپرد قلم کیا ہوا ہے:

”میں بارہا مکہ معظمہ گیا ہوں، اہل اللہ کے جھنڈے کے جھنڈے ہوتے ہیں، مگر میں نے حضرت مدنی کے مرتبہ کا کوئی ولی نہیں دیکھا۔“ ۲

جس کو پچے سے روحانیت و ولایت کا گزر بھی نہیں ہو سکتا، وہاں کے رہنے والوں کو نہ صرف زبان زوری سے ولی بتایا جاتا ہے بلکہ اولیاء اللہ سے بڑھا چڑھا کر دکھاتے ہیں۔ کاش ایسے قلم جو حضرات کبھی اتنا ہی غور فرمایا کرتے کہ اللہ و رسول (جل جلالہ) صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دشمنوں اور گاندھی کے پیاریوں کا بھلا ولایت سے رشتہ ناظم کیا؟ ابھی مولوی سمیع الحق صاحب کا ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے:

”حضرت رائے پوری مظلہ (مولوی عبدالقادر صاحب) سے کہا گیا کہ حضرت مدنی کانگرس میں اکیلے ہیں۔ فرمایا ہم اُس اکیلے کے ساتھ ہیں۔ میں تیرہ مرتبہ حجاز گیا۔ حرمین الشریفین میں پوری دنیا کے اولیاء اللہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے کہیں بھی حضرت مدنی کی نظیر نہیں دیکھی۔“ ۳

اب ٹانڈوی صاحب کے بارے میں دیوبندی حضرات کا یہ فیصلہ بھی مد نظر رکھا جائے:

”مگر اب آہ میرے سچا! دنیا میں تو اس وقت قیامت برپا ہے۔ اُمتِ مروحہ کا تو ہی ایک سہارا تھا سو قیامت میں ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔“ ۴

اگر اولیائے کرام بلکہ خود سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اپنا سہارا کہا جائے تو دیوبندی حضرات کے نزدیک یہ کفر و شرک ہے، قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ فوراً تقویۃ الایمان کے ساختہ قوانین سنانے شروع کر دیے جاتے ہیں کہ کوئی کسی کا دیکل!

۱۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، ۳۱ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۷۔ ۲۔ ایضاً، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۔

۳۔ ایضاً، ۳۱ اپریل ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۔ ۴۔ الجمعۃ، شیخ الاسلام نمبر، ص ۹۷۔

سفاشی نہیں ہے۔ کوئی نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں رکھتا۔ نہ بالفعل اُن کو کسی کام میں دخل ہے نہ اللہ کے دینے سے۔ جو اُنھیں خدا کے دینے سے بھی اختیار مانے وہ اور ابو جہل شرک میں برابر ہیں۔ لیکن اختیارات کی نسبت اگر دیوبندی حضرات کے دشمنوں یعنی انبیائے کرام و اولیائے عظام کے بجائے دیوبندیوں کے اپنے مولویوں ملاؤں کی طرف ہو جائے تو چاہے ہزاروں گنا زیادہ اختیار ماننے چلے جائیں، اب نہ کفر و شرک، نہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے خلاف، بلکہ وہی عقیدہ اب عین دین و ایمان ہو جائے گا۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہتا ہے اور اس یقین کو پوری تقویت نہیں پہنچتی کہ دہا بیت حقیقت میں انبیائے کرام اور اولیائے عظام سے بغاوت کا نام ہے اور وہابی وہی ہے جس کے دل میں انبیاء و اولیاء کی عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوگی اگرچہ بظاہر کتنی ہی عقیدت کا اظہار کریں یا منافقانہ طور پر عشق رسول کا بلند بانگ دعویٰ بھی کرتے پھریں۔ اس زندہ حقیقت کا اگر خود معائنہ کرنا ہو تو بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ سوال کیجیے کہ خرد و عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے، ظاہر ہے کہ دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والا مفتی اعظم و قطب الارشاد کہلانے والے سے لے کر ایک جاہل مطلق تک ہر وہابی یہی جواب دے گا کہ وہ ہماری ہی طرح کے بشر تھے۔ اس سوال کا جواب دینے میں اُنھیں قطعاً کوئی دقت نہیں اٹھانی پڑے گی، نہ کوئی جھجک یا ندامت محسوس ہوگی، نہ اس میں کسی قسم کی سچیدگی یا الجھن کا سامنا کرنا پڑے گا لیکن حبیب کردگار کی جگہ اگر بات اُن لوگوں کی آجائے جن کی وہ غیر محسوس طریقے پر رات دن پرستش میں مصروف رہتے ہیں، جن کی بارگاہوں میں عقیدت کے سجدے لٹاتے رہتے ہیں، جن کی بندگی سے وہ کسی وقت تائب ہونے کے لیے تیار نہیں یعنی اُن کے مولویوں کے بارے میں پوچھا جائے تو یوں جھول بھلیاں کی سیر کرنے لگ جاتے ہیں :

”آپ (ٹانڈوی صاحب) کے فضائل علمیہ اور کمالات باطنیہ کی صحیح اطلاع یا تو خداوند قدوس ہی کو ہو سکتی ہے (یعنی صرف امکان تسلیم کیا ہے) یا اُن اولیائے کرام اور علمائے ربانین کو ہو سکتی ہے جن کو مبداء فیاض نے چشم بصیرت عطا فرمائی ہے، ہم جیسے کو چشم آپ کی ذات قدسی صفات کو

کیا پہچان سکتے ہیں؟ لے

دیوبندیوں سے ٹانڈوی صاحب کا منصب و مقام کیوں نہیں پہچانا جاتا تھا؟ آخر گاندھی کی اندھی میں تنکے کی طرح اڑنے والے اور کانگریس کی در یوزہ گری کرنے والے مولوی صاحب کا مرتبہ جاننے میں کون سا پہاڑ حائل تھا؟ بات دراصل یہ ہے کہ دیوبندی حضرات اپنے کھدر پوش ٹانڈوی صاحب کو منصب الوہیت پر فائز کر چکے تھے، جیسا کہ خود لکھا ہے:

”تم نے کبھی خدا کو بھی اپنے گلی کوچوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے؟ کبھی خدا کو بھی اُس کے عرشِ عظمت و جلال کے نیچے فانی انسانوں سے فروتنی کرتے دیکھا ہے؟ تم کبھی تصور بھی کر سکتے کہ رب العالمین اپنی کبریائیوں پر پردہ ڈال کے تمہارے گھروں میں بھی آکر رہے گا؟“ لے

اسی کبریائی کے باعث ٹانڈوی صاحب کو بڑے ذوق و شوق سے عَلَیْمُ بِلَدَاتِ الصُّدُورِ بنا کر نشہیر کی ہے۔ مسلمان اگر دیوار کے پرے والی چیز سے سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو خبر دار مانیں تو مشرک اور دیوبندی حضرات اپنے کھدر پوش کبریا یعنی عالی جناب ٹانڈوی صاحب کو دلوں کے خطرات سے بھی واقف بتائیں تو عین ایمان اور ٹانڈوی صاحب کے کامل ہونے کی دلیل۔ چنانچہ جامعہ مدنیہ لاہور کے امیر حامد مہیا صاحب جو ٹانڈوی صاحب کے خلیفہ مجاز بھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ قیامِ پاکستان کے بعد مولوی احمد علی لاہوری صاحب نے ٹانڈوی صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا۔ ادھر سے جو جواب آیا اُسے لاہوری صاحب اپنے لیے ذریعہ نجات قرار دے کر محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ وجہ مَیںیہ:

”حضرت شیخ التفسیر (مولوی احمد علی لاہوری) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے خط میں ایسا تاثر ظاہر نہیں کیا تھا لیکن حضرت مدنی قدس سرہ کامل تھے اس لیے میری قلبی کیفیت اُن پر منعکس ہوئی کہ میں نے اگرچہ الفاظ ایسے نہیں

کھے تھے لیکن کھتے وقت مجھ پر رقت کا عالم تھا۔ حضرت مدنی نے جواب میں میری قلبی کیفیت کا خیال فرمایا اور یہی شیخ کا کمال ہے۔ ۱

مجھے کہنے دیجئے کہ قلوب پر مطلع ہونا اگر کامل ہونے کی دلیل ہے تو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عیبت پر دیوبندی حضرات پہو بٹھانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں؟ جتنا علم اپنے ٹانڈوی صاحب کے لیے تسلیم و شتر کیا ہے کوئی دیوبندی مرتے دم تک بھی اتنا علم اس ہستی کے لیے تسلیم نہیں کرتا جو اولین و آخرین کے علوم کی جامع ہے۔ کیا یہ حبیب پروردگار کو ناقص ٹھہرانے، فضل و کمال سے خالی بنانے اور غلامی کے پردے میں دل کی لگی بھجانے کا پراسرار کاروبار نہیں ہے؟ ورنہ ٹانڈوی صاحب تو دلوں پر بھی مطلع اور سید الانبیاء، دیوار کے پرے والی چیزوں سے ناواقف۔ کیا اس فیصلے میں محبت اور نفرت کے جذبات کی کارفرمائی نہیں ہے؟ نہ ان حضرات کے پاس ایک بھی دلیل کہ ٹانڈوی صاحب قلوب پر مطلع ہیں نہ ایسا کوئی ثبوت کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پس دیوار کی چیزوں سے ناواقف تھے۔ بات بس اتنی ہے کہ ٹانڈوی صاحب سے عقیدت ہے تو بغیر دلیل بھی عَلَیْہِمْ اَیَّدَاتِ الصَّدُورِ مان لیے گئے اور سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے عداوت ہے تو دنیا و مافیہا سے واقف ہونے کے باوجود پس دیوار سے ناواقف ٹھہرا دیے گئے۔ قلب کی اس بیماری کا علاج سوائے اللہ رب العزت کے اور کسی کے بس نہیں۔ تو ہُتَبِ اسی مرض کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو دین و ایمان کی اس ٹی۔ بی سے محفوظ و مامون رکھے۔ آمین۔ ٹانڈوی صاحب کی شان میں کہے گئے اس شعر کے تیور بھی ذرا تار مین کر ام بغور ملاحظہ فرمائیں : ۲

آج اُس مشفق، مربی، شیخِ کامل کا ہے ساتھ

جس کی نظروں سے گداؤں کو شہنشاہی ملے

دیوبندی حضرات کے نزدیک فخرِ دو عالم، سیدِ عرب و عجم تک تو کسی کو نفع نقصان پہنچا نہیں

سکتے تھے بلکہ اپنی صاحبزادی کے کام آنے تک سے مجبور و معذور تھے لیکن ٹانڈوی صاحب کو یہ کمال ان کے نزدیک ضرور حاصل تھا کہ یہ پاک جھپکنے میں خاک نشینوں کو تحت نشین اور بکارت کو بادشاہ بنادیا کرتے تھے۔ کیا یہ ایک شرمناک جسارت اور دیانت و انصاف کا سر بازار خون نہیں کیا جا رہا ہے؟ اب مولوی حسین احمد گاندھوی کے عاشق زار اور لاہور میں دیوبندیت کے سابق علمبردار مولوی احمد علی لاہوری (المتوفی ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء) کے بارے میں مولوی سعید احمد جالندھری لکھتے ہیں:

”میں اپنے علم و ایقان اور مطالعہ کی کسوٹی پر جب کبھی حضرت شیخ التفسیر علیہ الرحمۃ کو کس کر دیکھتا ہوں، بے ساختہ زبان سے یہ کلمہ ادا ہو جاتا ہے،
حضرت مولانا احمد علی یقیناً اس دور کے حسن بصری ہیں۔“

نوشہرہ چھاؤنی کے جناب احمد عبدالرحمن صدیقی نے اپنے پیر مولوی احمد علی لاہوری کو صدیق اکبر کے مقام پر فائز بتاتے ہوئے تصریحاً لکھا اور دیوبندی حضرات نے اُسے یوں شہر کیا ہے:

”۵ دسمبر، ۱۹۵۵ء سوموار کے دن بیعت کی اور واپس نوشہرہ گیا تو چند ایام کے بعد خواب میں دیکھا کہ ایک جگہ ہے اور لوگ بتلا رہے ہیں، یہ حضرت صدیق اکبر اور یلقیہ صحابہ کے مکانات ہیں۔ حضرت صدیق اکبر کے مکانات کے دروازے سبز تھے۔ میں نے دستک دی۔ اندر سے ایک بچہ نکلا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ حضرت صدیق اکبر کہاں ہیں؟ تو اُس نے سامنے چوہارے کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سامنے درس قرآن دے رہے ہیں۔ میں نے جب دیکھا تو وہ حضرت لاہوری تھے۔ اس کے بعد میں جاگ اُٹھا اور اس معتمہ کو نہ سمجھ سکا۔ تب سمجھ میں آیا جب حضرت کے انتقال پر علامہ انور صابری صاحب ہندوستان سے بسلسلہ تعزیت تشریف لائے تو اُنھوں نے کہا کہ حضرت لاہوری تمام صدیق

پر فائز تھے۔ تب مجھے اپنے خواب کی تعبیر معلوم ہوئی۔ اے

دیوبندی حضرات جب اپنے مولویوں کے لیے کوئی مقام ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اُس کے لیے عموماً خواب گھڑتے اور گھڑے گھڑائے خوابوں کے سہارے اپنا خیالی شیش محل تعمیر کر لیا کرتے ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اسی باب کے اندر ہم دیوبندی حضرات کے ایسے خوابوں اور ان کے متضاد فتروں اور متضاد عقاید و بیانات کو دو مستقل عنوانات کے تحت ضبط تحریر میں لاتے لیکن ان دونوں عنوانات کی وسعت کے تحت نجواف طوالت یہاں اُنھیں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اقرار ارادہ ہے کہ جلد از جلد ان عنوانات پر مستقل کتابیں پیش کی جائیں گی، انشاء اللہ تعالیٰ۔ ہاں تو ذکر ہے مولوی احمد علی لاہوری کا۔ مولوی مناظر حسین نظر رکھتے ہیں کہ ختم نبوت کی تحریک کے سلسلے میں جب احمد علی صاحب اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی ملتان جیل میں تھے تو قاضی صاحب نے مولوی احمد علی صاحب لاہوری کو کس رنگ رُوپ میں دیکھا یہ مولوی مناظر صاحب کے قلم سے پوچھیے؛

”قاضی صاحب کہتے ہیں کہ میں اُن (لاہوری صاحب) کی کوٹھری کے پاس

سے گزرتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اللہ کا نور، اللہ کی بارگاہ میں سرسبز ہے۔“

کیا اب بھی اس حقیقت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہے کہ وہابیت اصل میں انبیاء کرام و اولیاء عظام سے بغض و عناد ہی کا نام ہے۔ اگر کائناتِ ارضی و سماوی کی سب سے ممتاز ہستی اور بعد از خدا بزرگ توئی کے منصب پر فائز ہونے والے محبوب پروردگار کے لینے اللہ کا نور کیسے تو وہابیوں کا مفتی اعظم سے جاہل مطلق تک یہ پکا یقین رکھتا ہے کہ ایسا کہنے والے نے کفر کیا، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدائے وحدۃ لا شریک کا شریک ٹھہرا دیا۔ لیکن اس بات پر کفر و شرک کا فتویٰ جڑنے والے قلم کی سیاہی ابھی خشک نہیں ہونے پاتی کہ اپنے مولویوں اور ملاؤں کے لیے اللہ کا نور کھ دیا جاتا ہے۔ آخر یہ دھاندلی ایک روز رنگ لائے گی۔ اِنَّ مَوْعِدَکُمْ الصُّبْحُ ط اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ۔

ملہ خدام الدین، ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء، ص ۳۶، ۴۶

ملہ خدام الدین، ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء، ص ۱۸

دیوبندی حضرات کے نزدیک مولوی عبدالقادر رائے پوری (المتوفی ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء) بڑے ولی کامل اور صاحب کشف و کرامت بزرگ ہو گزرے ہیں۔ موصوف کے خلیفہ مجاز مولوی جمیل احمد میواتی نے اپنے پیر کے عَلَیْہِ السَّلَام بِذَاتِ الصَّدُورِ ہونے کے بارے میں تحریر کیا ہے:

”شام کا وقت تھا۔ مہمان چونکہ ابھی تھوڑے ہی تھے لہذا بڑے کمرے میں حضرت اقدس کے ساتھ ہی کھانا کھانے کی سعادت ملی۔ درمیان میں حضرت اقدس نیکہ سے ٹیک لگائے چار زانو بیٹھے ہوئے کھانا نوش فرما رہے تھے۔ دائیں بائیں دو قطاروں میں مہمان بیٹھے ہوئے تھے۔ بائیں قطار کے سب سے آخر میں، میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت کو چار زانوں بیٹھے ہوئے دیکھ کر میرے دل میں خیال آیا کہ بھائی! ہم نے تو سنا تھا کہ یہ بہت بڑے بزرگ ہیں، مگر کھانا تو ان تین طریقوں کے خلاف کھا رہے ہیں جو ہم کو جماعت میں بتائے گئے ہیں۔ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ، ساری دنیا جن کے کمالات بزرگی کی قائل ہے اور اُن کا دوا مانتی ہے اور جن کی کرامتوں میں سے سب سے بڑی کرامت یہی سمجھی جاتی ہے کہ ساری عمر حضرت نے اپنی کسی حرکت و سکون سے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ مجھ میں بھی کوئی کمال ہے، وہیں سے بیٹھے بیٹھے میرے دل میں سے گزرنے والے خطرہ کو اپنے کشفِ عالیہ کے ذریعے سے معلوم کرتے ہوئے میری اصلاح کی غرض سے فرمایا: بھائی! جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے کہ ویسے ہی کھاؤں لیکن میں بوڑھا ہوں اور بیماری کے سبب معذور بھی ہو چکا ہوں“ لے

جب بات انبیائے کرام اور اولیائے عظام کی ہو تو وہابی حضرات کا ہر قلم دین و ایمان کے سینے پر نشتر زنی کا کام کرتا چلا جاتا ہے لیکن جب اُن میں سے کسی قلم کا رُخ اپنے مُلاؤں کی

بانہ ہوا، تو ابھی ابھی جب باتوں کو کفر و شرک قرار دیا تھا وہ عین ایمان اور قرآن و حدیث کی تعلیم کے بالکل مطابق قرار پا جائیں گی۔ باطل کا ہمیشہ سے یہی خاصہ رہا ہے اور دیوبندی حضرات کے ایسے دو غلطیوں کے پیش نظر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے: **ع**
اللہ رے خود ساختہ قانون کا نیرنگ

حدیث کی اصطلاح میں جسے احسان کہتے ہیں، اُسی کا نام علمائے دیوبند کا **تصوّف** تصوّف ہے۔ غیر مقلد اور مودودی نما و ہابیوں کے نزدیک تصوّف کا سارا شعبہ ہی بدعت اور شجر ممنوعہ ہے جبکہ دیوبندی حضرات اس کے قائل ہی نہیں بلکہ اپنی فرضی پیری مریدی کا جال بچھا کر عوام الناس کو اپنے دامِ تزویر میں پھنساتے رہتے ہیں۔ گوشۂ عنوان کے تحت قارئینِ کرام نے ملاحظہ فرمایا ہو گا کہ دیوبندی حضرات نے شاید ہی اپنے کسی مولوی کو چھوڑا ہو جسے منصبِ الوہیت پر فائز نہ کر سکے ہوں ورنہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے فضائل و کمالات میں بڑھ چڑھ کر دکھانا تو ان حضرات کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعے سے ایک بے خبر آدمی کو یہی محسوس ہو گا کہ دنیا میں اگر کہیں صاحبِ کمال پیدا ہوئے تو وہ علمائے دیوبند ہیں جبکہ اہل نظر پر واضح ہے کہ حقیقت اس کے سراسر برعکس ہے۔ یہ بزرگی کے دعوے، یہ کرامتوں کے چرچے، یہ کشف و الہام، صیغے محض دنیادی کاروبار کو چمکانے اور خود کو اہلسنت و جماعت باور کروانے کی خاطر اختیار کر رکھے ہیں۔ آئیے دیوبندی حضرات نے جو تصوّف و روحانیت کا فلک بس شیش محل تعمیر کیا ہوا ہے، اُس کے اندر تو جھانک کر دیکھیں۔ چنانچہ حافظ ضامن صاحب کے بارے میں مولوی عاشق الہی میرٹھی نے بروایت مولوی رشید احمد گنگوہی صاحب لکھا ہے:

”حضرت حافظ صاحب کے مزاج اور خوش مزاجی کے بہت قصبے بیان فرمایا کرتے تھے۔ ایک بار فرمایا: حافظ صاحب کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک بار ندی پر شکار کھیل رہے تھے، کسی نے کہا: حضرت! ہمیں۔ آپ نے فرمایا: اب کے ماروں تیری“۔

یہ واقعہ حکایاتِ اولیاء مرتبہ مولوی اشرف علی تھانوی، مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۲۴ پر بھی درج ہے۔
 اب مولوی رشید احمد گنگوہی کا ایک خواب مولوی عاشق الہی میسر بھی کی زبانی سنئے،
 ”آپ (گنگوہی صاحب) ایک مرتبہ خواب بیان فرمانے لگے کہ مولوی محمد قاسم
 کو میں نے دیکھا کہ دُلسن بنے ہوئے ہیں اور میرا نکاح اُن کے ساتھ ہوا۔
 پھر خود ہی تعبیر فرمائی کہ آخر اُن کے بچوں کی کفالت کرتا ہی ہوں۔“
 اب دیکھنا یہ ہے کہ جو خواب مولوی محمد قاسم نانوتوی کی وفات کے بعد دیکھا گیا کیا وہ نانوتوی
 صاحب کی زندگی میں کبھی اپنے اصلی رنگ رُوپ میں بھی دیکھا جاتا تھا یا نہیں؟ اس کا
 جواب ملاحظہ ہو:

حضرت والد ماجد مولانا حافظ محمد احمد صاحب و عم محترم مولانا حبیب الرحمن صاحب
 رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ ایک دفعہ گنگوہی خانقاہ میں مُجمع تھا۔ حضرت
 گنگوہی اور حضرت نانوتوی کے مرید و شاگرد سب جمع تھے اور یہ دونوں حضرات
 بھی وہیں مُجمع میں تشریف فرما تھے کہ حضرت گنگوہی نے حضرت نانوتوی سے
 محبتِ آمیز لہجہ میں فرمایا کہ یہاں ذرا لیٹ جاؤ۔ حضرت نانوتوی کچھ شرما سے
 گئے مگر حضرت نے پھر فرمایا تو بہت ادب کے ساتھ چپٹ لیٹ گئے۔ حضرت
 (گنگوہی صاحب) بھی اُسی چارپائی پر لیٹ گئے اور مولانا کی طرف کو کر دٹ
 لے کر اپنا ہاتھ اُن کے سینے پر رکھ دیا جیسے کوئی عاشقِ صادق اپنے قلب کو
 تسکین دیا کرتا ہے۔ مولانا ہر چند فرماتے ہیں کہ میاں کیا کر رہے ہو، یہ لوگ
 کیا کہیں گے؟ حضرت نے فرمایا: لوگ کہیں گے کہنے دو۔“

دیوبندیوں کے نزدیک مولوی محمد قاسم نانوتوی بہت بڑے بزرگ اور حجتہ الاسلام تھے۔
 موصوف کے بزرگانہ ارشادات کی ایک جھلک دیوبندی حضرات ہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

۱۔ تذکرۃ الرشید، حصہ اول، ص ۲۴۵

۲۔ اشرف علی تھانوی، مولوی، حکایاتِ اولیاء، ص ۳۳۹

والد صاحب نے فرمایا کہ ایک دفعہ چھٹنے کی مسجد میں مولانا فیض الحسن صاحب استنجے کے لیے لوٹا تلاش کر رہے تھے اور اتفاق سے سب لوٹوں کی ٹوئیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ فرمانے لگے کہ تو یہ، سارے لوٹے مختون ہی ہیں۔ حضرت (نانوتوی صاحب) نے ہنس کر فرمایا، پھر آپ کو تو بڑا استنجا نہیں کرنا ہے (گویا مختون سے کیا ڈر ہے)۔ لہ

مولوی اشرف علی تھانوی دیوبندی حضرات کے نزدیک بہت بڑے بزرگ، بلکہ مجدد بلکہ جامع المجتہدین تھے۔ موصوف نے اپنے بچپن کے واقعات بیان کرتے ہوئے ایک مرتبہ مریدوں کو بتایا:

”ایک روز ایسا ہوا کہ بھائی پیشاب کر رہے تھے، میں نے اُن کے سر پر پیشاب کرنا شروع کر دیا“۔ لہ

اب حکیم الامت صاحب کی مہمان نوازی کا ایک بے نظیر واقعہ ملاحظہ فرمایا جائے :

ایک صاحب تھے سبکی کے، ہماری سوتیلی والدہ کے بھائی، بہت ہی نیک اور سادہ تھے۔ والد صاحب نے اُن کو ٹھیکے کے کام پر رکھ چھوڑا تھا۔ ایک مرتبہ کسٹریٹ سے گرمی میں جھوکے پیا سے گھر آئے اور کھانا نکال کر کھانے میں مشغول ہوئے۔ گھر کے سامنے بازار ہے۔ میں نے سڑک پر سے ایک سگتے کا پلا چھوٹا سا پکڑ کر، گھر لاکر، اُن کی دال کی رکابی میں رکھ دیا۔ بیچارے روٹی چھوڑ کر کھڑے ہو گئے۔“۔ لہ

موصوف گھر میں اور کس قسم کی کرامتیں دکھایا کرتے تھے۔ خود اُن کی زبانی ایک واقعہ سنئے اور اندازہ کیجیے :

لہ اشرف علی تھانوی، مولوی: حکایات اولیاء، ص ۲۸۷

لہ الافاضات الیومیہ، جلد چہارم، ص ۲۷۲

لہ ایضاً، ص ۲۷۳

”ہم لوگ والد صاحب کے پاس رہتے تھے۔ تین چار پائیاں برابر کچی ہوتی تھیں۔ والد صاحب اور ہم دونوں بھائیوں کی۔ میں نے رتی لے کر سب کے پائے ملا کر خوب کس کر باندھ دیے اور لیٹ کر سو گئے۔ پھر والد صاحب بھی آکر لیٹ گئے۔ اتفاق سے بارش آئی تو والد صاحب اُٹھے اور..... اپنی چار پائی گھسیٹی۔ اب وہاں تینوں چار پائیاں ایک ساتھ چلی آرہی ہیں۔ سجدہ غصے ہوئے اور فرمایا کہ ایسی ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔“

اب ذرا یہ ملاحظہ ہو کہ تھانوی صاحب مسجدوں میں کیسی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ موصوف نے اپنی ایک ایسی کرامت اپنے مریدوں کے سامنے یوں فخر بہ بیان فرمائی اور اُس کی اشاعت کرائی کہ ”ایک مرتبہ میرٹھ میں میاں الہی بخش صاحب مرحوم کی کوٹھی میں جو مسجد ہے (میں نے) سب نمازیوں کے جوتے جمع کر کے اُس کے شامیانے پر پھینک دیے۔ نمازیوں میں غل ہو کہ جوتے کیا ہوئے۔“

موصوف حکیمانہ مسجدیں بناتے اور اُن میں نماز باجماعت کا اہتمام بھی کر دیا کرتے تھے۔ اب دیوبندیوں کے حکیم الامت صاحب کی زبانی سنئے کہ وہ مسجد اور امامت کیسی ہوتی تھی، ”ایک روز سب لڑکے اور لڑکیوں کے جوتے جمع کر کے اُن کو برابر رکھا اور ایک جوتے کو سب کے آگے رکھا، وہ گویا کہ امام تھا اور پلنگ کھڑے کر کے، اُس پر کپڑے کی چھت بنائی، وہ مسجد قرار دی۔“

تھانوی صاحب اپنی ایسی حرکتوں کے باعث اپنے خاندان اور والد محترم کے لیے باعثِ ننگ و مشہور ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس امر کا انھوں نے اپنے مریدوں کے سامنے خود یوں اعتراف کیا تھا:

”جہاں اس قسم کی کوئی بات شوخی کی ہوتی تھی۔ لوگ والد صاحب کا نام لے کر

کہتے کہ اُن کے لڑکوں کی حرکت معلوم ہوتی ہے! لے

دیوبندی حضرات یہ کہہ سکتے ہیں تھانوی صاحب کی یہ نازیبا حرکات اُس وقت کی ہیں جب وہ سن شعور کو نہیں پہنچے تھا۔ چلیے ایسا ہی ہو گا کہ جناب مولوی صاحب کو اُس وقت اپنے مریدوں اور معتقدوں میں ایسی ہیودہ باتوں کے تذکرے اور انھیں شایع کروانے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی، جب کہ اُن کی علامگی اور دیوبندی فرقے میں اُن کے حکیم الامت اور مجددِ دین و ملت ہونے کے دُھول بجائے جارہے تھے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ مریدوں کے سامنے ایسی نازیبا حرکتوں کا سرے سے تذکرہ ہی نہ کرتے۔ بہر حال اب تھانوی صاحب کی اُس دور کی تہذیب و شرافت ملاحظہ فرمائیے، جب اُن کی علامگی اور خانہ ساز بزرگی کا آفتاب نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ قارئینِ کرام! ذرا دیوبندیوں کے حکیم الامت اور مجددِ دین و ملت کہلانے والے کی طرز گفتگو، میاں شرافت اور مریدوں کی تربیت کا اندازہ ملاحظہ فرمائیں۔ تھانوی صاحب فرماتے ہیں:

”ایک شخص نے مجھ سے شکایت کی کہ ذکر میں جو پہلے مزہ آتا تھا، اب نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ میاں مزہ تو ندی میں ہوتا ہے، یہاں کیا مزہ ڈھونڈنے پھر ہو؟“

دیوبندیوں کی تہذیب و شرافت کا ایک نادر شہکار اور ملاحظہ ہو۔ مولوی لطف اللہ دیوبندی نے لکھا ہے:

”مکتب کے لڑکوں نے حافظ جی کو نکاح کی ترغیب دی کہ حافظ جی نکاح کر لو، بڑا مزہ ہے۔ حافظ جی نے کوشش کر کے نکاح کیا اور رات بھر روٹی لگا لگا کر کھائی۔ مزہ کیا خاک آتا، صبح کو لڑکوں پر خفا ہوتے ہوئے آئے کہ سسرے کہتے تھے کہ بڑا مزہ ہے، ہم نے روٹی لگا کر کھائی ہمیں تو نہ نمکین معلوم ہوئی، نہ میٹھی، نہ کڑوی۔ لڑکوں نے کہا کہ حافظ جی! مارا کرتے ہیں۔ آئی شب، حافظ جی نے بیچاری کو خوب زد و کوب کیا۔ دے

جُوتا، دے جوتا، تمام محلہ جاگ اُٹھا اور جمع ہو گیا اور حافظ جی کو بُرا بھلا کہا۔ پھر صبح آئے اور کہنے لگے کہ سسروں نے دق کر دیا۔ رات ہم نے مارا بھی کچھ مزہ نہ آیا اور رُسوائی بھی ہوئی۔ تب لڑکوں نے کھول کر حقیقت بیان کی کہ مارنے سے یہ مراد ہے۔ اب جوشب آئی تب حافظ جی کو حقیقت منکشف ہوئی۔ صبح کو جو آئے تو منہجوں کا ایک ایک بال کھل رہا تھا اور خوشی میں بھرے ہوئے تھے۔ ۱

مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کی حکیمانہ تعلیمات ملاحظہ ہوں جن کی مریدوں کو تلقین کرتے رہا کرتے تھے چنانچہ موصوف نے بغیر شرمائے ایک واقعہ اپنے مریدوں کے سامنے یوں بیان کیا جو ملفوظات کا حصہ قرار پایا،

”عوام کے عقیدہ کی بالکل ایسی حالت ہے جیسے گدھے کا عضوِ مخصوص، بڑھے تو بڑھتا ہی چلا جائے اور جب غائب ہو تو بالکل پتہ ہی نہیں۔ واقعی عجیب مثال ہے۔“ ۲

یہ عجیب مثال ہے تو تھانوی صاحب کی زبانی ذہانت کا کمال ملاحظہ ہو۔ اُنھوں نے فرمایا تھا، ”ایک شخص کسی مکان میں اندر سے کھڑی لگا کر کسی عورت سے زنا کر رہا تھا۔ لوگوں نے دسک آدمی تو اب اندر سے کہتا ہے کہ میاں! یہاں جگہ کہاں؟ یہاں خود ہی آدمی پر آدمی پڑا ہے۔ دیکھ لیجیہ کیسا سچا آدمی تھا۔ جھوٹ نہیں بولا۔ کیسی ذہانت کا جواب ہے۔“ ۳

خیر یہ تو تھانوی صاحب نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں جھوٹ نہ بولنے کی تلقین فرمائی ہے اب بزرگی کے اظہار اور حقائق و معارف بیان کرنے کا طریقہ بھی جامع المجددین صاحب ہی سے معلوم کرنا چاہیے کیونکہ اُن کے سوا اس شرافت سے بے ہوئے کو چہ کا شناساؤ

۱ لطف اللہ، مولوی؛ علمائے حق، ص ۱۲

۲ لطف اللہ، مولوی؛ جلد چہارم، ص ۷

۳ لطف اللہ، مولوی؛ جلد چہارم، ص ۷۰

کون ہو سکتا ہے۔ موصوف نے ایک مرتبہ فرمایا تھا:

”ماموں صاحب بولے کہ میں بالکل ننگا ہو کر بازار میں ہو کر نکلوں۔ اس طرح ایک شخص تو آگے سے میرے عضو تناسل کو پکڑ کر کھینچے، ساتھ میں لڑکوں کی فوج ہو اور وہ یہ شور مچاتے جاویں، بھڑوا ہے، بھڑوا ہے اور اُس وقت میں حقائق اور معارف بیان کروں۔“ ۱

تھانوی صاحب کا یہ حکیمانہ ملفوظ گرامی بھی دیوبندیوں کی تربیت کے لیے مشہر کیا گیا ہوگا۔

پانچ لکھا ہے :

”قصبہ رامپور میں حضرت مولانا گنگوہی نے ایک واقعہ میں طلاق کے متعلق کوئی فتویٰ دیا تھا۔ کسی عورت نے قرآن شریف کا ترجمہ پڑھ کر اُس کے خلاف یہ فتویٰ دے دیا کہ قرآن میں یہ لکھا ہے حکیم ضیاء الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے بیان کیا۔ فرمایا وہ کیا جانے چُتہ و کیس کی۔“ ۲

میر خیال ہے کہ دیوبندی حضرات کے لبقیۃ السلف و عمدة الخلف عالیجناب تھانوی صاحب کے ملفوظات مذکورہ بالا ہی اس جماعت کی تہذیب و شرافت اور بزرگی کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ ماقول و کفی کے تحت، طوالت سے بچنا اور ان پر ہی اکتفا کرنا مناسب ہے۔ قارئینِ کرام نے ان سے ہی بخوبی محسوس کر لیا ہوگا کہ :

ہیں ستارے کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا

۴۔ بانی جماعت اسلامی کے کارنامے

یوں تو عالیجناب مودودی صاحب نے اپنی بلند قامت ہستی اور بین الاقوامی شہرت کے مالک شخصیت ہونے کے باعث ملتِ اسلامیہ پر کتنے ہی مخصوص احسانات فرمائے ہیں

جو تاریخ کا ایک پراسرار اور المناک باب بن چکے ہیں، لیکن یہ احسان اپنی جگہ پر زالی ہی شان رکھتا ہے
 کہ جو ملت پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہے اُس پر ایک تازہ فرقے کا بوجھ اور
 لا دیا۔ اللہ اور رسول نے فرقہ بازی سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے اور ایسا کرنے والوں کے
 بارے میں سخت وعیدیں سنائی گئی ہیں لیکن بین الاقوامی شخصیت ہونے کے باعث جناب
 مودودی صاحب نے اُن کی ذرا پروا نہ کی۔ وہابیت کا تیسرا ایڈیشن مرتب کر کے شائع فرمایا
 اور جماعت اسلامی کے خوشنما نام سے مسلمانوں کی فہرست میں ایک فرقہ اور شامل کر دیا۔ کاش
 وہ ایسا وبال اپنے سر نہ لیتے اور اپنا زور قلم بھرے ہوئے مدعیان اسلام کو جوڑنے اور بہک
 جانے والوں کو راہِ راست پر لانے میں صرف کرتے۔ اگر راہِ راست سے اُنھیں چڑھتی اور وہابیت
 پر جان چھڑکنا اور اسی کی تبلیغ و اشاعت کرنا وہ ضروری خیال کرتے اور باعثِ نجات گردانتے تھے
 تو غیر مقلدوں یا دیوبندیوں میں شامل رہتے لیکن نیا فرقہ کھڑا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔
 یہ حقیقت ہے کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے پہلے پاک و ہند میں وہابیت کا نام و نشان
 بھی نہیں تھا اور محمد بن عبد الوہاب نجدی سے پہلے رُوئے زمین پر اس جماعت کا کہیں وجود
 نظر نہیں آتا تھا۔ اسی طرح مولوی رشید احمد گنگوہی سے پہلے دیوبندی عقاید و نظریات کی
 اس نام سے کوئی جماعت نہ تھی۔ سر سید احمد خاں علی گڑھی سے پہلے کوئی نہیں جانتا تھا کہ
 نیچریت کون سے درخت کا نام ہے۔ مرزا غلام احمد قادیانی سے پہلے مرزائی فرقہ، خواہ وہ
 قادیانی ہوں یا لاہوری، ہرگز نہ تھا۔ غلام احمد پرویز سے پہلے خود کو اہل قرآن بتانے والا
 پرویزی ٹولہ دنیا کے طبقے پر ناپید تھا اور مودودی صاحب دی گریٹ سے پہلے کوئی فرقہ
 جماعت اسلامی کے نام سے انسانوں میں متعارف نہیں تھا۔ موخر الذکر دونوں فرقوں کے
 بانی تا حال یقید حیات ہیں۔ کاش! اللہ تعالیٰ ان دونوں حضرات کو ہدایت بخشنے کہ فرقے
 بنانے کا جو وبال اپنے سر لیا ہے، اُس سے تائب ہو کر، راہِ ہدایت اختیار کر لیں۔ اپنے
 پروردگار کی بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے وَلَا تَمُوتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ پر
 عمل کر لیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ہماری ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا تھا

سردیوں و مکمل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہی ہادی کُل اور ہدایت کا چشمہ ہیں۔ قیامت تک آنے والوں مدعیان اسلام میں سے راہ ہدایت پر وہی شمار ہوگا جو اُس آقاؐ کے کائنات کے لئے جوئے دین پر ثابت قدم رہے اور اُس میں کسی قسم کی کاٹ چھانٹ نہ کرے۔

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلام صحابہ کرام نے سیکھا، اُن سے تابعین نے، ان سے تبع تابعین نے، غرضیکہ اسی طرح ہر نئی نسل اپنے بزرگوں سے دین حاصل کرتی اور اُسے اپنی نسل تک پہنچاتی رہی۔ قیامت تک اسی طرح دین جاری رہے گا۔ اس حقیقت کی روشنی میں ہمارے کرام خود تو فرماتے ہیں کہ جو جماعتیں اور فرقے کل یا پر سوں کی پیداوار ہیں اگر اُن میں سے کسی کی قنایت کا ڈھول پٹیا بائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ حقانیت انھیں بطور میراث ملی ہے یا ان پر نازل ہوئی ہے؟ دونوں میں سے ہر شق محتاج ثبوت ہے۔ جن کی جماعتوں کا ماضی میں وجود ہی نہیں انھیں کس کی میراث ملتی؟ رہا نزول کا معاملہ تو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دین کا منسوخ ہونا اور کسی دوسرے پر برحق دین کے نازل ہونے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دریں حالات دین مصطفیٰ کے دشمنوں اور ملت اسلامیہ کے بدخواہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ سید الانبیاء سے دین کی میراث پانے والوں کو غلط اور اہل باطل قرار دیا، اُن کی مذمت کرتا ہوں اور کمزوریوں کو سامنے رکھ کر اصلاح کرنے کے لیے کھڑے ہو گئے، جب بعض جملے بجالے مسلمان اُن کی اصلاحی سرگرمی سے متاثر ہو کر ہمنوا بنے تو اپنا رنگ یوں دکھانا شروع کیا کہ مقدس شجر اسلام میں بعض خود ساختہ عقاید و نظریات کے پیوند لگا کر نیا اور تازہ تازہ دین پیش کرنے لگ گئے۔ علمائے ملت جب اُن خود ساختہ ایجادات پر گرفت کرتے تو بنا اصلاحی رنگ سامنے کر کے مسلمانوں کو درغلالتے کہ دیکھیے یہی لوگ ہیں جو فلاں فلاں غلطیوں کو کرتا ہوں کے مروج ہیں اور اصلاح سے کس درجہ کانپتے اور دشمنی رکھتے ہیں۔ گمراہ گروں کا یہ دودھ پین ہے جس کے باعث ہر تخریب کار اور فرقہ ساز اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرتا رہا ہے۔ اس حقیقت کو خود جناب مودودی صاحب نے یوں بیان کیا ہے:

”یہ بھی انسان کی عین فطرت ہے کہ وہ برائی کی کھلی دعوت کو کم ہی قبول کرتا ہے۔ عموماً اُسے جال میں پھانسنے کے لیے ہر داعی شر کو خیر خواہ کے بھیس ہی

میں آنا پڑتا ہے ۱۷

خالق کائنات جل جلالہ تو ہر عیب و نقص سے پاک ہے
مودودی صاحب کا خدا لیکن مودودی صاحب کا خدا شاید ایسے امور و صفات کو
تکلفات گردانتا ہے کہ ان سے بچنا چنداں ضروری نہیں سمجھتا۔ چنانچہ عالی جناب مودودی صاحب
نے سورہ بقرہ کے الفاظ **اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمُ** کا بقل خود ترجمہ یوں کیا ہے:

”اللہ اُن سے مذاق کر رہا ہے“ ۱۸

سورۃ التوبہ کی آیت ۹، کا ترجمہ یوں کیا ہے:

”اللہ اُن مذاق اڑانے والوں کا مذاق اڑاتا ہے“ ۱۹

نہی مذاق عام طور پر جھگڑے فساد کی بنیاد ہو کر رہ جاتا ہے۔ اچھا ہوتا اگر مودودی صاحب یہ
بھی بتا دیتے کہ جب اُن کا پروردگار اکثر اوقات منافقینِ مدینہ سے مذاق کرتا رہتا تھا تو
کبھی ہانتھا پائی یا جو تم پزیر تک بھی نوبت پہنچ جاتی تھی یا نہیں؟ ہو سکتا ہے کہ اگر معمول
میں فرق نہ آیا ہو تو عدالتی چارہ جوئی تک نوبت بھی پہنچی ہو۔ بہر حال اچھا ہوتا کہ بین الاقوامی
محقق صاحب مذکورہ بالا امور پر بھی روشنی ڈال دیتے۔ جناب مودودی صاحب نے اپنے
خدا کی شان، خود اُس کی زبانی یوں بھی بیان کی ہے:

”کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟“ ۲۰

”میری چال کا کوئی توڑ نہیں؟“ ۲۱

”اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ سب سے بہتر چال چلنے والا ہے؟“ ۲۲

”یہ چال تو وہ چلے اور پھر ایک چال ہم نے چلی جس کی اُنھیں خبر نہ تھی؟“ ۲۳

۱۷ مودودی صاحب، مولوی: تفہیم القرآن، جلد دوم، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۶

۱۸ ایضاً: جلد دوم، ص ۲۱۹

۱۹ ایضاً: جلد اول، ص ۵۴

۲۰ ایضاً: جلد دوم، ص ۱۰۴

۲۱ ایضاً: جلد دوم، ص ۶۱

۲۲ ایضاً: جلد سوم، ص ۵۸۴

۲۳ ایضاً: جلد دوم، ص ۱۶۱

لفظ چال ذو معنی ہے۔ اس میں ناقابلِ اعتراض مفہوم بھی موجود ہے اور قابلِ اعتراض اس سے بدرجہا زیادہ ہے۔ مودودی صاحب جیسی بین الاقوامی شخصیت کو اپنے پروردگار کے بارے میں ایسا لفظ استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے تھا جو زیادہ تر قابلِ اعتراض معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ یقیناً وہ اس بات سے بے خبر نہیں ہیں کہ لفظ سَاعِنَا ہرگز ذو معنی نہیں۔ اس میں کوئی قابلِ اعتراض مفہوم شامل نہیں، لیکن یہودی اپنے بغض و عناد کی آگ میں جلتے ہوئے دلوں کو کسی قدر ٹھنڈک پہنچانے کی خاطر اس لفظ سے ناجائز فائدہ اٹھا لیا کرتے تھے یعنی بظاہر یوں معلوم ہوتا کہ وہ سَاعِنَا یا سَوْالُ اللہ کہہ رہے ہیں لیکن حقیقت میں سَاعِنَا اور سَاعُونَا وغیرہ الفاظ ادا کیا کرتے تھے۔ اللہ جل مجدہ نے یہود کی شرارت کے پیشِ نظر صحابہ کرام جیسی قدسی جماعت اور عشقِ مصطفیٰ کی اُن منہ بولتی تصویروں کو بھی لفظ سَاعِنَا کے استعمال سے روک دیا۔ پروردگارِ عالم نے اپنے حبیب اور برگزیدہ ترین بندے کی شان میں وہ لفظ استعمال کرنے سے روک دیا جس میں کوئی قابلِ اعتراض معنی نہیں لیکن معاذین اُس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر توہین و تنقیص کا پہلو پیدا کر دیتے تھے۔ کیا وہ خدائے ذوالجلال اپنے متعلق ایسا لفظ پسند فرمائے گا، جو زیادہ تر قابلِ اعتراض معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ ناراض ہونے کی نسبت غور کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ وقار کا مسئلہ بنا کر اڑ جانا فضول ہے کیونکہ ایمان جیسی متاعِ عزیز کا حاصل کرنا اور سنبھال کر رکھنا حاصلِ زندگی ہے۔

انبیائے کرام پر تیر اندازی مودودی صاحب کا قلم جب اپنے پروردگار کو نظر انداز نہیں کر سکتا تو حضراتِ انبیائے کرام کو اپنی تیر افگنی کا ہدف بنائے بغیر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔ چنانچہ مودودی صاحب نے تیدنا ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کو داغدار کرتے ہوئے یوں اپنا تحقیقی رنگ دکھایا ہے،

”بعض لوگوں نے اُس میں عزم نہ پایا یا کا مطلب یہ لیا ہے کہ ہم نے اُس میں نافرمانی کا عزم نہ پایا یعنی اُس نے جو کچھ کیا، نافرمانی کے عزم کی بناء پر نہیں کیا، لیکن یہ خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔ یہ بات اگر کہنی ہوتی تو لَوْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا

عَلَى الْعَصِيَّانِ كَمَا جَاءَتْهُ لَمْ يَحْجِدْ لَهُ عَزْمًا۔ آیت کے الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ فقدانِ عزم سے مراد اطاعتِ حکم کا فقدان ہے نہ کہ نافرمانی کے عزم کا فقدان۔ ۱

انبیائے کرام کا معصوم ہونا ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس پر تمام مسلمانوں کا ہمیشہ اتفاق رہا ہے لیکن جن حضرات کو شیطان اپنی نیابت میں اس مقدس گروہ کے خلاف کھڑا کرنا ہے وہ اپنے ملعون قائد کی طرح علی ساز و سامان سے لیس ہو کر محسوس یا غیر محسوس طریقے پر حفاظتِ توحید یا زورِ تحقیق کا بہانہ لے کر انبیائے کرام حبیبی پاکیزہ ہستیوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے بغیر نہیں چھوڑتے۔ کاش! مودودی صاحب اتنا غور فرما لیتے کہ وہ اس آیت میں لَمْ يَحْجِدْ لَهُ عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان اس مجبوری کے تحت مراد نہیں لے سکے کہ اس آیت کے الفاظ لَمْ يَحْجِدْ لَهُ عَزْمًا عَلَى الْعَصِيَّانِ مہیں ہیں تو اسی فقدانِ عزم سے اطاعتِ حکم کا فقدان مراد لینے کیلئے کیا انہیں اس آیت میں عَلَى الطَّاعَةِ بھی لکھا ہوا نظر آگیا ہے؟ مودودی صاحب! اگر اس آیت میں عَلَى الْعَصِيَّانِ نہیں تو عَلَى الطَّاعَةِ بھی نہیں ہے، اس صورت میں غور طلب یہ امر ہے کہ انبیائے کرام کی عصمت پر یقین رکھنے والا آخر لَمْ يَحْجِدْ لَهُ عَزْمًا سے نافرمانی کے عزم کا فقدان ہی مراد لے سکتا ہے اور ایک مسلمان کی روح بھی اس بات کے تصور تک سے کانپنے لگے گی کہ وہ انبیائے کرام حبیبی مقدس ترین ہستیوں میں اطاعتِ حکم کا فقدان بتائے اور ایسی بات کی تشہیر سے تو اس کا ہر بُن مُو ابا کرے گا۔ آگے ملاحظہ ہو کہ بین الاقوامی مفکر صاحب نے اپنی تحقیق کے دریا بہاتے ہوئے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی عظمت کو کس طرح داغدار کرنے اور مسلمانوں کے دلوں سے عصمتِ انبیاء کے عقیدے کو نکال دینے کی کوشش کی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

”اس سلسلے میں ایک اور سوال بھی پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب حضرت ابراہیم

نے تارے کو دیکھ کر کہا، یہ میرا رب ہے، اور جب چاند اور سورج کو دیکھ کر انھیں
 اپنا رب کہا، تو کیا اُس وقت عارضی طور پر یہی سہی، وہ شرک میں مبتلا نہ ہو گئے تھے؟
 اس کا جواب یہ ہے کہ ایک طالبِ حق اپنی جستجو کی راہ میں سفر کرتے ہوئے
 بیچ کی جن منزلوں پر غور و فکر کے لیے ٹھہرتا ہے، اصل اعتبار اُن منزلوں کا
 نہیں ہوتا، بلکہ اصل اعتبار اُس سمت کا ہوتا ہے جس پر وہ پیش قدمی کر رہا ہے
 اور اُس آخری مقام کا ہوتا ہے جہاں پہنچ کر وہ قیام کرتا ہے۔ بیچ کی منزلیں ہر
 جویائے حق کے لیے ناگزیر ہیں۔ ان پر ٹھیرنا بسلسلہ طلب و جستجو ہوتا ہے نہ کہ
 بصورتِ فیصلہ۔ اصلایہ کہ ٹھیراؤ سو امی واستفہامی ہو اگر تا ہے نہ حکمی۔
 طالب جب ان میں سے کسی منزل پر رُک کر کہتا ہے کہ ایسا ہے۔ اور تحقیق سے
 اُس کا جواب نفی میں پا کر وہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا بالکل
 غلط ہے کہ اُٹناٹے راہ میں جہاں جہاں وہ ٹھیرتا رہا، وہاں وہ عارضی طور
 پر کفر یا شرک میں مبتلا رہا۔ ۱

مودودی صاحب نے کتنے بیچ در بیچ حیلوں بہانوں سے یہ زہریلی دوائی مسلمانوں کے
 حلق سے، اُن کا خیر خواہ بن کر، اُتارنے کی کوشش کی ہے کہ واقعی ابراہیم علیہ السلام تارے،
 چاند اور سورج کو اپنا رب کہتے رہے اور واقعی وہ کفر و شرک میں مبتلا ہوتے رہے، عصمت
 اُن کے نزدیک تک چھٹکنے سے گریز کرتی رہی، فضلِ خداوندی اُن کی دستگیری سے قاصر
 ہوتا رہا لیکن انھیں کفر و شرک میں مبتلا شمار نہ کیجیے کیونکہ یہ وقتی اور عارضی بات تھی۔ وہ تجربہ
 کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جدھر وہ جا رہے ہیں اُس سمت پر اعتبار کیجیے۔ درمیان
 میں سو کفر یا پانچو شرک بھی کر لیں تو اُس کا کوئی اعتبار نہ کرنا، درمیانی کفریات و شرکیات
 کو کفر و شرک شمار نہ کرنا۔ مودودی صاحب کو تیرا گفنی میں حیرت انگیز مہارت حاصل ہے
 کہ ایک ہی تیر میں بے شمار شکار کر لیتے ہیں۔ ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر

پیغمبر اور اللہ جل شانہ کے خلیل کی عظمت و عصمت کو اس درجہ داغدار کرنے کی کوشش کی کہ انہیں کافرو مشرک تک بنا کر رکھ دیا، دوسری جانب ہزاروں کافروں، مشرکوں اور گمراہوں بد مذہبوں کو برأت کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔ جب اُن پر گرفت کی جائے تو وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہماری ریائی منزلیں ہیں ان کا کیوں اعتبار کرتے ہو؟ اعتبار ہماری اُس سمت کا کرو جدھر ہمارا منہ ہے یا ہماری آخری منزل کا اعتبار کرنا۔ معلوم نہیں مودودی صاحب نے پورے دین اور اُس کے جملہ احکامات کو یکسر معطل اور حرف غلط کی طرح بیکار ٹھہرانے کی یہ جسارت کس خوشی میں فرمائی ہے؟ ستم بالائے ستم تو یہ کہ حبیب پروردگار، خلاصہ کائنات، سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بارے میں یہاں تک لکھ دیا:

”نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضور کے ذہن میں یہ تصور تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے یا ملنی چاہیے، بلکہ آپ سرے سے کتب آسمانی اور اُن کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپ نہ شعوری طور پر اس تفصیل سے واقف تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کیا باتیں ماننی چاہئیں اور نہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتب الہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفار مکہ سے بھی چھپی مہوئی نہ تھیں۔ مکہ معظمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اُس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضور کی زبان سے کتاب الہی کا کوئی ذکر سنا ہو یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے“ لے

جہاں تک کفار مکہ کا ایسی بات کے سننے سے محروم رہنے کا تعلق ہے تو یہ بات درست ہے لیکن فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اعلان نبوت سے پہلے جاہل محض ہونے کا حکم صادر کرنے

ہے پہلے کاش! مودودی صاحب کا بیباک قلم ٹوٹ گیا ہوتا کاش! مودودی صاحب اپنے اس سراسر غیر اسلامی عقیدے پر نظر ثانی کر کے حیاتِ مستعار کے ان آخری لمحات میں ایمان جیسی متاعِ عزیز کو حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کر لیں۔ مجملہ انبیائے کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلم نے یوں اپنا زورِ تحقیق دکھایا ہے،

”عصمت در اصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ نبوت کی ذمہ داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتاً خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے بھی اُن سے منفع ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھ لیں اور جان لیں کہ یہ بشر ہیں، خدا نہیں“۔

معلوم نہیں جناب مودودیت مآب کو عصمتِ انبیاء سے کیا چڑ ہے؟ کیا منصبِ نبوت سے اُنھیں کوئی خاص پر خاش ہے یا خود اس کے طلبگار تھے اور محروم رہنے کے باعث بیانِ کرام کی عصمت سے ٹکرنے اور اُن ہستیوں پر کھوپڑ بازی کی مشق فرمانے لگے ہیں؟ مانت تسلیم کر کے گویا انبیائے کرام کو منصبِ ولایت پر توفیق نہ سمجھ لیا لیکن فوراً ہی موصوف کا بیباک قلم جو شوخی پر آیا تو طرارے بھرتا ہوا سارے انبیائے کرام کو عام گنہگاروں کی صف میں کھڑا کر گیا۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلیٰ العظیم۔

یہ چند عبارتیں محض اس لیے پیش کر دی ہیں کہ مودودی صاحب جیسے دین سازوں کو زُبَانًا تَقِیْنَ دُونَ اللہ بنا کر جن حضرات نے اپنے دلوں اور دماغوں پر مسلط کر رکھا ہے وہ شاید غور و فکر کو کچھ کام میں لاسکیں اور یہ سوچنے کی توفیق پاسکیں کہ شریعتِ مطہرہ تو محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر نازل ہوئی تھی اور صحابہ کرام کو اُس کی عملی تصویریں بنا کر اللہ کے آخری

پیغمبر نے تیار کیا تھا، اُن سے تابعین نے، اُن سے تابعین نے، مغربیکہ اسی طرح اُن کے
 دین پہنچا لیکن یہ کیا ستم ہے کہ پھیلوں کا سمجھا ہوا دین بیکار ہو کر رہ گیا، چودہ سو سالہ دین بھی
 حرفِ غلط قرار دے دی گئی اور دین صرف مودودی صاحب کے قلم ناستی رقم کی رطب و یابس کا
 کا نام ہو گیا، کاش! اُن کے معتقد لوگ یہ یقین کر لیں کہ مودودی صاحب ہرگز نبی نہیں ہیں کہ
 اُن کی تشریح حرفِ آخر قرار پائے۔ تصریحات وہی قابلِ تسلیم ہیں جو سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ
 وسلم اور آپ کے غلاموں یعنی ہمارے آقاؤں سے منقول ہیں، اُن کے خلاف ہر بات محض
 اصلاح کے نام پر فساد اور مقدس اسلام کی جگہ خانہ ساز اسلام پیش کرنے کی شرمناک سازش
 ہے۔ (لغو بالله من شرور النفسا)

جب مودودی صاحب نے انبیائے کرام تک کو
 صحابہ کرام پر زالی کرم نوازی اپنی مشق ستم کا نشانہ بنائے بغیر نہ چھوڑا تو صحابہ کرام
 کو جھلا کیسے نظر انداز کر سکتے تھے؟ صحابہ کرام جیسے مقدس گروہ جس کو اللہ تعالیٰ نے فِائِ
 اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَا اٰمَنْتُمْ بِہِ فَرَاکِ مِعْیَارِ حَقِّ قَرَار دیا۔ جن کو فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
 نے اَصْحَابِیْ کَالنَّجْوَمِ بِاَیَّتِهِمْ رَاقَتْ دِیْتُمْ رَاقَتْ دِیْتُمْ کی سند کے ذریعے معیارِ حق قرار
 کی منادی کروائی، انبیائے کرام کے سوا انسانوں کے باقی ہر گروہ سے اس نرالی جماعت کو
 ممتاز قرار دیا، اُسی کے بارے میں بین الاقوامی مفکر صاحب یوں اپنے تفکرات پیش
 کرتے ہیں:

”رسولِ خدا کے سوا کسی انسان کو معیارِ حق نہ بنائے۔ کسی کو تنقید سے بالاتر نہ
 سمجھے۔ کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اُسی
 معیارِ کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اُس معیار کے لحاظ سے جس درجے میں ہو
 اُس کو اُسی درجے میں رکھے۔“

اب اسی مقدس گروہ یعنی حضراتِ صحابہ کرام کے بارے میں عالی جناب مودودی صاحب کا

دوسرا ایٹھی حکم ملاحظہ فرمایا جائے؛

”میں باری مسلمان تو دراصل اُس زمانے میں بھی وہی تھے اور اب بھی وہی ہیں جو قرآن اور حدیث کے علوم پر نظر رکھتے ہوں اور جن کے رگ و پے میں قرآن کا علم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا نمونہ سرایت کر گیا ہو“ لے

موردی صاحب کے نزدیک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے دورِ خلافت میں ایک اندیشہ تھا۔ وہ اپنے متوقع جانشینوں کو اُس کے بارے میں سمجھاتے بھی رہے۔ نتیجہ کیا برآمد ہوا؟ یہ موردی صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو؛

”حضرت عمرؓ کو اپنے آخر زمانے میں اس بات کا خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں اُن کے بعد عرب کی قبائلی معصیتیں (جو اسلامی تحریک کے زبردست انقلابی اثر کے باوجود ابھی بالکل ختم نہیں ہو گئی تھیں) پھر نہ جاگ اٹھیں اور اُن کے نتیجے میں اسلام کے اندر فتنے برپا ہوں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اپنے امکانی جانشینوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اُنھوں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے حضرت عثمانؓ کے متعلق کہا، ”اگر میں ان کو اپنا جانشین مقرر کروں تو وہ بنی ابنِ مَعِیْط (بنی امیہ) کو لوگوں کی گردنوں پر مسلط کر دیں گے اور وہ لوگوں میں اللہ کی نافرمانیاں کریں گے۔ خدا کی قسم اگر میں نے ایسا کیا تو عثمانؓ یہی کریں گے اور اگر عثمانؓ نے یہ کیا تو وہ لوگ ضرور معصیتوں کا ارتکاب کریں گے اور عوام شورش برپا کر کے عثمانؓ کو قتل کر دیں گے“ لے

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد واقعی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی مقرر ہوئے۔ بدینہ عین کے بین الاقوامی محقق صاحب نے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں عمال کے سلسلے میں یوں زہر افشانی کرتے ہوئے دین و دیانت کا سربازِ خون کیا ہے،

لے موردی صاحب: تفہیمات، ج ۱، ص ۳۱۹

لے موردی صاحب: خلافت و ملکیت، طبع پنجم، ۱۹۷۰ء، ص ۹۸، ۹۹

”اُن کے بعد جب حضرت عثمانؓ جانشین ہوئے تو رفتہ رفتہ وہ اس پالیسی سے ہٹتے چلے گئے۔ اُنھوں نے پے در پے اپنے رشتہ داروں کو بڑے بڑے اہم عہدے عطا کیے اور اُن کے ساتھ دوسری ایسی رعایات کیں جو عام طور پر لوگوں میں ہڈ اعراض بن کر رہیں۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو معزول کر کے اُنھوں نے کوفہ کی گورنری اپنے ماں جاتے بھائی ولید بن عقبہ بن ابی معیطؓ کو مقرر فرمایا اور اُس کے بعد یہ منصب اپنے ایک اور عزیز سعید بن عاصؓ کو دیا۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بصرے کی گورنری سے معزول کر کے اپنے ماموں زاد بھائی عبد اللہ بن عامرؓ کو اُن کی جگہ مامور کیا۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کو مصر کی گورنری سے ہٹا کر اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ بن سعد بن ابی سرحؓ کو مقرر کیا۔ حضرت معاویہؓ سیدنا عمر فاروقؓ کے زمانے میں صرف دمشق کی ولایت پر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے اُن کی گورنری میں دمشق، حمص، فلسطین، اردن اور لبنان کا پورا علاقہ جمع کر دیا۔ پھر اپنے ماموں زاد بھائی مروان بن الحکمؓ کو اُنھوں نے اپنا سیکرٹری بنالیا، جس کی وجہ سے سلطنت کے پورے در و بست پر اُس کا اثر و نفوذ قائم ہو گیا۔ اس طرح عملاً ایک ہی خاندان کے ہاتھ میں سارے اختیارات جمع ہو گئے۔“ ۱

اس مزعومہ طرزِ عمل پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ فیصلہ صادر ہوتا ہے:

”فطری طور پر یہ بات کسی کو پسند نہ آ سکتی تھی کہ سابقین اولین، جنھوں نے اسلام کو سر بلند کرنے کے لیے جانیں لڑائی تھیں اور جن کی قربانیوں ہی سے دین کو فروغ نصیب ہوا تھا، پیچھے ہٹا دیے جائیں اور اُن کی جگہ یہ لوگ اُمّت کے سرخیل ہو جائیں۔“ ۲

اب مروان بن الحکم کے باعث خلیفہ ثالث کی دوسری جرم فردیوں سُنائی جاتی ہے:

۱۔ مودودی صاحب، خلافت و ملوکیت، طبع پنجم، ۱۹۷۰ء، ص ۱۰۶ تا ۱۰۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹

مردان کے اس پس منظر کو نگاہ میں رکھا جائے تو یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اُس کا سیکرٹری کے منصب پر مقرر کیا جانا لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ لوگ حضرت عثمانؓ کے اعتماد پر یہ تو مان سکتے تھے کہ حضورؐ نے ان کی سفارش قبول کر کے حکم کو واپسی کی اجازت دینے کا وعدہ فرمایا تھا، اس لیے اُسے واپس بلا لینا قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن یہ مان لینا لوگوں کے لیے سخت مشکل تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسی معتبوب شخص کا بیٹا اس بات کا بھی اہل ہے کہ تمام اکابر صحابہ کو چھوڑ کر اُسے خلیفہ کا سیکرٹری بنا دیا جائے خصوصاً جبکہ اُس کا وہ معتبوب باپ زندہ موجود تھا اور اپنے بیٹے کے ذریعے حکومت کے کاموں پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ اے

مذکورہ دونوں امور کے بارے میں عالی جناب مودودی صاحب کی عدالت سے خلیفہ رسول کے بارے میں یہ فیصلہ سنا لیا گیا:

”حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی پالیسی کا یہ پہلو بلاشبہ غلط تھا اور غلط کام بہر حال غلط ہے، خواہ وہ کسی نے کیا ہو۔ اُس کو خواہ مخواہ کی سخن سازیوں سے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا نہ عقل و انصاف کا تقاضا ہے اور نہ دین ہی کا یہ مطالبہ ہے کہ کسی صحابی کی غلطی کو غلطی نہ مانا جائے۔“

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو خارجیت کا بیباک قلم کس طرح مجرم ٹھہراتا اور اُن کے جرائم کی فہرست مرتب کرتے ہوئے انہیں باغی بتاتا، اسلام سے انحراف کرنے والے باد رکھتا ہوا یوں زہر افشانی کرتا ہے:

”حضرت عثمانؓ کے خون کا مطالبہ، جسے لے کر دو طرف سے دو فریق اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور دوسری طرف حضرت

معاویہؓ۔ ان دونوں فریقوں کے مرتبہ و مقام اور جلالتِ قدر کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ دونوں کی پوزیشن آئینی حیثیت سے کسی طرح درست نہیں مانی جاسکتی۔ ظاہر ہے کہ یہ جاہلیت کے دور کا قبائلی نظام تو نہ تھا کہ کسی مقتول کے خون کا مطالبہ لے کر جو چاہے اور جس طرح چاہے اٹھ کھڑا ہو اور جو طریقہ چاہے اُس کو پورا کرانے کے لیے استعمال کرے۔ یہ ایک باقاعدہ حکومت تھی جس میں ہر دعوے کے لیے ایک ضابطہ اور قانون موجود تھا۔ خون کا مطالبہ لے کر اٹھنے کا حق مقتول کے وارثوں کو تھا، جو زندہ تھے اور وہیں موجود تھے۔ حکومت اگر مجرموں کو پکڑنے اور اُن پر مقدمہ چلانے میں واقعی دانتہ ہی تساہل کر رہی تھی تو بلاشبہ دوسرے لوگ اُس سے انصاف کا مطالبہ کر سکتے تھے، لیکن کسی حکومت سے انصاف کے مطالبے کا یہ کون سا طریقہ ہے اور شریعت میں کہاں اِس کی نشان دہی دی جاسکتی ہے کہ آپ سرے سے اُس حکومت کو جائز حکومت ہی اُس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ آپ کے اس مطالبے کے مطابق عمل درآمد نہ کر دے۔ حضرت علیؓ اگر جائز غلیفہ تھے ہی نہیں تو پھر اُن سے اس مطالبے کے آخر معنی کیا تھے کہ وہ مجرموں کو پکڑیں اور سزا دیں؟ کیا وہ کوئی قبائلی سردار تھے جو کسی قانون اختیار کے بغیر جسے چاہیں پکڑ لیں اور سزا دے ڈالیں؟

اس سے بھی زیادہ غیر آئینی طریقہ کاریہ تھا کہ پہلے فریق نے بجائے اِس کے کہ وہ مدینے جا کر اپنا مطالبہ پیش کرنا، جہاں اور مجرمین اور مقتول کے ورثاء سب موجود تھے اور عدالتی کارروائی کی جاسکتی تھی، بصرے کا رخ کیا اور فوج جمع کر کے خون عثمانؓ کا بدلہ لینے کی کوشش کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ ایک خون کے بجائے دس ہزار مزید خون ہوں اور مملکت کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ شریعتِ الہی تو درکنار، دنیا کے کسی آئین و قانون کی رُو سے بھی اسے ایک جائز کارروائی نہیں مانا جاسکتا۔

یہ ہے محبوبہ سیدہ المرسلین اور مقتدر صحابہ کرام کے بارے میں مودودی صاحب کے قلم
 جتنی رقم کی وہ شتم ظریفی جس پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کرتے بلکہ فارغین کرام کے دین و دیانت پر ان کا
 فیصلہ چھوڑتے ہوئے محض ایسی چند عبارتوں کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں۔ اب سیدنا امیر معاویہ
 رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں موصوف کی تحقیق ملاحظہ ہو :

اُس سے بدرجہا زیادہ غیر اُبنی طرز عمل دوسرے فرقہ، یعنی حضرت معاویہؓ کا تھا
 جو معاویہ بن ابی سفیان کی حیثیت سے نہیں بلکہ شام کے گورنر کی حیثیت سے
 خون عثمان کا بدلہ لینے کے لیے اُٹھے، مرکزی حکومت کی اطاعت سے انکار کیا،
 گورنری کی طاقت اپنے اس مقصد کے لیے استعمال کی اور مطالبہ بھی یہ نہیں
 کیا کہ حضرت علیؓ قاتلین عثمانؓ پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دیں، بلکہ یہ کیا کہ وہ قاتلین عثمانؓ
 کو ان کے حوالہ کر دیں تاکہ وہ خود انہیں قتل کریں۔ یہ سب کچھ دور اسلام کی
 نظامی حکومت کے بجائے زمانہ قبل اسلام کی قبائلی بد نظمی سے اشتباہ ہے۔
 خون عثمانؓ کے مطالبے کا حق اول تو حضرت معاویہؓ کے بجائے حضرت عثمانؓ
 کے شرعی وارثوں کو پہنچتا تھا۔ تاہم اگر رشتہ داری کی بنا پر حضرت معاویہؓ
 اس مطالبہ کے مجاز ہو بھی سکتے تھے تو اپنی ذاتی حیثیت پر نہ کہ شام کے گورنر کی
 حیثیت میں۔ حضرت عثمانؓ کا رشتہ ہو کچھ بھی تھا، معاویہ بن ابی سفیان سے تھا
 شام کی گورنری ان کی رشتہ دار نہ تھی۔ اپنی ذاتی حیثیت میں وہ خلیفہ کے پاس
 مستغیث بن کر جا سکتے تھے اور مجرمین کو گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے کا
 مطالبہ کر سکتے تھے۔ گورنر کی حیثیت سے انہیں کوئی حق نہ تھا کہ جس خلیفہ کے ہاتھ
 پر باقاعدہ آئینی طریقے سے بیعت ہو چکی تھی، جس کی خلافت کو ان کے زیرِ نظام
 صوبے کے سوا باقی پوری مملکت تسلیم کر چکی تھی، ان کی اطاعت سے انکار
 کر دیتے اور اپنے زیرِ انتظام علاقے کی فوج طاقت کو مرکزی حکومت کے مقابلے
 میں استعمال کرتے اور ٹھیکہ جالیہ قیدیہ کے طریقے پر یہ مطالبہ کرنے کہ
 قتل کے ملامتوں کو عدالتی کارروائی کے بجائے مدعی قصاص کے حوالہ کر دیا جائے

تاکہ وہ خود اُن سے بدلہ لے لے

مودودی صاحب کا قلب صماۃ کرام کی دشمنی سے اتنا لبریز ہے کہ اُنھوں نے روافض کی تکفیر بھی ختم کر دی۔ برگزیدہ صحابی، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر اُنھوں نے تاریخ کے جھوٹے اور بے سرو پا واقعات کا سہارا لے کر وہ جھوٹے الزامات عاید کیے ہیں جن کی کوئی صاحب عقل و دانش مسلمان برگزیدہ جبارت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سبائی رافضی لوگ کو تقویت پہنچانے کی غرض سے اُنھوں نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام بھی عائد کیا ہے،

”ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور اُن کے حکم سے اُن کے تمام گورنر، خطبوں میں برسرِ منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب دشمن کی بوچھاڑ کرتے تھے، حتیٰ کہ مسجد نبویؐ میں منبرِ رسولؐ پر عینِ روضہ نبویؐ کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں اور حضرت علیؑ کی اولاد اور اُن کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سننے لگتے تھے کسی کے مرنے کے بعد اُس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار، انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت کھاناؤنا فعل تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اگر اپنے خاندان کی دوسری غلط روایات کی طرح اس روایت کو بھی بدلا اور خطبہ جمعہ میں سب علیؑ کی جگہ پر آیت پڑھنی شروع کر دی: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاتِّبَاعِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَيَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (النحل - ۹۰)“

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر مودودی صاحب نے دین و دیانت سے جاری ہو کر یہ کھاناؤنا الزام بھی عائد کیا ہے:

مالِ غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے سرِ احکام کی خلاف ورزی کی۔ کتاب و سنت کی رو سے پورے مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہیے اور باقی چار حصے اُس فوجِ مقدسہ ہونے چاہئیں جو لڑائی میں شریک تھی، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مالِ غنیمت میں سے چاندی سونا اُن کے لیے الگ نکال لیا جاتے، پھر باقی مال شرعی قاعدہ کے مطابق تقسیم کیا جائے، لے

دردی صاحب کا حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک سنگین الزام اور پیش کیا جاتا ہے، جسے انھوں نے مختلف کمزور تاریخی روایات کے سہارے عائد کیا ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں:

حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور اُن کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اُن کا گورنر عبداللہ بن عمرو بن عقیل ان ایک مرتبہ بصرے میں منبر پر خطبہ دے رہا تھا۔ ایک شخص نے دورانِ خطبہ میں اُس کو کنکھ مار دیا۔ اس پر عبداللہ نے اُس شخص کو گرفتار کر لیا اور اُس کا ہاتھ کٹوا دیا۔ حالانکہ شرعی قانون کی رو سے یہ ایسا جرم نہ تھا جس پر کسی کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔ حضرت معاویہؓ کے پاس استغاثہ کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں ہاتھ کی دیت تو بیت المال سے ادا کر دوں گا، مگر میرے عمال سے قصاص لینے کی کوئی سبیل نہیں۔ زیادہ کو جب حضرت معاویہؓ نے بصرے کے ساتھ کوٹنے کا بھی گورنر مقرر کیا اور وہ پہلی مرتبہ خطبہ دینے کے لیے کوٹنے کی جامع مسجد کے منبر پر کھڑا ہوا تو کچھ لوگوں نے اُس پر کنکھ پھینکے۔ اُس نے فوراً مسجد کے دروازے بند کر دیے اور کنکھ پھینکنے والے تمام لوگوں کو (جن کی تعداد ۳۰ سے ۸۰ تک بیان کی جاتی ہے) گرفتار کر کے اُسی وقت اُن کے ہاتھ کٹوا دیے۔ کوئی مقدمہ اُن پر نہ چلایا گیا۔ کسی عدالت میں وہ پیش نہ کیے گئے۔ کوئی باقاعدہ

تلافی شہادت اُن کے خلاف پیش نہ ہوئی۔ گورنر نے محض اپنے انتظامی حکم سے اتنے لوگوں کو قطعید کی سزا دے ڈالی جس کے لیے قطعاً کوئی شرعی جواز نہ تھا۔ مگر دربار خلافت سے اس کا بھی کوئی نوٹس نہ لیا گیا۔ اس سے بڑھ کر ظالمانہ افعال بُسر بن ابی ارطاة نے کیے جسے حضرت معاویہؓ نے پہلے حجاز و یمن کو حضرت علیؓ کے قبضے سے نکالنے کے لیے بھیجا تھا اور پھر ہمدان پر قبضہ کرنے کے لیے مامور کیا تھا اُس شخص نے یمن میں حضرت علیؓ کے گورنر عبید اللہ بن عباسؓ کے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ ان بچوں کی ماں اس صدمے سے دیوانی ہو گئی۔ بنی کنانہ کی ایک عورت بخیر ظلم دیکھ رہی تھی، حیج اُٹھی کہ ”مردوں کو تو تم نے قتل کر دیا، اب ان بچوں کو کس لیے قتل کر رہے ہو؟“ بچے تو جاہلیت میں بھی نہیں مارے جاتے تھے۔ اے ابن ارطاة! جو حکومت بچوں اور بوڑھوں کے قتل اور بے رحمی و برادر کشی کے بغیر قائم نہ ہو سکتی ہو اُس سے بُری کوئی حکومت نہیں، اس کے بعد اسی ظالم شخص کو حضرت معاویہؓ نے ہمدان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جو اُس وقت حضرت علیؓ کے قبضے میں تھا۔ وہاں اُس نے دوسری زیادتیوں کے ساتھ ایک ظلم عظیم یہ کیا کہ جنگ میں جو مسلمان عورتیں پکڑی گئی تھیں، اُنھیں لونڈیاں بنا لیا۔ حالانکہ شریعت میں اس کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔ یہ ساری کارروائی گویا اس بات کا عملاً اعلان تھی کہ اب گورنروں اور سپہ سالاروں کو ظلم کی کھلی چھوٹ ہے اور سیاسی معاملات میں وہ شریعت کی کسی حد کے پابند نہیں ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اور الزام بڑے معصومانہ انداز میں خیر خواہ اسلام و مسلمین بن کر عاید کیا ہے :

”سر کاٹ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنے اور انتقام کے جوش میں لاشوں کی بھرتی کرنے کا وحشیانہ طریقہ بھی، جو جاہلیت میں رائج تھا اور جسے اسلام نے مٹا دیا تھا“

اسی دور میں مسلمانوں کے اندر شروع ہوا، لے

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مجموعی دورِ حکومت کے بارے میں سرکارِ مودودیت مآب کا
یصلہ ملاحظہ ہو :

”حضرت معاویہ کے عہد میں سیاست کو دین پر بالا رکھنے اور سیاسی اغراض کے لیے
شریعت کی حدیں توڑنے کی جو ابتداء ہوئی تھی، اُن کے اپنے نامزد کردہ جانشین
یزید کے عہد میں وہ بدترین نتائج تک پہنچ گئی۔“

صحابہ کرام کے بارے میں جناب مودودی صاحب کا نظریہ دکھانے کی خاطر یہ چند عبارتیں
ذیل کی تبصرے کے پیش کر دی ہیں۔ اہل علم اور اہل دین و ایمان اُن کی ایسی دل آزار عبارتوں اور
مہزون کے مخصوص نظریات سے پہلے ہی نالاں ہیں جس کے باعث ہمیں تبصرہ کرنے یا کسی تفصیل
میں جانے کی چٹاں حاجت نہیں۔

قرآن و حدیث پر مہربانیاں
مودودی صاحب کے اسلام اور مسلمانوں پر احساناتِ مخصوصہ
قرآن و حدیث کی فہرست تو بہت طویل ہے، سرِ دست چند نوازشات کا
تذکرہ ہی مآقلاً و کفّی کے تحت کیا جا رہا ہے۔ دین کا اولین ماخذ چونکہ قرآن کریم ہے اور اس
نے مفهوم و مطالب سے روشناس ہونے میں ہم اکابر کی تصریحات کے محتاج ہیں کیوں کہ
عجب قرآن سے صحابہ کرام نے، اُن سے تابعین عظام نے، غرضیکہ اسی طرح اگلی نسل کے
اہل کلمہ کی نسل کے بزرگوں سے سیکھتے اور آنے والوں کو سکھاتے آئے ہیں۔ لیکن جس نے اللہ تعالیٰ
کے کلامِ معجزِ نظام میں معنوی تخریف کا دروازہ کھولنا ہو اُسے قرآن سیکھنے والوں کا رابطہ اکابر سے
تو ناظروری ہو جاتا ہے ورنہ وہ اپنے مقصد میں ہرگز کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اور ہرگز اپنی
مذمت کو فخر اکابر نہیں منوا سکتا اور نہ مرجعِ خلافت بن سکتا ہے۔ مودودی صاحب کا فہم ہمیشہ دور
کا کوڑی لاتا ہے اور زیرک اتنے ہیں کہ زہر بھی ایسی مینٹھی گولیوں کی شکل میں کھلاتے ہیں۔

ع کہ ہو نچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نچیری

اندرونی زہر سے بے خبر حضرات بیرونی چاشنی پر ایسے مست ہوتے ہیں کہ اُن کی زہریلی اور
ممک گولیاں کھانے کے لیے دیوانہ وار پھرنے لگتے ہیں۔ بزرگانِ دین جنہوں نے بلا واسطہ یا
بلا واسطہ سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسلامی تعلیمات حاصل کیں اُن سے مسلمانوں کا
رابطہ توڑنے کی مودودی صاحب یوں تلقین فرماتے ہیں:

”قرآن اور سنت کی تعلیم سب پر مقدم ہے مگر تفسیر و حدیث کے پُرانے ذخیروں سے
نہیں، اُن کے پڑھانے والے ایسے ہونے چاہئیں جو قرآن و سنت کے مغز کو
پاچکے ہوں۔“ لے

دوسرے مقام پر اسی بات کو بیان کرتے ہوئے یوں اکابر سے بغاوت کی تلقین فرمائی ہے:

”جب تک مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ قرآن اور سنت تک بلا واسطہ دسترس حاصل
نہ کرے گا اسلام کی روح کو نہ پا سکے گا، نہ اسلام میں بصیرت حاصل کر سکے گا،
وہ ہمیشہ مترجموں اور شارحوں کا محتاج رہے گا۔“ لے

موصوف کس طرح مسلمانوں کو قرآن سکھانا چاہتے ہیں؟ اس امر کی وضاحت میں یوں خامہ فرسائی
کی ہے:

”قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں، ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے
جس نے قرآن کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہو اور جو طرزِ جدید پر قرآن پڑھانے اور
سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔“ تے

کچھ سمجھے کہ سرکارِ مودودیت آب کے دربار سے کیا حکم ملا؟ یہی کہ تفسیر و حدیث کے پُرانے ذخیروں
کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے، مترجموں اور شارحوں کا محتاج نہیں رہنا چاہیے، بزرگوں نے قرآن
حدیث کے مغز کو پایا ہی نہیں تھا، وہ قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب کو سمجھے بغیر ہی بزرگ

بن بیٹے تھے، قرآن کریم کو آج حقیقت میں وہی سمجھ سکتا ہے جو اس کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے اور وہ ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر ہی ہو سکتا ہے۔

اگر کوئی مسلمان مودودی صاحب کی اس تلقین پر عمل کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جائے، کچھ تمام بزرگوں کو مودودی صاحب کی ہدایت کے مطابق ناقابلِ اعتماد گردان کر تفسیر و حدیث کے کسی پرانے ذخیرے کو ہاتھ بھی نہ لگائے۔ حدیث تو سرے سے اُس کے ہاتھ سے گئی کہ نیا ذخیرہ ایک بھی دنیا میں موجود نہیں، اگر کوئی سو بھی تو مواد سارا پُرانے ذخیروں کا، لہذا وہ بھی ناقابلِ اعتماد، اب صرف کلامِ الہی باقی رہ گیا جو بغیر کسی ترجمے اور تفسیر کی مدد کے سمجھنا ہے، مطلب اپنے ذہن سے کشید کرنا ہے، جو بھی عرق یا جُوس کی صورت میں زید و عمرو کے دماغوں سے برآمد ہو یہ نوڈی حساب کے نزدیک قابلِ اعتماد اور بزرگانِ دین نے صاحبِ قرآن سے مفہوم و مطالب سیکھے وہ ناقابلِ یقین۔ کیا مودودی صاحب کی شریعتِ محمدیہ کے علمبرداروں سے بغاوت کرنے اور مسلمانوں کو بغاوت پر ڈنکے کی چوٹ ابھارنے کا کوئی جواب ہے ؟

چلیے مودودی صاحب کی تلقین کو علمی جامہ پہنانے والے کے ہاتھ میں ایک معترضی قرآن کریم رہ گیا، لیکن یہ بھی تو اُن ناقابلِ اعتماد ہستیوں کی وساطت ہی سے ملا ہے، اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی۔ دیں حالات اس امر کا کیا ثبوت ہو گا ؟ اگر آیہ کریمہ اِنَّا عَمُّوْا الذِّکْرَ پڑھ کر سنائی جائے تو یہ آیت بھی تو اُسی مجموعہ کلامِ الہی کی ہے جو ناقابلِ اعتماد حضرات کی معرفت ملا ہے، لہذا اس سے استناد تو اُسی صورت میں ہو سکے گا جب اس مجموعہ (قرآن کریم) کی صحت کا اُن ناقابلِ یقین ہستیوں کے علاوہ کوئی دوسرا یقینی ثبوت فراہم کر دیا جائے، جو اس کی صحت پر آفتابِ نیمروز کی طرح دلالت کر رہا ہو۔ مودودی صاحب اگر ہماری جسارت کو معاف فرمائیں تو ہم یہ عرض کرنے میں قطعاً کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ موصوف نے جن ہستیوں پر بے اعتمادی کا اظہار فرمایا ہے وہ اُن بزرگوں کو نظر انداز کر کے قرآن و حدیث کی صحت کا کوئی ایک ثبوتِ قبر کی کوٹھری میں جانے تک بھی پیش نہ کر سکیں گے۔

ثانیاً : مودودی صاحب نے تفہیم القرآن کیوں لکھی ؟ اس پر قوم کا لاکھوں ردِ پیہ کیوں ضائع کیا جا رہا ہے ؟ تلقین تو یہ فرمائی تھی کہ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ براہِ راست قرآن و

سنت کا علم حاصل کرے، کسی مترجم یا شارح کا محتاج نہ بنے، اپنے ترجمہ اور تفسیر کو پڑھنے سے مودودی صاحب مذکورہ تلقین کی روشنی میں منع کیوں نہیں فرماتے؟ منع نہ فرمانے سے تو یہی مترشح ہوتا ہے کہ موصوف صرف یہ چاہتے ہیں کہ اُمتِ محمدیہ اپنے جلیل القدر اکابر سے رابطہ ختم کر کے، یہ سمجھتے ہوئے مودودی صاحب کے قدموں سے لگ جائے کہ اگرچہ سو سالہ دور میں کسی نے حقیقت میں قرآن و حدیث کے مفہوم و مطالب کو سمجھا ہے تو وہ ہستی صرف علی بن ابی مودودیت مآب کی ہے۔

مثلاً: کیا ہم مودودی صاحب سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ موصوف نے جن ذخیروں سے دُور رہنے کی مسلمانوں کو تلقین فرمائی ہے، خود زمانہ حال کے جانا باز فرقہ ساز صاحب نے انہیں کیوں اکٹھا کیا ہوا ہے؟ بہ تصنیف کے اندر اُن سے استناد کس خوشی میں کیا جاتا ہے؟ یہ من مکر دم شمار حذر بکینڈ والا معاملہ کہاں تک لائق تحسین و قابلِ ستائش ہے؟

رابعاً: تفسیر و حدیث کے تمام ذخائر کو ایک طرف رکھتے ہوئے مودودی صاحب کیا مسلمانوں کو بتا سکتے ہیں کہ کسی آیت کا حقیقی مفہوم متعین کرنے کی اُن کے پاس کسوٹی کیا ہے؟ کیا اس طرح بر شخص آیاتِ قرآنیہ کے مفہوم و مطالب وہی نہ بتاتا پھرے گا جسے اُس کے دماغ نے درست قرار دے لیا ہے جبکہ ایسے ہی دوسرے محقق کے نزدیک وہ بالکل غلط بھی ہو سکتا ہے، اس حالت میں یہ فیصلہ کرنا کہ دونوں میں سے کس کی بات درست ہے؟ آخر اس کا فیصلہ کس طرح ہوگا؟ کیا اس طرح ایسا بر شخص ایک فرقہ نہ بن جائے گا اور یہ اُمتِ محمدیہ میں ایک زبردست فتنے کا دروازہ تو نہیں کھولا جا رہا؟ کیا اس صورت میں ایسے تمام محققین آپس میں دست و گریباں نہ ہوتے رہیں گے؟ کیا وہ رات دن مسلمانوں میں سر پھٹول نہ کرتے رہیں گے؟ کاش! مودودی صاحب اپنے ان نظریات کی مضرت کو محسوس کر کے آئندہ ملتِ اسلامیہ کے افراد کو فتنہ باز و فتنہ ساز بننے کی دعوت نہ دیں بلکہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی تلقین فرمایا کریں، جس کا تعین اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کے ذریعے فرمایا گیا ہے۔

کھنے کو اُن سے کہہ رہا ہوں حالِ دل مگر

ڈر ہے کہ شانِ ناز پہ شکوہ گراں نہ ہو

ملتِ اسلامیہ جو پہلے ہی متعدد فرقوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ ہر فرقہ اہل حق
فرقہ سازی سے برسہا برس بیکار تھا، اس حالت میں موصوف نے اُمتِ محمدیہ پر کرم بالائے کرم
کرتے ہوئے اُمتِ محمدیہ کو جماعتِ اسلامی کے نام سے ایک تازہ فرقہ اور محنت فرمادیا۔ اس
فرقے کی معجون مرکب کے سارے اجزاء و مابیت ہی کے جراثیم پر مشتمل ہیں لیکن اُسے مودودی صاحب
نے اپنے انا کے توام میں گوندھ کر تیار کیا ہے۔ سیاسی جماعت کے بطور یہ فرقہ منظر عام پر
آیا تھا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ایک مذہبی فرقے کی شکل اختیار کر گیا۔ مودودیت زدہ حضرات کی
نظر میں اپنے پیشوا عالیجناب مودودی صاحب کا انا اتنا بلند و بالا ہے کہ ایسے حضرات ہر
بزرگ پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ صحابہ کرام کو ہدفِ تنقید بنا ہوا خندہ پیشانی سے دیکھ سکتے ہیں مودودی
صاحب کا قلم انبیائے کرام کی عصمت اور سید الانبیاء علیہ وعلیہم الصلوٰۃ والسلام کی عظمت کو
داغدار کرنا چلا جائے تو ان کی پیشانی پر بل بازبان پر ایک حرفِ شکایت تک نہیں آتا بلکہ مرجحاً
اور زندہ باد کے نعرے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں لیکن مودودی صاحب پر اگر کوئی تنقید
کرے یا کسی طرح موصوف کا نام الف کے تلے آئے تو یہ حرکت مودودی صاحب اینڈ کمپنی
کے لیے قطعاً ناقابلِ برداشت ہے کیونکہ مودودی صاحب کو تو انبیائے کرام جیسے مقربینِ
بارگاہِ الہیہ پر تنقید کرنے کا پرمٹ ملا ہوا ہے، وہ اس حرکتِ قبیحہ کا پیدائشی حق رکھتے ہیں لیکن
کسی دوسرے کو بانیِ جماعتِ اسلامی کی کسی کو ہمالیہ سے بھی وزنی غلطی کو غلطی کہنے کا حق
دینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ یہی تو وہ افسوسناک صورت ہے جسے قرآنِ کریم میں
رَاتَّخَذُوا اَحْبَابًا لَهُمْ وَرَهْبًا لَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ مَظْهَر ایا گیا ہے۔ یہی ہے
جماعتِ اسلامی کے سومنات کا وہ سب سے بڑا بُت جس کی پورے اہتمام سے پوجا پاٹ کا
انتظام کیا ہوا ہے۔ اس جماعت کا ہر فرد اپنے اُس چلتے پھرتے بُت کے آگے جھکنا ہی
ذریعہ نجات جانتے اور مسلمانوں کو بھی اس راستے پر گامزن ہونے کی دعوت دینے میں
شبانہ روز مصروف رہتے ہیں۔

وہابیہ کے سابق دونوں فرقے (اہلحدیث و دیوبندی) یہی سلوک مولوی محمد اسماعیل دہلوی
کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اُن کے نزدیک راہِ ہدایت اور ذریعہ نجات یہی ہے، جس پر

گمازن ہونے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا اور اُس صراطِ مستقیم کا تعین فرماتے ہوئے کثرت سے یوں دُعا مانگنے کے لیے ارشاد فرمایا تھا: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔ یعنی انعام یافتہ حضرات کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جو انبیاء، صدیق، شہداء اور صالحین میں، لیکن وہابیہ کی دونوں اولین جماعتوں نے تو اس فرمانِ الہی کو بوں بدلا ہوا ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيْ كَانَ عَلَيْهِ السَّلَاطَةُ اور صِرَاطَ الَّذِيْ عَلَيْهِ السَّلَاطَةُ اور جماعتِ اسلامی کے قبیلے میں اس آیت کی رو کو عملاً بصورت دی ہوئی ہے کہ صِرَاطَ الَّذِيْ عَلَيْهِ السَّلَاطَةُ۔ اللہ تعالیٰ تجلبد مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے (آمین)

وہابیہ کی اولین جماعت کی عبرتناک ناکامی کے بعد برٹش گورنمنٹ نے کتابِ وہابیت کا دورہ ایدیشن دیوبندی جماعت کی صورت میں شائع کیا۔ یہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو گمراہ کرنے کی خاطر سُنی حنفی بن کر سامنے آئے۔ بعض غیر ضروری مسائل میں عوام الناس کو اصلاحی رنگ دکھایا اور اس طرح اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ خاطر خواہ کامیابی یوں بھی حاصل نہ ہوئی۔ ایک مرحلے پر انگریزی حکومت نے مولوی محمد الیاس کا مذہبی دیوبندی سے علاقہ میوات میں پانچو روپیہ ماہوار تنخواہ پر تبلیغ کروائی۔ رفتہ رفتہ تبلیغی سسٹم دیوبندیت کا حصہ بن گیا۔ اب یہ حال پورے عالمِ اسلام میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ حضرات سروں پر بستر اٹھائے یا مسجدوں میں ڈیرے جلتے ہوئے مار رہے جاتے ہیں۔ یہ مسلمانانِ اہلسنت وجماعت کو اپنے جال میں گرفتار کرنے، اپنا ساتھی بنا کر محمد رسول اللہ کی اُمت کے زمرے سے نکال کر محمد بن عبد الوہاب نجدی کے پیروکاروں میں شامل کرنے کی خاطر تالیفِ قلوب کے ہر ساز و سامان سے لیس ہو کر آتے ہیں۔ دراز ریش، ٹخنے ننکے، ہاتھ میں سیج، خاموشی کے مجسمے، زبانوں پر ذکرِ الہی، نگاہیں نیچی، ایک امیر کے تابع کوئی سخت کلامی سے پیش آتے تب بھی غصہ نزدیک نہیں آنے دیتے، عقیدہ پوچھو تو ہرگز نہیں بتاتے، کسی اختلافی مسئلے پر بولنا ان کے مشن سے خارج، ابتدائی مرحلہ کلمہ اور نماز کی تلقین ہے، اگلی بات مسجد میں اہلسنت کو بلا کر انہیں مولوی محمد زکریا کا مذہبی دیوبندی کا تبلیغی نصاب سنانا اور اس کے بعد اپنے جال میں پھنسنے والوں سے چلت پھرت کے لیے تین، سات، دس یا اکتالیس دن وقف کرنے کی خاطر ایڑی چوٹی کا زور لگانا اور خوشامد تک کرنا۔ اس عیاری کے باعث دیوبندی جماعت

گراہی میں اتنی کامیابی ہوئی ہے جتنی اُن کے علماء عیدوں میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ تبلیغی سسٹم کی کامیابی کو دیکھ کر مودودی صاحب نے سیاست کا جال بچایا، اسلامی نعرے لگاتے، مسلمان لیڈروں کی بعض غلط حرکات اور کوتاہیوں سے خوب فائدہ اٹھایا۔ سیاسی موضوعات کے ساتھ دینی عقائد و مسائل میں کتا ہیں لکھ کر اپنے جال میں پھنسنے والوں کے سامنے متبادل اپنالٹریچر رکھا، ہر بڑی سے بڑی ہستی میں کیڑے دکھا کر اپنی پاکبازی کا لوہا منوایا۔ اپنوں کے ذہنوں میں بنیاد کہ ہر بڑی سے بڑی ہستی کم و بیش گناہ میں ضرور ملوث ہوئی، غلطی کر گئی، لہذا اُس پر تنقید کرنا بھی عیب نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے۔ اپنی ذات کو غلطی سے مبرا اور تنقید سے بالاتر دکھایا، لہذا جماعت اسلامی کا کوئی فرد مودودی صاحب پر تنقید قطعاً برداشت نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ وہابی جس رنگ میں بھی مسلمانوں کے سامنے آئے ملت اسلامیہ کی بدخواہی اُن کی منزل مقصود رہی۔ رہنمائی کے جھبیس میں رہنری ہی کرتے رہے اور کر رہے ہیں۔ ہر وہابی جماعت کا مشن مسلمانوں کے ہاتھوں سے اللہ کی رستی کو چھڑانا اور انبیائے کرام اور اولیائے عظام کا گستاخانہ کار اُن کی متاعِ ایمانی کو لوٹنا ہے۔ ان کی غایت درجہ کوشش یہی رہی ہے کہ مسلمانوں کا رُخ حرم سے پھیر کر لندن، سومنات، نجد اور واشنگٹن کی جانب پھیر دیا جائے۔ مسلمانانِ عالم کے زوال کے اسباب میں سب سے بڑا سبب وہابیت کا ظہور ہے۔ خلافت سے لے کر بر ملک کی اسلامی حکومت تک، جسے بھی غیر مسلم طاقتوں نے تاراج کیا، اُس کی تہ میں وہابیوں کی فتنہ سمانی اور اسلام دشمنی کا رُخِ ماضور رہی ہے۔ رانھوں نے ہمیشہ غیر مسلموں کے دستِ بازو اور مسلمانوں کے مفادات پر کاری فرمیں لگائیں اور ملت اسلامیہ کے لیے مارا آستیں ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کو اقتدار سے محروم کر دانے کے بعد اُن کے خرمین اتحاد میں آگ لگانے میں مصروف رہے اور کبھی مسلمانوں کو متحد نہیں ہونے دیا۔ خود فتنوں کا دروازہ کھولنا اور خود اُسے بند کرنے کے لیے، مجاہد و مصلح کہلانے کی خاطر مہم چلانا ان کی تکنیک رہی ہے تاکہ جھولے جھالے مسلمان انہیں مصلح، ریفارمر اور ملت اسلامیہ کے بہادر وہان کر ان کے بچے لگ جائیں اور اس طرزی وحدت کا جنازہ نکل جائے۔ دوسرے گمراہ فرقے جلد مٹ جایا کرتے تھے لیکن یہ وہابیت کا فتنہ غیر مسلم طاقتوں کی بدولت دو سو سال سے پھلنا چھولتا اور اپنی جڑیں وسیع کرتا ہی جا رہا ہے۔

مُحَمَّدٌ صَادِقٌ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَسَلَّمَ نے خوارج کا یہ بھی خاصہ بتایا تھا کہ یَقْتُلُوْنَ اَهْلَ الْاِسْلَامِ
وَيَدْعُوْنَ اَهْلَ الْاَدْوَانِ - اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کی شری پسندی اور فتنہ انگیزی سے
محفوظ و مامون رکھے۔ (آمین)

۵۔ بانیِ پنچریت کے کارنامے

گاندھی نے ایک جانب انڈین نیشنل کانگرس بنا کر برٹش گورنمنٹ کے ہندوؤں کے
بارے میں جو شکوک و شبہات تھے اُنھیں دور کرنا شروع کیا اور حکومت کی حمایت کا دم بھرنا
کانگرس لیڈروں کا شعار بنا دیا اور دوسری طرف ہندو قوم کے سامنے ایسے اصول رکھے کہ چند
ہی سالوں میں دولت، تعلیم، خوشحالی اور ظاہری عزت ہندوؤں کے پاس جمع ہونی شروع
ہوگئی۔ ہندو قوم ہر لحاظ سے اتنی مضبوط و مستحکم ہوگئی کہ وہ جب چاہتے تو حکومت وقت کی چولیں
ہلا کر رکھ دیتے اور انگریز کی حکومت نہ ہوتی تو مسلمانوں کو علی الاعلان پتہا چاہاتے، کیونکہ حکومت
کی مشینری کے بیشتر کل پُرزے ہندو تھے۔

اس صورتِ حال کے ابتدائی تیور دیکھتے ہی برٹش گورنمنٹ کی نظر انتخاب نے مسلمانوں
سرسید احمد خاں صاحب کو چُن لیا۔ مسلمان قوم کو انگریزوں کے قریب لانے کی تلتین کی، تاکہ
سابقہ اور موجودہ حاکم قوموں کے درمیان جو منافرت پیدا ہو چکی تھی وہ دور ہو جائے۔ یہ اُسی صورت
میں ممکن تھا کہ ملتِ اسلامیہ کو غیرت ملی سے عاری کر کے اینگلو انڈین مسلمان بنا دیا جائے، اُن
کا رخِ حرم سے لندن کی جانب پھیر دیا جائے نیز انگریزوں اور مسلمانوں میں 'من تو شدم تو
من شدمی' والا معاملہ ہو۔ ایک انگریز اور مسلمان میں ماسوائے اس کے اور کوئی فرق نہ ہو کہ
وہ خود کو عیسائی اور یہ مسلمان کہتا رہے۔ سرسید احمد خاں صاحب اس بات پر آمادہ ہو گئے اور
اُنھوں نے ایک جانب مسلمانوں کو انگریزوں کے قریب لانے کی کوشش شروع کر دی تو
دوسری طرف اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی مہم کا آغاز کر دیا۔

اسلام ہی ایک سچا دین ہے اور اس کے علاوہ جتنے بھی مذاہب ہیں سب جھوٹے اور
باطل ہیں۔ اسلام ایسا کامل اور مکمل دین ہے جس میں کسی غیر اسلامی نظریئے کو شامل کرنے کی

تلقا گنجائش نہیں ہے۔ جھوٹے مذاہب میں سے ایک مذہب والا اگر دوسرا مذہب اختیار کر لے یا دوسرے مذہب کے قریب ہو جائے تو اُس کا اُسی طرح کچھ نہیں بگڑتا جس طرح ایک نجاست میں دوسری ملا دینے سے پلیدی میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اسلام میں باطل مذاہب کا ایک نظریہ شامل کر لینے سے وہی نتیجہ سامنے آتا ہے جو دودھ کے کسی بھرے ہوئے ٹب میں پیشاب کا ایک قطرہ ڈالنے سے برآمد ہوتا ہے کہ سارا دودھ پلید اور ناقابل استعمال۔ اسی طرح کسی مسلمان کھانے والے کا ایک غیر اسلامی نظریہ اختیار کر لینا اُس کے اسلامی دعوے کو غلط بنا دیتا ہے اور شریعتِ مطہرہ ایسے کسی بھی شخص کو مسلمان تسلیم کرنے کی روادار نہیں ہے۔

گاندھی اگر اپنی قوم کو انگریزوں اور عیسائیت کے قریب لے گیا تو اس سے ہندوؤں کی بد مذہبی میں کیا فرق آیا؟ لیکن عیسائیت کے نزدیک جانے والے مسلمانوں کے پتلے کیا رہ گیا؟ دین و ایمان سے ہاتھ دھونے کے بعد اگر دولت و وجاہت ہاتھ بھی آئی تو یہ دنیاوی زینت آخرت میں کس کام آئے گی جبکہ ایمان جیسی متاعِ عیزِ زمینی گنوا دی جس پر اُخروی نجات کا دار و مدار ہے۔

سر سید احمد خاں صاحب نے مسلمانوں کو برٹش گورنمنٹ کے قدموں میں جھکانے کی جو کوشش کی اُس کے بارے میں موصوف اور اُن کے حامیوں کے چند بیانات باب چہارم میں پیش کیے جائیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں صرف یہ پہلو اجاگر کرنا ہے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کو عیسائیت کے نزدیک لے جانے نیز اسلام اور عیسائیت کا فرق مٹانے کی کہاں تک کوشش کی؟ ہمارے مذکورہ بالا خیالات کو سر سید احمد خاں صاحب کے دستِ راست یعنی خواجہ الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی کے مندرجہ ذیل بیان کی روشنی میں پرکھا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

”سر سید نے غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جن دو باتوں کو مسلمانوں کی آئندہ بہبود کے لیے ضروری سمجھا تھا، اُن کے لیے انگلستان کا سفر کرنا ضروری تھا۔ اُن کا خیال یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں میں مغربی تعلیم نہ پھیلے گی اور جب تک مسلمانوں اور انگریزوں میں موانست اور میل جول پیدا نہ ہوگا اُس وقت تک مسلمانوں کا پنپنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا دشوار ہے۔ گو وہ اب تک ان دو تدبیروں میں

برابر سرگرم رہے مگر جس حد تک وہ اپنا منصوبہ پورا کرنا چاہتے تھے اُس کے لحاظ سے ان کو ولایت کا سفر کرنا ضروری معلوم ہوا۔ ۱

ہوسکتا ہے کہ یہاں کوئی صاحب یہ فرمانے لگیں کہ مذکورہ بیان سے مغربی تعلیم کا حصول اور انگریزوں سے میل و جول کی کوشش تو ضرور ثابت ہوتی ہے لیکن اسے عیسائیت کے قریب لے جانا قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ سرستید احمد خاں صاحب نے قرآن کریم کی ایک تفسیر بھی لکھی تھی، جس میں آیات قرآنیہ کے مفہوم و مطالب ساری اُمت محمدیہ کے برعکس اور یہی کچھ بتائے ہیں۔ حالی صاحب اس تفسیر کی توصیف میں یوں رقمطراز ہیں :

”الحمد للہ اس حق گو تفسیر کی بدولت روحانی مہلک بیماریوں کو آج غسلِ صحت ملا۔ مسلمانوں کے پاک دلوں میں وہ گندی گندی باتیں جمی ہوئی تھیں جیسے کچے ہیں مہتاں۔ اب اُن کا ایک بیک دور ہونا خدا کے مقدس کلام کی سچی تفسیر کا نتیجہ ہے۔ ہم اس احسان کے بدلے اپنی کمال کی جوتیاں بنا دیں تو حضرت کی تفسیر کے ایک فقرے کا معاوضہ ہوگا۔“ ۲

سرستید احمد خاں صاحب نے بائبل کی تفسیر بھی لکھی اور عیسائی حضرات کو اطمینان دلانے کے لیے اپنا مطلع نظریوں بیان کیا :

”یقیناً میں بھی بائبل کا اتنا ہی طرف دار اور مؤید ہوں جس قدر کہ آپس ہیں۔ میرا مقصد ہے کہ میں ڈاکٹر کلنز کے اعتراضات کا اپنی تفسیر کے مناسب حصوں میں، جب اُن کا موقع آئے، جواب دوں۔“ ۳

مذکورہ تفسیر کے بارے میں خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنے تاثرات یوں سپرد قلم کیے تھے :

”یہ تفسیر جو انجیل کو بجائے لغو سمجھنے کے جیسا کہ اب تک خیال تھا، واجب التعمیم بیان کرتی ہے، اور اس کا ثبوت خود قرآن سے دیتی ہے، اس قابل ہے کہ

اس کا ترجمہ مسلمانوں کی ہر زبان میں اور بالخصوص عربی میں ہو کیونکہ مسلمانوں کے واسطے سے اس سے منید بات اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ انجیل کو اُسی عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں جس نگاہ سے وہ قرآن کو دیکھتے ہیں، لے

جناب عالی صاحب کے آخری الفاظ بار بار پڑھنے کے قابل ہیں۔ کیا اب بھی کوئی شک و شبہ باقی رہ گیا کہ مسلمانوں کو ایمان سے محروم کر کے نیم عیسائی بنانے کی یہ ایک پراسرار سازش تھی جس کا جال برٹش گورنمنٹ نے پھیلایا اور سر سید احمد خاں صاحب نے حکومت کے اس منصوبے کو کامیابی سے ہمتا کر کے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ موصوف نے اسی منصوبے کے تحت پورے دین میں ترمیم کی اور حکومت کے اشارے پر ایسا اسلام مرتب کیا، جس کے پیروکار اور ایک کھلے غیر مسلم میں ماسوائے مسلم اور غیر مسلم کہلانے کے اور کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ سر سید احمد خاں صاحب نے مقدس اسلام میں جو کتر بیونت کی اُس کا خلاصہ جناب عالی پانی پتی نے یوں پیش کیا ہے :

۱۔ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔

۲۔ قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔

۳۔ تقلید واجب نہیں ہے۔

۴۔ قرآن کا کوئی حکم جو ایک آیت میں بیان ہوا تھا کسی دوسری آیت سے منسوخ نہیں ہوا اور نہ قرآن کی کسی آیت کی تلاوت منسوخ ہوئی اور سورہ بقرہ کی اس آیت سے کہ ما ننسخ من آية او ننسخها۔ قرآن کی کسی آیت کا نسخہ اور کسی کا منسوخ ہونا مراد نہیں ہے بلکہ اُس کا بعض آیتوں سے شرائع سابقہ کے بعض احکام کا منسوخ ہونا مراد ہے۔ ۵۔ قرآن میں کسی طرح کی زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل واقع نہیں ہوا۔ وہ جس طرح اور جس قدر نازل ہوا تھا اُسی قدر زمانہ نزول سے آج تک محفوظ ہے اور جن روایتوں سے زیادتی یا کمی یا تغیر و تبدل کا ہونا بعض صحابہ کے اقوال سے قرآن کا توارد ہونا پایا جاتا ہے وہ سب موضوع ، وہ مفتر ہی ہیں۔

۶۔ صحاح ستہ بلکہ صحیحین کی بھی تمام حدیثوں کو، حسب تک اصول علم حدیث کے موافق اُن کی جانچ نہ کی جائے، قابل وثوق نہیں سمجھنا چاہیے۔

۷۔ شیطان یا ابلیس کا لفظ جو قرآن مجید میں آیا ہے اُس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے، بلکہ خود انسان میں جو نفسِ آمارہ یا قوتِ بہیمیہ ہے، وہ مراد ہے۔

۸۔ طبور متخفہ جن کو نصاریٰ نے گلا گھونٹ کر مار ڈالا ہو، مسلمانوں کو اُن کا کھانا حلال ہے۔

۹۔ چونکہ خبر واحد میں احتمالِ صدق و کذب باقی رہتا ہے، اس لیے جو اعتراض اخبارِ اعدا کی بنا پر اسلام کی نسبت کیے جاتے ہیں، اسلام اُن کا جواب دہ نہیں ہے۔

۱۰۔ سوا اُن کفار و مشرکین کے جن کا قرآن کی اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یا جو اس آیت کے مصداق ہوں کہ: **انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخرجکم من ديارکم و ظاہروا علیٰ اخرجکم ان توؤھم**۔ تمام کفار و مشرکین سے دوستی و مولات کرنا جائز ہے۔

۱۱۔ عہدِ عتیق اور عہدِ جدید کی کتابوں میں تحریفِ لفظی واقع نہیں ہوئی بلکہ صرف تحریفِ معنوی ہوئی ہے مگر اسی کے ساتھ اُن کا اَوَّل سے آخر تک الہامی ہونا اور غلطی سے پاک ہونا غیر مسلم ہے۔

۱۲۔ ہر شخص اُن مسائل میں جو قرآن یا حدیثِ صحیح میں منصوص نہیں ہیں، آپ اپنا مجتہد ہے۔

۱۳۔ حضرت باجرہ جو اسمعیلؑ کی ماں ہیں وہ جیسا کہ بعض روایتوں میں مذکور ہے، درحقیقت لونڈی نہ تھیں بلکہ رقیون بادشاہِ مصر کی بیٹی تھیں۔ رقیون نے اُن کو صرف تربیت کے لیے حضرت سارہ کے ساتھ کر دیا تھا۔

۱۴۔ وضع و لباس وغیرہ میں کفار کے ساتھ تشبیہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔

۱۵۔ قرآن کی کسی آیت سے جبر پر اور کسی سے قدر پر استدلال کرنا، جیسا کہ متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کی نائید کے لیے کیا ہے، مقصدِ شارع کے برخلاف ہے کیونکہ جن آیتوں سے اس مسئلہ کو استنباط کیا جاتا ہے، اُن آیتوں سے بندوں کے مجبور یا مختار ہونے کا تصفیہ کرنا مقصود نہیں ہے ورنہ آنحضرت مسئلہ مذکور کے متعلق بحث کرنے والوں پر غضب ناک ہو کر یہ نہ فرماتے کہ: **اَیْہَذَا اُمِرْتُحَامَ بِہَذَا**

اُمِّ سَلْتُ۔

۱۶۔ معراج اور شق صدر دونوں رُویا میں واقع ہوئے ہیں نہ کہ بیداری میں، کیا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور کیا مسجد اقصیٰ سے آسمانوں تک۔

۱۷۔ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فردِ مخلوقات موجود ہے اسی طرح اُس سے بالاتر مخلوقات، جس کا ہم کو علم نہیں، موجود ہو، لیکن ملائک یا ملائکہ کے الفاظ جو قرآن میں وارد ہوئے ہیں اُن سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے مختلف قویٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے مادے میں ودیعت کیے ہیں جیسے پہاڑوں کی صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، برق کی قوتِ جذب و دفع و امثال ذالک، انہیں کو ملائک یا ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

۱۸۔ آدم اور ملائکہ اور ابلیس کا قصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعے کی خبر نہیں ہے بلکہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرائے میں انسان کی فطرت اور اُس کے جذبات اور قوتِ بہیمیہ جو اُس میں ودیعت کی گئی ہے، اُس کی بُرائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے اور اس قسم کی اور بھی متعدد تمثیلیں قرآن میں موجود ہیں۔

۱۹۔ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا۔

۲۰۔ قرآن میں آنحضرت صلعم سے کسی معجزہ کے صادر ہونے کا ذکر نہیں ہے۔

۲۱۔ آیہ: الذین اتینہم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم میں جو ضمیر مفعول لفظ یعرفونہ میں ہے، وہ جیسا کہ عام مفسرین لکھتے ہیں، آنحضرت کی طرف عائد نہیں ہوتی بلکہ جیسا ابن عباس، قتادہ، ربیع اور ابن زید سے منقول ہے تحویلِ قبیلہ کے معاملے کی طرف پھرتی ہے، جس کا ذکر اس آیت سے پہلے اور اس کے بعد کیا گیا ہے۔

۲۲۔ آیت میراث سے وصیت کا حکم، جو آیت وصیت میں والدین اور دیگر ورثاء کے لیے تھا، منسوخ نہیں ہوا۔ پس جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے۔

۲۳۔ جو لوگ مشکل سے روزہ رکھتے ہیں وہ آیہ: وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعمام مسکین کے بموجب روزوں کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔ بعض دیگر علماء فدیہ کی

اجازت کو خاص کر معتر لوگوں کے لیے مخصوص سمجھتے ہیں مگر مسیح کے نزدیک یہ حکم عموماً سب لوگوں کے لیے ہے جن کو روزہ رکھنا شاق ہو، خواہ بڑھے ہوں اور خواہ جوان۔ لیکن بہ نسبت فدیہ دینے کے اُن کو روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۲۴۔ جس رب یعنی سُود کی حرمت قرآن میں بیان ہوئی ہے، اُس سے اُسی قسم کا رب مراد ہے جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں عرب میں جاری تھا اور جس کی مثال ہمارے ملک کے سُود خواروں اور ریتلیوں میں، جن کا پیشہ سُود خاری ہے، پائی جاتی ہے۔ مگر اُس سے اُس منافع کی حرمت جو پرامیٹری نوٹوں پر لیا جاتا ہے ثابت نہیں ہوتی۔ اس کے سوا کسی گورنٹ یا کمپنی کو جو ملک کی ترقی کے لیے روپیہ قرض لے، اُس کو سُود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کا رفاہ عام کے کام کے لیے چندہ جمع کرے، اُس روپیہ کا سُود میں لگانا اور اُس کے منافع سے رفاہ عام کے کام کرنا، یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔

۲۵۔ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر اُٹھایا جانا ثابت ہو۔

۲۶۔ شہداء کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ اُن کو مُردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں، اس سے اُن کا علو درجات اور روحانی خوشی اور دنیا میں مثال قابلِ تقلید چھوڑنا مراد ہے، نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے پیتے ہیں۔

۲۷۔ صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے اُس سے فی الواقع کوئی آلہ مثل زنجبک یا سنگھیا تری یا قرنا کے مراد نہیں ہے بلکہ یہ محض استعارہ ہے کہ جس طرح تری کی آواز پر لشکر جمع ہوجاتے ہیں اسی طرح خدا کی مشیت اور ارادہ سے لعل و حشر واقع ہوگا۔

۲۸۔ خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور اسماء و افعال کے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز و استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا ہے اور اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ بھی سب مجاز پر محمول ہے نہ حقیقت پر۔

۲۹۔ قرآن میں جو خدا کا زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنا بیان ہوا ہے، اس سے کسی واقعہ کی خبر دینی مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہودیوں کے اس اعتقاد کی تردید مقصود ہے کہ

خدا تعالیٰ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کے بعد ساتویں دن آرام لیا اور اسی لیے جو کچھ اُن کا عقیدہ خلقِ زمین و آسمان کی نسبت تھا اُس کو قرآن میں اُسی طرح بیان کر کے فرمایا کہ وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُغُوبٍ۔ کیونکہ شارع کا مقصد حقایقِ اشیاء سے بحث کرنا یا جو باتیں حقائق کے برخلاف ہوں اُن پر رد و قدح کرنا نہیں ہے بلکہ جو خیالات لوگوں کے دل میں خدا کی وحدانیت اور قدرت و عظمت کے خلاف تہہ نشین ہوں اُن کا زائل کرنا ہے۔

۳۔ قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں بدیاں اور بد اخلاقیات پھیل جانے کے بعد اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہونا اور کسی قوم کو آندھی اور طوفان سے، کسی کو زلزلہ سے، کسی کو ٹڈیوں اور دیگر وحشرات کے مسلط کرنے سے اور کسی کو کسی اور کسی کو کسی عذاب سے زیادہ کرنا بیان ہوا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت اُن کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے بلکہ ابتداءً آفرینش سے یہ خیال تمام قوموں میں چلا آتا تھا کہ جو ہولناک حادثے دنیا میں واقع ہوتے ہیں وہ انسان کے گناہوں کی کثرت کے سبب ہوتے ہیں اور انبیائے کرام کا کام یہ ہے کہ جن خیالات پر لوگ مجبول ہوئے ہیں اگر وہ خیالات مقاصدِ نبوت کے منافی نہیں ہیں بلکہ اُن کی تائید کرنے والے ہیں تو وہ اُن خیالات کی صحت یا غلطی سے کچھ تعرض نہیں کرتے بلکہ اُنہیں خیالات کے موافق اُن سے خطاب کرتے ہیں۔

۴۔ خدا کا دیدار کیا دنیا میں اور کیا عقبیٰ میں، نہ ان ظاہری آنکھوں سے ممکن ہے اور نہ دل کی آنکھوں سے۔

۵۔ قرآن مجید میں جو جنگِ بدر و حنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے، اُس سے اُن لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا۔

۶۔ صفاتِ باری تعالیٰ عین ذات ہیں، نہ غیر ذات اور نہ لایین و لا غیر، جیسا کہ اشاعرہ کا مذہب ہے۔

۷۔ حضرت عیسیٰ کا بنِ باب کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔

۸۔ کوئی امر عادتِ الہی اور قانونِ طبیعتی کے خلاف بھی وقوع میں نہیں آتا۔

۳۶۔ قرآن میں جو کفار سے بطور معارضہ کے کہا گیا ہے کہ تم کو اس کتاب کے مِنْ عِنْدِ اللّٰہ ہونے میں شک ہو تو اس کی مثل کوئی سورت یا چند آیتیں تم بنا لاؤ۔ اس سے جیسا کہ اکثر اہل اسلام خیال کرتے ہیں، یہ مراد نہیں ہے کہ ایسا فصیح کلام تم نہیں بنا سکتے بلکہ یہ مراد ہے کہ ایسا کلام جو عالم اور فلسفی اور حکیم سے لے کر جاہلوں، صحرانشین بد دود اور اونٹ چرانے والوں تک سب کی ہدایت کے لیے یکساں مفید اور سب کی سمجھ اور علم کے موافق ہو، بنا لینا تمہاری طاقت اور قدرت سے باہر ہے۔

۳۷۔ نبوت کا ملکہ نبی کی اصل فطرت میں ودیعت ہوتا ہے اور جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ اَلنَّبِيُّ نَبِيٌّ وَلَوْ كَانَ فِي بَطْنِ اُمَةٍ۔ وہاں کے پیٹ سے نبی ہوتا ہے اور جس طرح تمام ملکات اور قویٰ فطری بتدریج ترقی کرتے ہیں، اُسی طرح ملکہ نبوت بتدریج ترقی پاتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ کمال کے درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اُس سے وہ ظہور میں آتا ہے جو اُس کا مقتضی ہوتا ہے اور جس کو عرف عام میں بعثت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس لیے جو وحی اُس پر نازل ہوتی ہے وہ کسی اعلیٰ یا قاصد (یعنی فرشتہ) کی وساطت سے نازل نہیں ہوتی بلکہ خود بخود ایک چیز اُس کے دل سے اُٹھتی ہے اور اُسی پر گرتی ہے

۳۸۔ قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوائی آگ کے شعلے سے پیدا ہوئے ہیں اور اُن میں مرد و عورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ، ثابت نہیں ہوتا۔

۳۹۔ انبیائے بنی اسرائیل اور قوم بنی اسرائیل کے قسے جو قرآن میں بیان ہوئے ہیں، اُن میں جس قدر باتیں بظاہر قانون فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، وہ سب درحقیقت اُس کے مطابق بیان کی گئی ہیں مگر مفسرین اہل اسلام نے یہودیوں کی پیروی سے اُن کے معانی ایسے بیان کیے ہیں جو قانون فطرت کے خلاف ہیں۔

۴۰۔ طوفانِ نوح جس کا ذکر قرآن مجید میں متعدد جگہ آیا ہے، عام نہ تھا بلکہ اُسی قوم اور اُسی ملک میں محدود تھا، جس پر حضرت نوح مبعوث ہوئے تھے۔

۴۱۔ حضرت اسماعیل کی ولادت کے وقت حضرت سارہ کی عمر اُس حد کو نہیں پہنچی تھی جبکہ عادیۃً اولاد کا

ہونا غیر ممکن ہے۔ لہ

نوٹ : اس سے بھی بڑھ کر سرسید احمد خاں صاحب نے چند مسائل و نظریات کے ذریعے شریعت محمدیہ کو غیر بود کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ مسلمان اپنی ایمان جیسی متاعِ عزیز کو گمراہ صرف اینگلو انڈین مسلمان بن جائیں۔ یہ چنانچہ موصوف نے اُمتِ محمدیہ سے ایسے جتنے نظریات میں اختلاف کیا اُن کا خلاصہ عالی پانی پتی کے لفظوں میں گزشتہ ترتیب کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

۴۲۔ اسلام نے غلامی کو ہمیشہ کے لیے موقوف کر دیا ہے اور آیہ من و فدا جو سورہ محمد میں ہے وہ نہایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے۔

۴۳۔ دعا ایک قسم کی عبادت ہے جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے الدعاء هو العبادۃ، پس دعا کے مستجاب ہونے سے اُس کا مطلب جس کے لیے دعا کی جاتی ہے، حاصل ہونا مراد نہیں ہے بلکہ جو معنی عبادت کے قبول ہونے کے ہیں، وہی معنی دعا کے مستجاب ہونے کے ہیں۔

۴۴۔ آیت یا آیاتِ بینات کے الفاظ جو قرآن مجید میں جا بجا آتے ہیں اُن سے وہ احکام یا مواعظ و نصائح مراد ہیں، جو خدا تعالیٰ نے بذریعہ وحی کے انبیاء پر نازل فرمائے ہیں، نہ کہ معجزات، جیسا کہ عموماً علمائے اسلام نے بیان کیا ہے۔

۴۵۔ حضرت عیسیٰ کی نسبت جو یہودی کہتے تھے کہ ہم نے اُن کو سنگسار کر کے قتل کیا اور عیسائی کہتے تھے کہ یہودیوں نے اُن کو صلیب پر قتل کیا تھا، یہ دونوں قول غلط ہیں بلکہ بلاشبہ وہ صلیب پر چڑھانے لگے مگر صلیب پر موت واقع نہیں ہوئی اور اسی لیے قرآن میں وما قتلوه وما صلبوه کے الفاظ واقع ہوئے ہیں، جس سے یہ مراد ہے کہ موت مصلوب کرنے سے مقصود تھی، وہ واقع نہیں ہوئی۔

۴۶۔ اگر مرد کو یہ احتمال بھی ہو کہ متعدد ازواج میں عدالت کر سکے گا، تو اُس کو ایک سے زیادہ

جو روکی اجازت نہیں ہے۔

۴۷۔ سارق کے لیے قطع ید کی سزا جو قرآن میں بیان ہوئی ہے لازمی نہیں ہے کیونکہ اگر لازمی ہوتی تو فقہاء اُس کو مال مسروقہ کی ایک خاص مقدار کے ساتھ مشروط نہ کرتے اور نیز صحابہ کے وقت میں متعدد موقعوں پر سزائی کو صرف قید کی سزا نہ دی جاتی۔

۴۸۔ قرآن میں جہنم اور اجتناب کے الفاظ سے چھپے ہوئے پہاڑی اور صحرائی لوگ مراد ہیں، نہ کہ وہ وہی مخلوق جو دیو اور جُھوت وغیرہ کے الفاظ سے مفہوم ہوتی ہے۔

۴۹۔ سورہ فیل میں جن الفاظ سے اصحاب فیل پر ابابیل کا نکر یاں پھینکنا مراد لیا جاتا ہے وہ درحقیقت مرض چھپ سے استعارہ ہے، جس کی نسبت تاریخ سے ثابت ہے کہ پہلے پہل مرض چھپ عرب میں اُسی سال نمودار ہوا جبکہ ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کی تھی۔

۵۰۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ اور تمام انبیائے سابقین کے قصوں میں جس قدر واقعات بظاہر خلاف قانون فطرت معلوم ہوتے ہیں، جیسے ید بیضا، عصا کا اُتر دیا بن جانا، فرعون اور اُس کے لشکر کا غرق ہونا، خدا کا موسیٰ سے کلام کرنا، پہاڑ پر تجلی کا ہونا، گوسالہ سادک کا بولنا، ابر کا سایہ کرنا، من و سلویٰ کا اُترنا، عیسیٰ کا گہوارہ میں بولنا، خلق طیر، اندسوں اور کوڑھیوں کو چنگا کرنا، مردوں کو زندہ کرنا، مائدہ کا نزول وغیرہ وغیرہ اُن کی تفسیر میں جو کچھ سرسید نے لکھا ہے وہ غالباً پہلے کسی مفسر نے نہیں لکھا۔

۵۱۔ قرآن مجید میں دو طرح کا کلام پایا جاتا ہے: ایک مقصود اور دوسرا غیر مقصود۔ پس جو کلام غیر مقصود ہے اُس سے کسی بات کے اثبات یا نفی پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کفار کے رحمتِ الہی سے محروم ہونے کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ: لَا تَقْتُمْ لَكُمْ اَبْوَابَ السَّمَاءِ چونکہ اصل مقصود اُن کے حرمان کا بیان ہے اور اُس کو اس پر ایسے میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے اس کلام کو غیر مقصود سمجھا جائے گا اور اس سے اس بات پر کہ آسمان میں فی الواقع دروازے موجود ہیں، استدلال نہ ہو سکے گا۔

۵۲۔ شریعتِ اسلامیہ میں تمام احکام دو قسم کے ہیں: ایک اصلی اور دوسرے محافظ احکام اصلی جن احکام پر اسلام کی بنیاد قائم ہے وہ صرف احکام اصلی ہیں، جن میں حکم ایسا نہیں کہ قانون

فطرت کے خلاف ہو، اور دوسری قسم کے احکام سے فقط احکام اصلی کی محافظت مقصود ہے نہ یہ کہ وہ خود مقصود بالذات ہیں۔ پس اُن کی نسبت یہ بحث بالکل بے محل ہے کہ وہ قانون فطرت کے مطابق ہیں یا نہیں۔ لیکن چونکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں اس لیے عملاً دونوں کا درجہ برابر ہے۔ مثلاً نماز کے متعلق اصلی حکم صرف توجہ الی اللہ ہے، باقی جس قدر احکام اس سے متعلق ہیں مثل وضو و قیام و قعود و رکوع و سجود اور استقبال قبلہ وغیرہ سب اس کے محافظ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مرض یا عذر کی حالت میں سب ساقط ہو سکتے ہیں مگر توجہ الی اللہ کسی حالت میں ساقط نہیں ہوتی۔ لیکن جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو دونوں کا بجالانا ضروری ہے۔

شریعتِ مطہرہ کو انگیز بہادر کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر باز بچہ اطفال بنا کر یوں بیدری سے پامال کرنا جس شخص نے اپنا شعار بنالیا ہو اور مسلمانوں کو علی الاعلان ایسا ہی مسلم نما عیسائی بننے کی دعوت دیتا رہا ہو، چاہے تو یہی تھا کہ اسلام کی حقانیت پر یقین رکھنے والے اُس سے کڑھ کش رہتے اور اکثر حضرات نے ایسا ہی کیا لیکن برٹش گورنمنٹ کے چکاریوں نے اُس دشمنِ دین و ایمان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلا بے ملائے شروع کر دیے۔ چنانچہ خواجہ نظام حسین حالی نے لکھا ہے:

سر سید احمد خاں کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسانات ہیں، انہیں میں سے ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک ایسی بے بہا زندگی کا نمونہ چھوڑ گئے ہیں، جس سے بہتر ہم اپنی موجودہ حالت کے مطابق کوئی نمونہ قوم کی تاریخ میں نہیں پاتے۔

خدا کا شکر ہے کہ سر سید احمد خاں صاحب کا جاری کردہ نیچری فرقہ کبھی کا اپنی موت مر چکا ہے لیکن اُس کے زہریلے اثرات تاحال مسلمانوں کے خرمینِ دین و ایمان کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔

زیادہ تر اس شخصیت کا شکار سکولوں اور کالجوں کا تعلیم یافتہ طبقہ ہوتا ہے اور دوسری جانب پر ویزیت وہی سرسید احمد خاں کی صدائے بازگشت بنی ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو سچی ہدایت نصیب فرمائے۔ آمین

سرسید احمد خاں بھی وہابی تھے۔ مولوی ملوک علی صاحب کی سرکردگی میں جو دہلی کالج سے حکومت اپنے مقصد کے لوگوں کی کھپی تیار کروا رہی تھی آنجناب بھی اُن میں سے ایک تھے۔ دیوبندی اور نیچری فرقوں کا بیک وقت دیوبند اور علی گڑھ سے ظہور ہوا تھا۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہوتے ہیں، اسی طرح ہر تخریب کار کی تصویر کے دونوں رخ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک جانب سے وہ بد صورت معلوم ہوتا ہے تو دوسری جانب سے حسین و جمیل۔ رادھر سے دیکھیں تو تخریب کار نظر آئے گا اور دوسری طرف سے مصلح و رفیقا مر۔ اس سمت سے مکمل بدخواہ نظر آتا ہے تو اُدھر سے خیر خواہ۔ یہ دو غلطی ہی ایسے حضرات کو منزل مقصود تک پہنچاتا ہے۔ ان کا مقصد تخریب کاری اور اہل دین کی بدخواہی ہوتا ہے تاکہ کسی سے منہ مانگا انعام پاسکیں، لیکن جب اہل علم و دانش اُن کی حرکتوں سے آگاہ ہو کر باز پرس کرتے اور عوام الناس کو اُن کے شر سے محفوظ رہنے کی ہدایت کرتے ہیں، تو ایسے حضرات اپنی دوغلی تصویر کا دوسرا رخ سامنے کر دیتے ہیں کہ دیکھیے صاحب اِنَّ مَعَكُمْ طَائِفًا مِّنْهُمْ مُّصْلِحُوْنَ ۝ لیکن علمائے کرام اُن کے دھوکے میں آنے والے کہاں؟ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہ نئے لباس میں وہی پُرانے بہرو پیے آرہے ہیں جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: اَدَاٰتُهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہمیشہ علمائے اہلسنت و جماعت سے وابستہ رہیں اور اسی دین و مذہب کو اپنا مقصد حیات بنائے رکھیں جس پر اللہ تعالیٰ کے جملہ مقبول بندے چل کر دونوں جہانوں کی کامیابی حاصل کر گئے اور جن کا نام آج تک مخلوق خدا کی زبانوں پر بصد عزت و احترام آتا ہے اور ہر صاحب عقل و دانش اُن کی عقیدت کا دم بھرنے پر مجبور ہے۔ اُن حضرات کے راسخ کے علاوہ جو کسی اور راستے پر چلنے کی تلقین کرے یا اہلسنت و جماعت کے مذہب کو یا اُس کے بعض عقاید و نظریات کو اپنی تحقیق کے سانچے میں ڈھالے اور اپنے عقلی ڈھکسلوں کو قرآن و حدیث کا حاصل اور شریعت مطہرہ کا منشا بتائے وہ رہبر کے بھیس میں رہن رہے۔ ایسے

جلد حضرت سے مسلمانوں کو ہر وقت خبردار رہنا چاہیے۔ یعنی: ۷
 بخوبی جانچ کر لے جنس کی بازار ہستی میں
 فریب ران جو فروشوں سے نہ کھا گندم نمائی کا

۶۔ بانی خاکسار پارٹی کے کارنامے

جناب عنایت اللہ مشرقی (المتوفی ۱۳۸۳ھ / ۱۹۶۳ء) اس تحریک کے بانی تھے۔
 شروع میں خاکسار پارٹی ایک سیاسی جماعت کے بطور نمودار ہوئی۔ پیلچہ اُن کا علامتی نشان تھا۔
 بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہندی مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ ان کا نصب العین ہے لیکن
 حقیقت میں یہ بھی برٹش گورنمنٹ کی ایک پراسرار اور خوشنما چال تھی۔ مشرقی صاحب کے بارے
 میں پیرزادہ بہاء الحق قاسمی امرت سری نے مؤخر خلافت قاہرہ کے پیش نظر لکھا تھا:

’نام نہاد مؤخر خلافت قاہرہ مصر منعقدہ ۱۳ مئی ۱۹۲۶ء میں جب طحہ عنایت اللہ
 مشرقی ہندی مسلمانوں کا خود ساختہ نمائندہ بن کر شریک ہوا تو ہندوستان
 اور ترکی و مصری اخبارات نے مشرقی کو برطانوی جاسوس قرار دیا۔ چنانچہ
 روزنامہ ’زمیندار‘ لاہور نے، جو آجکل اپنی مخصوص مصلحتوں کے ماتحت اسی
 جاسوس کی تحریک خاکساری کا بہت بڑا حامی ہے، ۴ جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت
 کے صفحہ ۱ پر اخبار البلاغ مصر مجریہ ۵ جون ۱۹۲۶ء کے ایک مقالہ کا ترجمہ شایع
 کیا، جس میں ترکی کے مشہور اخبار ’وقت‘ کے حوالہ سے مشرقی کو برطانوی
 جاسوس کہا گیا تھا۔ اس پر خود مدیر زمیندار نے جولائی ۱۹۲۶ء کی اشاعت
 کے صفحہ ۱ پر لکھا ہے:

’ہم نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ بعض حلقوں میں یہ شبہ کیا جا رہا ہے
 کہ مشرقی صاحب کی حیثیت طوطی پس آئینہ کی ہے اور اُن کی یہ نقل و حرکت
 اپنے استاذ ازل کے ایماء و اشارہ کا نتیجہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے لکھا تھا
 کہ اگر یہ شبہ غلط اور بے بنیاد ہے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ بے تعلقی کا اعلان

اور شیطان سے مراد وہ حیوانی طاقت ہے (جو انسان میں کھانے پینے کے لیے موجود ہے۔ اس کے بعد) اُس نے (اپنی خرافات کو جاری رکھتے ہوئے) وہ خیالات پیش کیے ہیں جن کو کوئی ایمان دار بلکہ عقلمند بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔ پھر تعجب ہے (کہ ان خرافات کے متعلق زور سے لکھتا ہے) کہ یہی حق اور اصل اسلام ہیں اور اُس کا دعویٰ ہے کہ میرے سوا قرآن مجید کو (کسی نے آج تک نہیں سمجھا) اور اُسے یہ بھی دعویٰ ہے کہ اس وقت (مسلمانوں کا) امیر (اور خلیفۃ المؤمنین) میں ہی ہوں۔ پھر حکم دیتا ہے کہ زکوٰۃ مجھے دیا کرو (اور یہ بھی کہتا ہے کہ) میرا بیت المال ہی صدقات کا صحیح مصرف ہے۔

(علاوہ بریں) اپنے ہفتہ وار اخبار الاصلاح میں اور اپنے رسالہ مولوی کا غلط مذہب میں اور اپنی اردو تفسیر میں اور اپنی کتاب اشارات میں وہ خیالات پیش کیے ہیں جو امت محمدیہ کے عقاید کو پاش پاش اور اجماع امت کی بوٹی بوٹی کرتے ہیں اور قرآن مجید کی قطعی آیات اور متواتر احادیث نبویہ کے صریح خلاف ہیں۔ دیکھو مقدمہ عربیہ صفحات مندرجہ ذیل..... (تاکہ) اُس کی خرافات کا آئینہ (آپ کے سامنے آجائے) بغرضیکہ اُس کے یہ چند خیالات منٹے نمونہ از خردارے ہیں۔ علاوہ بریں ایک اور عجیب خرافات پر بھی ہے اور بڑے دعوے سے کہتا ہے کہ علمائے ازہر نے مجھے علامہ کا خطاب دیا ہے اور میری تفسیر کی نہایت تعریف کی ہے۔ اب ان خرافات کے متعلق جناب کی رائے کیا ہے؟ اور اُس تفسیر کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ جو ان امور پر مشتمل ہے اور اس شخص کے متعلق اور اس کے فہم قرآن کے متعلق کیا فتویٰ ہے؟ (اور یہ بھی بتایا جائے کہ) کیا واقعی علمائے ازہر نے اس کتاب کو دیکھ کر اسے علامہ کا خطاب دیا ہے؟

المستفتی: عبداللہ شاہ مبلغ اسلام پشاور۔ ہندوستان

لے بہاء الحق قاسمی، مولوی، ضرب کاری بر مذہب خاکساری، ص ۳ تا ۶

اس استفادہ کا جامعہ ازہر کے بزرگ ترین عالم علامہ یوسف الدجوی الماکی نے عربی میں طویل جواب لکھا اور اُن کے فتوے پر چھ علمائے کرام کی تصدیق مع مُہر و دستخط ہیں، جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :

- ۱۔ شیخ مصطفیٰ حامی، شاہی خطیب، مسجد زینبی، قاہرہ، مصر۔
- ۲۔ علامہ محمد حبیب اللہ الشنقیطی، نائب پرنسپل، جامعہ ازہر، مصر۔
- ۳۔ شیخ عبد الرحمن الجزیری الشافعی، استاد جامعہ ازہر، مصر۔
- ۴۔ علامہ محمد زاہر الکوثری شیخ الاسلام، وکیل دولت عثمانیہ، ترکیہ۔
- ۵۔ شیخ مصطفیٰ صبری، سابق شیخ الاسلام، ترکی۔
- ۶۔ شیخ خلیل خالدی حنفی، خطیب بیت المقدس۔

مذکورہ فتوے کے بارے میں ابوالعباس جناب پیرزادہ محمد بہاء الحق قاسمی نے مشرقی صحابہ کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے بعض ضروری امور کی وضاحت بھی فرمائی ہے۔ موصوف کا وہ بیان قارئین کرام کی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر پیش خدمت ہے:

عنایت اللہ مشرقی کے پیش نظر کوئی تعمیری پروگرام قطعاً نہیں۔ اُس کا مقصد وحید تخریب اور صرف تخریب ہے۔ علمائے کرام کا وجود باوجود اُس کے تخریبی پروگرام کی تکمیل میں چونکہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اس لیے وہ ان حضرات کے خلاف مرزا غلام احمد قادیانی اور دوسرے اعدائے اسلام کی طرح منافرت پھیلا کر اپنے طعنانہ مقاصد کی اشاعت کے لیے راستہ صاف کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے ہندوستان کے علمائے کرام کو گالیاں دیں کیونکہ یہی حضرات اُس کے فریب سے آگاہ تھے اور انہیں سے اُس کو واسطہ پڑنا تھا۔ لیکن مصر کے علمائے کی نسبت اُس نے یہ بے بنیاد اور سراسر جھوٹا پروپیگنڈا کیا کہ وہ تذکرہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور کہ وہ صاحب تذکرہ کو علامہ کا خطاب دے چکے ہیں.....

مجلسِ علی جامعہ اسلامیہ ڈاجھیل ضلع سورت کی طرف سے جامعہ کے

فاضل مدرس مولانا سید محمد یوسف شاہ بنوری لپٹاوری بعض ضخیم کتب فقہ کی طباعت اور علمائے ممالک اسلامیہ کے ساتھ روابط پیدا کرنے کے سلسلے میں مصر، بیت المقدس، ترکی اور حجاز مقدس کو تشریف لے گئے اور آپ نے وہاں کے علمائے سامنے مشرقی کی کتاب تذکرہ کو پیش کر کے اُن سے اس کی نسبت فتویٰ طلب کیا۔ چنانچہ مصر کے جلیل القدر عالم علامہ یوسف دحوی ماکلی نے فتویٰ لکھا، جس کی تائید و تصدیق مصر کے دوسرے علمائے علاوہ ترکی، بیت المقدس اور مصر معظمہ کے علمائے کرام نے فرمائی۔ یہ فتویٰ حکومت مصر کے سرکاری رسالہ الاسلام مجریہ، ارشوال، ۱۳۵۷ھ مطابق ۹ دسمبر ۱۹۳۸ء میں چھپ چکا ہے، اس لیے کسی اَلَدُ الْخِصَام کے لیے یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ یہ فتویٰ جعلی ہے۔ یہ فتویٰ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ مشرقی کی تکفیر اور اُس کے عقائد کی تغلیط و تکذیب میں علمائے ہند متفرق نہیں ہیں بلکہ ممالک اسلامیہ کے علماء بھی اس باب میں علمائے ہند کے ہم نوا ہیں۔ اب اس کے بعد مشرقی کے لیے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہیں ہے کہ یا تو اس فتوے کے سامنے تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے عقاید کفریہ سے توبہ کرے یا حسبِ عادت پوری دلیری سے علمائے ہند کی طرح علمائے مصر وغیرہ کو بھی بے نقط گالیاں دے کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے۔

دوسرا استفتاء علمائے مکہ مکرمہ کی خدمت میں پیش کیا گیا، جس کا امام مسجد حرام، جناب ابوالسمع نے ۱۱ محرم ۱۳۵۸ھ کو جواب تحریر فرمایا اور اپنے فتوے میں مشرقی صاحب کے متعلق لکھا کہ: لا شک فی کفرہ و جہلہ۔ اس فتوے کی مسجد حرام کے ایک مدرس محمد سلطان المحصوی نے تصدیق کی تھی۔ خدا کا شکر ہے کہ انگریز بہادر کے چلے جانے کے بعد یہ فرقہ پاکستان کے اندر ایک عضوِ معطل بن گیا اور عالیشان مشرقی صاحب کی وفات کے ساتھ

ہی ناکساری فتنہ بھی زندہ درگور ہو گیا تھا۔ اب چند خاکساروں کا وجود اگر کہیں نظر آجاتا ہے تو
یہ حضرات اُس آندھی کے تنگے یا فتنے کی اُس گرم بازاری کے آثارِ قدیمہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں
کو ہر فتنہ باز و فرقہ ساز کے شر سے بچائے۔ آمین۔ برٹش گورنمنٹ نے اپنے دورِ اقتدار میں اسلام دشمنی
سے سرشار ہو کر مسلمانوں کے غرضِ دین و ایمان میں آگ لگانے کی خاطر، مصلحین کے رُوپ میں
کیے کیے تخریب کار کھڑے کیے، جو قوم کے سامنے بڑے خوشنما رنگوں میں آئے اور رہبری کے بھیس
میں مہر پی کرتے رہے۔ اتنے لصوص دین کھڑے کر دینے پر بھی انگریزی حکومت کی اسلام دشمنی کا جذبہ
مرد ہونے میں نہ آیا۔ مسلمانوں کے خلاف اُس کی بھر پور آتشِ غیظ و غضب بجھنے کا نام نہ لیتی تھی
جسے دیکھ کر ہر صاحبِ نظر بے ساختہ کہہ اٹھتا تھا:۔

بسل تو ہوتے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر
ٹھنڈا میرے قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا

۷۔ بانی پرویزیت مسٹر غلام احمد پرویز کی تخریب کاریاں

یہ فرقہ سرسید احمد خاں صاحب کی نیچریت کے سہارے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ اس
دن کے اکثر اجزاء نیچریت کے ہیں، کچھ کمیونزم اور سوشلزم کا مواد ہے اور باقی مسٹر غلام احمد پرویز
صاحب کی اپنی ایجادات۔ مذکورہ تینوں قسم کے اجزاء سے پرویزیت کی مجموعی مرکب تیار کی گئی ہے۔
پرویزی حضرات خود کو اہل قرآن کہتے، قرآن فہمی کے ٹھیکیدار بتاتے ہیں اور پرویز صاحب کے
مطلق اُن کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ رسولِ خدا کے بعد اگر اسلام کے اس چودہ سو سالہ دور میں
کسی نے قرآنِ کریم کی آیات کے حقیقی مفہوم و مطالب کو سمجھا ہے تو وہ صرف اور صرف مسٹر
غلام احمد پرویز کی ذات ہے۔ مسلمانوں میں یہ فرقہ پرویزی، منکرینِ حدیث اور منکرینِ سنت کے
ناموں سے متعارف ہے۔ پرویز صاحب اور پرویزی حضرات کو اپنے اہل قرآن ہونے کا
دعوٰی ہے اور وہ مسلمانوں کے قرآن مجید کی تعلیمات سے دُور اور نفور رہنے کا دُھول بجاتے رہتے ہیں
کیونکہ حقیقت میں اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے پرویز صاحب سے بڑا شاید ہی قرآنِ کریم کا کوئی
خلاف پیدا ہوا ہو۔ موصوف نے قرآنی تعلیمات اور اُس کے مفہوم و مطالب میں تحریف کا وہ

دروازہ کھولا ہے کہ احکام خداوندی کی حقیقی صورت کو مسخ کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے۔ اگر یہ قرآن فہمی ہے تو قرآن دشمنی کس درخت کا نام ہوگا؟ جو کسی کی کوئی لنگڑی عقل آیات قرآنی کا مطلب بتاتی جائے اگر آیات کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا تو اس طرح ہزاروں افراد، ہزاروں قوم کے مفہوم و مطالب نہ بتاتے پھریں گے؟ کیا وہ سب تعبیریں حقیقی اور درست ہوں گی؟ اگر نہیں اور ہرگز درست شمار نہیں ہوں گی تو مسٹر پرویز صاحب کی عقل کو قرآن کریم کی کون سی آیت نے حقانیت کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے کہ موصوف جو مفہوم بتاتے جاتیں آیات قرآنیہ کا حقیقی مفہوم وہی ہوگا؟ آخر قرآن کریم نے یہ کس جگہ تصریح کی ہے کہ کلام الہی کا حقیقی ترجمان مسٹر غلام احمد پرویز ہے؟ جو کچھ پرویز صاحب قرآن کریم کے بارے میں فرماتیں وہ درست اور دوسرے جو چاہیں کہتے پھریں وہ سب کچھ غلط۔ کیا پرویزی حضرات مسلمانوں کو یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ کلام الہی میں یہ تصریح کس جگہ فرمائی گئی ہے؟ پرویز صاحب مسلمانوں کو سب سے پہلے یہ یاد کرانے پر مہر نہیں کہ:

”دین کے ساتھ برادرانِ اہل کچھ اقوام سابقہ کے ہاتھوں ہوا تھا وہی کچھ اسلام کے ساتھ بھی ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو قرآن کریم میں مکمل کیا اور حضور نے اس قرآن کو اُمت کو دے دیا، لیکن حضور کی نشرِ شرف براری کے تھوڑے عرصے بعد منافد پرست قوموں نے اُبھرنا شروع کر دیا۔ اس دفعہ پہلے ملوکیت آئی، اس کے ساتھ سرمایہ داری اور ان دونوں نے اپنے تحفظ کے لیے دین کو مذہب میں بدلنا شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ دین بھی آہستہ آہستہ اُسی طرح مذہب میں تبدیل ہو گیا، جس طرح سابقہ انبیائے کرام کا لایا ہوا دین تبدیل ہوا تھا۔“

اگر بقول مسٹر پرویز صاحب سرورِ کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے وصال کے تھوڑے ہی عرصے بعد دین کو ان کے اصطلاحی مذہب میں بدل دیا گیا تو اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ اُس وقت سے لے کر اب تک جتنے مسلمان کہلانے والے ہوئے ہیں وہ سب بے دین اور

اسلام کے دشمن تھے۔ ان حالات میں کئی سوالات پر وہ ذہن پر اُبھرتے ہیں، لیکن دُوسوال پیش کرتے ہیں

۱۔ جب اس تقریباً تیرہ سو سال کے درمیان نبی عرصے میں سارے مسلمان دین کے بدخواہ اور اسے

تبدیل کرنے والے ہی پیدا ہوتے رہے اور انہیں روکنے ٹوکنے والی کوئی طاقت نہ تھی

تو انہوں نے قرآن کریم کے اندر معنوی تحریف کے ساتھ لفظی تحریف کرنے میں کون سی

کسر اٹھا رکھی ہوگی؟ دہریہ حالات پر ویز صاحب موجودہ قرآن کی صحت لفظی کس طرح ثابت

کریں گے؟ اگر وہ آیہ کریمہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ..... سے استدلال کریں تو

بالکل بے معنی بات ہوگی کہ اُمّتِ محمد کو اُمّتِ ملعونہ ٹھہرا دینے کے سبب تو قرآن کریم کی

صحت مشکوک ہوئی کہ جو کتاب دشمنوں بدخواہوں کے ہاتھوں ملی، اُس کی صحت اور کی بیش

سے محفوظ رہنے پر کس طرح یقین کیا جائے؟ ایسی حالت میں قرآن مجید کی کسی آیت یا آیات

سے کس طرح استدلال صحیح ہو سکے گا کیونکہ یہ شک اپنی جگہ قائم رہے گا کہ ممکن ہے اس

آیت یا ان آیات کو اُن بدخواہوں نے گھڑ کر اپنی جانب سے شامل کر دیا ہو۔ لہذا ان

حالات میں صداقت اُس وقت ثابت ہو سکے گی جب کوئی خارجی دلیل قائم کر دی جائے۔

لیکن پر ویز صاحب مرتے دم تک ایسی دلیل قائم نہیں کر سکیں گے۔ هَا تُوَا بُرْهَانُكُمْ

اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔

۲۔ جب دین کو مٹے اور مذہب کو اُس کی جگہ سنبھالے اتنی صدیاں گزر گئیں۔ دین کو جاننے

والا، اُس پر چلنے والا کوئی نہ رہا تو اتنا عرصہ گزرنے کے بعد پر ویز صاحب کو کس ذریعے سے

یہ معلوم ہو رہا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دین کی یہ شکل و صورت بتائی تھی

اور قرآنی آیات کے منہوم و مطالب یہی بتائے تھے جو مسٹر پر ویز بتا رہے ہیں؟ اگر

پر ویز صاحب اس کا کوئی تسلی بخش جواب مرحمت فرمادیں تو اُن کا مسلمان قوم پر بڑا کرم

ہوگا۔

پر ویز صاحب نے قرآنی تعلیمات کو اس بیدردی سے بدلا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس

آخری پیغام کو بچوں کا کھلونا یا مادری کا تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ بغیر کسی دلیل و حجت کے جو

نہیں آتا ہے آیات کا مطلب بتاتے چلے جاتے ہیں۔ اسلام کی غربت کا اس

الناک دور اور کب آیا ہوگا کہ قرآن کریم کے ایسے اشد ترین مخالف اور کلامِ الہی کے بے باک
مُحَرِّف سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں کہ یہ کیا خط بے ربط پھیلایا جا رہا ہے؛ کیوں رہنمائی کا
دعویٰ کر کے رہنری کی خوشیاں بچا رہے ہو؛ ہاتے غربتِ اسلام اداستے قرآن کریم تیری
کس میرسی! موصوف نے اپنی مخصوص ترنگ میں اللہ رب العزت کے اسم ذات اللہ کا
مطلب یہ بتایا ہے :

”اس اہم نکتہ کو اگر تم سمجھ لو تو قرآن فہمی میں تمہاری بہت سی مشکلات کا حل خود بخود
نکل آئے گا، یعنی ان مقامات میں اللہ کی جگہ اللہ کا قانون کہ دیا کرو، تو بات بالکل
واضح ہو جائے گی، مثلاً اللہ یُحْیِیْ وَيُمِیْتُ..... اللہ کا قانون مارتا ہے
اور وہی زندہ رکھتا ہے“ ۱

اب حکمِ خداوندی اطیعوا اللہ یعنی احکاماتِ الہیہ کی اطاعت کا پرویزی مفہوم ملاحظہ ہو؛
”چونکہ خدا عبارت ہے اُن صفاتِ عالیہ سے جسے انسان اپنے اندر منعکس کرنا چاہتا ہے۔
اس لیے قوانینِ خداوندی کی اطاعت درحقیقت انسان کی اپنی.... اطاعت ہے
کسی غیر کی نہیں“ ۲

لیجیے پرویز صاحب کے لفظوں میں ایمان بالغیب کا جدید مفہوم بھی ملاحظہ فرمائیے؛
”مستقبل کے مفاد کے لیے وہی کوشش کرے گا جسے اُن دیکھے نتائج پر
پورا پورا یقین ہو۔ قرآن اسے ایمان بالغیب کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے“ ۳
موصوف نے قرآن کریم کو کھلونا بناتے ہوئے شرک کا مطلب یہ گھڑا ہے؛
”شرک کے معنی ہیں کہ انسان زندگی کے ایک دائرے میں کوئی اور قانون سامنے
رکھے اور دوسرے دائرے میں کوئی اور“ ۴

اب اسی انداز پر رئیس المحررین صاحب نے کفر کا مفہوم یہ بتایا ہے :

۱۔ مسٹر پرویز: سلیم کے نام خطوط، ص ۱۵۶ ۲۔ مسٹر پرویز: معراجِ انسانیت، ص ۲۲۰
۳۔ مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۳۰ ۴۔ ایضاً، ص ۵۳

”وہ لوگ جو اپنے حال ہی کی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں۔۔۔۔ اُنھیں۔۔۔۔ کفار کا گروہ کہہ لیجئے یعنی مستقبل سے یکسر منکر“ ۱

قیامت یعنی روزِ جزا و سزا موصوف جیسے مادیت پرست کی نگاہوں میں کیا ہے؟ ملاحظہ ہو:

”ظہورِ نتائج کے وقت میں اختلاف ہوتا ہے، اس لیے قرآن نے واضح کر دیا کہ یوم الدین۔۔۔۔۔ اس وقت بھی موجود ہے۔ یہ تو ملا کی قیامت ہے جس کا اس زندگی سے کوئی تعلق نہیں“ ۲

حیاتِ بعدِ الممات کو مسٹر پرویز صاحب نے کس چابک دستی سے اسی زندگی میں سمویا ہے، موصوف کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”حیاتِ بعدِ الممات ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارے ایمان کی بنیاد ہے۔ زندگی ایک جڑے رواں ہے۔۔۔ اس میں انقطاع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ ۳

زندگی میں انقطاع کا سوال پیدا ہوتا ہے یا نہیں؟ اس کا موصوف کو مرتے دم بخوبی علم ہو جائے گا، اگرچہ آج گمراہ گری کا بازار گرم رکھتے ہوئے وہ جوچا ہیں کہہ سکتے ہیں، کون زبان پکڑ سکتا ہے؟ میزان پر اعمال ٹیلنے کی تصریح موصوف نے یوں کی ہے:

”قرآنی تصور کی رُو سے ہماری زندگی کی ایک ایک سانس میں حساب اور کتاب پوشیدہ ہے۔ کارِ گاہِ حیات میں ایک ایک قدم پر میزان قائم ہے، جس میں ہمارے اعمال ٹیلتے ہیں اور ہمیں موت اور زندگی کے پروانے ملتے ہیں“ ۴

منابعِ دنیا اور منابعِ آخرت کا مفہوم جو پرویز صاحب نے گھڑا ہے، اُسے موصوف کی زبانی ہی سماعت فرمایا جاتے:

”قرآن۔۔۔۔ کے نزدیک منابعِ دنیا سے مفہوم ہوتا ہے وہ مفاد جو انسان صرف اپنی ذات کے لیے تلاش کرتا ہے اور سامانِ آخرت سے مقصود ہوتا ہے

۱ مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ امت، ص ۲۲ ۲ مسٹر پرویز: فردوسِ گمشدہ، ص ۲۶۱
۳ مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ امت، ص ۲۹ ۴ مسٹر پرویز: فردوسِ گمشدہ، ص ۲۶۶

وہ متاع جسے وہ آنے والی نسلوں کے لیے جمع کرتا ہے۔ ۱

اب تقویٰ اور پرہیزگاری کا مطلب، جو پرویز صاحب کا خانہ ساز ہے، ملاحظہ فرمایا جائے:

”قانونِ فطرت سے ہم آہنگی کو تقویٰ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ - وقتی کے

معنی ہیں گھوڑے کے سموں کو اس طرح گھسنا کہ وہ ہموار ہو جائیں۔ ۲

زمین و آسمان یعنی ارض و سماء کا پرویز صاحب نے کیا معنی گھڑا ہے، یہ بھی موصوف کی زبانی ملاحظہ فرمالیجیے:

”قرآن نے معاشی زندگی کے لیے ارض کی جامع اصطلاح استعمال کی ہے اور

آفاقی قوانین کو جو کائنات میں جاری و ساری ہیں سماء کی اصطلاح سے تعبیر

کیا ہے۔ ۳

اقامتِ صلوٰۃ یعنی نماز قائم کرنے کے بارے میں موصوف کیا تحقیق جھاڑتے ہیں، اُن کے ہی لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”مجوسیوں کے ہاں پرستش کی شکل کو نماز کہا جاتا تھا۔ یہ لفظ اُنہی کا ہے

لہذا صلوٰۃ کی جگہ نماز نے لے لی۔ ۴

اب اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَتُوا الزَّکٰوۃَ کا صحیح مفہوم سامنے آ سکتا ہے، یعنی

معاشرے میں ایسی فضا پیدا کر دی جائے جس سے ہر فرد معاشرہ اُن مستقل اقدار

کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو جن کا ذکر اُدھر کیا گیا ہے، اپنے دل کی مرضی اور

روح کی خوشنودی سے دوسروں کے لیے سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کی فکر

میں لگ جائے۔ قرآن نے اِقَامَۃ الصَّلٰوۃ کا لازمی نتیجہ یہی بتایا ہے۔ ۵

”جہنم والوں سے پوچھا جائے گا کہ تم نے کیا جرم کیا تھا، جس کی وجہ سے تمہاری

۱ مسٹر پرویز: اسبابِ زوالِ اُمت، ص ۲۹ ۲ ایضاً، ص ۳۳

۳ ایضاً: ص ۳۵ ۴ مسٹر پرویز: قرآنی فیصلہ، ص ۲۶

۵ مسٹر پرویز: نظامِ ربوبیت، ص ۱۶۰، ۱۶۱

یہ حالت ہوگئی؛ وہ کہیں گے ہم مصطفیٰ نہیں بنے تھے (تَقُولُوا لَمْ نَكُنْ مِنَ الْمُصْطَلٰیۖنَ ۝ ۴۴) یعنی ہماری کیفیت یہ تھی کہ ہم اُن لوگوں کے لیے سامانِ پرورش نہیں فراہم کرتے تھے جو حرکت سے محروم ہو گئے تھے۔ لہٰذا زکوٰۃ کا مفہوم بتاتے ہوئے موصوف نے ایک عجیب سوال بھی کر دیا ہے۔ دونوں باتیں خود اُن کے لفظوں میں ملاحظہ ہوں:

”یہ حکم کہ زکوٰۃ دو، قرآن میں اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح اڑھاٹی فیصدی دو، قرآن سے باہر۔ کیا۔۔۔۔۔ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا؟“

واقعی زکوٰۃ کی شرح قرآن سے باہر ہے اور اس کے بیان کر دینے سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ بھی نہیں تھا لیکن مسٹر پرویز نے ایمان اور توحید سے لے کر چھوٹے مسائل تک قرآن کریم کی تمام اصطلاحوں کو جو من مانے مفہوم و مطالب کا جامہ پہنا دیا ہے، کیا ان کے متعلق قرآن کریم کے اندر ذرا بھی کوئی اشارہ پایا جاتا ہے کہ واقعی فلاں اصطلاح کا یہی مفہوم ہے جو پرویز صاحب بیان کر رہے ہیں۔ ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اپنے بیان کردہ مطالب کی نائید قرآن مجید سے ہرگز پیش نہ کر سکیں گے۔ فَإِنَّهُمْ تَفَعَّلُوا وَلَكِنْ تَفَعَّلُوا ۖ فَالْتَقُوا النَّاسَ الَّتِي وَفَّوْهُمْ هَٰذَا النَّاسُ وَالْحَبَاۤءَ طُ أُعِدَّتْ لِنَٰكَافِرِيۡنَ ۝ یہ کیا قیامت ہے کہ کائنات کی سب سے بزرگ ترین ہستی، جس پر کلامِ الہی نازل ہوا وہ قرآن کریم کی کسی اصطلاح کا مفہوم بتائیں تو پرویز صاحب کے نزدیک ناقابلِ قبول اور ناقابلِ یقین لیکن خود جو بھی انٹرنیشنل معانی گھڑ کر پیش کریں اُن کی صحت و صداقت کو ایسے وثوق کے ساتھ منوانے کی ہم چلاتے ہیں جیسے اللہ رب العزت نے انھیں بتایا ہو کہ واقعی میری نازل کردہ آیات کے حقیقی معانی یہی ہیں۔ موصوف نے کتنے دھڑتے اور بیباکی کے ساتھ مسلمانوں سے یہ سوال کیا ہے کہ:

”رسول اللہ سے بہتر کوئی شخص قرآن کو نہیں سمجھتا لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن

کی جو تفسیر رسول اللہ نے فرمائی وہ آج ہے کہاں؟“ لے

جو سوال پرویز صاحب مسلمانوں سے کر رہے ہیں اگر یہی کچھ مسلمان اُن سے مطالبہ کریں کہ کیا آپ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ قرآنی تفسیر ہے؟ یقیناً پرویز صاحب کا جواب نفی میں ہوگا۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ موصوف آیات قرآنیہ کے جو مفہوم و مطالب بتا رہے ہیں اُن کے بارے میں کیا ثبوت ہے کہ وہ رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بیان فرمودہ تفسیری بیانات کے بالکل مطابق ہیں اور اُن کے مخالف یا من گھڑت نہیں ہیں؟ موصوف نے بعض قرآنی الفاظ کے مفہوم و مطالب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

”قیامت کے قرآنی مفہوم کے لیے مشعلِ راہ کی آخری جلد کا انتظار فرمائیے۔“

”قصہ آدم کے صحیح مفہوم کے لیے جلد دوم، باب آدم دیکھیے۔“

”ثواب کے قرآنی مفہوم کے لیے دیکھو میرا مضمون نجات ص ۱۔“

”جنت اور جہنم کے قرآنی مفہوم کے متعلق دیکھیے میرے مقالات نجات ص ۱۔“

”قرآن کے نظامِ صلوة کی تفصیل کے لیے مشعلِ راہ کی آئندہ جلد کا انتظار فرمائیے۔“ لے

پرویز صاحب نے مسلمانوں پر تو یہ حجت قائم کرنے کی کوشش فرمائی تھی کہ زکوٰۃ کی شرح بیان کر دینے سے کیا قرآن کا حجم بڑھ جاتا؟ مسلمان بھی اُن سے یہی سوال کرتے ہیں کہ پرویز صاحب بتائیے تو سہی کہ قیامت، ثواب، جنت و دوزخ اور نظامِ صلوة وغیرہ قرآنی اصطلاحوں کا مفہوم اگر اللہ تعالیٰ اپنے آخری پیغام میں وہی کچھ بیان کر دیتا جو آپ بیان کر رہے ہیں تو کونسا حجم بڑھ جاتا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیان کردہ مفہوم و مطالب قطعاً قرآن کریم میں بیان نہیں فرمائے تو آنجناب کس خوشی یا خوش فہمی میں کلامِ الہی کے اندر معنوی تحریف کر کے ادھر

لے مشر پرویز، مقام حدیث، ص ۸

لے مشر پرویز، اسبابِ زوالِ امت، ص ۴۴

لے ایضاً، ص ۴۸

لے ایضاً، ص ۱

لے ایضاً، ص ۱

لے ایضاً، ص ۱۱۰

غضب الہی خرید رہے ہیں اور ادھر بھولے بھالے مسلمانوں کی بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں گمراہ کر رہے ہیں؟

اگر مسٹر پرویز کی طرح کسی سیاستدان کو تحقیق کا شوق چڑائے اور وہ قرآن دانی کا مدعی بن کر کہنے لگے کہ ایمان سے وزارت کا حصول، اقامتِ الصلوٰۃ سے پارٹی کا استحکام، ثواب سے دولت کا ملنا، جنت و دوزخ سے ہارجیت اور قیامت سے مراد وزارت سے معزول ہونا ہے۔ اسی طرح ایک امیر بنکار نے لگے کہ ایمان سے کارخانے ہونا، اقامتِ صلوٰۃ سے کوٹھیوں کا رول کا حصول، ثواب سے فارونی دولت، جنت و دوزخ سے مزدوروں کا خوش رہنا یا ہڑتال کر دینا اور قیامت کا مطلب کارخانوں کا قومی ملکیت میں چلے جانا ہے یا کوئی مزدور کہے کہ ایمان سے نوکری ملنا، اقامتِ صلوٰۃ سے مالک کا کام سے خوش ہونا، ثواب سے مزدوری کا بروقت مل جانا، جنت و دوزخ سے نوکری میں کمی بیشی اور قیامت سے مراد نوکری سے جواب مل جانا ہے تو ایسے حضرات کی زٹلوں، ہٹک بندیوں اور مسٹر پرویز کے سراسر عقلی ڈھکوسلوں میں آخر فرق کیا ہوگا؟

قوان کریم کے مفہوم و مطالب میں مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے ساتھ ساتھ پرویز صاحب نے دوسرا میدانِ حدیث کی مخالفت کو بنایا، جس کے جواب میں علمائے کرام بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ تیسرا میدان تحریکِ پاکستان کا منتخب کیا ہوا ہے، جس کو لے کر پاکستانی باشندوں کو مغالطے میں مبتلا کرنا بھی موصوف کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کے ایک پیوکار چودھری حبیب احمد صاحب نے بھی اپنی تصنیف تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء میں یہی تاثر پیش کیا ہے۔ دیندار طبقے سے اہل دین کو متنفر کرنے کی خاطر پرویز صاحب نے لکھا ہے کہ:

”غیروں کی حکومت میں مذہب تو باقی رہ سکتا ہے، دین نہیں رہ سکتا۔ آپ اجاب کو معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کی سب سے زیادہ مخالفت ہمارے مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت دین اور مذہب کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تا امروز باہدگر ستیزہ کار چل رہی ہے۔“

آگے موصوف نے مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کرتے ہوئے لکھا ہے:

”آپ نے غور فرمایا کہ تحریک پاکستان کی کش مکش کس طرح درحقیقت دین و مذہب

کی وہی کش مکش تھی جو ازل سے تمام دوسنیہ کا پہلی آرہی ہے۔ مذہبی طبقہ کی

اس قدر مخالفت کے باوجود پاکستان وجود میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی مخالفین

کا یہ لشکر بھی ادھر اُمنڈ آیا۔ اب وہی کش مکش پندرہ سولہ برس سے یہاں بھی

جاری ہے۔ اس طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہونے

پاتے۔ اس کی بجائے یہ چاہتے ہیں کہ اولاً یہاں مذہبی تھیا کر لپی قائم ہو جائے

اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس انداز کی سیکولر حکومت قائم ہو جائے جس میں

پبلک لاز حکومت کے ہاتھ میں رہیں اور پرسنل لاز مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں

ان جبارتوں میں پرویز صاحب نے دل کھول کر دھاندلی کی ہے۔ چند ایک کی نشان دہی کرتا ہوں:

اولاً: دین اور مذہب کی من مانی تعبیریں کر کے خود کو دین کا پیر و کار اور مسلمانوں کو دین سے

متنفذ اور مذہب کے پرستار قرار دے دیا۔ حالانکہ نہ دین و مذہب میں کوئی تفریق، نہ پرویز صاحب

کو دین سے کوئی سروکار، نہ مسلمانوں میں کوئی دین سے بیزار اور کسی دوسرے مذہب

کا پیر و کار۔

ثانیاً: سب مسلمانوں کو تحریک پاکستان کا مخالف قرار دے دیا، یہ ہمالیہ پہاڑ سے

بھی بڑا منغلط ہے۔ تحریک پاکستان کی مخالفت صرف ان علمائے کی تھی جو گاندھی کے

پرستار تھے یعنی نیشنلسٹ علماء، جن میں جمیعہ العلماء تھے ہند اور احراری وغیرہ حضرات شامل

یہ ملت اسلامیہ کے لیے مسٹر پرویز کی طرح ہمیشہ مار آتین ہی رہے تھے۔ مسلمانوں کے

سوا د اعظم یعنی اہلسنت و جماعت نے تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ لیا۔ یہی حضرات اس

تحریک کا علم بلند کرنے والے اور یہی اسے ساحلِ مراد تک پہنچانے والے تھے جنہیں گرو گرو

نے بریلوی فرقہ کے نام سے پکارنا شروع کر دیا ہے حالانکہ یہ وہی قدیم جماعت ہے جسے اللہ تعالیٰ

نے اپنے آخری پیغام میں حزبِ اللہ اور اُمتِ وسطیٰ کہا ہے اور فرخِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جس کی مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاصْحَابِي کے لفظوں سے تخصیص فرمائی اور اتَّبِعُوا السَّوَادَ الْأَعْظَمَ سے جس کی پہچان بتائی ہے۔ جس کے علمی و عملی اور تبلیغی و مجاہدانہ کارناموں سے دنیا جگمگا رہی ہے اور خدا کا آخری پیغام دنیا کے ہر گوشے میں پہنچا اور جو ہمیشہ کفر کا غرور توڑتے آئے اور طاغوتی طاقتوں کے مقابلے پر ایسی مضبوط چٹان ثابت ہوتے رہے کہ ان کے سائے میں مارِ آستین ثابت ہونے والے گمراہ گروں کو بھی آرام سے بیٹھنا نصیب ہوتا رہا ورنہ دنیا کے کفر کے مقابلے پر اُحدیث، دیوبندی، نیچری، پرویزی اور شیعہ وغیرہ حضرات نے اپنی پوری تاریخ میں کون کون سے ملکوں میں اسلام پھیلایا؟ کفر کی طاقتوں سے کتنی دفعہ ٹکری؟ جو اب صفرِ اہلسنت و جماعت کو ایک جانب رکھ دینے کے بعد باقی سارے فرقے دیکھیں کہ کافروں، غیر مسلموں کے مقابلے پر اُن کی جمعیت و طاقت کیا ہے؟ کیا کافروں کے حصے میں اُن کی ایک ایک بوٹی بھی آتی ہے؟ اہلسنت کا سایہ ہٹتے ہی کیا کچے نہ چبایے جائیں گے؟

پرویز صاحب! اسی اہلسنت و جماعت کے پانچ ہزار مشایخ و علماء سنی کافر نس کے ابلاس منعقدہ ۲۷ تا ۳۰ اپریل میں بنارس کے مقام پر اکٹھے ہوئے اور ڈیڑھ لاکھ سے زائد سنی مسلمانوں کی موجودگی میں تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کا تاریخی اعلان فرمایا۔ علی الاعلان کہہ دیا کہ برطانیہ کے سارے خود کاشتہ پودے یعنی تمام فرقے پاکستان کی مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے تو مذکورہ کافر نس کے خطبہ صدارت میں متفقہ اعلان کیا گیا کہ سنی مسلمان پاکستان بنا کر رہیں گے اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک پاکستان معرض وجود میں نہ آجائے۔ جتنی کہ پیر مائیکل شریف نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر مسلمانانِ اہلسنت و جماعت پاکستان بنانے پر کمر بستہ نہ ہوتے تو مسٹر جناح کے ساتھ تھا کون؟ کون مسلم لیگ کا جھنڈا اٹھاتا اور کہاں اس کا دفتر قائم ہوتا؟ بلکہ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ مسٹر جناح بھی اگر مطالبہ پاکستان سے دست بردار ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں لیکن سنی مسلمان پاکستان بنا کر ہی دم لیں گے۔ غرضیکہ تمام علماء اور مشایخ نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ پیرانِ عظام نے اپنے ہزاروں اور لاکھوں مریدوں کو

مطالبہ پاکستان کا منہ بولنا اشتہار بنا دیا۔ اکیلے حضرت امیر ملت، پیر حافظ جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ اپنے چالیس لاکھ مریدوں سمیت حمایت پر کمر بستہ تھے اور تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کی خاطر دن رات ایک کر دیے۔ کیا مسٹر پرویز اینڈ کمپنی ان بزرگوں میں سے کسی ایک بزرگ کے برابر پاکستان کی تحریک میں اپنا حصہ ثابت کر سکتے ہیں؟ جانے دیجئے۔ پاکستان کی بنیاد پر جو الیکشن ہوا اور مسلم لیگ نے سو فیصد کامیابی حاصل کی، کیا مسٹر پرویز ثابت کر سکتے ہیں کہ اُن میں سے ایک ممبر بھی ایسا ہے جو پرویزی حضرات کے ووٹوں سے کامیاب ہوا ہو؟ مسٹر پرویز اور پرویزی حضرات ہمیں بتا سکتے ہیں کہ اہلسنت و جماعت کے مقابلے پر پاکستان کے لیے اُن کی قربانیوں کا تناسب کیا ہے؟ سوائے اس کے وہ اور کیا کارنامہ دکھائیں گے؟ مینسٹریاں علماء کے خلاف لکھے ہوئے چند بیانات دکھادیں گے، حالانکہ وہ علماء بھی اُمتِ محمدیہ کے لیے ہمیشہ اپنی تاریخ میں پرویز صاحب کی طرح مارا آستین ہی بن کر رہے ہیں۔ اپنے چند صفحات لکھنے کی یہ قدر و قیمت اور ملتِ اسلامیہ کے اتنے عظیم الشان کارنامے، بے شمار جانی اور مالی قربانیوں سے یوں آنکھیں بند بلکہ دشمنِ دین و ملت قرار دینے کے پابند،

عشرم تم کو مگر نہیں آتی

ثالثاً: پرویزی حضرات نے کس روز انگریزوں یا ہندوؤں سے مقابلہ کیا۔ اگر آپ حضرات کی جانب سے ایسا ایک لفظ بھی منہ سے نکلتا تو اس پورے ٹولے کو برٹش گورنمنٹ یا ہندو اکثریت ایک پرکاش یا کسی مکھی اور مچھر کے برابر بھی تو اہمیت نہ دیتی۔ لیکن یہ ٹولہ پاکستان کی تحریک اور دین کا علم بردار بنتا ہے جو دین کے ابجد سے بھی واقف نہیں اور مسلمانوں کے سوا اعظم کو دین و دیانت سے پیچھا چھڑا کر، آنکھیں بند کر کے تحریک پاکستان کا مخالف بتا رہا ہے کیا پرویز صاحب یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ اُن سے تحریک پاکستان یا مملکتِ پاکستان کو کیا فائدہ پہنچا ہے؟ دین سے بغاوت کرنے والے چند سرسبز ملک و ملت کا کیا جھلا کر سکتے ہیں؟

رابعاً: موصوف کا لکھنا کہ: ”اس طبقہ کی انتہائی کوشش ہے کہ یہاں قرآن کی حکمرانی نہ ہو پاتے“ ایسے عالم آشکار میں قطعاً سفید جھوٹ اور زری گپ ہے۔ مسلمان تو دل و جان سے

جاتے ہیں کہ یہاں قرآن کریم کی حکومت ہو جائے، قرآن و سنت کا آئین رائج ہو جائے، نظامِ مصطفیٰ رائج ہو جائے، خلافتِ راشدہ کے قوانین نافذ ہو جائیں۔ اگر قرآن کی حکمرانی سے پرویز صاحب کی مراد اپنے ذاتی خیالات ہیں تو ہم ڈنکے کی چوٹ کہتے ہیں کہ پرویز صاحب جیسے دشمنِ قرآن کریم کے خیالات لبِ اسلام پر لاگو ہوں، اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ:

ہر ایں خیال است و محال است و جنوں

پرویز صاحب نے علامہ اقبال کو اپنے خیالات کا داعیِ اول، اپنی غیر اسلامی تحریک کا علمبردار و فوٹو گرافر، اُن کی عقیدت کا دامن سنبھالا ہوا ہے۔ یہ پرویز صاحب کی دھوکے بازی کا چوتھا میدان کیونکہ شاعر مشرق علامہ سر محمد اقبال، سنی مسلمان اور ایک عظیم مفکر تھے۔ پرویزیت سے موصوف کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ کفر زار ہند کے قلب میں بیٹھ کر اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرنے والے سلطانِ ہند ذوالعین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شاعر مشرق نے کہا تھا:

ہر چشتی نے جس چمن میں پیغامِ حق سنایا

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق اپنے تنازعات کا اظہار یوں کیا تھا:

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان

اللہ نے ہر وقت کہا جس کو خبردار

مولانا جلال الدین رومی صاحبِ ثنوی کو علامہ اقبال نے اپنا پیر قرار دے کر پیر رومی اور اپنے لیے پیر ہندی کہا اور مولانا روم سے ڈاکٹر اقبال اتنے متاثر تھے کہ بعدِ حُسن و یاس کہا کرتے تھے:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے

وہی آب و گلِ ایراں، وہی تبریز ہے ساقی

علامہ اقبال تو بزرگانِ دین کو پیغامِ حق سنانے والے اور سرمایۂ ملت کے نگہبان قرار دے رہے ہیں اُن جیسے اور پیدا ہونے کی دُعا میں کرتے تھے لیکن پرویز صاحب ایسے علامہ اقبال کے عاشق ہیں کہ علامہ کے ممد و حین کو دین کے دشمن اور مذہب کے پرستار بتا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ دین و دانت نصیب فرماتے۔ (آمین)

۸۔ شیعہ حضرات

شیعہ فرقے کا ظہور ایک یہودی سازش ہے۔ عبد اللہ بن سبا یہودی نے ۲۵ھ میں اسلام کی عداوت سے سرشار ہو کر ازراہ منافقت مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا اور امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں سے دھتکارے جانے کے بعد حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وافر عقیدت کا دم بھرنے لگا۔ اس لحاظ سے شیعان علی نے سرانگھوں پر جگہ دی۔ اپنے مخصوص حلقے میں پہلے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت کا شوشہ چھوڑا اور اس کے بعد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سب و شتم کا دروازہ کھولا۔ جب ان دونوں قسم کے خیالات بعض حضرات نے قبول کر لیے اور اُس کا ایک حلقہ قائم ہو گیا تو اصحاب ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر زبانِ طعن دراز کرنی شروع کر دی اور یہ دعویٰ کر دیا کہ خلافت بلا فصل درحقیقت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حق تھا، جن لوگوں نے اُنھیں اس حق سے محروم کیا وہ غاصب، اہل بیت کے دشمن اور مسلمانوں کے بدخواہ ہیں۔

اُس بد بخت عبد اللہ بن سبا کے اس پروپیگنڈے سے بعض لوگ ایسے متاثر ہوئے کہ اُن ظالموں نے خلیفہ ثالث حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خون ناحق اپنے سر لے کر دارین کی رویا ہی خریدی۔ اس حادثہ فاجعہ سے خلافت کی آب و تاب جاتی رہی اور ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ کچھ اس طرح منتشر ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے زیرک ترین اور قابلِ فخر و عظیم الشان مدبر کے سنبھالے بھی نہ سنبھل سکا، حتیٰ کہ ایسے ہی حالات میں ایک بد بخت سبائی ابنِ طحیم کے قاتلانہ حملے سے زنجیروں کی تاب نہ لاتے ہوئے جنت الفردوس میں تشریف فرما ہوئے۔

عبد اللہ بن سبا کے پروپیگنڈے نے شیعانِ علی کو عجیب موثر پرکھڑا کر دیا تھا۔ جہاں تک حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں زبان کھولنے کا تعلق ہے تو اس کی مقتدر صحابہ کرام کیلئے اُس وقت گنجائش موجود تھی لیکن اصحاب ثلاثہ اور ازواجِ مطہرات سے بدظنی اور سب و شتم بھلا کوئی مسلمان کس طرح برداشت کر سکتا ہے؟ اکثر مسلمان حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت و حمایت پر متفق ہیں لیکن شیعانِ علی کی مذکورہ کثوت سے نالاں تھے۔ یوں خلیفہ چہارم حضرت علیؑ

شیخہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حامیوں کو اُس مکار یہودی کی سازشوں نے ایک مرکز پر جمع نہ ہونے دیا، جس کے باعث وہ اپنے مخالفین پر، جنہیں اسی سازش نے خلیفہ وقت کے مقابلے پر کھڑا کر دیا تھا، کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ شیعیان علی کی اسی سازش سے تنگ آکر حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسئلہ خلافت پر حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سمجھوتا کر لیا۔ اسی صورت حال کی بدولت شاہِ گلگوں قبا، سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اُن کے خاندان پر شیعیان علی کے ہاتھوں میدانِ کربلا میں قیامت گزر گئی۔ یہ ہیں اس ٹولے کی اہل بیت وائمہ اطہار سے عقیدت کے عدیم النظیر کارنامے۔ اس بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات اُس صحیح البلاغت کتاب سے پیش کیے جاتے ہیں جو شیعہ حضرات کے نزدیک اصح الکتاب بعد کتاب اللہ ہے۔ ایک مکتوبِ گرامی میں امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا، جس کا قارئین کی سہولت کے پیش نظر صرف ترجمہ پیش کرتا ہوں، عربی کے شائق اصل کتاب کی جانب رجوع کریں،

”میں خدا سے سوال کرتا ہوں کہ مجھے اس گروہ سے جلدی دُور کر دے۔ خدا کی قسم اگر دشمن سے مقابلے کے وقت مجھے شہادت کی جانب رغبت نہ ہوتی اور اپنی جان کو جانِ آفریں کے سپرد کر دینے کے لیے ہمہ وقت تیار نہ رہتا، تو میری آرزو یہ ہے کہ ایک روز بھی اس گروہ کے ساتھ نہ رہوں اور نہ کبھی ان لوگوں سے ملوں۔“
اپنے ایک خطبے میں حضرت امیر المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے شیعہ گروہ کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کیا:

”خدا کی قسم جو دلوں کو مردہ کر دیتا ہے اور عقل و فہم کو کھینچ لیتا ہے، میں اُن کا باطل پر اجتماع اور تمحاری حق پر اگندگی دیکھتا ہوں۔ خدا تمہیں ذلیل و رسوا کرے کہ تم از خود تیروں کا نشانہ بن گئے۔ لوگ تمہیں غارت کرتے ہیں اور تم سے کچھ نہیں بن پڑتا، لوگ تم پر جہاد کرتے ہیں لیکن تم جہاد سے عاری ہو گئے اور خدا کی نافرمانی تمہیں خوش کرتی ہے۔ جب میں اُن پر یلغار کرنے کے لیے تم سے گرمی میں کہتا ہوں تو گرمی کی شدت کا اندر پیش کر دیتے ہو اور موسم گرما بچنے تک

مہلت مانگتے ہو۔ جب سردی میں تم سے جہاد کرنے کو کہتا ہوں تو سردی کی شدت کا بہانہ بنا کر سردیاں گزرنے تک کی مہلت طلب کرتے ہو۔ یہ تمہارا سردی گرمی سے بھاگنا ہے تو خدا کی راہ میں تلوار اٹھانے سے تو امکان بھر بھاگو گے۔ تم مردوں کی شکل میں نامرد، بچوں جیسی عقل والے اور زبور پہننے والی عورتوں کی مانند ہو میری انتہائی کوشش یہی ہے کہ تمہاری شکل بھی نہ دیکھوں اور تم میرے لیے انجانوں کی طرح ہو جاؤ۔“ لے

اسی خطے میں مولا مشکل کشا، شیر خدا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے تاثرات کا یوں بھی اظہار فرمایا:

”تمہیں خدا ہلاک کرے بے شک تم نے میرے دل کو پیپ سے اور میرے سینے کو غصے سے بھر دیا ہے۔ تم نے مجھے پے در پے رنج و غم کے جام پلائے۔ تم نے ترکِ رفاقت اور حکمِ عدولی کے ذریعے میری تمام تدبیروں کو خاک میں ملا دیا، یہاں تک کہ قریش یہ کہنے لگے کہ بیشک ابوطالب کا بیٹا جری اور جانناز ضرور ہے لیکن فوجوں کو لڑانے کے قواعد سے نااہل ہے کہ مخالفین پر قابو پاتے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت میدانِ جنگ کا مجھ سے بڑھ کر آزمودہ کار کون ہے؟ جب میں نے عمر کی بیس منزلیں بھی طے نہیں کیں اُس وقت سے میدانِ ضربِ حرب میں قدم رکھا ہے حالانکہ اب میری عمر ساٹھ سال سے بھی تجاوز کر گئی ہے لیکن جس امیر کا حکم نہ چلے اُس کی تدابیر کیا رنگ دکھائیں؟“ لے

دوسرے خطے میں صاحبِ ذوالفقار، شہِ دلدل سوار نے اپنے ساتھیوں کی جو انگریزوں کا تذکرہ یوں فرمایا:

”میں کہاں تک تمہاری حفاظت اس طرح کروں جیسے نازک بدن، ناکتخدا عورتوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ کہاں تک تمہیں پرانے کپڑے کی طرح سنبھالوں

جسے ایک طرف سے سیاجاتا ہے تو دوسری جانب سے پھٹ جاتا ہے۔ جب سردارانِ شام سے کوئی سردار تم پر یلغار کرتا ہے تو تم اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے ہو اور اپنے گھروں میں اس طرح گھس جاتے ہو جیسے گواہ اپنے سوراخ میں گھس جاتی ہے یا بجوا اپنے بھٹ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ۱

یہ ہے ان حضرات کی ائمہ اہل ہمارے عقیدت کہ زندگی میں تو سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رفاقت کا دم نہ بھرا، جھوٹے دعوے کر کے عقیدت کا ڈھول بجاتے رہے، وقت آنے پر انجان بن جاتے، شیعہ حضرات کی اس منافقت نے شیر خدا کو ایک دن بھی آرام سے کارِ خلافت انجام دینے کی مہلت نہ دی اور ان جھوٹے عقیدت مندوں کی دھوکے بازی سے اسلام کا وہ بطل جلیل اور خدا کا عیدم النظیر شیرِ غلیفہ وقت ہونے کے باوجود اپنے ہی ایک صوبے پر تازلیست قابو نہ پاسکا۔ لیکن ان کی وفات سے لے کر آج تک انھیں بلا فصل خلافت دلانے اور وصی رسول بنانے کی مہم چلائے ہوئے ہیں، جیسے سب کو پیچھے دھکیل کر آج انھیں تحتِ خلافت پر بٹھا کر ہی دم لیں گے۔ وقت گزرنے پر حمایت کی ہانڈی میں ایسا اُبال اور دورِ خلافت میں حمایت وغیرہ کا اس درجہ کال۔ جب حضرت امیر المومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حمایت کرنے، جانبازی دکھانے کا وقت تھا تو روپوشی میں کاہل ہو گئے۔ شیر خدا کا وصال ہوا تو یہی حضرات اُگلی کٹا کر حمایتی شہیدوں میں آ شامل ہوئے۔ بعد اُمام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حمایت کا یقین دلا کہ خلافت پر آمادہ کر لیا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مقابلہ کرنے ایک لشکرِ جزائری کھڑا ہوا۔ امام عالی مقام کے سامنے ان حمایتیوں کا دو غلہ پن اپنے اعلیٰ رنگ روپ میں موجود تھا۔ اپنے والدِ محترم کے ساتھ ان کا سلوک دیکھ چکے تھے، لہذا ان کی حمایت پر امیر معاویہ سے صلح کرنے اور خلافت ان کے سپرد کر دینے کو ترجیح دی۔ گویا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی ان کی جھوٹی حمایت کے دعووں کو پائے استحقاق سے ٹھکرا دیا۔ اس کے بعد سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تھوڑی دیر کے لیے ان لوگوں کی حمایت کے بلند بانگ دعاوی کو دراسی اہمیت

دے دی، امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ پر اپنی بیعت کرنے والوں کو اپنا حمایتی سمجھ لیا، تو ان
 حمایتی حضرات کے ہاتھوں گلستانِ مرقضی کے ہر گل بوٹے اور چمنستانِ زہرا کی بے گھلی کلیوں پر بھی میلان
 کر بلا میں جو قیامت گزر گئی وہ شیعہ اہل بیت کے ہاتھ پر ایسا انٹ ڈاغ ہے جو قیامت تک ان کے
 ماتم کرنے، ٹسوسے بہانے اور حمایتِ اہل بیت کے فرضی ڈھول پیٹنے سے مٹ نہیں سکتا۔ دستِ مسلم
 پر بیعت کرنے والوں کے گھروں میں امام مسلم اور ان کے بچوں کو پناہ تک نہ مل سکی، ان بے گناہوں
 کے لاشے ان حمایتیوں کے سامنے ٹرپ ٹرپ کر ٹھنڈے ہو گئے لیکن حمایتی اس درجہ سنگدل
 بلکہ سیاہ دل بلکہ دوستی کے پردے میں دشمنی سے بھرپور تھے کہ کسی چھوٹی آنکھ میں آنسو نہ آیا۔
 حالانکہ اب ماتم کرتے پھرتے ہیں، کسی بد بخت کی زبان سے ہمدردی کا ایک کلمہ نہ نکلا حالانکہ وقت
 گزرنے کے بعد حمایت میں گلے چھاڑ چھاڑ کر چلاتے آرہے ہیں۔ کر بلا میں قیامت گزر رہی تھی
 لیکن حیدر کرار کا وار الخلاف خاموش ہی نہیں تھا بلکہ شہیدانِ کر بلا کے خلاف صفت آراء تھا۔ وقت آنے
 پر شیعہ اہل بیت نے امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے بچوں کو تہ تیغ کرنا،
 یزید، ابن زیاد اور شمر کا ساتھ دے کر کشتِ زہرا کو پامال کرنا ہی اہل بیت کی محبت کا تقاضا سمجھا۔

بھلانے پہ بھی قصہِ عہدِ ماضی

بھلایا نہ جائے گا تم سے، نہ ہم سے

شیعہ حضرات کے متقدمین و متاخرین قرآنِ کریم کی صحت کے منکر اور اسے

انکار قرآنِ مجید تحریر شدہ نسخہ بتاتے نیز بایض عثمانی ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ ان

حضرات کی مشہور و معروف کتاب اصولِ کافی، جو صحاح اربعہ میں شمار کی جاتی ہے، اس کی یہ

روایت ملاحظہ ہو:

عن جابر قال سمعت ابا جعفر جابر سے روایت ہے کہ میں نے امام محمد باقر سے سنا کہ

يقول ما ادعى احد من الناس لوگوں میں سے کذاب کے سوا کوئی یہ دعویٰ نہیں کرے گا کہ جتنا قرآن

انه جمع القرآن كله كما انزل الآ نازل ہوا تھا وہ سب جمع کر لیا گیا ہے قرآن کو علی بن ابی طالب

كذاب وما حفظه كما نزل الله اور ان کے بعد والے اند کے سوا کسی نے اس طرح جمع اور محفوظ

الاعلى ابن طالب والا ثمة من بعده نہیں کیا جس طرح اللہ تعالیٰ نے اسے نازل کیا۔

شیخہ حضرات کے نزدیک جو قرآن مکمل اور مقبر ہے اُس کی آیات کی تعداد کے بارے میں یہ روایت
لا حظ ہو :

عن هشام بن سالم عن ابی عبد اللہ علیہ السلام قال ان القرآن الذی جاء به جبرائیل علیہ السلام الی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لے کر آئے تھے، اُس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں۔

شیخہ حضرات کے بلند پایہ مفسر، علامہ محسن کاشی نے تفسیر عیاشی کے حوالے سے تحریف قرآن کے متعلق لکھا ہے :

فی تفسیر العیاشی عن ابی جعفر قال لولا انه نزل فی کتاب اللہ ونقص ما خفی حقنا علی ذی نجی ولو قد قام قائلنا صدقہ القرآن وفیه عن ابی عبد اللہ علیہ السلام لو قرئ القرآن کما انزل الفینا فیہ مسینا۔

تفسیر عیاشی میں ہے کہ امام جعفر نے فرمایا کہ اگر قرآن میں کمی بیشی نہ کی ہوتی تو ہمارا حق کسی عقلمند پر پوشیدہ نہ رہتا اور اگر ہمارے امام قائم علیہ السلام ظاہر ہو کر بولیں تو قرآن اُن کی تصدیق کرے اور اُسی میں امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد منقول ہے کہ اگر قرآن وہ پڑھا جائے جو نازل ہوا تو اُس میں ہمارا ذکر نام بنام ملے۔

تیسری شیعہ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے۔ چنانچہ اسی تفسیر صافی میں تصریحاً لکھا ہے :

اما اعتقاد مشائخنا رحمہم اللہ ہمارے مشایخ رحمہم اللہ کا اعتقاد اُس بارے میں

لے محمد بن یعقوب کلینی، اصول کافی، کتاب فضل القرآن، ص ۶۷

لے محسن کاشی : تفسیر صافی، ص ۱۱

فی ذالک فالظاهر من ثقتہ الاسلام
 محمد بن یعقوب الکلینی طاب ثراہ
 انه کان یعتقد التحریف والنقصا
 فی القرآن لانه روى مروایات فی
 هذا المعنی فی کتابہ الکافی
 ولم یعرض لقدم فیہا مع انه
 ذکر فی اول الکتاب انه یشتق
 بمادواہ فیہ وکذا لک استادہ
 علی بن ابراہیم القمی فان تفسیرہ
 مملو منہ ولم یغلو فیہ وکذا لک
 الشیخ احمد بن ابی طالب
 الطبرسی قدس سرہ
 ایضاً نسبح علی منوالہما
 فی کتاب الاحتجاج - لہ

یہ ہے کہ ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی طاب ثراہ
 کی نسبت یہ واضح ہے کہ وہ قرآن میں تحریف
 نقصان کے قائل تھے کیونکہ انہوں نے اس
 مضمون کی کئی ہی روایتیں اپنی کتاب کافی میں
 نقل کی ہیں اور ان پر کوئی اعتراض وارد نہیں
 کیا، بلکہ اپنی کتاب کے شروع میں لکھ دیا کہ
 اس کتاب میں جو حدیثیں نقل ہوں گی ہمیں ان کی
 صحت پر وثوق ہے اور اسی طرح ان کے استاد
 علی بن ابراہیم قمی بھی تحریف پر یقین رکھتے تھے کیونکہ
 ان کی تفسیر تو ایسی روایتوں سے پر ہے اور ان
 کو اس عقیدے میں غلو نہیں ہے اور اسی طرح
 شیخ احمد بن ابوطالب طبرسی قدس سرہ بھی
 تحریف کے قائل تھے کیونکہ اپنی کتاب الاحتجاج میں
 وہ بھی ان دونوں حضرات کے نقوش قدم پر
 چلے ہیں۔

شیعہ حضرات نے تمام مسلمانوں کو غیر مسلم ٹھہرانے کی خاطر بڑے شد و مد سے یہ دعویٰ تو کر دیا کہ
 موجودہ قرآن کریم تحریف شدہ ہے اور اپنے مقصد کی تائید میں حدیثیں بھی گھر کر اپنی کتابوں میں
 شامل کر لیں لیکن اس سے شیعہ حضرات کو کون سی حقانیت کی سند مل گئی؟ اگر بقول ان کے
 دوسروں کے پاس معرفت کلام الہی ہے تو روافض کے پاس کیا ہے؟ ان کے پاس تو میرے سے
 کچھ بھی نہیں۔ اس صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کے مسلمان کہنے کی بنیاد کس چیز پر ہے؟
 ان کے دین کا ماخذ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں روافض کا مضحکہ خیز موقف ملاحظہ ہو:

قال يا ابا محمد فان عندنا الجامعة وما يدريهم ما الجامعة قال قلت فذاك وما الجامعة قال صحيفه طولها سبعون ذراعاً - ۱

فرمایا (امام جعفر صادق نے)، اے ابو محمد! بیشک ہمارے پاس ایک جامعہ ہے اور وہ کیا جانیں کہ جامعہ کیا ہے۔ میں نے کہا، میں آپ پر قربان، ارشاد فرمائیں کہ وہ جامعہ کیا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ ستر گز لمبا قرآن ہے۔

معلوم نہیں شیعہ حضرات نے اتنا لمبا چڑا قرآن رکھا ہوا کہاں ہے؟ اُسے اٹھاتا اور پڑھتا کون ہے؟ کیا یہ ایسے عالم آشکار میں سفید جھوٹ اور نرمی گپ نہیں؟ اسے علمی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا کتنا چاہیے یا اور کچھ؟ اگر شیعہ حضرات ایسا قرآن نہ دکھا سکیں تو ان کے دعویٰ اسلام کا ثبوت اور سلمان کھلانے کی دلیل کیا؟ اسی طرح کا حضرات شیعہ نے ایک قرآن اور گھڑا ہوا ہے۔ اُس کے بارے میں یہ روایت ملاحظہ ہو:

واتا عندنا لمصحف فاطمة عليها السلام وما يدريهم ما مصحف فاطمة قال مصحف فيه مثل قرآنك هذا ثلاث مرات والله ما فيه من قرآنك هذا حرف واحد - ۲

(امام نے فرمایا) اور ہمارے پاس مصحفِ فاطمہ علیہا السلام ہے اور لوگ کیا جانیں کہ مصحفِ فاطمہ کیا ہے؟ فرمایا وہ ایسا مصحف (قرآن) ہے جو تمہارے قرآن سے تین گنا ہے۔ خدا کی قسم، تمہارے قرآن کا اُس میں ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

قرآنِ کریم عربی زبان میں ہے اور عربی کے اٹھائیس حروفِ تہجی ہیں جبکہ مصحفِ فاطمہ کے اندر ان میں سے کوئی حرفِ تہجی حسبِ روایت بالا استعمال نہیں ہوا، تو اس کی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ مصحفِ فاطمہ یقیناً عربی کے علاوہ کسی اور زبان میں ہے۔ شیعہ علماء کو چاہیے کہ وہ اپنے مذکورہ قرآنوں کی تلاوت کیا کریں اور شیعہ عوام کو اپنے علماء سے ان قرآنوں کی زیارت کا ضرور مطالبہ کرنا چاہیے کیونکہ دین کا ماتخذ قرآن ہے، جب قرآن سے عمر بھر محروم رہے تو دین و

ایمان کیسا؟

تحریف قرآن کے بارے میں شیعہ حضرات کا تفصیلی عقیدہ مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے:

المستفاد من مجموع هذه الاخبار وغيرها من الروايات من طريق اهل البيت عليهم السلام ان القرآن الذي بين اظہرنا ليس بتمامه كما انزل على محمد صلى الله عليه وآله وسلم بل منه ما هو خلاف ما انزل الله ومنه ما هو مغير محرف وانه قد حذف عنه اشياء كثيرة منها اسم على عليه السلام في كثير من المواضع ومنها لفظة آل محمد غير مرة ومنها اسماء المنافقين في مواضعها ومنها غير ذلك وانه ليس ايضا على الترتيب المرضي عند الله وعند رسوله وبه قال على

ان تمام حدیثوں اور ان کے علاوہ جس قدر روایات اہل بیت علیہم السلام سے مروی ہیں، ان سے استفادہ ہے کہ جو قرآن ہمارے سامنے موجود ہے وہ سارا اُس طرح نہیں ہے جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا تھا، بلکہ اس میں بعض باتیں ما انزل اللہ کے خلاف ہیں اور بعض ہیں تغیر و تبدل کر دیا گیا ہے اور بے شک کتنی ہی باتیں اس سے حذف کر دی گئی ہیں جیسے کتنے ہی مقامات سے حضرت علی علیہ السلام کا نام اور کئی جگہ سے آل محمد کا لفظ اور متعدد جگہ سے منافقین کے نام اور ان کے علاوہ کئی چیزیں، علاوہ بریں اس کی ترتیب اللہ اور رسول کی پسندیدہ ترتیب کے مطابق نہیں۔ یہی خیالات علی بن ابراہیم کے ہیں۔

بن ابراہیم - لہ

یہ ہے شیعہ حضرات کا قرآن کریم کے بارے میں واضح عقیدہ۔ ان حضرات کے معتمد زمرہ اکابر سے

موت پا حضرات ایسے ہیں جنہوں نے اپنے اکابر اور اپنی جماعت کے برخلاف عقیدہ تحریف پر
علم اعتماد کا اہتمام کیا ہے اُن کے نام یہ ہیں،

۱۔ ابی جعفر محمد بن علی بن حسین بن موسیٰ بن بابویہ قمی الملقب بالصدوق (المتوفی ۳۸۱ھ)

۲۔ شیخ مفید، سید مرتضیٰ، علم الہدی (المتوفی ۴۳۶ھ)

۳۔ شیخ الطائف، ابوجعفر محمد بن حسن طوسی (المتوفی ۴۶۰ھ)

۴۔ ابوعلی طبرسی (المتوفی ۵۲۸ھ)

گویا چھ صدیوں میں شیعہ حضرات کے اندر ان چار کے علاوہ کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا،
جن کا قرآن کریم کے محرف ہونے پر عقیدہ نہ ہو۔ حالانکہ ان چاروں حضرات کی سارے شیعہ اکابر
کے رد بروحیت کیا اور دیگر اکابر شیعہ نے جو تحریف قرآن کے بارے میں احادیث اپنی اُن مائتہ ناز
صاف میں شامل کی ہوئی ہیں جن پر ان کے مذہب کا دار و مدار ہے نیز ان کا برہیل بیت وائمہ دین کے
تحریف قرآن کے متعلق بیانات نقل کیے ہوئے ہیں، اُن کے بالمقابل ان چاروں حضرات کے، بغیر
کسی دلیل کے، ذاتی اقوال و نظریات کی وقعت اور قدر و قیمت کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ راہ ہدایت
غیب فرمائے۔ آمین

علاوہ بریں یہ چاروں حضرات بھی ہرگز اس بات کے قائل نہیں کہ موجودہ قرآن کریم وہی ہے
جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) پر نازل فرمایا تھا، بلکہ اب کا عقیدہ
یہ ہے کہ اصلی قرآن تو واقعی سترہ ہزار آیات کا یا ستر گز لمبا ہی تھا، اُس میں سے کتنی ہی
آیتیں اور بعض آیتوں کے الفاظ صحابہ کرام نے حذف کر دیے تھے، اس طرح موجودہ
قرآن ہے تو اُسی قرآنِ منزل من اللہ کا حصہ لیکن یہ پورا اور مکمل نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی
چاروں حضرات اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ قرآن کریم کے الفاظ وہی ہیں جو اصلی قرآن کے
تھے، اس میں اضافہ قطعاً نہیں ہوا ہے، ہاں کمی بہت کچھ کر دی گئی ہے۔ اسی لیے ان چاروں
شیعہ حضرات کو یہ تلقین بھی کی کہ وہ بے کھٹکے اپنی نمازوں میں اس قرآن مجید کی تلاوت
کرسکتے ہیں کیونکہ اس میں کسی بشر کا کلام شامل نہیں ہے۔

ان چاروں حضرات نے اپنی مزعومہ احادیث، ائمہ کی جانب گھڑتے ہوئے نظریات اور

اپنے اکابر کی تصریحات کے خلاف اس قرآن کریم کی صحت پر کیوں زور دیا؟ بات اصل میں یہ ہے کہ شیعہ حضرات اپنے مخالفین کے روبرو حدیث نقلین کو بڑی شد و مد سے پیش کرتے آئے ہیں تاکہ اہلبیت اطہار کی عقیدت کے غود کو علمبردار منوا سکیں، لیکن اہلبیت تو نقل و دم ہیں جبکہ نقل اول قرآن مجید ہے۔ یہ حدیث پیش کرتے ہوئے رافضی مناظرین کو یہ دقت پیش آتی تھی کہ موجود قرآن کریم کو تحریف شدہ ماننے کے بعد شیعہ حضرات کو مسلمان ثابت نہیں کیا جاسکتا تھا، کیونکہ دین کا اولین ماخذ تو یہی کلام الہی ہے، جن کے مذہب کا مدار قرآن مجید پر نہیں اس کے پاس دین کہاں۔ قرآن کریم کو محرف ثابت کرنے کی غرض سے شیعہ حضرات کو عبد اللہ بن صحابہ کرام سے دشمنی سب کے اتباع میں بغض صحابہ سے سرشار ہونا پڑا اور صحابہ کرام تک کے خلاف حدیثیں گھڑ کر، فرضی الزامات قائم کر لیے اور ان پاکباز ہستیوں کو داغدار کھانے پراڑی چوٹی کا زور لگانا شروع کر دیا چنانچہ اصول کافی میں ہے:

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام فی	ارشاد باری تعالیٰ: ان الذین امنوا ثم
قول اللہ عزوجل ان الذین امنوا ثم	کفر واثم امنوا ثم کفروا کی
کفروا ثم امنوا ثم کفروا قال	تفسیر میں امام جعفر صادق علیہ السلام سے
نزلت فی فلان وفلان وفلان امنوا	منقول ہے کہ یہ آیت فلان، فلان اور
بالنبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	فلان کے حق میں نازل ہوئی، جو پہلے
فی اول الامر وکفروا حیث	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے
عرضت علیہم الولایت حبیب	آئے تھے اور جب ان پر ولایت (ولاء)
قال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ و	علی، پیش کی گئی تو کافر ہو گئے جبکہ حضور
سلم من کنت مولاہ فعلی مولاہ ثم امنوا	علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ جس کا
بالبیعة لامیر المؤمنین علیہ	آقا میں ہوں پس علی بھی اس کا آقا ہے۔
السلام ثم کفروا حیث مضی	پھر امیر المؤمنین علیہ السلام کی بیعت پر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ و	ایمان لائے لیکن رسول اللہ صلی اللہ
آلہ وسلم فلم یقر وبالبیعة ثم ازدادوا	علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد کافر ہو گئے۔

کفرًا باخذہم من باعہ بالبیعة
 لہم فہؤلاء لم یبق فیہم من الایمان
 شیء۔ لہ

انہوں نے بیعت کا اقرار نہ کیا ، پھر
 امیر المؤمنین کی بیعت کا اقرار کرنے والوں
 سے اپنی بیعت لے کر کفر میں اور بڑھ گئے
 یہ وہ ہیں جن میں ایمان کا کوئی ذرہ باقی
 نہ رہا۔

اصول کافی کی تفسیر صافی میں ہے کہ فلاں اور فلاں سے مراد حضرت ابو بکر ، حضرت عمر اور
 حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اسی اصول کافی میں متصلاً یہ حدیث بھی ہے :

عن ابی عبد اللہ علیہ السلام
 فی قول اللہ تعالیٰ ان الذین
 استردوا علی ادبارہم من
 بعد ما تبیین لہم الہدی فلاں
 وفلاں وفلاں استردوا عن
 الایمان وترك ولاية امیر
 المؤمنین علیہ
 السلام۔ لہ

ارشاد باری تعالیٰ : ان الذین استردوا
 علی ادبارہم من بعد ما تبیین
 لہم الہدی کی تفسیر میں امام
 جعفر صادق علیہ السلام سے منقول ہے
 کہ مراد فلاں وفلاں وفلاں ہیں جو امیر المؤمنین
 علیہ السلام کی ولایت کو ترک کرنے کے
 باعث ایمان سے پھر گئے (مرتد ہو گئے)
 تھے۔

تفسیر صافی والے نے فلاں وفلاں کی نشان دہی کرتے اور باقی جملہ صحابہ کرام کو منافق ٹھہرتے
 ہوئے لکھا ہے کہ : ”مراد عثمان و ابوسفیان و معاویہ است۔ برگشتہ انداز ایمان در مجلس منافقان
 بسبب ترک ولایت امیر المؤمنین۔“ ان حضرات نے سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ
 افراد یعنی صحابہ کرام حبیبی عیدم النظیر جماعت کو اپنی مشن ستم کا نشانہ بناتے ہوئے مسلمانوں کی دلازاری
 کا یہاں تک اہتمام روا رکھا ،

عن حمزان بن اعیین قال قلت
 حران بن اعیین کہتے ہیں کہ میں نے امام

لابی جعفر علیہ السلام جعلت
فداک ما اقلنا لو اجتمعنا
على شاة ما افینناها فقال
الا احدثک باعجب من
ذالك الماحجرون و
الانصار ذهبوا الا
واشار بيده ثلاثة - له
محمد باقر علیہ السلام سے عرض کی، میں
آپ پر قربان ہو جاؤں، ہم تعداد میں
کتنے کم ہیں کہ اگر کسی دسترخوان پر ایک
بکری کمانے کے لیے جمع ہوں، تو ساری
بکری نہیں کھا سکتے۔ آپ نے فرمایا، کیا
میں تجھے اس سے بھی عجیب بات نہ
بتاؤں۔ مہاجرین و انصار سے (حضور
کے بعد) سب مرتد ہو گئے ماسوائے
تین کے جو ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

مذکورہ تین حضرات کی نشان دہی فروع کافی میں یوں کی گئی ہے :

عن ابی جعفر قال کان الناس
اهل سرمة بعد النبی
الا ثلاثة فقلت و من
الثلاثة فقال المقداد
ابن الاسود و ابوذر
غفاری و سلمان الفارسی - له
امام محمد باقر سے روایت ہے۔ انھوں
نے فرمایا کہ نبی مکرّم کی وفات کے بعد
تین کے علاوہ باقی سب مرتد ہو گئے تھے۔
میں نے پوچھا، وہ تین کون ہیں؟ فرمایا،
مقداد بن الاسود، ابوذر غفاری اور
سلمان فارسی۔

ستم ظریفی تو لحاظ ہو کہ یہاں سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے
بعد تین حضرات کا اسلام پر قیام رہنا بیان ہوا ہے اُس کی رُو سے سارے اہلبیت بلکہ
سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی اسلام سے پھر جانے والوں میں شامل کر دیا۔ ان
حالات میں نااطع سر بگریباں ہے اور پڑھنے والے سرگرداں رہ جاتے ہیں کہ یا الہی! یہ لوگ جو
اہلبیت کی محبت کا دھول پوری طاقت سے بجاتے پھر رہے ہیں، ان کے اس خوشحال نعرے

کی حقیقت کیا ہے؟ دوسری جانب قرآن کریم کو محرف اور اہل بیت کو مظلوم دکھانے کی غرض سے صحابہ کرام کو منافق و مرتد دکھانے اور باور کرانے کا دہال اپنے سر لیا۔ مخالفت صحابہ پر اپنے مقبوعین کو آمادہ کر لینا حقیقت میں عبداللہ بن سبا جیسے مسلم نمایہودی کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ اُس نے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت کے درمیان سے اُس مضبوط ترین واسطے کو نکال دیا جو کہ وہ صحابہ کے نام سے چار دہانگ عالم میں مشہور و معروف ہے۔ جن حضرات نے اس عظیم الشان واسطے کو ناقابل یقین تسلیم کر لیا، اُن کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دین حاصل کرنے کا آخر ذریعہ کیا ہے؟ کاش ایہ حضرات اب بھی عقل و دانش کو کام میں لاتے ہوئے اگر اس سراسر غیر اسلامی روش کو ترک کر دیں، اُن مقدس ہستیوں پر تیز بازی کر کے اُس شمع رسالت کی دلا زاری نہ کریں جس کی وہ کرنیں تھیں اور ملت اسلامیہ کو روحانی اذیت نہ پہنچایا کریں تو اس میں خود اُن کا بھی بھلا ہے۔ وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ایسے افکار و مسائل جو مختلف جماعتوں کے درمیان بُعد اور منافرت کا سبب ہیں، اُن پر ٹھنڈے دل و دماغ سے نظر ثانی کر کے اتفاق و اتحاد کی جانب قدم اٹھایا جائے ورنہ وہ دن دور نہیں کہ غیر اسلامی نظریات اور دین سے بغاوت کا جو سیلاب پوری دنیا نے اسلام کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے ہے وہ اتنی شدت اختیار کر جائے گا کہ کسی بھی تنہا جماعت کو سنبھلے کا موقع نہیں دے گا۔ ہمیں امید و انتہی ہے کہ یہ حضرات غصے میں آنے اور جھنجھلانے کے بجائے عقل سے کام لیتے ہوئے بہتری کا راستہ اختیار کریں گے وَمَا ذَاكَ عَلَى اللَّهِ بِعَزِيزٍ۔

یہ حقیقت ہے کہ اصحاب ثلاثہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں انتہائی محبت اور عقیدت لقیہ و احترام کے رشتے پوری طرح استوار تھے۔ اُن میں سے ہر بزرگ ایک دوسرے کو اپنی جان سے عزیز سمجھتا تھا اور خصوصاً اہل بیت اطہار سے تو جمیع صحابہ کرام کو جو آقائے کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قُرب کی بدولت محبت و عقیدت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق اور حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ہاتھوں پر رضا و رغبت بیعت کی۔ ہمیشہ اُن کے مشیر خاص اور دست و بازو بن کر رہے۔ یہ چاروں بزرگ فرخندہ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد اُمتِ محمدیہ کے سرپرست تھے اور ان حضرات کی تمام تر توانائیاں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے وقف تھیں۔ خاتی غرض یا

دنیاوی منفعت کا سایہ تک ان میں سے کسی بزرگ کے نزدیک سے نہ گزر سکا۔ سارے ہی فقر فیزی کا نمونہ اور ہادی دو جہاں کے نقوش قدم کو مشعل راہ بنائے ہوئے تھا۔

بڑا ہونفسانیت کا کہ ایک یہودی عبداللہ بن سبا کی سازش سے بعض مدعیان اسلام نے ان حضرات کے رشتہ محبت و اخوت کو بغض و عداوت بتانا شروع کر دیا۔ یہ دیرینہ سازش آج تک اپنے قدم جمائے ہوئے ہے اور مسلمان کھلانے والوں میں آئے دن سرچٹول کا سبب بن جاتی ہے۔ جب ان حضرات سے کہا جاتا ہے کہ جن بزرگوں میں آپ عداوت و نفرت باتے ہیں ان کے بارے میں تو فریقین کی تصانیف یہ بتا رہی ہیں کہ کمال محبت تھی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان بزرگوں کے ہاتھوں پر بخوشی بیعت کی اور تینوں کے ساتھ تازلیست محبت و الفت رہی۔ اس کے جواب میں شیعہ حضرات یہ گوفہ چھوڑتے ہیں کہ حقیقت میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرات خلفائے ثلاثہ کے مابین انتہائی عداوت اور نفرت تھی لیکن شیر خدا نے جو ان کے ہاتھوں پر بیعت کی، تازلیست ان کے دست و بازو بنے رہے اور ان حضرات کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہے تو یہ سب کچھ بر بنائے تقیہ تھا۔ چنانچہ اس بنائے فاسد کو مضبوط و مستحکم کرنے کی خاطر یہ حضرات حسب منشا احادیث و آثار گھڑنے اور اپنی تصانیف میں شامل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب یہ منسوب کیا:

قال ابو جعفر علیہ السلام التقیۃ امام محمد باقر علیہ السلام نے فرمایا کہ تقیہ

من دینی و دین ابائی و لا ایمان میرا اور میرے آباؤ اجداد کا دین ہے۔ جو

لعم لا تقیۃ لہ۔ ۱۔ تقیہ نہ کرے اس کا ایمان ہی نہیں۔

امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب تقیہ جیسے صریح کذب، منافقت اور ٹھیسٹ خباثت کو درست ثابت کرنے کی خاطر، کمال جہارت سے یہ الفاظ منسوب کر دیے:

قال ابو عبد اللہ علیہ السلام امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ

یا ابا عمران تسعة اعشار الدین اے ابو عمران! دین کے نو حصے تقیہ میں ہیں

فی التقیة ولا دین لمن لا
تقیة له۔ ۱۔
اور جو تقیہ نہ کرے اُس کا کوئی دین نہیں ہے۔

یزامام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اسلام کے بطل حلیل کی جانب یہ قول بھی منسوب کیا ہوا ہے:
یا سلیمان انکم علی دین من
کتہ اعز اللہ و من
اذا عہ اذ لہ اللہ۔ ۲۔
اے سلیمان! تم ایسے دین پر ہو کہ جو اسے
چھپائے اللہ تعالیٰ اُس کو عزت دے گا
اور جو اسے ظاہر کرے خدا اُسے ذلیل
کرے گا۔

بکہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب گھڑا ہوا یہ حکم بھی نشر کرتے رہتے ہیں:
من اذا ع علینا شیئاً من
امرنا کم قتلنا عدواً
ولم یقتلنا خطاء۔ ۳۔
جس نے ہمارے دین میں سے کسی چیز کو
ظاہر کیا، وہ اس شخص کی مانند ہے جس
نے غلطی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر ہمیں
قتل کیا۔

شیعہ حضرات کی خدمت میں ہماری عاجزانہ التماس ہے کہ امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
کے مذکورہ ارشاد پر وہ حضرات عمل فرمائیں اور خلفائے اربعہ کے مابین جو انھوں نے بُغض و عداوت
کی کہانیاں گھڑی ہوئی ہیں، انھیں ازراہ تقیہ ہی سہی، نشر کرنے سے باز رہا کریں۔ آخر جب
حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فرضی عداوت کا کسی مرحلے پر تازلیست اظہار نہ کیا، حضرت
امامین عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے کبھی یہ نہ کہا کہ ہمارے گھرانے اور حضرات خلفائے ثلاثہ
میں کسی قسم کی شکر رنجی تھی، اگر شیعہ حضرات کے نزدیک یہ سب کچھ تقیہ کے باعث تھا، تو یہ
حضرت بھی ایسا ہی تقیہ اختیار کر لیں اور ان بزرگوں کی طرح عداوت و نفرت کے تنگوفے نہ چھوڑا
کریں اور بقول حضرت امام جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے دین بننے اور خود کو اہل بیت اطہار کا

قاتل و کھانے سے اجتناب کریں۔ اگر واقعی اس باب میں اکابر اہلبیت تقیہ فرماتے رہے تو شیعہ حضرات کیوں اس تقیہ پر عمل پیرا نہیں ہوتے؟

۵۔ نے فروعت حکم و نے از اصول
شرم بادت از خدا و از رسول

شیعہ حضرات نے ایک جانب دین کو حرف غلط ٹھہرانے کی مہم چلائی کہ قرآن کریم کو متعہ تحریف شدہ اور صحابہ کرام کو اسلام سے پھر جانے والے باور کروانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہوا ہے تو دوسری جانب مسلمانوں کے اخلاق و کردار کا جنازہ نکال دینے کی خاطر متعہ کو قیامت تک کے لیے جاری بتایا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے عہد کرامت ہند میں ایک مدت تک یہ مباح رہا اور اس کے بعد قیامت تک کے لیے اسے حرام قرار دے دیا گیا۔ شیعہ حضرات نے نہ صرف حرام کو حلال ٹھہرانا اپنا منشور بنالیا بلکہ جو امر کسی وقت مباح تھا اسے اپنے دین کا ایسا ضروری جزو اور لازمی رکن قرار دے لیا کہ عقل انسانی انگشت بدندان رہ جاتی ہے۔ اس حرکت قبیحہ کے احادیث و آثار گھڑ کر وہ فضائل بیان کیے ہیں کہ ان کی صداقت پر یقین رکھنے والے خواہ نماز روزے کے نزدیک نہ جاتیں لیکن متعہ کے ذریعے جنت الفردوس کا ٹکٹ ضرور حاصل کریں گے۔ چنانچہ علامہ علی حائری لاہوری کے والد سید ابوالقاسم نے لکھا ہے:

قال ابو عبد الله عليه السلام	امام جعفر صادق عليه السلام نے فرمایا، کوئی
ما من رجل تمتع ثم اغتسل	شخص ایسا نہیں کہ وہ متعہ کرنے کے
الا خلق الله من كل	بعد غسل کرے مگر اللہ تعالیٰ ہر اس
قطرة تقطر منه	قطرے کے بدلے جو اس سے گرتا ہے
سبعين ملكا يستغفرون الى	ستر فرشتے پیدا کرتا ہے جو قیامت تک
يوم القيامة۔ ۱۰	استغفار کرتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک اور روایت شیعہ حضرات کی معتبر تفسیر منہج الصادقین سے ملاحظہ ہو:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم
من تمتع مرةً امن سخط
اللہ الجبار و من تمتع
مرتين حشرمع الابراس و
من تمتع ثلاث مرات
صاحبني في الجنان - ۱

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا،
جو ایک مرتبہ متعہ کرے وہ خدا کے جبار کے
قہر سے نجات پا گیا اور جو دو مرتبہ کرے
اس کا حشر نیک لوگوں کے ساتھ ہو گا
اور جو تین دفعہ متعہ کرے تو جنت میں
میرا ساتھی ہو گا۔

اس سے بھی اعلیٰ فضائل بتانے والی، شیعہ حضرات کی گھڑی ہوئی یہ حدیث بھی قابلِ غور ہے:

قال النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم من تمتع مرةً درجته
کدرجۃ الحسن و من
تمتع مرتين درجته کدرجۃ
الحسين و من تمتع ثلاث مرات
درجته کدرجۃ علی و من تمتع اربع
مرات درجته کدرجۃ - ۲

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا،
جو ایک دفعہ متعہ کرے اس کا مرتبہ حسن
جیسا ہے اور جو دو مرتبہ متعہ کرے تو
حسین کا درجہ پائے اور جس نے تین
دفعہ متعہ کیا اس کا درجہ علی جیسا ہے
اور جو چار مرتبہ متعہ کرے تو اس کا مقام
میرے جیسا ہے۔

ان احادیث کی صحت پر یقین رکھنے والوں کو کیا پڑی ہے کہ نیکیاں کرنے اور برائیوں سے
بچنے کی مصیبت میں پھٹنے پھریں۔ کیوں نہ مزے سے متعہ کرتے جائیں اور ایسے درجے حاصل
کرتے جائیں جن کا کوئی نیکو کار تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس مسئلے سے انسانی اخلاق و کردار پر
کیا اثر پڑ رہا ہے، کاشش امتوزین متعہ کبھی اس پر بھی ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے
کی زحمت گوارا فرمائیں۔ شیعہ حضرات نے مسائل سے قطع نظر کتنے ہی ایسے نظریات کو اسلامی
عقاید منوانے کی مہم چلائی ہوئی ہے جو قرآن و حدیث کے سراسر خلاف ہیں۔ مثلاً:
۱۔ شیعہ حضرات بارہ اماموں کو انبیائے کرام کی طرح معصوم قرار دیتے ہیں۔

- ۲۔ ائمہ کا مرتبہ انبیائے کرام کے برابر بلکہ ان سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔
 ۳۔ ائمہ کو خدائی میں ذیل اور بالکل مانک و مختار ٹھہراتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ مرتے بھی اپنے اختیار سے ہیں۔

- ۴۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتبہ جملہ انبیائے کرام سے بھی بلند ٹھہراتے ہیں۔
 ۵۔ روافض کے بعض فرقے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اُلوہیت کا حامل بتاتے ہیں۔
 ۶۔ حضرت امام مہدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو غار سرمن رائے میں چھپا ہوا بتاتے ہیں۔
 ۷۔ دعویٰ کرتے ہیں کہ پورا اور اصلی قرآن امام مہدی کے پاس ہے جو بوقتِ ظہور ملے کر آئیں گے۔

- ۸۔ حدیثیں گھڑنے میں انتہائی جبری ہیں اور اپنے مذہب کی بنیاد اسی گھڑنت پر رکھی ہوئی ہے۔
 ۹۔ باغِ فدک کو چھیننے اور یارِ غار رسول کو ناحق بدنام کرنا اپنا مشن بنائے ہوئے ہیں۔
 ۱۰۔ حدیثِ قرطاس کو ناحق بہانہ بنا کر فاروقِ اعظم جیسی جلیل القدر مہستی کو خواہ مخواہ مطعون کرتے رہتے ہیں۔

- ۱۱۔ حُجْمِ غدیر کے واقعے کو بغیر کسی ادنیٰ قرینے کے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافتِ بلا فصل کی دلیل بناتے ہیں۔

- ۱۲۔ اسلامی کلمہ پر محض سید زوری سے اضافہ کر کے اپنا مسلمانوں سے علیحدہ کلمہ گھڑا ہوا ہے۔
 حضرت امیر المؤمنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تو بانیِ رفض یعنی عبد اللہ بن سبا کو ملک بدر کر دیا تھا لیکن شیعہ حضرات اُس مسلم نمایہودی کے خیالات کو اپنے دلوں سے نکالنے پر کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے۔ چنانچہ اسی عبد اللہ بن سبا کے بارے میں رجالِ کُشی کے حوالے سے شیعہ حضرات کے ایک نامور مجتہد استرآبادی نے لکھا ہے؛

فانظروا الی عبارۃ الکُشی ذکر	عبارتِ کُشی ملاحظہ ہو، بعض اہلِ علم نے
بعض اہل العلم ان عبد اللہ	ذکر کیا ہے کہ عبد اللہ بن سبا حقیقت
ابن سبا کان یہودیاً واسلم	میں یہودی تھا۔ وہ مسلمان (بظاہر) ہوا
ووالی علیاً وکان یقول وھو	اور حضرت علی کی محبت کا علم بلند کرنے لگا

علی یہودیتہ فی یوشع و صی
 بالفوقال بعد اسلامہ بعد
 وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ
 وسلم فی علی مثل ذالک نکات
 من اشهر بالقول بغرض
 امامۃ علی علیہ السلام
 البراءۃ من اعدائہ و کاشف
 مخالفیہ و اکفرہم من ہما قال من
 خالف الشیعۃ اهل التشیع والرفض
 من الیہودیت - لہ
 جب وہ یہودی تھا تو حضرت یوشع کے
 وصی ہونے میں غلو کرتا تھا اور مسلمان ہونے
 پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال
 کے بعد اُسی طرح حضرت علی کے بارے
 میں کہنے لگا۔ یہی ہے جس نے امامت علی
 کی فرضیت کا دھول بجایا ، اُن کے
 مخالفین پر تبرک کیا ، فرضی مخالفین گھر سے
 اور اُن کی تکفیر کی۔ بایں وجہ مخالفین شیعہ
 کہتے ہیں کہ اہل تشیع اور رفض کی اصل
 یہودیت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارشادات کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جس
 طرح غار جیت ایک شجر ممنوعہ ثابت ہوتی ہے اُسی طرح رفض بھی ایسی نادان دوستی کا مظاہرہ
 جو دشمنی سے کسی طرح کم نہیں۔ یہ شرف صرف اور صرف اہلسنت و جماعت ہی کو حاصل ہے کہ
 ہر قابل احترام ہستی کا احترام ملحوظ رکھتے اور حفظ مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ یہاں نہ افراط ہے نہ
 تفریط۔ اپنے محبین و مخالفین کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

میحکمک فی صفقان محب مفرط
 تذهب بہ الحب الخ
 غیر الحق و مبغض مفرط
 تذهب بہ البغض الخ
 غیر الحق و خیر
 الناس فی حالاً
 عنقریب میرے بارے میں دو فتنی ہلاک
 ہوں گے۔ محب دوستی میں افراط کرنے
 کے باعث کہ دوستی کو حق سے دُور لے
 جائے گا اور دشمنی کہ دشمنی میں افراط سے
 دشمنی کو حق سے دُور لے جائے گا بہترین
 انسان میرے بارے میں وہ ہے جو

النمط الاوسط فالزموا
السواد الاعظم فان يد الله
على الجماعة و ايتاكم و
الفرقة فالتشاذ
من الناس للشيطان كما ان
التشاذ من الغنم للذئب
الا من دعا الى هذا
الشعار فاقتلوه ولو
كان تحت عامتي - له

میانہ روی اختیار کرے۔ تم سب سے بڑی
جماعت کے اتباع کو لازم جانو، کیونکہ
اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے۔ فرقہ بازی سے
بچ کر رہنا کیونکہ جماعت سے علیحدہ رہنے
والا انسان شیطان کا شکار ہے جیسے
ریوڑ سے جدا ہونے والی بکری بھیڑیے
کا شکار ہوتی ہے۔ غیر دارِ جو تحصیل
جماعت سے علیحدگی کی دعوت دے اُسے
قتل کرو خواہ وہ میری اس دستار کے
نیچے ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد گرامی سنہری حروف میں لکھنے کے قابل اور
مسلمانوں کے لیے بہترین لائحہ عمل ہے۔ محبت کے افراط کی شیعہ حضرات اور عداوت کے افراط
کی خارجی حضرات منہ بولتی تصویریں ہیں۔ بفضلہ تعالیٰ اہلسنت و جماعت ہی میانہ روی اختیار کیے
ہوتے اور مسلمانوں کا سوادِ اعظم (سب سے بڑی جماعت) ہیں، جن کے ساتھ رہنے کی حضرت
مولا مشکل کثارتی اللہ تعالیٰ عنہ نے تاکید فرمائی اور جس سے جدا ہونے والے کو قتل کرنے کا حکم
صادر فرمایا ہے۔ والحمد للہ علی ذالک۔

مسلمانوں سے شیعہ حضرات کی دشمنی اظہر من الشمس
زندوں سے دوستی یا دشمنی پھر اور بات ہے
مسلمانوں سے بغض و عداوت
لیکن ملتِ اسلامیہ سے ان کی عداوت کسی مسلمان کے فوت ہو جانے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی۔
ان کے نزدیک مسلمانانِ اہلسنت و جماعت ہر حالت میں غیر مسلم اور قابلِ لعنت ہیں۔ چنانچہ
لکھا ہے کہ کسی سنی کا جنازہ نہیں پڑھنا چاہیے اور اگر کسی غیر شیعہ کی نمازِ جنازہ پڑھنی پڑ جائے تو
چوتھی بجیر سے پہلیوں بد دعا کرے،

اللهم اخز عبدك في عبادك
 اے اللہ اس بندے کو اپنے بندوں
 اللهم اصله حرًا نارك
 اور شہروں میں ذلیل کر، اے اللہ اسے
 اللهم اذقه اشد
 نارِ جہنم میں ڈال۔ اے اللہ اسے سخت
 عذابک۔ لے عذاب پہنچا۔

بے مل تو ہوئے سیکڑوں ہی سرد تڑپ کر
 ٹھنڈا میرا قاتل کا مگر دل نہیں ہوتا

مسلمانوں کو شیعہ حضرات کی اس حرکت قبیحہ کا کہاں تک افسوس ہو جبکہ ان حضرات نے
 اپنی فرضی محبت کے مرکز و محور یعنی حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات والامعات کو
 اپنی شقِ ستم سے نہ بچنے دیا۔ چنانچہ خود ان کی جانب یہ فرضی قول منسوب کیا ہوا ہے:
 ان علیا علیہ السلام قال علی
 بے شک حضرت علی علیہ السلام نے
 منیر کوفہ یا ایہا الناس
 کوفے کے منبر پر جلوہ افروز ہو کر فرمایا،
 استدعوت الی شیئ
 اے لوگو! تمہیں ایک چیز د میری سب
 فسبوتی۔ لے شتم کی جانب بلایا جائے گا، تو مجھے
 گالیاں دے لینا۔

لا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

۹۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے کارنامے

مرزا غلام احمد قادیانی کی حتمی تاریخ پیدائش تو کسی کو معلوم نہیں، ہاں مرزا صاحب نے
 کتاب البریہ میں ۱۸۳۹ء اور ۱۸۴۰ء بتائی ہے لیکن تریاق القلوب میں ۱۸۴۵ء لکھی ہے۔
 اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ عربی اور انگریزی میں اجد خواں تھے۔ سیا کوٹ پکھری میں

لے تحفۃ العوام، جلد اول، ص ۱۳۸

لے محمد بن یعقوب کلینی: اصول کافی، ص ۴۸۴

بشاہرہ پندرہ روپے ماہوار چار سال تک محترم بھی رہے۔ آبائی پیشہ زمینداری تھا۔ آباؤ اجداد سکھوں اور انگریزوں کے وفادار اور ملازم رہتے آئے تھے۔ والد کا نام مرزا غلام مرتضیٰ تھا۔ مرزا غلام احمد قادیان نے قانونی مختار کاری کا امتحان بھی دیا لیکن فیل ہونے پر تعلیم سے دل اُچاٹ ہو گیا۔ ضعیف دل و دماغ تمام عمر جلائی پر رہا۔ قوتِ مردی سے اکثر اوقات محروم رہے۔ تشنچِ قلب، اسہال، دردِ سر، دورانِ سر، بالیوخیلا اور ذیابیطس وغیرہ امراضِ موصوف کی زندگی کے ساتھی تھے۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو لاہور میں موصوف کا شدتِ اسہال یا ہیضہ سے انتقال ہوا تھا۔ بعد وفات اُن کے منہ سے پانچ نکتے ہوئے دیکھا گیا جو حاضرین کی عبرت کا باعث ہوا۔ مرزا صاحب کے خلفاء اس صورتِ حال کی تردید کرتے رہے۔ والعم عند اللہ۔

۱۸۸۶ء سے مرزا صاحب نے اپنی نبوت کی بنیاد رکھنی شروع کی، لیکن ایسے گول مول لفظوں میں جو صرف کشفِ الہام وغیرہ پر مبنی تھے اور براہین احمدیہ میں اہل گٹھ پھر رہے ہیں۔ قادیان سے براہین احمدیہ اور مدرسہ دیوبند سے تحذیر اناس بیک وقت کھی گئیں۔ علی گڑھ کالج کا اجراء مدرسہ دیوبند کی تاسیس اور براہین احمدیہ کی تصنیف کا زمانہ ایک ہے، گویا برٹش گورنمنٹ نے ملتِ اسلامیہ کے خلاف بیک وقت چار فتنے دہلی، علی گڑھ، دیوبند اور قادیان سے کھڑے کر دیے۔ چاروں فتنے اپنے اپنے رنگ میں نرالے، انتہائی پُر اسرار اور مسلمانوں کے خرمینِ دین و ایمان میں آگ لگانے والے تھے۔ افسوس! ان فتنوں کی کماحقہ مضرت سے مسلمانوں کی اکثریت تا حال باخبر نہیں ہو سکی ہے۔ اگر حقیقت کی تہ میں جھانک کر دیکھا جائے تو صاف نظر آنے لگتا ہے کہ انگریزی حکومت اپنے اسلام دشمن مقاصد میں انتہائی کامیاب رہی تھی۔ کاش! ہم اب بھی ان فتنوں کی مضرت کو سمجھنے لگ جاتیں۔ دہلی سے شش مثل کی آواز، علی گڑھ سے تیج پیت کا نظور، دیوبند سے براہینِ قاطعہ اور فتاویٰ گنگوہی متعلقہ وقوعِ کذب باری اور قادیان سے فتحِ اسلام تو فیضِ مرام اور ازالہِ اوہام کی اشاعت ان فتنوں کی دوسری کڑیاں ہیں۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے جملہ تخریب کاروں سے بڑھ کر وبال اپنے سر لیا کہ نبوت کا دعویٰ کر کے دجالوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اپنی دنیا سنبھالنے کی خاطر کروڑوں مسلمانوں کی عاقبت برباد کر گئے۔ اب موصوف کے چند مخصوص کارنامے ہم بڑے اختصار کے ساتھ

مرد مرزا غلام احمد قادیانی کی تصانیف سے پیش کرتے ہیں۔ موصوف برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کو سخت بد ذاتی اور گناہ سمجھتے تھے۔ اب باقی کارگزاری کی جھلک ملاحظہ ہو۔

تخریب کاری کے چاروں مراکز یعنی دہلی، علی گڑھ، مدرسہ دیوبند اور قادیان مخالفت جہاد میں دو باتیں قدر مشترک تھیں:

۱۔ حکومت کی تائید و حمایت

۲۔ جہاد کی مخالفت

قادیانی قادیان میزبان میدانوں میں اپنے حلیفوں سے گوٹے سبقت لے گیا۔ چنانچہ مرزا صاحب نے بارے میں فرمایا ہے:

”دوسرا امر قابل گزارش یہ ہے کہ میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں کہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور اُن کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال جہاد وغیرہ کے دور کروں، جو دلی صفائی اور غلصہ تعلقات سے روکتے ہیں“ ۱

صاحب نے ممانعت جہاد کے سلسلے میں جو کارنامہ دکھایا اُس کا کئیوں فخریہ ذکر کیا ہے، میں نے ممانعت جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں“ ۲

طوق استعمار مغرب خود کیا زیب گلو

اور گو او اس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

۱۸۸۶ء میں کشف والہام کے دعاوی کرنے کے بعد ۱۸۹۰ء میں مرزا صاحب نے کہنا شروع کر دیا کہ

۱۔ ایضاً، تبلیغ رسالت، ج ۶، ص ۱۰

۲۔ حریاق القلوب، ص ۲۶

۳۔ ایضاً، حریاق القلوب، ص ۲۵

میں مسیح موعود اور عیسیٰ بن مریم ہوں۔ چنانچہ موصوف نے خود لکھا ہے :

”مریم کی طرح عیسیٰ کی روح مجھ میں نفخ کی گئی اور استعارہ کے رنگ میں مجھے حامل ٹھہرا دیا گیا اور آخر کئی مہینے کے بعد، جو دس مہینے سے زیادہ نہیں، بذریعہ اس الہام کے مجھے مریم سے عیسیٰ بنایا گیا۔ پس اس طور سے میں ابنِ مریم ٹھہرا گیا۔
اپنے مسیح موعود ہونے کے دعوے کو مرزا صاحب نے ان لفظوں میں بھی بیان کیا ہے :
”میرا دعویٰ یہ ہے کہ میں وہ مسیح موعود ہوں، جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کی تمام پاک کتابوں میں پیش گوئیاں ہیں کہ وہ آخری زمانے میں ظاہر ہوگا۔“
دوسری جگہ موصوف نے اپنے اسی دعویٰ کو ان لفظوں میں دہرایا ہے :

”جس آنے والے مسیح موعود کا حدیثوں سے پتہ لگتا ہے، اُس کا اُن ہی حدیثوں سے یہ نشان دیا گیا ہے کہ وہ نبی ہوگا اور امتی بھی۔“

اس سے آگے موصوف نے خود کو عیسیٰ علیہ السلام سے افضل بنانے کی مہم شروع کر دی، چنانچہ لکھا ہے :

”خدا نے اس امت میں سے مسیح موعود بھیجا جو اُس پہلے مسیح سے اپنی تمام شان میں بہت بڑھ کر ہے۔ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر مسیح ابنِ مریم میرے زمانے میں ہوتا تو وہ کام جو میں کر سکتا ہوں وہ ہرگز نہ کر سکتا اور وہ نشان جو مجھ سے ظاہر ہو رہے ہیں، وہ ہرگز نہ دکھلا سکتا۔“
مرزا صاحب نے اپنے اس شیطانی دعوے کی دلیل ان مضحکہ خیز لفظوں میں پیش کی ہے :
”جب خدا نے اور اُس کے رسول نے اور تمام نبیوں نے زمانہ کے مسیح کو اُس کے کارناموں کی وجہ سے افضل قرار دیا ہے پھر تو یہ شیطانی دوسوہ ہے کہ یہ کہا جاتے کہ کیوں تم مسیح ابنِ مریم سے اپنے تئیں افضل قرار

دیتے ہوئے لے

مرزا صاحب نے مسیح موعود کے ساتھ آدم ہونے اور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بروز ہونے کو منطقی انداز میں، ان لفظوں کے ساتھ بیان کیا ہے:

”لا جرم خدا نے مجھ کو آدم بنایا اور مجھ کو وہ سب چیزیں بخشیں اور مجھ کو خاتم النبیین اور سید المرسلین کا بروز بنایا اور مجھ پر اس میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ابتداء سے ارادہ فرمایا تھا کہ اُس آدم کو پیدا کرے گا جو آخری زمانہ میں خاتم الخلفاء ہوگا جیسا کہ زمانہ کے شروع میں آدم کو پیدا کیا جو اُس کا پہلا خلیفہ تھا اور یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ فطرت کا دائرہ گول ہو جائے۔“

مرزا صاحب نے بروزِ نفلّی کے معاملے کو بڑھاتے ہوئے خود کو تمام انبیائے بنی اسرائیل کا ظل ان نظروں میں بتایا ہے:

”یہ خدا تعالیٰ پر بدظنی ہے کہ اُس نے مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کی بدی کا تو حصّہ دار ٹھہرا دیا ہے، یہاں تک کہ ان کا نام یہود بھی رکھ دیا مگر اُن کے رسولوں اور نبیوں کے مراتب میں سے اس امت کو کوئی حصّہ نہ دیا۔ پھر یہ امت خیر الائم کس وجہ سے ہوئی؛ بلکہ شر الائم ہوئی کہ ہر ایک نمونہ شر کا ان کو ملا مگر نیکی کا نمونہ نہ ملا۔ کیا ضرور نہیں کہ اس امت میں بھی کوئی نبیوں اور رسولوں کے رنگ میں منظر آوے جو بنی اسرائیل کے تمام نبیوں کا وارث اور اُن کا ظل ہو،“

موصوف نے سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بروز ہونے کا خطبہ الہامیہ میں جو دعویٰ کیا تھا، اسے اور آگے بڑھاتے ہوئے صاف لکھ دیا کہ میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نبیوں کا کمال نمونہ ہوں، مرزا صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

”خدا تعالیٰ نے ابتداء سے ارادہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات معقودہ کے انہما و اثبات کے لیے کسی شخص کو آنجناب کی پیروی اور متابعت

نہ اعظم احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، ص ۱۵۵ ۱۵۷ ایضاً: خطبہ الہامیہ ۴، ص ۱۶۷

۱۵۸ ایضاً: کشتی نوح، ص ۴۴

کی وجہ سے وہ مرتبہ کثرت مکالمات اور مخاطبات الہیہ بخشے کہ جو اُس کے وجود میں
عکسی طور پر نبوت کا رنگ پیدا کر دے۔ سو اس طرح سے خدا نے میرا نام نبی رکھا
یعنی نبوت محمدیہ میرے آئینہ نفس میں منعکس ہو گئی اور خلقی طور پر نہ اصلی طور پر مجھے
یہ نام دیا گیا، تا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ٹھہروں، بلکہ
موصوف نے اپنی بروزی منطق کا ہیر پھیر لفظوں کی جگر بازی میں یوں بھی دکھایا ہے:

”چونکہ میں اُس کا رسول یعنی فرستادہ ہوں مگر بغیر کسی نئی شریعت اور نئے دعوے
اور نئے نام کے بلکہ اُسی نبی کریم، خاتم الانبیاء کا نام پا کر اور اُسی میں ہو کر اور اُسی کا
مظہر بن کر آیا ہوں“ ۱

اسی بات کو موصوف نے اگلے صفحے پر ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

”اس نکتہ کو یاد رکھو کہ میں رسول اور نبی نہیں ہوں یعنی باعتبار نئی شریعت اور نئے
دعوے اور نئے نام کے اور میں رسول اور نبی ہوں۔ یعنی باعتبار ظہیریت کاملہ کے۔
میں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے اور میں
کوئی علیحدہ شخص نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہوتا تو خدا تعالیٰ میرا نام محمد اور احمد
اور مصطفیٰ اور مجتبیٰ نہ رکھتا“ ۲

حقیقی نبوت کا دعویٰ ابتداء میں مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ نبوتی خلقی بروزی وغیرہ
پر دوں میں طفوف رکھا لیکن اُن کا قدم وقت کے ساتھ ساتھ
آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں عیسوی ختم ہوئی اور ادھر مرزا صاحب نے
اپنے پچھلے دعویٰ کو چھوڑتے ہوئے ۱۹۰۱ء میں حقیقی نبوت کا دعویٰ کر دیا یعنی کمال شعبہ بازی
دکھاتے رہے اور لفظوں کا ہیر پھیر آخری دم تک سلامت رکھا۔ مثلاً لکھتے ہیں:
”ہلاک ہو گئے وہ جنہوں نے ایک برگزیدہ رسول (یعنی مرزا صاحب) کو قبول

نہ کیا۔ مبارک وہ جس نے مجھ کو پہچانا۔ میں خدا کی سب راہوں میں سے آخری راہ ہوں اور اُس کے سب نوروں میں سے آخری نور ہوں۔ بد قسمت ہے وہ جو مجھے چھوڑتا ہے کیونکہ میرے بغیر سب تاریکی ہے۔ ۱۔

مرزا صاحب کی حبسی شیطانی نبوت تھی اُسی کے مطابق وحی بھی نقدی کی صورت میں ہوتی تھی، جس کی خاطر موصوف نے یہ سارا شیطانی ڈرامہ ٹیچ کیا تھا۔ چنانچہ ٹیچی فرشتے کی ایک آمد کا موصوف نے یوں تذکرہ کیا ہے:

”ایک دفعہ مارچ ۱۹۰۵ء کے مہینے میں بوقت قلت آمدنی لنگر خانہ کے مصارف میں بہت دقت ہوئی کیونکہ کثرت سے مہمانوں کی آمد تھی اور اُس کے مقابل پر روپیہ کی آمدنی کم، اس لیے دُعا کی گئی۔ ۵ مارچ ۱۹۰۵ء کو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص جو فرشتہ معلوم ہوتا تھا میرے سامنے آیا اور اُس نے بہت سا روپیہ میرے دامن میں ڈال دیا۔ میں نے اُس کا نام پوچھا۔ اُس نے کہا، نام کچھ نہیں۔ میں نے کہا، آخر کچھ تو نام ہو گا؟ اُس نے کہا، میرا نام ہے ٹیچی ٹیچی۔ پنجابی زبان میں وقت مقررہ کو کہتے ہیں یعنی عین ضرورت کے وقت آنے والا تب میری آنکھ کھل گئی۔ بعد اُس کے خدا تعالیٰ کی طرف سے کیا ڈاک کے ذریعے سے اور کیا براہ راست لوگوں کے ہاتھوں سے اس قدر مالی فتوحات ہوئیں جن کا وہم و گمان نہ تھا اور کئی ہزار روپیہ آگیا۔ چنانچہ جو شخص اس کی تصدیق کے لیے صرف ڈاکخانے کے رجسٹری ۵ مارچ ۱۹۰۵ء سے آخر سال تک دیکھے اُس کو معلوم ہو گا کہ کس قدر روپیہ آیا تھا۔ ۲۔

جو طاقت اس خوشحال ملک کی دولت کو لوٹ رہی تھی وہ اگر اپنے کسی خودکاشتہ پودے پر دس بیس ہزار روپیہ سالانہ خرچ کرتی رہے تو کون سا اُسے اپنے کنگال ملک سے لانا پڑتا تھا۔ آخر وہ وقت مقررہ پر پہنچنے والے ٹیچی ٹیچی جو ہوئے۔ ضرورت خود معلوم کرتے رہتے تھے اور ادھر سے

مطالبے بھی پہنچتے ہوں گے، جنہیں الہام کا نام دے کر مرزا صاحب رقمطراز ہیں،

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی مجھ سے یہ عادت ہے کہ اکثر جو نقد روپیہ آنے والا ہو یا اور چیزیں تحائف کے طور پر ہوں اُن کی خبر قبل از وقت بذریعہ الہام یا خواب کے مجھ کو دے دیتا ہے اور اس قسم کے نشان پچاس ہزار سے کچھ زیادہ ہوں گے۔
بہر حال یہ تو دعویٰ نبوت کے سلسلے میں مرزا صاحب اور اُن کی مرتبی حکومت کا معاملہ تھا۔ یہاں دعویٰ نبوت کے سلسلے میں موصوف کی چند عبارتیں پیش کرنا مد نظر ہے۔ چنانچہ مرزا صاحب نے بڑے طمطراق سے تحریر کیا ہے:

”خدا کا کلام اس قدر مجھ پر نازل ہوا ہے کہ اگر وہ تمام کھا جائے تو میں جزو سے کم نہیں ہوگا۔“ ۱

موصوف نے اپنے تئیں حضرت نوح علیہ السلام پر فضیلت دیتے ہوئے صاف لکھا ہے:
”خدا تعالیٰ میرے لیے اس کثرت سے نشان دکھلا رہا ہے کہ اگر نوح کے زمانہ میں وہ نشان دکھلائے جاتے تو وہ لوگ غرق نہ ہوتے۔ مگر میں اُن کو کس سے مثال دوں، وہ اس خیرہ طبع انسان کی طرح ہیں جو روز روشن کو دیکھ کر پھر بھی اس بات پر ضد کرتا ہے کہ رات ہے دن نہیں۔“ ۲

حضرت یوسف علیہ السلام سے خود کو افضل بتاتے ہوئے موصوف نے تحریر کیا ہے:
”اس امت کا یوسف یعنی یہ عاجز اسرائیلی یوسف سے بڑھ کر ہے کیونکہ یہ عاجز قید کی دعا کر کے بھی قید سے بچا یا گیا مگر یوسف بن یعقوب قید میں ڈالا گیا اور اس امت کے یوسف کی بریت کے لیے پچیس برس پہلے ہی خدا نے آپ گواہی دے دی اور بھی نشان دکھلائے مگر یوسف بن یعقوب اپنی بریت کے لیے انسانی گواہی کا محتاج ہوا۔“ ۳

مرزا صاحب نے اپنی ذات کو تمام انبیائے کرام کے کمالات کی جامع بتاتے ہوئے صاف لکھا ہے :

”دنیا میں کوئی نبی نہیں گزرا جس کا نام مجھے نہیں دیا گیا۔ سو جیسا کہ براہین احمدیہ میں خدا نے فرمایا ہے کہ میں آدم ہوں، میں نوح ہوں، میں ابراہیم ہوں، میں اسماعیل ہوں، میں یعقوب ہوں، میں اسماعیل ہوں، میں موسیٰ ہوں، میں داؤد ہوں، میں عیسیٰ ابن مریم ہوں، میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں یعنی بروزی طور پر، جیسا کہ خدا نے اُسی کتاب میں یہ سب نام مجھے دیے اور میری نسبت جبری اللہ فی حلال الانبیاء فرمایا، یعنی خدا کا رسول، نبیوں کا پیر ہوں۔ سو ضرور ہے کہ ہر ایک نبی کی شان مجھ میں پائی جائے۔“ ۱

مرزا صاحب اپنے متعلق بشارتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کتنے فخریہ انداز میں انبیائے کرام کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مرکز بن بیٹھے۔ چنانچہ ان امور کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

”اے عزیزو! تم نے وہ وقت پایا ہے جس کی بشارت تمام نبیوں نے دی ہے اور اُس شخص کو تم نے دیکھ لیا، جس کے دیکھنے کے لیے بہت سے پیغمبروں نے بھی خواہش کی تھی۔ اس لیے اب اپنے ایمانوں کو خوب مضبوط کرو اور اپنی راہیں درست کرو۔“ ۲

موصوف نے اپنے فرضی معجزات کی کثرت کے پیش نظر انبیائے کرام کی توہین کا یہ اہتمام بھی کیا تھا :

”اُس (خدا) نے میرا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے اس قدر معجزات دکھائے ہیں کہ بہت ہی کم نبی ایسے آئے ہیں جنہوں نے اس قدر معجزات دکھائے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس نے اس قدر معجزات کا دریا رواں کر دیا ہے کہ باستثناء ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی تمام انبیاء علیہم السلام میں اُن کا ثبوت اس کثرت

کے ساتھ قطعی اور یقینی طور پر محال ہے اور خدا نے اپنی محبت پوری کر دی ہے اب چاہے کوئی قبول کرے یا نہ کرے ۱۷

مرزا صاحب نے اپنے فرضی معجزات کی تعداد بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”میری تائید میں اُس نے وہ نشان ظاہر فرمائے ہیں کہ..... اگر میں اُن کو فرداً فرداً

نہا کر دوں تو میں خدا تعالیٰ کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ وہ تین لاکھ سے بھی زیادہ ہیں ۱۸

لیکن اپنے اسی قلم ناحق رقم سے سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے معجزات کی تعداد بتاتے ہوئے لکھا ہے:

”تین ہزار معجزات ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ظہور میں آئے۔ ۱۹

بہر حال موصوف کو اپنے معجزات وغیرہ کا پورا مزہ مل رہا ہوگا۔ برطانوی نبوت خوب رنگ دکھا رہی ہوگی موصوف نے اپنی اسی مخصوص ترنگ میں اپنے معجزات کی کثرت کا یہ فرضی افسانہ اور شیطانی قصہ بھی سنایا تھا،

خدا تعالیٰ نے اس بات کے ثابت کرنے کے لیے کہ میں اُس کی طرف سے ہوں،

اس قدر نشان دکھلائے ہیں کہ اگر وہ ہزار نبی پر تقسیم کیے جائیں تو اُن کی بھی ان سے

نبوت ثابت ہو سکتی ہے، لیکن چونکہ یہ آخری زمانہ تھا اور شیطان کا مع اپنی تمام

ذریت کے آخری حملہ تھا، اس لیے خدا نے شیطان کو شکست دینے کے لیے ہزار ہا

نشان ایک جگہ جمع کر دیے لیکن پھر بھی جو لوگ انسانوں میں سے شیطان ہیں، وہ نہیں

مانتے ۲۰

مرزا صاحب نے جملہ انبیائے کرام پر اپنی افضلیت بتاتے ہوئے فارسی میں یہ تین شعر بھی لاپے تھے:

انبیاء گر چہ بودند بے من
بعرفاں نہ مکرّم ز کے

آنچه دادست ہر نبی را جام داد آن جام را مرا بہ تمام
کم نیم زان ہمہ پرفتنے یقین ہر کہ گوید دروغ ہست لعین

مقدس بارگاہوں میں دریدہ دہشتی توہین و تنقیص کی ہے لیکن حضرت عیسیٰ علی نبینا
و علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان میں تو ایسے ایسے یہودہ کلمات لکھے اور شایع کیے ہیں جن کی
ایک مسلمان ہرگز جہارت نہیں کر سکتا۔ موصوف نے لکھا ہے :

تعرض حسین کو نبیوں پر فضیلت دینا یہودہ خیال ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ وہ بھی خدا
کے راست باز بندوں میں سے تھے، لیکن ایسے بندے تو کروڑ ہا دنیا میں گزر
چکے ہیں اور خدا جانے آگے کس قدر ہوں گے۔ پس بلا وجہ اُن کو تمام انبیاء کا
سردار بنادیا خدا کے پاک رسولوں کی سخت ہتک کرنا ہے۔ ایسا ہی خدا نے اور
اُس کے پاک رسول نے بھی مسیح موعود کا نام نبی اور رسول رکھا ہے اور تمام
خدا تعالیٰ کے نبیوں نے اُس کی تعریف کی ہے اور اُس کو تمام انبیاء کے صفات کا
کا مظہر ٹھہرایا ہے اب سوچنے کے لائق ہے کہ امام حسین کو اُس سے کیا نسبت
ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن اور احادیث اور تمام نبیوں کی شہادت
سے مسیح موعود حسین سے افضل ہے اور جامع کمالات متفرق ہے۔ پھر اگر
درحقیقت میں ہی مسیح موعود ہوں تو خود سوچ لو کہ حسین کے مقابل مجھے کیا وجہ
دینا چاہیے اور اگر میں وہ نہیں ہوں تو خدا نے صد ہا نشان کیوں دکھلائے اور
کیوں وہ ہر دم میری تائید میں ہے؟

”دوسرے مقام پر مرزا صاحب شیعہ حضرات کو مخاطب کر کے امام عالی مقام سیدنا حسین رضی اللہ
تعالیٰ عنہ کی یوں کسر شان کرتے ہیں :

”اے قوم شیعہ! اس پر اصرار مت کرو کہ حسین تمہارا منجی ہے کیونکہ میں سچ سچ

کتنا ہوں کہ آج تم میں ایک ہے کہ اُس حسین سے بڑھ کر ہے۔

کربلائیت سیر ہر آنم
صد حسین است در گریبانم

کنواری بتول حضرت مریم علیہا السلام پر نکاح کرنے کی تمت لگا کر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تنقیص کرتے ہوئے مرزا صاحب نے یوں اپنے کذاب ہونے کا ثبوت دیا ہے:

”مریم کی وہ شان ہے جس نے ایک مدت تک اپنے تئیں نکاح سے روکا، پھر بزرگان قوم کے نہایت اصرار سے بوجہ حمل کے نکاح کر لیا۔ گو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ برخلاف تعلیم توریت عین حمل میں کیوں کیا گیا اور بتول ہونے کے عہد کو کیوں ناخن توڑا گیا اور تعداد ازواج کی کیوں بنیاد ڈالی گئی یعنی باوجود یوسف بنجار کی پہلی بیوی کے ہونے کے مریم کیوں راضی ہوئی کہ یوسف بنجار کے نکاح میں آوے؛ مگر میں کہتا ہوں کہ یہ سب مجبوریاں تھیں جو پیش آ گئیں۔“

فرضی یوسف بنجار کو مرزا صاحب نے اپنی خصلت سے مجبور ہو کر عیسیٰ علیہ السلام کا والد بھی لکھا ہے۔
مثلاً:

”حضرت مسیح ابن مریم اپنے باپ یوسف کے ساتھ بائیس برس تک نجاری کا کام بھی کرتے رہے ہیں۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظاہر و باہر معجزات کے بارے میں مرزا صاحب یوں آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں:

”عیسائیوں نے بہت سے آپ کے معجزات لکھے ہیں مگر حق بات یہ ہے کہ آپ سے کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا اور اُس دن سے کہ آپ نے معجزہ مانگنے والوں کو گندی گالیاں دیں اور اُن کو حرام کار اور حرام کی اولاد ٹھہرایا، اُسی روز سے شریفیوں نے

۱۔ غلام احمد قادیانی: در ثمنین، ص ۲۸۷

۲۔ غلام احمد قادیانی: کشتی نوح، ص ۱۶ ۳۔ غلام احمد قادیانی: ازالہ ادہام، ص ۳۰۳

آپ سے کنارہ کیا ہے

دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا انکار اور پیشگوئیوں کے بارے میں ہرزہ مرائی کرتے ہوئے لکھا ہے :

”اگر مسیح کے اصلی کاموں کو اُن حواشی سے الگ کر کے دیکھا جائے جو محض افرائے طور پر یا غلط فہمی کی وجہ سے گھڑے گئے ہوں، تو کوئی عجوبہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مسیح کے معجزات اور پیشگوئیوں پر جس قدر اعتراض اور شکوک پیدا ہوئے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کسی اور نبی کے عوارق یا پیش خبریوں میں کبھی ایسے شہادت پیدا ہوئے ہوں۔ کیا تالاب کا قصبہ مسیحی معجزات کی رونق دور نہیں کرتا اور پیشگوئیوں کا حال اس سے بھی زیادہ ترابر ہے۔ کیا یہ بھی کچھ پیش گوئیاں ہیں کہ زلزلے آئیں گے، مری پڑے گی، لڑائیاں ہوں گی، قحط پڑیں گے۔“

فری تالاب کا بہانہ بنا کر مرزا صاحب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ خلقِ طیر کے بارے میں تحریر کیا ہے :

”یہ اعتقاد بالکل غلط اور فاسد اور مشرکانہ خیال ہے کہ مسیح مٹی کے پرندے بنا کر اور اُن میں پھونک کر اُنھیں سچ پچ کے جانور بنا دیتا تھا۔ نہیں بلکہ صرف عملِ ترب (مسمومیت) تھا جو رُوح کی قوت سے ترقی پذیر ہو گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مسیح ایسے کام کے لیے اُس تالاب کی مٹی لاتا تھا، جس میں رُوح القدس کی تاثیر رکھی گئی تھی۔ بہر حال یہ معجزہ صرف کھیل کی قسم میں سے تھا اور مٹی درحقیقت ایک مٹی ہی رہتی تھی جیسے سامری کا گوسالہ۔“

اسی معجزے کے بارے میں مرزا صاحب نے اپنے خیالات کا اس طرح بھی اظہار کیا ہے :

”حضرت مسیح کا معجزہ پرندے بنا کر اُن میں پھونک مار کر اڑانا، حضرت سلیمان کے معجزہ کی طرح عقلی تھا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اُن دنوں ایسے امور کی طرف

لوگوں کے خیالات جھکے ہوئے تھے کہ جو شعبہ بازی کی قسم میں سے دراصل بے سود اور عوام کو فریفتہ کرنے والے تھے۔^۱

مرزا صاحب نے مذکورہ تالاب کو سراہتے ہوئے اعجازِ عیسوی کے بارے میں اپنی فطرت سے مجبور ہو کر یوں وریدہ دہنی کی ہے:

”اگر آپ سے کوئی معجزہ بھی ظاہر ہوا ہو، تو وہ آپ کا نہیں بلکہ اُسی تالاب کا معجزہ ہے اور آپ کے ہاتھ میں سوائے مکرو فریب کے اور کچھ نہ تھا۔“^۲

معجزات کے بعد عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت پر مرزا صاحب کا براہِ راست جارحانہ حملہ ملاحظہ ہو:

”یہود عیسیٰ کے بارے میں ایسے قوی اعتراض رکھتے ہیں کہ ہم بھی جواب میں حیران ہیں، بغیر اس کے کہ یہ کہہ دیں کہ ضرور عیسیٰ نبی ہے کیونکہ قرآن نے اُس کو نبی قرار دیا ہے اور کوئی دلیل اُن کی نبوت پر قائم نہیں ہو سکتی بلکہ ابطالِ نبوت پر کئی دلائل قائم ہیں۔“

اب عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر پر زائدِ حال کے اس وِجَال کے ظالمانہ اور جارحانہ حملے ملاحظہ ہوں:

”مسیح کی راست بازی اپنے زمانے میں دوسرے راست بازوں سے بڑھ کر ثابت نہیں ہوتی بلکہ بچی کو اُس پر ایک فضیلت ہے کیونکہ وہ شراب نہ پیتا تھا اور کبھی نہ سنا کہ کسی فاحشہ عورت نے اپنی کمائی کے مال سے اُس کے سر پر عطر ملا تھا یا ہاتھوں اور اپنے سر کے بالوں سے اُس کے بدن کو چھوا تھا یا کوئی بے تعلق جوان عورت اُس کی خدمت کرتی تھی۔ اسی وجہ سے خدا نے قرآن میں بچی کا نام حصور رکھا مگر مسیح کا نہ رکھا کیونکہ ایسے قصے اس نام کے رکھنے سے مانع تھے۔“^۳

اسی روش کو جاری رکھتے ہوئے مرزا صاحب نے یہ بھی کھا ہے:

۱۔ غلام احمد قادیانی: ازالہ اوہام، ص ۳۰۲
 ۲۔ ایضاً: حاشیہ ضمیمہ انجامِ آسم، ص ۴
 ۳۔ ایضاً: دافع البلاء، ٹائٹل پیج، ص ۴

”آپ کا کج رویوں سے میلان اور صحبت بھی شاید اسی وجہ سے ہو کہ جدی مناسبت درمیان ہے ورنہ کوئی پرہیزگار انسان ایک جوان کج روی کو یہ موقع نہیں دے سکتا کہ وہ اُس کے سر پر اپنے ناپاک ہاتھ لگا دے اور زنا کاری کی کمائی کا پلیدہ عطر اُس کے سر پر ملے اور اپنے بالوں کو اُس کے پیروں پر ملے۔ سمجھنے والے انسان سمجھ لیں کہ ایسا انسان کس چلن کا آدمی ہو سکتا ہے؟“

موصون نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر افرزا کیا کہ اُن کے چار بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ چنانچہ لکھا ہے:

”یسوع تومیسع، میں اُس کے چاروں بھائیوں کی بھی عزت کرتا ہوں۔ یسوع کی دونوں بہنیں وہ بھی مقدس سمجھتا ہوں۔“

عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ تشریف آوری کے بارے میں مرزا صاحب کے تاثرات یہ ہیں:

”خدا ایسے شخص کو کسی طرح دوبارہ دنیا میں نہیں لاسکتا جس کے پہلے فتنے نے ہی دنیا کو تباہ کر دیا ہے۔“

مرزا صاحب اپنی وریدہ دہنی اور فتنہ پرداز کی خود سزا جھکت رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سارے ایمان اسلام کو ایسے دجالوں کے شر سے محفوظ و مامون رکھے اور ہمیں انبیائے کرام و اولیاء عظام سے بچائے غلام اور وارث بنائے۔ آمین

مرزا صاحب نے جب تمام انبیائے کرام سے افضل اور باکمال بن اللہ ہونے کا دعویٰ ہونے کے دعوے کو خوب تہر کر لیا۔ انبیائے کرام کی دل کھول کر توہین و تہقیر کر چکے تو ابن اللہ ہونے کا دعویٰ بھی کر دیا۔ چنانچہ لکھا ہے:

”میں نے تجھ سے ایک خرید و فروخت کی ہے یعنی ایک چیز میری تھی جس کا تو مالک بنایا گیا اور ایک چیز تیری تھی جس کا میں مالک بن گیا۔ تو بھی اس خرید و فروخت کا

اقرار کر اور کہہ دے کہ خدا نے مجھ سے خرید و فروخت کی۔ تو مجھے ایسا ہے جیسا کہ اولاد
تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں۔ ۱
دوسرے مقام پر لکھا ہے:

انت منی بمنزلة ولدی۔ ۲
یعنی تو مجھ سے بمنزلہ میرے فرزند کے ہے۔
نبوت سے ابن اللہ اور ابن اللہ سے خود اللہ ہونے کا مرزا صاحب نے
دعویٰ الوہیت بقلم خود اعلان مشہور و مشتر کیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے عربی زبان
میں تحریر فرمایا ہے:

ما أيتنى في المنام عین اللہ
وتیقنت اننى هو فخلقت
السموات والارض و قلت
انا ربنا السماء الدنيا
بصا بیح۔ ۳
میں نے نیند میں اپنے آپ کو ہوہو اللہ
دیکھا اور میں نے یقین کر لیا کہ میں وہی
(اللہ) ہوں۔ پھر میں نے آسمان اور
زمین بنائے اور کہا کہ ہم نے آسمان کو
ستاروں کے ساتھ سجایا ہے۔

مرزا صاحب نے ایک طرف تو نبوت کا دعویٰ ڈنکے کی چوٹ کیا ہے لیکن دوسری
اقبال ڈگری جانب اُسے ظلی بروزی یا غیر تشریعی وغیرہ کے پردوں میں پھپھانے اور آسانی
سے یہ زہر مسلمانوں کے حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کی ہے لیکن خدا کی قدرت کہ موصوف نے
ادعائے نبوت کو کفر بھی قرار دیا ہے، مثلاً جامع مسجد دہلی میں مرزا صاحب نے یہ اعلان کیا:
"ان تمام امور میں میرا وہی مذہب ہے جو دیگر اہل سنت و جماعت کا مذہب ہے۔
اب میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار اس
خانہ خدا (جامع مسجد دہلی) میں کرتا ہوں کہ میں جناب خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم
کی ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اُس کو بے دین اور

۱ غلام احمد قادیانی، دافع البلاء، ص ۸
۲ غلام احمد قادیانی، حقیقۃ الوحی، ص ۸۶

۳ ایضاً: آئینہ کمالات اسلام، ص ۵۶۴، ۵۶۵

دائرۃ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ لے

دوسرے مقام پر مرزا صاحب نے مدعیان نبوت کے بارے میں یوں حکم شرع بیان کیا ہے:

”سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ختم المرسلین کے بعد کسی دوسرے

مدعی نبوت اور رسالت کو کاذب اور کافر جانتا ہوں۔ لے

مکرمہ پاکستان نے بھی، ستمبر ۱۹۷۱ء کو یہی فیصلہ سنایا تھا کہ جو مدعی نبوت مرزا غلام احمد قادیانی

کی نبوت و رسالت کا قائل ہے یا کم از کم ایسے دجال و کذاب کو مسلمان شمار کرتا ہے وہ کافر و

مرد اور دائرۃ اسلام سے خارج ہے۔ کذاک العذاب وللعذاب الاخرة اکبر لو کانوا

یعلمون ۵

مرزا صاحب کے نزدیک غیر احمدی ہرگز مسلمان نہیں تھے۔

مسلمانوں سے علیحدگی

چنانچہ موصوف نے لکھا ہے:

”جو شخص تیری پیروی نہیں کرے گا اور تیری بیعت میں داخل نہیں ہوگا اور تیرا مخالف

رہے گا وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کرنے والا جہنمی ہے۔ لے

موصوف کے خلیفہ مرزا محمد محمود قادیانی نے اس دائرے کو اور بھی وسیع کرتے ہوئے صاف لکھ دیا:

”کل جو مسلمان حضرت مسیح موعود کی بیعت میں شامل نہیں ہوئے، خواہ اُنھوں نے

حضرت مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ کافر اور دائرۃ اسلام سے خارج ہیں۔ لے

نور مرزا غلام احمد قادیانی نے اس معاملے کو ان دو لوگ لفظوں میں صاف کرتے ہوئے لکھا ہے:

”جو مجھے نہیں مانتا وہ خدا اور رسول کو بھی نہیں مانتا۔ لے

احمدی حضرات کسی غیر احمدی کے جنازے کی نماز پڑھنا جائز شمار نہیں کرتے۔ مثلاً:

”حضرت مرزا صاحب نے اپنے مرحوم (فضل احمد صاحب) کا جنازہ محض اس لیے

۱۔ غلام احمد قادیانی: تبلیغ رسالت، جلد دوم، ص ۴۴ لے ایضاً: ص ۲۲

۲۔ ایضاً: جلد نہم، ص ۲۷ لے مرزا محمود احمد خلیفہ: بیئۃ صداقت، ص ۳۵

۳۔ غلام احمد قادیانی: حقیقۃ الوحی، ص ۱۶۳

نہیں پڑھا کہ وہ غیر احمدی تھا! لے

احمدی حضرات کے نزدیک غیر احمدی کو لڑکی دینا قطعاً ممنوع اور ناقابلِ معافی جرم ہے۔ مثلاً: ”حضرت مسیح موعود نے اُس احمدی پر سخت ناراضگی کا اظہار کیا ہے جو اپنی لڑکی غیر احمدی کو دے۔ آپ سے ایک شخص نے بار بار پوچھا اور کئی قسم کی مجبوریوں کو پیش کیا لیکن آپ نے اُس کو یہی فرمایا کہ لڑکی کو بٹھائے رکھو لیکن غیر احمدیوں میں نہ دو۔ آپ کی وفات کے بعد اُس نے غیر احمدیوں کو لڑکی دے دی تو حضرت خلیفہ اول حکیم نور الدین نے اُس کو احمدیوں کی امامت سے ہٹا دیا اور جماعت سے خارج کر دیا اور اپنی خلافت کے چھ سالوں میں اس کی توبہ قبول نہ کی، باوجودیکہ وہ بار بار توبہ کرتا رہا۔“ لے

مرزا صاحب نے اپنے پیروکاروں کو غیر احمدی حضرات کے پیچھے نماز پڑھنے سے قطعی طور پر منع کر دیا تھا۔ چنانچہ موصوف نے غیر احمدیوں کی تین قسمیں بنا کر تینوں کے بارے میں یوں خدا کی طرف منسوب کر کے حکم سنایا تھا:

”پس یاد رکھو کہ جیسا کہ خدا نے مجھے اطلاع دی ہے تمہارے پر حرام ہے اور قطعی حرام ہے کہ کسی مکفر اور کذاب یا مرتد کے پیچھے نماز پڑھو۔ بلکہ چاہیے کہ تمہارا وہی امام ہو جو تم میں سے ہو۔ اسی کی طرح حدیث بخاری کے ایک پہلو میں اشارہ ہے کہ امام مکہ منکر یعنی حبیب مسیح نازل ہوگا تو تمہیں دوسرے فرقوں کو جو دعویٰ اسلام کرتے ہیں، بجلی ترک کرنا پڑے گا اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔ پس تم ایسا ہی کرو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا الزام تمہارے سر پر ہو اور تمہارے عمل جبط ہو جائیں اور تمہیں خبر نہ ہو؟“ لے

خلیفہ قادیان، میاں محمود احمد صاحب نے احمدی اور غیر احمدی کے مسئلے کا فیصلہ یوں سنایا

لے اخبار الفضل قادیان، ۱۵ دسمبر ۱۹۳۱ء لے خلیفہ مرزا محمود احمد، انوار خلافت، ص ۹۳

لے غلام احمد قادیانی: اربعین ۳، ص ۲۴

ہوا ہے :

ہمارا یہ فرض ہے کہ غیر احمدیوں کو مسلمان نہ سمجھیں اور اُن کے پیچھے نماز نہ پڑھیں
 کیونکہ ہمارے نزدیک وہ خدا تعالیٰ کے ایک نبی کے منکر ہیں۔ یہ دین کا
 معاملہ ہے۔ اس میں کسی کا اپنا اختیار نہیں کہ کچھ کر سکے، لے

صاحب نے اپنے مریدوں کو سبق پڑھایا تھا کہ احمدیوں کو غیر احمدی حضرات سے تعلقات
 منقطع رکھنے چاہئیں، موصوف کے نزدیک مرزاؑ کا رآمد اور مسلمان بیکار شے تھے۔ چنانچہ
 کا ایک فیصلہ یوں منقول ہے :

یہ جو ہم نے دوسرے مدعیان اسلام سے قطع تعلق کیا ہے اول تو یہ خدا تعالیٰ
 کے حکم سے تھا، نہ اپنی طرف سے اور دوسرے وہ لوگ ریا پرستی اور طرح طرح
 کی خرابیوں میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور اُن لوگوں کو اُن کی ایسی حالت کے ساتھ
 اپنی جماعت کے ساتھ ملانا یا اُن سے تعلق رکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ عمدہ اور
 تازہ دودھ میں بگڑا بھوا دودھ ڈال دیں، جو سڑ گیا ہے اور اُس میں کیرے پڑ گئے
 ہیں۔ اس وجہ سے ہماری جماعت کسی طرح اُن سے تعلق نہیں رکھ سکتی اور
 نہ ہمیں ایسے تعلق کی حاجت ہے، لے

حق نے بڑے اختصار کے ساتھ مرزا غلام احمد قادیانی کے مخصوص نظریات اور
 اسی چند عنوانات کے تحت بغیر کسی خاص تبصہ اور تردید کے پیش کر دیے ہیں تاکہ مسلمانوں کو
 حضرات کی مفرات، اسلام دشمنی اور خارج عن الاسلام ہونے کا کسی قدر اندازہ ہو جائے۔
 طرح گزشتہ سطور میں احقر نے رئیس المبتدعین مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے لے کر
 اسی صاحب اور پیر ویز صاحب تک کے مخصوص نظریات اختصار کے ساتھ پیش کر دیے ہیں۔
 شاہد ہے کہ میرا مقصد اُن کے متبعین کی خیر خواہی اور مسلمانوں کو اُن کے سرسری غیر اسلامی

یہاں مولود احمد خلیفہ، انوارِ جلالت، ص ۹۰

غلام احمد قادیانی : رسالہ التبیان، جلد ۶، نمبر ۸، ص ۳۶

اور منافقانہ اندازِ فکر سے مطلع کرنا ہے۔ خدا کرے کہ یہ پراگندہ سطور کتنے ہی حضرات کی ہدایت کا
 باعث بن جائیں اور جوستی مسلمان صلحِ کلیت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں اور فرضی اتحاد و
 رواداری کا جھنڈا بھینسہ ہو گیا ہے، ممکن ہے یہ سرمہ اُن کی چشمِ بصیرت کے لیے مفید ثابت
 ہو جائے۔ ان ارید الا اصلاح ما استطعت وما توفیق الا باللہ و علیہ
 توکلت والیہ اُنیب و صلی اللہ تعالیٰ علی حبیبہ سیدنا و مولانا محمد و
 آلہ و صحبہ اجمعین۔

خاکپائے علماء: محمد عبد الحکیم خاں مجددی مظہری
 المعروف بہ اختر شاہ بہمانپوری
 دار المصنفین لاہور

باب چهارم

شیاطینِ ملکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ ہو نچیر کے دل میں بھی پیدا ذوقِ نچیری
(اقبال)

انگریز دوستی کی کہانی، انگریز دوستوں کی زبانی

قارئین کرام! گزشتہ صفحات میں آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ انگریزوں نے بعض علماء کو کس طرح خبیثہ کر اپنے تحریبی منصوبوں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ اسلام کا حلیہ بدلنے اور مسلمانوں کی مختلف ٹولیاں بنانے میں کس طرح اُن حضرات نے اسلام دشمن حکومت کا ہاتھ بٹایا۔ انگریزوں کے ساتھ اس تحریبِ کاری میں متفقہ اراے ہونے والے بعض علماء کی گزشتہ صفحات میں نشان دہی کی جا چکی ہے۔

بعض مبتدعین کے علماء و مورخین بغضِ معاویہ میں یا اپنے اکابر کی انگریز دوستی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے علمائے اہلسنت کے بارے میں عوام کو پھیلنے اور جہلاء میں اپنا بھرم بنائے رکھنے کی غرض سے مفروضات کا سہارا لے کر لکھ مارتے ہیں کہ اگر فلاں عالم انگریزوں کا ایجنٹ نہیں تھا تو اُس نے ہمارے فلاں فلاں بزرگ کی تکفیر کیوں کی؟ یا چونکہ فلاں عالم نے تحریکِ خلافت یا فلاں گاندھوی منصوبے کی حمایت نہیں کی تھی لہذا ثابت ہوا کہ وہ مولوی انگریزوں کا ایجنٹ تھا۔ ایسے انصاف دشمن اور اسلامی تعلیمات سے نا آشنا حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح خلافِ دیانت کھانا غلط تاثرات پھیلنا حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ آخر خدا کے ولیوں اور مقبول بندوں سے بغض و عداوت رکھ کر، اللہ تعالیٰ سے لڑائی مول لینے میں دارین کی کون سی بھلائی کا راز پنہاں ہے؟

ایسے حاسدین اور انصاف کا خون کرنے والے محققین کو معلوم ہونا چاہیے کہ حقیقت اور اصلیت کے میدان میں یہ اگر، مگر اور چونکہ، چنانچہ کے سہارے بے معنی اور فضول ہوا کرتے ہیں۔ کیا کسی پر اتنا بڑا الزام صرف مفروضات کی بنا پر عائد کیا جاسکتا ہے؟ کیا فرضی مغالطوں تک بھی عقلاء کے نزدیک کوئی وزن ہوا کرتا ہے؟ اگر مخالفین اہلسنت اور متبعینِ زمانہ کے پاس علمائے اہلسنت کی انگریز دوستی کا ایک بھی ٹھوس اور یقینی ثبوت ہے تو بڑے شوق سے اسے پیش کریں۔ لیکن یہ مدِ نظر رہے کہ فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَكِنْ تَفْعَلُوا فَالْقَوْلُ لِلَّهِ الْبَاقِي وَتَوَدُّهَا

النَّاسُ وَالْحِبَارَةُ اُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ اگر ایک ثبوت بھی نہ لاسکو اور ہم کسے دیتے ہیں ہرگز نہ لاسکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ (نعوذ باللہ من ذلک)

برٹش گورنمنٹ کے پروردہ علماء نے شریعتِ اسلامیہ کو غتر بود کرنے کی جو کوششیں کی تھیں، تاریخی گزشتہ باب میں ملاحظہ فرما چکے۔ ان حضرات کی انگریز دوستی کے اگرچہ سیکرل بیانات پیش نظر ہیں لیکن نجوفِ طوالت ماقلاً و کفائی کے تحت چند حوالے پیش خدمت ہیں۔
وَاللّٰهُ التَّوَفِیْقِ۔

۱۔ سید احمد صاحب بریلوی

سید احمد صاحب (المتوفی ۱۲۴۶ھ / ۱۸۳۱ء) کا جب مولوی محمد اسماعیل دہلوی سے معاملہ طے ہوا تو آپ نواب امیر خاں پنڈاری کے ہاں جا کر ملازم ہو گئے۔ وہاں ۱۸۱۰ء سے ۱۸۱۶ء تک تقریباً سات سال رہے۔ اُن ایام میں نواب امیر خاں کی پوزیشن کیا تھی؟ اس بارے میں غلام رسول مہر یوں لکھتے ہیں :

”غرض امیر خاں آخری دور کے آزاد ہندوستانی امیروں میں سب سے بڑھ کر طاقتور تھا۔ ایک موقع پر اُس کے پاس چالیس ہزار جانا جمع ہو گئے تھے اور ایک سو پندرہ توپیں تھیں۔ اتنی عظیم الشان قوت کو انگریز قلبِ ہند میں آزاد چھوڑنے کے روادار نہ ہو سکتے تھے، لیکن اُنھیں یہ حوصلہ بھی نہ تھا کہ امیر خاں سے کھلے میدان میں ٹکراتیں، اس لیے کہ جانتے تھے، مَن چلا آدمی ہے، مقابلہ پر ڈٹ جاتے گا تو ممکن ہے دوسری ملکی قوتیں بھی جو بظاہر دب گئی تھیں، اُبھر آئیں اور ہمیں بسترِ بوریہ سنبھال کر ہندوستان سے نکل جانا پڑے۔ وہ امیر خاں سے ٹکراتے نہیں، لیکن جو عناصر اُس کے لیے لگ ویاوری کا سرچشمہ بن سکتے تھے اُنھیں ایک ایک کر کے آہستہ آہستہ توڑتے رہے یہاں تک کہ اُس کی فوج میں بھی انگریزی ریشہ دوانیاں خاصی پھیل گئی۔“ لے

جب نواب امیر خاں انگریزوں کی آنکھوں میں کھٹک رہا تھا تو دلوں کو دلوں سے راہ ہوتی ہے، ان دنوں سید صاحب کو بھی مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح الہام ہو رہا تھا۔ کس بات کا الہام ہو رہا تھا؟ مہر صاحب بتاتے ہیں :

”خود سید صاحب کا بیان ہے کہ غیبی اشاروں کی بنا پر وہ نواب صاحب کے لشکر میں گئے تھے۔ واقع میں ہے کہ جب وہ لشکر میں تھے تو ایک روز فرمایا : ”قصبہ رائے بریلی میں مجھ کو جناب الہی سے الہام ہو کہ یہاں سے نواب نامدار امیر الدولہ بہادر کے لشکر میں جا اور وہاں کی خدمت ہم نے تجھ کو دی، وہاں ہم کو تجھ سے کچھ اور کام بھی لینے ہیں۔ یہ مشرکہ غیبی سن کر میں وہاں سے روانہ ہوا۔ چند روز میں آکر ملازمت نواب صاحب مدوح کی حاصل کی۔“ لے

نیز منظومہ صفحہ ۲۳ کے حوالے سے موصوف یوں رقمطراز ہیں :

”از زمانیکے حضرت امیر المومنین — بنابر الہامیکہ در باب اقامت جہاد می شد، راہگزارے لشکر ظفر اثر — امیر الدولہ نواب امیر خاں بہادر مرحوم شدند“ جس زمانے میں حضرت امیر المومنین اقامت جہاد کے متعلق غیبی اشاروں کی بنا پر امیر الدولہ نواب امیر خاں مرحوم کے لشکر ظفر اثر کی جانب روانہ ہوئے۔ شاید کسی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے سید صاحب نے نواب موصوف کی فوج میں بھرتی ہونے کا ارادہ کیا تھا، کیونکہ وہ پیر و مرشد تھے۔ جناب غلام رسول مہر اس خیال کے حق میں نہیں ہیں۔ ان کی تحقیق یہی ہے کہ شاہ صاحب کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں :

”جو کچھ اوپر بیان ہوا ہے اُس سے صاف آشکارا ہے کہ سید صاحب نے بطور خود یہ فیصلہ فرمایا، شاہ صاحب کے امر و حکم کو اس اقدام سے کوئی تعلق

نہ تھا۔ انھیں رائے بریلی ہی میں غیبی اشارہ ہوا کہ نواب کے پاس جاؤ، چنانچہ وہ نکل پڑے اور دہلی ہوتے ہوئے راجپوتانہ پہنچ گئے۔^۱ نواب کی فوج میں بھرتی ہونے کے بارے میں مرزا حیرت دہلوی یوں رقمطراز ہیں:

”جب سید صاحب نے سواروں میں نام لکھوایا ہے تو آپ امیر خاں کے آگے پیش کیے گئے۔ وہ دیکھ کے بہت خوش ہوا اور اُس نے یہ کہا، اگر اپنی جان کھپا کے محنت کی اور اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تو میں آپ کو ایک ہزار فوج کا افسر بنا دوں گا۔“^۲

سید صاحب نے الہام کی ہدایات کے مطابق خوب اپنی جوانمردی کے جوہر دکھائے تاکہ نواب کا اعتماد حاصل کر لیا جائے۔ ساتھ ہی نواب موصوف کی خیر خواہی کا پوری طرح دم بھرتے رہے۔ آخر کار منزل مقصود ہاتھ آگئی۔ یعنی:

”جب پے درپے یہ باتیں سید احمد صاحب سے ظہور پذیر ہوئیں، پھر تو امیر خاں نے اپنا مشیر مقرر کر لیا اور کوئی کام بغیر آپ کے مشورہ نہ کرتا تھا۔ ساتھ ہی ان کامیابیوں کے جو سید صاحب کو حاصل ہوئیں، یہ خوشی سے دیکھا جاتا ہے کہ آپ نے اس ترقی پر بھی اپنے فرائض کے انجام دینے سے (جو الہام کے ذریعے تفویض ہوئے تھے) پہلو تہی نہ کی۔“^۳

سید صاحب نے نواب کے پاس کس قسم کے اکلِ حلال سے ولایتِ انبیاء کی منازل طے کی تھیں۔ اس حقیقت کے چہرے سے مرزا حیرت دہلوی نے یوں نقاب اٹھا کر حقیقت کو واضح کیا ہوا ہے:

”امیر خاں کے لشکر کی کوئی باقا عدہ تنخواہ نہ تھی۔ کسی ریاست پر چھاپہ مارا،

^۱ غلام رسول تہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۹۳

^۲ مرزا حیرت دہلوی: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۳۵۹

^۳ ایضاً: ص ۳۵۹

اگر وہاں سے کچھ ہاتھ لگ گیا تو باہم تقسیم ہو گیا نہ ہاتھ لگا لشکر میں فاقہ کشی ہو رہی ہے، لیروں کی سی کیفیت تھی۔ کبھی جے پور پر حملہ کر کے یہاں زلزلہ ڈال دیا اور کبھی جودھ پور پر جادو ڈال دیا وہاں ایک ہلکم چادی.... امیر خاں کے سپاہیوں کی زندگی جس قدر خطرناک تھی اُسی قدر چاق و چُپت اور شمشیر زنی میں بسر ہوتی تھی، جو سپاہیانہ قالب کی سچی رُوح ہے۔" لے

"سید احمد صاحب تقریباً سات برس تک امیر خاں کی ملازمت میں رہے۔ اس عرصہ میں آپ کو بارہا مختلف جنگوں میں جانے اور توپ و بندوق و تلوار سے کام لینے کا موقع پڑا ہوگا۔ کہیں کسی کے ساتھ آپ نے حملہ کیا ہوگا تو کہیں سرکش گاڈ کو لوٹنا کھسٹنا ہوگا۔ غرض ساری ہی باتیں جن سے جنگ و غارت تعبیر ہو سکتی ہے عمل میں آئی ہوں گی۔" لے

سید احمد صاحب کو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور اُس کی فوج میں بھرتی ہونے کا اہمام کیوں ہوا تھا اور کس کی طرف سے ہوا تھا؟ اس سوال کا جواب موصوف کی کارگزاری میں ہی مل سکتا ہے کہ اُن کا مشن کیا تھا، اور کب انہوں نے اپنے فرض منصبی کو پورا کر کے نواب کو خیرباد کہا۔ مولوی محمد جعفر اس سلسلے میں یوں لکھتے ہیں:

"ایک روز کا ذکر ہے کہ لشکرِ نواب امیر خاں مرحوم انگریزوں کے لشکر سے لڑ رہا تھا۔ دونوں طرف سے توپ اور بندوقیں چل رہی تھیں۔ اُس وقت سید صاحب اپنے خیمے میں تشریف رکھتے تھے۔ آپ نے اپنا گھوڑا تیار کر دیا اور اُس پر سوار ہو کر مثل ہوا کے دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں انگریزی فوج کا سپہ سالار مع اپنے مصاحبوں کے کھڑا تھا۔ پس وہاں سے اُس سپہ سالار کو ساتھ لے کر پھر دونوں لشکروں کو چیرتے ہوئے

اپنے نیچے تک چلے آئے۔ یہاں آکر تھوڑی سی بات چیت کے بعد سپہ سالار مذکور
نے عہد کر لیا کہ میں اسی دم اپنے لشکر کو مقابلہ نواب امیر خاں سے واپس
لے جاؤں گا اور پھر مقابلہ کو نہ آؤں گا، بلکہ جہاں تک ممکن ہو گا اپنی سرکار کو
اس بات پر مجبور کروں گا کہ نواب امیر خاں سے صلح کر لے۔ اس واقعہ کے بعد
پھر سرکار انگریزی اور نواب امیر خاں میں جنگ نہیں ہوئی بلکہ صلح کی بات چیت
اور رسل و رسائل شروع ہو گئے اور لارڈ ہیسٹنگ صاحب بہادر وائسرائے ہند
کے عہد میں ٹونک کا ملک نواب صاحب کو دے کر صلح کی گئی، ۱۷

یہ تھا سید احمد صاحب کا مشن کہ نواب امیر خاں کا اعتماد پورے طور پر حاصل کر کے انگریزوں کے
حق میں فضا ہموار کرتے اور نواب کی جڑیں کاٹتے رہے۔ عین مقابلہ کے وقت ظاہر ہوئے
کہ انگریزی فوج میں بھی صحیح خانہ کی طرح دندنا بٹے پھر رہے تھے اور کسی نے روکنے ٹوکنے کی
ضرورت نہ تھی۔ امیر خاں کی آنکھیں کھلیں لیکن اس وقت جب چڑیاں کھیت چگ گئی تھیں
مجبوراً صلح پر آمادہ ہونا پڑا۔ تھانیسری صاحب آگے پوں تصریح کرتے ہیں:

”ابھی صلح کی بات چیت طے نہیں ہوئی تھی کہ سید صاحب سات برس کے
قیام کے بعد پھر لشکر نواب امیر خاں سے جدا ہو کر دوبارہ ۱۸۱۶ء میں دہلی
تشریف لے گئے..... اپنے چلنے کے وقت آپ نے یہ پیشین گوئی کی تھی،

جس کو نواب وزیر الدولہ مرحوم (ابن نواب امیر خاں) اپنے وصایا و ذریعہ
میں اس طرح لکھتے ہیں کہ سید صاحب نے مولوی نذر محمد صاحب سے کہ وہ
بھی اس لشکر میں موجود تھے اپنے رخصت ہونے کے وقت فرمایا تھا کہ ”اب
جلد صلح ہو جائے گی اور فلاں فلاں شہر اور فلاں فلاں علاقہ سرکار انگریزی نواب
صاحب کو دے دے گی اور ایک زمانہ دراز گزرنے کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ
میں بھی ایک لشکر مجاہدین کا ساتھ لے کر نشانوں کے پھر پیے اڑاتا ہوا نواب

امیر خاں صاحب کے ملک سے گنہ روں کا۔ اس پیشین گوئی کے ذکر کرنے کے بعد نواب وزیر الدولہ مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ ”موافق اس پیشین گوئی کے جو شوہر اور ممالک آپ نے بتلائے تھے، ٹھیک وہی سرکار انگریزی نے ہم کو دئے اور صلح ہو گئی۔“

موصوف کا بیان چونکہ نواب وزیر الدولہ ابن نواب امیر خاں کی کتاب ”وصایا وزیر“ کے حوالے سے ماخوذ اور مدلل ہے لہذا قابل تقسیم ہونے میں کیا شک و شبہ رہا؟ مذکورہ اقتباس کی روشنی میں نتیجہ سامنے آتا ہے کہ سید احمد صاحب جو بیگونیوں کر رہے تھے اور موصوف پر جو المانات کی بارش ہو رہی تھی اس کا معدن و مصدر برٹش گورنمنٹ ہی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ مذکورہ حوالوں کی روشنی میں برصغیر مزاج نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ مزید تسلی کے لیے مرزا حیرت دہلوی کی تصدیق بھی قابل غور ہے موصوف لکھتے ہیں:

”آخر کار ایک بڑے مشورہ کے بعد سید احمد صاحب کی کارگزاری سے ہر ریاست میں سے کچھ کچھ حصہ دے کر امیر خاں سے معاہدہ کر لیا، جیسے بجے پور سے ٹونک دلوایا اور جھوپال سے سروج، اسی طرح مختلف پرگنوں مختلف ریاستوں سے بڑی قیل و قال کے بعد انگریزوں نے دلو ا کے بچھرے ہوئے شیر کو اس حکمت سے پنجرہ میں بند کر دیا۔“

اس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صورت حال بیان کی۔ مذکورہ حوالہ میں بعض جگہ چونکہ اجمال سے کام لیا گیا ہے لہذا ان باتوں کی تفصیل کے لیے موصوف کا مندرجہ ذیل بیان کافی ہوگا:

”۱۲۳۱ھ تک سید احمد صاحب امیر خاں کی ملازمت میں رہے، مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خاں کی صلح کرادی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دئے گئے اور جن پر آج تک امیر خاں کی اولاد حکمرانی کرتی ہے دینے لے پائے تھے۔ لارڈ ہیسٹنگ سر سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری

بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اُس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا، امیر خاں، لارڈ ہیسٹنگ اور سید احمد صاحب۔ سید احمد صاحب نے امیر خاں کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اتارا تھا۔ آپ نے اُسے یقین دلایا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑانا اگر تمہارے لیے بڑا نہیں ہے تو تمہاری اولاد کے لیے ستم قاتل کا اثر رکھتا ہے۔ انگریزوں کی قوت دن بدن ترقی پذیر ہے اور تمام قومیں پے در پے تنزل کرتی جاتی ہیں۔ تمہارے بعد فوج کو کون سنبھالے گا اور عظیم الشان لشکر انگلشیہ کے مقابلے میں کون میدان جنگ میں لاکے جائے گا، یہ باتیں امیر خاں کی سمجھ میں آگئی تھیں اور اب وہ اس بات پر رضا مند تھا کہ گوارہ کے لیے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں آرام بیٹھوں۔

سید صاحب کو جو نواب امیر خاں کے پاس جانے اور وہاں اپنی کارگزاری دکھانے کا اہمام ہوا تھا۔ موصوف نے اُس پر عمل کرنے کی غرض سے لوٹ مار، قتل و قتال اور فساد و درہشتگری وغیرہ کسی چیز کو بھی وہاں قابلِ نفرت نہ سمجھا اور نیز لوٹ مار اور جبر و استبداد سے حاصل کیے ہوئے مال کو اکل حلال کے درجے سے ذرا بھی گرا ہوا نہ گردانا کیونکہ اُن دنوں سید صاحب اُن کے معتقدوں اور سوانح نگاروں کے مقدر سے ولایتِ انبیاء کی منازل کو سبک رفتاری سے طے کر رہے تھے۔ جب سات سالہ محنتِ شاقہ اور سعیِ پیہم کے باعث سید صاحب منزلِ مقصود پر پہنچ گئے، نواب امیر خاں کو شیشہ میں اتار لیا، اُس بھرے ہوئے شیر کو انگریزوں کے پنجہ میں بند کر دیا اور اس طرح اپنے ملہم (لارڈ ہیسٹنگ) کو اپنی اس بے نظیر کارگزاری سے خوب خوش کر لیا تو موصوف انتہائی احترام کے مستحق قرار پا گئے۔ چنانچہ خاندانِ سید صاحب کے چشم و چراغ، مولوی سید ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں کہ:

”قلعہ آباد میں جو مسلمان سپاہی مختلف خدمات پر متعین تھے اور تین سو کی تعداد میں تھے اُنھوں نے انگریز قلعہ دار کی اجازت سے حضرت (سید صاحب) کو

قلعہ میں تشریف لانے کی زحمت دی۔ شہنشین پر جو سلاطین سابق کی تخت گاہ تھی، آپ کو بٹھایا اور بڑے خلوص و اعتقاد کے ساتھ بیعت کی، اے

سید صاحب سکھوں سے لڑنے کی تیاریاں کرنے والے تھے۔ اس لیے بطور شکریہ انگریزوں نے بھی مصنف کے راستوں میں دیدہ و دل فرس راہ کیے ہوئے تھے۔ سید صاحب بھی انگریزوں کی اس عقیدت کو احترام کی نظروں سے دیکھتے تھے اور حتی الامکان کسی عام انگریز کو بھی پس نہیں کرتے تھے مثلاً:

”جہاں آباد سے آگے ایک مقام اوجھنی میں ہوا۔ وہاں کے زمیندار شیخ لعل محمد نے دعوت کی اور سیکڑوں آدمی مرید ہوئے۔ آگے بڑھے تو راستے میں ایک انگریز کی مسلمان بیوی نے دعوت کی غرض سے روکا۔ سید صاحب نے اُس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر انگریز خود آیا اور عرض کی کہ اُس کی دعوت نہ مانے لیکن میری دعوت قبول کر لینے میں تو تکلف نہ ہونا چاہیے۔ آپ نے انگریز کی دعوت قبول کر لی۔“

انگریزوں کے اسی ہڈیے لشکر کی کمانی جناب غلام رسول مہر کی زبانی مزید پیش خدمت ہے:

”صبح کو ڈوڈلگی سے روانہ ہوئے۔ شام ہو گئی تو ملاعوں نے ایسی جگہ کشتیاں باندھیں، جہاں اُس پاس کوئی بستی نظر نہیں آتی تھی۔ دریا کے کنارے کی زمین دُور دُور تک اُس درجہ خراب تھی کہ کھانا پکانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اِس اثناء میں کالی گھٹا اُٹھی، تیز ہوا چلنے لگی اور قطرہ افشانی شروع ہو گئی۔ سب نے سمجھ لیا کہ رات کھائے بغیر گزارنی ہوگی۔ اچانک دُور مشعلیں نظر آئیں۔ سمجھا گیا کہ کچھ لوگ کشتیوں کی طرف آرہے ہیں۔ پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ نیل کے انگریز تاجر نے اپنے مسلمان کارکنوں کے پاس خاطر سے پلاؤ کی دیگیں پکوا کر بھیجی ہیں اور خود گھوڑے پر ساتھ آیا ہے۔“

حاجہ الحسن علی ندوی، سیرت سید احمد شہید، جلد اول، ص ۱۹۶

جب دعوتوں کا تذکرہ ہی شروع ہو گیا تو مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی بھی ایک عقیدت مند لکھنے والا اس سے بھی عظیم الشان دعوت کا بیان سُن لیا جائے۔ چنانچہ موصوفیوں وضاحت فرماتے ہیں:

”جب وہ مشعلیں کنارے کے نزدیک پہنچیں تو دیکھا کہ ایک انگریز گھوڑے پر سوار مختلف قسم کا بہت سا کھانا ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ اُس نے کشتی کے نزدیک آکر پوچھا: پادری صاحب کہاں ہیں؟ جب حضرت نے کشتی میں سے جواب دیا تو وہ گھوڑے سے اتر کر اور اپنی ٹوپی سر سے اتار کر بہت ادب سے حضرت کے سامنے کشتی میں آیا۔ بعد سلام و مزاج پُرسہی کے عرض کیا کہ تین روز سے میں نے حضور کی تشریف آوری کی خبر لانے کے لیے نوکر اس طرف متعین کر رکھے تھے، سو آج اُنھوں نے مجھ کو خبر دی، لہذا یہ ماحضر، حضور اور کل قافلے کے لیے تیار کر کے لایا ہوں، براہ بندہ نوازی اس کو قبول فرمائیں۔ حضرت نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ فوراً وہ کھانا اپنے برتنوں میں لے کر قافلے میں تقسیم کر دو۔ تقریباً دو گھنٹی تک وہ انگریز حضور میں حاضر رہا، پھر رخصت لے کر مع اپنے آدمیوں کے واپس چلا گیا۔“

دعوتوں کے یہ واقعات بتا رہے ہیں کہ سید احمد صاحب اس نیاری جنگ کے سلسلے میں جب ایک ہندوستان میں رہے تو انگریز وقتاً فوقتاً اس قسم کی ناز برداری کرتے رہے اور جب اپنی جمعیت کو لے کر منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں خبر گیری کا بھی حکومت نے انتظام کیا ہوا تھا۔ اس قافلے کی مذکورہ ضیافت کے واقعے کو سید ابوالحسن علی ندوی نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

”اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ انگریز گھوڑے پر سوار چند پالیوں میں کھانا رکھے کشتی کے قریب آیا اور پوچھا کہ پادری صاحب کہاں ہیں؟ حضرت نے کشتی پر سے جواب دیا کہ میں یہاں موجود ہوں۔ انگریز گھوڑے پر سے اُترا اور ٹوپی ہاتھ میں

یہ کشتی پہنچا اور مزاج پُرسی کے بعد کہا کہ تین روز سے میں نے اپنے ملازم یہاں کھڑے کر دیئے تھے کہ آپ کی اطلاع کریں۔ آج اُنھوں نے اطلاع کی کہ اغلب یہ ہے کہ حضرت قافلہ کے ساتھ تمھارے مکان کے سامنے پہنچیں۔ یہ اطلاع پا کر غروب آفتاب تک میں کھانے کی تیاری میں مشغول رہا۔ تیار کرانے کے بعد لایا ہوں۔ سید صاحب نے حکم دیا کہ کھانا اپنے برتنوں میں منتقل کر لیا جائے کھانا لے کر قافلے میں تقسیم کر دیا گیا اور انگریز دو تین گھنٹہ ٹھہر کر چلا گیا۔ ۱۷

جب انفرادی دعوت سے کھانے کی بھری ہوئی چند پالکیوں اور پلاؤں کے ساتھ تکبات آگئی تو اب پورے قافلے کی اُن عظیم الشان دعوتوں کا تذکرہ بھی کیوں نہ کر ہی دیا جائے جن کی نظیر چشم فلک کُن نے اُس وقت سے پہلے یا اُس وقت سے لے کر اب تک، بڑے صغیر پاک و ہند کی زمین پر نہ دیکھی ہوگی۔ ضیافت اور دعوت پر ہی کیا منحصر؟ معلوم یہی ہوتا ہے کہ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور بظاہر تو منظم فلاں ابن فلاں نظر آ رہے تھے لیکن اندرون خانہ حکومت ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ خوب کھلا پلاکر، ہر طرح آراستہ و پیراستہ کر کے، زبانی کے بکرے بنا کر، اپنے اقتدار کی بلائیں اتارنے کے لیے بالا کوٹ میں بھینٹ چڑھانے کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ یہ حضرات ان ناز برداریوں میں ایسے مست ہوئے کہ جاموں میں چھولے مالتے۔ ۱۸

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پر شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

سید صاحب کے اس قافلے کی الہ آباد میں کس طرح ضیافتیں ہوئیں، کس قدر سامان امداد کے طور پر دیا گیا، یہ موصوف کے نامور سوانح نگار جناب غلام رسول مہر کی زبانی پیش خدمت ہے:

”شیخ غلام علی نے ہر ایک سے کہہ دیا تھا کہ دورانِ قیام الہ آباد میں کوئی صاحب سید صاحب کو کھانے کی تکلیف نہ دیں۔ یہ احسان صرف میرے ذمے رہنے دیا تھا۔“

ہاں اپنے مکان پر لے جا کر پان کھلائیں، عطر لگائیں، نذریں پیش کریں، کھانا نہ کھلائیں۔ چنانچہ سید صاحب جب تک الہ آباد میں ٹھہرے رہے پورے قافلے کی مہمان داری شیخ غلام علی نے فرمائی اور کس شان و اہتمام کے ساتھ، آج اُس کی تفصیلات سن کر شاید اکثر لوگ سمجھیں گے کہ خیالی افسانہ بیان ہو رہا ہے حالانکہ شیخ صاحب نے تواضع اور مدارات کا جو نمونہ پیش کیا اُس کی محض سرسری کیفیت ہم تک پہنچ سکی ہے۔

شیخ صاحب مہاراجہ اودت نرائن والی بنارس کے مختار تھے۔ انھوں نے سید صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔ باقی قافلے کے لیے مہاراجہ کی بارہ دری خالی کرائی۔ پورے قافلے کے لیے دونوں وقت کا کھانا قیام گاہوں پر پہنچ جاتا تھا اور کیسا کھانا، ایک ایک وقت میں کئی کئی چیزیں تیار ہو کر آتیں مثلاً قورمہ، پلاؤ، زردہ، شیر مال، تازہ مٹھائی، خمیری روٹیاں۔ اُس وقت تک ساتھیوں کی تعداد ساڑھے سات سو ہو چکی تھی لیکن شیخ صاحب کے تکلف میں کوئی کمی نہ آئی۔ اندازہ کیا گیا کہ کم از کم ایک ہزار روپے روزانہ کھانے پر صرف ہوتے تھے اور یہ اُنس زمانے کا خرچ ہے جب جنسیں بچہ ارزاں تھیں۔

شیخ صاحب دن میں دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے۔ ایک مرتبہ بعد نماز ظہر، دوسری مرتبہ بعد نماز مغرب۔ دونوں مرتبہ پیش بہانہ تدریس ساتھ لائے مثلاً نہایت قیمتی پارچے، عمدہ بندوقیں، پستول اور تلواریں، بعض اوقات نقد روپیہ لے آتے۔ واقعہ کار اصحاب کا اندازہ ہے کہ بارہ پندرہ روز کے قیام میں شیخ صاحب نے اس طریق پر جو نذریں پیش کیں، وہ بحیثیت مجموعی بیس ہزار سے کم نہ ہوں گی.....

اسی دوران میں شیخ صاحب نے ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے نئے تیار کرا کے پیش کیے کہ سفر میں کام آئیں گے۔ قافلے کے ہر فرد کو ایک ایک

جوڑی نئے جڑتے، مردوں کو دودو پا جائے، دودو انگڑکھے، دودو ٹوپیاں او
ایک ایک چادر۔ مستورات کو دودو پا جائے، دودو کُرتے اور دودو دوپٹے دیئے۔
سب کو سر عام ایک ایک روپیہ دیا۔ سید صاحب کے اقرباء کی خدمت میں
دس دس روپے فی کس پیش کیے۔ علماء کی خدمت میں اُن کی حیثیت و مرتبہ
کے مطابق نذریں گزرائیں۔

سید صاحب کے لیے روزانہ پانچ سو روپے یا کسی وقت کم یا زیادہ
لے کر آئے۔ دونوں وقت کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے بھجواتے۔
ایک روز سید صاحب کی دونوں بیٹیوں کو استی استی روپے دیئے گئے۔
لطف یہ کہ جب نذریں پیش کرتے تو بڑے ہی انکسار سے تھی دستی کا اظہار
فرماتے۔

خصت کے وقت سید صاحب کی خدمت میں جو سامان لائے وہ
بیس پچیس کشتیوں میں لگا ہوا تھا۔ اُس میں مشروع، کھواب، پشمینے، نینو،
دھاکے کی ٹہل، محمودی، بنارسی اطلس وغیرہ کے تھان بھی تھے اور کشمیری
شال بھی۔ ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد تھے۔ دو نہایت خوبصورت
مُطلا اور مذہب قرآن مجید نذر کیے۔ ایک مکہ معظمہ کے لیے اور دوسرا مدینہ منورہ
کے لیے۔ تمام اہل قافلہ کے لیے نو نو دس دس ہاتھ لمبے جامہ ہائے احرام تھے،
جن میں ایک سو بیس تھان صرف ہوئے۔ دو سو چالیس تھان گاڑھے کے ان
کے علاوہ تھے، تاکہ متفرق ضروریات میں کام آئیں۔

اس کے بعد قیامِ کلکتہ کے دوران منشی امین الدین نے اس قافلہ کی جو خاطر و مدارات کی یا ان کے
بائے کسی نے کروائی اُس کا تذکرہ پہلے مولوی محمد جعفر تھانیسری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمایا جائے،
ملاحظہ ہیں:

”اُس وقت منشی امین الدین صاحب وکیل سرکاری جو کلکتہ کے مسلم رؤسا میں تھے مع بہت سے عمائد ساکنانِ کلکتہ کے خدمت شریف میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کلکتہ میں قیام تک اس خاکسار کے غریب خانہ میں مقیم رہیں اور جو نان و نمک میسر ہوں قبول فرمائیں۔ حضرت نے اُن کی درخواست کو قبول کر لیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد اور بہت سے شریف و نجیب کلکتہ کے وہاں پہنچے اور حضرت کو اپنے اپنے مکانات کو لے جانا چاہا۔ مگر چونکہ حضرت نے منشی امین الدین سے وعدہ کر لیا تھا، اس واسطے اُن کی درخواست کو منظور نہ فرمایا۔ نماز مغرب کے بعد اول حضرت بہ سواری پاکلی منشی امین الدین کے مکان کو تشریف لے گئے اور پھر منشی صاحب نے ہر قسم کی سواریاں بھیج کر ادھی رات تک سارے قافلہ کو اپنے مکان میں پہنچا دیا۔

ایک عمدہ باغ میں قافلے کا ڈیرہ کرایا گیا۔ رات کو نہایت عمدہ اور پُر تکلف کھانا منشی صاحب کے یہاں سے آیا اور با فراغت سارے قافلے نے سیر ہو کر کھایا۔ صبح کو منشی صاحب نے سارے قافلے کے واسطے جوتے خرید کر ہر ایک کو تقسیم کر دیے۔ جس کے پاس کپڑا نہ رہا تھا اُس کو کپڑا بنا دیا۔ لیکن اس تاریخ سے سید صاحب کو اس مکان میں اتار کر جو منشی امین الدین صاحب رخصت ہوئے پھر آکر اُنھوں نے کبھی مُنہ نہ دکھلایا، اگرچہ دونوں وقت اُن کے یہاں سے سارے قافلے کو کھانا آتا تھا اور اُن کے آدمی ہر وقت خدمت کے واسطے موجود رہتے تھے، مگر وہ خود کبھی نہ آتے۔ اسی طرح تقریباً ایک ماہ گزر گیا۔“ لے

پرنس گورنمنٹ کے اس سرکاری وکیل یعنی منشی امین الدین نے سید احمد صاحب اور اُن کے قافلے کی جس طرح خاطر مدارات کی اُس کا نقشہ جناب غلام رسول مہر نے اپنی ٹور خانہ شان

کے ساتھ یوں کھینچا ہے :

منشی صاحب نے دریا کے کنارے بہت بڑی دری بچھا دی تھی اور ہر قسم کی سواریاں بکثرت منگالی تھیں مثلاً پنیس، ڈولیاں، بگھیاں، کرانچیاں، ہوادار وغیرہ۔ بار برداری کے لیے چھکڑے موجود تھے۔ مزدور بھی خاصی تعداد میں جمع تھے۔ پہلے مستورات کو پردہ کر کے اتارا گیا اور قیام گاہ پر بھیج دیا۔ پھر مرد سوار ہوئے۔ سواریاں اتنی زیادہ تھیں کہ بہت سی خالی واپس کرنی پڑیں۔ منشی صاحب سید صاحب کو پنیس میں سوار کرا کے پہلے اپنے مکان پر لے گئے، پھر قیام گاہ پر پہنچایا، جہاں تمام کمرے فرش سے آراستہ تھے اور ہر کمرے میں ضرورت کے مطابق پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ متعدد اکابر نے بھی اپنے اپنے ہاں ٹھہرنے کی درخواست کی، لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ منشی امین الدین احمد کے ساتھ اقراء ہو چکا ہے اس لیے معذور ہوں، البتہ دعوت قبول کروں گا۔

تین روز تک منشی صاحب کے ہاں سے نہایت پُر تکلف کھانے آتے رہے، مثلاً قرمرہ، شیر مال، باقر خاںیاں، ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ، کئی قسم کے مرتے اور اچار، کئی قسم کے میٹھے، سید صاحب کے لیے جو کھانا آتا اس میں اور بھی کئی قسمیں ہوتیں۔ تیسرے روز آپ نے فرمایا کہ ہمارے لیے صرف ایک قسم کا کھانا آتے، انواع و اقسام کے کھانے کو اہل قافلہ میں تقسیم کرنا بھی مشکل ہے اور ہم لوگ تکلفات کو اچھا بھی نہیں سمجھتے۔ منشی صاحب نے سمجھا کہ شاید کھانا اچھا نہیں ہوتا اس لیے تکلفات میں مزید اہتمام و اضافہ کر دیا۔ لے

رسول نے منشی امین الدین صاحب کی فیاضی یا ان کے حاکموں کی ذرہ نوازی کو مزید یوں بیان کیا ہے :

’منشی صاحب نے پورا باغ سید صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ اُس میں نارنگی، چکوترے، سنگترے، کیلے، انجیر، انار، امرود، ناریل، آم وغیرہ کے درخت تھے۔ انگوڑ کی بلیں بھی تھیں، انناس بھی تھے۔ سید صاحب کے رفیقوں کی تقویٰ شرعی کا یہ عالم تھا کہ خود پھل توڑنا ایک طرف، جو پھل درختوں سے خود بخود گر جاتے انھیں بھی کوئی نہ اٹھاتا۔ ایسے تمام پھل سید صاحب کے پاس جمع ہو جاتے۔ آپ پورے قافلے میں تقسیم فرما دیتے۔ قافلے کے بعض افراد کے جوئے ٹوٹ گئے تھے ”محزن احمدی“ سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی امین الدین احمد نے پہلے ہی دن ضرورت مندوں کو تین سو روپے کے بجوتے اور ایک ہزار سے زیادہ کے کپڑے خرید دیے“ لے

یہ منشی امین الدین کون تھے اور ان کا کاروبار کیا تھا؟ ان کا انگریزوں سے کوئی تعلق دور یا نزدیک کا تھا یا نہیں؟ ان مجلہ امور کی وضاحت سید احمد صاحب کے عاشق زار اور وہابی بیڑے کے مورخ نامدار عالی جناب غلام رسول مہر نے یوں داد تحقیق دیتے ہوئے فرمائی ہے:

’اُس مقام پر کلکتہ سے ایک تیز رفتار کشتی میں جسے پیشین کہتے تھے ایک صاحب آئے اور سید صاحب سے ملے۔ نام پوچھا تو بتایا، امین الدین۔ یہ منشی امین الدین احمد تھے جو بنگال کے اونچے گھرانے کے فرد تھے اور کلکتہ کے ممتاز ایروں میں گئے جاتے تھے۔ انگریزی کمپنی میں انھیں وکالت کا عہدہ حاصل تھا اور کمپنی کے پورے ہندوستانی علاقوں میں سے جتنے مقدمات کلکتہ کی مرکزی حکومت کے پاس پیش ہوتے تھے، سب منشی صاحب ہی کی وساطت سے پیش ہوتے تھے۔ (ان کی مابانہ تنخواہ مقرر نہ تھی، لیکن حق وکالت کی رقم اتنی بن جاتی تھی کہ صاحب ”محزن احمدی“ کے بیان کے مطابق ہر مہینے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار روپے کی تھیلیاں ہاتھی پر

لذکر ان کے گھر پہنچتی تھیں۔ لے

کیا یہ امر جائے غور ہے یا نہیں کہ سید احمد صاحب کی صحبت سے منشی امین الدین احمد ابھی فیضیاب بھی نہیں ہوئے بلکہ زیارت کا شرف تک نصیب نہیں ہوا۔ اس کے باوجود سید صاحب جو ابھی کلکتہ پہنچے بھی نہیں کہ انھیں پینس میں لے جانے کے لیے منشی امین الدین کس طرح اور کیوں آتے؟ کیا انھیں الہام ہو گیا تھا کہ فلاں صاحب آرہے ہیں انھیں اپنے پاس لے آؤ۔ بغیر کچھ دیکھے جہاں لے، انھیں سید صاحب سے عقیدت کس طرح ہو گئی؟ کیا یہ رازداری کے ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کارنامہ تو نہ تھا؟ شاید پورے ہندوستان میں سید صاحب کی اتنی اولیٰ و عقیدت کا اہتمام نہ ہوا ہو جیسا انگریزوں کی راجدھانی یعنی شہر کلکتہ میں ہوا، حالانکہ کلکتہ ان دنوں انگریزوں کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ آخر ان لوگوں کو انگریزوں کے علاوہ اس ڈرامے کے پارٹ ادا کرنے پر اور کس نے مائل کیا تھا؟ قبل ازیں خود منشی امین الدین احمد بھی ایسی عقیدت سے نا آشنا اور بقول غلام رسول مہر، ہدایت سے محروم تھے۔ موصوف نے وضاحت کی ہے:

”جن لوگوں نے سید صاحب کی وجہ سے ہدایت پائی ان میں خود منشی امین الدین احمد

کا ذکر بھی ضروری ہے۔ لے

اگر منشی امین الدین احمد نے سید صاحب سے ہدایت پائی تھی تو جب سید صاحب کے قدم بھی کلکتہ میں نہیں پہنچے تھے اور وہ ابھی راستے میں ہی تھے اس وقت قبل از ہدایت یہی منشی امین الدین احمد کیوں سید صاحب کو لینے کے لیے پہنچ گئے تھے؟ کیا یہ اس قافلے کے لیے رازداری کے ساتھ خود برٹش گورنمنٹ کا انتظام نہیں تھا؟ انگریزوں کی اس بستی میں، انگریزوں کی حوصلہ افزائی کے سہارے اتنی اونچی پرواز اڑنے لگے کہ پیشگوئی کے شرعے دیتے رہے اور انگریزوں کے خفیہ انتظامات کو اپنی کرامت سمجھتے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

”سید صاحب نے کلکتہ پہنچ کر مولانا عبدالحی سے فرمایا تھا کہ اگرچہ ہم حج کی نیت سے آتے ہیں لیکن خدا کے فضل سے اُمید ہے (کمپنی کی مہربانی سے) کہنا

زیادہ موزوں ہوتا، اس شہر میں باب ہدایت اس طرح مفتوح ہوگا کہ دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے۔ یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور اس کی تصدیق بعض انگریزوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کہ ۱۸۶۲ء میں سید صاحب کلکتہ آئے اور مسلم آبادی بہت بڑی تعداد میں ان کی پیروی بن گئی۔ شاہ اسحاق نے بیان فرمایا کہ سید صاحب کلکتہ پہنچے تو بہت سے مسلمانوں نے آپ کی ہدایت سے فائدہ اٹھایا اور آپ کے ارشادات کی برکت سے اس سرزمین میں خاص دینی رونق پیدا ہو گئی۔

حاجی حمزہ علی خاں کہتے ہیں، آدمیوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ سید صاحب کو آرام کے لیے بہت کم وقت ملتا تھا۔ سب لوگ شیرینی لاتے اور زیادہ تر بتائے ہوتے۔ لوگوں کے پاس خاطرے سید صاحب کم از کم ایک دانہ ضرور چھکتے اس طرح زبان مبارک پر ابلے پڑ گئے تھے۔ بیعت کا سلسلہ دو اڑھائی پہر دن چڑھے سے شروع ہو جاتا اور رات تک جاری رہتا۔ عورتیں بھی بکثرت آتیں اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کمرہ بھر جاتا۔ بہت سے غیر مسلم سید صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ کلکتہ اصلاً انگریزی بستی تھی، وہاں کی زندگی انگریزی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ عورتیں بے پردہ ہوتیں، شراب بکثرت پی جاتی۔ سید صاحب کی وجہ سے مسلمانوں میں پردے کا رواج چھو اور شراب کی دکانیں بے وقوف ہو گئیں۔“

انگریزوں کی اس آبادی یعنی کلکتہ میں سید صاحب کو جتنی آمدنی ہوئی اس کے بارے میں مہر صاحب یوں لکھتے ہیں :

”کلکتہ والوں کے تحائف و ہدایا کے بارے میں جو کچھ معلوم ہو سکا اس کی سرسری کیفیت یہ ہے :

۱۔ منشی امین الدین احمد: پانچ ہزار نقد، تین سو جوڑے جوتے، چار گھڑی کپڑے، ایک میں سفید تھان یعنی لٹھا، ملل وغیرہ۔ دوسری میں سوسی اور چھینٹ کے تھان، باقی گھڑیوں میں مولنا کپڑا۔ دو نہایت خوبصورت گھڑیاں۔ پانچ ہزار روپے اس غرض سے (مزید) پیش کیے کہ ممکن ہے بعض اوقات سید صاحب کے رفقاء کو مزاج کے مطابق کھانا نہ ملا ہو اور انھوں نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ پانچ سو احرام دتے۔

۲۔ امام بخش سوداگر: تین سو روپے، بیس اشرفیاں، پندرہ تھان سفید اور چھینٹ کے۔ دو شیشیاں عطر کی، جن میں پانچ پانچ تولے عطر تھا۔ ایک بنگلہ جسے سید صاحب نے باصرار واپس کر دیا۔

۳۔ غلام حسین تاجر: چار جہاز پورے نذر کیے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کا سامان بھی مہیا کر دیا۔ چونکہ انتظام ہو چکا تھا، اس لیے سید صاحب نے یہ نذر بشکریہ واپس کر دی۔ غلام حسین نے اپنے لڑکے کو ساتھ کر دیا۔ یقین ہے بڑی رقم بھی دی ہوگی، اُس کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ ایک کوٹھی نذر کی جو سید صاحب نے اُسے واپس دے دی۔ مراجعت پر سید صاحب اُسی کے ہاں ٹھہرے تھے۔

۴۔ شیخ رمضان: سعد الدین ناخدا، منشی حسن علی اور امام بخش تاجر نے چار سو احرام پیش کیے اور عرض کیا کہ جو احرام پہلے پیش ہو چکے ہیں عمرہ کے لیے باندھ جائیں، ہمارے احرام حج کے لیے استعمال کیے جائیں۔

۵۔ جس پیر زادے نے بیرونی دروازے سے مکان کے اندر تک سید صاحب کے لیے پگڑیاں بچھائی تھیں، اُس نے سو روپے پیش کیے۔ اس درجے کی دوسری نذروں کا حساب پیش کرنا مشکل ہے۔

سید صاحب نے سوار ہونے سے پیشتر حکم دے دیا تھا کہ ساتھیوں میں سے جس جس کے پاس ایک جوڑا ہو، اُسے تین جوڑے نئے بنوا دیے جائیں۔ باقی لوگوں کے لیے کم از کم دو دو نئے جوڑوں کا انتظام کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک سو کے لیے دو دو جوڑے سلوا دیے گئے۔

سید صاحب نے اس دورہ حج کے سلسلے میں کتنے ہی شہروں کا دورہ کیا، اُن کے ساتھ تقریباً ساڑھے سات سو آدمی جمع ہو گئے تھے جنہیں حج کے لیے ساتھ لے جانا منظور ہو گیا تھا۔ خود تو وہ بیچارے خالی ہاتھ تھے لیکن اس دورے میں کمپنی بہادر کی نظر عنایت سے مسلمان رئیسوں کا نام رکھ کر نوازشوں کی وہ بارش ہوئی کہ جس کا اندازہ بھی کرنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے الہ آباد اور کلکتہ کے دور رئیسوں یعنی شیخ غلام علی اور منشی امین الدین احمد کی امداد کا ذکر کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے شہروں اور قصبوں میں بھی آپ کے ساتھ یہی سلوک رہا۔ بھولے بھالے مسلمان تو اپنے پاس سے نذریں پیش کرتے کیونکہ حج کے لیے ایسا جلوس اُنھوں نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ کانوں سے سنا ہوگا۔ لیکن بڑے بڑے رئیسوں نے جو بعض مقامات پر امداد کی اُس میں برٹش گورنمنٹ کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ جن وجوہات کی بنا پر ہم یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں اُن کا ذکر ہر واقعے کے ساتھ کر دیا گیا ہے۔ حاشا وکلا ہمیں کسی سے خواہ مخواہ کی عداوت نہیں اور نہ ہم کسی پر الزام تراشی ہی کرنا چاہتے ہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ حقیقت کو اُس کے اصلی رنگ میں پیش کیا جاتے۔

سید صاحب جب اس قافلے سمیت حج سے فارغ ہو کر ہندوستان وارد ہوئے تو غلام رسول صاحب کی تحقیق کے مطابق ۶ صفر ۱۲۳۹ھ مطابق ۱۲ اکتوبر ۱۸۲۳ء کو کلکتہ پہنچ گئے۔ مختلف شہروں میں آپ کو مدعو کیا گیا، کافی کافی عرصہ وہاں قیام رہا۔ باقی ماندہ قافلے کے ساتھ دنیا فٹیں ہوتی رہیں۔ تحفے تحائف اور نذرانے وصول کرتے ہوئے بریلی پہنچ گئے۔ یہ ۳۹-۱۲۳۸ھ/ ۲۳-۱۸۲۲ء کی فتوحات کا ذکر ہے۔

اب قارئین کی توجہ سید احمد صاحب کی تحریکِ جہاد کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں مقتدین کا موقف یہ ہے کہ سکھوں کے مظالم کی بنا پر سید صاحب نے اُن سے جنگ کرنے کی ٹھانی تھی۔

ہندوستان کے مختلف شہروں میں آپ نے گشت کی۔ آپ کے رفقاء یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی (المتوفی ۱۲۴۳ھ) کے جگہ جگہ ترغیب جہاد پر وعظ ہوئے۔ کتنے ہی مسلمان جان اور مال سے آپ کے ساتھی بن گئے۔ یہ ۱۲۴۲ھ/ ۱۸۲۷ء میں دورہ کیا گیا۔ جب سید صاحب پوری طرح لیس ہو گئے، ساتھیوں کی بھیڑ لگ گئی تو عازم پنجاب ہوئے لیکن اس روانگی سے پہلے اور دورے کے شروع سے ہی اس الہام کا سُنا دینا ضروری خیال کیا جاتا تھا، جو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے دوسرا اہم الہام بار بار کیا جا رہا تھا۔ وہ الہام یہ تھا:

”آپ کے سفر جہاد سے پہلے، بار بار آپ کو یہ الہام رہا ہے کہ آپ کا ملک پنجاب آپ کے ہاتھوں پر فتح ہو کر پشاور سے تادیبائے ستیج (یعنی سکھوں کا علاقہ) مثل ہندوستان کے رشک افزائے چمن ہو جائے گا۔ چنانچہ ان متواتر وعدہ ہائے فتح سے آپ کا ہر مرید واقف تھا“۔

سید صاحب کی نظر میں جتنے ہندوستان پر انگریزی تسلط تھا، وہ رشک افزائے چمن تھا اور ستیج سے پشاور تک کے علاقے کو بھی، جو سکھوں کے قبضے میں تھا، آپ انگریزی عملداری میں شامل کر کے، رشک افزائے چمن بنانے کی خاطر تن من دھن کی بازی لگانے پر تیار تھے، کیونکہ دوسری طرف سے بار بار الہام ہو رہا تھا۔ موصوف نے اس الہام اور متواتر وعدہ ہائے فتح کے نام سے خوب جمعیت اکٹھی کی۔ بے شمار امداد ہوئی حتیٰ کہ ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۴۶ھ تک کے غلط طبع میں بھی آپ اس الہام اور ان وعدہ ہائے فتح کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ کاش! اُن کا نصیر بیدار ہو جاتا اور قوم کو ایسے عجیب چکر میں پھنسا کر نہ جاتے، کیونکہ:

اپنے لائق کو نہ پہچانے تو محتاجِ ملوک

اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا، دارا و جم

سید احمد صاحب نے یار محمد خاں حاکمِ یاغستان کو خط لکھتے ہوئے اپنے دوسرے الہام کا خود نقل لکھا رہا ہے:

فقیر دریں باب بشاراتِ غیبی مامور است و بہ بشاراتِ لاریبی بشر، ہرگز ہرگز شعبۂ وسوسۂ شیطانی و شائبہ ہوائے نفسانی بایں الہامِ رحمانی مترج نیست، بالجمہ فقیر مثال حکمِ الہی از تہ دل مقصود است و اعتماد بوعده الہیہ کلی حاصل، و اما ایں کہ بوعده الہیہ بچہ طریق ظاہر گردد پس بندہ عبودیت شعار را چہ یاراکہ از مالک خود بہ پرسد کہ وعدہ خود را بچہ طور ایفا خواہی کرد، کہ ایں سوال خارج از قانونِ آدابِ عبودیت است، بالجمہ از گفتگو و چون و چرا بیزارم و از ماندہ اطاعتِ محض ذلہ بردار، لہ

فقیر اس خصوص میں غیبی اشارہ کی بنا پر مامور ہے اور اُس مبشر کی اس بشارت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ہرگز ہرگز کسی شیطانی و وسوسہ اور نفسانی خواہش کا شائبہ اس الہامِ رحمانی میں شامل نہیں ہے۔ حالِ کلام یہ کہ فقیر کو حکمِ الہی کی تعمیل تہ دل سے منظور ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر کامل اعتماد ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اللہ کا وعدہ کس طرح ظہور پذیر ہوگا؟ اس بندے کو جس کا شعار بندگی ہے کیا طاقت ہے کہ وہ اپنے مالک سے یہ پوچھے کہ تو اپنا وعدہ کس طرح پورا کرے گا؟ ایسا سوال آداب اور قانونِ عبودیت کے خلاف ہے۔ غرض میں ایسی چنان و چنین کی باتوں سے بیزار ہوں اور محض اُس کی بندگی کے دسترخوان کا ریزہ چہین ہوں۔

فقیر محمد خاں کے نام خط لکھتے ہوئے سید احمد صاحب نے یہ مژدہ اُنھیں ان لفظوں میں سنایا تھا

”اما بیانِ الہام، پس فقیر از پردۂ غیب بہ بشاراتِ ربانی باستیصال کفار دراز مویاں (یعنی قوم سکھ) مامور است و از کمین لاریب بشاراتِ اب رہا الہام، وہ یہ ہے کہ اس فقیر کو پردۂ غیب سے کفار یعنی لائبہ بال والے سکھوں کے استیصال کے لیے مامور کیا گیا ہے اور ایسے مقام سے جس میں شک و شبہ کی گنجائش

روحانی بغلبہ مجاہدین ابراہیم بشارتؑ
 نہیں۔ روحانی بشارتوں کے ذریعے نیک کردار
 مجاہدین کو ان پر غلبہ پانے کی بشارت دینے
 والا مقرر کیا گیا ہے۔ ۱۷

شاہ بخارا کے نام سید احمد صاحب نے جو طویل خط لکھا اس کی دو عبارتیں متعلقہ اہام حسب ذیل ہیں:

در مقدمہ اقامت جہاد و ازالہ کفر قیام جہاد کے معاملے اور کفر و فساد کے
 و فساد بطریق اہام ربانی و کلام رفع دفع کرنے کے لیے اہام اور روحانی
 روحانی بہ اشارات غیبی در باب مکالمہ کے ذریعہ غیبی امامت سے اس
 امامت مشرف ساختند و بہ بشارت فقیر کو مشرف فرمایا۔ اور ہم کو فتح و نصرت کے
 لاریں در باب فتح و ظفر مبشر... متعلق ایسی بشارتوں کا منجبر۔ بامور فرمایا ہے
 ہرگز ہرگز شعبہ و سوسہ شیطانی ہرگز ہرگز کوئی شیطانی و سوسہ اور نفسانی
 و شائبہ ہوائے نفسانی باین اعیہ خواہشات کا کوئی شائبہ بھی اس ملٹی
 روحانی و اہام ربانی مخلوط نہ گردید۔ دعوت اور اہام ربانی میں داخل نہیں ہے
 وَاللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُولُ وَكِیْلٌ وَاللّٰهُ تَعَالٰی عَلٰی مَا نَقُولُ وَكِیْلٌ

سید صاحب کے مذکورہ بالا بیانات سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں:

۱۔ سید صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہام ہوا، بار بار اہام ہوا کہ پنجاب تمہارے
 ہاتھ پر فتح ہوگا۔

۲۔ سید صاحب کو بذریعہ اہام بتایا گیا کہ تمہیں سکھوں کے استیصال کے لیے پیدا
 کیا گیا ہے۔

۳۔ پنجاب کی فتح و نصرت کا مشرودہ سنانے پر سید صاحب کو من جانب اللہ مامور کیا گیا تھا۔

۴۔ موصوف کو نہ صرف بذریعہ اہام بلکہ روحانی مکالمے کے ذریعے درجہ امامت پر فائز
 کیا گیا تھا۔

۱۷ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۷
 ۱۸ مکتوبات کی عبارتوں کا ترجمہ اسی کتاب سے نقل کیا جا رہا ہے جو سخاوت مرزا نے کیا تھا۔
 ۱۹ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: مکتوبات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۸۱، ۸۰

۵۔ پنجاب کی فتح اور سکھوں کے استیصال کا جو سہرا بذریعہ الہام سید احمد صاحب کے سر پر باندھا گیا تھا۔ اس الہام کی صداقت میں موصوف کے نزدیک شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

۶۔ ان دونوں مزدوروں کو بشارتِ رحمانی اور الہامِ ربّانی کے ذریعے پہنچایا گیا تھا۔
 ۷۔ اس ربّانی الہام اور رحمانی بشارت کا ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہو گا کیونکہ ان میں شیطانی دوسرہ یا نفسانی خواہشات کا شائبہ حضورِ اہی تھا، جو ان کا خلاف واقع ہو جائے۔
 ۸۔ سید صاحب اپنے الہام کی صداقت پر خدا کو گواہ رکھتے تھے۔

۹۔ موصوف خدا سے یہ پوچھ تو سکتے تھے کہ پنجاب کیسے فتح ہو گا اور سکھوں کا استیصال کن طریقوں اور کتنی تیاری سے کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سوال اُن کے نزدیک شعائرِ بندگی اور قانونِ عبودیت کے خلاف تھا۔

۱۰۔ موصوف کو قیامِ جہاد اور دفعِ فساد پر بذریعہ الہام مامور کیا گیا تھا۔ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ۔
 اس موضوع پر ہمیں کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ سید صاحب کے بیانات کی روشنی میں اُن کے معتقدین سوچیں اور فیصلہ کریں کہ یہ الہامِ رحمانی تھا یا شیطانی؟ بشارتِ رحمانی تھی یا خواہشِ نفسانی؟ کیا سید صاحب نے واقعی الہام کے مطابق پنجاب کو فتح کر لیا تھا اور سکھوں کا استیصال کر دیا تھا؟ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے اور کیوں نہ ہو جبکہ اس کے علاوہ چارہ کار بھی کوئی نہیں، تو فیصلہ کرنے میں دشواری کیا باقی رہ گئی؟ خدا کرے کسی کی اندھی عقیدت راستے میں حائل نہ ہو جائے ورنہ معاملہ تو صاف ہے۔ اگر آج فیصلہ نہیں کرتے تو نہ سہی، کل خود ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ آخر دنیا ئے دنی کا یہ اندھیرا چھٹے گا، صبحِ قیامت نمودار ہوگی۔

أَلَيْسَ الْقَبْحُ بِقَرِيبٍ ۚ کیا صبحِ قیامت قریب نہیں ہے؟ کہو گے تو سہی: ہ

یہ عذرا تمہارا جذبِ دل کیسا نیکل آیا

میں الزام اُن کو دیتا تھا، قصور اپنا نیکل آیا

اگر اب بھی کوئی کسرا تھی رہ گئی ہے تو سید صاحب کا اس سے بھی کئی گنا الہامی مژدہ سماعت فرماتے اور اس کی روشنی میں ہی فیصلہ کر کے خار کو خار اور رُکُل کو رُکُل کا مقام دے لینا۔ ہمارا

ہم بفضلِ تعالیٰ سمجھا دینا ہے، دلوں کا پھیرنا اور ہدایت دینا باری تعالیٰ شانہ کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ وہ الہامی بیان پیش خدمت ہے :

”سید محمد یعقوب آپ کے بھانجے سے روایت ہے کہ بروقت روانگی خراسان آپ اپنی ہمشیر والدہ سید محمد یعقوب سے رخصت ہونے لگے تو آپ نے اُن سے فرمایا کہ ”اے میری بہن! میں نے تم کو خدا کے سپرد کیا اور یہ بات یاد رکھنا کہ جب تک ہند کا شرک اور ایران کا رخص اور چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق میرے ہاتھ سے محو ہو کر ہر مردہ سلت زندہ ہو جائے گی، اللہ رب العزت مجھ کو نہیں اٹھائے گا۔ اگر قبل از ظہور ان واقعات کے کوئی میری موت کی خبر تم کو دے اور تصدیق پر حلف بھی کرے کہ سید احمد میرے روبرو مر گیا یا مارا گیا تو تم اُس کے قول پر ہرگز اعتبار نہ کرنا کیونکہ میرے رب نے مجھ سے وعدہ واثق کیا ہے کہ ان چیزوں کو میرے ہاتھ پر پورا کر کے مارے گا۔“

اچھا ہوتا کہ سید صاحب اتنی سی وضاحت اور فرمادیتے کہ اُن کے رب یا ارباب نے یہ وعدہ اُن سے کہاں بیٹھ کر کیا تھا، بہر حال سید صاحب کے اس بیان کی روشنی میں کہ جب تک مذکورہ چاروں ملکوں کو میں پاک صاف نہ کر دوں اُس سے پہلے اگر کوئی حلفیہ بھی میری موت کی خبر دے تو وہ جھوٹا ہے۔ ہم خیر اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ موصوف سے ہند کا شرک، ایران کا رخص، چین کا کفر اور افغانستان کا نفاق آج تک نہیں مٹایا جاسکا، لہذا موصوف اپنے بیان کی روشنی میں کہیں جیتے جاگتے ہی پھر رہے ہوں گے۔ اُن کے رب نے تو ان کاموں سے پہلے نہ اٹھانے کا وعدہ کر ہی لیا تھا، لہذا ہو سکتا ہے کہ موصوف پہلے ان چاروں ملکوں میں مردہ منتوں کو زندہ کرتے پھر رہے ہوں گے۔ ویسے اس کا فیصلہ تو سید صاحب کے معتقدین ہی کر سکتے ہیں کہ سید صاحب اب زندہ ہیں یا نہیں؟ اگر وہ آنجہانی ہو چکے تو اپنے اس بیان کی روشنی میں اُنھیں سچا سمجھا جائے گا یا جھوٹا؟ کوئی کچھ بھی فیصلہ کرے یہ اُس کی اپنی مرضی ہے۔

ہاں قارئین کی معلومات کے لیے اس امر کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ خود سید صاحب کے اربعین سوانح نگار یعنی مولوی محمد جعفر تھانیسری نے بھی تسلیم کیا ہے کہ وعدۂ فتح پنجاب کے الہام کے خلاف واقع ہوا۔ موصوف کے اپنے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

”وعدۂ فتح پنجاب کا آپ (سید صاحب) کو ایسا وثوق تھا کہ آپ اُس کو سراسر صادق اور ہونہار سمجھ کر بار بار فرماتے اور اکثر مکتوبات میں لکھا کرتے تھے کہ اس الہام میں وسوسہ شیطانی اور شائبہ نفسانی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ملک پنجاب ضرور میرے ہاتھ پر فتح ہوگا اور اس فتح سے پہلے مجھ کو موت نہ ہوگی۔ لیکن معاملہ بالاکوٹ، خواہ شہادت ہو یا غیبت بظاہر سراسر اُس یقینی الہام کے خلاف ہوا۔“

تھانیسری صاحب نے یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ سید صاحب کے الہام کے خلاف ہوا، انصاف کے دامن کو جھٹک دیا کیونکہ آگے صاف کہنا پڑ جاتا کہ اگر الہام کے خلاف واقع ہوا تو وہ رحمانی نہیں بلکہ شیطانی الہام تھا جسے وسوسہ شیطانی کہتے ہیں، اس صورت میں سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے الہاموں میں شرعی لحاظ سے فرق بتانا مشکل ہو جاتا، لہذا انھوں نے فیصلے کی اس شاہراہ کو چھوڑ کر یوں تاویل کی پگھلٹنی پر چلنا شروع کر دیا:

”اس وقوعہ (معرکہ بالاکوٹ) کے پندرہ برس کے بعد سلطنت پنجاب متعصب اور ظالم سکھوں کے ہاتھ سے نکل کر ایک ایسی عادل اور آزاد اور لامذہب قوم کے ہاتھ میں آگئی جس کو ہم مسلمان (دہائی صاحبان) اپنے ہاتھ پر فتح ہونا تصور کر سکتے ہیں اور غالباً سید صاحب کے الہام کی صحیح تاویل یہی ہوگی جو ظہور میں آئی۔“

تھانیسری صاحب تو خیر اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اس جہانی موذخین ہی بتادیں کہ سید صاحب کا

مذکورہ الہام ربانی تھا یا شیطانی؟ اگر وہ بھی اس فیصلے سے کتر اگر تھا نیسری صاحبؒ کی تاویل کا اس تھا متے میں تو ہم اُن کی خدمت میں یہ سود بانہ التماس پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اسے انصاف کا غور کرنے والوں اس تاویل کا مفاد یہی تو ہے کہ برٹش گورنمنٹ یا سید احمد صاحبؒ، ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے "من تو شدم تو من شدی" والا معاملہ تھا۔ سید صاحب فتح کر لیتے یا انگریزوں نے پنجاب فتح کر لیا۔ انگریز خود سکھوں سے لڑتے یا سید صاحب کو بھڑا دیا۔ ایک ہی بات ہے۔ مانا کہ قالب دو تھے لیکن جان تو دونوں طرف ایک تھی۔ بظاہر دونوں کے راستے الگ لگ نظر آتے تھے لیکن منزل مقصود دونوں کی ایک تھی۔ یعنی انگریزی عملداری کی حدود کو اور وسیع کرنا جسے سید صاحب اپنی ہی عملداری سمجھا کرتے تھے، نیز اس عملداری کے راستوں کی رکاوٹوں کو دور کر کے اسے مضبوط و مستحکم کرتے تھے۔ یہی تھی اُن کی منزل مقصود اور یہی ہے اُن کے جہاد کی غرض و غایت۔ لہذا:۔۔

ہیں سنارے کچھ منظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

بہر حال سید احمد صاحبؒ اپنے جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے، جمعیت کو لے کر گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور شہر شہر پھرے، جہاد کے نام سے بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا دیا، کتنے ہی مسلمانوں نے جہاد کے نام سے دھوکا کھا کر ہر قسم کی جانی اور مالی قربانی پیش کی۔ انگریز اس تیاری پر مانع نہیں ہوئے اور مانع کیوں ہوتے جبکہ یہ سارا منصوبہ ہی انگریزوں کا اپنا تھا۔ سکھوں سے نہ لڑنے کا انگریز معاہدہ کر چکے تھے، دریائے ستلج کو سرحد قرار دیا جا چکا تھا۔ لیکن انگریزوں نے جب قلبِ ہند کے اپنے طاقتور دشمن کو بڑی حکمتِ عملی سے پھرے میں بند کر لیا تو اب کچھ جیسی جنگ آزما قوم کو زیر کرنے کی نگرہا منگیں ہوئی۔ اس مقصد کے لیے برٹش گورنمنٹ کو سید احمد صاحبؒ سے موزوں اور کون مل سکتا تھا، جنہوں نے جعفر بنگال اور سادق دکن کی سنتِ معلومہ کو تازہ کرنے کی غرض سے ایک مسلمان فرمانروا یعنی نواب امیر خاں مرحوم کو انگریزوں کے ہاتھ میں پھنسا کر بے دست و پا کر دیا تھا۔ سکھوں اور سرحد کے مسلمانوں کو زیر کرنے کا کام بھی سید احمد صاحبؒ کے ہی سپرد کیا گیا۔ اندرونِ خانہ انگریز ہر طرح امدادی تھے، فریقین میں

مکمل اتحاد و اتفاق تھا، لیکن پردہ رکھنے کی غرض سے جہاد کرنے کی برٹش گورنمنٹ سے یوں اجازت حاصل کی جاتی ہے :

”اُس وقت ہر شہر، قصبہ و گاؤں، برٹش انڈیا میں علانیہ سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ ہونا تھا مگر براہِ دُور اندیشی معرفت شیخ غلام علی صاحب رئیس اعظم الہ آباد کے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر اضلاع شمالی و مغربی کو بھی سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کی اطلاع دی گئی تھی۔ جس کے جواب میں صاحب مدوح نے یہ تحریر فرمایا کہ جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ و فساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں۔“ ۱

اسی اجازت کے واقعے کو مرزا حیرت دہلوی نے ذرا اور کھل کر یوں بیان کیا ہے :

”سید احمد صاحب نے مولانا شہید (مولوی محمد اسماعیل دہلوی) کے مشورہ سے شیخ غلام علی رئیس الہ آباد کی معرفت لیفٹیننٹ گورنر ممالک مغربی شمالی کی خدمت میں اطلاع دی کہ ہم لوگ سکھوں پر جہاد کی تیاری کرنے کو ہیں، سرکار کو تو اس میں کچھ اعتراض نہیں ہے؛ لیفٹیننٹ گورنر نے صاف لکھ دیا کہ ہماری عملداری کے امن میں خلل نہ پڑے، ہمیں کچھ سروکار نہیں، نہ ہم ایسی تیاری کے مانع ہیں۔ یہ تمام پتین پتین ثبوت صاف صاف اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ یہ جہاد صرف سکھوں ہی کے لیے مخصوص تھا، سرکار انگریزی سے مسلمانوں کو ہرگز ہمدردی نہ تھی۔“ ۲

اعلیٰ احکام نے اُس وقت اپنے ماتحت افسروں کو مطلع کر دیا تھا کہ سید صاحب اینڈ کمپنی سے ہرگز مزاحمت نہ کرنا یہ ہمارے مخالف نہیں ہیں۔ اس امر کی واضح تصریح مرزا حیرت دہلوی کے وائسنگاف لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے :

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء، ص ۱۶۸

۲۔ حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۷۰

جب مہیب تحریک پھیلی تو ضلع کے حکام اس سے چوکتے ہوئے اور اُنھیں خوف معلوم ہوا، کہیں ہماری سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور موجودہ امن میں تو کسی قسم کا خلل واقع نہ ہوگا۔ اس نظر سے ضلع کے حکام نے اعلیٰ کو لکھا۔ وہاں سے صاف جواب آگیا۔ ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو، ان مسلمانوں کو ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے، یہ سکتھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں۔ اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔ بھلا مسلمانوں کو گورنمنٹ انگلش سے کیوں روکا ہونے لگا تھا، جہاں وہ اپنے دین کے ارکان بخوبی ادا کر سکتے تھے اور کرتے تھے۔ انہیں تو لبریشن (مذہبی آزادی) بخوبی حاصل تھی۔ وہ صرف دشمن دین و ایمان سکتھوں سے مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور ان کا ارادہ صرف سکتھوں ہی سے اپنے مظلوم بھائیوں کا انتقام لینا تھا، جن کے قابلِ رحم مظالم کا بیان ہم مولانا شہید کی سوانح عمری میں بیان کر چکے ہیں۔ ۱

بات اصل میں یہ ہے کہ حکام اعلیٰ سید احمد صاحب کی طرف سے پوری طرح مطمئن تھے کیونکہ وہ تیارے انگریزوں کی مخالفت کیا کرتے جبکہ ساری زندگی ہی صرف انگریزی مفادات کے حصول و غنائم گزار دی تھی۔ جن حضرات کو موصوف کی برٹش نوازی بلکہ ایجنٹ ہونے کا پتہ نہیں تھا۔ ان نے اس تیاری اور پہل پہل کے وقت عظیم آباد اور ملتان میں حکام اعلیٰ سے اس تیاری کی شکایت کی، نقص امن کا خطرہ سمجھایا، لیکن حکام کے سامنے چونکہ اصل حقیقت موجود تھی وہ شکایتوں پر ایمان دھرتے اور بے خبر ہمدردوں کو کیوں منہ لگاتے، مہر صاحب یوں رقمطراز ہیں :

”بعض شیعہ حضرات نے (قیام عظیم آباد کے دوران) انگریز حاکم کے پاس شکایت کی کہ سید صاحب انگریزوں کے خلاف جہاد کا ارادہ یکے بیٹھے ہیں اور ہم لوگ از روئے خیر خواہی یہ حقیقت آپ تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن حاکم نے اس شکایت کو فرقہ وارانہ رقابت کا نتیجہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔“ ۲

”بعض حاسدوں نے (قیامِ مکتہ کے دوران) انگریزوں کے پاس شکایت کی کہ سید احمد پہلے نواب امیر خاں کے لشکر میں نشان بردار تھا، نواب کمپنی سے مل گیا تو سید احمد نے پیری مریدی کا ڈول ڈالا اور اب انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ محض بے علم ہے۔ اس شکایت پر کسی نے توجہ نہ کی۔“

نواب امیر خاں کو انگریزوں کے پیچھے میں بند کر دانا اور سکھوں سے لڑ کر پنجاب کو انگریزوں کے قبضہ میں شامل کرنے کی کوشش کرنا، یہ سید احمد صاحب کے وہ کارنامے ہیں جو بڑی رازداری سے پایہ تکمیل کو پہنچانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ اپنے منہ سے آج تک کون سے غدار نے اعتراف کیا ہے کہ میں اپنے دین اور اپنی ملت کے فلاں بدخواہ کا آلہ کار ہوں؟ اس طرح تو میر جعفر اور میر صادق وغیرہ نے بھی تسلیم نہیں کیا تھا بلکہ وہ بھی اپنے ان سیاہ کار ناموں پر پردہ ڈال کر نازاں تھے۔ غداروں کا اندازہ بعض حالات و قرائن سے ہی لگایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ایسا سببان مل جائے کہ کسی ایجنٹ نے دشمن سے اپنی دوستی کا دم بھرا ہو یا اس کی تعریف کی ہو تو میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ قابلِ اعتماد ثبوت کسی کی ایجنٹی کا آج تک تحریری طور پر نہ مل سکا۔ آج اب ہم سید احمد صاحب کے بارے میں ان کی گھریلو تصانیف سے ایسے بیانات تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

”یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپ سکھوں سے جہاد کرنے کے لیے تشریف لے جا رہے تھے تو کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دُور سکھوں سے جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہیں؟ انگریز جو اس ملک پر حاکم اور دینِ اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں؟ گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو، یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریکِ دمِ دگار ہو جائیں گے، کیونکہ سیکڑوں کو س سفر کر کے، سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا، یہ ایک ایسا امرِ محال ہے جس کو ہم لوگ نہیں کر سکتے۔“

سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت نہیں کرنا چاہتے اور نہ ہی انگریزوں اور سکھوں کا ملک لینا ہی ہمارا مقصد ہے، بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادرانِ اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجبِ جہاد سے باز آجائیں تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

اور انگریزی سرکار گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کوئی ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرائض مذہبی اور عبادات لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ و غلط کتے اور تزویج مذہب کرتے ہیں، وہ کبھی مانع و مزاحم نہیں ہوتی، بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہیں۔ ہمارا اصل کام اشاعتِ توحیدِ الہی اور اچائے سننِ سید المرسلین ہے، سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں۔ پھر ہم سرکارِ انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور اصولِ مذہب کے خلاف بلاوجہ طرفین کا خون گرا دیں؟ ۱

یہی تھامسری صاحب اس بارے میں سید احمد صاحب کے مکتوبات اور حالاتِ زندگی کو منظرِ نگاہِ کسب کی روشنی میں اپنے امیر المومنین کی انگریز دوستی کو واضح کرنے کی غرض سے یوں رقمطراز ہیں:

”اس سوانح اور مکتوبات کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سید صاحب کا انگریزی سرکار سے جہاد کرنے کا ہرگز ارادہ نہ تھا، وہ اس آزادِ عملداری کو اپنی ہی عملداری سمجھتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انگریزی سرکار اس وقت سید صاحب کے خلاف ہوتی تو ہندوستان سے سید صاحب کو کچھ مدد نہ پہنچتی مگر سرکارِ انگریزی اس وقت دل سے چاہتی تھی کہ سکھوں کا زور کم ہو۔“ ۲

۱۔ محمد جعفر تھامسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۱

دیوبندیوں کے نام نہاد مناظر مولوی محمد منظور نعمانی بھی سید صاحب کی انگریز دوستی کو غلط ثابت کرنے سے عاجز ہو کر اُن کی اصلی پوزیشن کو تسلیم کرتے ہیں مگر کس طرح پہلو بدل کر چنانچہ اُن کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

”مشہور یہ ہے کہ آپ (سید صاحب ایڈ کمپنی) نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی۔“

چونکہ مولوی محمد منظور دیوبندی نے اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ انگریزوں نے بعض مواقع پر سید احمد صاحب کی امداد بھی کی تھی، لہذا ہم اس امداد کے واقعات کو مدلل طور پر تجویزی سی وضاحت سے پیش کرنا چاہتے۔ جب سید احمد صاحب لڑائیوں میں مصروف تھے۔ معتقدین کی نظر میں ہما کر رہے تھے اور حقیقت میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ تو انگریزوں نے مصروف کے لیے باقاعدہ وہاں بھی امداد بھیجتا جاری رکھا۔ دہلی اور دوسرے مراکز کی معرفت بھیجتے رہے اور بعض نوابوں کو بھی ترغیب دی۔ مثلاً :

”نواب ٹونک نے بھی دس بیس ہزار روپے شاہ اسماعیل کی معرفت بھیجے۔“

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۶۲ھ) کی معرفت بھی رقم جایا کرتی تھی اور حکومت اُس کی نگران و محافظ تھی۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ مولوی محمد جعفر تھانیسری کی زبانی ملاحظہ فرمائیے :

”اس (لیفٹیننٹ گورنر سے اجازت) کے بعد سید صاحب ملک یاغستان میں پہنچ کر سکھوں سے جہاد میں مصروف تھے۔ اُس وقت ایک ہنڈی سات ہزار روپے کی بذریعہ ساہوکاران دہلی مرسلہ مولوی محمد اسماعیل صاحب بنام سید صاحب روانہ ہوئی تھی۔ ملک پنجاب میں وصول نہ ہونے پر اس سات ہزار روپے کی واپسی کا دعویٰ عدالت دیوانی میں دائر ہو کر ڈگری ہوئی اور پھر ہنگام اپیل عدالت

نایب دیوانی (ہائی کورٹ) آگرہ میں بھی حکم ڈگری بجتی مدعی بحال رہا۔ لہ
مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے :

”جب سید صاحب یا غستان میں تھے تو مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی
نے کچھ اُپر سات ہزار روپیہ سید احمد صاحب کو بذریعہ ہنڈی روانہ کیا تھا۔
وہ کسی باعث سے نہیں پہنچا تھا۔ اُس پر نالش کی گئی تھی اور پھر روپیہ وصول
کر کے دوبارہ سید صاحب کی خدمت میں روانہ کیا گیا تھا۔“

فارتین کرام ! یہ تھے سید احمد صاحب کے بارے میں اُن کے سوانح نگاروں اور معتقدوں کے
بیانات جن کے پیشِ نظر ہم نے ان سوانح نگاروں، سید صاحب کے اکثر معتقدوں اور دیگر
غیر جانب دار مورخوں کے ساتھ ہمنوائی کی اور سید صاحب کو ان جملہ حضرات کی طرح برٹش نواز کہا
اور لکھا۔ ہمارے علمائے اہلسنت موصوف کی اس روش پر گرفت بھی کرتے آئے ہیں۔ مبتدعین
حضرات کے پاس کوئی دلیل حقیقت میں ایسی نہیں تھی جس سے وہ ذرا بھی صفائی پیش کر سکیں۔
دوسری مشکل اُنھیں یہ تھی کہ جملہ دہابی مورخ ہمارے دعویٰ کی اپنی اپنی تصانیف میں تائید کرتے تھے
اور اُنھوں نے سید صاحب کو خود فخریہ طور پر برٹش گورنمنٹ کا خیر خواہ بتایا ہے۔ ان جملہ حالات
کے بخلاف جناب غلام رسول مہر اور پروفیسر محمد ایوب قادری نے اپنا مورخانہ ذر صرف کیا اور
بڑی شد و مد سے سید صاحب کو انگریزوں کا دشمن منوانے کی کوششیں کرتے رہے ہیں۔ اور
اپنے اکابر یعنی سید صاحب کے سابقہ سوانح نگاروں پر بھی الزام تراشی میں کوئی عار محسوس نہیں کی۔
مہر صاحب مولوی محمد جعفر تھانویسری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں :

”اس کتاب (تواریخ عجیبہ) نے سید صاحب کے متعلق دو نہایت افسوسناک

لے محمد جعفر تھانویسری : حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۸

لے حیرت دہلوی مرزا : حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ص ۳۷۲

لے تواریخ عجیبہ مصنفہ محمد جعفر تھانویسری کے دوسرے ایڈیشن کا نام ”سوانح احمدی“ رکھا گیا۔ موجودہ ایڈیشن جو
کراچی سے ”نفس ایڈیٹی“ والوں نے شائع کیا ہے اُنھوں نے پہلے حصے کا نام ”حیات سید احمد شہید“ اور
”سید احمد شہید“ کا ”کتوبات سید احمد شہید“ رکھا ہے۔

غلط بیانیوں کو عام کیا۔ اول یہ کہ سید صاحب انگریزوں سے نہیں لڑنا چاہتے تھے صرف سکھوں سے لڑانی پر آمادہ ہوئے تھے۔ اس غلط بیانی کو مستند بنانے کے لیے سید صاحب کے مکاتیب کی عبارتوں میں تحریف کی گئی۔^۱

اس سلسلے میں داد تحقیق دیتے ہوئے موصوف اپنے دعوے کو یوں موکد کرتے ہیں:

”جہان تک میں تحقیق کر سکا ہوں، سب سے پہلے سر سید احمد خاں مرحوم نے سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں سے ہٹا کر سکھوں کی طرف پھیرا۔ ولیم ہنٹر کی کتاب ”ہمارے ہندوستانی مسلمان“ چھپی تھی تو سر سید نے اس کی تمت طرازیوں کے جواب میں ایک سلسلہ مضامین ”پایونیر“ میں چھپوا دیا تھا۔ جو بعد میں الگ بھی چھپ گیا تھا۔ ان جوابی مضامین میں یہ بھی کہا گیا کہ سید صاحب صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ سے اظہارِ برأت کر دیا تھا۔ سر سید کا یہ بیان بہت کم لوگوں کی نظر سے گزرا ہوگا۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری مرحوم نے اُسے پھیلا کر پیش کیا۔^۲

یہی غلام رسول مہرا اپنے موقف کو مضبوط کرنے کی غرض سے یوں انتہائی اقدام کر کے حقائق پر پردہ ڈالنے کی بھرپور کوشش کرتے اور سید صاحب کو انگریزوں کا مخالف دکھانے کے لیے راستہ صاف کرتے ہیں:

”سید صاحب کے متعلق قلمی ذخیروں تک چند افراد کے سوا کسی کو دسترس حاصل نہ تھی۔ ”تواریخ عجیبہ“ (سوانح احمدی) چھپی تو اُس میں سید صاحب کے مقاصد جہاد کا حلیہ بالکل بگاڑ کر پیش کیا گیا تھا۔ عام اصحاب نے اُسے مستند شے سمجھ کر قبول کر لیا۔ اس طرح اُس پاک نفس مجاہدِ کبیر کے مقاصد ایک نہایت افسوسناک غلط فہمی کا ہدف بنے۔ میں مانتا ہوں کہ جس زمانے میں ”تواریخ عجیبہ“

^۱ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم، ۱۹۶۸ء، ص ۲۷

^۲ ایضاً: ص ۲۴۱

لکھی گئی، سید صاحب کی تحریک انگریزوں کے عتاب کا مورد بنی ہوئی تھی۔ لیکن مولوی محمد جعفر صاحب مکاتیب کو چھوڑ سکتے تھے، انھیں تحریف شدہ شکل میں شائع کرنے کی کون سی مجبوری پیش آگئی تھی؟ اور یہ حرکت اُن لوگوں سے سزا ہوئی جو سید صاحب کے عقیدت مند تھے۔“ ۱

جناب غلام رسول مہر کی اس بارے میں ”ہاں میں ہاں ملانے“ کا شرف اگر کسی صاحب کو علمی انداز میں آج کل حاصل ہے تو وہ پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے ہیں۔ مورخانہ انداز میں موصوف نے اس میدان میں کافی کام کیا ہے۔ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کی حمایت اور اُن کے مخالفین کو غلط ثابت کرنے میں آپ نے اپنی صلاحیتیں وقف کی ہوئی ہیں۔ اپنے محبوب ہیرو، جناب سید احمد صاحب کی تحریک جہاد کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

”واقعہ یہ ہے کہ یہ شوشہ بھی خود اپنوں ہی کی طرف سے حکومت برطانیہ کی وفاداری کی غرض سے چھوڑا گیا۔ سب سے پہلے سر سید احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) نے ”اُور انڈین مسلمانس“ پر تبصرہ کیا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ جہاد سکھوں کے خلاف تھا۔ پھر اس تحریک کے خاص رکن مولوی محمد جعفر تھانیسری نے اصل مواد میں ترمیم کر کے انگریزوں کی بجائے سکھوں کا لفظ لکھا اور اس کو مشہور کیا۔ بعض کوتاہ فہم یا پست ذہنیت رکھنے والے اشخاص تحریک مجاہدین کی اہمیت کم کرنے کے لیے اس قسم کے غیر معیاری رسالے کبھی کبھی چھاپتے رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس کو چے ہی سے نابلد ہیں، وہ تحریک مجاہدین کو کیا سمجھیں؟“ ۲

پروفیسر صاحب موصوف نے بھی جناب غلام رسول مہر کی تقلید میں مولوی محمد جعفر تھانیسری کو مورد الزام ٹھہرانے اور اُسی تحریک جہاد کے رازدار و سرگرم کارکن کو بدنام کرنے میں کسی قسم کی

۱۔ غلام رسول مہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، ص ۲۵۰

۲۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: مقدمہ حیات سید احمد، مطبوعہ راجپوت، ۱۹۶۸ء، ص ۲۹

بھجک محسوس نہیں کی۔ ان کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس خانوادے کا کوئی بڑے سے بڑا، خواہ دین و دیانت سے کورامانا پڑے تو مان لیں گے لیکن سید احمد صاحب کی بگڑی کو بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں گے۔ چنانچہ موصوف مزید لکھتے ہیں :

”اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ مولف (محمد جعفر تھانیسری) نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ جہاد کی تحریک از اوّل تا آخر سکھوں کے خلاف تھی۔ انگریزوں سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا اور سید احمد شہید کی جماعت مجاہدین کے سرگرم کارکن انگریزوں سے کوئی دشمنی یا پرغاش نہ رکھتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر تھانیسری جماعت کے خاص رازدار تھے۔ جس کے نتیجے میں انھوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں، گھر بار لٹایا، ہزاروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائداد سے محروم ہوئے، بیوی بچے چھوٹے، عزت و دولت سے محروم ہوئے، زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جھگڑوں اور پہاڑوں (جزائر اندمان) میں قیدی کی حیثیت سے گزارے۔ جب کالے پانی سے رہا ہو کر آتے تو پولیس کی پابندیوں اور نگہانیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ ان حالات و مصائب و آلام کا یہ ردِ عمل ہوا کہ انھوں نے اس موقع میں مصلحت کے قلم سے نقش و نگار کرنے کی کوشش کی ہے، ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔“

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں موصوف نے اپنا تاریخی بھرم رکھنے کی غرض سے غلام رسول مہر صاحب کی ”ماں میں ہاں“ طے کرنے کا فرض ہی ادا کیا ہے۔ چنانچہ اس امر کا ثبوت پیش کرنے کی غرض سے پروفیسر صاحب یوں رقمطراز ہیں :

”حیرت کی بات یہ ہے کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے سید احمد شہید کے بعض مکاتیب کی عبارتیں تک بدل دی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی معرکہ الاراء تصنیف ”سید احمد شہید“ میں اس کا اکتشاف کیا ہے۔ (ص ۱۶۲ تا ۱۸۹)۔“

لاہور ۱۹۵۲ء - ۱۰

سید احمد صاحب کو انگریزوں کا مخالف منوانے کی خاطر وہابیوں کے نامور مورخ یعنی غلام رسول مہراؤن کے اتباع میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا اپنی سو سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی جرأت و جسارت کرنا، ہو سکتا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین و ملت کی کوئی اہم خدمت یا سعادت داریں کا ذریعہ ہو، لیکن انصاف پسند اہل علم حضرات کے نزدیک، اس طرح تحقیق کے پردے میں تحریفیں کرنا دیانت داری سے بعید ہی شمار ہوتا ہے، کیونکہ یہ ملت پر ظلم اور تاریخ سے مذاق ہے۔

جب مصنف "تواریخ عجیبہ" مولوی محمد جعفر تھانیسری کو سید احمد صاحب کی تحریک کا سرگرم کارکن اور رازدار مان لیا، نیز یہ تسلیم کر لیا کہ انھوں نے اعانت تحریک کی پاداش میں کالے پانی کی سزا پائی، اٹھارہ سال جزیرہ انڈیمان میں مقید رہے، جہاں واضع ہوئی اور خوفناک تکلیفیں اٹھائیں دیں حالات، سید صاحب کے ایسے صبر کرنا پر وکلہ پر خود سید صاحب ہی کی تاریخ کو بدلنے اور ان کے مکتوبات میں تحریف کرنے کا الزام لگانا کیسی خوفناک جسارت ہے۔

جناب غلام رسول مہراؤن، ۱۹ء میں انجمنانی ہو چکے، حقیقت حال ان کی نگاہوں کے سنہ آگئی ہوگی۔ علاوہ بریں ان کا معاملہ چونکہ خود ہی سپردِ خدا ہے، اس لیے ان کی طرف بڑے سخن کرنا مناسب ہی نہیں۔ راقم الحروف بصداوب، جناب پروفیسر محمد ایوب قادری ایم۔ اے اور پروفیسر فیروز الدین روجی سے مخاطب ہو کر مندرجہ ذیل امور کی وضاحت کا طلبگار ہے:

۱۔ کیا فواب امیر خاں کے پاس جانے کے وقت (۱۸۱۰ء) سے معرکہ بالاکوٹ (۱۸۳۱ء) تک سید صاحب نے اکیس سال کے اندر کوئی ایسا بیان بنفس نفیس دیا، جس میں صاف صریح طور پر فرمایا ہو کہ ہم انگریزوں سے بھی جہاد کریں گے؟ ایسا بیان مطبوعہ ہونا چاہیے۔

۲۔ اگر سید احمد صاحب کا کوئی ایسا بیان نہ ہو تو کم از کم ان کے دستِ راست مولوی محمد اسماعیل دہلوی ہی کا کوئی ایسا مطبوعہ بیان آجنگاب کے پیشِ نظر ہے؟

لے محمد ایوب قادری: تعارف مصنف حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۵۴

۳۔ یہ بھی نہ سہی، وہ کون کون سے مورخ ہیں جنہوں نے سید احمد صاحب کے بعد یعنی ۱۸۳۱ء سے ۱۸۶۹ء تک کے ایک سو سولہ سال عرصے میں وضاحت کی ہو کہ سید صاحب کا ارادہ انگریزوں سے لڑنے کا تھا؟

۴۔ آپ حضرات ماشاء اللہ تاریخ دان بلکہ اسکالر کہلاتے ہیں، ۱۶۲۶ھ / ۱۸۳۱ء کے بعد سید صاحب کے بعض خلفاء جو انگریزوں سے لڑے تھے اُن واقعات کو اصل تحریک کے نظریات کا جزو قرار نہ دے لینا۔ ۱۸۴۵ء میں سکھ نہیں بلکہ انگریز پنجاب کے حکمران بن گئے تھے۔ اس وقت انگریزوں نے اپنے ان خانہ زادوں کی گوثالی ضروری سمجھی ہوگی کیونکہ اب سرحد میں ان کا وجود انگریزی مفادات کے خلاف ہو کر رہ گیا تھا۔ سکھوں کے عہد حکومت میں تو برٹش گورنمنٹ نے دلی خواہش کے ساتھ سکھوں اور مسلمانوں کو یکجہ کے لیے اپنے ان جانثاروں کو بھیجا تھا۔ اب انگریزوں کا مقصد پورا ہو چکا تھا، لہذا جو سلوک جعفر و صادق کے ساتھ کیا تھا وہ بھلا ان کے ساتھ کیوں نہ کرتے؟

راقم الحروف نے یہاں جو کچھ لکھا ہے کہ سکھوں اور مسلمانوں کو یکجہ کے لیے انہیں بھیجا تھا، اس جملے میں مسلمانوں کا لفظ شاید آپ حضرات کے جذبہ عقیدت کو ٹھیس پہنچانا اور اس وجہ سے طبع نازک پر گراں گزر رہا ہو تو گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا مقصد کسی کا دل دکھانا نہیں۔ ہاں مجبوراً ایسا لکھنا پڑا ہے کیونکہ سید احمد صاحب کے جملہ سوانح نگاروں نے ان بانی مجاہدوں کا سب سے بڑا کارنامہ جو رنگ برنگی تاویلوں کے سہارے فزیہ انداز میں پیش کیا ہے، وہ مسلم گشتی کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

۵۔ ہو سکتا ہے کہ انگریزوں سے خوفناک اذیتیں اٹھانے کے بعد مولوی محمد جعفر تھانیسری ہم گئے ہوں، انہوں نے قلم پر احتیاط کے پہرے بٹھالیے ہوں۔ ان حالات میں یہی ہوتا کہ وہ منہ سے کچھ نہ کہتے، ڈر کے مارے خاموش رہتے، قلم کو بھی حرکت میں نہ لاتے اور باقی زندگی خاموشی میں گزار کر راہی ملکِ عدم ہو جاتے۔ لیکن موجودہ مورخین حضرات جس مصلحت کا تھانیسری صاحب پر بھوت سوار کر رہے ہیں، انہوں نے اس کے برعکس اُسی تحریک کے بانی کی سوانح حیات لکھ ڈالی، جس کے سرگرم کارکن ہونے کی

بنا پر وہ برٹش گورنمنٹ کے زیرِ عتاب رہے تھے۔ ایسا کیوں کیا؟

۶۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ سید احمد صاحب کی سوانح حیات لکھنے کے سلسلے میں انھیں انگریزوں سے کسی قسم کے خطرے یا نقصان کا اندیشہ نہیں تھا، اسی لیے اس موضوع پر قلم اٹھایا تھا۔ اگر سید صاحب انگریزوں کے مخالف ہوتے تو ہو سکتا ہے کہ تھانیسری صاحب ان کی سوانح حیات لکھنے کا خیال تک بھی نہ لاتے۔ بصورتِ دیگر اگر پھر بھی لکھنے پر آمادہ ہوتے تو سید صاحب کو ۱۲۹ھ میں انگریزوں کا مخالف لکھ دینے سے انھیں اندیشہ کس بات کا تھا، جبکہ ۱۲۴ھ میں وہ معاملہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ دریں حالات مولوی محمد جعفر تھانیسری کو تحریکِ جہاد کا رخ موڑنے اور کمزورتیاں میں تحریف کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟

۷۔ مولوی محمد جعفر تھانیسری کو اگر خطرہ لاحق ہو سکتا تھا تو صرف اسی صورت میں کہ وہ خود کو انگریزوں کا دشمن لکھتے یا ظاہر کرتے۔ کسی پچاس سال پیشتر کی ہستی یا تحریک کو انگریزوں لکھنے سے مصنف پر کون سی دفعہ عائد ہو سکتی تھی؟ دریں حالات اپنے بزرگ سید صاحب کے اولین سوانح نگار کی قبر پر حجتِ علی میں نہیں بلکہ بغضِ معاویہ میں، دُعائے خیر کے پھولوں کے بجائے بُھتانات کے کانٹوں کی چادر کس جرم کی پاداش میں چڑھائی جا رہی ہے؟

۸۔ آپ حضرات کو یشکایت ہے کہ جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف نہ پھیر کر تھانیسری صاحب نے تحریک کا حلیہ بگاڑ دیا۔ گویا "تواریخِ عجیبہ" کی ایک یہ حرکت اور دوسرا مسئلہ غیبت آپ کو کھٹکتا ہے اور ان کے علاوہ باقی سب خیریت ہے۔ حالانکہ اسی "تواریخِ عجیبہ" نے سید صاحب کے معجزات و کرامات کا ڈھیر اور الاموں کا اندھیرا اپنے اندر اس طرح محفوظ کیا ہے کہ سید صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے مراتب میں ماسوائے اس کے اور کوئی فرق نظر نہیں آتا کہ انھیں اپنے لیے نبی کہنے اور کہلانے کی قدرت نے ہمت ہی نہیں دی اور ان کے اس غلام کو مرزا صاحب کے ذریعے پورا کیا گیا تھا۔ موجودہ مؤرخین حضرات نے اس جانب سے کیوں منہ پھیرا ہوا ہے؟ آخر اس کی وضاحت بھی تو کرنی چاہیے تھی؟

۹۔ سر سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری نے جس وقت علی الاعلان اس تحریکِ جہاد کو

صرف سکھوں کے ساتھ مخصوص کرنا شروع کیا تھا تو سید احمد صاحب کے معتقدین ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیلے پڑے تھے، اُن میں سے کتنے حضرات نے اس ادعا کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی؟

۱۰۔ صدائے احتجاج بلند کرنا یا اس دعوے کو افترامی ٹھہرنا تو دور کی بات ہے، ہم تو یہی دیکھتے ہیں کہ اُن کے اکثر معتقدین نے مر سید احمد خاں اور محمد جعفر تھانیسری کے اُن بیانات پر مہر تصدیق ہی ثبت کی تھی۔ یہ درست ہے یا نہیں؟

۱۱۔ اگر ان دونوں حضرات نے تحریک کا علیہ بگاڑا تھا تو اُن اہل علم اور صورت حال سے واقف حضرات نے اس بداندیشی کا سد باب کیوں نہ کیا جو اس تحریک سے خود منسلک تھے اور مولوی محمد جعفر تھانیسری کی طرح اس کے سرگرم کارکن اور رازدار تھے؟

۱۲۔ سید صاحب کے اُن معتقدین کے ناموں کی فہرست پیش کرنے کے لیے ہم تیار ہیں جنہوں نے موصوف کا انگریز دشمن ہونا ہرگز تسلیم نہیں کیا۔ کیا ایسے جملہ حضرات کو آپ سید صاحب کے بدخواہ اور تحریف پسند لکھنے اور ماننے کے لیے تیار ہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟

۱۳۔ اگر بقول مہر صاحب، مولوی محمد جعفر تھانیسری نے سید صاحب کے مکتوبات تک میں تحریف کر دی تھی تو، ۱۹۶۷ء سے پہلے وہابیوں کے علماء اور مورخ کہاں سوئے پڑے تھے؟ اُنہوں نے اصل اور نقل کے فرق کو واضح کر کے، اس تحریف کے سلسلے میں اپنا فرض کیوں ادا نہیں کیا تھا؟

۱۴۔ فرہسی، جن حضرات کے قبضے میں وہ مکتوبات تھے کم از کم اُنہیں تو اپنے وحی و عصمت والے اور خدا سے مصافحہ و ملاقات کرنے والے، بلکہ باری تعالیٰ شانہ سے ہمکلامی کے شرف سے مشرف ہونے والے دادا پیر کی حمایت میں اغماض سے کام لے کر بدخواہوں کی فہرست میں اپنا نام نہیں لکھوانا چاہیے تھا، آخر وہ سب کے سب کیوں چُپ ساڑ پڑے رہے؟

۱۵۔ غلام رسول مہر کی تازہ تحقیق پر تو جناب قادری صاحب ایمان لے آئے کہ مکتوبات کی

اصل عبارتیں یوں نہیں بلکہ یوں ہیں۔ لیکن موصوف نے اس طائفہ کی تاریخ کو شاید وہابیت کی عینک اُتار کر دیکھنے کا شرف کبھی حاصل ہی نہیں کیا ورنہ انھیں صاف نظر آ جاتا کہ اس جماعت کے اونچی چوٹی کے علماء بھی اتنے جبری اور بیباک ہیں کہ خود باری تعالیٰ شانہ اور اُس کے سب سے برگزیدہ رسول پر بہتانات باندھتے ہوئے بھی کبھی نہیں ڈرے، عظمتِ خداوندی اور شانِ مصطفویٰ کی ناپ تول کرتے رہنا ان حضرات کا دائمی مشغلہ ہے، قرآنِ کریم کی کتنی ہی آیات کے چودہ سو سالہ متواتر معانی و مطالب سے انحراف کر کے انھیں اپنے پسندیدہ اور خود ساختہ معانی کا لباس پہناتے رہنا، احادیث میں جہاں چاہا متن یا شرح میں ہاتھ کی صفائی دکھانا ورنہ فنِ رجال کی بحث چھیڑ کر شعبہ بازی کا کمال پیش کرنا، ایمان اور کفر، توحید اور شرک کی حدود میں ایسی دھاندلی مچانا کہ عوام الناس کو عجیب پریشانی میں مبتلا کر دینا اور ایک ایسے چکر میں پھنسا دینا جس سے نکلنے کا انھیں بظاہر کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔

تصانیفِ اکابر سے وکتبِ ائمہ سے عبارتیں نقل کرتے وقت من مانی عبارتیں بنالینا، اول یا آخر کا جملہ اڑا دینا، عبارت کے درمیان سے اپنے خلاف الفاظ کو ایسے انداز سے بضم کر جانا گویا یہاں کوئی لفظ تھا ہی نہیں، اپنی طرف سے الفاظ گھڑ کر کسی بزرگ کی عبارت سے ملا کر سب کچھ اُن کے سرخو پھینا، طرہ یہ کہ اپنے ذہن سے کتابیں گھڑ لینا، اُن کے مطابق، صفحہ اور عبارتیں تک اپنے ہی ذہن کی مشین سے ایجاد کر کے علمائے اہلسنت کو چیلنج کرتے رہنا کہ دیکھو جناب! تم ایسا کہتے ہو حالانکہ تمہارے فلاں فلاں بزرگ نے اپنی فلاں فلاں تصنیف کے فلاں فلاں صفحہ پر تمہارے خلاف یوں لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ اُن کتابوں کا دنیا کے پردے پر کہیں نام و نشان نہیں ہوتا، کسی کتاب میں اُن کا ذکر تک نہیں، ذکر کہاں سے ہو جبکہ یہ مصنوعات ہی گھڑنت ساز فیکٹری کی ہیں۔ ان حضرات نے اپنی انتہائی ہنرمندی اور کرشمہ سازی سے روافض کے کان بھی کاٹ رکھے ہیں۔

اُسی طائفہ سے ایک ایسی آواز اُٹھے جو اُس کی پوری تاریخ کے علماء و مورخین کی تصریحات کے خلاف ہو، کیا ایسی آواز انصاف کی رُود سے قابلِ سماعت ہے ؟

”مینٹھی مینٹھی ہب، کڑوی کڑوی تھو“ الی بات دوسری ہے ورنہ اس طرح کس فرد یا جماعت کی تاریخ کو نہیں بدلایا جاسکتا؟ کون سے ولی کو شیطان اور کون سے شیطان کو ولی ثابت کرنے کی جسارت نہیں ہو سکتی؟ لیکن سوال تو یہی ہے کہ ایسا کرنے سے کیا حقیقت بھی بدل جایا کرتی ہے؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد اتنی تکلیف اٹھانے، اپنوں کو مطعون کرنے اور اپنی ہی تاریخ کو بدلنے کا آخر فائدہ کیا؟ افسوس!

۷ متابعِ دین و دانش لُٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافرا کا غمخواروں ریزہ ہے ساقی

۱۶۔ جامع مسجد دہلی والا تاریخی مباحثہ تو پیش نظر ہوگا جو ربیع الثانی ۱۲۴۰ھ میں ہوا تھا۔ کیا غور نہیں کیا کہ ایک طرف ولی اللہی خاندان، تیرہویں صدی کے مجددِ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے خوشہ چین علمائے کرام اور اکثر علمائے دہلی ہیں تو دوسری طرف مذہبِ اہلسنت و جماعت سے بغاوت کرنے والے مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور مولوی عبدالحی صاحب ہیں۔ اول الذکر جو متحدہ ہندوستان میں خارجیت و وہابیت کے بانی قرار پائے تھے، اُن سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ اپنا مسلمان ہونا ثابت کر دیجیے، اگر جناب کا ساختہ مذہب ہی اسلام کی صحیح تصویر ہے تو اپنے خاندانی اکابر مثل شاہ عبدالقادر شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالرحیم کو کس طرح بزرگ بلکہ مسلمان بھی مانا جاسکتا ہے؟ کیونکہ آپ کے نزدیک اُن کا مذہب کفر و شرک بلکہ بت پرستی تک کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ موصوف نے جواب کی گنجائش نہ پا کر راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی خیریت سمجھی تھی۔ مولوی عبدالحی صاحب نے مجبور ہو کر گفتگو تو کی لیکن ہر مسئلے میں معمولی سی قیل و قال کے بعد اہلسنت کا موقف تسلیم کرتے چلے گئے حتیٰ کہ دستخط و مہر سے بھی گریز نہ کیا۔ یہ محض دفع الوقتی تھی ورنہ خارجیت سے ان حضرات نے سرِ مومنار نہیں کیا تھا۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے مسلکِ اہلسنت اور اپنے خاندانی مذہب سے روگردانی کرنے کے باعث اپنے خاندانی علماء یعنی شاہ مخصوص اللہ و شاہ محمد موسیٰ پسران شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہم کو بھی مُنہ دکھانا بند کر دیا، اس طرح

دینی حلقوں کے اس مرکز (خاندان عزیزی) سے موصوف کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ یہ سب کچھ منظور لیکن مذہب اہلسنت اختیار کرنا ساری عمر نا منظور ہی رہا۔ معلوم نہیں سید صاحب کے اس نامہ دار مرید نے جو اندرون خانہ سید صاحب کے رہبر اور اس سارے ڈرامے کو سیٹج کرنے والے تھے، انھوں نے یہ ساری کارگزاری انگریز دشمنی میں ہی کھائی تھی؛

۱۷۔ اگر سید صاحب انگریزوں کے خلاف ہوتے تو انھیں مسلمانوں سے کٹ کر، اپنے اکابر کے مسلک کو چھوڑ کر، مذہب اہلسنت و جماعت سے مُنہ موڑ کر، علیحدہ اپنا محمدی گروہ بنانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ اگر یہ اقدام حکومت کی شہ پر نہیں تھا تو اور کس ضرورت کے تحت تھا؟ اس طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے مرکز سے رشتہ ٹوٹا، مسلمانان اہلسنت و جماعت کا ساتھ چھوٹا، جامع مسجد دہلی کے سب سے پہلے حنفی وہابی مباحثہ و مناظرہ کے ذریعے بھی راہ راست پر نہ آتے، پنجتار میں صد ہا علماء و مشائخ نے انھیں بد مذہب ثابت کر کے مذہب اہلسنت قبول کرنے کی دعوت دی لیکن نا منظور ہوئی، جس کے باعث سرحد و پنجاب کے اکثر مسلمانوں نے جو حُسنِ ظن کے تحت ساتھ ہی گئے تھے، ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ انھوں نے سرحدی مسلمانوں کو کلاب النار اور ملعونین اشرار ٹھہر کر مستحل الدم قرار دے کر ان کے خون سے ہولی کھیلنی شروع کی، ان کے اموال کو غنیمت سمجھ کر مہضم کرنا شروع کیا، ان کے تنگ و ناموس پر ڈاکے ڈالے تو ان غیور مسلمانوں کے ہاتھوں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح ہونا قبول کر لیا لیکن اپنی سیاہ کاریوں اور بد مذہبی سے باز آنا کسی بھی مرحلے پر قبول نہ کیا۔ کیا سید صاحب اینڈ کمپنی کی یہ البیلی ادائیں، بانکی جفا میں، انگریز دشمنی کا کثرہ تھیں؟

۱۸۔ کرم کوشیاں ہیں، مستم کاریاں ہیں

بس اک دل کی خاطر یہ تیاریاں ہیں

۱۸۔ سید احمد صاحب کے مذہبی رہنما یعنی مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے کمال اطاعت شکاری سے انگریزی منصوبے کے مطابق پیارے مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں تحریف کرنے اور شجر اسلام میں توحید کی آڑ لے کر غیر اسلامی عقائد و نظریات

کی قلمیں لگاتے وقت خوفِ خدا اور خطرہٴ روزِ جزا کا قطعاً خیال نہیں رکھتا تھا۔ کیا اُسی برٹش گورنمنٹ کی مخالفت کا خیال تک بھی سید صاحب ایندکنی کے قریب پھٹک سکتا تھا،

۱۹۔ انصاف پسند حضرات سے التجا ہے کہ وہ سید صاحب کے ملفوظات، جنہیں مولوی محمد امین دہلوی اور مولوی عبدالحی دہلوی نے ”صراطِ مستقیم“ کے نام سے کتابی صورت میں مرتب کیا تھا، اُس کی روشنی میں سید صاحب کی تصویر دیکھیں۔ بھلا جب تک مرزا غلام احمد قادیانی نے صریحاً دعویٰ نبوت نہیں کیا تھا بلکہ وہ اپنے متعلق مجدد، مصلح، مہدی اور مسیح موعود وغیرہ ہونے کے دعوے کر رہا تھا اور پے درپے الہامات سنارہا تھا، مرزائے قادیان کے اُس دور اور سید احمد صاحب کے سارے کراماتی و طلسماتی دور میں فرق کیا ہے؟ دعویٰ نبوت کی مہلت ہی نہیں ملی تھی ورنہ وحی و عصمت تک کونسی صفتِ نبوت ہے جو سید صاحب نے اپنی ذات میں نہیں بتائی یا اس متن پر حاشیہ چڑھانے والوں نے اُن کے گلے میں نہ لٹکائی؟ باری تعالیٰ شانہ! شک صعود، دیدارِ الہی، مصافحہ، مکالمہ، لین دین، عہد معاہدے، کلامِ حقیقی وغیرہ تک کے دعاوی سب موجود، چونکہ ان میں سے بعض چیزیں کتنے ہی انبیاء کو بھی حاصل نہیں تھیں لہذا دعویٰ کر دیا کہ سید صاحب سرورِ کون و مکاں صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مشابہت پر پیدا ہوئے ہیں۔ اے انصاف کے شیدائو! اے کلمہ طیبہ کے ہمراہیو! کیا یہ سارے مراحل انگریز دشمنی میں طے کیے جا رہے تھے؟

۷۔ بھلا دیتی میں سب رنج و آلم حیرانیاں میری

ترمی تمکین بے حد کی قسم، ایسا بھی ہوتا ہے

۲۰۔ پروفیسر صاحبانو! خدا کو حاضر و ناظر جان کر ایک صاحب صراطِ مستقیم کتاب پکڑ لیں اور دوسرے صاحبِ تقویۃ الایمان کو سنبھال کر بالقابل ٹیڈ جاتیں۔ مضامین کا موازنہ کر کے دیکھ لیں، جو بات ایک میں جزوِ ایمان دوسری میں وہی بات کفر و شرک کا سامان جو شخص اس کے نزدیک ولی دوسری کے نزدیک شیطان، اسی طرح اگر ایک کتاب دوسری کا رد نہ کر دے تو ہمارا ذمہ۔ کیسے! اس سے زیادہ وضوحِ حق اور اتمامِ حجت

اور کیا ہو سکتی ہے، حقیقت تو واقعی عیاں ہے لیکن اُن نازک مزاج مہربانوں کا کیا علاج، جو حقیقت کو مان لینے سے پہلے ہی نہ ماننے کی قسم کھائے بیٹھے ہوں سوچیے تو سہی یہ کفر و ایمان کو شیرو شکہ کرنے کی کارگزاری کیا انگریزوں سے ٹکرانے کی خاطر سرانجام دی جا رہی تھی؟ کہیں حکومت ہی کی شہ پر اپنا اور مسلمانوں کا دین و ایمان تباہ و برباد کرنے کے لیے تو ایسا نہیں کیا جا رہا تھا؟

۵۔ قادری دین میں کہہ بھاگ خدا لگتی کچھ

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

۲۱۔ اچھا جانے دیجیے ہر قسم کے بیانات کو، جاتے غور ہے کہ انگریز جیسی دُور اندیش، باریک بین اور عیار قوم جس نے اپنے روزِ اوّل سے ہی مسلمانانِ ہند کو خاص طور پر اپنے شکنجے میں کس رکھا تھا اور گرفت کو روز بروز مضبوط سے مضبوط تر کیا جاتا تھا، اگر اُسے سید صاحب اینڈ کمپنی سے ایک فیصد بھی اپنی مخالفت یا اپنے نقصان کا اندیشہ ہوتا تو انگریز اپنی ملکیت میں انھیں کھلے بندوں ہر قسم کی قوت جمع کرنے کی کیا ایک منٹ کے لیے بھی مہلت یا اجازت دینے کے روادار ہو سکتے تھے؟ کیا انگریز اتنے بیوقوف تھے کہ خود اپنی آستین میں بصد شوق سانپ پال لیتے یا سید صاحب کے پاس اتنی قوت کہیں سے اچانک آگئی تھی کہ انگریزوں میں انھیں روکنے ٹوکنے کی طاقت و جرات ہی نہ تھی؟

۲۲۔ زیادہ کھٹا، لمبے چوڑے دلائل پیش کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ خود ان حضرات کے نزدیک، ان کے جملہ مورخوں کے نزدیک، یہ سارا خانوادہ، اس کی تمام ذیلی شاخیں، سب کا وجود تک انگریز کی ہنرمندی کا مرہونِ منت ہے۔ اس لیے سید صاحب ہوں یا اُن کا سارا محمدی گروہ، بعد میں اسی ڈگر پر چلائے جائیو گے جسٹس العلماء قسم کے حضرات ہوں یا مصلح و ریفارمر وغیرہ، یہ سب اور ان کی ساری جماعتیں، سب کے سب برٹش گورنمنٹ کے وفادار، اطاعت شعار بلکہ آلہ کار بن کر رہے اور اس روش پر نازاں تھے، فخر یہ اس کا چرچا کرتے اور گورنمنٹ کی مزید عنایات

کے حقدار بنتے رہتے، مخالفین پر زبانِ طعن و راز کرتے، اُن کی زبان بندی کرواتے اور
 ”سیاں جتنے کو زوال اب ڈر کا ہے کا“ کے مصداق خوب مزے لوٹتے تھے۔ ماسوائے
 اُن حضرات کے جو تحریکِ خلافت کے زمانہ سے گاندھی کو اپنا امام اور پیشوا بنا بیٹھے تھے۔
 باقی حضرات کی ۱۹۴۷ء تک یہی کیفیت رہی۔ اُس وقت اس دوستی کا ظاہر کرنا باعثِ
 عنایات تھا لیکن جب انگریز دوڑ گئے، وہ چشمِ کرم ہی نہ رہی جس سے عنایتوں کی بارش
 ہوا کرتی تھی، بلکہ اب انگریز دوستی کے اظہار میں محض رُسوائی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔
 اسی لیے یارِ لوگوں نے انگریزوں کے دوڑ جانے کے بعد اُلٹی گنگا بہانی شروع
 کر دی کہ صاحبو! کیسی دوستی اور کہاں کی دوستی؟ انگریز سے ہمیں محبت نہیں تھی، ہمارے
 بعض بزرگوں کا جو انگریزوں کی بارگاہ میں آنا جانا اور فیضیاب ہوتے رہنا تھا وہ کوئی
 آلہ کار بننے کے لیے تھوڑا ہی تھا بلکہ صرف تفریحِ طبع کے لیے ایسا کیا جاتا تھا۔ رہا یہ کہ
 ڈیڑھ سو سال سے ہمارے علماء اور مورخین لکھتے آ رہے ہیں کہ ہماری اور ہمارے
 چھوٹے بڑوں کی انگریز دوستی ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے تو اس قسم کی باتوں کا
 وہی لوگ یقین کرتے ہیں جنہیں انگریزوں سے کچھ بھی سیکھنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ جب انگریز
 نہ رہے تو ہماری انگریز دوستی ہی کہاں رہ گئی؟ دریں حالات جب ہم انگریزوں کے دوست
 نہ رہے تو اپنے بزرگوں کے ماتھے پر یہ کلتک کا ٹیکہ کیوں باقی رہنے دیں۔ یقین جانئے
 اگر ہمارے وہ علماء اور مورخین زندہ ہوتے جو انگریز دوستی کے بیانات دیتے آ رہے
 تھے تو ۴ اگست ۱۹۴۷ء کو یعنی پاکستان کی تاریخ کے پہلے ہی روز وہ حضرات بھی کچھ
 کہہ اُٹھتے جو آج ہم کہہ رہے ہیں اور فوراً اپنی اپنی تصانیف کے شروع میں ”اعتذار“
 کی ایک ایک چٹ شامل کر دیتے، جس میں لکھا ہوا ہوتا کہ ”اس کتاب کے فلاں فلاں
 صفحہ پر کتاب کی غلطی سے جو انگریز دوستی لکھا گیا ہے، قارئینِ کرام اُسے انگریز دشمنی
 پڑھیں، ہم اپنی کوتاہی پر معذرت خواہ ہیں، اگلے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جاتے گی
 انشاء اللہ۔ لیکن :۔“

مُجھلانے پہ بھی قصہ ربطِ ماضی
 مُجھلایا نہ جائے گا، ہم سے نہ تم سے

۲۳۔ اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ اپنی ساری تاریخ کو بدلنے کا ٹھیکہ لینے والے جناب غلام رسول مہر کی مندرجہ ذیل شہادت، خود اُن کے اپنے لفظوں میں کافی رہے گی:

”اب یہ سوال سامنے آتا ہے کہ سید صاحب کس کے خلاف جہاد کی دعوت دے رہے تھے؟ آیا وہ صرف سکھوں سے لڑنا چاہتے تھے، جیسا کہ سوا سو سال سے سمجھا اور سمجھایا جا رہا ہے اور وہ بھی محض اس بنا پر کہ پنجاب کی سکھ حکومت مسلمانوں پر بے پناہ ظلم کر رہی تھی، نہ موصوف اپنی سوا سو سالہ تاریخ کو بدلنے کی سعادت حاصل کرنے والے ہیں کیونکہ یہ حقیقت موصوف کے جذبہ عقیدت پر گراں گزرتی تھی۔ ثبوت میں اُس خط کے دو اقتباس پیش کیے ہیں جو سید احمد صاحب نے شاہ بخارا کو بھیجا تھا نیز والی ہرات کے نام لکھے گئے خط کی طرف اشارہ بھی کیا ہے کہ ان میں سید صاحب نے ہندوستان پر انگریزی تسلط کا ذکر بھی کیا ہے۔ ہماری نظر میں یہ موصوف کے کھلے مغالطے ہیں کیونکہ صوبہ سرحد میں سید صاحب ایڈمنسٹری کو بد مذہب اور انگریزوں کا ایجنٹ کہا جاتا تھا۔ وہ اگر دوچار لفظ انگریزوں کے خلاف نہ کہتے تو اور کیا یوں لکھ دیتے کہ ”واقعی مابعدولت برٹش گورنمنٹ کے آلہ کار ہیں۔“ بدنامی کا داغ مٹانے اور مسلمانوں کو ساتھ ملانے کی غرض سے انگریزوں کے خلاف دو لفظ مصلحتاً کہنے کا تکلف نہ کیا گیا تھا ورنہ حقیقت اپنی جگہ عیاں ہے۔

۲۔ مولوی محمد اسماعیل دہلوی

مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) اور سید احمد صاحب ایک ہی گامی کے دو پیسے، ایک جان اور دو قالب یا بمنزلہ روح اور جسم تھے، اسی لیے ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ دریں حالات گزشتہ سطور میں جو کچھ سید صاحب کے بارے میں لکھا گیا ہے اُسے ان دونوں حضرات کے بارے میں سمجھا جائے کیونکہ اگرچہ بظاہر سید صاحب کا مرشد یا امیر المومنین کی پوزیشن میں جماعت کے سرگروہ نظر آتے ہیں، لیکن اندرون خانہ

اس سارے ڈرامے کو ترتیب دے کر پیش کرنے والے اور اس نوازیدہ محمدی گروہ کے قافلہ سالار اور رُوح رواں، یہی مولوی محمد اسماعیل دہلوی تھے۔

موصوف نے جب جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر وعظ کتنا شروع کیا اور اپنے بعض غیر اسلامی اور خلاف مذہب عقائد و نظریات کی تبلیغ شروع کی تو دہلی کے عوام و خواص میں اور خصوصاً شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدین میں غیظ و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ان دنوں یہ کیا ہونے لگا، جس گلشن کی آبیاری یہ خاندان بڑھ چڑھ کر کرتا آیا ہے اُسی خاندان کا ایک عالم اپنے آباء و اجداد کے مذہب کو، عالم اسلام کے مذہب کو، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی آنکھیں بند ہوتے ہی، قربانی کا بکرا بنا کر خارجیت کے بُت کی نذر کر رہا ہے۔ عوام و خواص نے دنگا فساد کی بجائے قانونی راستہ اختیار کیا۔ پندرہ سو مسلمانوں کے دستخطوں کے ساتھ ریڈیڈنٹ کی خدمت میں اس وعظ کے خلاف درخواست پیش کی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ ریڈیڈنٹ کو حکام اعلیٰ نے اُس وقت تک موصوف کے بارے میں کوئی خصوصی ہدایت نہ بھیجی ہو، یہی وجہ ہے کہ لاعلمی میں پندرہ سو مسلمانوں کا پاس لحاظ کرتے ہوئے نیز امن و امان بحال رکھنے کی خاطر موصوف کا وعظ ممنوع قرار دے دیا اور بذریعہ کوئٹال تحریری حکم بھیج دیا گیا۔

موصوف نے اعلیٰ حکام کو اس پابندی سے مطلع کیا ہوگا، اعلیٰ حکام نے ریڈیڈنٹ کو صورت حال بتائی ہوگی اور خصوصی ہدایات سے نوازا ہوگا، جس کی اطلاع موصوف کو مل گئی ہوگی، لہذا انھوں نے اپنے معاونین یعنی برادرانِ دینی و یقینی کو ساتھ لے کر ریڈیڈنٹ سے ملاقات کی۔ ملاقات کے تیور ملاحظہ ہوں :

”آپ نے خارجی طور پر دریافت کر کے کہ فلاں وقت ملنے ملائے اور فرصت کا ہوتا ہے، سیدھے کوٹھی پر پہنچے، ساتھ میں صرف مولوی عبدالصمد بنگالی اور مولوی عبدالرحیم محدث تھے اور ایک آپ کا مٹنی ہیرالال تھا اور ایک خدمتگارت تھا پہلے آپ نے جا کر اطلاع کراتی، جوں ہی ریڈیڈنٹ نے سنا کہ شاہ اسماعیل آتے ہیں فوراً باہر نکل آیا اور باہر برانڈے سے آکر لے گیا۔ حد سے زیادہ عزت کی اور بار بار یہ کہا کہ آپ نے بڑا ہی سرفراز کیا (یہ عقیدت!) معمولی مزاج سپی

کے بعد ریڈیٹنٹ نے خود یہ الفاظ کہے، مولوی صاحب، ہمارے سرشتہ دار (علامہ فضل حق خیر آبادی) کی غلطی سے آپ کے وعظ بند کرنے کا میں نے حکم جاری کر دیا تھا، لیکن جب آپ نے واجبی اور معقول وجہیں لکھیں تو میں نے اُسی وقت حکم ثانی لکھوا دیا تھا کہ وعظ قدیمی طور پر جاری کیا جائے اور کوئی مزاحم نہ ہو۔

جائے غور ہے، جہاں عوام کا احتجاج بے کار ہو کر نہ جاتے، سرشتہ دار کی رپورٹ بیکار ثابت ہو جاتے جس ریڈیٹنٹ نے حکماً وعظ بند کیا تھا وہ اُنٹا مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی تعظیم و تکریم پر مجبور ہو جاتے اور فوراً وعظ جاری کرنے کا حکم نافذ کرے کیا مسلمانوں نے صورتِ حال کو سمجھ نہ لیا ہوگا؟ کیا کمپنی کی اس سازش کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ گئے ہوں گے؟ لیکن جہاں مغل بادشاہ (اکبر شاہ) بھی بے دست و پا ہو کر ٹیڑھ رہا ہو وہاں عوام الناس کیا کر سکتے تھے؟ پیارے صرف خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے اور یا مجبوری دین کی بیخ کنی کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بصدِ حسرت یاس جو ریمارک دیا وہ پورے حالات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے :

”جب یہ لوگ (مسلمانانِ دہلی) مولوی منطقی صاحب (علامہ فضل حق خیر آبادی) کے پاس پہنچے اور ساری کیفیتِ عرض کی تو وہ آبدیدہ ہو کر کہنے لگے کہ ”اسماعیل دین محمدی کی بیخ کنی کیسے بغیر نہیں رہنے کا۔“ یہ مولوی منطقی صاحب کا پہلا جملہ تھا جو انھوں نے پیارے شہید کی نسبت استعمال کیا۔“ ۱

موصوف کے بارے میں اس سلسلے کی ضروری معلومات کا تذکرہ ہم گزشتہ ابواب میں تفصیل سے پیش کر چکے ہیں، اُعادے کی ضرورت نہیں۔ اب ان کے بیانات اپنی تحریکِ جہاد کے متعلق ملاحظہ ہوں :

”یہ بھی صحیح روایت ہے کہ اُنہی نے قیامِ کلکتہ میں جب ایک روز مولانا محمد اسماعیل صاحب

وعظ فرما رہے تھے، ایک شخص نے مولانا سے یہ فتویٰ پوچھا کہ سرکار انگریزی پر جہاد کرنا درست ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ ایسی بے روبریا اور غیر متعصب سرکار پر کسی طرح بھی جہاد کرنا درست نہیں ہے۔
مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کو اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے:

”مکلتہ میں جب مولانا اسماعیل صاحب نے جہاد کا وعظ فرمانا شروع کیا ہے اور سکھوں کے مظالم کی کیفیت پیش کی ہے تو ایک شخص نے دریافت کیا، آپ انگریزوں پر جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا، اُن پر جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو اُن کی رعیت ہیں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان کے ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے، ہمیں اُن کی حکومت میں ہر طرح آزادی ہے، بلکہ اگر اُن پر کوئی (مسلم یا غیر مسلم) حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اُس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آئینہ آنے دیں۔“

نیچری فرقے کے بانی جناب سر سید احمد خاں نے اپنے لفظوں میں یہ قصہ یوں سپرد قلم کیا تھا:

”ایک مرتبہ وہ (مولوی محمد اسماعیل دہلوی) مکلتہ میں سکھوں پر جہاد کا وعظ فرما رہے تھے۔ اثنائے وعظ میں کسی شخص نے اُن سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کرتے؟ وہ بھی تو کافر ہیں۔ اس کے جواب میں مولوی محمد اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رُو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔“

۱۔ محمد جعفر تھانیسری، سوانح احمدی، ص ۳۷

۲۔ حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۶۴

۳۔ سر سید احمد خاں: ہنٹ پر ہنٹ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۲۹

اپنے اکابر کی انگریز دوستی کا داغ مٹانے سے اپنے کو مجبور دیکھ کر اپنے امام مذہب مولوی محمد اسماعیل بریلوی کے عاشق زار یعنی مولوی محمد منظور نعمانی سنبھلی کو ان الفاظ میں اعتراف کیے بغیر کوئی راستہ نظر نہ آیا:

”مشہور یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں سے مخالفت کا کوئی اعلان نہیں کیا، بلکہ کلکتہ یا پٹنہ میں اُن کے ساتھ تعاون کا اظہار کیا اور یہ بھی مشہور ہے کہ انگریزوں نے بعض بعض موقعوں پر آپ کی امداد بھی کی ہے“ لے

مولوی محمد اسماعیل پانی پتی نے اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ فیصلہ کن بیان دیا ہے:

”سرستید نے اس مضمون میں یہ بات بار بار لکھی ہے کہ حضرت سید احمد رائے بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید، انگریزی حکومت کے ہرگز ہرگز مخالف نہ تھے اور نہ ہی انھوں نے کبھی ان کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ سرستید کے اس بیان کی تائید بعد کے متعدد مؤرخوں نے بھی کی ہے، چنانچہ ذاب صدیقی حسن نے ترجمانِ وہابیہ مطبوعہ امرتسر کے صفحہ ۲۱، ۸۸ پر، نیز سوانح احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری میں بیس مقامات پر، اسی طرح حضرت شاہ اسماعیل کی سوانح موسوم حیات طیبہ کے صفحہ ۱۸۹، ۲۹۲، ۲۹۴ پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے۔ مگر حال میں بعض اصحاب نے ان حقائق کے برخلاف یہ لکھنا شروع کر دیا ہے کہ حضرت سید احمد رائے بریلوی اور حضرت شاہ اسماعیل کا اصل مقصد انگریزوں کے خلاف جہاد تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ایسے حضرات کا یہ بیان واقعات کے مطابق نہیں اور نہ اس دعوے کا کوئی واضح ثبوت موجود ہے“ لے

۳۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی

آپ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے اور جانشین تھے۔ چونکہ مولوی محمد اسماعیل جو حضرت کے جتنیچہ اور مولوی عبدالحی بڈھانوی (المتوفی ۱۲۴۳ھ/ ۱۸۲۸ء) جو شاہ صاحب کے داماد تھے یہ خاندان عزیزی کے مسلک سے بغاوت کر چکے تھے اس لیے آپ نے اپنے وصال سے قبل ہی ۱۲۳۹ھ/ ۱۸۲۴ء میں شاہ محمد اسحاق دہلوی کو اپنا خلیفہ نامزد کر دیا تھا۔ یہ کیوں بدلے؟ پس منظر ملاحظہ ہو۔

حالات کے بدلتے ہوئے دیر نہیں لگتی سید احمد صاحب کے نامور خلیفہ اور اُن کی تحریک جہاد کے سرگرم کارکن مولوی محبوب علی صاحب کسی زمانے میں مسلمانانِ سرحد کے بارے میں یہ فتویٰ صادر فرما رہے تھے:

”سکھوں سے زیادہ ان کلمہ گو کافروں پر جہاد فرض ہے۔“

جب انھوں نے دیکھا کہ ہمارے مجاہدین سکھوں کا نام لے کر مسلمانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں۔ اُن کی جانوں اور اموال کو اپنے لیے حلال ٹھہرایا ہوا ہے اور اُن کے ننگ و ناموس سے کھیل رہے ہیں۔ تو ان کا ضمیر کچھ بیدار ہوا یا اسلامی غیرت نے کچھ رنگ دکھایا یا کلمہ گوئی کا کچھ پاس لحاظ سامنے آیا، کہ بر ملا اپنے ساتھیوں سے کہنے لگے:

”تمھارے اُوپر زوجہ، بچوں اور والدین کے حقوق ہیں، تم اُن سب حقداروں کے حقوق تلف کر کے یہاں بیٹھے ہو۔ جب لوگوں نے کہا جہاد کے واسطے بیٹھے ہیں، تو مولوی صاحب نے کہا کہ جہاد کہاں ہے اور کس دین تم نے کون سے کافر کو قتل کیا ہے اور کون سے ملک میں تمھارا عمل دخل ہے؟ صبح سے شام تک کھانے پکانے کی فکر میں رہتے ہو، جہاد کا نام لینا ایک دیوانہ پن ہے۔ بعض لوگ اس جیلے سے یہاں عیش کرتے ہیں اور تمھاری دنیا و آخرت دونوں خراب ہیں۔“

لے حیرت دہلوی مرزا: حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۲، ۱۹، ۶، ص ۲۲۳

لے محمد جعفر تھانیسری، منشی: حیاتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۳۵

مولوی محبوب علی نے جب ساتھیوں کو یوں لاجواب کیا حتیٰ کہ سید صاحب پر بھی اعتراضات کیے اور وطن واپس لوٹ آئے تو اس تحریک کو بہت نقصان پہنچا، کیونکہ چندے کی فراہمی اور دہلی وغیرہ مراکز سے چندہ پہنچانے میں آپ نمایاں سرگرمی دکھا رہے تھے۔ مولوی محمد اسحاق دہلوی اس رقع پر ظاہر ہو گئے کہ اس تحریک سے موصوف بھی کسی قدر وابستہ ہو چکے ہیں۔ مولوی محمد جعفر تھانی سیری نے اس امر کی یوں تصریح کی ہے:

مولوی محبوب علی کے اغوا سے جو کاروبار جہاد کو صدمہ پہنچا، ویسا صدمہ اُس لشکر کو آج تک کسی سکھ یا درانی کے ہاتھ سے نہ پہنچا تھا۔ مولوی محبوب علی کے فتنہ کے بعد مدت تک ہندوستان سے قافلوں کا آنا بند ہو گیا، اکثر معاونین جہاد سُست ہو گئے۔ جب بہت سے خطوط مولوی محبوب علی کی تکذیب میں لشکر مجاہدین سے ہندوستان میں آئے تب دنوں کے بعد مولوی محمد اسحاق صاحب اور مولوی محمد یعقوب صاحب معاونین جہاد کی سعی سے یہ فتنہ محبوبی رفع ہو کر خرچ اور قافلوں کی روانگی دوبارہ شروع ہوئی۔ ۱

موصوف اس دوران میں چونکہ تقویۃ الایمانی خیالات کے زیر اثر آچکے تھے اور دوسری جانب تیسویں صدی کے مجدد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی جانشینی کا شرف بھی حاصل تھا، ان حالات میں فریقین کو خوش رکھنے کے لیے گول مول فتوے دیا کرتے تھے۔ جو بائیں تقویۃ الایمان میں کفر و شرک بتائی گئی ہیں، اُن میں سے بعض کو ناجائز، بعض کو مکروہ وغیرہ دیا کرتے تھے۔ لیکن موصوف اپنی اس روش سے کسی فریق کو بھی خوش نہ کر سکے۔ جتد عین نے قرآن کی اس روش کو بھی غنیمت سمجھا لیکن اہلسنت کے زمرے میں جب موصوف کی ساکھ زیادہ کرنے لگی، اکثر اہل علم اُن کی اس روش سے آگاہ ہونے لگے تو آپ نے اپنی پوزیشن کو مزید غالب ہونے سے بچانے کی غرض سے ہجرت کو مناسب سمجھا، چنانچہ موصوف معرکۃ بالا کوٹ کے ان سال بعد یعنی ۱۲۵۷ھ/۱۸۴۱ء میں مقدس سرزمین حجاز کو ہجرت کر گئے اور باقی وقت وہیں

گزارا۔ چونکہ اس اہلسنت سے علیحدہ ہونے والوں کے گروہ کی قیادت آپ کے سپرد تھی لہذا جاتے وقت مختلف حضرات پر مشتمل ایک بورڈ کی تشکیل کر گئے، جو اس نوزائیدہ محمدی گروہ کا سرپرست بنایا گیا۔

۴۔ مولوی محبوب علی

یہ سید احمد صاحب کے مرید و خلیفہ اور ان کی تحریک جہاد کے سرگرم کارکن تھے۔ آخر میں اپنے پر کے جہاد کو فراڈ یا فساد سمجھ کر اُس سے کنارہ کش ہو گئے تھے، جیسا کہ پیچھے مذکور ہوا۔ انگریزوں کے سلسلے میں اپنے مرشد اور اپنی جماعت کی طرح ثابت قدم رہے۔ موصوف کے بارے میں سرسید احمد خاں نے یوں لکھا ہے:

”شاید اس مضمون کے پڑھنے والے اس عجیب بات کے سننے سے بھی خوش ہوں کہ مولوی محبوب علی صاحب وہی شخص تھے جن کو ۱۸۵۷ء میں باغیوں کے غرنہ بخت خاں نے عین ہنگامہ غدر میں طلب کیا اور ان سے یہ درخواست کی کہ آپ اس زمانے میں انگریزوں پر جہاد کرنے کی نسبت ایک فتویٰ پر اپنے دستخط کریں۔ مگر مولوی محبوب علی نے صاف انکار کیا اور بخت خاں سے کہا کہ ہم مسلمان گورنمنٹ انگریزی کی رعایا ہیں، ہم اپنے مذہب کی رو سے اپنے حاکموں سے مقابلہ نہیں کر سکتے اور طرہ بریں یہ ہوا کہ جو ایذا بخت خاں اور اُس کے رفیقوں نے انگریزوں کی میموں اور بچوں کو دی تھی اُس کی بابت بخت خاں کو سخت لعنت ملامت کی۔“

۵۔ مولوی کرامت علی جون پوری

تذکرہ علمائے ہند کے مرتب پر فیسر محمد ایوب قادری نے موصوف کے بارے میں یوں

نفریح کی ہے :

”جون پور میں پیدا ہوئے۔ شیخ احمد علی چریا کوٹی، مولانا احمد اللہ انامی اور مولانا قدرت اللہ رودولوی سے تحصیل علم کی۔ علم قرأت و تجوید سید ابراہیم مدنی سے حاصل کیا۔ سید احمد شہید کے مرید ہوئے۔ بنگال میں اسلام کی اشاعت کی۔ مولوی شریعت اللہ کی تحریک کا شدت سے رد کیا۔ انگریزی حکومت کی موافقت میں جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔“ ۱

انگریز مورخ مسٹر ولیم ہنٹر نے ان کی انگریز نوازی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے :

”یہ بڑا ہی مبارک واقعہ ہے کہ جس ضلع (جون پور) سے ہندوستان کے سب سے بڑے مسلمان بادشاہ (اکبر) کے خلاف بغاوت کا فتویٰ شائع ہوا تھا، اُسی نے ایک ایسا عالم بھی پیدا کر دیا جس کا فتویٰ انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو سختی سے منع کرتا ہے۔“ ۲

مولوی کرامت علی جون پوری (المتوفی ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء) کی انگریز دوستی کے بارے میں مولوی مسعود عالم ندوی یوں تصریح کرتے ہیں :

”مجاہدین اور اتباع سید احمد شہید کے سب سے بڑے واقف کار، مسٹر جمیل وکلی نے شہادت دی ہے کہ مولوی کرامت علی صاحب برطانوی حکومت کے مؤید اور وہابیوں کے پختے مخالف تھے۔ یہ تصدیق نامہ راج محل (بہار) میں ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو دیا گیا، جسے خود اُن کے پوتوں نے فخریہ ۱۹۱۴ء میں درج کرایا تھا۔ (وہ خوب صورت اور نظر زیب پمفلٹ راقم کی نظر سے گزر چکا ہے) اس میں اُن کے صاحبزادے، مشہور ادیب، مولوی عبدالاقول صاحب جون پوری اور حافظ احمد صاحب کی وفاداری کی بھی تصدیق ہے۔ اس کے علاوہ راقم

بھی یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ عقائد و اعمال میں وہ سید صاحب کے اصحابِ خاص کی روش سے بالکل الگ تھے؛ لے

۶۔ مولوی ملوک العلی نانوتوی اینڈ کمپنی

مولوی ملوک العلی نانوتوی (المتوفی ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۱ء) ہی کو مولوی محمد اسحاق دہلوی (المتوفی ۱۲۶۸ھ / ۱۸۴۵ء) نے سرزمینِ حجاز کی طرف ہجرت کرتے وقت تشکیل کردہ بورڈ کا سرپرست بنایا تھا۔ موصوف نے انتہائی خاموشی سے انگریزی مقاصد و مفادات کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے دہلی کالج سے اینگلو انڈین علماء کی ایک ایسی کھیپ پیدا کی، کہ اُن کے ذریعے مسلمانوں کا تعلیمی نظام کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا اور دوسری طرف ان تیار کردہ علماء نے انگریز کی موافقت میں فضا کو ہموار کرنے کا کام بڑی رازداری سے جاری رکھا۔ مولوی ملوک العلی کے بارے میں انگریزوں کی رائے کیا تھی، ملاحظہ فرمائیے؛

”دہلی کالج کے تمام انگریز پرنسپلوں کے وہ معتقد تھے۔ کالج کی رپورٹوں سے واضح ہوتا ہے کہ انگریز پرنسپل مولانا ملوک العلی پر بہت اعتماد کرتے تھے اور ہر سالانہ رپورٹ میں اُن کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔ ایک موقع پر گورنر جنرل بہادر نے مولانا ملوک العلی کو انعام سے بھی نوازا۔ صورت یہ ہوئی کہ ۱۵ مارچ ۱۸۴۵ء کو گورنر جنرل بہادر نے دہلی میں دربار کیا۔ ۱۷ نومبر کے دربار میں ۲۷ حضرات کو انعام و اکرام سے نوازا۔ مولانا ملوک العلی مدرس اَدُل کو خلعت سہ پارچہ مرحمت ہوا۔“ لے

مولوی ملوک العلی کے شاگردوں میں وہ حضرات بھی شامل ہیں جو مدرسہ دیوبند کے بانیوں اور چلانویوں میں تھے، جیسے مولوی محمود الحسن دیوبندی کے والد مولوی ذوالفقار علی صاحب اور مولوی شبیر احمد

لے مسعود عالم ندوی، مولوی: ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۴۷

لے محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول، ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۶

عقباتی کے والد فضل الرحمن دیوبندی وغیرہ اس کھیپ کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں وضاحت کی ہے:

”مولانا ملوک العلی کے صدر مدرس ہونے کی وجہ سے وہی کالج کی تعلیمی سرگرمیاں یقیناً آگے بڑھیں اور مسلمانوں کی ایک ایسی کھیپ تیار ہوئی جس نے نئے نظام تعلیم میں منسلک ہو کر خاطر خواہ خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد مظہر (مدرس آگرہ کالج)، مولانا محمد منیر (مدرس بریلی کالج)، مولانا محمد احسن (مدرس بنارس و بریلی کالج)، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (مدرس بریلی کالج و ڈپٹی انسپکٹر مدارس)، مولانا فضل الرحمن دیوبندی (ڈپٹی انسپکٹر مدارس) تو خاص ان (مولوی ملوک العلی) کے اسعۃ و آثار ہیں۔

ان کے علاوہ شمس العلماء ڈپٹی شیخ ضیاء الدین ایل۔ ایل۔ ڈی شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد (ف ۱۹۱۲ء)، شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد (ف ۱۹۱۰ء)، پیر زادہ محمد حسین (سیشن جج)، خواجہ محمد شفیع (جج)، خان بہادر میر ناصر علی (ف ۱۳۵۲ھ / ۱۹۳۳ء)، مولوی کریم الدین پانی پتی (ف ۱۸۷۹ء)، مولوی جعفر علی (ف ۱۳۱۲ھ) وغیرہ بہت سے ایسے حضرات ہیں جو اسی دہلی کالج کے فیض یافتہ اور تربیت یافتہ ہیں اور کم و بیش ان تمام حضرات نے نئے تعلیمی نظام میں منسلک ہو کر نمایاں خدمات انجام دیں اور گورنمنٹ نے بھی ان کی خدمات کو سراہا اور حُسنِ صلہ سے نوازا۔“

۷۔ مولوی سمیع اللہ دہلوی

مولوی سمیع اللہ دہلوی کے بارے میں مولوی عبدالحق قدوسی نے یوں تصریح کی ہے:

”آپ (مولوی ملوک العلی نانوتوی) کے تلامذہ میں سے مولوی سمیع اللہ دہلوی

بڑی شہرت کے مالک اور گورنمنٹ کے معتمد علیہ آدمی تھے۔ اے

مولوی ملک العلی صاحب کے دوسرے شاگرد مولوی ذکاء اللہ دہلوی نے موصوف کی سوانح عمری لکھی اور ۱۹۰۹ء میں مطبع انوار الاسلام حیدر آباد دکن سے شائع کروائی۔ اُس کا ایک اقتباس پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کر کے نہ صرف موصوف کی انگریز دوستی کا، بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلہ کار ہونے کا راز یوں فاش کیا ہے:

۱۶ دسمبر ۱۸۸۴ء کو مولوی سمیع اللہ مصر میں انگریزوں کے ساتھ استعمار کو مضبوط کرنے کی غرض سے پولیٹیکل مشن پر مصر گئے اور وہاں اُنھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک (جو برطانوی استعمار کے خلاف تھی) کو نقصان پہنچایا۔ ان خدمات کے صلہ میں اُن کو سی۔ ایم۔ جی کا خطاب ملا۔ اے

۸۔ مولوی ڈپٹی نذیر احمد دہلوی

موصوف بھی دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملک العلی نانوتوی کے شاگرد تھے۔ برٹش گورنمنٹ نے ان کے کارناموں کے پیش نظر شمس العلماء کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ برٹش گورنمنٹ کے منصوبوں کو پائیدگی تک پہنچانے کی غرض سے ساری عمر قلم سے کام لیتے رہے اور مزے سے ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز رہے۔ انگریزی عنایات سے خوب فیضیاب ہوتے۔ قرآن کریم کا ترجمہ بھی کیا، مقصد یہی تھا کہ کلام الہی کی تعلیمات کو اپنے مخصوص نظریات کے مطابق ثابت کر کے دکھائیں، جیسا کہ سر سید احمد خاں، مرزا حیرت دہلوی اور کئی دوسرے حضرات نے بھی اُس دور میں کیا۔ متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ اور انگریزوں کا حکمران ہو کر ہندوستان کے باشندوں کو جبراً غلام بنالینا موصوف کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی مہربانی تھی اور اس انعام خداوندی کا شکریہ ان لفظوں میں ادا کرتے ہیں:

اے ہفت روزہ "الاعتماد" لاہور، ۱۲ اکتوبر، ۱۹۷۰ء، ص ۶

اے محمد ایوب قادری پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، ص ۱۸۴

”خدا کی بے انتہا مہربانی اس کی مقتضی ہوئی کہ انگریز بادشاہ ہوئے“ لے
 ”ہم نے خدا کے فضل سے انگریزی عملداری میں آنکھ کھولی ہے، خدا اس کو
 ابد الابد تک سلامت رکھے“ لے

موصوف کو مسلمانوں کے حکمران رہنے سے بھی وہ آرام نہیں پہنچ سکتا تھا جتنا انگریزوں نے
 پہنچایا۔ ڈپٹی صاحب کا یہ بیان اُن کے سوانح نگار نے ان لفظوں میں نقل کیا ہے:
 ”شکر ہے کہ ہم رعایا بھی بنے تو ایسوں کی کہ جن کی عملداری میں ہم کو اپنی (مسلمانوں
 کی) سلطنت سے زیادہ آرام و آسائش ہے“ لے

۹۔ مولوی محمد احسن نانوتوی

مولوی محمد احسن نانوتوی (المتوفی ۱۳۱۲ھ / ۱۸۹۴ء)، مولوی محمد مظہر نانوتوی اور مولوی
 محمد میر نانوتوی کے حقیقی بھائی تھے۔ یہ جملہ حضرات دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور مولوی ملک العلی
 کے شاگرد اور قریبی عزیز تھے۔ ۱۸۵۷ء میں موصوف بریلی کالج میں مدرس تھے۔ جنگ آزادی
 کے وقت یوں اپنا رنگ دکھایا:

”۲۲ مئی ۱۸۵۷ء کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد
 فوجہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے
 بغاوت کرنا خلافِ قانون ہے۔ نواب بہادر خاں کمشنر بریلی مسٹر ایگزیکٹو کے
 بظاہر مددگار تھے اور نواب صاحب پر کمشنر بریلی کو پورا اعتماد تھا۔ اس سلسلہ
 میں ایک انگریز مورخ رقمطراز ہے ”پچھلی صدی کے..... محافظ (حافظ
 رحمت خاں) کے پوتے خان بہادر نے کمشنر (بریلی) کی کوششوں کی پوری پوری
 تائید کی اور کالج (بریلی کالج) سے منسلک ایک مولوی (محمد احسن نانوتوی) نے

لے افتخار عالم بلگرامی: حیاتِ نذیر، مطبوعہ شمسی پریس دہلی، ص ۱۳۷

لے ایضاً، ص ۱۳۷

لے ایضاً، ص ۱۳۷

مسجد میں تقریر کی اور اُس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلافِ شرع ہے۔
 موصوف نے انگریزوں کا حق نمک ادا کرتے ہوئے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو خلافِ شرع
 بتایا تھا، اُن کی یہ تقریر گویا مسلمانانِ بریلی کی ایمانی غیرت اور جذبِ حریت کے لیے ایک چیلنج تھی۔
 جب سارے شہر میں ان کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور جان کا خطرہ محسوس ہوا، تو
 موصوف نے بریلی کو چھوڑنا گوارا کر لیا لیکن انگریز دوستی کو اپنے اکابر کی طرح چھوڑنا منظور نہ ہوا۔
 قارئینِ کرام درج ذیل اقتباس پر غور فرمائیں :

”اس تقریر نے بریلی میں ایک آگ لگا دی اور تمام مسلمان مولانا محمد احسن نانوتوی
 کے خلاف ہو گئے۔ اگر کو تو الٰہ شہر شیخ بدر الدین کی فمائش پر مولانا بریلی نہ
 چھوڑتے تو اُن کی جان کو بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔“

۱۰۔ مولوی عبدالاحد

موصوف کون تھے؟ اس کا جواب پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے
 ”مولانا محمد احسن (نانوتوی) کے دو بیویاں تھیں۔۔۔۔۔ دوسری بیوی بنارس
 والی تھیں، ان کو والدہ عبدالاحد کہتے تھے۔۔۔۔۔ مولانا محمد احسن اپنی
 سوتیلی اولاد مولوی عبدالاحد اور زینب بی کی ضروریات کا بہت خیال رکھا کرتے
 تھے۔“

اب موصوف کے لفظوں میں ہی مولوی عبدالاحد کا تفصیلی تعارف کروایا جاتا ہے:
 ”مولوی صاحب مرحوم، مولانا محمد احسن نانوتوی کے ربیب تھے اور وہ ۱۸۵۰ء
 میں بنارس میں پیدا ہوئے۔ مولوی عبدالاحد کی تمام تر تعلیم و تربیت مولانا محمد احسن

۱۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۶ء، ص: ۵۰

۲۔ ایضاً: ص ۵۱

۳۔ ایضاً: ۱۱۸، ۱۱۹

نے کی..... مولوی عبدالاحد چودہ سال کی عمر میں حفظِ قرآنِ کریم سے فارغ ہوئے۔
 مولانا محمد احسن سے درسِ نظامی کی تکمیل کی اور ۱۸۶۹ء میں بریلی کالج سے انٹرنس
 پاس کیا۔ ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ اسکول بدایوں میں تھریڈ ماسٹر مقرر ہو گئے۔۔۔۔
 ۱۸۷۵ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے وکالت کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا،
 اسی سال انبارہ میں ”رسالہ نمبر ۱۵ بنگال“ کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۸۸۴ء
 میں ملازمت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور میرٹھ میں وکالت کرنے لگے۔

۱۸۸۶ء میں مولوی عبدالاحد نے منشی ممتاز علی بن شیخ امجد علی سے مطبع
 مجتبائی دہلی پانچ سو روپے میں خرید لیا کیونکہ منشی ممتاز علی حجاز مقدس کو ہجرت کر گئے
 مولوی عبدالاحد مرحوم نے مطبع مجتبائی کو بہت ترقی دی اور دراصل یہی مطبع
 ان کی شہرت و نیک نامی اور دولت و امارت کا سبب بنا۔ پہلے یہ ایک معمولی سا
 مطبع تھا، مولوی صاحب مرحوم نے اس کو بہت ترقی دی اور جلد ہی
 یہ مطبع بڑے صغیر پاک و ہند کے مشہور مطابع میں شمار ہونے لگا اور ایسا شہرت پذیر
 ہوا کہ آج تک اس کی ساکھ قائم ہے۔“

موصوف نے مولوی بشیر الدین احمد (المتوفی ۱۹۲۷ء) کی تصنیف ”واقعات دارالحکومت
 بلبلہ دوم، مطبوعہ شمسی پریس آگرہ ۱۹۱۹ء کے صفحہ ۱۹۱ سے مولوی عبدالاحد کے بارے
 میں ایک اقتباس یوں نقل کیا ہے:

”دلی کے نہایت سربراہ آوردہ اشخاص میں آپ کا شمار ہے۔ قومی کاموں میں بہت
 دل چسپی لیتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے ٹرسٹی ہیں۔ آئینری مجسٹریٹ ہیں۔ اسی سال
 (۱۸۹۱ء) میں آپ کو خان بہادر کا خطاب ملا ہے۔ دہلی میں ایسا کوئی قومی جلسہ یا اہم
 کام نہ ہوگا جس میں آپ سب سے آگے نہ ہوں۔ دل کھول کر قومی کاموں میں
 جان و مال سے شرکت کرتے ہیں۔ جامع مسجد، مسجد فقیر، عرب اسکول،

یتیم خانوں وغیرہ کے ممبر ہیں۔^۱

موصوف کی اسی دریا دلی کے بارے میں یوسف بخاری کی کتاب ”یہ دتی ہے“ کے صفحہ ۱۱۳ء جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلماء سید احمد صاحب کا ایک بیان پروفیسر محمد ایوب قادری نے نقل کیا ہے جو موصوف نے ۳ ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ / ۹ ستمبر ۱۹۴۷ء کو دیا تھا۔ اُس بیان کا آخری حصہ ہر ذیہ قارئین ہے :

”قوم کے کاموں اور تعلیمی اداروں میں اُنھوں نے بڑی فراخ دلی سے چندے دیے۔ علی گڑھ کالج، عربک دہلی کالج اور انجمن مؤید الاسلام کے بے حد دلدادہ تھے اور ہمیشہ ان کی مالی امداد کرتے رہے۔ حکیم اجل خاں کے طبیب کالج میں تئذ اندراجات ان سے انجام پاتیں۔ حکیم صاحب اُن کا عمر بھرا اعتراف کرتے رہے۔“^۲

ان جملہ مشاغل کے ساتھ موصوف کا برٹش گورنمنٹ کے ساتھ کیا رویہ تھا؟ انگریزی حکومت اور عام مسلمانوں نے آپ کو کس نظر سے دیکھا؟ ان تینوں سوالوں کا جواب مندرجہ ذیل عبارت میں تلاش کیجیے :

”پہلی جنگ عظیم ۱۵-۱۹۱۴ء میں مولوی عبدالاحد نے حکومتِ برطانیہ کی بے مثال خدمت انجام دی۔ اُنھوں نے دارفند میں دل کھول کر چندہ دیا اور تقریباً تین لاکھ روپیہ قرضہ جنگ میں دیا۔ اُنھوں نے سٹی ریکروٹنگ کمیٹی اور پیپسٹی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان خدمات کے صلہ میں گورنمنٹ برطانیہ نے مولوی عبدالاحد مرحوم کو خلعت، سند اور خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔“

۲۔ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مولوی عبدالاحد کا انتقال ہوا۔ اُس زمانے میں

خلافت کی تحریک زوروں پر تھی۔ حکام رس اور خطاب یافتہ حضرات کو لوگ اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے، لہذا بعض لوگوں نے مولوی عبدالاحد مرحوم کی تدفین میں سخت رکاوٹیں ڈالیں۔ لہ

۱۱۔ میاں نذیر حسین دہلوی

میاں نذیر حسین دہلوی (المتوفی ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء) موضع بلتھوا مضافات سورج گرڈھ ضلع مونگیر (بہار) میں بقول مصنف الحیاء بعد المماتہ "۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ موضع بلتھوا سیدوں کی بستی تھی لیکن جس طرح مولوی محمد اسماعیل دہلوی متحدہ ہندوستان کے شہر آفاق علمی و روحانی خاندان یعنی خاندان عزیزی کو لے ڈوبے اور ایک بھی قابل ذکر فرد کا نشان باقی نہ رہا۔ اسی طرح میاں صاحب کی بستی میں سیدوں کا ایک بھی گھر باقی نہ رہا بلکہ صوف کے سوانح نگار کی تصریح کے مطابق وہاں صرف جولاہے آباد ہیں۔ موصوف کا ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا۔ شاہ اسماعیل دہلوی سے حدیث کی سند حاصل کی، جس کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری یوں رقمطراز ہیں:

"مولوی نذیر حسین ولد جو ادلی سورج گرڈھ ضلع مونگیر (بہار) میں ۱۲۲۰ھ / ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۶ سال کے بعد علم کی طرف میلان ہوا۔ ۱۲۳۷ھ / ۱۸۲۱ء میں وطن سے پوشیدہ طور پر صادق پور پہنچے وہاں کچھ درسی کتابیں پڑھیں۔ ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۹ء میں دہلی میں پہنچے۔ پنجابی کٹرے کی مسجد اورنگ آبادی میں ٹھہرے۔ مولوی عبدالخالق دہلوی، اخوند شیر محمد قندھاری، مولوی جلال الدین ہروی، مولوی کرامت علی بنی اسرائیلی، مولوی محمد بخش، مولوی عبدالقادر رامپوری (المتوفی ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء) تلمیذ مفتی شرف الدین رامپوری سے جملہ علوم حاصل کیے۔ حدیث کی اجازت شاہ محمد اسحاق

دہلوی (ف ۱۲۶۲ھ/۴۶-۱۸۴۵ء) سے حاصل کی۔ نواب مولوی حبیب الرحمن

خاں شروانی، عبدالرحمن محدث پانی پتی کا بیان لکھتے ہیں کہ:۔ جس روز

شاہ محمد اسحاق صاحب ہجرت کر کے حجاز روانہ ہوئے تو اس روز نذیر حسین

اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند کتابوں کی اولیت کی ایک ایک حدیث

پڑھی اور کُل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحب نے ایک چھوٹے

کاغذ پر یہی واقعہ لکھ دیا۔ اس سے پہلے مدرسہ میں کبھی پڑھنے کو نہیں آتے تھے

سند حاصل کرنے کے اس واقعہ کو میاں صاحب کے سوانح نگار، مولوی فضل حسین بہاری

نے تفصیل سے بیان کیا ہے اور واقعہ کو غلط ملط کرتے ہوئے اصلیت کا صرف اتنا اعتراف

کیا ہے :

”مولانا محمد اسحاقؒ نے ۱۲۵۸ ہجری میں ہجرت کی اور اُسی سنہ میں بہ وقت

رخصت میاں صاحب کو اُن سے سند و اجازت تحریری حاصل ہوئی۔“ ۱

موصوف کی سند پر اکثر علماء معترض ہو کر تے تھے کہ پتہ تو ہدی کی ذرا سی گانٹھ ہے لیکن

پنساری بنے بیٹھے ہیں۔ کہاں باقاعدہ سند و تدریس سے محروم اور کہاں شیخ الکل ہونے کا

پروہ گینڈا۔ چنانچہ ایسے ہی ایک واقعہ کا تذکرہ میاں صاحب کے سوانح نگار نے یوں

کیا ہے :

”ایک روز مولوی احمد علی صاحب مرحوم سہارن پوری کو میاں صاحب نے

خفا کر کے فرمایا: میں چڑا اس نہیں دکھاتا ہوں۔ تم بیٹھو میں صحاح پڑھاتا ہوں،

دیکھو روشِ محدثانہ رکھتا ہوں یا نہیں؟ اکثر ایسے موقع پر شوخی طبع سے

سند کو چڑا اس کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔“ ۲

۱۔ محمد ایوب قادری، تذکرہ رجالِ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۳۸۳

۲۔ فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد المات، مطبوعہ ضیاء پریس کراچی، ۱۹۵۹ء، ص ۵۹

میاں صاحب نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت ایک انگریز عورت کی جان بچائی تھی۔
 ساڑھے تین مہینے اُسے اپنے مکان پر رکھنے کے بعد انگریزوں کے کیمپ میں پہنچا دیا تھا۔ خصوصاً
 اس واقعے کے بعد اُن کی نگاہوں میں برٹش گورنمنٹ اور حکومت کی نظر میں میاں صاحب کیا تھے؟
 یہ پروفیسر محمد ایوب قادری کے لفظوں میں ملاحظہ فرمائیے:

”۱۸۵۷ء میں ایک انگریز خاتون کو پناہ دی۔ ساڑھے تین مہینے تک رکھا، جس کے
 بدلے میں ایک ہزار تین سو روپیہ انعام اور خوشنودی سرکار کا سرٹیفکیٹ ملا جس
 زمانہ میں (۱۸۶۳-۶۵) وہابیوں (غیر مقلد وہابیوں) پر مقدمے چل رہے تھے
 میاں ندیر حسین کو بھی بحیثیت سرگروہ وہابیاں احتیاطاً ایک برس تک راولپنڈی
 کی جیل میں نظر بند رکھا گیا تھا مگر بقول مولف الحیوة بعد الماتة وفادار گورنمنٹ
 ثابت ہوئے اور کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا۔ جب میاں ندیر حسین جج کو گئے تو کمشنر
 دہلی کا خط ساتھ لے گئے۔ گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء کو
 شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء کو دہلی میں انتقال ہوا۔“ لے

خطاب ملنے کے واقعے کو موصوف کے سوانح نگار نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:
 ”گورنمنٹ انگلشیہ کی طرف سے ۲۲ جون ۱۸۹۷ء مطابق ۲۱ محرم ۱۳۱۵ھ روز
 سہ شنبہ کو ملا۔ جن لوگوں کو شیخ کے دیکھنے اور کچھ دنوں بھی ساتھ رہنے کا شرف
 حاصل ہے وہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ عموماً خطاب پانے والے خطاب کے لیے
 جو کچھ کرتے ہیں آپ کی طبیعت میں بالفطرۃ اُس کا مادہ ہی نہ تھا۔ وہ تدبیر، زہد
 تقویٰ اور درویشی میں جس طرح ثابت قدم اور مستقیم الحال تھے ویسے ہی ان امور
 کی جانب سے نہایت ہی لالہ بالی اور بے پروا تھے۔ معلوم ہوا کہ جس وقت کمشنر
 دہلی نے جگم لیفٹننٹ گورنر پنجاب، گورنمنٹ کی طرف سے اس خطاب کی خبر آپ کو
 دی، اس سے ایک منٹ آگے میاں صاحب کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ

بات نہیں آئی تھی کہ میں اس عام لقب سے ملقب ہوں گا اور جب لوگ خلعت و خطاب کے ساتھ میاں صاحب سے ملے اور آپ کو اس سے آگاہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہم غریب آدمی خلعت و خطاب لے کر کیا کریں گے ؟ خلعت و خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے۔ ہم کو دنیا لا حل ہے۔ بعد اس گفت و شنود کے آپ نے اسی قدر فرمایا : ”اچھا آپ حاکم ہو، جو چاہو کوئی لے“

جب میاں نذیر حسین صاحب کے وفادار حکومت ثابت ہونے کی بات چل نکلی ہے تو کیوں نہ اس سلسلے میں موصوف کے سوانح نگار ہی سے پوچھا جائے ؟ چنانچہ وہ لکھتے ہیں :

”اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ میاں صاحب بھی گورنمنٹ انکلیش کے کیسے وفادار تھے۔ زمانہ غدر، ۱۸۵۷ء میں جب کہ دہلی کے بعض مقتدر اور بیشتر معمولی مولویوں نے انگریز پر جہاد کا فتویٰ دیا تو میاں صاحب نے نہ اس پر دستخط کیا نہ مہر۔ وہ خود فرماتے تھے کہ : ”میاں وہ ہلڑ تھا، بہادر شاہی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بوڑھا بادشاہ کیا کرنا ؟ حشرات الارض خانہ براندازوں نے تمام دہلی کو خراب، دیران، تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائط امارت و جہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے تو اس فتوے پر دستخط نہیں کیا، مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے ؟ مفتی صدر الدین خاں صاحب پتھر میں آ گئے۔ بہادر شاہ کو بھی سمجھایا کہ انگریزوں سے لڑنا مناسب نہیں ہے مگر وہ باغیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہو رہے تھے، کرتے تو کیا کرتے ؟“

مولوی محمد اسماعیل نے جس داؤد ظاہری والے فتنے کا سنگ بنیاد بھی رکھا تھا، اُسی ترک تقلید کی میاں نذیر حسین دہلوی نے موصوف کے بعد گھل کر سرپرستی کی اور اس طرح غیر مقلدین کا ایک علیحدہ فرقہ معرض وجود میں آ گیا۔ علمائے اسلام نے سمجھانے بچانے اور رد و تردید کے

زیلے خوب اپنا فریضہ ادا کیا لیکن موصوف پر کوئی اثر نہ ہوا اور حکومت کی سرپرستی میں بے فہار ہی
 دوڑتے بھاگتے رہے۔ ۱۲۰۰ھ میں میاں صاحب نے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا۔ جانے سے
 پہلے موصوف نے اپنے خداوندِ نعمت، کشتہ دہلی سے چٹھی حاصل کی جو الحیات بعد المات کے صفحہ ۱۳۹
 پر انگریزی میں درج ہے۔ وہاں اس کا ترجمہ یوں کیا ہے :

”مولوی نذیر حسین دہلی کے ایک بڑے مقدرِ عالم ہیں، جنہوں نے نازک وقتوں
 میں اپنی وفاداری گورنمنٹِ برطانیہ کے ساتھ ثابت کی ہے۔ وہ اپنے فرضِ
 زیارتِ کعبہ کے ادا کرنے کو مکہ جاتے ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ جس کسی برٹش گورنٹ
 افسر کی وہ مدد چاہیں گے وہ اُن کو مدد دے گا کیونکہ وہ کامل طور سے اس مدد کے
 مستحق ہیں۔

دستخط ہے۔ ڈی۔ ٹریبلٹ بنگال

سر دس کشتہ دہلی و سپرنٹنڈنٹ

۱۰ اگست ۱۸۸۳ء“ لے

موصوف نے دوسری چٹھی اُس انگریز افسر سے حاصل کی تھی، جس کی بیوی کو میاں صاحب نے
 ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں ساڑھے تین ماہ اپنے گھر میں رکھا اور اُس کی جان بچائی تھی۔ چنانچہ
 سوانح نگار نے لکھا ہے :

”دوسری چٹھی مسٹر لیسنس نے بنام کونسلِ مقیمِ جدہ کے دی، جس میں آپ کی
 خیر خواہی زمانہِ غدر کا مفصل بیان تھا۔ اُنہوں نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُن کے
 مخالفین بھی بہت ہیں اور اُن میں سے بعض مکہ معظمہ میں یہاں سے بھاگ کر
 مقیم ہو گئے ہیں۔ مسٹر لیسنس نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ برٹش گورنمنٹ کانسل
 کا فرض ہے کہ ان کو ان کے مخالفین کے شر و فساد سے بچاتے۔ یہ چٹھی
 برٹش کانسلِ مقیمِ جدہ (مکتوب الید) نے اپنے پاس رکھ لی۔“ لے

لے فضل حسین بہاری، مولوی : الحیات بعد المات ، ص ۱۴۰

لے ایضاً : ص ۱۴۰، ۱۴۱

میاں صاحب سے محکمہ میں باز پرس ہوئی، تو حاکم محکمہ کے سامنے موصوف نے یہ بیان دیا:

”ہندوستان میں اس وقت انگریزی حکومت ہے۔ وہاں ہر مذہب آزاد کے ساتھ اپنے شعار مذہب کے ادا کرنے کا مجاز ہے۔ کوئی مسلمان نہ جمعہ سے روکا جاتا ہے نہ جماعت سے اور یہاں اسلامی سرزمین اور مسلمانوں کی محنت میں ہم لوگ طواف کعبہ اور جمعہ و جماعت سے مجبور ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ کہنے سے معذور سمجھے جاتیں کہ انگریزی گورنمنٹ ہندوستان میں ہم مسلمانوں (دہائیوں) کے لیے خدا کی رحمت ہے“ ۱

میاں صاحب اپنے غیر متعلقہ گروہ کے سرپرست اور شیخ اہل تھے۔ موصوف کے دست راست اور فعال کارکن مولوی محمد حسین بٹالوی تھے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں لکھا ہے:

”مولوی محمد حسین بٹالوی کی پوری پالیسی میں شمس العلماء، شیخ اہل میاں، ندیر حسین ممدو معاون بلکہ سرپرست و سرخیل رہے اور صادق پور کے بجائے مرکز قیادت دہلی اور لاہور منتقل ہو گیا۔ پھر بیسویں صدی کے آغاز پر دسمبر ۱۹۰۶ء میں بمقام آرہ (بہار) آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس وجود میں آئی، جس کے سبب فعال کارکن مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسری تھے۔ اہلحدیث کانفرنس کی پالیسی بھی کم و بیش مولوی محمد حسین بٹالوی کے انداز پر رہی“ ۲

ضروری ہوا کہ مولوی محمد حسین بٹالوی کا انداز معلوم کیا جاتے تاکہ اس جماعت کے سرپرست میاں ندیر حسین دہلوی کا حکومت کے بارے میں اور بھی واضح نظریہ سامنے آجائے۔

۱۔ فضل حسین بہاری، مولوی: الحیات بعد المات، ص ۱۹۱، ۱۹۲

۲۔ محمد ایوب قادری، مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۸

۱۲۔ مولوی محمد حسین بٹالوی

مولوی محمد حسین بٹالوی (المتوفی ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) حقیقت میں اُس جماعت کی پالیسی کے علمبردار ہیں جس کا سنگ بنیاد مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے رکھا تھا۔ وہاں بیت کی اپنے روزِ اول سے ۱۹۲۰ء تک وہی پالیسی رہی جو مولوی محمد حسین بٹالوی نے اختیار کی۔ چنانچہ غیر مقلد حضرات کے سرگروہ، نواب صدیق حسن خاں فوجی بھوپالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے :

”۸۷ء میں مولوی محمد حسین سرگروہ موحّدین لاہور، بجواب و سوال و مسئلہ اور اُس فتوے کے کہ آیا بمقابلہ گورنمنٹ ہند، مسلمانانِ ہند کو جہاد کرنا اور اپنی مذہبی تقلید میں ہتھیار اٹھانا چاہیے یا نہیں؟ بجواب دیا ہے اور بیان کیا ہے کہ جہاد جنگ مذہبی بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا بمقابلہ اُس حاکم کے کہ جس نے آزادی مذہبی دے رکھی ہے اور از روئے شریعت اسلام عموماً خلاف و ممنوع ہے اور وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادی مذہب دی ہے، ہتھیار اٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں اور مستحقِ سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں۔“

پھر مولوی محمد حسین نے اپنے اس دعویٰ اور جواب کی تصدیق میں کُل علماء ملک پنجاب و اطرافِ ہند کے پاس اپنے فتویٰ جوابی کو بھیج دیا اور اچھی طرح سے مشترک کیا اور کُل علماء ہند و ملک پنجاب سے اس بات کی تصدیق میں اقرار مہری اور دستخطی کرا لیا کہ عموماً مسلمانانِ ہند کو ہتھیار اٹھانا اور جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کرنا خلافِ مسئلہ سنت و ایمانِ موحّدین ہے۔

اور نیز کُل علمائے ملک پنجاب و ہند نے تائیدِ قول مولوی محمد حسین کی، کی اور اپنے اپنے دستخط و مہر کر کے مولوی محمد حسین کو اس فتویٰ میں بہت سچا اور پکا کہا ہے اور سب نے اپنی اپنی رائے اسلامی و ایمانی سے اس فتوے کو قبول کیا ہے اور جانا اور مانا ہے کہ بمقابلہ گورنمنٹ ہند فرقہ موحّدین کو ہتھیار اٹھانا،

خلافت اسلام و ایمان کے ہے۔

پھر مولوی محمد حسین نے اس بات کی استدعا کی تھی کہ وہ ایمان ملک ہزارہ کے نزدیک ایک عام ایلمی بذریعہ مسلمانان ہند کے بھیجا جائے اور وہ مع اس فتویٰ کے جا کر اس نا سمجھ کو مطلع کر دے کہ جہاد بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند کے منوع ہے اور نیز ان کو آگاہ کر دے کہ ان کی اس نافہمی کے غوریزی و قتال و جہاد پر سخت گناہ ثابت ہے اور سب کا گناہ ان کے سر پر وارد شرعی ہے اور چونکہ از روئے شریعت اسلام، برٹش گورنمنٹ ہند سے جہاد کرنا، خلافت طریقہ اسلام و شریعت حقہ کے ہے، اس لیے ان کو خیر خواہی و گورنمنٹ ہند میں برابر مستعد رہنا چاہیے۔“ لے

مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے فتوے میں انگریز کے خلافت جہاد کرنے کو ایمان اور اسلام کے خلافت قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے نہ صرف موصوف کے نزدیک بلکہ مولوی محمد حسین بٹالوی اور میاں نذیر حسین دہلوی کی تصدیق و تائید کرنے والے علمائے اہلحدیث کے نزدیک باغی اور مستوجب سزا ہیں۔ برسبیل تذکرہ یہاں جناب غلام رسول مہر کی تحقیق پر ایمان لانے والوں کی خدمت میں ایک گزارش ہی پیش کر دی جاتے۔ وہ گزارش یہ ہے کہ تمام غیر مقلدین علماء کے اس متفقہ فتویٰ کی روشنی میں سوچے تو سہی! اگر آپ مہر صاحب کی پیروی میں سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف بھی کرنا چاہتے ہیں تو بخوشی کیجیے لیکن اس صورت میں جملہ دیوبندی علماء کے نزدیک وہ حضرات باغی اور مستحق سزا بنتے ہیں اور ان کا یہ اقدام اسلام اور ایمان کے خلافت قرار پاتا ہے۔ اگر اس فتوے کو ناقابل اعتبار سمجھا جائے تو ایسا کرنا غیر مقلد حضرات کی ساری کوششیں مآخذ الا اعتبار ٹھہرانے کے مترادف ہوگا۔

اب قارئین کرام، مہر صاحب کی تحقیق پر ایمان لا کر سید احمد صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف کرنے والے حضرات اور علمائے اہلحدیث، یہ سارے حضرات اس امر کا

فیصلہ فرمائی کہ :

۱۔ غلام رسول مہر فرماتے ہیں کہ سید احمد صاحب اینڈ کمپنی کے جہاد کا رخ حقیقتاً انگریزوں

کی طرف تھا۔

۲۔ علمائے اجماع فرماتے ہیں کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا اسلام اور ایمان کے خلاف ہے اور ایسا کرنے والا سزا کا حقدار اور باغی ہے۔

تینوں قسم کے حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ ان فریقین میں سے کون سا فریق قابل اعتبار نظر آتا ہے اور کون سا ناقابل اعتماد ؟ ہمارے اس سلسلے میں عاجزانہ التماس یہیں اتنی سی ہے کہ جس فریق کو بھی ناقابل اعتبار ٹھہرایا جائے اُس سے ازراہ کرم ہمیں بھی مطلع کر دینا، تاکہ ہم اُن سے محتاط رہیں۔

مولوی محمد حسین بٹالوی کے مذکورہ فتوے کے بارے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کی تحقیق

یہ ہے :

”مولوی محمد حسین بٹالوی نے سرکار برطانیہ کی وفاداری میں جہاد کی منسوخی پر ایک مستقل رسالہ ”الاقتصاد فی مسائل الجہاد“ ۱۲۹۲ھ میں لکھا۔ انگریزی اور عربی زبانوں میں اُس کے ترجمے ہوئے۔ یہ رسالہ سرچارلس ایچیسن اور سرجمیل لائل گورزان پنجاب کے نام معنون کیا گیا۔ مولوی محمد حسین نے اپنی جماعت کے علماء سے راتے لینے کے بعد ۱۲۹۶ھ میں رسالہ اشاعت السنہ کی جلد دوم شمارہ گیارہ میں بطور ترمیم شائع کیا، پھر مزید مشورہ اور تحقیق کے بعد ۱۳۰۶ھ میں باضابطہ کتاب کی صورت میں شائع ہوا۔“ لے

موصوف کے مذکورہ فتوے کے متعلق جناب مسعود عالم ندوی کی رائے کچھ اس طرح ہے :

”معتبر اور ثقہ راویوں کا بیان ہے کہ اس کے معاوضے میں سرکار انگریزی سے انھیں جاگیر بھی ملی تھی۔ اس رسالے کا پہلا حصہ پیش نظر ہے۔ پوری کتاب تحریف

تدلیس کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔“ ل

مولوی محمد حسین بٹالوی اپنے اس فتوے پر بے حد نازاں تھے اور اس کے ذریعے وہ اپنی ذات کو اور اپنی جماعت کو برٹش گورنمنٹ کے خیر خواہوں میں سب سے ممتاز دکھانے اور ثابت کرنے پر اڑی چڑی کا زور لگا رہے تھے۔ موصوف کے رسالہ ”اشاعت السنہ“ لاہور، جلد ۷ کے صفحہ ۲۶۱، ۲۶۲ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے اُن کا اسی فتوے کے سلسلے میں ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

”اگرچہ اس مضمون (منسوخی جہاد) کے رسائل گورنمنٹ اور ملک کے خیر خواہوں نے بھی لکھے ہیں لیکن جو ایک خصوصیت اس رسالے میں ہے وہ آج تک کسی تالیف میں پائی نہیں جاتی۔ وہ یہ ہے کہ یہ رسالہ صرف موقت کا خیال نہیں رہا، اس گروہ کے عوام و خواص نے.... اس کو پسند کیا اور اس سے اپنے آراء کا توافقی ظاہر کیا۔ اس توافقی رائے کو حاصل کرنے کے لیے مؤلف (محمد حسین بٹالوی) نے عظیم آباد پلٹنے تک ایک سفر کیا تھا، جس میں لوگوں کو یہ رسالہ سُنا کر اتفاق حاصل کیا اور جہاں خود نہیں پہنچا وہاں اس رسالے کی متعدد کاپیاں ارسال کر کے توافقی حاصل کیا۔“ ل

یوں تو کتنے ہی علماء برٹش گورنمنٹ کے آلہ کار بن کر خفیہ یا اعلانیہ حمایت کا دم بھرتے اور انگریزوں کے تخریبی منصوبوں کو پانیہ تکمیل تک پہنچانے میں اپنی پوری پوری صلاحیتوں کو بروئے کار لارہے تھے لیکن انگریز کی علی الاعلان، ڈنکے کی چوٹ توافقت کرنے، جہاد کو منسوخ قرار دینے، انگریز کے مخالفوں سے ٹکر لینے میں مولوی محمد حسین بٹالوی، مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید احمد علی گڑھی سب سے ممتاز ہیں۔ یہ تینوں حضرات آپس میں تو ایک دوسرے کے خلاف ہیں لیکن کسی بھی چوتھی ہستی کو، اس میدان میں، ان حضرات کا مد مقابل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ثبوت کے طور پر موصوف کا ایک بیان ملاحظہ ہو، جسے پروفیسر محمد ایوب قادری نے ”اشاعت السنہ“ لاہور

لے مسعود عالم ندوی، ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی، ۱۳۶۸ھ، ص ۶۹

لے محمد ایوب قادری: مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۵

شمارہ ۹ کے صفحہ ۲۶۲ سے نقل کیا ہے :

”اس گروہ اہلحدیث کے خیرخواہ و وفادار رعایا برٹش گورنمنٹ ہونے پر ایک بڑی روشن اور قومی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ برٹش گورنمنٹ کے زیر حمایت رہنے کو اسلامی سلطنتوں کے ماتحت رہنے سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس امر کو اپنے قومی وکیل، اشاعت السنہ کے ذریعہ سے جس کے نمبر ۱۰، جلد ۶ میں اس امر کا بیان ہوا ہے (اور وہ نمبر ہر ایک لوکل گورنمنٹ اور گورنمنٹ آف انڈیا میں پہنچ چکا ہے) گورنمنٹ پر بخوبی ظاہر اور مدلل کر چکے ہیں، جو آج تک کسی اسلامی فرقہ رعایا گورنمنٹ نے ظاہر نہیں کیا اور نہ آئندہ کسی سے اس کے ظاہر ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔“ ۱

مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی پیدا کردہ جماعت (غیر مقلد و مابی) اپنے روزِ اوّل ہی سے برٹش گورنمنٹ کی خیرخواہ اور وفادار تھی لیکن انگریزوں کے پنجاب پر قابض ہو جانے کے بعد سیاحب کے بعض کاروباری قسم کے مجاہد خلفاء کا انگریزوں سے ٹکراؤ ہوا، اُن کی تحریک کو مٹایا گیا، مقدمے چلے، سزائیں دیں۔ ان حالات میں حکومت سے ناراضگی قدرتی امر تھا لیکن ایک طرف گورنمنٹ کا آہنی پنجہ تھا تو دوسری طرف مولوی محمد حسین بٹالوی کی فہمائش۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پوری جماعت برٹش گورنمنٹ کی وفادار و خیرخواہ بن کر اُس کے استحکام و قیام کو اپنے لیے نعمت و غیر تر قیہ گرداننے لگے۔ اس سلسلے میں مرزا حیرت دہلوی یوں نغمہ سنج ہیں :

”گورنمنٹ خود جاننتی ہے کہ اُس کی سلطنت کی برکتوں کو فرقہ اہل حدیث نے کس قدر تسلیم کیا ہے اور اُس کے کیسے فرمانبردار، مطیع اس گروہ کے لوگ ہیں۔ ان پر کیا، ہندوستان کے کل مسلمان اپنی گورنمنٹ کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی اُن کا رروائیوں میں شریک نہیں ہوتے جو گورنمنٹ کے خلاف سمجھی جاتی ہیں۔“ ۲

۱۔ لکھنؤ ایوب قادری : مقدمہ حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی، ص ۲۷

۲۔ حیرت دہلوی مرزا : حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۲۶۷

مولوی محمد حسین بٹالوی نے ملکہ وکٹوریہ کے جشنِ جوہلی پر برٹش گورنمنٹ کی بارگاہ میں اپنا
نذرانہ عقیدت بچھا کر کرنے کی غرض سے جو ایڈریس پیش کیا تھا اس کا ایک اقتباس "اشاعة السنہ"
لاہور، جلد ۹، شمارہ ۷، کے صفحہ ۲۰۵، ۲۰۶ سے پروفیسر محمد ایوب قادری نے یوں نقل کیا ہے،

"یہ مذہبی آزادی اس گروہ کو خاص کر اس سلطنت میں حاصل ہے بخلاف دوسرے
اسلامی فرقوں کے کہ ان کو اور اسلامی سلطنتوں میں بھی یہ آزادی حاصل ہے،
اس خصوصیت سے یقین ہو سکتا ہے کہ اس گروہ کو اس سلطنت کے قیام و
استحکام سے زیادہ مسرت ہے اور ان کے دل سے بارک باد کی صدائیں زیادہ
زور کے ساتھ نعرہ زن ہیں" لہ

اسی سلسلے میں پروفیسر محمد ایوب قادری کا یہ بیان بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے:
"اسی طرح لارڈ ڈفرن وائسرائے ہند کی سبکہ دہشی پر جماعت اہل حدیث نے
ایک خوشامدانہ ایڈریس دیا، جس پر سب سے پہلے شمس العلماء میاں نذیر حسین
کے دستخط ہیں۔ اس کے بعد ابوسعید محمد حسین وکیل اہل حدیث، مولوی احمد اللہ
واعظ میونسپل کمشنر امرت سر، مولوی قطب الدین پٹیوٹا اہل حدیث روپڑ،
مولوی حافظ عبداللہ غازی پوری، مولوی محمد سعید بنارس، مولوی محمد ابراہیم آڑہ
اور مولوی نظام الدین پٹیوٹا اہل حدیث مدراس کے دستخط ہیں" لہ

مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد صاحب نے اپنی اس نوزائیدہ جماعت کا نام "محمدی
گروہ" رکھا تھا۔ خلفاء کا دور آیا تو اپنے لیے "موتحدین" اور مسلمانوں کو مشرکین بتانے لگے لیکن
محمد بن عبدالوہاب کے نقش قدم پر چلنے کی بنا پر متحہ ہندوستان کے مسلمان بھی انھیں اہل عرب
کی طرح "دہابی" ہی کہا کرتے تھے۔ جب مقدمہ انبالہ کے تحت انگریزوں نے اپنے خانہ زادوں
کی گوشمالی شروع کی، جواب انگریزوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ اس کپڑ دھکڑ سے دہابی

حضرات گھبرا اٹھے۔ اس موقع پر مولوی محمد حسین بٹالوی کام آئے۔ ایک طرف انہوں نے حکومت کے غصے کی آگ اپنی خوشامداندہ روش اور کاسہ لیبسی کے پانی سے سرسید احمد خاں کی طرح بجھانی شروع کی اور دوسری طرف اپنی پوری جماعت کو حکومت کا وفادار بنادیا۔ اس جماعت کے ہاتھ پر جو مسلمانوں نے وہابیت کی چٹ لگا رکھی تھی، اُسے اہل حدیث حضرات کے وکیل مولوی محمد حسین بٹالوی نے اپنے سرپرستوں کے ذریعے قانونی طور پر ہٹانے کی کوشش کی اور اپنی جماعت کا نام جس طرح منکرین حدیث نے ”اہل قرآن“ تجویز کیا ہے، اسی طرح ان منکرین فقہ و تقلید ائمہ نے اپنی جماعت کو ”اہل حدیث“ کا نام دیا۔ مثلاً :

”انہوں نے ارکان جماعت اہل حدیث کی ایک دستخطی درخواست لیفٹننٹ گورنر پنجاب کے ذریعہ سے والسرائے ہند کی خدمت میں روانہ کی، اُس درخواست پر سر فرسٹ شمس العلماء میاں نذیر حسین کے دستخط تھے۔ گورنر پنجاب نے وہ درخواست اپنی نائبی تحریر کے ساتھ گورنمنٹ آف انڈیا کو بھیج دی۔ وہاں سے حسب ضابطہ منظوری آگئی کہ آئندہ وہابی کے بجائے ”اہل حدیث“ کا لفظ استعمال کیا جائے۔ لیفٹننٹ گورنر پنجاب نے اس کی باقاعدہ اطلاع مولوی محمد حسین کو دی۔ اسی طرح گورنمنٹ مدراس کی طرف سے ۵ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۲، گورنمنٹ بنگال کی طرف سے ۴ مارچ ۱۸۹۰ء کو بذریعہ خط نمبر ۱۵۶، اور گورنمنٹ یو۔ پی کی طرف سے ۲۰ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۸۶ گورنمنٹ سی۔ پی کی طرف ۱۴ جولائی ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۴۰، اور گورنمنٹ ممبئی کی طرف سے ۱۴ اگست ۱۸۸۸ء کو بذریعہ خط نمبر ۳۲، اس امر کی اطلاع مولوی محمد حسین بٹالوی کو ملی۔“ لے

موصوف کے مذکورہ بالا بیان کا ماخذ رسالہ ”اشاعۃ السنۃ“ لاہور ہے۔ اس کی تائید میں سیرت ثنائی مطبوعہ گوجرانوالہ ۱۹۵۲ء کے صفحہ ۳۷۲ سے مولوی عبدالحجید خادم سوہدری کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے :

”مولوی محمد حسین بٹالوی) نے اشاعت السنہ کے ذریعہ اہل حدیث کی بہت محنت کی۔ لفظ ”وہابی“ آپ ہی کی کوشش سے سرکاری دفاتر اور کاغذات سے منسوخ ہوا اور جماعت کو اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا گیا۔۔۔۔۔ (آپ نے) حکومت کی خدمت بھی کی اور انعام میں جاگیر پائی، لہ

۱۳۔ مولوی نواب صدیق حسن خاں قنوجی

آپ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ / ۱۴ اکتوبر ۱۸۳۲ء کو اپنی ننہال بانس بریلی میں پیدا ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد ان کی والدہ محترمہ قنوج چلی گئیں جو موصوف کا آبائی وطن تھا۔ درسی علوم مفتی صدر الدین دہلوی سے حاصل کیے، تفسیر و حدیث وغیرہ علوم قاضی حسین انصاری، شیخ عبدالحق ہندی اور مولوی محمد یعقوب دہلوی سے حاصل کیے۔ پہلے بھوپال میں ملازمت کی بعد ۱۲۸۸ھ / ۷۲-۱۸۷۱ء میں رئیس بھوپال کی شوہری و نیابت کا شرف بھی مل گیا۔ نوابی اور خان بہادری کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ میاں نذیر حسین دہلوی اور مولوی محمد حسین بٹالوی کے ہم مسلک و ہم مشرب تھے۔ تصنیف و تالیف کے ذریعے اور شانِ نوابیت کے بل بوتے پر اپنی جماعت کی جڑیں مضبوط کرتے رہے۔ انگریز دوستی میں بڑھ چڑھ کر حصہ دار رہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کو نواب صاحب شرعی نقطہ نظر سے کیا درجہ دیتے تھے، خود موصوف کے لفظوں میں یہی ملاحظہ فرمائیے:

”چنانچہ غدر (یعنی جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء) میں جو چند لوگ نادان، عوام الناس، فتنہ و فساد پر آمادہ ہو کر جہاد کا جھوٹا نام لینے لگے اور عورتوں اور بچوں کو ظلم و تعدی سے مارنے لگے اور ٹوٹ مار پر ہاتھ دراز کیا اور ہوالِ رعایا اور پرایا پر غصباً قابض و متصرف ہوئے انہوں نے خطائے فاحش کی اور قصورِ ظاہر، اس لیے کہ قرآن و حدیث کے موافق کہیں شرطیں جہاد کی موجود نہ تھیں، سوائے

سودائے خام اور خیالی پلاؤ حکومت رانی اور ملک ستانی کے اُن کے دلوں میں اور
مغزوں میں سمائے ہوئے تھے۔ ہم نہیں جانتے کہ اُن میں سے کسی جماعت اور
شکر میں خلوص نیت اور پاکِ طینت اور انصاف واجبی اور تبعیتِ مذہب
اسلام ہوئے نہ

موصوف کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سراسر ایک فتنہ و فساد تھا۔ چنانچہ تصریح کرتے ہیں کہ:
”آج کل عام مسلمان جن کو علم و فہم سے بہرہ نہیں بلکہ اکثر اربابِ دُول و حکومت جنہیں
اسلام کی خوبیوں سے اور ایمان کی باتوں سے بالکل واقفیت نہیں، جس کو
جہاد سمجھ رہے ہیں، وہ حقیقت میں فتنہ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔“
اسی سلسلے میں موصوف یوں اپنا عندیہ ظاہر کرتے ہیں:

”جس کا جی چاہا اور اُس کو وسوسہ سرداری نے گھیرا، وہی سرکار سے باغی
ہو کر لڑنے کو کھڑا ہو گیا اور اس لڑائی کو جہاد ٹھہرایا، حالانکہ وہ جہاد نہ تھا،
سراسر فتنہ تھا۔“

اسی جنگِ آزادی، ۱۸۵۷ء کے بارے میں موصوف نے یوں نوابی فیصلہ صادر فرمایا ہے:
”بناوَت جو ہندوستان میں زمانہٴ ندر ہوئی، اُس کا نام جہاد رکھنا اُن لوگوں کا
کام ہے جو اصل دینِ اسلام سے آگاہ نہیں اور ملک میں فساد ڈالنا اور امن اٹھانا
چاہتے ہیں۔“

جی مسلمانوں نے، ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لیا، جو انگریز کی غلامی کا جوا اپنے کندھوں
سے اتار کر پھینک دینا چاہتے تھے اور جو اپنے ملک کو غاصب انگریزوں کے پنجے سے چھڑا کر
آزاد فضا میں سانس لینا چاہتے تھے، وہ تھے کون؟ اس سوال کا جواب نواب صدیق حسین

نہ صدیق حسن خاں قنوجی، نواب: ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۲۴

نہ ایضاً: ص ۲۸

نہ ایضاً: ص ۳۰

نہ ایضاً: ص ۱۰۷

صاحب نے یوں دیا ہے:

”جتنے لوگوں نے غدر میں شردِ فساد کیا اور حکامِ انگلشیہ سے برسرِ غادر ہوئے
وہ سب کے سب مقلدانِ مذہبِ حنفی تھے، نہ متبعانِ حدیثِ نبوی۔ مگر
مکر اور زور کی راہ سے فتنہ پردازی کی تمت دوسروں پر باندھ دی اور اہلِ غدر کو
دبا بیٹھا دیا“ لے

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں حصہ لینے والے مسلمانوں کا نواب صاحب کی نظر میں جرمِ کیا تھا، ان
پر کوئی دفعہ عائد ہوتی تھی؟ اس سلسلے میں شریعتِ محمدی کے ٹھیکیدار بننے والے نواب صاحب
کا فیصلہ ملاحظہ ہو:

”وہ لوگ جو بمقابلہ برٹش گورنمنٹ ہند یا کسی اُس بادشاہ کے کہ جس نے آزادیِ مذہب
دی ہے ہتھیار اٹھاتے ہیں اور مذہبی جہاد کرنا چاہتے ہیں، کُل ایسے لوگ باغی ہیں
اور مستحقِ سزا کے مثل باغیوں کے شمار ہوتے ہیں“ لے

اب آخر میں ملاحظہ ہو کہ غیر مقلدانِ ہند کی نظر میں انگریز جیسی عیار، ظالم اور اسلام دشمن قوم کیسی تھی؟
پہلے باب کے اندر جس کے عیارانہ قبضے، ظالمانہ رویے اور اسلام دشمن منصوبے کا اجمالی ذکر
کیا گیا ہے اُس کی روشنی میں نواب صاحب کی قصیدہ خوانی ہو سکتا ہے مکِ حلالی کا ثبوت ہو
لیکن مسلمانوں کی ایمانی غیرت کے لیے چیلنج ہے۔

”غرض ان (قاضی شوکانی) کی گواہی سے بخوبی معلوم ہوا کہ درستی ملک اور
صفائیِ راہ اور رفادِ عوام اور امنِ خلافت اور امانِ مخلوق اور راحتِ رسانی
رعیت اور آرامِ دہی بریت میں حکامِ فرنگ کا مثل اور نظیر اس وقت میں
بلکہ اکثر اوقات میں ہرگز نہیں۔ اگرچہ ہر وقت کے ملا اور مفتی خوشامد کی راہ سے
باتیں بناتے ہیں اور ہر کسی کو اچھا بتاتے ہیں مگر میری نظر میں جو راج اور صبح

لے صدیق حسن خاں قنوجی، نواب: ترجمانِ دہلیہ، مطبوعہ امرتسر، ص ۷۴

لے ایضاً: ص ۱۲۰

معلوم ہوا، وہ لکھ دیا۔ قبول و ہدایت اللہ کے ہاتھ ہے۔“ لے
 ۵ گرچہ ہے دلکش بہت حسنِ فرنگ کی بہار
 طائرکِ بلند بال، دانہ و دام سے گزر

۱۴۔ سرسید احمد خاں

سرسید احمد خاں ۵ ذی الحجہ ۱۲۳۲ھ مطابق ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔
 تعلیم حاصل کی لیکن بے توجہی سے اور بہت کم۔ ابتدائی زندگی رنگارنگ قسم کی ہے۔ حالی پانی پتی
 نے اس کی یوں تصویر کشی کی ہے:

”سرسید کا عنفوانِ شباب نہایت زندہ دل اور رنگین صحبتوں میں گزرا تھا۔
 وہ راگ رنگ کی مجلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ باغوں کی سیر کو دوستوں کے
 ساتھ جاتے تھے۔ پھول والوں کی سیر میں خواجہ صاحب پہنچتے تھے اور وہاں
 کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے۔ دلی میں بسنت کے میلے جو موسمِ بہار کے
 آغاز میں درگاہوں میں ہوتے تھے، وہاں جاتے تھے۔ خود ان کے نانا فرید
 کی قبر پر چنٹھ کھجے میں جو بسنت کا میلہ ہوتا تھا اس میں وہ اپنے اور
 بھائیوں کے ساتھ منظم و مہتمم ہوتے تھے۔“ لے

سرسید احمد خاں اپنی سوانحِ حیات خود یوں بیان کرتے تھے:

”اول اول توجہ کبھی سرسید کے سامنے اور ان کی لائف لکھنے کا ارادہ
 ظاہر کیا جاتا تھا، تو وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ: میری لائف میں سوا
 اس کے کہ رطپن میں خوب بکڑیاں کھلیں، کنگوے اڑاتے، کبوتر پالے،
 ناچ مجھے دیکھے اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلوائے اور رکھا

ہی کیا ہے؟ لے

مولوی عبدالحق حقانی دہلوی نے سرسید احمد خاں کا تعارف یوں کر دیا ہے:

”اس کتبہ میں ایک شخص سید احمد خاں صاحب بہادر بھی پیدا ہوئے۔ یہ شخص ابتداء میں مولوی مخصوص اللہ صاحب بنیرہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی خدمت میں آکر کسی قدر صرف و نحو سے آشنا ہوئے اور تعویذ گنڈے بھی سیکھے، لیکن جب یہ نسخہ چلا تو گورنمنٹ برٹش کی طرف رجوع کیا اور اپنی لیاقتِ خدا داد سے کوئی اچھا عمدہ بھی پایا، پھر تو پکے وہابی متبع مولوی اسماعیل صاحب ہو گئے۔۔۔۔۔ اس عرصہ میں غدر ہو گیا اور سید صاحب اپنی خیر خواہی اور حکامِ رسی سے بڑی ترقی کر گئے اور اپنی خوش بیانی اور عالی دماغی سے انگریزوں میں بڑے فاضل یا فلاسفر باوقار مانے گئے اور سی۔ ایس۔ آئی کا لقب حاصل کیا اور کچھ عجیب نہیں کہ گورنمنٹ برٹش، ۱۸۵۷ء کے فساد سے پُر حذر ہوا اور سید صاحب نے مسلمانوں کی طرف سے گورنمنٹ کو نہ صرف اطمینان دلایا بلکہ خیالات مذہبیہ کے گرانے کا بھی بیڑہ اٹھایا ہو۔“ لے

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں سرسید احمد خاں صاحب نے اپنی قوم کے خلاف اور اپنے ملکِ مضادات کے خلاف دل کھول کر انگریزوں کی مدد کی۔ موصوف کے اس کارنامے کو انگریزوں نے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور انھیں خوب مالامال کیا۔ سرسید احمد خاں صاحب کی ان کارگزاریوں کے لیے دفتر چاہیں تفصیلی حالات کے لیے اُن کی تصنیف ”تاریخ کشمیری ہجوز“ بھی کافی ہے یہاں محض ایک جھلک دکھانے کی غرض سے اُن کے سوانح نگار یعنی خواجہ الطاف حسین حالی کا ایک بیان ہدیۃ النظائر ناظرین ہے:

”جو شخص سرسید کی طبیعت اور جبلت سے واقف ہوگا، وہ اس بات کو

لے الطاف حسین حالی، حیاتِ جاوید، ص ۱۷۱

لے عبدالحق حقانی، مولوی: تفسیر حقانی، جلد اول، ص ۱۱۲

باسانی باور کرے گا کہ جو کچھ غدر کے زمانہ میں گورنمنٹ کی خیر خواہی اور وفاداری اُن سے ظہور میں آئی وہ کسی خلعت یا انعام وغیرہ کی توقع پر مبنی نہ تھی۔ وہ بڑا انعام اپنی خدمت کا یہی سمجھتے تھے کہ اُس نازک وقت میں ان سے کوئی امر اخلاق اور شرافت اور اسلام کی ہدایت کے خلاف سرزد نہیں ہوا۔ مگر گورنمنٹ نے خود انکی خدمات کی قدر کی اور اُن کے صلے میں ایک خلعت قیمتی ایک ہزار روپے کا اور دوسو روپے ماہوار کی پولیٹیکل پنشن دونوں تک مقرر کی۔ ۱۰

موصوف کی نظر میں برٹش گورنمنٹ کیا اور کیسی تھی؟ خواجہ الطاف حسین حالی نے اُن کا ایک بیان یوں نقل کیا ہے:

”الہی تیرا بہت بڑا احسان اپنے بندوں پر یہ ہے کہ اپنے بندوں کو عادل اور منصف حاکموں کے سپرد کرے۔ سو برس تک تُو نے اپنے ان بندوں کو، جن کو تُو نے خطہ ہندوستان میں جگہ دی ہے۔ اسی طرح عادل اور منصف حاکموں کے ہاتھ میں ڈالا۔ پچھلے کم بخت برسوں میں جو بسبب نہ ہونے ان حاکموں کے ہماری شامتِ اعمال ہمارے پیش آئی، اب تُو نے اُس کا عوض کیا اور پھر وہی عادل اور منصف حاکم ہم پر مسلط کیے۔ تیرے اس احسان کا ہم دل سے شکر ادا کرتے ہیں، تُو اپنے فضل سے اس کو قبول کر۔“ ۱۱

سید احمد خاں آخر برٹش گورنمنٹ کے اتنے خیر خواہ کیوں بنتے تھے؟ اس کی وجہ خود موصوف کی زبانی سنئے:

”انھوں (سر سید احمد) نے کئی موقعوں پر یہ ظاہر کیا کہ میں ہندوستان میں انگلش گورنمنٹ کا استحکام کچھ انگریزوں کی محبت اور اُن کی ہوا خواہی کی نظر سے

نہیں چاہتا بلکہ صرف اس لیے چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی خیر اس کے استحکام میں سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک اگر وہ (مسلمان) اپنی حالت سے نکل سکتے ہیں تو انگلش گورنمنٹ ہی کی بدولت نکل سکتے ہیں۔ ۱۷

موصوف کے نزدیک انگریز مسلمانوں کے ہمدرد اور بھی خواہ تھے۔ اس خوش فہمی میں وہ دانستہ مبتلا ہونے پر مجبور تھے اور پوری قوم کو بھی اس خوش فہمی کا شکار کرنا چاہتے تھے۔ اس دعوے کی دلیل سرسید کے پاس وہ چند قوم فروش بلکہ دین فروش تھے جنہیں حکومت نے فکر دنیا سے آزاد کر رکھا تھا۔ مسلمانوں کو موصوف جس قسم کی تلقین کیا کرتے تھے وہ خود سرسید احمد خاں صاحب کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے :

”ہم (سرسید احمد خاں) جو یہ لکھتے ہیں کہ ہماری منصف گورنمنٹ مسلمانوں کے ساتھ ہے، اس کی بہت روشن دلیل یہ ہے کہ ہماری قدردان گورنمنٹ نے خیر خواہ مسلمانوں کی کیسی قدر و منزلت اور عزت و آبرو کی، انعام و اکرام اور پشنٹ جاگیر سے نہال کر دیا ہے۔ ترقی عمدہ اور افزونی مراتب سے سرفراز کیا ہے۔ پھر کیا یہ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان نازاں ہوں اور اپنی گورنمنٹ کے شکر گزار اور ثنا خواں رہیں؟“ ۱۸

۱۷ مچلی نے ڈھیل پاٹی ہے، لقمے یہ شاد ہے
صیت و مطمئن ہے کہ کاٹنا نکل گئی

کاسر لسی کا اولین ریکارڈ دیکھنا ہو تو انگلش گورنمنٹ کی قصیدہ خوانی سرسید احمد خاں صاحب کی زبانی سنیے اور مسٹر غلام احمد پرویز کو بھی سنائیے کیونکہ موصوف کی نظروں میں پاکستان کا حقیقی بانی سرسید تھا۔ انگریز کی چمچ گیری پر مسلمانوں کو مجبور کرنے والا، مسلمانوں کا دینی وجود ختم کر کے انہیں زبانی مسلمان اور انگریزوں کا سائیس، کلرک اور دربان بنارہا تھا یا پاکستان؟

غیر منطقی قصیدہ ملاحظہ ہو :

”اُن (سر سید) کی نہایت نچرے رائے تھی کہ ہندوستان کے لیے انگلش گورنمنٹ سے بہتر، گو کہ اُس میں کچھ نقص بھی ہوں، کوئی گورنمنٹ نہیں ہو سکتی اور اگر امن و امان کے ساتھ ہندوستان کچھ ترقی کر سکتا ہے تو انگلش گورنمنٹ ہی کے ماتحت رہ کر کر سکتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ گو ہندوستان کی حکومت کرنے میں انگریزوں کو متعدد دلڑائیاں لڑنی پڑی ہوں مگر درحقیقت نہ انھوں نے یہاں کی حکومت بہ زور حاصل کی اور نہ مکرو فریب سے، بلکہ درحقیقت ہندوستان کو کسی حاکم کی اصلی معنوں میں ضرورت تھی، سو اسی ضرورت نے ہندوستان کو اُن کا محکوم بنا دیا“ لے

۷ کشتی دل کی الٹی بحرِ ہستی میں ہو خیر

نا خدا ملتے ہیں لیکن با خدا ملنا نہیں

میں حیران ہوں کہ برٹش گورنمنٹ کی چالو سی اور ملت فروشی میں سر سید احمد خاں کو ازل نمبر قرار دوں یا مولوی محمد حسین بٹالوی کو ؟ لیکن میں فیصلہ کرنے والا کون ؟ اس امر کا فیصلہ تو خود قارئینِ کرام نے کرنا ہے۔ اس سلسلے میں کیوں نہ موصوف کا ایک بستی فتویٰ بھی پیش کر دیا جاتے :

”مسلمان انگریزی گورنمنٹ کی رعایا اور متما من ہیں اور اپنے فرائض مذہبی

بلا مزاحمت ادا کرتے ہیں۔ وہ شریعت اسلامیہ کی رو سے بمقابلہ انگریزوں

کے نہ جہاد کر سکتے ہیں، نہ بغاوت، نہ کسی قسم کا فساد“ لے

چونکہ متحدہ ہندوستان میں وہابیت کو نجد سے درآمد کرنا، خود انگریزی حکومت کا کارنامہ تھا اور وہی اس کی سرپرست تھی۔ سر سید احمد خاں صاحب اس نوازش کا شکریہ یوں ادا کرتے ہیں :

لے الطاف حسین حالی : حیات جاوید، ص ۶۸۲

لے ایضاً : ص ۲۳۳

”وہابی جس آزادی مذہب سے انگلش گورنمنٹ کے سائڈ عافیت میں رہتے ہیں،
دوسری جگہ ان کو میسر نہیں ہے۔ ہندوستان ان وہابیوں کے لیے دارالامن
ہے۔“ ۱

اسی سلسلے میں موصوف کا اس سے بھی واضح ایک بیان اور ملاحظہ فرمایا جائے:
”انگلش گورنمنٹ ہندوستان میں خود اس فرقہ کے لیے جو وہابی کہلاتا ہے،
ایک رحمت ہے (جو ۱۹۴۷ء میں وہابیوں کو روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اتر)
جس طرح ہندوستان میں کل مذہب کے لوگوں کو کامل آزادی ہے، جو سلطنتیں
اسلامی کہلاتی ہیں، اُن میں بھی وہابیوں کو ایسی آزادی مذہب ملنا مشکل بلکہ
ناممکن ہے۔ سلطان کی عملداری میں وہابی کا رہنا مشکل ہے۔“ ۲

کیوں صاحبو! چودہ طبق روشن ہوئے یا نہیں؟ مسلمان بادشاہ کی حکومت میں آخر وہابی کا
رہنا مشکل کیوں ہے اور یہ حضرات انگریزی عملداری کو اپنے لیے رحمت اور دارالامن سمجھنے اور
لکھنے پر کیوں مجبور ہیں؟ کہیں یہ سب کچھ برٹش گورنمنٹ ہی کے دم قدم کی بہار تو نہیں ہے؟ اس کے
باوجود اسلام کے ٹھیکیدار بننا، اپنے لیے متحد ہونے کا دعویٰ کرنا اور سچے مسلمانوں کو مشرک،
بدعتی اور بریلوی فرقہ گننا، یہ کیا ستم ہے؟

۳ وہ شیفتہ کو دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا بتاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

موصوف نے وہابیوں کا برٹش گورنمنٹ کے متعلق نظریہ اور اُن کی انگریز دوستی کو
واضح لفظوں میں بیان کرتے ہوئے اس امر کی کوشش کی ہے کہ جنگ آزادی، ۱۸۵۷ء میں
حصہ لینے کی وہابیوں پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ نری الزام تراشی ہے۔ موصوف کے اپنے
الفاظ ملاحظہ ہوں :

۱۔ محمد اسماعیل پانی پتی: مقالات سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور، ص ۲۱۲

۲۔ ایضاً: ص ۲۱۲

”وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو اور اُس کا اسلام ہو اُسے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو۔ اُس کو یہ کہنا کہ وہ پردہ تخریب سلطنت کی فکر میں چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور غدر اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے، محض تہمت ہے اور ہم اس وقت بہت سے ایسے آدمی نشان دے سکتے ہیں جو سرکار کے ایسے ملازم ہیں کہ اُن سے زیادہ سرکار کا خیر خواہ اور معتمد کوئی نہیں، بایں ہمہ وہ اپنے نہیں علی الاطلاق اور بے نال فخریہ طور پر وہابی کہتے ہیں۔ سرکار نے بے سوچے سمجھے اُن کو معتمد نہیں گردانا۔ بلکہ غدر کے زمانے میں جبکہ قسطنطنیہ کی آگ ہر طرف مشتعل تھی، اُن کی وفاداری کا سونا اچھی طرح تایا گیا اور وہ خیر خواہی سرکار میں ثابت قدم رہے۔ اگر وہ جہاد کا وعظ کتے ہوتے اور بغاوت وہابیوں کی اصل ہوتی تو جو کچھ اُن سے ظہور میں آیا، یہ کیونکر طور میں آتا؟“ لے

شاید اکبر الہ آبادی نے اسی روش کو دیکھ کر یہ شعر فرمادیا تھا:

مٹاتے ہیں جو وہ ہم کو تو اپنا کام کرتے ہیں
مجھے حیرت تو اُن پر ہے، جو اس ٹٹنے پر مکتے ہیں

سید احمد خاں صاحب پر حکومت کو بڑا اعتماد تھا، بڑے سے بڑا انگریز انہیں قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا، کسی وقت بھی اُن کی جعفر بنگال اور صادق دکن سے کم عزت نہیں کی جاتی تھی۔ اس لایابی اور اثر و رسوخ کو کس طرح حاصل کیا گیا تھا؟ موصوف کے سوانح نگار خواجہ الطاف حسین حالی کی زبانی سنئے:

”لیکن اگر فرض کر لیا جائے کہ سرسید کی تمام کامیابیوں کا مدار اسی رسوخ اور اعتبار پر تھا، تو بھی اصل سبب اُن کی راست بازی اور سچائی ٹھیرے گی، کیونکہ برٹش گورنمنٹ میں ایک نیٹو (NATIVE) کا اس قدر رسوخ و اعتبار پیدا کرنا، جب تک اُس کی وفاداری اور خلوص کا سونا سخت امتحان کی آگ پر

”نایاب گیا ہو، ہرگز ممکن نہیں۔“

سرسید احمد خاں صاحب لندن گئے۔ کس کس سے ملے اور کون کون سی ہستیاں اُن سے آکر ملیں، ملاحظہ فرمائیے :

”الغرض سرسید بمبئی سے چوبیس دن میں لندن پہنچے اور میکین برگ اسکواڑ میں ایک مکان کرایے پر لے کر ٹھہرے اور اپنے دوستوں اور آشناؤں سے ملے۔ لارڈ لارنس سب سے زیادہ مہربانی، مروت اور خلق سے اُن کے ساتھ پیش آئے۔ وہ ہندوستان میں سرسید اور اُن کے خاندان کو اچھی طرح جانتے تھے اور اُن کی خدمات سے آگاہ تھے۔ لندن میں وہ (لارڈ لارنس) اکثر اُن (سرسید) کو اپنے گھر ڈز پر بلاتے تھے اور مینے میں ایک بار ہمیشہ اُن سے ملنے کو آتے تھے۔ اُنھوں نے ہی سرسید کو لندن کے اکثر امرا و مشاہیر سے ملوایا تھا۔ لارڈ اسٹیلی آف ایڈرلی جو قسطنطنیہ میں بطور سفیر انگریزی کے رہتے تھے وہ بھی جب لندن میں آتے تھے تو سرسید سے ملنے رہتے تھے۔ ہرجان ولیم کے انڈر سیکریٹری وزیر ہند کے ساتھ بھی سرسید کو خصوصیت ہوگئی تھی بلکہ معظمہ کے سدھی ڈپوک آف آرگائل جو اُس وقت وزیر ہند تھے اور سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ کے پیڑن بھی تھے، وہ بھی سرسید سے بڑے اخلاق اور تپا سے ملنے رہتے اور اپنے بیٹے مارکوس آف لارن سے بھی، جو ملکہ معظمہ کے داماد ہیں، اُن کو بلایا۔“

اسی دورہ لندن کے مزید حالات و کمالات ملاحظہ ہوں :

”سرسید نے پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا اور شب و روز اُن کاموں میں جن کے لیے یہ سفر اختیار کیا تھا، مصروف رہے۔ بایں ہمہ اُن کو اکثر خاص تقریروں میں بلایا جاتا تھا اور ان کی عزت افزائی کی جاتی تھی۔ ۲۳ جون ۱۸۶۹ء کو

وہ لارڈ لارنس کے ہاں ایک بہت بڑے ڈنر پر بلائے گئے اور ۱۳ جولائی کو سٹونین سو سائٹی آف سول انجینئرس کے ایک عظیم الشان جلسے میں اور اس کے بعد جو اسی کے متعلق گریپس میں ڈنر ہوا، اس میں شریک ہوئے۔

اس جلسے کی کیفیت ڈیلی نیوز (DAILY NEWS) مورخہ ۲۱ جولائی میں مفصل درج ہوئی تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسٹر پن نے جو سو سائٹی مذکور کے پریسیڈنٹ تھے سرسید کو اس جلسے میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا تھا اور لکھا تھا کہ آپ وقت معین پر میرے اسٹیمر میں، جو پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے موجود ہوگا، آئیں، مگر خود لارڈ لارنس سرسید کے مکان پر آتے اور ان کو اپنے ساتھ سوار کر کے لے گئے۔ سید حامد اور سید محمود بھی ساتھ تھے۔ اسٹیمر میں جا کر حاضری کھائی اور اسٹیمر کے کنارے پر جو بڑے بڑے کارخانے تھے دیکھے، پھر خاص اجازت سے ایک جنگی جہاز اور اس میں توپیں بھرنے اور چلانے کا تماشا دیکھا۔ وہاں سے گریپس میں جا کر ڈنر کھایا۔ اس ڈنر میں کئی ڈیوک اور بہت سے لارڈ اور بڑے بڑے انجینئر شریک ہوئے۔ کھانے میں طرفہ بات کہ ڈنر مذکور کی مینیو میں مندرج ہے، یہ تھی کہ تین طرح کے کھانے صرف دریائی پیداوار اور دریائی جانوروں سے تیار کیے ہوئے تھے (وہ دریائی جانور حلال ہیں یا حرام؟) خشکی کی پیداوار سے کوئی چیز میز پر نہ تھی۔ تمام انجینئروں نے جو اس جلسے میں شریک تھے، کھانے کے بعد اسٹیج پر دیں، اور سال گزشتہ کی مختلف ترقیات کا جو انجینئرنگ میں ہوئیں دکھایا۔ سب کے بعد پریسیڈنٹ نے اسپچ دی اور آخر میں لارڈ لارنس اور سرسید کا ذکر کر کے ان کے شامل ہونے پر فخر ظاہر کیا۔

۷ گردن ریفارمر کی ہر اک سمت تن گئی

بگڑی ہے قوم و ملک کی، ان کی تو بن گئی

سرسید انگریزوں کی نظر میں کیا تھے۔ یہ قارئین نے ملاحظہ فرمایا کہ صرف برٹش گورنمنٹ ہند کے اراکین و عمائد ہی انھیں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھتے تھے بلکہ حکومتِ برطانیہ کی عظیم ہستیاں بھی انھیں سرانگھوں پر بٹھاتی تھیں، آخر کیوں؟ اس سوال کا جواب خود تلاش کریں۔

اس ضمن میں احقر اتنا عرض ضرور کرے گا کہ غلام ہزار دفعہ یہ کہے کہ میں اپنے آقا کا دل و جان سے خیر خواہ اور وفادار ہوں اور اپنے قول کی عملاً ساری عمر تصدیق بھی کرتا رہے، یہ اُس کی انتہائی فرماں برداری اور نمک حلال غلام ہونے کی دلیل ضرور ہے لیکن اگر آقا اپنے غلام کی اطاعت شعاری، فرماں برداری و جہاں نشاری کا اعتراف کرے، خود اُس غلام کی شناختی کرنے لگ جاتے تو یہ اُس کی سب سے بڑی اطاعت شعاری کی دلیل ہی نہیں بلکہ فرمانبرداری کے نام پر پرستش کی حدود تک یہ جذبہ عقیدت و وابستگی، اُسے لے گیا ہوتا ہے۔ موصوف کے بارے میں ایک بیان ایسا بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ سوشل کمشنر اورنج، مسٹر کری کرافٹ پکن نے سرسید احمد خاں صاحب کے کارناموں کے پیش نظر شہر میرٹھ (یو۔ پی) میں موصوف کو مخاطب کر کے واشگاف الفاظ میں علی رؤس الاشہاد کہا تھا:

”تم (سرسید) ایسے نمک حلال نوکر ہو کہ ایسے نازک وقت (۱۸۵۷ء) میں تم نے سرکار کا ساتھ نہیں چھوڑا..... سرکار نے بھی تم کو اپنا خیر خواہ اور نمک حلال نوکر جان کر کمال اعتماد کے ساتھ ضلع بجنور کی حکومت تم کو سپرد کی اور تم اُسی طرح نمک حلال اور وفادار سرکار کے رہے۔ اس کے صلے میں اگر تمھاری ایک تصویر بنا کر پشتِ پالشت کی یادگاری اور تمھاری اولاد کی عزت اور فخر کے لیے رکھی جاتے تو بھی کم ہے۔“

۷۔ بوزنہ کو رقص پر کس بات کی یں داد دوں

ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارک باد دوں

۱۵۔ علامہ شبلی نعمانی

شبلی نعمانی (المتوفی ۱۳۳۲ھ / ۱۹۱۴ء) سولہ سال علی گڑھ کالج میں رہے۔ ندوۃ العلماء کے بانیوں میں سے تھے۔ ۱۸۹۴ء میں موصوف کو برٹش گورنمنٹ کی طرف سے شمس العلماء کا خطاب ملا۔ ان کے متعلق شیخ محمد اکرام کی یہ تصریح موصوف کو سمجھنے میں کافی حد تک مددگار ثابت ہوگی:

”شبلی قریباً سولہ سال علی گڑھ میں ملازم رہے۔ یہیں انھوں نے آرنلڈ سے فرانسیسی زبان سیکھی اور مستشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی اور یہیں سرسید کی بااثر شخصیت نے ان کی قلبِ ماہیت کی۔ بقول مولانا مہدی حسن‘ شبلی نے مولویت علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات کی کاپیائٹ، مذاقِ تصنیف اور وسیع النظری، غرض یہ جو کچھ ہوتے سرسید کے دامنِ تربیت کا اثر تھا۔ شبلی نے المامون کا دوسرا ایڈیشن جب شائع کیا ہے تو سرسید نے جس خلوص کے ساتھ اس پر دیباچہ لکھا، وہ آج بھی ان کی ادبی شرافت کا پتہ دیتا ہے۔“

برٹش گورنمنٹ کے بارے میں شبلی نعمانی کے نظریات کیا تھے، موصوف کے لفظوں میں یہی ملاحظہ فرمائیے:

”میں (شبلی) مدتِ العمر کبھی انگریز گورنمنٹ کا بدخواہ نہیں رہا ہوں۔ میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان یکانگت بڑھے اور ایک دوسرے کی طرف سے (یعنی ہندوستان کے رہنے والوں اور انگریزوں کی طرف سے) جو غلط فہمیاں مدتِ دراز سے چلی آتی ہیں، دور ہوں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ ۱۹۰۸ء میں، میں نے ”الندوہ“ میں ایک مستقل مضمون کے ذریعے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر انگریزی حکومت کی اطاعت و وفاداری مذہباً

فرض ہے۔“ لہ

شبلی نعمانی نے اپنی وفات سے پہلے ایک طویل عرضداشت، عبدالماجد دریابادی سے لکھوا کر حکومت صوبجات متحدہ آگرہ واودھ (یو۔ پی) کے چیف سیکرٹری کی خدمت میں پیش کی تھی۔ مذکورہ بالا عبارت اُسی عرضداشت کا ایک اقتباس ہے۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے شبلی نامہ کے علاوہ اپنی مشہور و معروف تصنیف ”موجِ کوثر“ میں بھی یہ اقتباس نقل کیا ہے، لیکن موجِ کوثر میں اس عبارت کے آخر میں یہ الفاظ بھی ہیں :

”اور اُسی سال (۱۹۰۸ء) ندوہ کے سالانہ جلسے میں وفاداری کا (برٹش گورنمنٹ کے وفادار رہنے کا) ایک ریزولیشن بھی پاس کروایا، پھر معاملہ مولوی عبدالکریم میں، محض اس جرم پر کہ میں نے اپنے ضمیر کے مطابق ایک باغیانہ (برٹش گورنمنٹ کے خلاف) مضمون کی اشاعت بند کی، اخبارات میں گالیاں سننا پڑیں۔“ لہ

۱۶۔ الطاف حسین حالی

موصوف ۱۸۳۷ء میں پانی پت کے محلہ انصاریاں میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۶ء میں حصار کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازمت مل گئی لیکن ۱۸۵۷ء میں ملازمت چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ۱۸۶۳ء سے ۱۸۷۰ء تک نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بچوں کو پڑھانے پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد پنجاب کے لیفٹننٹ گورنر کے میرنشی یعنی پیارے لال آشوب کی سفارش پر ”گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو“ لاہور میں مترجمہ کتابوں کی اردو عبارت درست کرنے کے لیے ملازم رکھ لیے گئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ”اینگلو بک سکول دہلی“ میں بھی ملازمت کی۔ ۱۸۸۸ء سے سرسید احمد خاں کی سفارش پر پچھتر روپے ماہوار وظیفہ ملا شروع ہو گیا، جو بعد میں سو روپے ماہوار کر دیا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں

لہ محمد اکرام شیخ : شبلی نامہ، ص ۲۴۵

لہ محمد اکرام شیخ : موجِ کوثر، ص ۲۲۴

گورنمنٹ نے شمس العلماء کا خطاب بخش دیا۔ ۱۹۱۴ء میں موصوف کا انتقال ہوا۔

موصوف بھی نیچریت کے حامی اور سرسید احمد خاں کی برطانوی گاڑی کو ہانکنے میں مددگار تھے۔ اپنی شاعری کے ذریعے نیچری مذہب کو پھیلانے، مسلمانان ہند کو گورنمنٹ برطانیہ کا وفادار اور بندہ بے دام و ثنا خواں بنانے میں پورا زور لگاتے رہے۔ انگریز قوم اور مغربی تعلیم و تہذیب کی صفت و ثنائیاں کرتے ہوئے موصوف کی عمر دراز بھی انتہائی مختصر ثابت ہوئی ورنہ شاید معاملہ کہاں سے کہاں جا پہنچتا۔ سرسید احمد خاں کے حکم سے آپ نے ایک معرکے کی نظم لکھی جو ”مسدس حالی“ کے نام سے مشہور اور ان کے مرشد جسے مرایہ افتخار شمار کیا کرتے تھے۔

خواجہ الطاف حسین حالی نے اس مسدس میں انگریزوں کو فروع انسان سے زالی مخلوق، دیوتا، معجزناہستیاں، مالک خزان، غیب دان اور بہت کچھ مانا اور دوسروں کو ایسا ہی ماننے کی یوں ترغیب دی ہے،

جنہوں نے بنایا اسے اپنا یا اور ہر اک راہ میں اس کو ٹھہرایا رہبر
یہ قول آجکل صادق آتا ہے اُن پر کہ اک نوع ہے نوع انساں بہتر

الگ سب سے کام اُن کے اور طور ہیں کچھ
اگر سب میں انساں، تو وہ اور ہیں کچھ

بہت اُن کو معجز نما جانتے ہیں بہت دیوتا اُن کو گردانتے ہیں
یہ جو ٹھیک ٹھیک اُن کو پہچانتے ہیں وہ اتنا مقدر نہیں مانتے ہیں

کہ دنیا نے جو کی تھی اب تک کماٹی
وہ سب جزو و کل اُن کے حصہ میں آئی

کیا علم نے اُن کو ہر فن میں یکتا نہ ہمسر رہا کوئی اُن کا نہ ہمتا
ہر اک چیز اُن کی، ہر اک کام اُن کا سمجھ بوجھ سے ہے زمانہ کی بالا

صنائع کو سب اُن کی تکتے ہیں ایسے

عجائب میں قدرت کے حیراں ہوں جیسے

دے علم نے کھول اُن پر خزانے چھپے اور ظاہر، نئے اور پرانے

دکھائے انھیں غیب کے کُل خزانے بنائے فتوحات کے سب ٹھکانے

ہوا جیسے چھائی ہے سب بحسہ و بر پر

وہ یوں چھا گئے خیر و باختر پر

انگریزوں نے مسلمانوں سے حکومت چینی، اُن کے دین میں تخریب کاری کی، اُن کی وحدت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا، دولت و عزت سب کچھ اُن سے چھین لیا اور ہزار کروڑوں اور جبر و استبداد سے انھیں اپنا غلام بنالیا۔ وہ ہر وقت اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے کہ کسی طرح ان غیر ملکی ڈاکوؤں کی غلامی کا جوا اتار کر پھینک دیں، آزادی کی فضا میں سانس لیں اور جلد از جلد غلامی کی لغت سے نجات حاصل کر لیں۔ لیکن انگریزوں کے زرخیز حضرات مسلمانوں کو یہی تبلیغ کیا کرتے تھے کہ یہ غلامی تو ہماری اپنی غلامی ہے، ہم غلام کہاں ہیں؟ ہمیں تو ہر قسم کی آزادی ملی ہوئی ہے، ہمیں ہر طرح کا آرام نصیب ہے اور ہمیں ترقی کرنے کے حکومت نے پورے پورے مواقع فراہم کیے ہوئے ہیں، لہذا خاموشی اور شکر گزاری کے ساتھ اُن مراعات سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور گورنمنٹ کی بدخواہی کا دل میں خیال بھی نہیں لانا چاہیے۔ حالی نے بھی یوں تلقین کی ہے:

حکومت نے آزادیاں تم کو دی ہیں ترقی کی راہیں سدا سر کھلی ہیں

صدائیں یہ ہر سمت سے آرہی ہیں کہ راجا سے پر جات تک سب سُن سکی ہیں

تسلط ہے ملکوں میں امن و اماں کا

نہیں بند رستہ کسی کارواں کا

نہ بدخواہ ہے دین و ایماں کا کوئی نہ دشمن حدیث اور قرآن کا کوئی

نہ ناقص ہے ملت کے ارکان کا کوئی نہ مانع شریعت کے فرماں کا کوئی

نمازیں پڑھو بے خطر معبدوں میں

اذا نہیں دھڑاکے سے دو مسجدوں میں

کھلی میں سفر اور تجارت کی راہیں نہیں بند صنعت کی، حرفت کی راہیں
جو روشن ہیں تحصیلِ حکمت کی راہیں تو ہموار ہیں کسبِ دولت کی راہیں

نہ گھر میں غنیم اور نہ دشمن کا کھٹکا

نہ باہر ہے قزاق و رہزن کا کھٹکا

مہینوں کے کٹتے ہیں رستے پلوں میں گھروں سے سواچیں ہے منزلوں میں

ہر اک گوشہ گلزار ہے جنگلوں میں شب و روز ہے ایمنی قافلوں میں

سفر جو کبھی تھا نمونہ سعت کا

وسیلہ ہے وہ اب سراسر ظفر کا

پہنچتی ہیں ملکوں میں دم دم کی خبریں چلی آتی ہیں شادی و غم کی خبریں

عیاں میں ہر اک بڑا عظم کی خبریں کھلی ہیں زمانہ پہ عالم کی خبریں

نہیں واقعہ کوئی پنہاں کہیں کا

ہے آئینہ احوال روئے زمیں کا

کہ و قدر اس امن و آزادگی کی کہ ہے صاف ہر سمت راہِ ترقی

ہر اک راہ رو کا زمانہ ہے ساتھی یہ ہر سو سے آوازِ پیہم ہے آتی

کہ دشمن کا کھٹکا نہ دہزن کا ڈر ہے

نکل جاؤ رستہ ابھی بے خبر ہے

مسلمانوں کو از روئے احادیث کفار کے تشبہ سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ اسلامی غیرت کا تقاضا یہی

ہے کہ وہ اپنے روش پر پکے رہیں اور خدا کے دشمنوں کے کسی طرح بھی مشابہ ہونے کی کوشش نہ

کریں۔ انگریز دوستی میں اس مخالفت کا شاعر نیچریت اور قوم کی غمخواری کا دم بھرنے والے نے

یوں مذاق اڑایا ہے :

ہیں واعظوں نے یہ تعلیم دی ہے کہ جو کام دینی ہے یا دنیوی ہے

مخالف کی ریس اُس میں کرنی بُری ہے نشانِ غیرتِ دینِ حق کا یہی ہے
نہ ٹھیک اُن کی ہرگز کوئی بات سمجھو

وہ دن کو کسے دن تو تم رات سمجھو

قدم گر رہِ راست پر اُن کا پاؤ تو تم سیدھے رستہ سے کترا کے جاؤ
پڑیں اُس میں جو دقتیں وہ اٹھاؤ لیکن ٹھو کریں جس قدر اُس میں کھاؤ

جو نکلے جہاز اُن کا بچ کر جھنور سے

تو تم ڈال دو ناؤ اندر جھنور کے

اگر مسخ ہو جائے صورت تمھاری بہائم میں مل جائے ریت تمھاری
بدل جائے بالکل طبیعت تمھاری سراسر بگڑ جائے حالت تمھاری

تو سمجھو کہ ہے حق کی اک شان یہ بھی

ہے اک جلوہ نورِ ایمان یہ بھی

نہ اوضاع میں تم سے نسبت کسی کو نہ اخلاق میں تم سے سہولت کسی کو
نہ حاصل یہ کھانوں میں لذت کسی کو نہ پیدا یہ پوشش نہ زینت کسی کو

تمہیں فضلِ ہر علم میں بر ملا ہے

تمھاری جہالت میں بھی اک ادا ہے

کوئی چیز سمجھو نہ اپنی بُری تم رہو بات کو اپنی کرتے بڑی تم
حمایت میں ہو جبکہ اسلام کی تم تو ہو ہر بدی اور گتہ سے بُری تم

بدی سے نہیں مومنوں کو مفسرت

تمھارے گناہ اور اُوروں کی طاعت

مخالف کا اپنے اگر نام لیجے تو ذکر اُس کا ذلت سے خوار کیجے
کبھی بھول کر طرح اُس کو نہ دیکھے قیامت کو دیکھو گے اس کے نتیجے

گناہوں سے ہوتے ہو گویا مُبرا

مخالف پہ کرتے ہو جب تم تبرّا

سائنس کی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن حقیقی علم اسی کو ٹھہرانا اور اسے
برایہ فخر انسان بنانا، ان حضرات کا کام تو ہو سکتا ہے جنہیں آخرت پر یقین ہی نہ ہو یا جو
عزت کی حقیقی زندگی پر اس چند روزہ دنیاوی زندگی کو ترجیح دینا ہی بہتر سمجھتے ہوں۔ سائنس
کے بارے میں موصوف کے نظریات ملاحظہ ہوں :

ہمیشہ سے جو کہتے آئے ہیں سبیاں کہ ہے علم سرمایہ فخرِ انساں
عرب اور عجم، ہند اور مصر و یوناں رہا اتفاق اس پہ قوموں کا یکساں
یہ دعویٰ تھا اک جس پہ حجت نہ تھی کچھ
گھلی اس پہ اب تک شہادت نہ تھی کچھ

جواہر تھے اک سب کی نظروں میں بھاری پرکھنے کی جس کے نہ آئی تھی باری
فضائل تھے سب علم کے اعتباری نہ تھیں طاقتیں اس کی معلوم ساری
یہ اب بحر و بر دے رہے ہیں گواہی
کہ تھا علم میں زورِ دستِ الہی

کیا کو ہساروں کو مسمار اس نے بنایا سمندر کو بازار اس نے
زمینوں کو منوا یا دوار اس نے ثوابت کو ٹھہرایا ستیار اس نے
لیا جہاں سے کام لشکر کشی کا
دیا پتلیوں کو سکت آدمی کا

یہ پتھر کا ایندھن ہے جلوانے والا جہازوں کو خشکی میں چلوانے والا
صدائوں کو سانچے میں ڈھلوانے والا زمین کے خزانے اگلوانے والا

یہی برق کو نامہ بر ہے بناتا
بھی آدمی کو ہے بے پر اڑاتا

تمدن کے ایوان کا معمار ہے یہ ترقی کے لشکر کا سالار ہے یہ
کہیں دستکاروں کا اوزار ہے یہ کہیں جنگجوؤں کا ہتھیار ہے یہ

دکھایا ہے نیچا دلیروں کو اس نے
بنایا ہے روبہا ثبیوں کو اس نے

اسی کی ہے اب چار سُو حکمرانی
ہوتے رام دیوان ماثند رانی
جیکے اس نے زیر ارمنی اور یمانی
گئے زاہلی مَجُول سب پہلوانی

ہوا اس کی طاقت سے تسخیر عالم

پڑے سامنے اس کے چرکس نہ ویلم لہ

حالی صاحب انگریزوں پر ایسے ایمان لائے تھے کہ اُن کی ہر چیز سے پیارا اور والہانہ لگا
ہو گیا مختار موصوف کے نزدیک مغربی علوم و فنون ہی حق کا جلوہ ہیں، گویا دوسرے باطل کا اندھیرا
ہوتے، چنانچہ فرماتے ہیں :

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے

تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پڑے کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے

جی ہیں دلوں میں ارسطو کی رائیں

جواب دجی اُترے تو ایساں نہ لائیں لہ

۱۷۔ مولوی رشید احمد گنگوہی

آپ ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرستوں اور حاجی
امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے مریدوں سے تھے۔ وہابیوں کی جماعت میں سے جب شاہ
محمد اسحاق دہلوی خلیفہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے گول مول اور مخصوص خیالات
سے اتفاق رکھنے والوں کی جماعت بنی اور دیوبندی مکتب فکر کے نام سے روشناس ہوئی،
تو اُس قافلے کے مولوی رشید احمد گنگوہی ہی قافلہ سالار قرار پائے۔ حاجی امداد اللہ مہاجر
مکی رحمۃ اللہ علیہ کے دیگر نامور خلفاء نے گنگوہی صاحب اور اُن کے ہم خیال علمائے دیوبند کا
تعاقب کیا کہ یہ حضرات اپنے اکابر اور پیرومرشد کے طریقے کے خلاف جا رہے تھے۔

جب اس قضیہ کی خبر حاجی امداد اللہ مہاجر کی رحمۃ اللہ علیہ کو ملی تو اپنے متعلقین کو سمجھانے کی غرض سے، جن مسائل میں ان حضرات کا نزاع تھا، اُن کے بارے میں اپنے نظریات و معمولات کلمہ کر فیصلہ ہفت مسئلہ کے نام سے موصوف کے پاس اُس کی کاپیاں بھیج دیں۔ گنگوہی صاحب نے اپنے پیر کے فیصلے کی یہ قدر کی کہ اپنے ایک شاگرد (خواجہ حسن نظامی دہلوی) کو اُن تمام کاپیوں کو جملانے کا حکم صادر فرمایا۔

فقہ حنفی کے پیروکار ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود موصوف نے اپنے تحکم سے اس میں ایسی تراش خراش فرمائی اور غور و جرح زمانہ کے نظریات داخل کیے کہ ابنائے زمانہ کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی تقدیس باری تعالیٰ شانہ کو داغدار ٹھہرانے کی غرض سے امکان کذب کے ناپاک عقیدے کو وقوع کذب تک بڑھا دیا۔ شیطان لعین کو فخر دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھی اعلم و اوسع علماً ٹھہرا دیا اور علمبردارِ خارجیت، امام ابو ہبہ مولوی اسماعیل دہلوی کے تمام غیر اسلامی عقائد و نظریات کی کھل کر تصدیق و تائید کرتے رہے۔ ان کا وصال ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں ہوا۔

موصوف نے اپنے اکابر سے رشتہ توڑا، اپنے پیرو مشد سے تعلق چھوڑا، آخر ایسا کیوں کیا؟ کہیں یہ حکومت کی شبہ پر تو ڈرامہ نہ کھیلا گیا ہو، جس کی تخریب کاری کی مشین اندرونِ خانہ بڑی عیاری اور رازداری سے چل رہی تھی، کہیں مولوی ہایت احمد گنگوہی کے فرزند اور حاجی امداد اللہ مخاٹو فی علیہ الرحمہ کے مرید، مولوی رشید احمد گنگوہی ساحرینِ برطانیہ کے جادو کا شکار تو نہیں ہو گئے تھے۔ آئیے واقعات کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی شروع ہو چکی ہے۔ موصوف کے ہم خیال علماء نے اپنا ایک جھنڈا نکال کر لیا ہے۔ ہتھیار لگا کر باہر پھرتے ہیں۔ کسی سے لڑنے کے لیے پھرتے تھے، ہمیں کیا معلوم جبکہ قریباً سو اسو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آئیے موصوف کے سوانح نگار، اُن کے عاشقِ زار، مولوی عاشق الہی میرٹھی سے پوچھتے ہیں :

”ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی)

اپنے رفیقِ جانی مولانا قاسم العلوم (مولوی محمد قاسم نانوتوی) اور طبیبِ روحانی

اعلیٰ حضرت حاجی صاحب و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے اور بند و قچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزمائش تھا اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے والا یا ہٹ جانے والا نہ تھا، اس لیے اُٹل پہاڑ کی طرح پراجھا کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جانثاری کے لیے تیار ہو گیا۔ اللہ کے شجاعت و جواہر دی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جاتے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بند و قچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ (گنگوہی صاحب) پرفریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ زیرِ ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔

اب معلوم ہو گیا۔ مولوی عاشق الہی میرٹھی نے راز بتا دیا کہ گنگوہی صاحب نے اپنے اکابر اور اپنے پیر سے قلبی رشتہ کیوں توڑ لیا تھا؟ اس لیے کہ برٹش گورنمنٹ سے جانثاری و وفاداری کا عہد و پیمان جوڑا گیا تھا۔ یہ بات بالکل صاف اور سیدھی سادی ہے، جس پر کسی حاشیہ آرائی کی ضرورت نہیں، ادھوری عبارت یا سیاق و سباق سے توڑنے موڑنے کی تہمت نہیں، خود گنگوہی صاحب کے سوانح نگار اور نامور دیوبندی عالم کی شہادت ہے، مخالفانہ بیان بھی اسے نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ یہ بیان دینے والا عالم اہلسنت نہیں۔ یہ ناچیز اس امر کے فیصلے کا حق قارئین کے سپرد کرتا ہے کہ مذکورہ حوالے کی روشنی میں مولوی رشید احمد گنگوہی انگریزوں کے مخالف ثابت ہوتے ہیں یا برٹش گورنمنٹ کے دل و جان سے وفادار بلکہ جانثار نظر آ رہے ہیں؟

پروفیسر محمد ایوب قادری نے تذکرہ علمائے ہند اردو مطبوعہ کراچی کے صفحہ ۵۰، ۵۱ پر بلکہ متعدد کتب و رسائل میں اور ان کی دیکھا دیکھی موجودہ علمائے دیوبند نے یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا ہے کہ مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ نے، ۱۸۵۷ء میں شاملی کے مقام پر انگریزوں سے لڑائی لڑی تھی، لہذا اکابر علمائے دیوبند مجاہدین جنگ آزادی

اور انگریزوں کے مخالف ہیں۔ یعنی ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک تو علمائے دیوبند مسوائے گاندھوی علما کے باقی سب انگریزوں کے نہ صرف خیر خواہ و وفادار بن کر رہے بلکہ برٹش گورنمنٹ کے آلہ کار بن کر ملت اسلامیہ سے کٹ کر ایک نئے فرقے کا اضافہ اور کر بیٹھے نیز اسلامی عقائد میں غیر اسلامی عقائد و نظریات کی پیوند کاری کرتے رہے۔ اگر یہ حضرات انگریزوں کے آلہ کار نہ بن گئے ہوتے تو یہ سوادِ اعظمِ اہلسنت و جماعت سے کٹ کر اپنا فرقہ الگ کیوں بناتے نیز اہلسنت و جماعت کے متواتر مذہب کا اپریشن کیوں کرتے؛ لیکن اُدھر انگریز بستر گول کر کے راہی برطانیہ ہوئے اُدھر تڑے سال بعد ان حضرات نے اپنے اکابر کی تاریخ کو بدلتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہمارے رشید احمد گنگوہی اور محمد قاسم نانوتوی وغیرہ بزرگ تو انگریزوں کے مخالف اور ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہیرو تھے۔ تاریخ کا اس طرح مذاق اڑا کر اُسے بازچوہ اطفال بناتے اور حقیقت کا منہ چڑاتے وقت اگر دیوبندی علماء و مورخین کو خوفِ خدا یاد نہیں رہتا تو ایسا کرتے وقت کیا ان حضرات کو بدگمانِ خدا سے بھی کوئی شرم و عار محسوس نہیں ہوتی؛ کیا ان حضرات کی غلط بیانی سے حقیقت بدل جائے گی؛ کیا اس قسم کی حرکتیں ہی ان حضرات کا طریقہ امتیاز ہیں؟

تذکرۃ الرشید کے مولف بالاحوالے کو موجودہ دیوبندی عالم، مفتی عزیز الرحمن بجنوری نے یں بیان کیا ہے:

”جب پلٹن (انگریزی فوج) مع توپ خانہ باغ کے سامنے سے گزری تو سب نے یک دم فیر کیا۔ پلٹن گھبرا گئی کہ خدا جانے کس قدر آدمی ہوں، جو یہاں چھپے ہوئے ہیں، توپ خانہ چھوڑ کر سب بھاگ گئے۔ حضرت گنگوہی نے توپ خانہ کھینچ کر حضرت حاجی صاحب کے سامنے لا کر ڈال دیا۔ اس سے ان حضرات کی..... ہر قسم کی قابلیت کا سکہ بیٹھ گیا۔ شاملی اُس زمانہ میں مرکزی مقام تھا، ضلع سہارن پور سے متعلق تھا۔ وہاں تحصیل بھی تھی اور فوجی طاقت بھی وہاں رہتی تھی۔ قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا۔ جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں تھی، مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکہ میں شہید ہو گئے۔ حضرت حافظ ضامن صاحب کا

شہید ہونا تھا کہ معاملہ بالکل ٹھنڈا پڑ گیا۔ ۱

گویا واقعہ سب کے نزدیک وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک نوے سال تک یہ لڑائی حکومت کے مخالفین یعنی حریت پسندوں کے ساتھ بتائی جاتی رہی اور انگریز چلے گئے تو یہی لڑائی انگریزوں کے خلاف بتائی شروع کر دی۔ اگر ہم موجودہ حضرات کے موقف کو درست تسلیم کر بھی لیں تو پھر بھی یہ فیصلہ غلط ہی رہے گا، کیونکہ بعد کے واقعات اس موقف کی تائید کرنے سے یکسر مجبور ہیں۔ جب لڑائی کی آگ ٹھنڈی ہوئی، انگریز دوبارہ قابض دستا ہو گئے تو دارو گیر کا دور شروع ہو گیا۔

اس دور میں، خصوصاً مسلمانوں پر کیا قیامت ڈھائی گئی، اس کا تصور بھی لرزہ خیز ہے۔ اسی کتاب کے پہلے باب میں اس قیامت خیز منظر کی جھلک قارئین کرام دیکھ چکے ہیں۔ فزا سا شبہ سولی پر لٹکانے کے لیے کافی تھا، کسی انگریز کی اگر مدد نہ کرنے کا الزام عائد ہوا تب بھی دار پر کھینچ دینے سے کم سزا نہ تھی، کسی انگریز کی تعظیم نہ بجالاتے یا کھڑے ہو کر عاجزانہ سلام نہ کیا تو گولی کا نشانہ بناتے گئے۔ جن بستیوں کے چند افراد نے بھی انگریزوں سے لڑائی کی، اس انتقامی دور میں ان بستیوں کو سرے سے صاف ہی کر دیا گیا۔ اگر واقعی یہ علمائے دیوبند انگریزوں سے لڑے تھے تو سولی یا سزائے موت سے کم کے بغیر تو نہیں رہ سکتے تھے، لیکن بعد کے واقعات تو یہی بتاتے ہیں کہ ان حضرات میں سے کسی ایک کے پیر میں کانٹا تک بھی نہیں چھبوا گیا۔ اگر انگریزوں سے لڑے تھے تو انھیں کیوں چھوڑ دیا گیا تھا؟ آئیے موصوف کے سوانح نگار مولوی عاشق الہی میرٹھی سے مزید معلومات حاصل کرتے ہیں :

”شروع ۱۲۷۶ھ نبوی/ ۱۸۷۹ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی) قدس سرہ پر اپنی سرکار (برٹش گورنمنٹ) سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔“ ۲

۱۔ عزیز الرحمن بجنوری، تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۸۰۔

۲۔ عاشق الہی میرٹھی، مولوی، تذکرہ الرشید، جلد اول، مطبوعہ میرٹھ، ۱۹۰۵ء، ص ۳۳۔

اسی بات کو دوسری جگہ ذرا تفصیل سے موصوف نے یوں بیان کیا ہے :

”جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور ہم دل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور منجری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں، انھوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات (گنگوہی و نانوتوی صاحبان) پر بغاوت کا الزام لگایا۔“

مولوی رشید احمد گنگوہی کے رفیق جانی اور مدرسہ دیوبند کے بانی مولوی محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں مندرجہ ذیل پر لطف حکایت کا پیش کرنا، شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ یہ ہر عقلمند کو نبوت غور و فکر دے رہی ہے :

”جب مجاہد علماء کی پکڑ دکھلا شروع ہوئی تو آپ (مولوی محمد قاسم نانوتوی) کی گرفتاری کے بھی وارنٹ جاری ہوتے۔ خدام اور متوسلین کے بہت زیادہ اصرار پر آپ ایک مکان میں روپوش ہوتے اور تین دن کے بعد پھر کھلے بندوں چلنے پھرنے لگے۔ لوگوں نے پھر روپوشی کے لیے بمقت عرض کیا تو آپ نے انکار کر دیا اور فرمایا کہ تین دن سے زیادہ روپوش ہونا سنت سے ثابت نہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے وقت غارِ ثور میں تین دن ہی روپوش رہے ہیں۔“

اتباعِ سنت کی حقیقت تو خالقِ لغوہ سے لے کر انکارِ خاتمیت زما فی تکم معلوم ہے۔ امتِ محمدیہ کے مسلمہ عقیدہ ختمِ نبوت کا انکار کر کے ایک ایسی خاتمیت گھڑنے والے بھی تو یہی نانوتوی صاحب ہیں، جس کا نام سننے سے بھی تیو سو سال کے مسلمانوں کے کان نا آشنا رہے۔ کیلیک کا رنامہ بھی اتباعِ سنت میں دکھایا تھا، بہر حال اس سے قطع نظر، مولوی محمد قاسم

نانوتوی کی جو انگریزی و دلیری ہے کہ تین دن روپوش رہنے کے بعد وندنا تے پھرنے لگے اور اس سے بھی بڑھ کر حیرت انگیز یہ ادا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں مولوی رشید احمد گنگوہی پر اپنی رحمدل سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا۔ دیوبندی علماء و مؤرخین تو ان حضرات کو مجاہد بنا کر، الزام کا رونا رو کر، پھر قید و بند سے چھڑا کر مطمئن ہو گئے ہوں گے اور ان باغی مجاہدوں کے معرکوں پر ڈینگیں مارنے لگے ہوں گے لیکن ہم ان حضرات سے اتنا ضرور دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں جہاں آپ کے ان مجاہدوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف شاملی کی لڑائی لڑی، انگریزی پلٹنے سے توپ خانہ بھی چھین لیا، چلیے یونہی سہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان حضرات پر بدخواہوں نے، ۱۸۵۷ء میں بغاوت کی تہمت لگا کر گرفتار کر دیا، بھلا اب مجاہد ہونے اور انگریز دشمن کہلانے میں، کون ہے جو ان حضرات کے متعلق شک کر سکے گا؟ لیکن اتنا تو ازراہِ کرم بتا دیجیے کہ آپ کے یہ ۱۸۵۷ء کے مجاہد، حریت پسند، جنگ آزادی کے ہیرو، ۱۸۵۷ء سے آخر وقت تک انگریزوں کی نگاہوں میں کیا بن کر رہے تھے؟ دوست سمجھ گئے یا دشمن، مخالف گردانا گیا یا آلہ کار، سا لہا سال تک انگریزوں نے اتنا بھی نہ پوچھا کہ اسے شاملی کے مقام پر ہم سے لڑنے والو! اسے ہمارا توپ خانہ یکم چھین لینے والو! ہم سے لڑے کیوں تھے؟ ہمارا توپ خانہ کیوں چھینا تھا؟ کیا برٹش گورنمنٹ ان چند علماء دیوبند سے اتنی خائف و ہراساں اور لرزاں و ترساں تھی کہ سزا دینا تو بہت بڑی بات ہے، ان سے اپنا توپ خانہ واپس لینے کی اپیل یا عرض بھی ان کی خدمت میں نہ کر سکی؟ آخر کاوٹ کیا تھی؟

۷ اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو

کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم

ہزار چک پھیروں سے اپنے اکابر کو مجاہد اور انگریز دشمن ثابت کرنے کی کوششیں کرتے ہیں لیکن تیلی کے بیل کی طرح جہاں سے چلتے ہیں پھرو ہیں آپہنچتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی بات ایسی لکھ دیجیے کہ ساری کاوشوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ مولوی عزیز الرحمن بجنوری کی تحقیق ملاحظہ فرمائیے:

"حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام ربانی (مولوی رشید احمد گنگوہی)

اور حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کے وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔۔۔۔۔

آپ (گنگوہی صاحب) اپنی دادھبیل رام پور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی خبر سانی سے آپ وہاں حکیم ضیاء الدین کے مکان سے گرفتار کر لیے گئے۔ یہ زمانہ ۱۲۷۵ھ یا ۱۲۷۶ھ کا تھا۔ گرفتار کرنے کے بعد آپ کو سہارن پور جیل کی کال کوٹھری میں رکھا گیا اور حالات اور واقعات کی تفتیش ہوتی رہی، مقدمہ چلتا رہا۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کے پاس ہتھیار ہیں؟ آپ نے تسبیح دکھلا کر فرمایا، ”ہمارے پاس یہ ہتھیار ہے۔“ سہارن پور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کیا گیا۔ بالاخر جب گورنمنٹ کو ثبوت نہ مل سکا رہا کر دیا۔ ۱

باقی باتوں سے قطع نظر جب برٹش گورنمنٹ کو سعی بسیار کے باوجود اس امر کا کوئی پھوٹے سے چھوٹا ثبوت بھی مل سکا کہ مولوی رشید احمد گنگوہی حکومت کے بدخواہ ہیں یا ۱۸۷۵ء میں انھوں نے انگریزوں کے مفادات کے خلاف کوئی ادنیٰ اسی حرکت بھی کی تھی، تو موجودہ حضرات کو کون سے دلائل یا حقائق و شواہد کا کھوج مل گیا ہے جن کی بنا پر بلند بانگ دعاوی کر کے اپنی سابقہ تاریخ کو بدلنے کی جسارت کرتے اور اسی کو حقیقت منوانے پر تیلے ہوئے ہیں۔ کم از کم ان حضرات کو اپنے بزرگوں کا ادب کرنا چاہیے اور اپنے اکابر کو اپنی رحم دل گورنمنٹ کے باغیوں اور مفسدوں کی فہرست میں تو شامل کرنا چاہیے۔ ملاحظہ ہو برٹش گورنمنٹ کیا تھی:

”جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی انھوں نے کمپنی کے امن و عافیت کا زمانہ

قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحم دل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا۔ ۲

اپنے اکابر مولوی رشید احمد گنگوہی اور مولوی محمد قاسم نانوتوی وغیرہ کی موصوف نے یوں صفائی پیش کی ہے:

”جیسا کہ آپ حضرات اپنی مہربان سرکار کے دلی خیر خواہ تھے۔ تازلیست خیر خواہ ہی

ثابت رہے۔“ ۳

۱۔ لکھنؤ، المیزان، مجلہ ۱، مولوی: تذکرہ مشائخ دیوبند، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۱۱۷

۲۔ عاشق الہی میرٹھی، مولوی: تذکرۃ الرشید، جلد اول، ص ۷۳

۳۔ ایضاً، ص ۷۹

موصوف پرنس گوڈنٹ کے وفادار اور خیر خواہ تھے یا مفسدوں اور باغیوں میں شریک رہے تھے،
 اس امر کا فیصلہ تو تاریں کرام خود کریں گے۔ راقم الحروف تو اس سے آگے صرف یہی کر سکتا ہے کہ جملہ
 متبعین کے بیانات سے قطع نظر کر کے، خود علیجناب، معلی القاب، مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی
 (المتوفی ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کا ایک ذاتی بیان نقل کر دیتا ہے کہ موصوف کا خود اپنے بارے میں
 اپنا فیصلہ کیا ہے :

”میں جب (مولوی رشید احمد گنگوہی) حقیقت میں سرکار کا فرماں بردار ہوں تو
 جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکانہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مانگ ہے،
 اُسے اختیار ہے، جو چاہے کرے“۔ لے

ص مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری
 ہو سکتا ہے کسی صاحب کو یہ شبہ لاحق ہو جائے کہ ”تذکرۃ الرشید“ کتاب تاریخی لحاظ سے
 ناقابل اعتبار ہو یعنی دیوبندی حضرات کے نزدیک اُس کے مندرجات مسلمہ نہ ہوں یا اُسے تاریخی
 لحاظ سے کوئی اہمیت حاصل نہ ہو، لہذا ہم اِس کتاب پر ان حضرات کے مایہ ناز موزنوں کی
 مہر تصدیق ثبت کروادیتے ہیں، عبدالرشید ارشد فرماتے ہیں :

”میرے کانوں میں مولانا غلام رسول مہر کے بار بار کہے ہوئے یہ الفاظ گونج رہے
 ہیں کہ ”تذکرۃ الرشید بہت عمدہ کتاب ہے۔ اِس کو پڑھ کر بڑا دل خوش ہوتا ہے۔
 میں (غلام رسول مہر) نے سالک صاحب (عبدالمجید سالک) اور اپنے کئی دوسرے
 احباب کو یہ کتاب پڑھانی ہے۔ اِس کتاب کو پڑھ کر مولانا رشید احمد گنگوہی کی
 عظمت دلوں میں پیدا ہوتی ہے“۔ لے

۱۸۔ مولوی اشرف علی تھانوی

موصوف کی پیدائش ۱۲۸۰ھ/۱۸۶۳ء کو تھانہ جھون میں ہوئی۔ مولوی محمود الحسن دیوبندی کے خاص الخاص تلامذہ میں سے ہیں۔ مدرسہ دیوبند کی سرپرستی بھی کرتے رہے۔ اپنی جماعت کی گاندھیت میں مبنیائی کرنے سے الگ رہے۔ دیوبندی حضرات انھیں حکیم الامت اور مجددِ ملت کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔ موصوف نے اپنی مشہور تصنیف ”بہشتی زیور“ کے پہلے حصے میں اُن امور کی ایک فہرست پیش کی ہے جو اُن کے نزدیک کفر و شرک ہیں۔ اگر موصوف کی اس فہرست کو سامنے رکھا جائے تو کسی متنفذ کو بھی مسلمان ثابت نہ کیا جاسکے گا۔ اس کے علاوہ تھانوی صاحب نے اپنی بعض تصانیف میں چند عبارتیں ایسی بھی درج کی ہیں جن کی ایک مسلمان کہلانے والا ہرگز جرات اور جسارت نہیں کر سکتا۔ سرورِ کون و مکان، فخرِ دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ میں ایسے گندے الفاظ لکھنے کی تو اس سرکار کے بدترین دشمنوں اور کھلے کافروں کو بھی جرات نہ ہوئی تھی۔ اس کتاب میں اُن عبارتوں کا تفصیلی ذکر اپنے موقع و محل پر آئے گا (انشاء اللہ تعالیٰ)۔

موصوف نے ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء میں وفات پائی۔

یکم محرم ۱۳۶۵ھ مطابق ۷ دسمبر ۱۹۴۵ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی کے مکان پر سیاسی اختلاف کو رفع کرنے موصوف کو اپنا ہم خیال بنانے کی غرض سے سات گاندھوی علماء تشریف فرما ہوئے:

- ۱۔ مولوی حسین احمد ٹانڈوی صدرِ جمعیتہ العلماء ہند
- ۲۔ مفتی کفایت اللہ دہلوی سابق صدرِ جمعیتہ العلماء ہند
- ۳۔ مولوی احمد حسین سابق ناظم اعلیٰ جمعیتہ العلماء ہند
- ۴۔ مولوی حفیظ الرحمن سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیتہ العلماء ہند

۵۔ مولوی عبدالحلیم صدیقی

۶۔ مولوی عبدالحمنان

۷۔ مفتی عتیق الرحمن

ساتھ گھنٹے تک ان حضرات کی حالاتِ حاضرہ پر گفتگو رہی۔ اپنا اپنا موقف واضح کیا۔ بعض نفیہ

گوشتے بھی سامنے آئے، جو مولوی طاہر احمد قاسمی کے قلم سے مولوی شبیر احمد عثمانی کی تصدیق کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں۔ عثمانی صاحب نے فرمایا:

”دیکھئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے اور آپ کے مسلم بزرگ و پیشوا تھے، اُن کے متعلق بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ اُن کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا علم نہ تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ اُن کو اس کا شبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اُس کو یہ علم نہ ہو کہ اُسے استعمال کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اس میں مانع نہیں ہو سکتا۔“

ظاہر ہے کہ مولوی اشرف علی تھانوی کے متعلق یہ بیان دینے والے مشہور دیوبندی عالم ہیں اور دوسری طرف سننے والے ایسے سات دیوبندی علماء ہیں، جنہیں اُس جماعت کا خلاصہ کہا جاسکتا ہے۔ لیکن وہ اس بیان کی تردید میں ایک لفظ بھی اپنی زبانوں پر نہ لاسکے۔

مولوی حسین احمد ٹانڈوی ایک دفعہ حکومت کے زیرِ عقاب آئے، جیل خانے میں رہے، بعض لوگوں نے اس واقعے میں تھانوی صاحب کا ہاتھ بتانے کی کوشش کی اور مسلسل کان بھرتے رہے تھے۔ ترقوں بعد موصوف نے اپنے ایک خط میں لکھا:

”مولانا مرحوم (مولوی اشرف علی تھانوی) کے بھائی محکمہ سی۔ آئی۔ ڈی میں بڑے عہدیدار آخر تک رہے۔ اُن کا نام مظہر علی ہے۔ اُنہوں نے جو کچھ کیا ہو مستعجب نہیں۔“

یہ بیانات اگرچہ اپنی جگہ پر بالکل واضح ہیں لیکن ہم یہاں مولوی اشرف علی تھانوی کا ذاتی بیان، خود اُن کے اپنوں کی مرتبہ کتاب سے پیش کر کے اس سلسلے میں اتنا مہم جت کرنا چاہتے ہیں،

بیان ملاحظہ ہو:

”ایک شخص نے مجھ (مولوی اشرف علی تھانوی) سے دریافت کیا تھا کہ اگر تھاری حکومت ہو جائے تو انگریزوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرو گے؟ میں نے کہا: محکوم بنا کر رکھیں گے کیونکہ جب خدا نے حکومت دی تو محکوم بنا کر ہی رکھیں گے، مگر ساتھ ہی اس کے نہایت راحت و آرام سے رکھا جائے گا، اس لیے کہ انھوں نے ہمیں آرام پہنچایا ہے۔“

حضر مدعی لاکھ پہ بھاری بے گواہی تیری

۱۹۔ مولوی شبیر احمد عثمانی و مولوی آزاد سبحانی

مولوی شبیر احمد عثمانی دیوبندی مولوی فضل الرحمن دیوبندی ۱۳۰۵ھ/۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے۔ موصوف کے والد ڈپٹی انسپکٹر مدارس اور دہلی کالج کے تربیت یافتہ تھے۔ خود موصوف نے مدرسہ دیوبند میں تعلیم پائی اور کچھ عرصہ اس کے صدر بھی رہے۔ جمعیتہ العلماء ہند کے آپ بھی ایک رکن تھے لیکن کسی وجہ سے آپ اپنے اکابر اور رفقاء کار کی گاندھوی روش کو برداشت نہ کر سکے، اس لیے جمعیتہ العلماء اسلام کے نام سے اپنی علیحدہ جماعت بنالی، جو دیوبندی طبقے میں بھی نسبتاً اقلیت میں ہی رہی۔ اکثریت میں وہی حضرات تھے جنہوں نے گاندھی کو اپنا بے تاج بادشاہ اور امام و پیشوا بنایا ہوا تھا۔ ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء میں آپ نے وفات پائی۔

چونکہ آپ مطالبہ پاکستان کے حامی اور مسلم لیگ کے ہنوا تھے، اس لیے جملہ علماء دیوبند ماسوائے چند کے، آپ سے ناخوش تھے۔ مولوی اشرف علی تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) کے گزشتہ بیان میں علمائے دیوبند کے جس مذاکرے کا بھی ذکر کیا تھا، اس میں جمعیتہ العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ، مولوی حفظ الرحمن سیوہاروی نے اپنے وفد کی طرف سے علامہ عثمانی کی جمعیتہ العلماء

اسلام کے قیام اور اغراض و مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :

مولانا حفظ الرحمن صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں جمعیتہ العلماء اسلام حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایما سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبجانی جمعیتہ العلماء اسلام کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن صاحب کے یہاں قیام کیا، جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبجانی صاحب اسی قیام کے دوران میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدیدار سے ملے، جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیتہ العلماء ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لیے ایک علماء کی جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لیے دے گی۔ چنانچہ ایک پیش قرار رقم اس کے لیے منظور کر لی گئی اور اس کی ایک قسط مولانا آزاد سبجانی صاحب کے حوالہ بھی کر دی گئی۔ اس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمن صاحب نے کہا کہ یہ اس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر آپ اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کر سکتے ہیں۔“ لے

مولوی حفظ الرحمن سید ہاروی کی اس تقریر کے جواب میں مولوی شبیر احمد عثمانی کا بیان بھی قابل غور و فکر ہے :

”پہلے میں (شبیر احمد عثمانی) اس معاملہ کی نسبت گفتگو شروع کرتا ہوں، جو آپ نے مولانا آزاد سبجانی کے متعلق بیان فرمایا ہے۔ جو روایت آپ نے بیان کی، میں نہ اس کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں مجھے اس سے پہلے ہی بذریعہ ایک گننام خط کے (جو دہلی سے ڈالا گیا تھا) یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اس خط میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط،

بہر حال میرے علم میں آپ کی ہے۔ لیکن اس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہو سکتی ہے؟

میں نے جو رائے پاکستان وغیرہ کے متعلق قائم کی ہے، وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ جمعیتہ العلماء اسلام میں آزاد سبجانی رہیں یا نہ رہیں، جمعیتہ العلماء اسلام خود قائم رہے یا نہ رہے، میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان مفید ہے۔

اگر میں تھوڑی دیر کے لیے اس روایت کو تسلیم بھی کر لوں کہ جمعیتہ العلماء اسلام گورنمنٹ کے ایماء سے قائم ہوئی ہے، تو آپ سے پوچھتا ہوں کہ کانگریس کی ابتدا کس نے کی تھی اور کس طرح ہوئی تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداءً اس کا قیام ایک وائسرائے کے اشارے پر ہوا تھا؟

حقیقت کا حال تو اللہ تبارک و تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے لیکن ان کے جواب کی روشنی میں اگر موصوف کو انگریز دوستی سے برأت کا سرٹیفکیٹ نہ بھی مل سکے، لیکن برٹش گورنمنٹ کا آزاد کار ثابت کرنا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔ رہا مولوی آزاد سبجانی، مگر جمعیتہ العلماء اسلام کا معاملہ تو یقیناً (عمائد و علمائے دیوبند) کے بیانات کی روشنی میں صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ موصوف کی انگریز دوستی بلکہ انجینیئر ڈاکٹر کاری شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲۰۔ مولوی محمد الیاس کا ندھلوی

موصوف ۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر میں مولوی رشید احمد گنگوہی (المتوفی ۱۳۳۲ھ/۱۹۰۵ء) کی خدمت میں تحصیل علم و فیض کے لیے حاضر ہو کر آپ کے ہاتھ پر بیعت ہوئے اور ان کی وفات تک اپنے پیرونگوہی صاحب کی خدمت میں حاضر رہے۔ اس وقت آپ عمر کی سیریل منزلیں طے کر چکے تھے۔ دیوبندی حضرات کی تبلیغی جماعتیں

جو آجکل بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہیں، اس تحریک کے بانی یہی مولوی محمد ایسا صاحب ہیں۔ یہ تبلیغی نظام کب اور کیوں قائم ہوا، اس کا تاریخی تذکرہ باب دوم میں اپنی جگہ پر ہو چکا ہے۔ علمائے دیوبند کی جس مینڈنگ کا گزشتہ سطور میں تین دفعہ ذکر آچکا ہے، اُسی میں مولوی غلط الفہم سید ہاروی نے یہ بھی کہا تھا:

”اسی ضمن میں مولانا حفظ الرحمن صاحب نے کہا کہ مولانا ایسا صاحب رحمہ اللہ

علیہ کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی طرف سے بذریعہ حاجی رشید احمد

صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا پھر بند ہو گیا۔“

حکومت نے امداد دینے کا وعدہ کر کے شردھانند کے مقابلے پر تبلیغ شروع کروا تو دیوبند کے جیسا کہ مذکور ہوا، کچھ عرصہ گزرنے پر فطیفہ دینا بند کر دیا۔ کانڈھلوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۳ھ/ ۱۹۴۴ء) اُس وقت شاید یہ شعر پڑھا کرتے ہوں گے: ۷

صبر اُس پر اس ہماری حسرت دیدار کا

بند جس نے کر دیا روزن تیری دیوار کا

۲۱۔ مرزا غلام احمد قادیانی

دورِ حاضر کا میلہ، اُمت کے تینیں دجالوں میں سے ایک دجال، مرزا غلام احمد قادیانی بھی ہے۔ موصوف نے مجدد اور مصلح کے دعاوی سے سلسلہ شروع کیا۔ دعویٰ نبوت کرنا تو عام مشہور ہے لیکن اس خوفِ خدا اور خطرہٴ روزِ جزا کو فراموش کر دینے والے اس شخص نے اپنے متعلق خدا ہونے تک کے متعدد دعاوی کیے ہوئے ہیں۔ موت سے پیشتر اپنے کئی مخالفوں کو چیلنج کیا تھا کہ فریقین سے جو جھوٹا اور کذاب ہے اُسے خدائے بزرگ و بزرگ دوسرے کی زندگی میں ہی باطاعون وغیرہ متعدی مرض کے ساتھ ذلیل کر کے مارے۔ مخالفین تو سارے ہی زندہ رہے لیکن اُن کی زندگی میں مرزا صاحب ہی بعارضۃً ہیضہ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء بروز منگل ساڑھے دس بجے

دن کے راہی ملک عدم ہو گئے اور اپنے جھوٹا ہونے کا سب کے سامنے بین ثبوت پیش کر گئے۔
 برٹش گورنمنٹ کے آئندہ کاروں میں مرزا غلام احمد قادیانی کا متقابل سرزمین پاک و ہند میں
 تو کوئی نہیں ہوا۔ مرزا غلام احمد کو یہ صفت ورثے میں ملی تھی۔ چنانچہ اپنے والد کے بارے میں
 خودیوں تصریح کی ہے :

میرے والد مرحوم کی سوانح میں سے وہ خدمات کسی طرح الگ ہو نہیں سکتیں جو
 وہ خلوص دل سے اس گورنمنٹ کی خیر خواہی میں بجالاتے۔ انہوں نے اپنی حیثیت
 اور قدرت کے موافق ہمیشہ گورنمنٹ کی خدمت گزاری میں اُس کی مختلف حالتوں
 اور ضرورتوں کے وقت وہ صدق اور وفاداری دکھلائی کہ جب تک انسان سچے
 دل اور تہ دل سے کسی کا خیر خواہ نہ ہو ہرگز دکھلا نہیں سکتا۔ لہ

اپنے والد کے بارے میں دوسری کتاب کے اندریوں لکھا ہے :

”والد صاحب مرحوم اس ملک کے ممتاز زمینداروں میں شمار کیے جاتے تھے۔
 گورنری دربار میں اُن کو کرسی ملتی تھی اور گورنمنٹ برطانیہ کے سچے شکر گزار اور
 خیر خواہ تھے۔“ لہ

اُن کے کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے فخریہ انداز میں ایک جگہ یوں بھی رقمطراز ہیں :

”سن ستاون (یعنی ۱۸۵۷ء) کے مفسدہ میں جبکہ بے تمیز لوگوں نے اپنی محسن
 گورنمنٹ کا مقابلہ کر کے ملک میں شور ڈال دیا، تب میرے والد بزرگوار نے
 پچاس گھوڑے اپنی گرہ سے خرید کر کے اور پچاس سوار پہنچا کر گورنمنٹ کی خدمت
 میں پیش کیے اور پھر ایک دفعہ سو سوار سے خدمت گزاری کی اور انہی مخلصانہ
 خدمات کی وجہ سے وہ اس گورنمنٹ میں ہر دفعہ تہذیب ہو گئے۔ چنانچہ جناب گورنر جنرل
 کے دربار میں عزت کے ساتھ اُن کو کرسی ملتی تھی اور ہر ایک درجہ کے حکام انگریزی

لہ غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۴۲

لہ غلام احمد قادیانی، مرزا: ازالہ اوہام، ص ۵۰

بڑی عزت اور دلجوئی سے پیش آئے تھے۔^۱

اپنے بڑے بھائی، مرزا غلام قادر کی انگریز دوستی کے بارے میں موصوف نے یوں تصریح کی ہے:

”اس عاجز کا بڑا بھائی، مرزا غلام قادر، جس قدر مدت تک زندہ رہا، اُس نے بھی اپنے والد مرحوم کے قدم پر قدم مارا اور گورنمنٹ کی مخلصانہ خدمت میں بڑا جان مصروف رہا۔“^۲

خود مرزا غلام احمد قادیانی (المتوفی ۱۹۰۸ء) جہاد کے سخت مخالف اور برٹش گورنمنٹ کے نمبر ایک آلہ کار تھے۔ اس امر کا اعتراف موصوف نے اپنے لفظوں میں یوں کیا ہے:

”میں ابتدائی عمر سے اس وقت تک جو قریباً ساٹھ برس کی عمر تک پہنچا ہوں، اپنی زبان اور قلم سے اہم کام میں مشغول ہوں تاکہ مسلمانوں کے دلوں کو گورنمنٹ انگلیشیہ کی سچی محبت اور خیر خواہی اور ہمدردی کی طرف پھیروں اور اُن کے بعض کم فہموں کے دلوں سے غلط خیال، جہاد و غیہ کے دُور کروں جو دلی صفائی اور مخلصانہ تعلقات سے روکتے ہیں۔“^۳

دوسری جگہ انگریزوں کی حمایت میں جہاد کی مخالفت کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

”میری ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ مسلمان اس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کے سچے خیر خواہ ہو جائیں اور ہمدی غوثی (امام مہدی علیہ السلام) اور مسیح غوثی (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی بے اصل روایتیں (جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں) اور جہاد کے جوش دلانے والے مسائل (جو حکم خدا اور عمل و ارشادِ مصطفیٰ ہے) جو احمقوں کے دلوں کو خواب کرتے ہیں، اُن کے دلوں سے معدوم ہو جائیں۔“^۴

۱۔ غلام احمد قادیانی، مرزا: شہادت القرآن، ص ۸۴

۲۔ ایضاً: ص ۸۶

۳۔ غلام احمد قادیانی مرزا: تبلیغ رسالت، جلد ۱، ص ۱۰

۴۔ غلام احمد قادیانی، مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۵

موصوف نے انگریزی حکومت کے استحکام کی خاطر اس کی حمایت میں جہاد کے خلاف
بے شمار کتابیں لکھیں اور اشتہار شائع کرائے اور اپنے اس اسلام دشمنی کے کارنامے پر آپ
یوں فخر کیا کرتے ہیں،

”میں نے ممانعتِ جہاد اور انگریزی اطاعت کے بارے میں اس قدر کتابیں
لکھی ہیں اور اشتہار شائع کیے ہیں کہ اگر وہ رسائل اور کتابیں اکٹھی کی جائیں تو
پچاس الماریاں اُن سے بھر سکتی ہیں۔“

شاید پنجاب کے مشہور شاعر ظفر علی خاں نے یہ شعر اسی لیے کہا تھا: ۷

طوقِ استعمارِ مغرب خود کیا زیبِ گلُو

اور گواہِ اس پر ہیں مرزا کی پچاس الماریاں

انگریزی حکومت کی اطاعت و فرماں برداری کی ترغیب دینے اور مسلمانوں کے جذبہ جہاد
کو برٹش گورنمنٹ کے مفاد کی خاطر ٹھنڈا کرنے کی غرض سے مرزا غلام احمد قادیانی نے تحریری
طور پر جو کچھ کیا، اُس کی تفصیل یوں بیان کی:

”مجھ سے سرکار انگریزی کے حق میں جو خدمت ہوئی وہ یہ تھی کہ میں نے پچاس ہزار
کے قریب کتابیں اور رسائل اور اشتہارات چھپوا کر اس ملک اور نیز دوسرے
بلادِ اسلام میں اس مضمون کے شائع کیے کہ گورنمنٹ انگریزی ہم مسلمانوں کی
محسن ہے، لہذا ہر ایک مسلمان کا یہ فرض ہونا چاہیے کہ اس گورنمنٹ کی
سچی اطاعت کرے اور دل سے اس دولت کا شکر گزار اور دعا گو رہے اور
یہ کتابیں میں نے مختلف زبانوں یعنی اردو، فارسی، عربی میں تالیف کر کے اسلام
کے تمام ملکوں میں پھیلا دیں اور یہاں تک کہ اسلام کے دو مقدس شہروں، مکہ
اور مدینہ میں بھی بخوبی شائع کر دیں اور روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ اور بلادِ شام
اور مصر اور کابل اور افغانستان کے متفرق شہروں میں جہاں تک ممکن تھا

اشاعت کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں انسانوں نے جہاد کے وہ غلیظ خیالات چھوڑ دئے جو نا فہم ملاؤں کی تعلیم سے اُن کے دلوں میں تھے۔ یہ ایک ایسی خدمت مجھ سے ظہور میں آئی ہے کہ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ برٹش انڈیا کے تمام مسلمانوں میں سے اس کی نظیر کوئی مسلمان دکھلا نہیں سکا۔ ۱

جس طرح اپنے دور میں جعفر بنگال اور صادق دکن ممتاز تھے اور اپنے سیاہ کار ناموں کو سراہا افتخار سمجھا کرتے تھے اُس طرح اپنے پیش رو حضرات سے مرزا صاحب ملت فروشی یا دین فروشی میں کم حقوڑے ہی رہ گئے تھے جو یہ فخر نہ کرتے بلکہ معلوم تو یوں ہوتا ہے کہ موصوف اپنے میدان کے سارے کھلاڑیوں کو مات دے کر، سب سے ممتاز ہو گئے تھے۔ اسی اسلام دشمنی اور ملت فروشی کے باعث اُنھیں خود احساس تھا کہ کسی بھی اسلامی ملک میں، کوئی مسلمان حکمران، ان کے وجود کو برداشت نہ کر سکے گا اور برٹش گورنمنٹ کے ماتحت اور اُس کی سرپرستی میں جو یہ عظیم فتنہ پرورش پارہا ہے، اسلامی حکومت اسے جڑ سے اکھاڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس حقیقت کا سرسید احمد خاں علی گڑھی اور مولوی محمد حسین پٹاوی کی طرح خود مرزا صاحب نے علی الاعلان اور بغیر کسی ہیر پھیر کے یوں اعتراف کیا ہے :

”خدا تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے میری اور میری جماعت کی پناہ اس سلطنت (برٹش گورنمنٹ) کو بنا دیا ہے۔ یہ امن جو اس سلطنت کے زیرِ سایہ ہمیں حاصل ہے، نہ یہ امن مکہ معظمہ میں مل سکتا ہے اور نہ مدینہ میں اور نہ سلطانِ روم کے پایۂ تخت قسطنطنیہ میں۔“ ۲

دوسری جگہ موصوف نے اور وضاحت سے اسی امر کا اَشکاف اعتراف یوں کیا ہے :

اگرچہ اس حسن گورنمنٹ کا ہر ایک پر رعایا میں سے تشکر واجب ہے، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ مجھ پر سب سے زیادہ واجب ہے، کیونکہ یہ میرے اعلیٰ

۱۔ غلام احمد قادیانی مرزا: ستارہٴ قیصر، ص ۷،

۲۔ غلام احمد قادیانی مرزا: تریاق القلوب، ص ۲۶

مقاصد جو جناب قیصر ہند کی حکومت کے سایہ کے نیچے انجام پذیر ہو رہے ہیں
ہرگز ممکن نہ تھا کہ وہ کسی اور گورنمنٹ کے زیر سایہ انجام پذیر ہو سکتے، اگرچہ وہ
اسلامی گورنمنٹ ہی ہوتی۔ ۱

مرزا صاحب اس امر کے بھی معترف ہیں کہ انھیں ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے نبی بنایا گیا تھا۔
نبی بنانے والے گورنر جنرل یا وائسرائے کا نام چونکہ انھوں نے تحریر نہیں کیا، لہذا اس کے
ذکر کو چھوڑ کر ملکہ برطانیہ کے متعلق بیان ملاحظہ ہو :

اُسے بابرکت قیصر ہند! تجھے یہ تیری عظمت اور نیک نامی مبارک ہو۔ خدا کی
نگاہیں اس ملک پر ہیں۔ خدا کی رحمت کا سایہ اُس رعایا پر ہے جس پر تیرا ماتھ
ہے۔ تیری ہی پاک نیتوں کی تحریک سے خدا نے مجھے بھیجا ہے۔ ۲

مرزا غلام احمد قادیانی کو ملکہ وکٹوریہ کے جس ماتحت حاکم نے نبی بنایا تھا، اس سے اُس کا
مقصود کیا تھا اور مرزا صاحب کو کس ڈیوٹی پر مامور کیا گیا تھا؟ موصوف نے اس سوال کا جواب
خدیوں دیا ہے :

”اُس نے اپنے قدیم وعدہ کے موافق، جو مسیح موعود کے آنے کی نسبت تھا، آسمان
سے مجھے بھیجا، تاہیں اُس مرد خدا کے رنگ میں ہو کر جو بیت اللحم میں پیدا ہوا
اور ناصرہ میں پرورش پائی، حضور ملکہ معظمہ کے نیک اور بابرکت مقاصد کی
اعانت میں مشغول رہوں۔“ ۳

موصوف کو اعتراف تھا کہ وہ انگریزی حکومت کا خود کا شتہ پودا ہیں، اسی لیے اپنے
نبی بنانے والوں کی خدمت میں اپنی خدمات یاد دلا کر، یوں دست بستہ عرض پرداز ہوئے تھے :
”اتنا س ہے کہ سرکار دولت دار، ایسے خاندان کی نسبت، جس کو پچاس سال کے
متواتر تجربے سے ایک وفادار، جانثار خاندان ثابت کر چکی ہے اور جس کی

۱ غلام احمد قادیانی مرزا : تحفہ قیصریہ، ص ۴

۲ غلام احمد قادیانی مرزا : ستارہ قیصر، ص ۱۵

۳ ایضاً : ص ۱۰

نسبت گورنمنٹ عالیہ کے معزز حکام نے ہمیشہ مستحکم رائے سے اپنی چھٹیا ت میں یہ گواہی دی ہے کہ وہ قدیم سے سرکار انگریزی کا خیر خواہ اور خدمت گزار ہے۔ اس خود کاشتہ پودے کی نسبت نہایت عزم و احتیاط سے اور تحقیق و توجہ سے کام لے اور اپنے ماتحت حکام کو اشارہ فرمائے کہ وہ بھی اس خاندان کی ثابتہ وفاداری اور اخلاص کا لحاظ رکھ کر مجھے اور میری جماعت کو عنایت و مہربانی کی نظر سے دیکھیں۔“ لے

۷۸۰ اپنی منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طا تروں پر سحر ہے صیت د کے اقبال کا

شیعہ حضرات

متحدہ ہندوستان کی سرزمین میں بسنے والے مسلمانوں کا مذہب، اہلسنت و جماعت تھا جن کو آجکل بریلوی مکتب فکر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا ہے اور جملہ جماعتیں جو آج کل نظر آ رہی ہیں وہ انگریزی دور حکومت میں اسی جماعت سے، برٹش گورنمنٹ کے تحریری منصوبے کے تحت، پیدا ہو کر بنی تھیں، ماسوائے شیعہ حضرات کے جو سرزمین پاک و ہند میں مغلوں کے دور سے موجود تھے لیکن انتہائی اقلیت میں، یعنی آٹے میں نمک کے برابر۔ ان حضرات نے اپنے لیے ہی بہتر سمجھا کہ برٹش گورنمنٹ کے وفادار اور خیر خواہ بن کر رہیں، اسی لیے انگریزوں کے خلاف انھوں نے کبھی کسی تحریک میں حصہ نہیں لیا۔ شیعہ صاحبان کی اس وفاداری کا ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے یوں اعتراف کیا ہے:

”لغات کے غیر ضروری ہونے پر ان کا اعلان بغیر کسی دباؤ کے واقع ہوا اور یہ بات نہایت ہی خوب ہے کہ ایسا اعلان باضابطہ طور پر تحریر میں آ گیا۔ اس دستاویز پر مستند اور قابل اعتماد شیعہ علماء کی مہریں ثبت ہیں اور یہ پورا فرقہ

اِس پر ہمیشہ عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اِس قسم کے باقاعدہ وعدوں کے بغیر بھی وہ قدرتاؤ فادار ہیں ! لے

ڈاکٹر ولیم ہنٹر کے بیان کے متعلق سر سید احمد خاں صاحب کے اپنے تاثرات یہ ہیں : اُس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے شیعہ لوگوں کا کچھ ذکر لکھا ہے اور جو تعریف اُن لوگوں کی کی ہے گو وہ بھی مشروط بشرائط ہیں، لیکن میں اِس طرح سے بھی خوش ہوں کیونکہ میری دانست میں یہی غنیمت ہے کہ اِس عالمِ ڈاکٹر نے مسلمانوں کے ایک فرقہ کی تو تعریف کی۔ چنانچہ میں اُن کی اِس قدر مہربانی اور رحم کا شکر گزار ہوں۔ لے

قارئین کرام ! جن حضرات کو برٹش گورنمنٹ نے سر زمینِ پاک و ہند سے اپنا آلہ کار بنا کر، اُن سے تخریبِ دین کا کام لیا، اُن سے مسلمانوں کی ملی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا، ایک اسلام کے متعدد جعلی اسلام بنوائے اور اِس طرح یہاں کے مسلمانوں کو ایک پریشان کن مصیبت میں مبتلا کر کے اُن کی طاقت کو منتشر اور دین و ایمان کو تباہ و برباد کر دیا، ایسی سیکڑوں ہستیوں میں سے چند نامور حضرات کی اِس باب میں نشان دہی کی گئی ہے اور اُن کے بارے میں جو بیانات پیش کیے ہیں، وہاں بھی مقصود ایسے جملہ بیانات کا حصر ہرگز نہیں تھا، بلکہ نمونے کے طور پر چند واضح اور غیر مبہم عبارتیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے کیونکہ پرکھنے والے تو اُن کی روشنی میں بھی کھرے اور کھوٹے سکوں کو پہچان سکیں گے پھر طالت کی کیا ضرورت ؟

غیر مسلموں سے دوستی کا شرعی حکم کیا ہے ؟ اِس بارے میں آگے مستقل عنوان کے تحت بقدر کفایت جواب موجود ہے۔ لیکن یہ تو زالا ہی ستم ہے کہ یہاں معاملہ دوستی پر بھی ختم نہ ہوا بلکہ ایجنٹ اور آلہ کار تک بن گئے۔ اگر کلامِ الہی کو سامنے رکھتے، اُس پر یقین ہوتا، اپنے پیدا کرنے والے کی بات سننے تو ہرگز بھی اُن دشمنانِ دین کے پھندے میں نہ پھنستے جبکہ یہود و نصاریٰ کے بارے میں بھی کلامِ الہی یوں خبردار کر رہا تھا :

لے ولیم ہنٹر ڈاکٹر : ہمارے ہندوستان میں مسلمان، ص ۱۰۹

لے سر سید احمد خاں : ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ لاہور، ص ۸۷

مَا يَوْمُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ
الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ
عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِمَّنْ تَرْيَكُمُ لَهُ
وہ جو کافر ہیں، کتابی یا مشرک، وہ نہیں
چاہتے کہ تم پر کوئی جہلائی اترے تمہارے
رب کے پاس سے۔

کیا ان حضرات نے اس حقیقت کو مد نظر رکھا؟ باری تعالیٰ شانہ فرمائیے کہ اہل کتاب
کبھی تمہاری جہلائی نہیں چاہتے، لیکن ان حضرات نے باری تعالیٰ شانہ کی نعمتوں کے خزانوں کی
کنجیاں ہی شاید برٹش گورنمنٹ کے ہاتھوں میں سمجھ رکھی تھیں کہ خدا منیے موڑ لیا اور حکومت سے رشتہ
جوڑ لیا۔ کاش! وہ قرآن کریم سے یہ پوچھ لیتے کہ اہل کتاب بھی اگر ہماری جہلائی میں خوش نہیں تو اور
کس بات میں خوش ہیں؟ اگر وہ اتنا پوچھنے کی زحمت برداشت کرتے تو اللہ تعالیٰ کا کلام معجز نظام
انہیں واضح طور پر یہ بتاتا کہ:

وَدَكْثِيرٍ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَدُّوْكُمْ
مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كَقَارِئٍ حَسَدًا مِّنْ
عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ
الْحَقُّ لَهُ
بہت کتابیوں نے چاہا، کاش انہیں
ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں، اپنے
دلوں کی جلن سے، بعد اس کے کہ حق ان
پر خوب ظاہر ہو چکا ہے۔

مسلمانو! کلام الہی کی سنو کہ اللہ اہل کتاب کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جلن اٹھتی
رہتی ہے اور اُسے بھانے کی خاطر وہ یہی حربہ استعمال کرتے ہیں کہ مسلمان سے کافر بنادیں۔
جاتے غور ہے کہ جو حضرات ان حاسدوں کی جھولی میں جا کرے تھے کیا انگریزی دھند و رچیوں
کے مطابق واقعی امیر المومنین، مصلح، ریفارمر، نبی اور شمس العلماء بنایا تھا؟ قرآن کو سچا جانو
کہ جہاں ان کا بس چلے وہ مسلمان کو کفر کی طرف پھیرتے ہیں۔ اگر خدا نہ کرے اب بھی کوئی شک باقی
رو گیا ہے اور ارشاد ربانی اور سن لو کہ اہل کتاب کسی مسلمان سے کس صورت میں اور کب راضی
ہو سکتے ہیں؟ یہ کسی مولوی کا فتویٰ نہیں کلام الہی کی ایک روشن آیت کا حصہ ہے:

لہ البقرہ: آیت ۱۰۵

لہ البقرہ: آیت ۱۰۹

وَلَنْ تَرْضَىٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۖ لَهُ

اور برگزتم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم اُن کے دین کی پیروی

نہ کرو۔

اب تو واضح ہو گیا کہ مسلمان کو مسلمان ہی دیکھتے ہوئے یہود اور نصاریٰ کبھی راضی نہیں ہو سکتے۔ وہ اگر خوش ہوں گے تو اسلام سے ہٹا کر اور اپنی ملت کا تابع بنا کر خوش ہوں گے۔ سوچے ذرا، جن حضرات نے برٹش گورنمنٹ کو راضی کرنا ہی اپنی زندگیوں کا مقصد اور اپنا اولین نصب العین بنا رکھا تھا، قرآن کریم کے آئینے میں دیکھیے کہ انگریزوں نے اُنہیں کیا بنایا ہوگا اور اُن سے کب جا کر راضی ہوئے ہوں گے؟ اور دیکھیے کلام الہی یوں بھی خبردار کر رہا تھا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فِرْعَوْنَ
مِنَ الدِّينِ أَوْ تَوَلَّوْا كُتُبَ بَرِّدُكُمْ
بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كُفْرِينَ ۝ ۱۰۰

اے ایمان والو! اگر تم کچھ تمہاریوں کے کہے پر چلے تو وہ تمہارے ایمان کے بعد تمہیں کافر کر چھوڑیں گے۔

یہاں بھی صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ اہل کتاب تمہیں مصلح یا ریفارمر وغیرہ کچھ بھی نہیں بنائیں گے اگرچہ دھوکے میں رکھنے کے لیے لیبیل تمہاری پیشانیوں پر ایسے ہی لگائیں گے، ورنہ حقیقت میں وہ تمہیں مسلمان نہا کافر بنائیں گے۔ مصلح وغیرہ تو جب بنائیں کہ اُنہیں اسلام کی غیر خواہی منظور ہو، ابھی ارشادِ ربانی سنا کہ اُن کے دلوں میں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حد کی آگ بھڑکتی رہتی ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ اُس آگ کو اسی طرح بجھاتے ہیں کہ مسلمانوں کو کافر بناتے ہیں کہ اسلام سے پھر جائیں یا اُن کی ملت کا ایک جزو بن جائیں اَللّٰهُمَّ احْفَظْنَا مِنْهُمْ۔

قارئین کرام! آپ نے انگریز دوستوں کے اپنے یا اُن کے متعلق ایک دوسرے کے بیانات ملاحظہ فرمائیے اور اب آخر میں ارشاداتِ خداوندی سُنئے۔ ان کی روشنی میں مذکورہ حضرات دین کے خیر خواہ تھے یا بد خواہ، خدا ترس تھے یا خوفِ خدا سے عاری، ملت کے غمخوار تھے یا زبردست،

مصلح اور ریفارمر تھے یا افتراق بین المسلمین کے ٹھیکیدار؛ اس امر کا فیصلہ کرنا اور اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانا یہ آپ حضرات کی ذمہ داری ہے۔

مذکورہ صورتِ حال کے برعکس، راقم الحروف کو تو علی الاعلان یہ کہنے میں کوئی تھجک محسوس نہیں ہوتی کہ مسلمانوں کی حقیقی اور قیدی جماعت، سوادِ اعظمِ اہلسنت و جماعت کے کسی ذمہ دار عالم کے متعلق اس قسم کا ایک بیان بھی نہیں دکھایا جاسکتا کہ انھوں نے برٹش گورنمنٹ کی حمایت کی ہو، یا انگلیزوں کے اشارے پر یا کسی بھی وجہ سے اسلامی عقائد و نظریات میں اپنی طرف سے معمولی رد و بدل بھی کی ہو۔ ذلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ احقر یہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہے کہ ہماری جماعت (جسے بتدعین نے بریلوی فرقہ کہنا شروع کیا ہوا ہے) وہی چودہ سو سال سے چلی آنے والی قیدی جماعت ہے اور ہمارے عقاید و نظریات وہی ہیں جو شروع سے لے کر اب تک متواتر چلے آ رہے ہیں۔ باری تعالیٰ شانہ ہمیں اسی جماعت میں رکھے، جملہ مدعیانِ اسلام کو سچی ہدایت نصیب فرمائے اور ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو۔ امین یا اللہ الغلین بحق سید المرسلین۔ رہتلا تنزع قلوبنا بعد اذ ہدیتنا و ہب لنا من لدنک رحمۃ ۛ انک انت الوہاب ۛ وصلى الله تعالى على حبيبہ محمد وعلى اله و صحبہ اجمعین۔

باب پنجم

عجم هنوز نداند رموزِ دین و راز
سرود بر سرِ منبر که ملت از وطن ست
بمصطفی برسانِ خویش را که دین همه است

ز دیو بند حسین احمد ایں چہ لو العجمی ست
چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست
اگر باؤز سیدی تمام بولہبی ست
(اقبال)

وہابیہ کی زُنا ر دوستی

قارئین کرام! یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ مسلمان اپنی مرضی کا مالک اور مطلق العنان نہیں بلکہ احکامِ الہی کا پابند ہے۔ اس کے تعلقات رضائے الہی اور منشاءِ خدائی کے تابع ہوتے ہیں۔ مسلمان کسی سے محبت کرے تو خدا کے لیے کرتا ہے اور کسی سے عداوت رکھے تو خدا کے لیے رکھتا ہے۔ اپنی مرضی سے یہ کسی سے بنانے اور بگاڑنے کا مجاز نہیں۔ باری تعالیٰ شانہ نے اس بارے میں جو حد بندی فرمائی ہے اُس سے تجاوز کرنا، گویا علوِ اسلام سے منحرف ہونا ہے۔

حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ فرمائیے کہ ان حضرات نے سرزمینِ پاک و ہند میں تیرھویں صدی کے اوائل سے سچے اور پختے مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا ناپاک مشغلہ اپنے مناخِ دین کا اولین کُن اپنے ضابطہ حیات کا اہم ترین باب اور بہترین توشہ آخرت و زاوِ راہ قرار دے کر اپنا اوڑھنا بچھونا یا دائمی وظیفہ یا مکئیہ کلام بنایا ہوا ہے اور سیکڑوں کتابیں بھی اسی منصوبے کے تحت بڑی آب و تاب سے شائع کروا چکے ہیں، جن میں آیاتِ الہیہ و فرامینِ مصطفویہ کے معانی و مطالب میں تحریف کرتے وقت قطعاً خوفِ خدا اور خطوہِ روزِ جزا کو مدِ نظر نہیں رکھا گیا اور اس طرح متواتر اُمتِ محمدیہ کو شرک کے سمندر میں دھکیل رہے ہیں گویا یہ اُمتِ مرحومہ ان کے نزدیک ٹھیک اُمتِ ملعونہ ہے ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ سے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گیارہ سو سال سے یہ اُمت توحید جیسے بنیادی اور اہم ترین عقیدے سے دست بردار ہو کر اسلام سے نا آشنا ہو گئی تھی اور گیارہ سو سال تک مسلمانانِ عالم اُس عقیدہ توحید سے نفی دست رہے تھے، جس پر اہل اسلام کو بجا طور پر ناز ہے۔

گویا محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو توحید کا جو درس دیا تھا اور اُس سرکار کے بانثار یعنی حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، جس توحید کے علمبردار اور مبلغ بنائے گئے تھے، ان کرم فرماؤں کے نزدیک اُسی مایہ ناز عقیدہ توحید کو اہلسنت و جماعت کے علمائے کرام اور اولیائے عظام نے گیارہ سو سال سے شرک کی گھانی میں ملائے رکھا اور

ان ہندوین زمانہ کے نزدیک اصلی عقیدہ توحید اب وہی ہے جو محمد بن عبد الوہاب نجدی نے خارجیت کے مردہ جسم میں جان ڈال کر، بارہویں صدی کے آخر میں پیش کیا اور کتاب التوحید کے ذریعے پوری دنیا میں اس کی تبلیغ و اشاعت کا انتظام کیا گیا۔

پاک و ہند میں موصوف کی ”کتاب التوحید“ کے اسباق کو اردو کا لباس پہنا کر مولوی محمد اسماعیل دہلوی نے ”تقویۃ الایمان“ کے نام سے پیش کر کے مسلمانوں پر شرک و کفر کی گولہ باری کا فریضہ انجام دیا۔

عقیدہ توحید کو غتر بود کرنے کی جسارت اور مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے کا مال تو ملاحظہ ہو کہ قدرت نے ان لوگوں کو اقوام عالم کے سامنے کس انداز میں سزا دی؟ کیا مسلمان جیسی غیور قوم کے لیے یہ باعث ننگ و عار نہیں کہ وہ کافروں اور مشرکوں کا آلہ کار یا غلیظ بازار بنے؟ مسلمانوں کو مشرک بنانے والوں کو قدرت نے یہ سزا دی کہ وہ برضا و رغبت مشرکین ہند کے نہ صرف غلام بنے بلکہ بت پرستوں کے بندہ بے دام بنے۔ باری تعالیٰ شانہ! سمجھ اور ہدایت نصیب فرمائے! آمین۔

اب میں ان حضرات کی زائر دوستی کے چند واقعات و بیانات پیش کرتا ہوں۔ آئیے سب سے پہلے بڑی دکان پر چلتے ہیں۔ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے سیکرٹری کون صاحب تھے؟

”بیمیں افسوس ہے کہ ہم شاہ صاحب (مولوی محمد اسماعیل دہلوی) کا خط بلفظ نقل نہیں کر سکتے، اس لیے کہ جو کاغذات منشی میرالال کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں لے ہیں، وہ علاوہ پارہ پارہ ہونے کے ایسے بدخط لکھے ہوئے ہیں کہ ہم بلفظ نقل کرنے کا فخر حاصل نہ کر سکے۔“

ستید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے ساتھیوں نے صورتہ سرحد میں جو جگہیں لڑیں، جنہیں جہاد کا نام دیا جاتا ہے۔ ان بانکہ مجاہدین میں سے ایک نامور مجاہد سے ہم

قارئین کرام کو مطلع کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

”ادھر اپنے مورچے سے بوقتِ شب سید صاحب نے اپنی فوج براہِ جلالہ واپس کرنی شروع کر دی۔ ایک راجپوت ہندو، جو مولوی احمد اللہ کے ساتھ بیسواڑہ سے جا کر شریک لشکرِ اسلام تھا مورچے میں باقی رہ گیا، جو صبح تک تنہا دونوں توپوں کو چلاتا رہا۔ بوقتِ صبح راجہ رام بھی بمقابلہ جلالہ اپنے لشکر سے آ ملا۔ ادھر دُرانی مارے خوفِ شبخون کے اپنے مورچے چھوڑ کر رات کو بھاگ گئے اور دہتر تک واپس نہ آئے۔“ ۱

جب سید احمد صاحب کی فوج دُرانیوں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھی تو سید صاحب کے محبوب مجاہد اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کے چہیتے اور منظورِ نظر توپچی یعنی راجہ رام صاحب کس بے جگری سے خدا کی راہ میں جہاد کر رہے تھے:

”مولانا نے تلوار کا پھرتی سے وار کر کے اُس کی گردن اڑا دی۔ دوسرا توپچی بھی یوں مارا گیا۔ مولانا شہید نے فوراً وہ دونوں توپیں دُرانیوں کی طرف پھیر کے فیر کرنے شروع کیے۔ ایک وفادار ہندو جو مولانا شہید پر فریفتہ تھا (راجہ رام قوم راجپوت باشندہ بیسواڑہ) گولہ اندازی پر مقرر ہوا۔ اُس نے اس قدر پھرتی سے گولہ اندازی کی کہ دُرانیوں کے پیر اکھڑ گئے۔“ ۲

جناب غلام رسول مہر کی زبانی بھی راجہ رام کے اس جہاد کی مختصر سی کہانی ہدیۂ قارئین ہے:

”یہ آٹھ دس آدمی تھے، جن میں سے شیخ امجد علی غازی پوری، حافظ یحیٰ بخش الہ آبادی، اور حافظ عبداللطیف نیونوی (برادر مولوی عبدالحی) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے ساتھ ایک ہندو راجا رام نامی بھی تھا، جو بیسواڑہ (نزد سلون) کا باشندہ تھا۔ اُس نے اپنا قصہ یوں بیان کیا کہ میں مورچے

۱ محمد جعفر تھانیسری، مولوی: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۲۴۰

۲ مرزا حیرت دہلوی، حیات طیبہ، مطبوعہ لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۲۷

میں سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کسی کو نہ پایا۔ بستی میں جا کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ تمام غازی
اُس فوج پر شبنون مارنے کے لیے گئے ہیں، جو دو آبہ کی طرف سے ملک کے طور
پر آکر ہی تھی۔ میں یہ سن کر توپوں کے پاس پہنچا۔ اندیشہ پیدا ہوا کہ مبادا دشمن
دوڑانی، توپیں لے جائیں، اُن میں گولے بھر بھر کر چلانے لگا۔ ۱

راجہ رام کے ایسے ہی کارناموں پر سید صاحب نے اُسے قبولیت کی سند جن لفظوں میں عطا
فرمائی وہ بھی ملاحظہ ہوں، تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے:

”سید صاحب نے راجہ رام کی بہادری اور حُسنِ تدبیر کی ستائش فرمائی۔ ۲
حادثہٴ بالاکوٹ کے بعد شیر سنگھ نے سید احمد صاحب کی لاش کے ساتھ کیا سلوک کیا
ملاحظہ ہو:

”یہ بھی ایک روایت ہے کہ آپ کی شہادت کے بعد راجہ شیر سنگھ خلیفہ ہمارا
رنجیت سنگھ نے جو سکتوں کی فوج کا جنرل تھا، آپ کی لاش پر دو شا لال ڈال کر
بہت عزت سے، آپ کو دفن کرا دیا۔ ۳

بعض لوگوں نے اس روایت کو مولوی محمد اسماعیل دہلوی پر چسپاں کیا ہے (واللہ اعلم) اور
مولوی محمد جعفر تھانیسری کا خیال بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے لیکن دیگر وہابی مورخین اس
اعزاز کو سید صاحب کے ساتھ ہی مخصوص کرتے ہیں، جناب غلام رسول مہر کی وضاحت
ملاحظہ فرمائی جائے، وہ یوں رقمطراز ہیں:

”شیر سنگھ نے اُن گرفتاروں سے کہا کہ لاشوں میں سے ہم کو بتاؤ، خلیفہ صاحب
(یعنی سید احمد صاحب) کی لاش کون سی ہے؟ اگر تم سچ سچ بتا دو گے تو
تو تم کو چھوڑ دیں گے۔ پھر انھوں نے کھیت میں جا بجا پھر کر لاشوں کو دیکھا،

۱۔ غلام رسول تہر: سید احمد شہید، مطبوعہ لاہور، بار سوم ۱۹۶۸ء، ص ۴۵۵، ۴۵۶

۲۔ ایضاً: ص ۴۵۶

۳۔ محمد جعفر تھانیسری: حیات سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء، ص ۳۱۶

ایک لاش بے سر کی تھی، اُنھوں نے کہا کہ یہ لاش خلیفہ صاحب کی معلوم ہوتی ہے مگر اس کا سر بھی ہو تو ہم بتا دیں، پھر شیر سنگھ نے اُس کا سر تلاش کروا کر منگایا اور اُس لاش میں ملوایا، تب اُنھوں نے کہا: ہاں خلیفہ صاحب کی لاش یہی ہے۔ پھر شیر سنگھ نے ایک دوشلا لاش پر ڈلوایا، دو تھان خاصے کے اوپر پچیس روپے نقد دیے اور کہا: جل طرح تم مسلمانوں کا دستور ہے کفن دے کر اس کو دفن کو دو۔ پھر ادھر ادھر سے ملکی مسلمان بھی آکر جمع ہوئے اور کفن دے کر اُس لاش کو دفن کیا اور وہ روپے نقد خیرات کیے گئے۔

ہر صاحب نے دیوان امر ناتھ کے ظفر نامے سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ شیر سنگھ نے سید صاحب کی تصویر بھی بنوائی تھی، یہ تو ہمیں معلوم نہیں کہ کیوں بنوائی، بہر حال بنوائی گئی۔ چنانچہ موصوف یوں لکھتے ہیں:

”شیر سنگھ سید صاحب کی نقش کی طرف متوجہ ہوا اور ایک سحر کار مصور کو مقرر کیا تاکہ اُن کی تصویر ہو ہو کھینچے۔ جب اُس علاقے کے نظم و نسق سے فارغ ہو کر و بار میں پہنچا، رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا۔ شیر سنگھ کو کلفی اور خلعت کے علاوہ بہت انعام دیے اور زیادہ سے زیادہ مہربانیاں کیں۔ خلیفہ صاحب کی تصویر سے جو انگریز کی بوسٹو نگہ کر کہا: ”آفرین“۔ اور مصفا نے تعریف کی۔ میں نے بھی وہ تصویر دیکھی، لیکن اس بات پر حیران ہوا کہ صورت کے درویش ہونے کے باوجود سلطانی و حکمرانی کی خواہش نفسانیت نے پیدا کی اور اگر مذہبی اختلاف کی بنا پر یہ سب کچھ عمل میں آیا تو سمجھنا چاہیے کہ خلیفہ صاحب صفوت و صفا سے بے خیر تھے۔“

سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی کی ان جملہ جنگی سرگرمیوں کے بارے میں خود وہابی

حضرات کی زبانی یہ اقرار ملاحظہ فرمائیے کہ ان میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا ر فرما تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:

”ہم پہلے لکھ آتے ہیں کہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ۱۸۵۷ء اور جہادِ حریت

۱۸۵۷ء میں بھی ہندو مسلم اتحاد کا کام کر رہا تھا۔“ ۱

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امام الہامیہ کی اس تحریکِ جہاد کے بارے میں دیوبندی نقطہ نظر کی پوری طرح وضاحت کر دی جاتے۔ چنانچہ اس سلسلے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے یوں تصریح کی ہے:

”ہندوستان کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ سید صاحب کو مسلمانانِ پنجاب کی حد درجہ پامالی وزبوں حالی کے باعث مہاراجہ رنجیت سنگھ کے بالفت بل صاف آرا ہونا اور آخر معرکہ بالاکوٹ میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا، ورنہ اصل یہ ہے کہ سید صاحب کا مقصد ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تسلط و اقتدار سے نجات دلانا تھا۔ انگریز خود اسے محسوس کرتے تھے اور اس تحریک سے بڑے خوفزدہ تھے، اسی بنا پر جب سید صاحب کا ارادہ سکھوں سے جنگ کرنے کا ہوا تو انگریزوں نے اطمینان کا سانس لیا اور جنگی ضرورتوں کے مہیا کرنے میں سید صاحب کی مدد کی۔“ ۲

ٹانڈوی صاحب کا نظریہ معلوم ہو گیا کہ اُن کے نزدیک سید صاحب نے انگریزوں سے وطن آزاد کرانا تھا۔ سکھوں سے معرکہ آرائی مقصود نہ تھی، یہ ضمناً ہوئی جس سے انگریز خوش تھے اور کسی قسم کی مزاحمت نہیں کر رہے تھے بلکہ ٹانڈوی صاحب نے یہ کھل کر اعتراف کر لیا کہ برٹش گورنمنٹ نے جنگی ضروریات کے سلسلے میں سید صاحب کی مدد کی تھی۔ اب یہ ملاحظہ فرمایا جائے کہ سکھوں سے سید صاحب کو کیوں لڑنا پڑا تھا:

”اُس زمانہ میں مغربی پنجاب میں سکھوں کی حکومت تھی جو کہ انگریزوں کے

۱۔ عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء، ص ۷۷

۲۔ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی، ص ۱۲

حلیف تھے اور آپس میں (انگریزوں اور راجہ رنجیت سنگھ میں) زور دار معاہدے
کیے ہوئے تھے مگر حقیقت میں سکھوں سے لڑنے کا مقصد اصلی ان بدیشیوں
(انگریز) اور ان کے معاونین سے لڑ کر ملک کو اس مصیبت سے بچانا تھا اور
رعایا پر سے ان کے وحشیانہ مظالم کو اٹھا دینا اور بس "۔

سید صاحب سکھوں سے کیوں لڑے؟ اس کی ٹانڈوی صاحب نے وضاحت کر دی۔ اب رہی
بیانات کہ انگریزوں کو متحدہ ہندوستان سے کیوں نکالنا چاہتے تھے؟ اس کا موصوف نے یوں
جواب دیا ہے :

"سید صاحب کا اصل مقصد چونکہ ہندوستان سے انگریزی تسلط و اقتدار کا قلع قمع
کرنا تھا، جس کے باعث ہندو اور مسلمان دونوں ہی پریشان تھے۔ اس بنا
پر آپ نے اپنے ساتھ ہندوؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی اور اُس میں صاف صاف
انہیں بتا دیا کہ آپ کا واحد مقصد ملک سے پر دہی لوگوں کا اقتدار ختم کر دینا ہے۔
اس کے بعد حکومت کس کی ہوگی؟ اس سے آپ کو غرض نہیں ہے۔ جو لوگ حکومت
کے اہل ہوں گے، ہندو ہوں یا مسلمان یا دونوں وہ حکومت کریں گے۔
چنانچہ اس سلسلے میں سرحد سے گوالیار کے مدار المہام اور مہاراجہ دولت رائے
سیندھیا کے وزیر و برادر نسبتی راجہ ہندو راؤ کو آپ نے جو خط تحریر فرمایا ہے
وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اس سے آپ کے اصلی عزائم اور ملکی حکومت
کے متعلق آپ کے نقطہ نظر پر روشنی پڑتی ہے۔"

ٹانڈوی صاحب نے اپنے اسی بیان کو آگے چل کر یوں مزید وضاحت کرتے ہوئے
تحریر کیا ہے :

"کامیاب ہونے کے بعد ہندوستان میں ملکی حکومت کا نقشہ کیا ہوگا؟ اس کا

فیصلہ آپ طالبینِ مناصبِ ریاست و سیاست پر چھوڑتے ہیں، مگر ہندوؤں کو
 یہ اطمینان ضرور دلاتے ہیں کہ وہ سید صاحب کی کوششوں کو اپنی ریاست کی
 بنیاد کے مستحکم ہونے کا باعث سمجھیں اور پھر سید صاحب کا ہندو ریاستوں کو
 مدد اور شرکتِ جنگ کی دعوت دینا اور اپنے توپ خانہ کا افسر راجہ رام راجپوت
 کو مقرر کرنا خود اس کی دلیل ہے کہ آپ ہندوؤں کو اپنا محکوم نہیں بلکہ
 شریکِ حکومت بنانا چاہتے تھے۔ بیشک سید صاحب جگہ جگہ اعلیٰ کلمۃ اللہ
 اور دینِ رب العالمین کی خدمت کا ذکر کرتے اور اسی کو اپنی مساعی کا محرک
 بتاتے ہیں لیکن آپ یہ خوب سمجھتے تھے کہ اعلیٰ کلمۃ اللہ کا ذریعہ صرف یہ ہی نہیں ہے
 کہ ایک فرقہ وار گورنمنٹ قائم کی جائے اور خود حاکم بن کر دوسرے برادرانِ
 وطن کو اپنا محکوم بنایا جائے بلکہ اس کا سب سے زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ
 برادرانِ وطن کو سیاسی اقتدار میں اپنا شریک کر کے اسلامی فضائلِ اخلاق سے
 اُن کے دلوں کو فتح کیا جائے۔ اقلیت اور اکثریت کے مسئلہ کی کوئی پیچیدگی
 آپ کے ذہن میں نہیں تھی۔ کیونکہ آپ کے نزدیک یہ دونوں بے حقیقت چیزیں
 تھیں۔ جو اپنے عمل میں سب سے زیادہ پُرجوش، فداکار، سرگرم اور مخلص و
 دیانت دار ہوگا، امامت اور لیڈرشپ اُسی کے ہاتھ میں رہے گی، خواہ اقلیت
 کے فرقہ سے تعلق رکھے یا اکثریت کے فرقہ سے۔“ لے

سید احمد اینڈ کمپنی کی تحریکِ جہاد کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر محترم
 اور دیوبندی حضرات کے عالیجناب شیخ الاسلام صاحب کا نظریہ قارئینِ کرام نے ملاحظہ
 فرمایا۔ اگر موصوف کو سچا مان لیا جائے تو یقیناً ہر ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان
 حالات میں سید احمد صاحب اور اُن کے ساتھیوں کو شہید کس بنا پر کہا جاتا ہے؟ اس
 طرح یہ ایک ملک گیری کی جنگ تو کہلا سکتی ہے لیکن جہاد کیسا؟ ملکی جنگ بھی ایسی کہ اگر کامیابی

نصیب ہو جاتے تو انگریزوں کے ساتھ ہندو کی حکمرانی بھی بسر و چشم قبول۔ مشرکین ہند کو برابر کا شریک رکھا، اُن سے وعدے کر لیے۔ خود وہابی حضرات وہ بات کے بغیر نہیں رہ سکتے جو ہم مذکورہ سطور میں عرض کر چکے، چنانچہ مولوی عامر عثمانی (المتوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء) ٹانڈوی صاحب کی ان تصریحات کے بارے میں لکھتے ہیں:

”کوئی شک نہیں، اگر استاد محترم حضرت مدنی کے ارشادِ گرامی کو درست مان لیا جائے تو حضرت اسماعیل کی شہادت محض فسانہ بن جاتی ہے۔ مادی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے غیر ملکی حکومت کے خاتمے کی کوشش کو نہ ذرا بھی مقدس نصب العین نہیں۔ اس نصب العین میں کافر و مومن سب یکساں ہیں۔ اس طرح کی کوشش کے دوران مارا جانا اُس شہادت سے بھلا کیا تعلق رکھے گا جو اسلام کی ایک معزز ترین اور مخصوص اصطلاح ہے اور اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں قید و بند کی مصیبتیں اٹھانا اجرِ آخرت کا موجب کیوں ہو گا؟“

خیر اس بات کا فیصلہ تو وہابی حضرات خود کریں گی کیونکہ ٹانڈوی صاحب کو اگر سچا سمجھا جائے گا تو مولوی محمد اسماعیل دہلوی اور سید احمد صاحب وغیرہ کو شہید کئے والوں کو جھوٹا ماننا لازم آئے گا اور سید احمد صاحب وغیرہ کو اگر شہید ہی قرار دینا ہے تو صدر دیوبند مولوی حسین احمد صاحب کو جھوٹا ماننا پڑے گا۔

ہمیں اب اس موضوع پر روشنی ڈالنی ہے کہ انگریز کی حکومت میں کانگریس اور مسلم لیگ دو ایسی سیاسی جماعتیں ملک کے اندر موجود تھیں جو متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی رہنمائی کا دم بھرتی تھیں۔ کانگریس کو ہندو اور مسلمان وغیرہ جملہ اقوام کی رہنمائی اور اُن کے مفادات کے تحفظ کا دعویٰ تھا لیکن حقیقت میں وہ صرف ہندو کے مفادات کا تحفظ کر رہی تھی اور خصوصاً مسلمانوں کو جھانسا دیا ہوا تھا۔ ہندو لیڈروں نے اپنی قوم کو ہر لحاظ سے ترقی کی

راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ جب ہندو ہر لحاظ سے مضبوط اور حکومت کی مشینری کے مکمل پُرزے بن گئے تو انھوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے اور مسلمانوں کو کچلنے کی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ چنانچہ کانگریس مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد پر آمادہ کرتی اور آزادی ہند کی خاطر اس کی اہمیت کو ذہن نشین کراتی۔ مہاسبھا اور جن سنگھ پارٹیوں کے ذریعے مسلم کشی کی مہم جاری رکھواتی اور اپنے زر خرید مسلمان لیڈروں اور علماء کے باعث مسلمانوں کو کانگریس سے دور بھی نہ ہونے دیتی۔ ہندو مسلم اتحاد کا آزادی کی خاطر واسطہ دے کر راضی رکھ لیتے بلکہ وہ تجویروں کی جھنکار پر خود ہی مسحور و مسحور رہا کرتے تھے۔

اُن دنوں مسلمانوں کی سیاسی جماعت یعنی مسلم لیگ کے صدر حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب دہلوی تھے۔ مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کرنا اس جماعت کا دعویٰ تھا لیکن اُن دنوں موصوف بھی گاندھی کے ہاتھ پر بیعت کر کے اسلامیان ہند کی قسمت کا سودا کر چکے تھے۔ دوسری جانب مولانا محمد علی جوہر نے تحریک خلافت شروع کی۔ مسلمانوں نے اس میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ خلافت اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں نے اپنی بساط سے بھی زیادہ چنڈ دیا، حتیٰ کہ عورتوں نے زپور تک اتار کر دے دیے۔ موصوف کے ساتھ مسلمانوں کا ایک سیلاب تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزوں کی حکومت کے ہندوستان میں دن گئے گئے ہیں اور انگریزی اقتدار اب چند روز کا مہمان ہے۔ مسلمان بے حد خوش تھے اور ہنود حیران و ششدر۔ لیکن تھوڑے ہی عرصے کے بعد جب حقیقت کے چہرے سے پردہ ہٹا تو صاف نظر آ گیا کہ خلافت سے مراد گاندھی کی امامت مطلقہ تھی اور مقامات مقدسہ کی بازیابی کا مقصد سورج یارام راج (اکھنڈ بھارت) کا حصول تھا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تیسری جماعت بعض انگریز کے پروردہ علمائے بناتی اور اس کا نام جمعیتہ العلماء ہند رکھا۔ ان دین فروش علماء کا کام صرف یہی تھا کہ گاندھی کی اسلام دشمن تجاویز پر شریعت مطہرہ کی مہر لگاتے رہا کریں اور بس۔ بد قسمتی سے یہ رہنمائی کے دعویدار قوم کا سب سے گمراہ ترین طبقہ نکلا کیونکہ مسلمان ان کے جُبہ و دستار پر اعتماد کر کے، ان کے فتوؤں کو شریعت کے مطابق گردانتے ہوئے گاندھیویت کے چکر میں پھنس جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ہی احزاب پارلی

بھی پنجاب میں یہی کردار ادا کر رہی تھی۔ فریقین کی اور بھی کئی جماعتیں تھیں لیکن وہ مذکورہ جماعتوں کی ذیلی شاخ ہی تھیں لہذا ان کے ذکر کی ضرورت ہی نہیں۔ اب مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیتہ العلماء اور احرار پارٹی کی گاندھویت کے بارے میں کچھ عرض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے کس طرح ہندو مفادات کا تحفظ کیا اور رہنمائی کے جھیس میں کس طرح مسلمانوں کے مفادات پر کاری ضربیں لگائی گئیں۔

گاتے کی قربانی اور گاندھوی ٹولہ

ایک وقت تھا کہ متحدہ ہندوستان کے باشندوں کی نمائندگی کانگریس کر رہی تھی۔ مسلم لیگ کا وجود ان دنوں قومی مفادات کے لحاظ سے برائے نام تھا۔ کانگریس میں ہندو لیڈروں کی اکثریت تھی۔ اس میں بھی جتنے مسلمان لیڈر شامل تھے وہ بھی کسی مرحلے پر اپنی قوم کو بحیثیت ایک رہنما کے فائدہ پہنچانے سے مجبور ہی بنے رہے یا ایسی صلاحیت ہی سے عاری تھے۔ غلامی کے اس دور میں ہندو لیڈروں نے اپنے بیدار مغز ہونے کا واضح ثبوت دیا اور اپنی قوم کو مادی لحاظ سے اُبھارنے کا جامع منصوبہ تیار کر کے اُسے عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو گئے۔ مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۵۸ھ / ۱۹۳۹ء) نے اس حقیقت کا تجزیہ یوں کیا ہے:

”ہندوؤں نے جب مسلمانوں کی نہ صرف کنارہ کشی بلکہ کانگریس کے مقاصد و طرز عمل سے مخالفت و بیزاری دیکھی اور ان کی جانب سے انہیں مایوسی ہوئی تو انہوں نے نہایت ہی عزم و استقلال سے حکیمانہ انداز پر اپنی قوی رفتار کی حرکت تین سمتوں میں منقسم کر دی۔

ایک جماعت نے اقتصادیات کو اپنا نصب العین قرار دیا اور اکتسابِ دولت کے جس قدر ذرائع اور وسائل تھے انہیں اپنے ہاتھوں میں لے لینے میں ساعیٰ کوشاں ہوئے، خصوصیت کے ساتھ ساہوکاری کو اس سلیقہ سے انجام دیا کہ پچاس برس کے عرصہ میں مسلمانوں کی تقریباً ساری دولت سمٹ کر ہندوؤں

کی ملکیت ہو گئی الا ماشاء اللہ۔

دوسری جماعت نے تعلیم اور اس کے ثمرات کی طرف قدم بڑھایا اور اس راہ میں بھی انھیں بے انتہا کامیابی حاصل ہوئی۔ خاص ہندوؤں کی تعلیم کا ہوں گا شمار جو کیا گیا ہے اور پھر اس کے مقابلہ میں مسلمانوں کی درس گاہیں رکھی گئیں تو ان کا وہی نقشہ سامنے آگیا ہے جو سماں دولت کا مقابلہ کرتے ہوئے پیش نظر ہو چکا ہے۔ تعلیم کے بعد ملازمت اور علمی پیشہ کا میدان سامنے آتا ہے۔ یہاں بھی ہندوؤں کا مقابلہ مسلمانوں سے وہی نتیجہ دیتا ہے جو سابق کے دو مقابلوں میں حاصل ہو چکا ہے۔

تیسری جماعت نے عملاً سیاسیات کی طرف اپنا قدم بڑھایا اور نہایت عزم و استقلال سے اس حوصلہ شکن، صبر آزما راہ پر چلنے لگے۔ اس میں شک نہیں کہ سیاست کی راہ بہت ہی پُر خطر تھی۔ اس کی سنگلاخ زمین قدم قدم پر پُر خار وادی سامنے لاتی تھی، جس پر چلنا اپنے تلووں کو زخموں سے چور چور اور پاؤں کو گھائل بنانا تھا۔ لیکن ہندوؤں کے عزم اور ہمت مردانہ کی داد دینی چاہیے جنھوں نے نہایت ذوق و شوق سے اس پیچ در پیچ خارزار سے نہ صرف گزر جانے کا بلکہ اس راہ کو صاف کر دینے کا عزم کر لیا تھا۔ اُن کے لیے ہر نوکِ خار لذت افزا اور ولولہ انگیز تھی، ہر ٹھوکہ سنگِ راہ کی اُن کے سمندرِ شوق کے لیے مہینہ تھی، قید خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریاں قصر و ایوان کے راحت و فضا سے ہمسری کرتی تھیں۔ طوق و سلاسل کی جھنکار اور آہنی زنجیروں کی سیاہی مرصع زیوروں کی چمک دمک اور اُن کی آواز سے زیادہ گوش نواز اور نظر افروز تھی۔

جب ہندو لیڈروں نے ہر لحاظ سے اپنی قوم کو مضبوط اور منظم کر لیا حتیٰ کہ وہ ایسے مقام پر پہنچ گئے کہ برٹش گورنمنٹ سے ملکہ اگر اس کی چولیں ہلا دیں اور آزادی کی منزل مقصود تک پہنچ

بائیں بکرانے میں جانی قربانیاں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ وقت تھا لیڈروں کے امتحان کا کہ ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کو اپنے قومی مفاد کی خاطر قربانی کا بکرا بننے پر رضا مند کر لیا لیکن مسلمانوں کے لیڈر اتنے نا اہل اور پھسٹڈی ثابت ہوئے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے ہاتھوں اس قربان گاہ پر سوراج کی خاطر بھینٹ چڑھانے کے لیے تحفظ خلافت اور حصول آزادی وغیرہ کا جھانسدے کر لے جاتے تھے۔ یہ واقعات ہمارے ایک دیدہ و درمرد حق آگاہ کی زبانی سنیے اور فراموش نہ ہوں کی داد دیجیے:

یہ سب کچھ تھا لیکن حکومت کی ہیکناری جس چڑھا دے اور قربانی کی خواہاں تھی اب تک ہندوؤں کے ہاتھوں نے وہ نذرانہ پیش نہیں کیا تھا، اسی لیے سلف گورنمنٹ اور ہوم رول کا خوشنما منظر قریب تو ہو گیا تھا لیکن جمابات کے پردے ہنوز اُس پر پڑے ہوئے تھے۔ ضرورت تھی کہ بہت سی جانیں حکومت کی دیہی پر بھینٹ چڑھا دی جائیں۔ سیاست کے سارے منازل میں یہ منزل سخت ترین تھی۔ قُرب شوق کی آگ بھڑکار رہا تھا اور جان کی اضاعت دامن پکڑتی تھی۔ مکتی اور رائیگاں جانوں کی تلاش تھی۔ بالآخر امعانِ نظر اور تعمقِ فکر کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ تینوں جماعتیں اپنے سی سالہ کماتے ہوئے سرمایہ کی اس طرزِ خاص سے ایک جھلک مسلمانوں کو دکھلائیں کہ اُن کی نگاہیں خیرہ اور عقول حیرت زدہ ہو جائیں۔ کچھ اپنا خیر و شر انھیں نہ سمجھائی دے نہ سمجھ میں آئے، ہاں اس پر انگدگی جو اس میں اپنی رہی سہی ہستی کھو بیٹھیں۔ اس عمل سے قربانی کی ضرورت بھی پوری ہو جائے گی اور یہ پہلو کا کاٹنا وجودِ مسلم بھی نکل جائے گا۔

جب ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے اُن ناخداؤں کو اپنی کمائی کی جھلک دکھائی تو ہمارے لیڈر بننے والے یک گئے، زنا رداروں پر ہزار جان سے قربان ہو گئے، جس کی وجوہات یہ ہیں:

”اس سحر سامری کو مسلمانوں کی آنکھوں نے جب دیکھا تو انھیں صاف نظر آیا کہ ہندوستان کی دولت اور سرمایہ دولت ایک جماعت کے ہاتھوں میں ہے۔ پھر ان علوم مغربیہ جو درجہ ایک دوسری جماعت کے ساتھ ساتھ ہیں۔ تیسری جماعت ایک سلف گورنمنٹ کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہے اور اشارہ قریب کر رہی ہے۔ وہ سماعت دور نہیں جبکہ یہ جماعتیں متحد ہو جائیں تو دولت، علم اور حکومت تینوں کا اجتماع قوم ہندو میں ہوا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے پہچانی ہوئی نظر سے اس جماعت کو دیکھا اور تڑپ کر رہ گئے، اس لیے کہ اس دور فرصت میں جبکہ ہندو اپنی قوم میں زندگی کی روح بچونک رہے تھے اور یکساں طرز پر ان اسباب کی فراہمی میں مصروف تھے، جن کے اجتماع کا نتیجہ قوم کا زندہ ہو جانا ہے۔ مسلمان نہایت المبدان و سکون سے اس راہ پر برابر قدم بڑھاتے جا رہے تھے، جس کا نتیجہ نیستی اور مردہ قوم بن کر رہنا ہے۔

یہ دولت بگاڑتے تھے، وہ ثروت بنا رہے تھے، یہ بیچتے تھے، وہ خریدتے تھے، یہ قرض سودی لیتے تھے وہ سود در سود کے پیچ میں ان کی جائدادیں مہول کرتے تھے، وہ پڑھ رہے تھے پڑھا رہے تھے یہ تعلیم کے نام سے کانپ کانپ اٹھتے تھے، وہ محنت کرتے تھے، جفاکشی اٹھاتے تھے یہ کاہلی اور تن آسانی کی لذتیں لے رہے تھے، وہ معاشرت میں کفایت شعاری ملحوظ رکھتے تھے یہ اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر معاشرت میں رنگینی پیدا کرتے تھے، وہ باہمی مخالفت مذہبی پھر بھی ایک زبردست مرکز اتحاد رکھتے تھے یہ سوداگر اور اختلاف کرتے تھے اور عداوت کی حد تک اسے پہنچا کر چھوڑتے تھے۔

آخر اس کا نتیجہ یہی تھا کہ دنیا میں باقی تو رہیں لیکن مفلس، جاہل اور بد اخلاق ہو کر نمونہ عبرت و بصارت ہوں۔ نہ ان میں حمیت ہو نہ غیرت، نہ صدق و صفا پایا جاتے نہ ہمد و وفا۔ ایسی حالت میں حریصانہ نظر سے ہندوؤں کی طرف

دیکھنا بجز اس کے اور کیا ثمرہ دیتا کہ حسرت و ارمان دل میں خون ہو کر رہ جائیں۔
موجودہ حالت میں یہ کس مرض کی دوا رہ گئے تھے جو انہیں ہنود اپنے میں
شامل کر لیتے؟ لے

یہی اُس وقت صورتِ حالات۔ مسلم لیگ جو خالص مسلمانوں کی جماعت تھی اور مسلمان ہند
کی خصوصیت سے واحد نمائندہ تھی اس موقع پر اس نے بھی ۱۹۱۶ء سے کانگریس کی ہمنوائی
بلکہ زنا ر دوستی اور بُت پرست نوازی کا المناک ثبوت دینا شروع کر دیا۔ مسلمانوں کی خلافت تو
یورپ کے مرنے میں تھی اور مسلمانانِ ہند کو ہنود نے ختم کرنے کا پروگرام بنالیا تھا، جس پر
گاندھی لیڈروں اور علمائے سوت کے ذریعے عمل کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران ۱۹۱۷ء میں ہنود نے
گانے کی قربانی کے بہانے مسلمانانِ کٹار پور کے ساتھ کیا سلوک کیا اور اُس موقع پر مسلمانوں
اور ہندوؤں کے لیڈر حضرات کا طرزِ عمل کس صورت میں سامنے آیا، یہ علامہ مرحوم کی زبانی سنئے:

انتہائے برا در نوازی اور حتی ہمسائیگی کی تازہ ترین مثال واقعہ کٹار پور ہے۔
ہندوؤں نے تو مسلمانوں کو بند مکان میں آگ لگا کر جلایا اور اُن کی جان و مال
اور آبرو کو نہایت بے دریغی و بے رحمی سے تباہ کیا لیکن جب مقدمہ حکومت کے
ہاتھوں میں پہنچا تو باوجود اس کے کہ عمائدینِ ہنود اُن خوریزِ ہندوؤں کی
حمایت میں ہر طرف سے ہر طرح کی امداد پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کے
لیڈروں نے بچاتے معاونت اور حقیقی عسکری کے یقین شروع کی کہ مسلمانانِ
کٹار پور یہ درخواستیں دیں، عرضداشتیں بھیجیں کہ ہم اپنا دعویٰ واپس لیتے
ہیں۔ گورنمنٹ ان مجرموں کو رہا کر دے۔ پھر جبکہ فیصلہ چھانسی کا سُنا گیا،
اُس وقت بھی مسلمانانِ کٹار پور کو دبا کر عفو کی خواستگاری میں انتہائی کوشش
عمل میں لاتی گئی اور آخر کار گورنمنٹ میں درخواست بھجوا ہی دی گئی۔ اس بذل
و کرم کے اسباب رموز و امرا ہیں۔ بجز لیڈروں کے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ

مسلمانانِ کٹار پور کا خون رائیگاں کیوں قرار دیا گیا؟ اُن کے ورثا کو اس سنگدلی کے فیصلہ پر راضی ہو جانے کے لیے کیوں مجبور کیا گیا، ہندوؤں نے کیا عوض اس احسان کا پیش کیا؟ ان سوالوں کا جواب حضرات لیڈر ہی دے سکتے ہیں بشرطیکہ ان سوالوں کا قابل جواب ہونا خیال بھی فرمائیں۔ ۱

مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں نے مسلمانانِ کٹار پور کے ساتھ کیسی ہمدردی کا سلوک کیا یہ بھی مولانا سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی ملاحظہ فرمائیے جو تاریخ کا ایک المناک واقعہ ہے۔

”ہندو نوازی میں مبالغہ و غلو اس سے سمجھنا چاہیے کہ دورانِ مقدمہ میں مسلمانانِ کٹار پور کے پاس لیڈروں کے صحائف پہنچے لگے کہ گائے کی قربانی موقوف کرو۔ ان صحائف میں مستغنی عن الاقارب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی کے صحیفہ کو امتیاز خصوصی حاصل ہے۔ بعض حضرات خود تشریف لے گئے تاکہ مسلمانانِ کٹار پور کو گائے کی قربانی سے باز رکھا جائے۔“ ۲

دوستی اور محبت کا ثبوت دینا طرفین کے لیے ضروری ہے لیکن اس وقت مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے ہندو کے دوست نہیں بلکہ غلام اور بندہ بے دام تھے اور وہ ملتِ اسلامیہ کو گاندھی کے قدموں پر بھکا کر اس ملتِ فردوسی کے صلے کی سوراخ کے وقت قیمت وصول کرنے کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ چونکہ وہ دوستی کا دم بھرتے تھے جس کے باعث ہر ذی ہوش کے دماغ میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ :

اگر قوم ہندو اور اس کے فدائیانِ مسلم سے سوال کیا جائے کہ کوئی واقعہ ایسا ہی مثل کٹار پور کے پیش کریں جس میں مسلمانوں نے ہندوؤں پر اس طرح وحشیانہ ظلم کیا ہو، پھر ہندو لیڈروں نے اپنے عوام کو اس طرح درگزر کرنے پر مجبور کیا ہو اور ان سب مراحل کے بعد اپنی قوم سے اُسی مذہبی عمل کے ترک

کرنے کی اپیل بھی کی ہو، اگر اس کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو پھر اس پُریچ لیڈری اور ژولیدہ خیر خواہی ملت و مذہب کے سمجھنے میں اگر کچھ الجھن پیدا ہو جاتے تو اس پر غتاب و خفگی کیوں نازل کی جائے؟ اس وقت صورت حال کیا تھی؟ عالمی حالات کس صورت میں رونا ہورہے تھے اور دولت عثمانیہ کے خلاف اسلام دشمن طاقتیں کیا کچھ کر چکی تھیں اور اس کی تباہی کے لیے کیا کر رہی تھیں؟ یہ ہر پڑھے لکھے فرد پر واضح ہے، لیکن مسلمانوں کو اس پریشان کن موڑ پر ہندو کی بے وفا قوم نے کس طرح اسلامیان ہند کو محبت کے جال میں پھنسا کر صفحہ ہستی سے مٹانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا، اس کی ایک ابتدائی کڑی ملاحظہ ہو:

۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے بعد مفاہمہ اتحاد کا آواز بلند کیا۔

اس وقت مسلمانوں کی خلافت مقدسہ، دولِ یورپ کے نرغہ میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس لیے مناسب یہی تھا کہ مسلمان ہند مقامی اور وطنی نزاعات کو صلح اور رستی کے ساتھ طے کر لیں اور یورپی توجہ سے خلافت اور مقامات مقدسہ کی حفاظت پر تذاہیر سوچ کر عمل آرا ہوں۔ لیکن ہندو مسلمانوں کے اس عالم پریشانی سے بغیر فائدہ حاصل کیے کیونکہ رہ سکتے تھے۔ ایک دو بڑے ہندو لیڈروں نے تو سحر آمیز افسوں خوانی لیڈرانِ مسلم کے کانوں میں بصیغہٴ راز شروع کی اور باقیہ نے مل کر ایک قیامت آورہ اور شاہ آباد میں بپا کی۔ دوسرے سال گٹار پور میں اپنی عداوت کا نہ ٹٹنے والا ثبوت پیش کیا۔

ہندوؤں نے آورہ، شاہ آباد اور گٹار پور میں اپنی بہیمیت کا اظہار محض اسلام دشمنی سے بدست ہو کر کیا تھا۔ چوٹی کے ہندو لیڈر تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ لگاتے، مسلمان لیڈروں کو اس اتحاد کی تبلیغ کرنے پر آمادہ کرتے رہتے اور باقی لیڈر مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے کی

لگن میں اسلامیان ہند کے خون سے اپنے ہاتھ رنگنے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ہندو لیڈر مسلمانوں پر قیامت کرواتے اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے ہندوؤں کے آگے سجدہ ریز ہونے میں کوتاہاں رہتے اور مسلمانوں کو ہندوؤں کی ناز برداری پر آمادہ کرنے میں اپنی پوری صلاحیتیں صرف کیے ہوئے تھے۔ اس وقت اسلام کا حقیقی در در کھنے والے اور مسلمانوں کے خیر خواہ یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ:

”مذہب و ملت کے پتے ہمدرد اُسی وقت کھٹک گئے تھے کہ یہ عنایت اور یہ باہمی آمیزش مسلمانوں کے کسی وطنی و مذہبی حق کو سلب کیے بغیر نہ رہے گی۔ چنانچہ یہ نتیجہ آج اُسی عنایت اور قرآن کا ہے جو گانے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑائی جاتی ہے۔ موحّدین کی پیشانی پر قشقہ جو شعارِ شرک ہے کھینچا جاتا ہے۔ مساجد اہل ہندو کی تفریح گاہیں، مندر مسلمانوں کا ایک مقدّس معبد ہے۔ ہولی شعارِ اسلام ہے جس میں رنگ پاشی اور وہ بھی خاص اہل ہندو کے ہاتھوں سے جبکہ وہ نشہ شراب میں بدست ہوں عجب دلکش عبادت ہے۔ بُتوں پر ریوڑیاں چڑھانا، ہار پھولوں سے اُتھیں آراستہ کرنا، پھولوں کا تاج اصنام کے سروں پر رکھنا، خالص توحید ہے بلکہ مسائل ان صورتوں میں اس لیے ڈھل گئے کہ ہندوؤں کی دلنوازی اور امتزضا سے زیادہ اہم نہ توحید ہے نہ رسالت معاذ اللہ، لَعُوْذُ بِاللّٰهِ ثُمَّ لَعُوْذُ بِاللّٰهِ“ لے

اب مسلمانوں کی ایک نمائندہ جماعت یعنی مسلم لیگ کی کارگزاری ملاحظہ ہو کہ مسٹر گاندھی اور لیڈرانِ ہندو جو کچھ چاہتے تھے، مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والے کس طرح اپنی بدنصیب قوم کو فریب میں مبتلا کر کے بت پرست نواز بنانے اور گاندھی کے قدموں میں جھکانے کے لیے کیسے کیسے جتن کرتے ہیں؟ بنیاد ملاحظہ ہو:

”۱۹۱۸ء میں مسلم لیگ کا جلسہ بھی دہلی میں ہی منعقد ہوا تھا۔ مجلس استقبالیہ کے

صدر نے جو اپنا خطبہ اس وقت پڑھا ہے اُس میں مسئلہ خلافت کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہوئے ترکوں کی حمایت میں صدائے احتجاج بلند کی ہے۔ برسوں کا جھولابو اسبقی جو آج یاد آیا ہے، یہی عامرہ مسکین کے تالیفِ قلوب کا پہلا سنگِ بنیاد ہے جسے ڈاکٹر انصاری صاحب نے بحیثیت صدر مجلس استقبالیہ مسلم لیگ اپنے ہاتھوں سے رکھا۔ اُس سال کی قومی و ملکی مجالس میں صرف اس قدر کارروائی ہوئی کہ مدن موہن مالویہ صاحب نے مسلمانوں کو دل آزاری ہندو سے منع فرمایا اور ڈاکٹر انصاری صاحب نے حمایتِ خلافت کا علم بلند فرمایا۔ علمائے سیاسی نے بھی وقت شناسی سے کام لے کر اس موقع پر اپنے فتوے کا اعلان ضروری سمجھا۔

اس بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جانے والی تھی اُس کے مختلف اجزا کیا تھے؟ وہ کیا اغراض و مقاصد تھے جن کو حاصل کرنے کی خاطر یہ ہندو مسلم اتحاد کا ڈھونگ رچایا جا رہا تھا، چنانچہ اس سلسلے کا ابتدائی کام ملاحظہ ہو:

”انہیں آیام میں مسٹر گاندھی اپنے دورانِ سفر میں بعض ایسے لیڈروں سے ملاقات کرتے ہیں جو قومی اور ملکی مجالس میں اپنی معذوریوں سے شریک نہیں ہو سکے تھے۔ پھر اسی کے ساتھ سستیہ گروہ اور ہڑتال عام اور رفیع امتیاز مسجد و مندر، جس کے محرک گاندھی ہیں، اسے بھی منظم کر لیجیے۔ جب یہ متفرق اعمال جن میں بظاہر کوئی سلسلہ معلوم نہیں ہوتا، اپنے اپنے موقع و محل پر انجام پا چکے، تو اب ۱۹۱۹ء میں بتاریخ ۱۷ نومبر بمقام دہلی خلافت کمیٹی کا سنگِ بنیاد پڑتا ہے۔ اُس موقع پر ہندو بھی ایک کافی تعداد میں بحیثیت نمائندہ شریک ہوئے، جن میں خصوصیت کے ساتھ مسٹر گاندھی کا نام قابلِ ذکر ہے، جنہوں نے اس خالص مذہبی جلسہ کے ایک اجلاس میں صدارت بھی فرمائی تھی اور علمائے سیاسی نے آپ کے تشکر و

اتقان میں وہ سب کچھ ارشاد فرمایا جس کا جذبہ عقیدت اور جوش اتباع و تقلید مقتضی تھا۔

اظہارِ تشکر کے ذیل میں مولانا صاحب (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) نے اس کا بیان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ مسٹر گاندھی صاحب کے اخلاق اور گفتگو سے میں یہاں تک متاثر ہو چکا ہوں کہ گائے کی قربانی میں نے ترک کر دی۔ جلسہ خلافت کے مقاصد اور اصول عمل اسلامی و دینی سے ترک قربانی کا ذکر کا تعلق کچھ ہو یا نہ ہو لیکن یہی جملہ جو بطور حکایت بیان ہوا اور جو الفاظ سرسری طور پر اُٹاتے تشکر و اتقان میں آگئے فی الحقیقت یہ ایک زبردست دیباچہ اور مقدمہ تھا اُس کتاب کا جو آئندہ ماہ دسمبر میں اُسی سال عامۃً مسلمین کے لیے تصنیف ہونے والی تھی۔ اسی کے ساتھ خلافت کے نام سے جو ایک ہڑتال ہوئی اُسے تمہید کتاب سمجھ لیجیے۔

جب دسمبر کا مہینہ آیا تو امرتسر میں تحریک خلافت کا جلسہ ہوتا ہے۔ مسلم لیگ کے صدر محترم یعنی عالیجناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں دہلوی صدارت فرماتے ہیں۔ اپنے خطبہ صدارت میں اظہار فرماتے کہ ہندو کی محبت کا دم کیوں بھرا جا رہا ہے، تحفظ خلافت کا ڈھونگ کس مقصد کی خاطر چلایا جا رہا ہے؟ گاندھوی علماء اور مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں نے گائے کی قربانی پر کس طرح ہاتھ صاف کیا؟ خوفِ خدا اور خطرہٴ روزِ جزا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کیونکر شریعتِ مطہرہ پر ظلم ڈھایا اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی مذموم جسارت کی؟

اب دسمبر کا مہینہ آتا ہے اور قومی مجالس کا انعقاد امرتسر میں ہو رہا ہے۔ مسلم لیگ کے صدر مستغنی عن اللقب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب رئیس دہلی اپنا خطبہ صدارت پڑھتے ہیں جس کی بے شمار کاپیاں ملک میں تقسیم ہو چکی ہیں۔ تقریباً چار صفحوں میں صدر مسلم لیگ نے مسئلہ قربانی سے بحث فرمائی ہے۔ ابتدائی جملہ یہ ہے: گاؤں کا دشمن کا ذکر ہم لوگ ایک عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں کرتے رہے ہیں

لیکن اب وقت آگیا ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق زیادہ صفائی اور زیادہ وضاحت کے ساتھ ذکر کیا جائے۔

ص ۳۲ میں نہایت سوز و گداز کے ساتھ ہندوؤں کی غایت و کرم کا ذکر فرمایا گیا ہے اور ص ۳ پر مذہبی نقطہ نظر سے اس مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے یوں ارشاد ہوتا ہے — ”ہندوستان کو چھوڑ کر تمام عرب، شام، مصر، طرابلس اور ایشیائے ترکی وغیرہ کے مسلمانوں کو دیکھیے جن میں سے کروڑوں کی تعداد نے زندگی بھر اس سنت کو بغیر گائے کی قربانی کے ادا کیا ہے۔“ عوام بجا پر اس پُرپیچ تاریخی جملہ سے یہ سمجھے کہ گائے کو قربانی کے لیے تمام بلاد اسلامیہ کے مسلمان چھوڑتے بھی نہیں، لیکن خفیف سایہ شبہ عوام کو رہ جاتا تھا کہ شاید اس دور سے پیشتر عہد رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں گائے قربانی ہوتی ہو۔ اس شبہ کو مٹا دینے کے لیے حکیم صاحب نہایت شد و مد سے ایک حدیث میں کچھ اپنی طرف سے اضافہ فرماتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے ہیں: — ”اس حدیث سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں علی العموم بکری کی قربانی کا رواج تھا۔“

مسلم لیگ میں جب یہ ریزولیشن پیش ہونے لگے تو ڈاکٹر انصاری صاحب نے ترک قربانی کا ڈاکٹر زولیشن پیش فرمایا، جو تھوڑی خوش بیانیوں کے بعد منظور ہو گیا۔ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محل نے قومی و ملکی مجالس سے مراجعت فرماتے ہوئے سہارن پور میں ایک تقریر فرمائی جس میں مسئلہ قربانی کے متعلق جو کارروائی مسلم لیگ نے انجام دی تھی اس کی تائید و تحسین میں کافی زور دار الفاظ ارشاد فرمائے۔

مستغنی عن الالقاب حکیم حافظ محمد اجل خاں صاحب رئیس دہلی کا مسلمانان گٹار پور کے پاس صحیفہ متعلقہ ترک قربانی کا ڈبھیچنا، ڈاکٹر انصاری صاحب کا خلافت کی حمایت میں ایک سال قبل صدائے احتجاج بلند فرمانا، پھر نمبر

میں جلسہ خلافت کا انعقاد اور گاندھی صاحب کی ایک جلسہ میں صدارت اور مولانا عبدالباری صاحب کا اثنائے تشکر و امتنان میں ترک قربانی گاؤ کا سرسری تذکرہ، پھر دوسرے ہی مہینے میں چند ہفتوں بعد مسلم لیگ کا جلسہ اور اُس میں انھیں ارکانِ ثلاثہ کا یکے بعد دیگرے اس مسئلہ کو اس طرح طے کر ڈالنا کہ مستغنی عن الالقب عالیجناب حکیم صاحب خطبہ صدارت میں ملکی، سیاسی اور مذہبی پہلو سے ترک قربانی گاؤ پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ریزولیشن کی شکل میں پیش فرماتے ہیں، جو منظور ہو جاتا ہے۔ مولانا عبدالباری صاحب سہارن پور پہنچ کر تحسین و تائید فرماتے ہیں۔ اب وہ نذرانہ اور گراں بہا تحفہ جو سرکار ہند میں پیش ہونے والا تھا، جس کے لیے سارے اہل دربار ہمہ تن جہنم براہ تھے، جس کا ذکر مسٹر مانلیگو کے سامنے پیش ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے وفد نے اپنے ایڈریس میں کیا تھا، نیز جس کے متعلق عرصہ سے اشاروں اور استعاروں میں ذکر ہوا تھا، اب وہ اس قابل ہو گیا کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہاتھ اس نذر و دیدہ میں شامل ہو۔

علامہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے گاندھی عیسیٰ اور لیڈروں کی شرمناک روش، اسلام دشمنی اور ریت پرست نوازی پر تاسف کا اظہار فرماتے ہوئے اس حقیقت کے چہرے سے نقاب کشائی کی ہے کہ مسلمان کہلاتے ہوئے ان حضرات نے ایسی گندی روش کیوں اختیار کی؟ وہ فرماتے ہیں:

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہندو ترک قربانی گاؤ کی تحریک کرتے تو عامہ مسلمین ہرگز اُس کو تسلیم نہ کرتے۔ لیڈر صاحبان بھی اگر اس کی اپیل سیاسی اور ملکی پہلو سے پیش فرماتے تو ناکامیاب رہنے کا ظن غالب تھا۔ اس جیسے

مسئد کے لیے اسی کی ضرورت تھی کہ شرعی اور مذہبی لباس میں اسے مسلمانوں کے سامنے لایا جائے۔ یہ نیپولین کی پالیسی تھی کہ وہ مذہب کا نام نہایت گرم جوشی سے لیتا اور مذہبی بننے میں کمال مبالغہ سے کام لیتا تھا۔ ہتک کہ بعضوں کو اس کے اسلام و مسلمان ہونے کا دھوکا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ "نالیف قلوب کا یہی ایسا وجہ ذریعہ ہے جسے ہمہ گیری کا حق حاصل ہے۔" نیپولین کی اسی پالیسی کو مدنظر رکھ کر اس وقت لیڈروں نے بھی مقاصد کانگریس کی تکمیل کے لیے جو مجلس منعقد فرمائی ہے اُسے دکش و گیر بنانے کے لیے خلافت جمیٹی کا لقب دیا ہے تاکہ نہایت مہولت سے مسلمان ہندوستان کی گردنیں ہندوؤں کی غلامی و اطاعت میں سر بسجود ہو جائیں۔

برعکس نہند نام زنگی کا فوراً لے

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس خلافت جمیٹی نے جو تحفظ خلافت و مقامات مقدسہ کی خاطر وجود میں آئی تھی آیا اس نے خلافت کی بازیابی اور حفاظت کے لیے ایک قدم بھی بڑھایا، مقامات مقدسہ کی حفاظت کا دم بھرنے والوں کے پاؤں میں یہ فریضہ ادا کرتے ہوئے کیا ایک کانٹا بھی لگا، اگرچہ خواب میں ہی سہی، مسلمانوں کو کیا خبر تھی کہ یہ حضرات سوراج یا رام راج کو خلافت قرار دے رہے ہیں۔ مقامات مقدسہ کی حفاظت سے ان بانیوں کی مراد یہ ہے کہ بتوں کا مسلمانوں سے احترام کروائیں گے اور اپنی زنا ر دوستی کا زندہ ثبوت پیش کرنے کی خاطر سب سے پہلے گائے کی قربانی مسلمانوں سے چھڑانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر دکھائیں گے۔ تحریک خلافت کا کارنامہ ملاحظہ ہو:

خاص دہلی میں عشرہ ذی الحجہ کے موقع پر اُونٹوں کا گشت، جن پر جلی قلموں میں اس طرح کے فقرات تختوں پر چسپاں، جن سے ہر مومن کا دل کانپ کاںپ اٹھتا تھا، لکھ کر خوب خوب مشتہر ہوئے۔ پھر نہایت سخی سے بعض مجبور کرنیوالی

تباہی سے بھی انسداد کافی کیا گیا۔ بمبئی کے مسلمانوں پر بھی خلافت کمیٹی نے قربانی کا دُ
پر ستم کرنے میں کچھ کمی نہیں کی۔ خلافت کمیٹیاں کیا ہوئیں کہ گاتے کی قربانی کرنے
والوں پر ایک آفت و بلا ہوئی۔

اب سے قبل جو حصہ ظلم کا ہندوؤں سے باقی رہ گیا تھا اُسے فدائیانِ ہندو نے
اسلام کا نام لے کر مسلمانوں پر تمام کر دینے کا عزم بالجزم کر لیا ہے یا رحم
الراحمین! ہم مسلمانوں پر رحم فرما اور اس آتے ہوئے فتنہ کو ہمارے سروں
سے دُور کر مجرمۃ النبی واللہ الامجاد۔ طرفگی کر اگر کوئی برسیلِ خیر خواہی
و نصیحت دینی ان لیڈروں کے طرز میں کچھ اصلاح پیش کرے یا ترمیم کا خواستگار
ہو تو اُسے کافر، بے دین، قوم فروش، غدار وغیرہ کہہ کر مجمع و محفل میں فضیحت
کر ڈالیں۔ عوام کی فوج ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اُنہیں جس پر چاہا بھڑکا دیا،
بھکا دیا۔ اہل حق اپنے گھروں میں خاموش بیٹھے ہیں اور اپنی مظلومیت کی بولی تباہ
و تعالیٰ سے فریادیں کرتے ہیں۔ نجات کی دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ ظلم اپنے نشہِ ظلم
میں سرشار و غافل اُمت کی تباہی میں سرگرم ہیں۔ وہ ساعت دُور نہیں
جبکہ رحمتِ الہی مظلوموں کی فریاد پر لبیک عبدی فرما گئے۔ لے

خلافت کمیٹیاں نو مسلمانوں پر یوں ظلم و ستم ڈھا رہی تھیں۔ بُت پرستوں کی محبت بلکہ
نشہِ غلامی میں سرشار ہو کر مداخلت فی الدین اور تخریبِ دینِ متین کی مرتکب ہو رہی تھیں۔
اس موقع پر مسلم لیگ اور اُس کے صدرِ محترم یعنی عالیجناب حکیم محمد اجمل خاں صاحب
دہلوی خلافت کمیٹی سے بھی سبقت لے جانا چاہتے تھے تاکہ سوراخ کی صورت میں اپنے
گانڈھی ہمارا ج سے دوسروں کی نسبت زیادہ انعام و اکرام کے مستحق قرار پائیں۔ موصوف
کی ایک ہونٹاک اور لرزہ خیز جھارت ملاحظہ ہو:

”جلسہ خلافت کی بنیاد ۱۹۱۶ء کی، نومبر کو بمقام دہلی جبکہ ہندو اور مسلمانوں

نے مل کر رکھی اور پھر اس کی کارروائیاں اخبار و جرائد میں مطبوع ہوئیں۔
 حیرت ہوتی تھی کہ الہی ایہ مسلمانوں کی عقل کو ہو کیا گیا ہے، جو اب عالم الغیب،
 قادر مطلق، سمیع و بصیر سے بھی پالیسی کرنے لگے، اسی حیرت میں تھا کہ لیگ
 کا جملہ ہوا اور حکیم حافظ محمد اجل خاں صاحب کا خطبہ صدارت دیکھنے میں آیا۔
 وہاں بھی وہی رنگ مغالطہ سترتا سرا پایا گیا، بلکہ حکیم صاحب نے ایک قدم
 بڑھ کر یہ جرات بھی فرمائی کہ حدیث شریف کا ایک جملہ نقل کرتے ہوئے ایک
 لفظ بڑھا دیا اور الخ لکھ کر ترجمہ اور نتیجہ بیان فرمایا۔ وہی لفظ جس کا اضافہ فرمایا گیا
 وار و مدارِ دلیل، اُسی کی وجہ سے چند سطور کی تحریر الخ لکھ کر ناقص چھوڑنے
 سے یہ فائدہ کہ ناظرین کا ذہن اس بے ربط اضافے سے متوحش نہ ہونے پائے۔
 چند روز تک سمجھ میں نہ آیا کہ اس طرح جعل اور تحریف سے کیا مدعا و مقصود ہے؟
 آخر ایک خط لکھا، جس میں نہایت نیاز مندانہ طور پر یہ سوال تھا کہ حضرت
 ام سلمہ سے مروی روایت کس کتاب سے آنجناب نے نقل فرمائی؟ جواب
 میں سکوت رہا۔ شاید خط ضائع ہوا۔ فقیر خود دہلی گیا۔ یہ رجب کی اوائل تاریخوں
 کا ذکر ہے۔ مسلم یونیورسٹی کا وفد اُس وقت دہلی گیا ہوا تھا۔ درِ دولت پر
 جا کر معلوم ہوا کہ طبیعت نامناسب ہے، پاؤں میں کچھ شکایت ہو گئی ہے۔ دوسرے
 دن پھر پہنچا۔ معلوم ہوا کہ مدن موہن مالویہ صاحب سے کچھ مشورہ ہو رہا ہے
 بعض حضرات اہل علم جن کی آمد و رفت جناب حکیم صاحب کے یہاں جاری ہے
 ان کی خدمت میں پیام بھیجا کہ حدیث شریف میں جو غلطی ہو گئی ہے اُس کی
 تصحیح کی طرف حکیم صاحب کو توجہ دلائیے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے
 کہ یہ کوشش بھی بے اثر ثابت ہوئی۔

چوتھی رجب کو سرکارِ اجیرا ستانہ غریب نواز پر حاضر ہوا۔ ایک دن
 بعض علماء سیاسی سے ملاقات ہوئی۔ عرض کیا کہ یہ فتنہ عظیم ہے۔ ہندو کی
 خاطر مسلمانوں کا گلہ نہ گھونٹئیے۔ دیکھیے حدیث میں جعل و تحریف تک کی نوبت

آگئی۔ تین مہینے گزر گئے اور کوئی اعلان نہیں کرتا ہے کہ اصل حدیث میں لفظ شتہ نہیں ہے، غلطی سے لکھ گیا ہے۔

ہر ایک شخص جس کے پاس خطبہ صدارت مسلم لیگ ہو اس مقام خاص کی تصحیح کرے نیز علماء موسسین اتحاد ہند و مسلم کا یہ فرض ہے کہ اتحاد کے حدود متعین فرمائیں۔ عوام کو تشفقہ لگانے اور مندروں میں جا کر ریوڑیاں بنوں پر چڑھانے سے منع کریں اور ان الفاظ کی شناخت کھلے لفظوں میں بیان فرمائیں ورنہ ایمان کی بربادی کا خطرہ ہے۔ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ فقیر کی اس اتھاس کی علمائے سیاسی کی خدمت میں ذرہ برابر بھی شنوائی نہ ہوئی۔ آج تک وہی سکوت ہے، وہی اعراض ہے، وہی چشم پوشی ہے۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ رہے سہے اعمالِ قبیحہ مسلمانوں نے تنک آنجمانی کی مصنوعی لاش کے موقع پر ادا کیے اور علمائے سیاسی نے پھر اپنے سکوت سے ان امور کے جواز و استحسان پر تازہ مہر ثبت فرمادی۔ ۱۷

اس سلسلے میں اظہارِ حق کی خاطر ان حضرات کو خوب سمجھایا گیا۔ خوفِ خدا اور خطرہ روزِ جزا یاد دلایا گیا لیکن جس طرح بنی اسرائیل کسی وقت بچھڑے کی محبت میں سرشار ہو گئے تھے کچھ اسی طرح اس بد نصیب قوم کے وہ گمراہ لیڈر اور گمراہ علمائے سوگاندھی جیسے پُر اسرار دشمنِ اسلام و مسلمین کی محبت میں ایسے بدست ہو چکے تھے کہ کسی فہمائش کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ اسی سلسلے کی مزید کارگزاری ملاحظہ ہو :

”کان پور میں بمابہ وجب ایک بڑے پیمانے پر علماء کا جلسہ ہوتا ہے۔ وہاں کے بعض کارکن علما سے یہ استدعا پیش کی گئی کہ مسلمانوں کو اعمالِ شرک و کفر میں شریک ہونے سے باز رکھیے اور قربانی گاؤں کے متعلق غلطی تسلیم کر لیجئے۔ لیکن جواب وہاں سے بھی سکوت ہی میں ملا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر

انتہائی بے قراری میں فقیہ نے رسالہ الرشد لکھا اور مسلمانوں کو امرِ حق سے آگاہ کیا۔ اس رسالے کی اشاعت اول عشرہ رمضان المبارک میں ہوئی۔

لیڈرانِ قوم کے پاس ٹکٹ چسپاں کر کے نسخے بھیجے گئے۔ تین ماہ کے عرصہ میں تقریباً تین ہزار نسخے مختلف اصناف و قصبات میں تقسیم ہوئے۔ اب آ کر جبکہ خطبہ صدارت مسلم لیگ کو آٹھ مہینے اور الرشد کی اشاعت کو کامل تین مہینے گزر چکے، حکیم صاحب اپنی غلطی کا اعتراف پیچ در پیچ اعتراض و سوال واپس کے لپیٹ میں تحریر فرماتے ہیں۔ حالانکہ مذہبی نقطہ نظر سے یہ ایسی خطائے فاحش تھی جس کا اعلان بلا جواز توقف حکیم صاحب کو بذریعہ تار مختلف و متعدد اخبار و جرائد میں اب سے بہت قبل کرنا تھا۔ ساتویں ذی الحجہ کا اخبار البشیر جو بیرونِ جات میں عین بقرعید کے روز پہنچتا ہوگا، اُس میں اس طرح اعتراف کرنے سے مقصد و مطلب ہے کہ مسلمانوں کو اقرار کا علم بھی اُس وقت ہو جبکہ سب مراحل قربانی کے طے پا جائیں۔ اسی کے ساتھ حق پسندی کی داد مل جائے گی۔ خیر یہ تو اپنا اپنا ذوق مذہبی ہے۔

جس کے دل میں حدیثِ مصطفویٰ کی عظمت ہے وہی یہ بھی جان سکتا ہے کہ اس طرح کی خطا کا کفارہ کیونکر ادا ہوتا، فجے تو حکیم صاحب کے ایک سوال کا جواب دینا ہے جسے موصوف نے اپنی غلطی کا اعتراف فرماتے ہوئے آخر میں پیش فرمایا ہے۔ حکیم صاحب تحریر فرماتے ہیں: — ”میرے

اوپر ایک یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ حدیث اذا اساد احمد کہ ان یسئخ بالثناء میں آخری لفظ ستاء کا کسی کتاب میں نہیں ہے۔ میں اس اعتراض کو قبول کرتا ہوں اور یہ بات ظاہر کرنی ضروری خیال کرتا ہوں کہ یہ لفظ محض غلطی کی وجہ سے لکھا گیا، دراصل یہ کسی حدیث کا جزو نہیں ہے لیکن میں نہیں سمجھ سکتا کہ اعتراض کرنے والے بزرگ اس سے کیا فائدہ حاصل کر سکتے ہیں؟“

فقیر نے حکیم صاحب پر اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ ایک حقیقی اور واقعی امر کا اظہار کیا تھا۔ رہا فائدہ، وہ حکیم صاحب ہی بیان فرمائیں کہ کون سا مقصد حاصل کرنا تھا جس کے لیے حدیث میں اضافہ کی حاجت ہوئی اور اب کہ غلطی کا اعتراف ہے، اُن پانچ سطروں کا خطبہ صدارت میں کیا فائدہ ہے؟ فقیر کا اس کشفِ حقیقت سے صرف یہی مدعا تھا کہ عالیجناب حکیم صاحب اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائیں اور مسلمانوں کو بھی یہ معلوم ہو جائے کہ ایک لفظ اپنی طرف سے بڑھانا اور اُسی اضافہ کو مقامِ استشہاد میں لانا، اُس خطبہ صدارت میں صرف اُسی ایک جگہ ہوا ہے جہاں حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم منقول ہے۔ بقیہ سارے حوالے اعیان و وزراء نے انگلستان کے صحیح ہیں، کسی طرح کے شک و شبہ کو اُن میں دخل نہ دینا چاہیے۔ اس کے سوا نہ کوئی مدعا نہ کچھ اور فائدہ۔ اربابِ بصیرت جن کی آنکھیں نورِ ایمان سے منور ہیں اُنہوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ آیا اسلام اور اسلامی خلافت کی حمایت کی جا رہی ہے یا کفر و شرک کا طغیان ہے جو مسلمانانِ ہند پر لایا جا رہا ہے۔

خواجہ حسن نظامی دہلوی کی روش زمانے بھر سے زالی تھی۔ موصوف کبھی گنگارام تھے تو کہیں جمناداس۔ کسی معاملے میں اہلسنت و جماعت کے ساتھ تو کسی میں بد مذہبوں کی ہمنوائی۔ قربانی گاؤ ہی کا تذکرہ ہے تو خواجہ صاحب بھی بُت پرست نواز ثابت ہوئے موصوف کے بارے میں مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

”خواجہ حسن نظامی صاحب کا ایک مضمون ۱۹ اگست (۱۹۲۹ء) کے اخبار حق لکھنؤ میں چھپا ہے، جس میں آپ نے مجالسِ عید میلاد کی تائید کرتے ہوئے مسلمانوں سے تحریک کی ہے کہ وہ ۱۲ ربیع الاول کو

ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کا ذبح ترک کریں۔ خواجہ صاحب کی یہ پہلی ہی ہندو نوازی نہیں ہے بلکہ اس سے قبل وہ ترک گاؤ کشی نام کا ایک رسالہ بھی لکھ چکے ہیں اور اکثر اوقات اُن کے خامہ ناطق رقم سے اس قسم کے مضامین نکلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ہندوؤں کے سیلابِ قصبہ طوفانِ عناد کی شدت و تیزی کو دیکھتے ہوئے بھی کوئی بھی خواجہ اسلام مسلمانوں کو خوشامدی بن جانے کی اجازت دے۔

نہ ہم خواجہ صاحب کو اتنا نادان سمجھتے ہیں کہ وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہ ہوں کہ خوشامدی ہمیشہ ذلیل و خوار رہا کرتے ہیں اور ظالموں کی جرأت اور دلیری خوشامد سے اور بڑھتی ہے۔ نہ خواجہ صاحب اتنے بے خبر ہیں کہ ہندوؤں نے جو مسلمانوں پر دشنامِ مظالم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اُس کی اُن کو خبر نہ ہو۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو ضرور معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کی پاسداری اور دلجوئی کا تصور بھی کبھی ہندو دماغوں میں نہیں ہوتا، تو وہ کس طرح مستحق ہیں کہ اُن کی دلجوئی کے لیے مسلمان اپنے خورد و نوش میں پابندیاں لازم کر لیں اور ایسی غذا جو انھیں مرغوب بھی ہے اور اُن کی معاشرت و اقتصادی حالت کے مناسب بھی ہے، اُس کو ترک کر دیں۔ یہ بھی خواجہ صاحب کو خوب معلوم ہو گا کہ ہندو منت شناس اور سپاس گزار قوم نہیں ہے کہ وہ کسی کا احسان مانے یا کسی کے بہتر سلوک کو یاد رکھے بلکہ وہ احسان کا لفظ بھی اپنی طرف آنے دینا گوارا نہیں کرتے۔

ہلاکتِ ٹھیکٹی (خلافتِ ٹھیکٹی) کے عہد میں جب قربانی گاؤ ترک کرنے پر خواجہ صاحب جیسے لیڈر بہت زور دے رہے تھے، اُس وقت بھی ہندو لیڈروں نے صاف کہہ دیا تھا کہ مسلمان اگر قربانی گاتے چھوڑیں گے تو اُس کا ہندوؤں پر کچھ احسان نہ ہو گا۔ ان حالات میں ہم نہیں سمجھتے کہ ذبیحہ گاؤ کو روکنے کی تحریک خواجہ صاحب کے دل میں کس سبب سے پیدا ہوتی ہے؟

اس کا سبب و محرک کیا ہے؟ اور وہ اس میں اپنا کیا نفع مد نظر رکھتے ہیں؟ یہیں اُن کی ذاتیات سے کچھ بحث نہیں لیکن مسلمانوں کو اس خطرناک مشورہ کی ناگفتگو سے مطلع کرنا ضرور تھا۔

ہندو مسلم اتحاد کی خاطر دہلی اور شملہ میں کانفرنسیں ہوئیں۔ مسلمانوں کی جانب سے وہی لیڈر اور علماء اُن مواقع پر بلائے گئے جو ہندوؤں کے ہاتھوں یک چکے تھے۔ مسلمانوں کی قیادت اور نمائندگی کا دم بھرتے لیکن تگ و دو ہندو مفادات کے تحفظ میں کرنے اور ملت اسلامیہ کو خلافت کا نعرہ سنا کر گاندھی کے قدموں میں ڈالتے تھے۔ ایسے حضرات کے بارے میں قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا:

”دہلی و شملہ میں جو مجلسیں ہوئیں اُن میں بیشتر وہ اصحاب شامل تھے جنہیں مسلمان ہندوؤں کا نفسِ ناطق سمجھتے اور جو مسلمانوں کے دینی و مذہبی حقِ قربانی اور ذبیحہ گاو کو روکنے کے لیے ماضی قریب میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہیں ہمارے ہندوؤں کی خوشنودی اُن کا مطمح نظر اور نصب العین رہا ہے۔ ایسے اصحاب مسلمانوں کے حقوق کی کیا حفاظت کر سکیں گے؟ شملہ کی مجلس میں جھٹکے کے طریقے سے قتلِ حیوان اور اُس کے گوشت کے عام فروخت کو ناقابلِ اعتراض تسلیم کر لیا۔ ان صاحبوں کو یہ خبر نہیں کہ ہندوؤں کی گوشت خور قومیں مسلمانوں کے ذبیحہ کو بے تکلف کھا سکتی ہیں اور انہیں اُن کا مذہب اس سے نہیں روکتا اور مسلمانوں کے مذہب میں جھٹکا حرام ہے۔ جب بانداروں میں جھٹکے کی دکانیں عام طور پر کھل جاتیں گی تو جاہل ناخواندہ دیہاتی مسلمان اُس سے دھوکا کھائیں گے اور ایک مصیبتِ عام میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہندوؤں کی تجویزوں میں سور کے گوشت کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے لیکن اس پر ان صلح کے علمبرداروں کو کوئی اعتراض نہوا۔

ہندو تو یہ کہتے ہیں کہ کسی ایسے رقبہ (علاقے) میں گائے ذبح نہ ہو سکے گی جہاں کافی مدت سے اُس کے ذبح کا رواج نہیں ہے۔ اس پر بھی ان خود سخت مصالحین سے یہ نہ کہا گیا کہ جب رواج کی یہ پابندی ہے تو سور کے گوشت اور جھٹکے کا کیوں نام لیا جاتا ہے، جس کا ذکر میں آنا بھی مسلمانوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ اگرچہ ان مصالحتی مجلسوں کا کچھ انجام نہ ہوا لیکن ان مصالحین کی کمزور روش نے ہندوؤں کو اور زیادہ جرأت دلا کر معاملہ کو پیچیدہ تر بنادیا۔ مسلمان کسی ایسی قرار داد پر راضی نہیں ہو سکتے جو علمائے دین، پیشوایان اسلام اور ہمدردان ملت کے مشورہ کے بغیر تجویز کی گئی ہو۔ یہ حضرات جو قوم میں مطعون ہیں اور جنہیں مسلمان ہندو پرست جانتے ہیں، اکرم کریں اور بے فائدہ تکلیف نہ اٹھائیں! لے

کاش! یہ گاندھوی ٹولہ یعنی مسلمانوں کے لیڈر بننے والے اور وہ علماء جن کے فتوے گاندھی کی جنبش لب کے ساتھ گردش کرتے رہتے تھے، کبھی خوفِ خدا کو مد نظر رکھ کر اس مرد حق آگاہ کی بات ہی سن لیتے جو دہلی کی مسجد فتحپوری میں بیٹھا ہوا مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ اُس مرد مومن سے میری مراد حضرت مفتی اعظم دہلی شاہ محمد مظہر اللہ نقشبندی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۸۶ھ/۱۹۶۶ء) ہیں۔ ذیل میں ہم ایک استفتاء پیش کر کے حضرت سیدی و مرشدی علیہ الرحمہ کا جواب نقل کرتے ہیں:

سوال نمبر ۲۳۵

- ۱۔ اسلامی اعتبار سے گائے کی قربانی شریعتِ غزائیں کیا حیثیت رکھتی ہے؟
- ۲۔ اگر حکومت اپنی طاقت سے گائے کی قربانی پر پابندی لگائے تو مسلمانوں پر کیا فرض عائد ہوتا ہے؟
- ۳۔ کیا مسلمان اسلامی اخلاقی اعتبار سے دیگر اقوام کی خوشنودی کے لیے گائے

کی قربانی ترک کر سکتے ہیں، اگر نہیں تو جو مسلمان اس فعل کے ترک میں یا اُردو ہوں اُن کے لیے شریعت میں کیا حکم ہے؟

مستفتی: فضل احمد دہلی

الجواب

۱۔ گائے کی قربانی دین الہی کی نشانیوں میں سے ہے لقولہ تعالیٰ :

وَالْبَدَنَ جَعَلْنَاهَا لَكُم مِّنْ شَعَائِرِ
اللّٰهِ لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ

یعنی اونٹ اور گائے کی قربانی کو تمہارے لیے دین الہی کی نشانیوں میں سے

ایک نشانی بنایا ہے، جس میں تمہارے

لیے بھلائی ہے۔

درمختار میں ہے :

بَدَنَةُ هِيَ الْاَبِلُ وَالْبَقَرُ سَمِيَتْ

بِهَا الصَّخَامَتُهَا۔

بدنہ اونٹ اور گائے ہے۔ ان کے

ڈیل دار ہونے کے سبب ان کا یہ

نام ہوا۔

۲۔ ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہوگا کہ ہر ممکن کوشش سے اس اسلامی نشان کی محافظت کریں۔

کہ اس سے غفلت جبکہ عقاب الہی کا موجب اور عتاب الہی کا

خوف اس کی محافظت کا سبب ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

وَمَنْ يَعْظَمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَانْهَآ

مَنْ هَتَّوٰی الْقُلُوْبَ۔

اور جو اللہ کے دین کی محترم نشانیوں

کی محافظت کرے گا، تو یہ محافظت

کرنا دلوں کے خوف کا مقتضی ہے۔

۳۔ اس کا جواب تو بہت ظاہر ہے کہ ہر مسلمان جانتا ہے کہ دین الہی کی نشانیوں کو مٹانا اور اُس کی بجائے کفری نشان قائم کرنا کس طرح غضب الہی کا موجب ہوگا؟

جس طرح گائے کا ذبیحہ اسلامی نشان ہے یونہی اس کا بند کرنا کفری نشان ہے۔ پس اس کی بندش کا اقدام تو بڑی شے ہے، اس کی جانب قلب کا میلان بھی عذاب کا موجب ہے۔ یہ خیال کہ اس سے ہمیں حکومت ہند کی حمایت و خوشنودی میرا جائیگی محض ایک شیطانی دھوکا ہے۔ ایسی حالت میں حمایت و رکنار ان لوگوں کا کوئی رفیق بھی نہیں ہو سکتا لقولہ تعالیٰ: وَلَا تَرْكَبُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا تَتَّسَبَّحُوا النَّارَ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ ثُمَّ لَا تُنصِرُونَ ۝

اس مقام پر حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے اصحاب کے واقعہ پر غور کیجیے کہ جب وہ یہودیت سے نائب ہو کر مشرف باسلام ہوئے تو انہیں خیال آیا کہ اونٹ کا گوشت شریعت موسوی میں حرام ہے اور اسلام میں محض مباح، تو کیا حرج ہے کہ ہم اونٹ کا گوشت نہ کھائیں۔ اس پر نہایت غتاب آمیز انداز میں ممانعت فرمائی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوا: يَا هَٰذَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ یعنی ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو دو اور ایسے خیالات میں پڑ کر (شیطان کے قدم قدم نہ چلو، یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ پھر اس کے بعد بھی کہ تمہیں واضح دلیلیں پہنچ چکیں اگر لغزش کرنے لگو تو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ زبردست ہے (اس کے عذاب کا کوئی روکنے والا نہیں) حکمت والا ہے (کہ بمقتضائے حکمت جب اور جن قدر چاہے نزا دیتا ہے)

اس واقعہ میں اور فتنہ زدہ فیہ واقعہ میں اصلاً فرق نہیں جس طرح عبداللہ بن سلام نے اونٹ کے گوشت کو مباح سمجھا اور اجتہاد غلطی کی کہ شعائر اسلام نہ سمجھتے ہوئے ترک کارا دہ کر لیا۔ وہی قصہ یہاں ہے۔ پس جس طرح وہ مورد عتاب ہوئے جو لوگ اس کو ترک کریں گے وہ بھی یقیناً مورد عتاب ہوں گے بلکہ مستحق عذاب کہ یہاں اس سے بڑی ایک شے اور بھی موجود ہے اور وہ ہندو کے عقائد باطلہ کی تردید ہے جو اشد معاصی ہے اور عصیاں میں کسی کا بھی حکم کیوں نہ ہو، اس کی پیروی موجب استحقاق عذاب ہے کہ اِنَّ الْاَكْثَرَ اِلَّا بِاللّٰهِ حُكْمٌ تو صرف اللہ ہی کا ہے اور تمام مخلوق اُسی کی محکوم۔ مشرکین مکہ نے بعض جانوروں کو اپنی طرف سے حرام کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ اُن کی اس تحریم کی بھی تردید فرماتا ہے،

چنانچہ ارشاد ہے: یا ایہا الناس کلوا صافی الامراض حلالاً طیباً (الایۃ) یعنی لوگو! جو چیزیں زمین میں حلال و پاکیزہ موجود ہیں اُن سے کھاؤ (اور اُن کی تحریم کا از کتاب کر کے) شیطان کی پیروی نہ کرو لقیلاً وہ تو تمہارا صریح دشمن ہے (کہ ایسے و اہیات خیالات سے تم کو ہر طرح کا نقصان دے رہا ہے) وہ تمہیں اُن ہی باتوں کی تعلیم کرے گا جو (میرے نزدیک) بُری اور بے حیائی کی ہیں اور یہ (دکریگا) کہ اللہ کے ذمے وہ باتیں لگاؤ جس کی تم سند ہی نہیں رکھتے۔ (جیسے گائے کی حرمت کہ من جانب اللہ تمہارے پاس اس کی کوئی سند نہیں)۔

اس آیت کریمہ میں جس طرح مشرکینِ مکرّم کو حکم ہے کہ تم حلال جانوروں کو حرام ٹھہرا کر شیطان کی پیروی نہ کرو اور اللہ پر ہتان نہ باندھو۔ یونہی ہندوؤں کو بھی حکم ہے کہ گائے کے باب میں ایسا معاملہ نہ کرو۔ پس جب خود ہندو کو یہ حکم ہے تو مسلمانوں کے لیے کب جائز ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے عمل سے اُن کے اس عقیدے کو قوت پہنچائیں اور شیطان کے اتباع اور خدا پر ہتان بندی میں اُن کا ساتھ دیں۔ مانا کہ مسلمان اس کو حرام جان کر ترک نہ کریں گے لیکن اس ترک میں قرآنی حکم کے خلاف غیر قرآنی حکم کی تقویت تو ہے اور من پچھے کہ آسمانی کتاب کے حکم منسوخ پر بھی عمل حرام کر دیا گیا ہے تو پھر کسی انسان کا حکم اُس کے آگے کیا حیثیت رکھتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلام کے واقعہ پر پھر غور کی نظر ڈالیے کہ باوجودیکہ اُونٹ کی حرمت ایک آسمانی کتاب میں موجود تھی لیکن چونکہ اُس کی حرمت منسوخ ہو چکی تھی اس لیے یہ اصحابِ اسلامی حکم سے اس کو حلال ہی سمجھتے تھے۔ غلطی ہو گئی کہ اس کو شعائرِ اسلام نہ سمجھا اور ترک کا ارادہ کر لیا جس کو تہدیداً شیطان کا اتباع قرار دیا گیا اور اپنے غضب کا اظہار فرمایا گیا۔ اُونٹ کچھ یہودوں کے معبودوں سے نہ تھا۔ پس یہاں عتاب تو صرف اس پر ہے کہ حکم منسوخ پر عمل کا کہوں ارادہ کیا گیا اور گائے کا تو معاملہ ہی جداگانہ ہے کہ اس کی حلت تعلیم توحید اور ایک شرکِ جلی کے ابطال پر ہے تو اب مسلمان خود ہی غور کرے کہ اس کا ترک کیا معنی رکھتا ہے، یہی کہ اس میں توحید کا ابطال اور شرک کا اعلان ہے۔

یہ حکم تو صرف مطلقاً ذبیحہ گاؤ کے ترک کا ہے لیکن اس پر قربانی کا ترک حکم میں اس سے بھی
 شدہ ہے کہ وہ عبادت الہی ہے۔ پس اس کے ترک میں ایک مخصوص عبادت کا ترک ہے۔ تو
 مسلمان کو یہ پوچھتے ہوئے شرم نہیں آتی کہ اس کو میں ترک کر سکتا ہوں یا نہیں، یقیناً اپنی
 خوشی سے جو اس کو ترک کریں گے یا اس میں اعانت کریں گے وہ سخت گنہگار ہوں گے۔
 اور یہ خیال کہ محض ہنود کی خوشی حاصل کرنے کے لیے اس کی قربانی کا ترک مقصود ہے
 اور کسی کی خوشی حاصل کرنا تو کوئی جرم نہیں۔ تو اول تو حق تعالیٰ کی ناراضگی کے مقابلہ میں کسی کی
 رضا کی طلب خود ہی حرام ہے۔ دوسرے وہ محض اتنی بات سے کہ آپ ذبیحہ گاؤ کو ترک کر دیں
 پوری طرح خوش بھی نہیں ہو سکتے کہ حقیقت میں اُن کو صرف گائے کی قربانی کا ترک مطلوب
 نہیں بلکہ ایک بہت بڑی مہتمم بالشان قربانی مطلوب ہے یعنی ایمان کی قربانی بقولہ تعالیٰ وَدُّوا
 لَوْ تَكْفُرُونَ یعنی اُن کی خوشی تو اس میں ہے کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ۔ چنانچہ آج مسلمان اس کو
 اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں تو کیا مسلمان اس کو برداشت کر کے جہنم میں اپنا ٹھکانا
 بنا سکتے ہیں؟

میرے دوستو! امور دنیوی میں آپ کو اُن سے مدارات سے کوئی نہیں روکتا، کیجیے اور
 مرد کیجیے، لیکن ایسی مدارات جس سے کوئی شعار اسلامی چھوٹے اور امور مذہبی پامال ہوں،
 ہرگز جائز نہیں۔ آپ کو اُن کی خوشی اسی لیے تو درکار ہے کہ اتفاق میسر آجائے جس کی
 ان سخت ضرورت ہے، لیکن کیا وہ حاصل ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں کہ یہ شے
 تو اور اختلاف کی بنیاد مضبوط کرنے والی ہے۔ اتفاق حاصل کرنے کی تو صرف ایک ہی
 صورت ہے اور وہ یہ کہ جس طرح تم اُن کے مسلمات میں کوئی مداخلت نہیں کرتے اسی طرح
 اُن کو بھی چاہیے کہ اسلامی احکام کے بجالانے میں ہم سے کچھ تعرض نہ کریں۔

اُن کو بتلانیے کہ فروعات ایک طرف رہے، اصول پر نظر ڈالیے کہ شرک کیسی بدترین
 شے ہے، جس میں معبود برحق کے مقابلے کا اعلان ہے، لیکن جب مشرکین ہمسایہ ہو جاتے
 ہیں تو کیا کوئی مسلمان اُن سے تعرض کرتا ہے کہ اپنے بُت خانے توڑ دو، شرک چھوڑ دو، ہم
 معبود برحق کا مقابلہ نہیں دیکھا جاسکتا۔ پس جب مسلمانوں کی طرف سے اس قدر وہ آزاد ہیں

تو اُن کے لیے کیا گنجائش کہ ہم سے مطالبہ کریں کہ گائے کی قربانی ترک کرو، حالانکہ اُسی کے نام پر قربانی کی جاتی ہے جس کو وہ بھی معبود جانتے ہیں اور خود اُن کے اکابر سے بھی یہ فعل ثابت ہے جو اپنے مقام پر بدلائل واضح ہو چکا ہے۔

الحاصل مسلمانوں کو ہرگز جائز نہیں کہ وہ اپنی رضا سے گائے کی قربانی ترک کریں بلکہ ہندو کو سمجھائیں کہ وہ اس کے ترک پر اصرار کر کے ایک نیا فتنہ نہ کھڑا کریں کہ یہ ہمارے مذہب میں مداخلت ہے جو قانوناً بھی ممنوع ہے فقط۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

محمد منظر اللہ دہلوی غفر اللہ لہ

امام مسجد جامع فتح پوری

دہلی

گاندھوی شیخ الہند کے کارنامے

جن سکتوں سے سید احمد صاحب اور مولوی محمد اسماعیل دہلوی برسرِ پیکار رہے اور پیش خویش تین چار سال تک جہاد فرماتے رہے، سید صاحب کے خلفاء بھی اُن کی سنت پر غیبوبت کا شاخسانہ کھڑا کر کے دنیا کماتے رہے، جن میں علمائے صادق پور سرفہرست ہیں اور جن سکتوں نے، ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں میں انگریزوں سے بھی بڑھ چڑھ کر مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ ڈھائے، جن کے تذکرے سے کلیجہ منہ کو آتے۔ مسجدوں میں گھوڑے باندھے، قرآن کریم پھاڑے، جلاتے اور مسلمانوں کو زندہ زندہ آتش کرنے اور اذیت ناک سزائیں دینے میں قطعاً کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی تھی۔ اُن کے ان تمام کارناموں کو گھریلو بخش اور معمولی حقیقت قرار دیتے ہوئے زمانہ قریب کے شیخ الہند کہلانے والے جناب مولوی محمود الحسن دیوبندی اُن سکتوں اور اپنے ہندو بھائیوں کے بارے میں یوں فہمائش کرتے ہیں:

”اور ہندوستان کی سب سے زیادہ کثیر تعداد قوم (ہندو) کو کسی نہ کسی طریق سے آپ کے ایسے مقاصد کے حصول میں مؤید بنادیا ہے اور میں ان دونوں قوموں (ہندو مسلم) کے اتفاق و اتحاد کو بہت ہی مفید اور نتیجہ خیز سمجھتا ہوں اور حالات کی نزاکت کو محسوس کر کے جو کوشش اس کے لیے فریقین کے عمائد نے کی ہے اور کر رہے ہیں اس کے لیے میرے دل میں بہت قدر ہے کیونکہ میں جانتا ہوں کہ صورتِ حالات اگر اس کے مخالف ہوگی تو وہ ہندوستان کی آزادی کو ہمیشہ کے لیے ناممکن بنا دے گی۔ اور دوسری حکومت کا آہنی پنجہ روز بروز اپنی گرفت کو سخت کرنا جائے گا اور اسلامی اقتدار کا اگر کوئی دھندلا نقشہ باقی رہ گیا ہے تو وہ بھی ہماری بد اعمالیوں سے حرفِ غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹ کر رہے گا۔ اس لیے ہندوستان کی آبادی کے یہ دونوں بلکہ سکھوں کی جنگ آزما قوم کو ملا کر تینوں عنصر اگر صلح و آشتی سے رہیں گے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی چوتھی قوم خواہ وہ کتنی ہی بڑی طاقتور ہو، ان اقوام کے اجتماعی نصب العین کو محض اپنے جبر و استبداد سے دبا سکے گی۔“ لہ

اسی پر بس نہیں، موصوف نے بڑے ناصحانہ اور در دھرب لہجے میں دونوں اقوام کے خواص و عوام کی خدمت میں فہمائش کے پہلو پہ پہلو اپیل بھی ان غیرت مند انہ الفاظ میں کی ہے :

”اگر فرض کرو، ہندو مسلمان کے برتن سے پانی نہ پیتے یا مسلمان ہندو کی اترتھی کو کندھانہ دے تو یہ ان دونوں کے لیے مہلک نہیں، البتہ دونوں کی وہ حریفانہ جنگ آزمائی اور ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے اور نیچا دکھانے کی وہ کوششیں جو انگریزوں کی نظروں میں دونوں قوموں کا اعتبار ساقط کرتی ہیں،

لے محمود الحسن، مولوی: خطبہ صدارت، مطبوعہ مطبع قاسمی دیوبند، ص ۱۸

”عبدالرشید ارشد، مولوی: بین پڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص (۲۹)

اتفاق کے حق میں ہم قاتل ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات میرے اس مختصر مشورہ کو سرسری نہ سمجھ کر ان باتوں کا اعلیٰ انسداد کریں گے۔ ۱۔

موصوف انگریزوں کی غلامی سے تو واقعی چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پوری طرح بیتاب تھے لیکن جتنے اس مقصد کی خاطر جدوجہد کرتے اُتنے ہی ہندو اور گاندھی کے قدموں سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ یہ نہ سمجھ پاتے کہ ان تمام کاوشوں کا ثمرہ صرف اور صرف ہندوؤں کو ملے گا۔ انگریز واقعی دشمنِ اسلام تھا اور ہے لیکن کیا ہندو حلقہ بگوشِ اسلام ہیں؟ کیا یہ اسلام اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہیں؟ دریں حالات یہ کہاں کی دانشمندی ہوئی کہ ایک دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا چھندا اپنے گلے سے ہٹانے کی خواہش میں دوسری اُس سے بھی بڑھ کر دشمنِ اسلام قوم کی غلامی کا طوق برضا و رغبت زیب گلو کر لیا جاتے۔ موصوف نے ترکِ مولا کے سلسلے میں جو فتویٰ جاری کیا تھا وہ بھی شرعی فتویٰ ہونے کی بجائے اُن کی انگریز دشمنی اور ہندو نوازی کا آئینہ دار ہے جبکہ شرعی فتویٰ تو خدا اور رسول کے احکام کی ترجمانی کا فریضہ ادا کرنا ہے، لیکن آنجناب کے فتوے میں یوں ہے :

”(۲) تحفظِ ملت اور تحفظِ خلافت کے خالص اسلامی مطالبہ میں اگر برادرانِ وطن ہمدردی اور اعانت کریں تو جائز اور مستحقِ شکر یہ ہیں۔ (۳) استخلاصِ وطن کیلئے برادرانِ وطن سے اشتراکِ عمل جائز ہے، مگر اس طرح کہ مذہبی حقوق میں رخنہ واقع نہ ہو۔“ ۲

ہندو لیڈر اتنے کم عقل کہاں تھے کہ ان صاحبان کے مذہبی معاملات میں دخل دینے یا ظاہری ہمدردی کا دم نہ بھرتے۔ کیا کوئی ہندو نواز بتا سکتا ہے کہ ہندوؤں کو ملتِ اسلامیہ اور خلافت کے تحفظ سے ایک رائی کے برابر بھی دلچسپی تھی یا ہے؟ وہی اُن کے یار اور مددگار اب تو ان الفاظ کو جھوٹ مٹ بھی زبانوں پر نہیں لاتے۔ آخر کیوں؟ اب توفیقین آگیا

۱۔ عبد الرشید ارشد، مولوی، سینیٹ بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ص ۲۹۱

۲۔ حسین احمد ٹانڈوی، مولوی: نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۵۹

یا نہیں کہ ہندو لیڈر مسلمانوں کو جھوٹی بھدروی کے جال میں پھنسا کر محض اپنا مقصد حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کر رہے تھے۔ باری تعالیٰ شانہ نے تو فرمایا تھا کہ لَا تَلُوتُ كُمُ مَنَعًا لَا۔ کہ کافر تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے لیکن مسلمانوں کے ان محسن اور لیڈر بننے والوں نے معلوم نہیں فرمانِ الہی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا یا اپنے ہندو بھائیوں کو کافروں میں شمار کرنا برداشت نہ کیا۔ چنانچہ مولوی محمود الحسن صاحب کا مذکورہ فتویٰ بھی شرعی ذمہ داری پوری کرنے کی بجائے اپنے برادرانِ یقینی کی رضا جوئی اور کانگریس کی تائید و حمایت میں جاری ہوا تھا۔ مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو :

”یہ وہ زمانہ ہے جب کہ ناگپور میں اجلاس کانگریس ہوا تھا اور اُس میں نان کو آپریشن کی تحریک پاس ہو چکی تھی۔ اس کے خلاف مسٹر جناح اور اُن کے موافقین کی آواز بہت کمزور پڑ گئی تھی اور یہ پارٹی حد درجہ اقلیت میں آ گئی تھی۔ ملک کے تمام اہل الرائے ہندو اور مسلمان، برطانیہ سے نہایت برگشتہ ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی کی رائے قبولیت عامہ حاصل کر چکی تھی۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے ترکِ موالات کے متعلق طلبہ یونیورسٹی نے فتویٰ حاصل کر لیا تھا، جس میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ترکِ موالات کی تمام دفعات میں کانگریس کی موافقت کی تھی اور تمام مسلمانوں اور طلبہ مسلم یونیورسٹی کو زوردار مشورہ دیا تھا کہ وہ اس پر عمل کریں۔“

دارالعلوم دیوبند اور جمعیتہ العلماء ہند کے صدر ہونے کی حیثیت میں مولوی محمود الحسن صاحب کا یہی فتویٰ تمام گاندھوی علماء کی طرف سے کفایت کرتا تھا کیونکہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، لیکن کانگریس کی موافقت میں دو چار لفظ لکھ کر ان شہسواروں کی فہرست میں اپنا نام درج کروانے کو پورا نجاتِ اخروی یا سعادتِ داین کا ذریعہ سمجھتے ہوئے مزید پانچ سو علماء کے قلم بھی حرکت میں آ کر ہی ہے :

”اس کے بعد یہی فتویٰ جمعیت علمائے ہند کے متفقہ فیصلے کی صورت میں تقریباً پانچ سو علماء کے دستخط سے شائع کیا گیا۔“

موصوف کی ریشمی رومال والی تحریک کا اُن کے حواریوں میں بڑا شہرہ ہے کہ اُنہوں نے انگریزوں کی غلامی کا جُؤا اتار پھینکنے کے لیے یہ بڑی پُراسرار اور منظم جدوجہد کی تھی۔ جہاں تک اُن کی انگریز دشمنی کا تعلق ہے وہ تسلیم لیکن کیا یہ تحریک صرف مسلمانوں کے مفاد میں اور ہندو کی دوستی بلکہ غلامی سے آزاد ہو کر چلائی گئی تھی؛ تفصیلات کے چہرے سے نقاب اٹھا کر دیکھا تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ منصوبہ ہندو کا تھا اور یہ گاندھوی علماء یا لیڈر محض شطرنج کے مہرے تھے جنہیں مسلم ممالک اور مسلمانان ہند کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے گمانھا گیا تھا۔ اس بارے میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے پیرا گراف نمبر ۱۶ کا ایک اقتباس، ان حضرات کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیے:

”مولوی عبید اللہ (سندھی) اور اُس کے رفیق ساتھیوں نے برطانوی حکومت کے خاتمہ پر موقتہ حکومت کے لیے ایک تجویز تیار کی تھی۔ اس تجویز کے مطابق ہند پر تاپ نامی ایک شخص کو صدر ہونا تھا۔ یہ شخص ایک معزز خاندان کا جو شیلا ہندو ہے۔ ۱۹۱۷ء کے آخر میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس جانے کا پاسپورٹ دیا گیا۔ یہ سیدھا جنیوا گیا اور وہاں بدنام زمانہ ہر دیال سے بلا ہر دیال نے اُسے جرمن قونصل سے ملایا اور وہاں سے یہ برلن آیا۔ بظاہر اس نے وہاں جرمنوں کو اپنی اہمیت کے مبالغہ آمیز تصور سے متاثر کیا اور اُسے ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ خود مولانا کو وزیر ہند اور مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا۔ مولانا برکت اللہ کشن اور ما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا غمیر تھا اور برلن کے راستہ کابل پہنچا تھا۔ وہ ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا لڑکا تھا اور انگلستان، امریکہ اور جاپان کی سیاحت کر چکا تھا۔“

ٹوکیو میں وہ ہندوستانی زبان کا پروفیسر مقرر ہوا تھا۔ وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف سخت لب و لہجہ کا ایک اخبار جاری کیا جس کا نام اسلامک فریڈمی (اسلامی برادری) تھا۔ حکومتِ جاپان نے اس کو بند کر کے اُسے پروفیسری سے معزول کیا اور وہ جاپان کو چھوڑ کر امریکہ میں اپنی غدر پارٹی سے جاملے۔

۱۹۱۶ء کی ابتدا میں مشن کے جرمنی ممبر اپنے مقصد میں ناکام ہو کر افغانستان سے چلے گئے۔ ہندوستانی ممبر وہیں رہے اور حکومتِ موقتہ پرویز نل گورنمنٹ نے روسی ترکستان کے گورنر اور زار روس کو خطوط بھیجے، جن میں اُس سے برطانیہ کا ساتھ چھوڑنے اور ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لیے امداد کی دعوت دی گئی تھی۔ ان خطوط پر راجہ مہندر پرناب کے دستخط تھے اور خطوط بعد میں برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔

زار کو جو خط لکھا گیا تھا وہ سونے کی تختی پر تھا۔ حکومتِ موقتہ کی ایک تجویز یہ تھی کہ ترکی حکومت سے روابط قائم کیے جائیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مولانا عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن کے نام ایک خط لکھا۔ اس خط کو ایک دوسرے خط کے ساتھ جو ۸ رمضان (۹ جولائی ۱۹۱۶ء) کو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا، ملا کر ایک لفافہ میں شیخ عبد الرحیم کے پاس حیدر آباد سندھ بھیج دیا گیا۔ شیخ عبد الرحیم تب سے غائب ہے۔ لفافہ پر ایک تحریر تھی جس میں شیخ عبد الرحیم سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ یہ خطوط کسی قابل اعتماد حاجی کے ذریعے مولانا محمود حسن صاحب کے پاس مکہ معظمہ پہنچائے جائیں اور اگر کوئی دوسرا قابل اعتماد حاجی نہ مل سکے تو شیخ صاحب خود ہی یہ خدمت سرانجام دیں۔

مولانا محمود حسن کے نام کے خطوط جو حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ آئے ہیں، ہم نے خود دیکھے ہیں۔ یہ خطوط زروریشم پر صاف اور واضح لکھے گئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں جرمن اور ترک مشن کی سابقہ آمد، جرمنوں کی واپسی اور ترکوں کے معطل قیام، بھاگے ہوئے طالب علموں کے واقعات، غالب نامہ کی اشاعت کا

ذکر تھا اور حکومتِ موقتہ اور ایک حزبِ اللہ کے قیام کی تجویز درج تھی۔ اس فوج کی
 بھرتی ہندوستان سے کرنے کی تجویز ہوئی تھی اور اس کا کام، اسلامی حکومتوں کے
 درمیان سلسلہ اتحاد قائم کرنا تھا۔ مولانا محمود الحسن سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ میرے
 واقعات سلطنتِ عثمانیہ تک پہنچا دیں۔ مولانا عبید اللہ کے خط میں حزبِ اللہ کا
 مرتب و مکمل نقشہ تھا۔ اس فوج کا مرکز مدینہ میں قائم ہونا تھا۔ خود مولانا محمود الحسن
 صاحب کو اس کا سالار بننا تھا۔ ثانوی مراکز مقامی سالاروں کے ماتحت قسطنطنیہ
 طہران اور کابل میں قائم ہونے تھے اور کابل کا سالار عبید اللہ کو بننا تھا۔ اس
 فہرست میں تین سرپرستوں، بارہ جرنیلوں اور کئی اور اعلیٰ فوجی عہدہ داروں کے
 نام درج ہیں۔

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف صریح طور پر واضح ہے کہ یہ برطانیہ کے خلاف جرمن حکومت
 کا ایک منصوبہ تھا۔ لیکن منجملہ جہاں دیدہ اور ہر فن مولانا ہندو اس تحریک کے سرغنہ بنائے گئے
 ہندو نواز چند علماء کو اس لیے شامل کر لیا گیا تھا کہ ان کے باعث اسلامی ملکوں کا تعاون حاصل کرنا
 آسان ہو جائے، جبکہ سلطنتِ عثمانیہ خاص طور پر برطانیہ سے تازہ زخم کھائے ہوئے تھی اور عام
 طور پر مسلمانوں کے اکثر ملک حکومتِ برطانیہ سے متنفر ہو چکے تھے۔

حالات و واقعات سے ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ اس جرمنی منصوبے میں ہندو کی اولین اور
 مسلمانوں کی حیثیت ثانوی تھی، لیکن رولٹ کمیٹی نے بھی اپنی اسی رپورٹ میں ہندوؤں کو خوش
 کرنے اور اپنی اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تحریک کو پان اسلامک قرار دے دیا۔
 کمیٹی کا یہ فیصلہ کسی طرح بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ جن علماء نے اس تحریک میں
 حصہ لیا وہ خود اسے پان اسلامک تحریک تسلیم نہیں کرتے مثلاً:

”اگر فقط یہ مسلمانوں کے لیے منصوبہ ہوتا تو راجہ مہندر پرنپ کو صدارت کیوں
 دی جاتی اور حکومتِ موقتہ میں غیر مسلموں کے لیے ایسی جگہ کیوں تجویز کی جاتی،

جیسا کہ آگے آئے گا۔ (۲) اگر صرف مسلمانوں کے لیے یہ منصوبہ تھا تو ہر دیا ل کی
 کوششیں اور مولانا برکت اللہ کی اعانتیں کیا گواہی دیتی ہیں، دیکھو رولٹ رپورٹ
 فصل پنجاب۔ (۳) جبکہ مولانا برکت اللہ کو وزیر اعظم بننا تھا، جیسا کہ آگے آئے گا
 اور وہ کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر تھا، جس میں رام چندر جیسا
 مشہور و معروف بھی ممبر تھا، تو اس (رولٹ رپورٹ) میں فقط مسلمانوں کی شورش
 کیوں ذکر کی گئی، بلکہ یہ ایک ہندوستانیوں کی آزادی کی تحریک تھی، جس میں مسلم اور
 غیر مسلم دونوں شریک تھے البتہ مسلم عنصر غالب تھا، جیسا کہ ہم نے ممبروں کے شمارے
 میں دکھلایا ہے اور یہی امر مولانا عبید اللہ صاحب ذاتی ڈائری میں لکھ رہے ہیں۔
 اس تحریک کے بارے میں مزید اس سے بھی واضح تبصرہ ملاحظہ فرمایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بڑے
 مسلمانوں کے بڑے کاموں پر خود ان کا بڑا واضح تبصرہ ان الفاظ میں موجود ہے:

”مولانا عبید اللہ اس تحریک سے بہت پہلے ہی اعتقاد جمائے ہوئے تھے
 کہ ہندوستان کی آزادی اور بہتری اسی میں ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہو۔ وہ اپنی
 ڈائری کے صفحہ ۸۷ میں لکھتے ہیں ”میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ
 اُس وقت سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا لیکن
 مطالعہ نچتہ ہوا تو مجھے ہندوستانییت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی
 ضرورت زور سے محسوس ہونے لگی۔“ خیال فرمائیے کہ رولٹ کمیٹی اس
 تحریک کو پان اسلامک تحریک کہتی ہے اور تحریک چلانے والا اس کو ہندوستانی
 تحریک کہتا ہے اور اسی نام کو اپنی تحریک کے لیے موثر قرار دیتا ہے۔ یہی اُس کا
 عقیدہ اس سے پہلے کا ہے۔۔۔ اور اسی کو حضرت شیخ الہند کا مشورہ قرار
 دیتا ہے مگر رولٹ کمیٹی افراق پھیلانے کے لیے اس کو پان اسلامک کہتی ہے۔“

جناب صدر دیوبند، مولوی محمود حسن صاحب کی پوزیشن کو اس سلسلے میں اگر اور واضح کر دیا جائے کہ وہ اس تحریک کو اسلامی تحریک سمجھتے تھے یا ہندوستانیوں کی جدوجہد آزادی، تو میرا خیال ہے کہ یہ حوالہ بارِ خاطر نہ ہوگا بلکہ انصاف پسند قارئین کے ذہنوں کی ایک الجھن کو سلجھانے اور حقیقت کو اُس کی اصلی شکل و صورت میں واضح کر دکھانے کا باعث بنے گا۔

الفاظ یہ ہیں:

”ہم بارہا عرض کر چکے ہیں کہ غالب پاشا گورنر حجاز نے بھی زور دیا تھا کہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے یعنی ہندو، مسلمان، پارسی، سکھ وغیرہ ہندوستانیوں کے اتحاد سے آزادی کی سکیم چلائی جائے۔ پان اسلامک میں یہ کہاں ہو سکتا ہے، حضرت شیخ الہند نے نہ صرف اس کو قبول فرمایا تھا بلکہ پہلے سے اس پر عامل تھے۔ اُن کے مشن میں سکھ اور اہلِ بھارتی ہندو شریک تھے جن کی وجہ سے ایک مستقل مکان دیوبند میں کرائے پر لے رکھا تھا۔“

تحریکِ خلافت

اب ذرا تحریکِ خلافت کو بھی دیکھ لیا جائے کہ اس تحریک کو چلانے والے کون تھے؟ قیادت کس کے ہاتھوں میں تھی؟ تحریکِ خلافت کے نام پر ہو کیا رہا تھا؟ جو کچھ اس تحریک کے نام پر کیا گیا اُس سے سلطنتِ عثمانیہ کو کہاں تک فائدہ پہنچا؟ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ تحریکِ خلافت کی رُوحِ رواں مولانا محمد علی جوہر تھے۔ موصوف کی تحریک نے اسلامیاتِ ہند میں ایک نئی روح بھونک دی تھی۔ مسلمانوں کے سینوں میں انگریزوں سے نفرت کا سیلاب اُمنڈنے لگا تھا۔ فعال قوم کے اس جوش و خروش کو دیکھ کر گاندھی صاحب لپٹائے، محبت کا ڈول ڈالا اور ہندو کے اُس بیدار مغز و عیار لیڈر نے اپنی قوم کو مولانا کی ہمنوائی پر لگایا۔ مولانا کوئی احسان فراموش تھوڑے ہی تھے، جب ہندو مولانا کی ہر آواز پر لبیک کہنے لگے تو شکر گزاری کے طور پر موصوف نے

گاندھی جی کی ہر بات پر لبیک کہنا شروع کر دیا بلکہ تحریکِ خلافت بھی اُن کے گھر کی لونڈی بنادی۔
 خلافت

”جن دنوں کانگریس کا اجلاس ناگپور میں منعقد ہوا، اُنہی دنوں خلافت کانفرنس کا اجلاس بھی ہوا اور اس میں بھی ترکِ موالات کا ریزولیشن منظور کر کے مسلمانوں نے بھی اپنی قیادت کے لیے گاندھی جی کو منتخب کیا۔“

مولانا محمد علی جوہر کی نظر میں گاندھی جی کا کیا مقام تھا اور ایک کھلے کافر و مشرک پر تحریکِ خلافت کے بانی اور مسلمانوں کے اس بیدار مغز لیڈر کو کہاں تک اعتماد ہو گیا تھا؟ حقیقت تو یہی کچھ نظر آتی ہے کہ اتحاد و دوستی کا رشتہ ذہنی غلامی پر جا کر ملتے ہو گیا تھا۔ یہ مشرک نوازی کی پاداش میں قدرت کی طرف سے سزا کے طور پر واقع ہوا ہو تو عجب نہیں۔ اب اس آگ اور پانی کے اجتماعِ ضدین کا ملاپ اور انتہائی افسوسناک ملاپ ملاحظہ ہو:

”مولانا محمد علی جوہر اُن دنوں پوری طرح مسٹر گاندھی کے ہمنوا تھے اور دونوں میں اتحاد و یکسانیت اس قدر تھی کہ دیکھ کر حیران ہوتی ہے۔ ہر ایک کو دوسرے پر پُر خلوص اعتماد تھا۔ چونکہ تحریک کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں تھی، اس لیے مولانا اپنے لیڈر پر بھرپور اعتماد رکھتے تھے۔ کراچی جیل سے مولانا بیجا پور منتقل کر دیے گئے۔ راستے میں کسی اسٹیشن پر کسی نامہ نگار نے تحریک کے متعلق اُن سے سوال کیا۔۔۔۔۔
 محمد علی نے جواب میں کہا کہ تحریک کا حال تو وہ لوگ جانیں جو باہر ہیں، میں تو اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ”میں اپنے لیے بعد رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے گاندھی جی ہی کے احکام کی متابعت ضروری سمجھتا ہوں۔“

مولانا جوہر کے پیروم شد یعنی مولوی عبدالباری فرنگی محلّی جو گاندھی جیسے سامری وقت کے سحر سے مسحور ہو کر اُس پر ہزار جان سے قربان ہو کر، ایک جتید و متبعِ عالمِ دین ہونے کے باوجود ڈنکے کی چوٹیوں کتے تھے،

عمرے کہ آیات و احادیث گزشت
رفتنے و شمار بُت پرستے کردی

چنانچہ موصوف کے یہی پیرو مرشد اپنے مرید کے مذکورہ بالا بیان کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے "عذر
گناہ بدتر از گناہ" سے بھی آگے بڑھ کر اُس پر حاشیہ آرائی کرتے ہیں،

"لکھنؤ سے اجیر ہائے وقت ایک بڑے اسٹیشن پر جو انگریزی اخبار میں خریدار اتفاقاً
سے اُس میں یہی مکالمہ درج تھا۔ مولانا عبدالباری (مولانا جوہر کے مرشد) نے
انہیں پڑھوا کر سنا۔ اُن کے ایک رفیق سفر و حضر، جو اُس وقت بھی اُن کے ہمراہ
تھے، بول اُٹھے کہ بعد رسول کے نام اپنے مرشد کا لینا تھا، یہ گاندھی جی کیا معنی؟
مولانا نے جستہ جواب دیا "مرشد کوئی ذاتی ہستی تو رکھتا نہیں، وہ تو رسول
ہی کا نائب ہوتا ہے، جب رسول کا نام لے دیا تو رسول کے نائب بھی اُسی
میں شامل ہو گئے، گاندھی جی سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ایک الگ و مستقل حیثیت
رکھتے ہیں۔ نام ان ہی کا لینا مناسب تھا" لے

شاید کوئی کہے کہ مولانا محمد علی جوہر تو سیاسی لیڈر تھے عالم دین تو نہ تھے اور اُن کے مرشد خود ہی
گاندھی کے دامِ تزیں میں گرفتار تھے لہذا ہم ان بیانات پر دارالعلوم دیوبند سے تصدیق کی مہر
لگوا دینا ضروری سمجھتے ہیں،

"اس اقتباس کو پڑھ لینے کے بعد ایک بات اصولی انداز میں سامنے آتی ہے کہ
جب کسی کو تحریک کا قائد بنالیا جائے (خواہ وہ شیطان ہو؟۔ اختر) تو پھر
اُس پر پورا اعتماد کرنا چاہیے۔ مولانا محمد علی جوہر کے گاندھی جی کے متعلق اس قسم کے
نظریہ کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے نقد و نظر کا دروازہ کھولا ہے اور بات کو
دور تک لے گئے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا جوہر کا یہ نظریہ کسی بھی نقطہ نظر سے
غلط نہیں ہے۔" لے

لے عبدالرشید از شد، مولوی: بیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۸۷۔

لے ایضاً: ص ۸۷۔

جب تحریکِ خلافت پورے زور شور سے جاری تھی تو ان دنوں ہندو مسلم اتحاد بھی اپنے نقطہ عروج کو چھو رہا تھا۔ انگریزوں نے اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ اگر صورتِ حالات یہی رہی تو ہندوستان سے ہمیں بوریہا بستر گول کرتے ہی بنے گی۔ انگریزوں نے شردھانند کے کان میں پنک مار کی کہ ملکानہ کے راجپوتوں کو ہندو بناؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ وہ رہا کر دیے گئے۔ دوسری طرف مولوی محمد الیاس کاندھلوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۴ء) کو پانچپور و پیما ہوار پر راضی کیا کہ وہ میوات کے ہندو نما مسلمانوں میں تبلیغ کر کے انہیں اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور کریں۔ حکومت کو نہ ہندومت سے عقیدت تھی نہ اسلام سے پیار۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہندو مسلم اتحاد جو ان کے اقتدار کے لیے مستقل خطرہ بنا جا رہا تھا اسے توڑ دیا جائے۔ شدھی پر مسلمان بھڑکیں گے اور ان کی تبلیغی مساعی سے ہندو بدکیں گے اس طرح اتحاد کے بجائے دونوں قومیں آپس میں ہی ٹکرائے لگیں گی اور ہم کرسی اقتدار پر بیٹھے ہوئے تماشا دیکھتے رہیں گے۔ اس انگریزی منصوبے کی کہانی، دیوبندی حضرات کی زبانی سنئے:

”انگریز بڑی شاطر قوم ہے۔ تحریکِ خلافت پر اس نے ہندو مسلم اتحاد کا جو نظارہ دیکھا اس کو دیکھ کر اسے گمان ہوا کہ اگر یہ لوگ اسی طرح متحد رہے تو ہم چند دنوں کے مہمان ہیں۔ لہذا حکومت نے سوامی شردھانند کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا، جنھوں نے باہر آکر شدھی کی تحریک چلائی اور ملکानہ کے راجپوتوں کو شدھ کرنا شروع کر دیا۔ یہ بیچارے نام کے تو مسلمان تھے لیکن رسم و رواج کے لحاظ سے ہندوؤں کی طرح۔ لہذا شردھانند کی شدھی تحریک کا ان پر جلد اثر ہوا اور وہ ہندو مذہب میں داخل ہو گئے۔۔۔۔۔ اور انہی دنوں مالا بار میں ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ ان سب حالات کی بنا پر ہندو مسلم جو متحد ہو کر انگریز کے خلاف تھے اب ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے اور دونوں قوموں کی پوری توانائیاں ایک دوسرے کے خلاف صرف ہونے لگیں۔“

جب انگریز کا یہ منصوبہ کامیاب ہونے لگا، جگہ جگہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپس میں ٹھن گئی تو وہ بڑے بڑے ہندو لیڈر جنہیں تحریک خلافت کی گاڑی کو چلانے والے مسلمان لیڈر اور گاندھی علی اپنے یار و مددگار یا اعیان انصار اور اپنی کشتی کے ناخدا اور جماعت کے امام و پیشوا بنائے بیٹھے تھے، انھوں نے اس موقع پر اپنا کیا رنگ دکھایا، ان مسلمانوں کے لیڈر اور علماء کلام نے دلوں کو انھوں نے واقعی بھائی سمجھ کر سینے سے چٹایا یا ان کے کسی بڑے سے بڑے کو بھی منہ نہ لگایا۔ صورت حال ملاحظہ ہو:

”مولانا (محمد علی جوہر) جب جیل سے رہا ہوئے تو ملک کی حالت بدل چکی تھی۔ اتحاد و اتفاق کی جگہ افتراق و انتشار نے لے لی تھی اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ملک کے سامنے ترک موالات اور عدم تعاون کا جو پروگرام رکھا گیا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور اس کی جگہ شدھی نے لے لی اور ادھر مسلمانوں نے مجبور ہو کر مدافعت میں تبلیغی مہم شروع کر دی۔ تقریباً تمام دینی جماعتیں اور علماء شدھی کے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ علماء کا موقف یہ تھا کہ سوامی شر دھانند کی تحریک کا اگر مقابلہ یا دفاع نہ کیا گیا اور سادہ لوح مسلمانوں کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تو اس کا بہت بڑا بدینی نقصان ہو گا۔ مولانا محمد علی جوہر کے بیشتر ساتھی بھی اسی تبلیغی مہم میں لگ گئے۔

موتی لال، نہرو اور دوسرے وزراء پریکٹس شروع کر کے اپنی اپنی وکالت و بیرٹری کو فروغ دینے کے سامان کر رہے تھے۔ لیکن ایک مولانا محمد علی تھے جنہیں یہی دھن تھی کہ اسی پروگرام و نصب العین کو اپنا یا جائے جس کے لیے نہ صرف وہ جیل گئے بلکہ ملک کے تمام بڑے بڑے لیڈروں اور چالیس پچاس ہزار افراد نے فہمی خوشی تمام کام چھوڑ کر جیل کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ مولانا جوہر اگر چلتے تو اسی دویں بہہ کر عوامی احساسات کا ساتھ دیتے مگر انھوں نے بلا خوف و ہمت لائٹ ان حالات میں بھی کانگریس سے پوری وفاداری کا ثبوت دیا اور کانگریس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے اور اس کی مقبولیت بحال کرنے میں دن رات

ایک کر دیا۔“ لے

غذہ کی ذریعے چونکہ ہزاروں مسلمانوں کو مرتد کیا جا چکا تھا اور کامیابی سے اُن دشمنانِ اسلام کی یہ تحریک چل رہی تھی، اسی لیے ہندو لیڈروں نے چُپ کی سادھ لی، منہ سی لیے۔ اس کے برعکس مولانا محمد علی جوہر اپنے ساتھی ہندو لیڈروں سے اپیل کرتے پھر رہے تھے کہ وہ اپنی معنی خیز چُپ توڑیں اور حالات پر قابو پانے میں مددیں حالانکہ اینٹ پتھر کے اُن پجاریوں نے گرگٹ کی طرح اپنا رنگ ہی بدل لیا تھا، لیکن افسوس! یہ سب کچھ دیکھتے بھالتے ہوئے بھی مولانا کی وفاداری کس کے ساتھ رہی اور کس کی پالیسیوں کو کامیاب بنانے میں مصروف رہے، یہ قارئین نے ملاحظہ فرما ہی لیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مولانا کی کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا :

”مولانا محمد علی کی انتھک کوششوں اور مساعی کے باوجود ہندو مسلم اتحاد کم ہوتا گیا اور اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی چلی گئی۔ اس کے لیے ایک ”یونٹی کانفرس“ دہلی میں اور ایک شملہ میں منعقد ہوئی، جس میں اکثر ہندو مسلم زعماء شریک ہوئے۔ کئی کئی دن اس کے اجلاس ہوتے رہے۔ مولانا نے سجدہ کوشش کی کہ کسی طرح وہ فضا پیدا ہو جائے جو تحریکِ خلافت میں تھی لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ فسادات ہوتے رہے اور ہندو مسلم تعلقات میں تلخی و کشیدگی بڑھتی رہی۔ گاندھی جیسا آدمی بھی یہ کہہ کر کہ ”اب میری بات کوئی نہیں سنتا“ اپنے آشرم میں چلے گئے۔“

آئیے اب یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا کی اس ہندو نواز پالیسی کو بلند عین زمانہ اور ہندو پریس نے کس نظر سے دیکھا؟ گاندھی کے سکوت سے کیا سبق حاصل کیا؟ سبق حاصل کرنے کے باعث کیا نتائج برآمد ہوئے؟

”مولانا جوہر کا یہ کردار بلاشبہ قابلِ تعریف و تحسین تھا اور حق و انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ہندو پریس مولانا کے اس رویے کو بنظرِ استحسان دیکھتا اور خراجِ عقیدت ادا

کہتا، مگر ہندو علماء اور پریس ہمیشہ مصلحت آمیز سکوت اختیار کرتا رہا اور مسلمان یہ کہتے رہے کہ مولانا جو ہر پرگانہ دھرمی کا سحر ہے اور وہاں اسی سر میں سُر لا کر ہندو پریس پر ضرور کھدیا کرتا تھا کہ علی برادران نے گاندھی جی پر جادو کر دیا ہے لیکن مولانا اپنے اور پریس کا یہ سلوک دیکھنے اور سننے کے باوجود ہمالہ کی طرح اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور یہ اعتراف کرنے میں بھی بخل نہیں کرنا چاہیے کہ گاندھی جی کا رویہ بھی منصفانہ نہ رہا۔ انھوں نے تحریک خلافت میں جو خالص اسلامی تحریک تھی بھرپور ساتھ دیا اور مسلمانوں نے ان کی قیادت میں کام کیا۔۔۔۔۔ بات مولانا جو ہر کی استقامت اور اپنے موقف پر پختگی کی ہو رہی تھی، جس کی بنا پر وہ ہندو اور مسلم دونوں کی نظر میں غیر مقبول ہو رہے تھے۔

ہندو جنھیں اپنا دینی یا یقینی بھائی سمجھا رہا تھا، شدھی اور تبلیغ کی تحریکوں کے سامنے آتے ہی یکسر آنکھیں بدل گئے، مولانا جو ہر جنھیں اپنا قائد و امام بنائے بیٹھے تھے یا جو ہندو لیڈر یہ ظاہر کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے کہ وہ مولانا کے ہی دست و بازو ہیں، انھوں نے مولانا کی التجاؤں پر کان نہ دھرے، ہندو پریس بھی مخالف ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ خدا نے وعدہ لا شریک کو سچا نہ مانا تھا، گاندھی و علماء و لیڈر نے اس سبوح و قدوس کے اس فرمان کا صادق ہونا نہ جانا تھا کہ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا۔ غیر مسلم تھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ کیا یہی کچھ ہو کر نہ رہا، مزید سنیے:

”شدھی کی تحریک اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی جانب سے تبلیغی مہم کی وجہ سے ہندو مسلم اتحاد کو خاصا نقصان پہنچ چکا تھا اور حالات ایسے ہو گئے تھے کہ گاندھی جی بھی اپنے آئندہ میں معتلف ہو گئے تھے۔ مہاسبھا کے لیڈر شدھی تحریک کی تائید و حمایت کر رہے تھے۔ کانگریس کے ہندو علماء ان حالات میں مہربان تھے لیکن ایک مولانا محمد علی اپنے شمس میں لگے ہوئے تھے اور برابر

ہندو مسلم اتحاد کی دعوت دیے جا رہے تھے۔ یونٹی کانفرنسیں کیں، اپنوں کی مخالفت مول لی، ہندو لیڈروں سے اپنے درجہ سے گہرے ہوئے الفاظ میں منت کی کہ ملک کی آزادی کے لیے اتحاد کی راہ اختیار کرو۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور دوسرے بزرگوں کی معیت میں گاندھی جی سے درخواست کی کہ وہ مہر سکوت کو توڑ کر مہاسبھا کے لیڈروں کو سمجھانے کی کوشش کریں، لیکن کوئی ہندو لیڈر اپنی قوم کی مخالفت کے خوف کی بنا پر یہ جرات نہ کر سکا کہ وہ مولانا محمد علی کی راہ اختیار کرے۔ ان حالات میں مولانا محمد علی نے ہی یہ جرات کی کہ وہ ڈاکٹر مونی، پنڈت مدن موہن مالوی اور دوسرے ایسے لیڈروں کے اتفاق کا پردہ چاک کریں۔ چنانچہ انھوں نے یہ فریضہ سرانجام دیا اور خوب انجام دیا۔ ہندو پریس جو پہلے مولانا کی اتحاد پر درکوششوں پر سکوت اختیار کیے ہوئے تھے اب صرف اس قصور پر کہ وہ ڈاکٹر مونی اور پنڈت مالوی کی نقاب کشائی کرنے لگے تھے۔ مولانا کے خلاف زہر چکانی کرنے کے لیے پورے ساز و سامان سے مسلح ہو کر میدان میں آگیا۔

ہندو خواص و عوام کے دلوں کا کھوٹ اور افسوسناک رویہ ظاہر ہو کر عالم آشکار ہو چکا تھا، اس کے باوجود مولانا ان بُت پرستوں کی ہمدردی کو تمام دکھوں کا علاج اور آزادی ہند کے لیے نسخہِ کیمیا بنائے بیٹھے تھے۔ حالانکہ مسلمان کی نظر میں آزادی کو نہیں بلکہ اسلام کو اولیت ہے۔ مسلمان آزادی پر اسلام کو قربان نہیں کیا کرتا۔ اس مسئلے کی شرعی پوزیشن اسی کتاب کی جلد دوم میں ”کفار سے دوستی“ کے تحت ملاحظہ فرمائی جائے۔ یہاں دکھانا یہ ہے کہ مولانا نے آزادی وطن کے ان پلٹے پھرتے بتوں اور بُت پرستوں کی رضا جوئی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا لیکن ”اُسے آرزو کہ خاک شدہ“ مثلاً؛

”اس پر مجبور ہو کر مولانا نے خلافت کانفرنس کا سپیشل اجلاس بلایا جو حکیم اجمل خاں

کی تحریک اور مولانا ابوالکلام آزاد و مولانا شوکت علی کی تائید سے مولانا سلیمان ندوی کی صدارت میں شروع ہوا اور اس میں مسلم زعمائے بالاتفاق، اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور کہا گیا کہ آزادی کی خاطر ہم ہندو دوستوں کی طرف دستِ تعاون بڑھا رہے ہیں، اب یہ اُن کی مرضی ہے کہ وہ اس ہاتھ کو دوست کا ہاتھ سمجھیں جو مصافحہ کے لیے بڑھاتا ہے یا ایک پہلوان کا جو اکھاڑے میں اتر کر اپنے حریف کی طرف بڑھاتا ہے۔

اس کانفرنس کے بعد مولانا جو ہر وفدِ حجاز میں شامل ہو کر دہلی سے عرب کو روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پر آپ نے لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ ملک کے لیے سخت ترین ابتلاء و آزمائش کا زمانہ ہے، نہ آپ خود مشتعل ہوں نہ اپنے کسی لفظ سے یا عمل سے اہل ہند کو مشتعل ہونے کا موقعہ دیں۔ میں رُخِ آسمان کرتا ہوں کہ اگر وہ تمہارے اوپر ہاتھ اٹھائیں تو سر جھکا دو، اگر وہ چھری اٹھائیں تو سینہ آگے کر دو، اگر ظلم کریں تو صبر سے کام لو۔

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

جس گاندھی کی امامت کو مولانا نے ناموافق سے ناموافق حالات میں بھی اپنے لیے دستِ فضیلت یا طرہٴ امتیاز بنائے رکھا، نہرو رپورٹ کے وقت اُسی گاندھی نے اور دوسرے ہندو کانگریسی لیڈروں نے جنھیں مولانا اپنی فوج کے سپہ سالاروں اور اپنے یاروں اور پیاروں میں گنتے تھے، خود مولانا کے ساتھ کیسا سلوک کیا:

مولانا محمد علی جوڑپ سے واپس آئے تو اُنھوں نے بھی اختلاف کیا اور ہندوستان پھر ایک دفعہ معرکہ کارزار بن گیا۔ تمام ہندوؤں نے رپورٹ کی تائید کی مگر مسلمانوں میں دو پارٹیاں بن گئیں۔ اس آل پارٹیز کانفرنس میں نہرو رپورٹ

کی حمایت میں کانگریس تھی، لبرل حضرات تھے، ہندو مہاسبھا تھی، مسلمانوں کی ایک جماعت تھی۔ گاندھی جی جواب تک خاموش تھے اس مرحلے پر نہر پورٹ کے منظور ہونے پر وہ اس کے حامی ہو گئے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی جنھوں نے ہر مرحلے پر کانگریس کا ساتھ دیا اور اپنوں کی گالیاں سنی تھیں، اب اُن کے اختلاف کو کانگریس نے پرکاش کی حیثیت بھی نہ دی اور اُن کی بات سُننے سے بھی انکار کر دیا۔ لے

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا

جمعیتہ العلماء ہند

جب ہندو نواز علما نے اپنی سیاسی جماعت ”جمعیتہ العلماء ہند“ کے نام سے بنائی جو حقیقت میں کانگریس ہی کی ذیلی شاخ تھی تو مولوی محمود الحسن صاحب اُس کے صدر اور مفتی کفایت اللہ دہلوی نائب صدر یا اپنے استاد کی جگہ عارضی صدر مقرر ہوئے جنھوں نے ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۸ء تک متواتر انیس سال تک اپنی اس سیاسی جماعت کی صدارت کے فرائض سرانجام دیے اور ہندو مسلم اختلافات بلکہ دونوں قوموں کی ہنگامہ آرائیوں اور کشت و خون کے دنوں میں بھی مفتی صاحب کی دلی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ وابستہ رہیں۔ مثلاً:

”حضرت مفتی صاحب نے اپنے ملک کی ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا۔ ۱۹۱۹ء کے رولٹ ایکٹ بل کے خلاف جب ستیہ گدہ کی تحریک شروع ہوئی تھی تو آپ نے اُس میں بھی بھرپور حصہ لیا۔ آپ اس مقصد کے لیے حکمت عملی کے ساتھ پیش قدمی کرتے رہے۔ تحریک خلافت کے خاتمہ کے بعد جب ۱۹۲۲ء میں سوامی شردھانند نے شدھی کی تحریک جاری کی اور نہاروں، ملکافوں کو، جو مسلمان تھے، مرتد کر کے

لے عبدالرشید ارشد، مولوی، بیس بڑے مسلمان، ص ۸۱۸

لے مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی ۱۲۹۲ھ/ ۱۸۷۵ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۷۲ھ/ ۱۹۵۲ء میں وفات پائی۔

ہندو بنایا تو حضرت مفتی صاحب کانگرس اور ہندوؤں سے بعض معاملات میں اتحاد رکھنے کے باوجود اپنے مذہبی فرائض سے غافل نہیں رہے، لے

مفتی کفایت اللہ دہلوی (المتوفی ۲۱۳۷ھ) کے علاوہ باقی سارے کانگریسی علماء، ہندوؤں کو خوش کرنے اور ہندو مسلم اتحاد برقرار رکھنے کی خاطر، اپنے ہندو بھائیوں کے مطالبے پر، خود شارع بن کر، اسلام سے مرتد کی سزا اور تبلیغ کو خارج کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے دیوبندی حضرات کا اپنا بیان ہے کہ،

”شدھی اور سنگٹھن کی تحریک کی وجہ سے تمام ملک میں فقر وارانہ فسادات شروع ہو گئے تھے، لہذا گاندھی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے ستمبر ۱۹۲۲ء کو اکیس دن کا برت شروع کیا اور ۲۶ ستمبر ۱۹۲۲ء کو پنڈت مدن موہن مالوی کی صدارت میں تمام فرقوں کی ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس میں صدر جلسہ نے ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ وہ اپنے مذہب میں سے سزائے مرتد اور تبلیغ کے احکام کو خارج کر دیں۔ اس موقع پر اکثر ہندو اور مسلمان لیڈروں نے اس تجویز کی حمایت کی، مگر ہزاروں کے اس مجمع میں صرف مفتی صاحب کی ذات تھی جس نے اس متفقہ تجویز کی پُر زور مخالفت کی اور شریعت کے صحیح احکام کی حمایت میں آپ عظیم ترین شخصیتوں سے بھی مرعوب نہیں ہوئے۔“

دیوبندی حضرات کے نزدیک مفتی صاحب کی زندگی کا ایک تابناک پہلو اور موصوف کے کارناموں میں سے ایک عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے دم واپس لین تک اینٹ پتھروں کے پجاریوں سے دوستی کا رشتہ برقرار رکھا،

”انھوں نے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ یہ تھا کہ کانگرس کا ساتھ دیا جائے۔ چنانچہ زندگی کے آخری لمحات تک انھوں نے اس راستہ سے قدم نہیں

بٹایا۔ لے

مولوی حسین احمد ٹانڈوی صاحب سابق صدر مدرس دیوبند (المتوفی ۱۳۷۷ھ) اپنے استاد مولوی محمود الحسن صاحب (المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) کے خلیفہ مجاز اور جانشین تھے۔ موصوف کی سیاسی سرگرمیاں بھی اُسی ڈگر پر ہیں :

”چنانچہ آپ نے صحیح صحیح جانشین ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا اور ہندوستان کی تحریک آزادی کی ذمہ داریوں کو شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح سنبھال لیا اور شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی طرح خلافت کھینچی اور جمعیتہ علماء کی راہنمائی کے فرائض سرانجام دینے لگے اور عدم تشدد کے راستے پر چل کر حکومت برطانیہ کے خلاف ملک و قوم کی سیاسی تحریکات میں جوشِ عمل کی رُوح پھونکنے لگے۔“

مولوی محمود الحسن صاحب کے مشن کو اُن کے جانشین مولوی حسین احمد ٹانڈوی نے جو ہندو نواز لوگوں کی نظر میں شیخ الاسلام تھے، کافی آگے دھکیلا، موصوف کانگریس کے باقاعدہ ممبر بنے اور آخری دم تک ممبر ہی رہے، چنانچہ خود رقمطراز ہیں :

”میں اگرچہ پہلے سے کانگریس میں شامل نہ تھا، مگر مالٹا سے واپسی پر کانگریس کا ممبر باقاعدہ بن گیا اور ہمیشہ جدوجہد آزادی میں شریک رہا اور قید و بند کے مصائب بھی اہل ملک کے ساتھ جھیلنا رہا۔“

کانگریس نے جب ترکِ موالات کی تحریک چلائی تو موصوف نے بھی گاندھی کے ارشاد کو آ مناد صدقنا کہہ کر نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اُس پر عمل کرنے اور کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ جیل بھی گئے۔ مثلاً :

”ترکِ موالات کے سلسلے میں آپ نے انتھک کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

لے عبدالرشید ارشد، مولوی : بیس بڑے مسلمان، ص ۴۵

لے ایضاً، ص ۴۷

لے حسین احمد ٹانڈوی، مولوی : نقشِ حیات، جلد دوم، ص ۲۷۳

زیر دفعہ ۱۲۰، ۱۳۱، ۵۰۵ آپ کو اور مولانا محمد علی صاحب مرحوم، مولانا شوکت علی صاحب، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا نثار احمد صاحب کان پوری اور بنگت گرو سوامی کرشن تیرتہ (شکر اچاریہ) پیر غلام مجدد صاحب سندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔ لے جب کانگریس نے ستیہ گرمی کی تحریک چلائی تو موصوف نے پوری وفاداری کے ساتھ اُس میں بھی بھرپور حصہ لیا، مثلاً:

۱۰۔ الحاصل جب ۱۹۳۲ء میں جمعیت اور کانگریس نے ستیہ گرمی کی تحریک پاس کی تو آپ اس تحریک میں بھی پیش پیش رہے۔ چنانچہ جب آپ دہلی تقریر کرنے کے لیے جا رہے تھے تو مظفر نگر اسٹیشن پر آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ۱

ٹانڈوی صاحب نہ صرف خود کانگریس میں شامل ہوئے اور ساری عمر بت پرستوں کے وفادار رہے بلکہ اپنے ہم مشرب لوگوں کو بھی اسی غیر اسلامی روش پر چلنے کی ترغیب دیتے رہے اور موصوف اسی کو اپنے خلوص و لہیت کی دلیل اور اسلام و مسلمین کی خیر خواہی سمجھتے رہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلاموں کو گاندھی کا غلام بنا کر چودھویں صدی میں خود کو ابوالفضل اور فیضی کا حقیقی جانشین منوانے کی سر توڑ کوششیں کرتے رہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

”اس نازک وقت میں حضرت مدنی کی ذات گرامی قدر تھی جو آگے بڑھی اور تمام مسلمانوں کو خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ جو جماعت انقلاب لاتی ہے وہی برسرِ اقتدار آتی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے ملک کے دوسرے باشندوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہیے اور مسلمانوں کو جنگِ آزادی کے لیے کانگریس کی شرکت کا مشورہ دیا۔ چنانچہ جمعیت علماء ہند کا سالانہ اجلاس امر وہہ ضلع مراد آباد میں کیا گیا۔ جنگِ آزادی کی خاطر کانگریس میں شرکت کا فیصلہ کیا گیا کہ اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہوئے کانگریس کے ساتھ اس بارے میں (حصولِ آزادی) تعاون کیا جائے۔“ ۲

۱۔ عہدہ الرحمن ٹنڈوی، مفتی، تذکرہ مشایخ دیوبند، مطبع سعیدی کراچی ۶۴، ۱۹، ص ۲۷۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۷۷

۳۔ عبد الرشید ارشد، مولوی، میں بڑے مسلمان، مطبعہ لاہور ۱۹۷۰، ص ۴۴

موصوف کے ان نظریات کے بارے میں عالیجناب مودودی صاحب کی رائے بھی اگر ملاحظہ فرمائی جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ ہماری ذاتی رائے ہے کہ اس بارے میں مودودی صاحب کا موقف یقیناً قابلِ توجہ ہے۔ ملاحظہ ہو،

”آپ کو صرف (ٹانڈوی صاحب کو) برطانوی اقتدار کا زوال مطلوب ہے، عام اس سے کہ وہ کسی صورت میں ہو، اسی لیے آپ ایسی انجمن کے معاملہ میں صرف علتِ جواز ہی ڈھونڈتے ہیں اور علتِ حرمت جو سامنے منہ کھولے کھڑی ہے آپ کو کسی طرح نظر نہیں آتی۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ ساتھ دیکھیں اور علتِ حرمت کو دفع کیے بغیر علتِ جواز کو قبول نہ کریں۔ اس لیے کہ ہم کو برطانوی حکومت کا زوال اور اسلام کا بقا دونوں ساتھ ساتھ مطلوب ہیں، اس کا نام اگر برطانیہ پرستی رکھنا ہے تو رکھیے، ہمیں اس کے طعن کی ذرہ برابر پروا نہیں“۔

ٹانڈوی صاحب اکبری دور کے ابو الفضل اور فیضی کی یاد تازہ کرتے ہوئے ہندوستان کے باشندوں کو، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان، سب کو گاندھی کے قدموں میں ڈال کر، کانگریسی اور گاندھوی بنانا چاہتے تھے، جس کا نام موصوف نے ہندوستانی رکھا تھا۔ جس طرح اکبر بھی ہندو اور مسلمان کا فرق مٹا کر سب کو ایک قوم بنانا چاہتا تھا اور دینِ فروش علماء میں سے ابو الفضل اور فیضی وغیرہ اُسے جواز مہیا کر رہے تھے اسی طرح دورِ حاضر میں گاندھی نے بھی اکبری منصوبہ شروع کیا۔ مسلمانوں کو نزدیک بلایا تاکہ ہندومت میں مدغم کیا جائے، حتیٰ کہ اپنے قدموں میں جگہ دی، خود کہ محمد رسول اللہ کی مثل کہنے والوں کا غرور اگر مشرکوں اور بت پرستوں کے جوتوں میں ڈال کر نہ توڑا جاتا تو کیا پروردگارِ عالم و عالیشان اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے گستاخوں کا اُن کی بد زبانوں پر کوئی نوٹس نہ لیتا؟ گاندھی کے غلام بننے، مسلمانوں کو مشرکینِ ہند سے محبت و اتحاد کا رشتہ قائم کرنے اور ہندوؤں میں مدغم ہونے کی تجویز پر مہرِ تصدیق ثبت فرماتے ہوئے ٹانڈوی صاحب

ایندھ کپنی نے ملا مبارک کے فرزندوں کی طرح آیات و احادیث سے جواز مہیا کیا۔ دین میں یوں جہارت دکھانا، قرآن و حدیث میں دن دھاڑے کھل کر تحریفیں کرنا اگر خدا کے عذاب اور رسول کی ناراضگی کا موجب ہوگا تو ہوتا پھرے، اپنے پیشوا گاندھی جی کو تو خوش کر لیا، اپنے ہندو بھائیوں کو راضی کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا۔ موصوف اپنی گاندھوی قوم کے بارے میں یوں تو بین رسالت کا ارتکاب کر کے غضب خداوندی کو جوش میں لاتے تھے:

”اس پر ملک و وطن میں بڑی بڑی بختیں ہوئیں مگر وہ اپنی جگہ مطمئن تھا اور مطمئن رہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ کے یہودیوں اور مسلمانوں کو حفاظتِ وطن کے نام پر ہلا کر ایک قوم ہی بن سکتے ہیں تو ہندوستان کا مسلمان بھی آزادی وطن کے لیے اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔“

”گاندھوی صاحب کے اس خلافِ حقیقت بیان اور نظریہ پر مودودی صاحب یوں تبصرہ کرتے ہیں:

”مولانا (گاندھوی صاحب) آخر فرمائیں تو کہ جس متحدہ قومیت کو وہ رسول خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں اس میں آجکل کی متحدہ قومیت کے عناصر ترکیبی میں سے کون سا عنصر یا اجاتا ہے؟ اگر وہ کسی ایک عنصر کا پتہ نہیں دے سکتے اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ ہرگز نہیں دے سکتے تو کیا مولانا کو خدا کی باز پرس کا خوف نہیں؟“

آگے مودودی صاحب اسی گاندھوی قومیت پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

”مولانا (گاندھوی صاحب) اس متحدہ قومیت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ سے تشبیہ دینے کی جرأت فرما رہے ہیں حالانکہ ان بنیادی حقوق کی حیثیت ملکہ و کوریہ کے مشہور اعلان سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے اور مغرب کی ڈپلومیسی کی ایسی چالوں کا رشتہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے جوڑنے

کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے بس کی بات تو نہیں، ہاں جن کے پاس تقویٰ کا زادِ راہ اتنا زیادہ ہے کہ وہ ایسی جسارتیں کرنے پر بخشنے جانے کی اُمید رکھتے ہیں اُنھیں اختیار ہے کہ وہ جو چاہیں کہیں اور جو چاہیں لکھیں۔ لے

موصوف نے اسی سلسلے میں ٹانڈوی صاحب کو نمائش کرتے ہوئے مندرجہ ذیل الفاظ میں حقیقت پسندی کی دعوت دی اور دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کرنے سے روکنے کی کوشش کی ہے:

”کم از کم اب وہ (ٹانڈوی صاحب) اُمت پر رحم فرما کر اپنی غلطی محسوس فرمائیں ورنہ اندیشہ ہے کہ اُن کی تحریریں ایک فتنہ بن کر رہ جائیں گی اور اُس پرانی سنت کا اعادہ کریں گی کہ ظالم امراء اور فاسق اہل سیاست نے جو کچھ کیا اُس کو علماء کے ایک گروہ نے قرآن و حدیث سے درست ثابت کر کے ظلم و طغیان کے لیے مذہبی ڈھال فراہم کر دی۔“ لے

ٹانڈوی صاحب نے اپنی تجویز کردہ گاندھوی قومیت کو شریعتِ محمدیہ سے درست ثابت کرنے اور ابو الفضل فیضی کا حقیقی جانشین بننے کی غرض سے ”متحدہ قومیت و اسلام“ کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اسی کتاب کے دلائل اور صفحہ ۷۶ کی ایک عبارت پر مودودی صاحب تنقید کرتے ہوئے، اُن کے غلط موقف کو یوں سمجھاتے ہیں:

”عبارت کا ایک ایک لفظ شہادت دے رہا ہے کہ مولانا (ٹانڈوی صاحب) نہ تو قومیت کے اصطلاحی مفہوم کو جانتے ہیں، نہ کانگریس کے مقصد اور مدعی کو سمجھتے ہیں، نہ بنیادی حقوق کے معنی پر انھوں نے غور کیا ہے، نہ اُن کو خبر ہے کہ جن اجتماعی مجلسوں کا وہ بار بار اس قدر سادگی کے ساتھ ذکر فرما رہے ہیں اُن کے حدود و اختیار و عمل موجودہ دستور کے تحت کن کن راہوں سے

اس دائرے میں لغو کرتے ہیں، جس کو تہذیب و تمدن اور عقاید و اخلاق کا دائرہ
 کہا جاتا ہے..... اور یہ بات بھی میں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں کہ مولانا حسین احمد
 بایں ہمہ علم و فضل، کلچر، تہذیب، پرسنل لاء وغیرہ الفاظ بھی جس طرح استعمال
 کر رہے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ان کے معنی و مفہوم سے نا آشنا
 ہیں۔ میری یہ صاف گوئی اُن حضرات کو یقیناً بُری معلوم ہوگی جو رجال کو حتیٰ سے
 پہچاننے کے بجائے حتیٰ کو رجال سے پہچاننے کے شوگر ہیں۔ اس کے جواب میں چند
 اور گالیاں سننے کے لیے میں نے اپنے آپ کو پہلے ہی تیار کر لیا ہے۔

علامہ اقبال مرحوم بھی وطنیت کے اُسی معنی و مفہوم کے قائل تھے جس کا تصور اسلام دیتا
 ہے۔ مثلاً:۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا

بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحاد و وطن نہیں ہے

علامہ نے یوں تو اس بارے میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن اُن کے کلام سے وطنیت کے بارے
 میں یہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

اس دور میں نے اور ہے، جام اور ہے، جم اور

ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور

تہذیب کے آذر نے تیر شوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بُت کہ تراشیدہ تہذیبِ نبوی ہے

غارتِ گم کا شانہ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اسی سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے

اس اسلامی تصورِ وطنیت کے خلاف ٹانڈوی صاحب نعرہ بلند کر رہے تھے کہ "ملّیتیں اوطان سے بنتی ہیں"۔ بھلا ڈاکٹر اقبال جیسا فرد کس طرح خاموش رہ سکتا تھا۔ جواباً یہ اشعار سپرِ قلم کر دیے :۔

عجم ہنوز نذاند رموزِ دیں ورنہ ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرور بر سرِ منبر کہ ملت از وطن ست چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی ست
بمصطفیٰ ہر پاں خویش را کہ دیں ہر دست اگر باو نہ رسیدی تمام بُو لہتی ست

ڈاکٹر اقبال کے مذکورہ اشعار کا گاندھوی حضرات تک پہنچا کیا ہوا، گویا جھس میں آگ لگ گئی، سارا قبیلہ بھڑک اٹھا۔ ٹانڈوی صاحب اور ان کے معتقدین نے موصوف کے خلاف ایک جنگِ مہم چلا کر دیا، طولِ طویل بحثوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ جاری ہو گیا۔ اقبال مرحوم ان دنوں بسترِ علالت پر دراز تھے۔ آپ نے ٹانڈوی صاحب کی ایک دو تحریروں کا جواب تو دیا لیکن چاروں طرف سے ہنگامہ آرائی دیکھ کر اس شعر پر بحث کا خاتمہ کر دیا :۔

فلندرجز دوترف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

اس موقع پر لاہور سے نکلنے والے اخبار "زمیندار" کے ایڈیٹر جناب ظفر علی خاں بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے علامہ اقبال کی تائید اور ٹانڈوی صاحب کی تواضع میں مندرجہ ذیل اشعار سپرِ قلم کر دیے :۔

حسین احمد مدنی

وطن جس کی رو سے ہے بنیادِ ملت
 میں اُس شرع کی کر رہا پیروی ہوں
 آہنا کا قرارہ اُچھلا ہے جس سے
 میں اُس زندگی کی شانِ نوی ہوں
 سکھاتا ہے جو ناچنا اور گانا
 میں اُس مدرسہ کا بڑا مولوی ہوں
 کبھی میں بھی تھا عازمِ سوتے یثرب
 اب اس عزم کو کر چکا ملتوی ہوں
 کوئی قادری ہے کوئی سُھروردی
 براخیز یہ ہے کہ میں گاندھوی ہوں
 مجھے لیگ سے اس لیے دشمنی ہے
 وہ عبد النزاری، میں عبد القوی ہوں
 برستی ہیں جس سے ترنگی بلاتیں
 میں اُس عرش پر آجکل مستوی ہوں
 سمجھ لوں میں چینا کو کیونکہ مسلمان
 کوئی میں بھی اشرف علی تھانوی ہوں

خدا اور رسول کے احکام بیان کرنے میں ٹانڈوی صاحب کس درجہ محتاط تھے اور فتویٰ نویسی کی شرعی ذمہ داریوں کو نبھاتے وقت خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا کو کہاں تک مدِ نظر رکھا کرتے تھے اس کی حقیقت مودودی صاحب کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”میں صاف کہتا ہوں کہ ان کے نزدیک کونسلوں اور اسمبلیوں کی شرکت کو ایک نِ حرام اور دوسرے دنِ حلال کر دینا ایک کھیل بن گیا ہے، اس لیے کہ ان کی کھیل و تحریم حقیقتِ نفسِ الامری کے ادراک پر تو مبنی نہیں محض گاندھی جی کی جنبشِ لب کے سانچہ ان کا فتویٰ گردش کرتا ہے۔“

ٹانڈوی صاحب اینڈ کمپنی کی ہندو وازی بلکہ زنا دوستی پر تبصرہ کرتے ہوئے اچھیں حضرات کے

لے مدینہ منورہ کو از روئے احادیث ”یثرب“ کہنا منع ہے، یہاں طیبہ لکھا جاسکتا تھا۔ (اختر)

لے مراد مسٹر محمد علی جناح۔ چونکہ ان کے مخالفین ”چینا“ کہا کرتے تھے، یہاں ٹانڈوی صاحب کی زبان میں چینا

کہا ہے۔ (چغتائے ص ۱۴۴) لے ابوالاعلیٰ مودودی، مولوی: مسئلہ قومیت، ص ۶۳

خانہ ساز حکیم الامت بلکہ ان کے محد و ملت بلکہ جامع الجہدین صاحب کھلانے والے مولوی اشرف علی
تھانوی (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) ان حضرات کی گاندھیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:
”جوابات گاندھی کے منہ سے نکل جانے فوراً اس کو قرآن و حدیث پر منطبق کرنے
کی کرتے ہیں۔ اس تحریک میں کوئی چیز بھی تو ایسی نہیں جو کسی مسلمان لیڈر یا علما
کی ہو۔ دیکھیے ہوم رول گاندھی کی تجویز، بائیکاٹ (ترک موالات) گاندھی کی تجویز،
ہجرت کا مسئلہ اس کی تجویز، غرض کہ جملہ تجویزیں اس کی ہیں۔ ان کا کام صرف یہ ہے
کہ جو اس نے کہا بلیک کہہ کر ساتھ ہو گئے۔“

مشہور دیوبندی عالم علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے بھتیجے مولوی عامر
عثمانی مدیر ماہنامہ ”تجلی“ اپنے اکابر دیوبند کی زنا دوستی پر یوں کھل کر تبصرہ کرتے ہیں:
”پنڈت نہرو کی ہاں ہاں ملاسنے کا سعادت مندانہ فرض بڑے بڑے علماء ربانیین
(علمائے دیوبند) کو بھی بے اعتنائی ”دینی“ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر پنڈت نہرو
کہہ دیں کہ دین اور سیاست کو ایک سمجھنے والے بڑے گدھے ہیں تو علماء ربانی و
حقانی کی ایک بڑی کھیپ اس پر تصدیق و تمحط کر دے گی اور جو پرانے خیال کے
مولوی و ملا و متحط گے گیر کریں گے انھیں زندیق و کافر ٹھہرا کر جیل میں بھجوانے کی
ترکیبیں کرے گی۔“ ملخصاً لے

۱۳ جولائی، ۱۹۵۷ء کو بھارت کے سابق صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے مدرسہ دیوبند کو اپنی تشریف آوری
سے نوازا۔ جناب حسین احمد صاحب ٹانڈوی (المتوفی ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) ان دنوں دارالعلوم
دیوبند کے صدر تھے۔ حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جن حضرات کے مذہب میں اہتمام و
تداعی اور دن تاریخ کا تعین قطعاً ناقابل برداشت اور سراسر بدعت سیئہ بلکہ قابل لوم و حرام
و فسق ہے، وہ اپنے ان جملہ منہیات کو ایک مشترک کی خاطر کس قدر سعادت مندی کے ساتھ

صرف جائز ٹھہراتے بلکہ ان سب باتوں پر عمل کر دکھاتے ہیں۔ میلاد شریف تو ان حضرات کی نظروں میں یوں ناجائز ہے کہ اس میں سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حالات و کمالات بیان کیے جاتے ہیں لیکن راجندر پرشاد کے جو علی الاعلان بت پرست تھا، اوصاف بیان کرنا اور تعریفی دستاویز یعنی سپاس نامہ ایک منقش صندوقچی میں رکھ کر پیش کرنا معلوم نہیں ان حضرات کے دین کا پہلا رکن ہے یا دوسرا؟ نیز میلاد شریف میں قیام تعطیلی تو اس لیے ان حضرات کے نزدیک بدعت و حرام بلکہ شرک ہے کہ آقاؐ کے دو جہاں، سرور کون و مکان صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعظیم کیوں کی جاتی ہے؟ آخر یہ بیچارے نبیؐ کی تعظیم کو بھی شرک نہ کہیں تو گاندھویت میں اور کس چیز کو شرک ٹھہرایا جائے؟ رہا مشرکوں کی تعظیم کا سوال، بت پرستوں کے لیے تعطیلی قیام کرنا، نہ صرف خود تعطیلی قیام کرنا بلکہ اپنی ساری علمی ذریت سے کروانا، سادہ لباس میں نہیں بلکہ خوش پوش ہو کر، کسی مجمع میں نہیں بلکہ سڑک پر دو رو یہ کھڑے ہو کر، سائے میں نہیں بلکہ دھوپ میں، خالی ہاتھ نہیں بلکہ جھنڈیاں اور ماٹولے کر۔ بھلا اس طرح کسی بت پرست کے لیے تعطیلی قیام کیا جاتے تو اس کے جواز میں دنیا کے کس مشرک یا زنا ر دوست کو کلام ہو سکتا ہے؟ باری تعالیٰ شانہ اپنے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے گستاخوں کو دنیا میں بھی کس طرح ذلیل و خوار کر دکھاتا ہے۔ کذا لک العذاب ولعذاب الآخرة اکبر لو کانوا یعلمون ۵ اب اس پر بھی کوئی نہ سمجھے تو یہ اُس کی عقل کا قصور ہے۔ آئیے اب راجندر پرشاد کے اس دورے کی کہانی خود علماء دیوبند کی زبانی سنیں:

۱۳ جولائی، ۱۹۵۷ء کی تاریخ دارالعلوم دیوبند میں وہ تاریخی دن تھا، جب دارالعلوم میں عالی جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب بالقابہ نے صدر جمہوریہ ہند کی حیثیت سے قدم رنجہ فرمایا۔۔۔۔۔ پروگرام کے مطابق صبح کے آٹھ بجے جب صدر جمہوریہ اپنے سیلون سے برآمد ہوئے تو حضرت مولانا مدنی اور حضرت مولانا طیب صاحب جو سیلون کے دروازے کے قریب کھڑے تھے، آگے بڑھے۔

لے (ترجمہ) اسی طرح عذاب دیا جاتا ہے اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی بڑا ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ وہ اس بات کو جانیں۔

مولانا حفظ الرحمن صاحب نے ان حضرات کا تعارف کرایا۔

اولاً مولانا مدنی سے پھر حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہ سے صدر محترم نے مصافحہ کیا۔ حضرت مہتمم صاحب (یعنی قاری محمد طیب صاحب) نے صدر کو ہار پہنایا۔ آٹھ بجکر دس منٹ پر صدر محترم دارالعلوم کے لیے اپنی کاریں روانہ ہوئے۔ اسٹیشن سے لے کر دارالعلوم تک راستہ غیر مقدم کے لیے بنائے ہوئے خوشنما دروازوں اور رنگ برنگ کی جھنڈیوں سے آراستہ تھا۔ دیوبند اور قُرب و جوار کے ہزاروں امتحان سرگرم پر دوریہ صدر کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے۔ دارالعلوم سے تقریباً تین چار فرلانگ کے فاصلے تک طلبائے دارالعلوم کی دوریہ قطاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ہند اور بیرون ہند کے طلبہ کے علیحدہ علیحدہ گروپ بنا دیے گئے تھے، جو متعدد مائٹویے ہوئے تھے۔ جب طلبہ کی ان دلکش قطاروں کے درمیان سے صدر محترم کی کار گزرنی شروع ہوئی تو دیوبند کی فضا استقبالیہ نعروں سے گونج اٹھی۔ کتب خانہ کے معائنہ کے بعد صدر جمہوریہ ٹھیک نو بجے استقبالیہ جلسہ میں شرکت کے لیے پُندال میں تشریف لے گئے۔ .. عظیم الشان اور حسین پُندال مختلف گیلریوں میں تقسیم تھا۔ صدر محترم نے جونہی ڈائس پر قدم رکھا، پورا مجمع صدر کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ حضرت مولانا مدنی نے صدر محترم کو سنہارا ہار پہنایا۔ دارالعلوم کی جانب سے اللہ اکبر، دارالعلوم زندہ باد، صدر جمہوریہ ہند زندہ باد اور جمہوری ہندوستان زندہ باد کے نعروں سے صدر محترم کا خیر مقدم کیا گیا اور ضلع کے حکام کی جانب سے سرکاری رسم کے مطابق قومی ترانہ پیش کیا گیا جسے انگریزی اسکول کے بچوں نے پڑھا۔ ترانہ ختم ہوتے ہی صدر محترم اور پورا مجمع بیٹھ گیا اور جلسہ کی کارروائی شروع کی گئی۔

سب سے پہلے دارالعلوم کی جانب سے حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب نے صدر محترم کی قدم رنجہ فرمائی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ”آج دارالعلوم

کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے صدرِ محترم ہندوستان کی صرف ایک عظیم شخصیت ہی نہیں بلکہ جنگِ آزادی کے ایک جانباز سپاہی بھی ہیں۔ آج وہ صدرِ جمہوریہ کی حیثیت سے یہاں رونق افروز ہیں۔ آپ کی قدم رنج فرمائی پر ہمیں مسرت ہے اور ہم اس کے لیے شکر گزار ہیں۔

اس کے بعد تلاوتِ قرآن سے جلسہ کی باقاعدہ کارروائی کا آغاز ہوا.....
 نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب مدظلہ نے سپاس نامہ پڑھ کر سنایا، جس میں دارالعلوم کی باطنی روحانیت اور توکل و انابت وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہوئے دارالعلوم کی چند ضرورتوں پر صدرِ محترم کی توجہ دلائی گئی۔ صدرِ جمہوریہ کو یہ سپاس نامہ ایک منقش صندوقچی میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ جلسہ کے اختتام پر صدرِ جمہوریہ ریلوے اسٹیشن پر تشریف لے گئے۔ دارالعلوم کی جانب سے دوپہر کا کھانا صدرِ محترم کو ان کے سیلون ہی میں کھلایا گیا۔ حضرت مولانا مدنی مدظلہ اور دوسرے منعقد حضرات کھانے میں شریک تھے۔

بہتر معلوم ہوتا ہے کہ صدرِ بھارت ڈاکٹر راجندر پرشاد کے اس دورہ دارالعلوم دیوبند کی کہانی ایک فاضل دیوبند یعنی علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۹ھ/۱۹۴۹ء) کے بھتیجے عام عثمانی صاحب کی زبانی بھی بیان کر دی جائے۔ چنانچہ موصوف اس واقعہ یا سانحہ کو اپنے الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں:

”دنیا کی مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم دیوبند کی دعوت پر ۱۳ جولائی کو جمہوری ہند کے صدر جناب ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب تشریف لائے جناب صدر کی آمد سے قبل تقریباً دس روز تک دارالعلوم کے تمام اسٹاف نے جس ذوق و شوق، تن دہی اور دلچسپی سے اپنے معزز مہمان کے استقبال کی تیاریاں کیں اُن کا تفصیلی بیان ایک دفتر چاہتا ہے۔ ہمیشہ عید قربان پر دس بارہ دن کی چھٹیاں

ہوا کرتی تھیں لیکن اس مرتبہ انھیں بھی ختم کرنا پڑا اور جاری ہوا کہ تمام اسٹاٹ
استقبالی انتظام کی تکمیل میں پوری طرح مصروف رہے۔۔۔۔۔ میرے اپنے کئی
اقرباء مدرسہ میں ملازم ہیں۔ اُن میں سے ایک کے ذوق و شوق کا عالم تو میں نے
اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ علی الصبح مدرسہ تشریف لے جاتے اور پھر ساری رات تک
اُن کا پتہ ہی نہ چلتا۔ جمعہ کے دن دوپہر کا کھانا کھانے بمشکل تین بجے گھر آ سکے۔ جی
چاہا کہ پوچھوں، کیا نماز جمعہ کی بھی چھٹی نہیں ملی، مگر چپ ہو رہا کہ کہیں اس کے
مقدس جذبات کو ٹھیس نہ لگ جائے۔ آخر جمعے تو ہر ساتویں روز آتے ہیں مگر صدر
جمہوریہ روز روز نہیں آتے۔

جلسے کی شرکت کے لیے انگریزی زبان میں نہایت نفیس دعوت نامے چھاپے
گئے تھے۔۔۔۔۔ جلسہ اُس پنڈال میں ہوا جو ہزار سے زیادہ روپے خرچ کر کے
وسیع دارالطلباء میں بنوایا گیا تھا، بہت شاندار، معزز مہمان کی شان کے مطابق۔
سب سے پہلے وطنی ترانہ پڑھا گیا۔ اُس وقت صدر جمہوریہ اور تمام اساتذہ و مفتیین اور
پورا مجمع کھڑا تھا۔ ترانے کے آخر تک سب کھڑے تھے اور پھر صدر جمہوریہ کی تقلید
کرتے ہوئے بیٹھ گئے۔

اب تلاوتِ قرآن سے جلسہ شروع کیا گیا۔ تلاوتِ قرآن کے وقت کھڑے
ہونے کا رواج ہمارے یہاں نہیں ہے، اس لیے اس کا مقابلہ ترانے کے
آداب سے نہیں کرنا چاہیے۔۔۔۔۔ تلاوت کے بعد نظمیں ہوئیں۔۔۔۔۔ گلزار صاحب
نے نہایت فصاحت و بلاغت کے ساتھ بتلایا کہ اگر مولانا مافی مدظلہ دینِ حجازی
کے مہبط و مخزن ہیں تو صدر جمہوریہ دینِ غیر حجازی کے امام و شیخ۔ ایک ولی ہے تو
دوسرا دھرماتما۔ دونوں ہی کے فیض و برکت سے جمہوری حکومت اپنے پیش بہا
کام سرانجام دے رہی ہے۔

انور صابری صاحب قومی و ملکی خیالات کو جامہ شعر پہنانے میں جس قدر
مشاق ہیں، وہ مشاعرے سننے والے حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ گاندھی جی کی

مظلومانہ موت پر غالباً ”باپوشیدہ“ کے عنوان سے جو نظم انہوں نے کہی تھی اس کا مقابلہ اس موضوع کی شاید کوئی نظم نہیں کر سکی۔ نظموں کے بعد حضرت مہتمم صاحب دارالعلوم نے سپاس نامہ پڑھا۔ سپاس نامے کے آخر میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ جناب صدر جمہوریہ کی قدم رنجہ فرمائی دارالعلوم کی تاریخ کا ایک تابناک نقش ہے جس پر دارالعلوم کو ہمیشہ فخر رہے گا۔۔۔۔۔ سپاس نامے کے بعد جناب صدر جمہوریہ نے تقریر فرمائی۔۔۔۔۔ اس کے بعد محترم علمائے رسم شکیہ اور فرامائی شیخ نے اپنی معروف صاف گوئی کو پوری طرح قائم رکھا اور فرمایا، ہم غریب ہیں، فقیر ہیں، بے نوا ہیں۔ عالیجناب صدر جمہوریہ۔۔۔۔۔ نے اپنی تشریف آوری سے سرفراز فرما کر ہمیں نہایت درجہ ممنون فرمایا ہے۔

صدر محترم جلسہ ختم ہونے پر دیوبند سے روانہ ہو گئے۔ میں نے دیکھا، اُن کی فرائے بھرتی ہوئی کار کو صرف ایک نظر دیکھ لینے کے لیے سیکڑوں لوگ اس طرح بھاگ رہے تھے جیسے قرون پہلے قیس ناقہ لیلیٰ کی طرف بھاگا ہوگا۔ کیوں بھاگتے؟ آخر صدر جمہوریہ کی کار تھی۔ دارالعلوم نے اپنے محبوب صدر کی آمد پر ہزاروں روپیہ خرچ کیا۔۔۔۔۔ جناب صدر نے اپنی جیب خاص سے نقد ایک ہزار روپیہ مدرسہ کو عنایت کیا۔ چنانچہ اگلے روز جناب مہتمم صاحب نے نہ صرف یکہ کامیابی کی مٹھائی تقسیم فرمائی بلکہ جلسہ عام میں جناب صدر کی خوش اخلاقی، فراخ نظری، روحانیت، شفقت، جود و سخا، انسانیت پروری، حلم و رافت اور بندہ نوازی کو بڑے وزنی۔۔۔۔۔ الفاظ میں بہت مسرت اور دلی جوش کے ساتھ سراہا۔

مشہور دیوبندی شاعر، اخبار نویس، ادیب، مقرر، لیڈر اور روزنامہ زیندار کے ایڈیٹر جناب ظفر علی خاں نے شاید اسی قسم کے ہندو نوازی اور زنا دوستی کے واقعات سے متاثر ہو کر یہ شعر کہے تھے کہ :

کیا پوچھتے ہو ہند میں دین ہدی کا حال
خود عالمان دین بھی چھپے اُس کے جال میں
کافر بھی ہمنوں کے اولوالامر بن گئے
لذت تھی جن کے خوان کی عجل حنید سے
چھوڑا جہاد کو اور اہنسا کیا قبول
اسلام کے چمن میں صنم ہر دوار کے
قرآن کے ترجمان ہیں کیوں بیت کی طرح چپ
کیا انقلاب ہے کہ اساطین شرع کو
ویراں ہے خانقاہ تو مسجد ہے پاٹمال
جس کا نہیں ہے تور، وہ ہے کانگرس کی چال
کل تک جو تھا حرام، ہو آج سے حلال
ہے آجکل پسند انھیں کیوٹی کی ڈال
جو شیر تھے پہننے لگے لومڑی کی کھال
پھرتے ہیں پات پات پھدکتے بیڑاں ڈال
حالانکہ ہے مدینہ کے ناموس کا سوال
دم مارنے کی گاندھی کے آگے نہیں مجال

کچھ جانتے بھی ہو کہ ہیں کیوں آج ہم ذلیل
حسم پر ہمارے ان علماء کا پڑا وبال

ٹانڈوی صاحب کے سیاسی نظریات کا اسلام سے کہاں تک تعلق تھا؟ ہندو کی محبت
میں وہ کس درجہ سرشار ہو چکے تھے، یہ حکیم محمود احمد برکاتی کی زبانی سنئے:

”مولانا حسین احمد مدنی کی قوت فیصلہ کے متعلق ہم اچھی رائے نہیں رکھتے۔ انھوں
نے مدت العمر کسی بھی سیاسی مسئلے میں اصابت رائے کا کوئی مظاہرہ نہیں کیا۔ ان
کا انداز فکر منطقی نہیں جذباتی تھا۔ انگریز کی دشمنی میں وہ حدود اعتدال سے
تجاوز کر گئے تھے اور استخلاص وطن کے لیے وہ ہندو قوم سے غیر مشروط
اتحاد کے قائل تھے اور اس سلسلے میں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ اشتراک وطن
کی بنیاد پر مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک قوم فرمانے لگے تھے۔ وطنی قومیت
متحدہ کی تبلیغ کو انھوں نے اپنے مشن کا ایک جز بنایا تھا اور شہر شہر اس کی
تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ زبان و قلم کا پورا زور اس متحدہ قومیت کی حمایت میں
صرف فرماتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار دہلی میں انھوں نے یہ گمراہ کن اور نہایت

غلامت نہایت زور کے ساتھ فرمائی کہ: اقوامِ اوطان سے بنتی ہیں! لے

مولانا معین الدین اجیری (المتوفی ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء) کی آزادی ہند کے مسئلے میں سیاسی جدوجہد کے بارے میں علامہ سلیمان ندوی (المتوفی ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء) نے یوں تصریح فرمائی:

”تحریکِ خلافت میں مذہبی فتوے کے جرم میں دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی سے برداشت کیا کہ علی برادران (مولانا شوکت علی و مولانا محمد علی جوہر) نے قدم چوم لیے۔ جس زمانہ ابتلاء میں مولانا کفایت اللہ صاحب صدرِ جمعیتۃ العلماء اور مولانا احمد سعید صاحب ناظمِ جمعیتۃ العلماء قید و نظر بندی کی تکلیفیں اٹھا رہے تھے، اُس وقت تحریک کی رہنمائی کے لیے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لے جاتے اور جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد مسائلِ حاضرہ پر تقریر فرماتے۔ جمعیتۃ العلماء کے اجلاسِ امر و ہم کی صدارت فرمائی اور مستقل نائب صدر رہے۔ صوبہ راجپوتانہ کی مجلسِ خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا۔ تحریکِ کشمیر کے زمانہ میں مجلسِ احرارِ اسلام کے ڈکٹیٹر رہے۔ مسلمانوں کے سوا برادرانِ وطن (ہندو) بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے۔“ لے

گاندھوی علماء جس زمانے میں کھل کر متحدہ قومیت کے مبلغ بنے ہوئے تھے۔ اُن کے نزدیک مسلم اور کافر ایک ہی قوم کے افراد تھے اور اس طرح اسلامیانِ ہند کو ہندو اکثریت میں مدغم کرنے پر اپنی تمام صلاحیتیں بروئے کار لارہے تھے، اُن دنوں مولانا معین الدین اجیری مسلمانوں کو یوں تلقین فرما رہے تھے:

”مسلمانوں کے لیے یہی راہِ عمل ہو سکتی ہے کہ وہ آزادی کے لیے متفقہ طور پر میدان میں آئیں، مگر کانگریس میں شامل ہو کر نہیں، ہندوؤں کا ضمیر ہرن کر نہیں بلکہ جمعیتۃ العلماء نے ہند برطانیہ کے خلاف جنگ کا جو پروگرام تیار کرے، اُس پر

عمل کریں۔ یعنی برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد تو نصب العین ہے، اس کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے مگر یہ جدوجہد گاندھی کی قیادت میں اور کانگریس کے جھنڈے تلے نہیں بلکہ خود اپنی تنظیم اور جمعیت کی نگرانی اور رہنمائی میں رہے۔

اور مولانا اجیمیری کی بتائی ہوئی اپنی تنظیم یعنی جمعیت العلماء ہند کا حال بھی حکیم محمود احمد برکاتی کی زبانی سن لیجیے کہ یہ مسلمانوں کی کیسی رہنمائی کر رہی تھی اور کس قسم کی آزادی اس جمعیت کا مطمح نظر تھا۔ وہ لکھتے ہیں،

علمائے دیوبند میں سے مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے سیاسی کردار کو ہم نے اس لیے موضوع گفتگو بنایا کہ جمعیت العلماء کی صدارت سب سے طویل عرصہ تک مولانا ہی نے فرمائی تھی اور ۱۹۴۰ء کے بعد سے تو وہ اپنی وفات تک مستعلاً و بلا انقطاع صدر جمعیت رہے۔ اس لیے جمعیت کی پالیسی کی تبدیلی میں اُن کا سب سے زیادہ دخل تھا اور یہ مولانا مرحوم کا کارنامہ تھا کہ رفتہ رفتہ جمعیت علماء ہند مسلمانوں میں اس قدر ناقبول بلکہ بالفاظ صحیح تر معضوب ہو گئی تھی کہ ۱۹۴۶ء کے معرکہ آراء اور فیصلہ کن انتخابات میں خاص سہارن پور کی سیٹ سے نیشنلسٹ مسلمانوں کا نمائندہ کامیاب نہ ہو سکا اور شہید ملت خان قیادت علی خاں نے اپنے قوم پرست حریف کو اُس کے مرکز میں عبرت ناک شکست دی۔ حدیہ ہے کہ تقسیم کے بعد اور مسلم لیگ کے راستے سے ہٹ جانے کے باوجود آج بھی جمعیت بھارت کے عوام و خواص کی قیادت کی اہل نہیں مانی جاتی۔

اب ٹائٹل دی صاحب کے دستِ راست مولوی حفظ الرحمان سیوہاروی کا حال مولوی محمد ریاض صاحب کی زبانی ملاحظہ فرمائیے:

مولانا حفظ الرحمن صاحب قیام پاکستان کے دیانت داری سے مخالف تھے

مگر ۱۹۴۷ء کے بعد انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں، وہ اب زمر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ ان خدمات نے اُن کو اُمتِ مسلمہ کے اُن افراد کی صف میں لاکھڑا کر دیا ہے کہ جن کی ذات پر پوری اُمتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ تاریخِ اسلام کے اکابر کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔^۱ اگر یہاں موصوف کے ہی لفظوں میں اس امر کا بھی اظہار کر دیا جائے کہ مولوی حفظ الرحمن نے جو مسلمانانِ ہند کی اب زمر سے لکھنے کے قابل گرانقدر خدمات انجام دی تھیں، وہ کیا ہیں؛ نیز موصوف پر کونسی اُمتِ مسلمہ کو فخر ہے اور وہ کون سے اکابر کی صف میں شامل ہوئے تھے، تو میرا خیال ہے کہ قارئینِ کرام بھی اس امر کے متقی ہوں گے۔ وضاحت ملاحظہ ہو:

”مجاہدِ ملت (مولوی حفظ الرحمن صاحب) کا حُسنِ تدبیر تھا کہ آپ نے اپنے پرانے تعلقات کو از سرِ نو تازہ ہی نہیں کیا بلکہ اُن کو نچتہ کر کے ایسا اعتماد حاصل کر لیا کہ گاندھی جی حکومت کے سربراہوں اور کانگرس کے بڑے ہندو لیڈروں پر بھی اتنا اعتماد نہ کرتے تھے جتنا مولانا حفظ الرحمن صاحب اور اُن کے ساتھیوں پر۔ ۹ ستمبر، ۱۹۴۷ء کو دہلی پہنچے تو فرقہ پرستوں نے اُن کی اتنی مخالفت کی کہ اُنھیں اپنی پرارتھنا کی مجلسوں میں ترمیم کرنا پڑی۔ مجاہدِ ملت جو فرقہ پرستی کے خلاف نبرد آزما تھے، گاندھی جی کے دستِ راست بن گئے۔ مجاہدِ ملت کو سبمانِ الہند مولانا احمد سعید دہلوی کی رفاقت و معیت حاصل تھی۔“

یہ بات اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے کہ گاندھی علما کی پوری کھیپ اسلام اور کفر کے فرق کو فرقہ پرستی سمجھتے تھے۔ ابو الفضل اور فیضی کی طرح اس چودھویں صدی میں اُن حضرات کے خلاف نبرد آزما رہے جو یہ کہتے تھے کہ اسلام اسلام ہے اور کفر کفر ہے، اسلام اور کفر کا ملاپ اجتماعِ ضعیف ہے۔ ان حضرات کا پیدا کردہ گاندھی ٹولہ اکبری دینِ الہی ہی کا ترمیم شدہ اور جدید

اٹیشن تھا، جس کو کامیاب بنا کر گاندھی کو خوش کرنے میں ہر گاندھیوی عالم دوسرے سے سبقت لے جانے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ ان حضرات کی ساری قابلیتیں اور توانائیاں اسی مقصد کے لیے وقف تھیں، لیکن جس طرح اکبر کے دین الہی سے ہندومت کو نقصان کی بجائے زبردت فائدہ پہنچا کہ مسلمانوں کو جو کفر سے نفرت ہوتی ہے اُس کی شدت میں کمی آگئی اسی طرح گاندھویت کی نحوست نے بھی مسلمانوں کو مشرکوں اور بُت پرستوں کے قدموں میں ڈال کر، انھیں بُت فروش بنانے کا فرض ادا کیا جنھیں کبھی اپنے بُت شکن ہونے پر ناز ہوا کرتا تھا۔ شاید اقبال مرحوم نے اسی لیے فریاد کی تھی کہ:۔

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ کتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

مولوی حفظ الرحمن صاحب نے ۱۳۸۲ھ/۱۹۶۲ء میں وفات پائی۔ موصوف چونکہ گاندھویت کے ایک عظیم رکن تھے اسی لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو گاندھی جی کے فلسفہ پر خلوص دل سے ایمان لائے ہوئے تھے اور انھیں کے اصولوں کو اپنا ضابطہ حیات سمجھتے تھے، اُس وقت انھوں نے بھارت کا صدر ہونے کی حیثیت میں سیوہاروی صاحب کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے موصوف کے بارے میں یوں فرمایا تھا،

”مولانا مرحوم کی سیاسی زندگی ۱۹۱۹ء سے شروع ہوئی۔ انھوں نے خلافت اور سوراج (اکھنڈ بھارت) کی تحریکوں میں حصہ لیا اور متحدہ قومیت (یعنی مسلمان اور ہندو ایک ہی قوم ہیں) اور حریت و آزادی کے پیغام کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کیا اور یہ وابستگی آخر دم تک برقرار رہی“ ملخصاً

ڈاکٹر راجندر پرشاد جو ڈاکٹر ذاکر حسین سے پہلے بھارت کے صدر تھے، موصوف کی وفات پر تعزیت کرتے ہوئے ان الفاظ میں سیوہاروی صاحب کے کارناموں پر روشنی ڈالتے ہیں:

”حضرت مولانا حفظ الرحمن صاحب مرحوم، جمعیتہ العلماء ہند کے ایک بلند پایہ رکن تھے۔ ہماری قومیت کی ایک چمکتی مثال تھے اور میرے اُن عزیز دوستوں میں سے تھے جن کے ساتھ بارہا کام کرنے کا مجھے اتفاق ہوا تھا۔“

بھارت کے وزیر اعظم، پنڈت جواہر لال نہرو نے موصوف کو اپنے تعزیتی پیغام میں یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

”مولانا کے انتقال سے مجھے بڑا دکھ ہوا ہے۔۔۔۔۔ ہم لوگ شروع میں دونوں یو۔پی۔ کانگریس کمیٹی کے ممبر تھے۔ اکثر ملا کرتے تھے۔ چھوٹی کونسل کے ممبر بھی رہے۔۔۔۔۔ اہم مواقع پر ملنے جلنے اور بات کرنے سے ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ میرے دل میں اُن کی بہت قدر تھی۔ وہ بہادر سپاہی تھے۔ بہادر بنیا تھے۔ جو کہتے تھے اُس میں وزن ہوتا تھا۔ اُن کی بات غور طلب ہوتی تھی۔ ایسے آدمی تھے کہ پیچیدہ مسائل کو حل کرنے میں مدد کرتے تھے۔“

مسٹر لال بہادر شاستری جو پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد بھارت کے وزیر اعظم بنے اور ۱۹۶۲ء میں موصوف کی وفات کے وقت ہوم مینسٹر تھے۔ انھوں نے ٹائون ہال دہلی کے تعزیتی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

”ابھی ابھی کچھ لوگوں نے کہا کہ مولانا حفظ الرحمن سپیو ہاروی صاحب، گاندھی جی کے اصولوں پر چلتے تھے۔ گاندھی جی اس ملک میں آئے۔ اُنھوں نے انگریزوں کے خلاف لڑائی لڑی۔ اُن کے ساتھ مل کر، اُن کے بتائے ہوئے اصولوں کو اپنا کر، اُن پر چل کر بہت سے لوگ لیڈر بن گئے۔ چھوٹے چھوٹے آدمی لیڈر بن گئے۔ اُن کا ڈھنگ، اُن کا طریقہ ایسا ہی تھا۔ لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ لیڈر دولت سے نہیں بنتا، بہت سا

پڑھ کچھ جانے سے نہیں بنتا، حکومت کا وزیر بن جانے سے نہیں بنتا، لیڈر تو پیدا ہوتا ہے اور مولانا (سیوہاروی صاحب) ایسے ہی لیڈر تھے۔ ابھی آپ نے سنا کہ مولانا شروع ہی سے لوگوں کی خدمت کے کاموں میں حصہ لیتے تھے، تو ان میں وہ بات شروع ہی سے تھی جو ایک پیدائشی لیڈر میں ہوتی ہے۔ ^{مختصاً}

گاندھوی امام الہند کے کارنامے

جناب ابوالکلام آزاد (المتوفی ۱۳۷۷ھ / ۱۹۵۸ء) اس گاندھوی قبیلے کی ممتاز و منفرد ہستی تھے۔ موصوف کی گاندھویت کے بارے میں مولوی شریف الحسن ناظر لکھنؤی نے یوں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

”ہندوستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں حضرت مولانا کی پہلی ملاقات مہاتما گاندھی سے ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جہاں مسئلہ ترکی و خلافت کے متعلق والٹر رائے سے گفتگو کرنے کے لیے تمام ممتاز ہندو مسلمان لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اس موقع پر آنجنابی ملک بھی موجود تھے اور وہی دن تھا جب مولانا اور گاندھی جی کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو گاندھی جی کے آخری دم تک قائم رہا۔“

یہ پہلی ملاقات ہندوستان کی تاریخ میں اس لیے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اس اجتماع میں پہلی مرتبہ مہاتما گاندھی کے اصولوں کو قبول کر لیا گیا۔ البتہ والٹر رائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے مولانا نے اختلاف کیا۔ وہ گفت و شنید اور عرض و معروض کے قدیم طریقوں سے بہت بیزار تھے اور اس لیے اُس مجلس میں اُنہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ کسی وفد کا والٹر رائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتہ وہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنہوں نے اس

”تاریخی اجتماع میں گاندھی جی کے پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ اُس وقت دوسرے مسلمان لیڈر جو مولانا کے بیخیال تھے، حکیم اجمل خاں مرحوم تھے۔“ ملخصاً

گاندھویت کے علمبرداروں میں موصوف سب سے قد آور ہیں۔ موصوف نے اکبری دور کے ابوالفضل کا حقیقی جانشین بن کر مسلمانان ہند کو مشرکوں اور بت پرستوں کا حقیقی بھائی بنا دینے، کفر و اسلام اور بت پرست و بت شکن کا فرق مٹا دینے کی غرض سے اور اس طرح دانستہ یا نادانستہ سمجھوتے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ کی مساعی جلیلہ کو حرف غلط کی طرح مٹانے اور ابوالفضل و فیضی وغیرہ کے ناپاک مشن کو از سر نو زندہ کرنے کا بیڑا اٹھایا، اس نظریہ کی علمبرداری کرتے ہوئے یوں اسلامیان ہند کو تلقین کرتے ہیں :

”میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا، ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے تو اُسے بخش دیں اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے اس مبارک اتحاد کو صدمہ پہنچے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارا گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں اور جب تک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں جو اسلام کے خلاف ہو، اُس وقت تک پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ اُن کے مشوروں پر کاربند رہیں۔“

یہ ایک بات ہے کہ ابوالکلام صاحب ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء سے رجسٹرڈ گاندھوی بنے تھے لیکن ماضی قریب کے ابوالفضل اپنے زمانہ ”الہلال“ ہی سے ہندو نواز اور زنا ر دوست تھے۔ موصوف کا یہ رجحان اُن کے دل کی کوٹھری میں ہی بند نہیں تھا بلکہ ”الہلال“ کے ذریعے بھی وہ ہندو دوستی اور متحدہ قومیت کی زور شور سے تبلیغ کر رہے تھے اور علی گڑھ کے بڑش نوازوں

پر بھی وارکتے رہتے تھے مولوی ثرلٹ الحسن ناظر لکھنؤی اس امر کی وضاحت یوں کرتے ہیں،
 ”الہلال مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی
 قوم اور اپنے ہوطنوں کو دے رہا تھا۔ وہ پہلے ہی دن سے ہندوستان کی ایک
 متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اس کی دعوت سے ہندوستان کا اسلامی ذہن اُس
 وقت تک بیگانہ تھا۔ مولانا نے قدامت پسندی کے مخالفت قومیت کے قلعہ
 پر حملہ کیا لیکن بظہر مستقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کر کے جنہوں نے علی گڑھ
 کی بنیاد کو ہلا دیا“ لے

مصوف کے بارے میں زمانہ قریب کی نامور شخصیت یعنی خواجہ حسن نظامی دہلوی مرحوم کے تاثرات
 بھی ملاحظہ فرمائیے :

”۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انھوں نے حسن نظامی کے ایک
 کاغذ پر یہ لکھا تھا ”سب باتیں منظور ہیں باشتنائے شرکتِ مسلم لیگ“۔ گویا ۲۴
 سال پہلے بھی وہ مسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آجکل ہیں۔۔۔۔۔
 اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی
 طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے۔۔۔۔۔ بہر حال مولانا آزاد موجودہ ہندوستان
 کے لیے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں“ لے

مصوف کے سیاسی عزائم و زائر دوستی کے پیش نظر، اُن سے ظفر علی خاں یوں گویا ہوئے تھے :
 ابوالکلام آزاد سے یہ پوچھتے ہیں دل جلے
 کیا خطا کوئی بھی سرزد تم سے ہو سکتی نہیں
 نہ روگاندھی کے دل کا حال تم جانو اگر
 کٹ کے اپنوں ملے ہو جا کے تم اخبار سے
 تم جکل تم پیشوائے امتِ مرحوم ہو
 تم بھی کیا پاپائے روم کی طرح معصوم
 پھر ذرا تم کو بھی قدرِ عافیت معلوم ہو
 پھر یہ کہتے ہو کہ ہم ظالم ہیں تم مظلوم ہو

ہم مسلمان ہیں، جو ہیں اوج سعادت کے ہما آئیں اُس کے سایہ میں ہم کس طرح جو بوم ہو
 تم یہ کہتے ہو کہ مسلم لیگ ہے جمعیت پسند تم کہاں کے پھلر وقت اسے مرے مخدوم ہو
 کیا تماشا ہے کہ نہرو ہو ہمارا ترجمان اور غلامی کفر کی اسلام کا مقسوم ہو
 کیا تماشا ہے کہ ہم گاندھی کے آگے جھکائیں کیا قیامت ہے کہ جو حاکم ہے وہ محکوم ہو

اے خدا راہِ ہدایت اُس مسلمان کو دکھا

غیرتِ اسلام کی دولت سے جو محروم ہو

جناب ابوالکلام آزاد اس گاندھی قبیلے میں اتنے قد آور، رک رکھاؤ کے اور قابلِ احترام تھے کہ کانگریس کے بڑے سے بڑے رکن سے اختلاف بھی کر سکتے تھے۔ راج گوپال اچاریہ راجندر پرشاد، پنڈت مدن موہن مالوی اور پٹیل جیسے حضرات کی کیا گنتی جب کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی خاطر میں نہیں لایا کرتے تھے۔ دیکھنے والوں نے یہ بھی دیکھا کہ بارہا اُن کی رائے گاندھی کی رائے سے مختلف رہی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ کئی دفعہ کانگریس کے بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو گاندھی سمیت اُن کی رائے کے آگے جھک جانا پڑا۔ اس سے صاف واضح ہے کہ وہ گاندھی صنم خانہ جس میں گاندھی کی پوجا ہوتی تھی، وہاں ہندو ہوں یا مسلمان کہلانے والے سب اسی بُت کے آگے سجدہ ریز تھے اور ”جی حضوری“ کی منزل سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے لیکن اس پورے جگٹھے میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں، جن کی اپنی رائے ہوتی تھی اور جو ہر بڑی سے بڑی ہستی سے اختلاف کرنے کی پوزیشن میں تھے اور اُن کے اختلاف کو نظر انداز کر دینے کی اُس قبیلے میں جرأت نہیں ہوا کرتی تھی۔ اُن دو ہستیوں سے میری مراد ایک کانگریس کے سابق صدر سبھاش چندر بوش اور دوسرے سابق صدر کانگریس جناب ابوالکلام آزاد ہیں۔ چنانچہ موصوف کی اسی انفرادیت کے بارے میں رئیس احمد جعفری ندوی یوں رقم طراز ہیں:

”پہر خطیب اور انشا پرداز، مدبر اور سیاست دان“ انا کے مرض میں گرفتار

ہوتا ہے۔ لیکن مولانا کی انانیت سب سے مختلف تھی۔ دوسروں کا "انا" زیادہ تر رکیک اور مبتذل ہوتا ہے، خواہ وہ چھوٹا ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن مولانا کے "انا" میں ہمالہ کی رفعت تھی، اتنا موٹا اور چوڑا چکلہ "انا" صرف مولانا کا حصہ تھا غالب کے سوا اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں اور غالب بھی اس لیے پیچھے رہ جاتے ہیں کہ ان کی زندگی کا حلقہ محدود تھا، اُسی حلقہ میں وہ اپنے "انا" کا ڈھکا بجاتے رہے۔ لیکن مولانا ادیب بھی تھے، انشا پرداز بھی تھے، صحافی بھی تھے، خلیفہ بھی تھے، عالمِ دین بھی تھے، سیاست دان بھی تھے، نیشنلزم کے حلقہ میں ہی موجود تھے جہاں ایک سے ایک گھاگھ موجود تھا۔ لیکن وہ ادیبوں کی محفل ہو یا انشا پردازوں کا مجمع، صحافیوں کا جگھٹ ہو یا خطیبوں کی مجلس، سیاست کا پلیٹ فارم ہو یا نیشنلزم کا اسٹیج، علمائے کرام کی جمعیت ہو یا صوفیائے عظام کا زاویہ۔ اس شخص کا "انا" کہیں بھی امام الہند، رئیس التحریر اور رب الارباب سے کم پر قناعت نہیں کرتا۔

جس طرح عشق چھپائے نہیں چھپتا اور ذرا سی بے احتیاطی میں معاملہ پابد تے و گرے دست بدست و گرے شک آجاتا ہے، اسی طرح "انا" نے بھی زمانے کتنے یگانہ روزگار لوگوں کے بڑے ڈبودیے، جن کی قابلیتِ ذہانت، فراست، علم، فضل، ہر چیز شک و شبہ سے بالاتر تھی، "انا" کے کثرتِ استعمال نے انہیں کہیں کانہ رکھا یا نقلِ محفل بنا دیا ورنہ پھر سامانِ تفریح۔ لیکن مولانا کے "انا" کا یہ وصف تھا کہ استعارہ اور کنایہ سے بے پروا وہ مجسم "انا" بن گئے تھے لیکن ان کے اس "انا" میں وہ دکشتی، وہ جاذبیت، وہ سحر ہے کہ طبعیت سیر نہیں ہوتی۔ محسن الملک ہوں یا وقار الملک، حالی ہوں یا شبلی، موتی لال نہرو ہوں یا گاندھی جی، محمد علی ہوں یا شوکت علی، عمر میں سب سے چھوٹے، لیکن "انا" کے پیمانے سے ناپے تو صحرِ طلوع صبحِ محشر چاک ہے میرے گریبار کا۔

کانگریس جیسے ادارہ میں جہاں گاندھی جی کی پوجا ہوتی تھی، جہاں موتی لال، جواہر لال اور سردار پٹیل کا طوطی بولتا تھا، جہاں نیشنلزم کے دعوے کے باوجود مکمل طور پر کمیونزم (فرق پرستی) کی کارفرمائی تھی۔ جہاں محمد علی (جوہر) کا چراغ نہ جل سکا، جس نے گاندھی کو گاندھی بنایا تھا۔ جہاں شوکت علی کا بھرم قائم نہ رہ سکا جس کی قوت عمل نے کانگریس کو صحیح معنی میں ہندو مسلم اتحاد کا نشان (SYMBOL) بنا دیا تھا۔ جہاں سے اجمل خاں جیسے مردِ حکیم و حلیم کو دل برداشتہ ہو کر نکلنا پڑا، وہاں ابوالکلام نامی ایک شخص کا اپنے قد آور اور بلند بالا "انا" سمیت زندگی کی آخری سانس تک موجود رہنا کانگریس کا نہیں ابوالکلام کا کمال تھا۔ لہ

جناب رئیس احمد جعفری نے یوں تو اپنے امام الہند یعنی ابوالکلام آزاد کی شخصیت کے عجیب و غریب پہلو بھی ظاہر کر دیے، موصوف کی انانیت کو تفصیلاً بیان کرنے کی رحمت اٹھائی لیکن یہاں پورے طور پر بیان نہ کر پائے تھے۔ اسی لیے اس کی کتاب کے اختتامی صفحات پر "حرف آخر" کے تحت یوں پورا کرتے ہیں:

"ان کا "انا" سمندر کی طرح گہرا، ہمالیہ کی طرح اونچا اور چاند کی طرح خوبصورت تھا۔ لوگ اپنے "انا" کو سات پردوں میں چھپاتے ہیں لیکن پکڑے جاتے ہیں۔ وہ سر جھکاتے ہیں، منہ بناتے ہیں، اپنے لیے غلام، خادم، ہیچ میرز، خاکسار، ذرہ بے مقدار، تنگ اسلاف، بندہ عاصی اور اسی طرح کے بہت سے لائقوں کے ساتھ "انا" کی پردہ پوشی کرتے ہیں، لیکن وہ ایک جرم کی طرح ظاہر ہو ہی جاتا ہے۔ کوئی پوچھے یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے۔ لیکن مولانا کا "انا" بے پردہ ہے، بے پروا ہے، خود سر ہے، خود ہیں ہے، معزز ہے، متکبر ہے۔ لیکن نہایت دکش۔ اس میں جلال و جمال کی ایسی آمیزش ہے کہ اس کی "انا" کی غلطیاں اور کوتاہیاں بھی دل کا دامن اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

جس کانگریس میں گاندھی جی اَنَدَب کُڑا اَعْلٰی کا نعرہ لگاتے ہیں اور سب سر بسجود ہو جاتے ہیں، جس میں جواہر لال کی زبان گاندھی جی کو ”بابو“ کہتے کہتے سُکھتی ہے، جس کے سامنے راجگوپال اچاری جیسا منجھا ہوا ایسا ستان سر کے بل حاضر ہوتا ہے اور پٹیل اور راجندر پرشاد جیسے لوگوں کے سامنے اگر وہ دن کورات کہتا ہے تو یہ ”ایک ماہ پر دین“ کا نعرہ لگانے لگتے ہیں، جس کے سامنے کانگریس کے بڑے بڑے نیتیا، مہاسبھا کے لیڈر، جن سنگھ کے دہنما، گورنر جنرل اور وائسرائے ہند، برطانیہ کا بینہ کے وزراء، برطانیہ کا وزیر اعظم، جمعیتہ العلماء ہند کے علمائے کرام سر نیاز خرم کرتے ہیں، وہاں ابوالکلام کہتا ہے: ”میں“ اور اس ”میں“ کا بانگنیں سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اُس کا ”میں“ گاندھی جی کو مامتا نہیں کہتا، جواہر لال کو پنڈت جی نہیں کہتا، راجندر پرشاد اور پٹیل کو ذرہ بے مقدار سمجھتا ہے۔ اُس کا ”انا“ بڑے سے بڑا اعزاز جو گاندھی سے ملے کہ جواہر لال تک کو دے سکا، وہ شریک کار (COLLEAGUE) کا لفظ تھا۔“

جعفری صاحب سمندر کی تہ سے ہمالیہ کی چوٹی تک، جمعیتہ العلماء ہند کے علماؤں سے کانگریسی نیتاؤں تک، انجی جلسوں سے سیاسی اکھاڑوں تک اور تنگ اسلاف سے گاندھیوں کے ماڈرن فرعون تک، وہ کونسی جگہ ہے جہاں نہیں گئے؟ وہ کونسا فرد ہے جس سے نہ ملے؟ وہ بھارت کی کونسی ہستی ہے جس کا وزن نہ جانچا، وہ کونسی رائے ہے جس کا بانگنیں نہ دیکھا؟ وہ کونسی خوبصورتی ہے جس کی دلکشی نظر نہ آئی اور وہ کونسی گاندھی قبیلے کی کمزوری ہے جو اُن کے احاطہ نظر میں نہ آسکی ہو۔ لیکن اس سعیِ بلیغ کے باوجود جس چیز کی وسعت کا، رفعت کا، گہرائی کا، طاقت کا، جسامت کا، جعفری صاحب احاطہ نہ کر سکے۔ وہ ہے جناب ابوالکلام آزاد کی ”انا“۔ اسی لیے اتنی مغز کھپائی کرنے کے باوجود آگے سر اپا استفسار بن کر یوں رقطراز ہیں:

”ساری کتاب (INDIA WINS FREEDOM) پڑھ جائیے، معلوم ہوگا

لے رئیس احمد جعفری ندوی: آزادی ہند، مطبعہ لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۲۸۳، ۲۸۴

لے مصنف ابوالکلام آزاد۔ آزادی ہند اُسی کا ترجمہ و تشریح ہے نیز جعفری صاحب تبویب بھی اپنے انداز پر کی ہے۔ آخر

کانگریس کے تمام اہم فیصلے "انا" کی طبع رسا کا نتیجہ ہیں۔ تمام اہم تجویزوں کا مسودہ "انا" کا لکھا ہوا یا لکھوایا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، اُس کا "انا" ایسا ڈکٹیٹر ہے جس کے سامنے کسی کو مجالِ دمِ زون نہیں۔ اس "انا" کی پشت پر اگر کوئی قوت ہوتی تو شاید اس کی دکھشتی ختم ہو جاتی۔ لطف تو یہ ہے کہ صاحب "انا" ایک ایسا شخص ہے جو اقلیت کا ایک فرد ہے۔ جس کی قوم نہ صرف یہ کہ اُس کی پشت پناہ نہیں بلکہ اُس سے بیزار ہے۔ جو بہت بڑا لیڈر ہے لیکن جس کے متبعین انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ جو کوئی بات اپنی قوم سے نہیں منوا سکتا۔ جو ایک عرصہ دراز سے اپنی قوم کے اجتماعات عامہ میں نہ شرکت کرتا ہے نہ تقریر۔ جو اگر کانگریس سے الگ ہو جائے تو پرگاہ کے برابر اُسے نقصان نہیں پہنچا سکتا، شامل رہے تو پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ وہ بھی اپنی اس کمزوری سے واقف ہے اور اُس کے شرکاء کار (COLLEAGUE) بھی۔ لیکن پھر بھی دمِ خم کا یہ عالم ہے کہ اُس کا "انا" اُن لوگوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا جو اپنی عظیم اکثریت رکھنے والی قوم کے مہاتما ہیں، شاہِ بنے تاج ہیں، جن کے ایک اشارہ پر خون کی ندیاں بہہ سکتی ہیں، جن کے ایک لفظ پر انقلاب آ سکتا ہے، جن کا ایک بول بغاوت برپا کر سکتا ہے، جن کے پاس دولت بھی ہے، سرمایہ دار اور مالکانِ بل بھی ہیں، لیکن اس "انا" کی حبیب خالی ہے۔ کسی سرمایہ دار سے اُس کا یارا نہ نہیں کسی مل مالک سے اُسے سروکار نہیں اور اگر ہو بھی تو اُس کی خودداری اُن سے استداد کو اپنی توہین سمجھتی ہے۔ ان حالات میں اس بے مثل دبے نظیر اور حسین و جمیل "انا" کی یہ جرأت، یہ ادا، یہ دھاندلی دیکھیے کہ سب سے اونچا بیٹھتا ہے، سب سے اونچا رہتا ہے۔۔۔ ہر طرح کے فکری اور سیاسی اختلافات کے باوجود یہ "انا" دکھن سے یا نہیں؟ لے

جعفری صاحب نے ابوالکلام آزاد کی یکسی اور گاندھی کی شنشہا ہی کے تحت جو موصوف کی "انا" کے بارے میں رائے قائم کی ہے، کم از کم راقم الحروف اسے درست تسلیم کرنے سے قاصر ہے۔ اگر صورت حال یہی ہوتی تو مولانا محمد علی جوہر کی طرح ابوالکلام آزاد کو بھی نظر انداز کیا جاسکتا تھا جیسا کہ پیشتر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک وقت ایسا بھی آیا جب نہ صرف گاندھی نے بلکہ کانگرس کے جملہ ہندو لیڈروں نے مولانا جوہر کو پرکاش کے برابر بھی حیثیت نہ دی اور ان کی بات تک سننے سے انکار کر دیا تھا حالانکہ ان دنوں ہندو نہ سہی مسلمانوں کا تو ان کے ساتھ ایک سیلاب تھا۔ علی برادران کو نظر انداز کر دینے کے بعد لیڈروں کا معاملہ تو صاف ہوا، باقی رہ گئے گاندھی و علماء۔ ان مسکینوں کی کانگرس کے اہم معاملات تک رسائی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی، خواہ یہ پیش خلیش شیخ الہند و شیخ الاسلام بنتے پھرے یا مجاہد ملت و امیر شریعت۔ یہ صرف کانگرس کے فیصلوں پر انگوٹھا دستخط کرنے والے تھے اور گاندھی و نہرو کے ارشادات کو قرآن و حدیث کی تعلیمات کے عین مطابق ثابت کرنے والے اور بس۔ اہم مواقع پر ان پیچاروں کو کانگرس نے کبھی بلانے اور ان سے مشورہ تک لینے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔

اب وسعت معلوم کرنی ہے ابوالکلام آزاد کے "انا" کی۔ یہ اُس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک یہ معلوم نہ کر لیا جائے کہ گاندھی کے عزائم کیا تھے اور ابوالکلام آزاد نے اپنی ساری اور گونا گوں قابلیتیں کس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وقت کی ہوئی تھیں۔ ان دونوں حضرات کے مدعا و مقصد کا پتہ لگتے ہی گاندھی امام الہند کا "انا" پورے طور پر واضح ہو جائے گا، جس سے رئیس احمد جعفری جیسے حضرات کی حیرانی خود ہی دور ہو جائیگی۔

گاندھی کو جب مولانا محمد علی جوہر جلیسوں نے گاندھی بنا کر ہندوستان کا سرکردہ لیڈر مان لیا اور تحریک آزادی کے ہر ٹولے نے اُسے اپنا قاید، رہنما، پیشوا اور امام بنالیا، تو گاندھی کی منزل مقصود نزدیک سے نزدیک تر آتی جا رہی تھی۔ وہ منزل مقصود کیا تھی؟ یہی کہ ہندوستان کے مالک بلا شرکت غیر ہندو اور صرف ہندو رہیں۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ ایسی پالیسی وضع کرتا تھا کہ جس سے اُس وقت کے حکمران یعنی انگریز ہندوستان سے بوری یا بستر گول کر کے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس کے بعد رہ جائیں گے سابق حکمران

(یعنی مسلمان) اور اُن کے مذہب میں شامل ہو جانے والے تو انہیں بہلا چھٹلا کر دوستی و ہمدردی کا جھانسا دیا جائے۔ نزدیک آنے پر اپنا مقصد حاصل۔ اس قرب و اتحاد سے جن باتوں کی گاندھی کو توقع تھی اُن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ بُت شکن اور بُت پرست کا فرق ختم ہو جائے گا۔

۲۔ توحید کے پرستار جب بُت پرستوں سے دوستی کرنے لگے تو جذبہ توحید خود ہی اُن کے دلوں سے محو ہو جائے گا۔

۳۔ ہندو کے دوست بننے والے اگر ہندو نہ بھی بنے تو نہ سہی، لیکن مسلمان بھی نہ رہ سکیں گے۔

۴۔ انگریزوں سے ٹکراؤ کی صورت میں مسلمان کا دعویٰ کرنے والوں کو مقابلہ پر چھوڑ کر خود انہما کے پجاری اور امن کے دیوتا بن جایا کریں گے۔ اس سے حکومت کا نزلہ مسلمانوں پر گرے گا جو ہر طرح ہندو کا فائدہ کہ مسلمان انگریزی اقتدار کی دہلیز پر ٹکڑے ماریں گے تو دہلیز ٹوٹے یا مسلمان کا سر چھوٹے، دونوں صورتوں میں مشرکین ہند اور اینٹ پتھر کے پجاریوں کی پانچوں گھی میں اور سر کڑا ہی میں۔

۵۔ انگریزوں کے بیک بینی و دو گوش نکل جانے کے بعد ہندو اقتدار کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں رہے گا، کیونکہ جن مسلمانوں سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے وہ خود ہی زنار دوست بلکہ ہندو کے غلام اور گاندھی کے بندہ بے دام بنے ہوئے ہوں گے پھر خطرہ کیسا؟

۶۔ گاندھی نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی سروہاند کی طرح اسی لیے تو کوئی تحریک کھلےلا شروع نہیں کی تھی کہ اُس انقلاب، ۱۸۵۷ء سے سبق سیکھ لیا تھا۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان کے باشندوں کو عیسائی بنانے کے منصوبے پر جب عمل کرنا شروع کر دیا تھا تو نتیجہ مکمل بغاوت پر منتج ہوا، جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے اس منصوبے کو ترک کر کے ایسی تعلیم و تہذیب کو رائج کرنا شروع کر دیا، جس نے پڑھے لکھے باشندگان ہند اور خصوصاً اسکولوں کالجوں میں

پڑے ہوئے مسلمانوں کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اور اس طرح پُرانی قوم کی جگہ ایک نئی قوم نے ہی جنم لے لیا۔ گاندھی بھی اسی طرح اتحاد اور دوستی کے پتھر میں چسنا کر مسلم قوم کی نسل کو اپنے انداز پر بدلنا چاہتا تھا۔ حالات کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ ہمارے گاندھی علماء بغیر کسی جبر و اکراہ کے، اس شمع طواغیت پر، خود ہی برضا و رغبت اور اُس سامری وقت کے سحر سے مسحور ہو کر، یہ کہتے ہوئے پروانہ وار تار ہو رہے تھے،

میں آپ ہی سر شوق سے مقتل میں جھکاؤں

لے جان اگر خنجرِ تسلیم تھمارا

اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ابوالکلام آزاد کیا چاہتے تھے؟ کیا وہ بھی گاندھی کی جہاد و گری کا شکار ہو گئے تھے؟ احتقر کا جواب (قطع نظر اس کے کہ وہ کسی کی نظر میں صحیح ہے یا غلط) نفی میں ہے۔ ابوالکلام اور گاندھی کی پہلی ملاقات ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوتی ہے لیکن آزاد صاحب اس ملاقات سے پہلے متحدہ قومیت کے حامی اور ہندو مسلم اتحاد کے زبردست مبلغ تھے۔ موصوف اپنے اس سیاسی و دینی نظریہ کی ”الہلال“ کے ذریعے کھل کر تبلیغ و اشاعت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو دورِ حاضر کا ابوالفضل بن کر برابر راعب کر رہے تھے۔ گروہ ہندوؤں کو بھی اپنا بھائی سمجھیں اور یہ خیال قطعاً دل میں نہ لائیں کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ہندو الگ۔ نہیں، بلکہ ہندو ہوں یا مسلمان، ہندوستان کے سارے باشندے ایک ہی قوم کے افراد ہیں اور اُس قوم کا نام، ہندو یا مسلمان نہیں بلکہ ”ہندوستانی“ ہے۔ ابوالکلام آزاد اپنے مخصوص نظریات و عزائم کی بنا پر اپنے دور کے ابوالفضل بن کر اکبر اعظم کی تلاش میں تھے اور ادھر گاندھی جو ہندوستان کا بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا، اس نے اس مقام پر پہنچ کر ماڈرن اکبر اعظم بننے کی غرض سے اُس کے ”دین الہی“ کو مادی صورت کی شکل میں پورے ملک پر مسلط کرنے کی غرض سے اپنے دور کے ابوالفضل کی راہوں کی ریدہ و دل فرس راہ کیے ہوئے تھے۔ ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو گاندھی اور ابوالکلام ملے نہیں نہیں، اپنے دور کے اکبر اعظم اور ابوالفضل ملے۔ دونوں بامراد ہو گئے۔ اکبر اعظم کو بابا ابوالفضل مل گیا اور ابوالفضل کو اپنا اکبر اعظم ہاتھ آگیا۔ نہ گاندھی ابوالکلام کا مرید تھا

نہ ابو الکلام گاندھی کا، بلکہ دونوں ایک دوسرے کی مراد تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے سوا ان کی تکمیل کا سب سے بڑا سہارا تھے۔ اگر مغل اعظم اور ابو الفضل اکیسٹہ نہ ہوتے تو تاریخ کے اوراق میں "وین الہی" کا نام تک نہ آتا، اسی طرح اگر گاندھی اور ابو الکلام بل جمل کر ایک ہی منزل پر گامزن نہ ہوتے تو "گاندھویت" کے نام سے بھی ابناٹے زمانہ کے کان نا آشنا رہتے۔ ظفر علی خاں نے اسی لیے تو کہا تھا:۔

کہے یہ اُن سے بھول گئے کیوں حرم کو آپ
آئیں ابو الکلام جو وردھما سے گھوم کر

شاید رئیس احمد جعفری صاحب نے یہ محسوس کہہ ہی لیا ہوگا کہ ابو الکلام آزاد کے "اَنَا" میں اتنی وسعت کیوں تھی اور موصوف کی جملہ کمزوریوں سے واقف ہونے کے باوجود کانگریس کا کوئی ہندو لیڈر تو کیا خود گاندھی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا، بلکہ وہی گاندھی جس کی اس نئے صنم خانے میں مغل اعظم کی طرح پرستش ہو رہی تھی بعض اوقات اُسے بھی ابو الکلام آزاد کی رائے کے آگے جھک جانا پڑا۔ ابو الکلام کو رد کر کے گاندھی کی لیڈری میں تو واقعی کوئی فرق نہ آتا لیکن جس گاندھویت کی خاطر وہ مہاتما فی کا ڈھونگ بچائے پھر رہا تھا اُس کا شاید کسیں نام و نشان بھی نہ ملتا۔ یہ گاندھی ابو الکلام اتحاد کی حدیں محض دوستی و تعاون پر ہی ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ دونوں میں جسم و روح اور لازم و ملزوم کا رشتہ تھا جس کے تحت دونوں ایک جان اور دو قالب ہو گئے تھے اور زبانِ حال سے ایک دوسرے کو مخاطب کر کے یوں کہا کرتے تھے:۔

مَنْ تُو شُدَمْ، تُو مَنْ شَدِی، مَنْ تَنْ شُدَمْ، تُو جَاں شَدِی

تاکس نہ گوید بعد ازاں، مَنْ دِیگرم، تُو دِیگری

موصوف کی وفات پر مشہور ہندو لیڈروں کی کیفیت کیا تھی، یہ شورش کشمیری ایڈیٹر چٹان کی زبانی سنئے:

پنڈت جواہر لال نہرو سر اپاگر یہ تھے۔ انھیں سنبھالنے والے ہزاروں تھے ، لیکن وہ لوگوں کو سنبھالنے کے لیے دوڑے پھر رہے تھے۔ تمام کوٹھی کے وسیع باغات انسانوں سے اٹ چکے تھے لیکن لوگ اندر آنے کے لیے دروازہ پر ہجوم کرتے رہے۔ پنڈت نہرو پورٹیکو کے باہر لوگوں کو ایک عام رضا کار کی طرح ہاتھ پھیلا کر روکتے رہے اور جب جنازہ اٹھانے کے لیے اُن کو بلایا تو اُن کی نظریں ہر کاب سیکورٹی آفیسر پر گر گئیں۔ استفسار کیا ، آپ کون ؟ جواب ملا ، سیکورٹی آفیسر ، آپ کی حفاظت کے لیے۔ پنڈت نہرو نے کہا ، کیسی حفاظت ، موت تو اپنے وقت پر آتی ہے ، بچا سکتے تو مولانا کو بچا لیتے۔ یہ کہہ کر پنڈت نہرو ہلک ہلک کر رونے لگے۔

پولن بجے میت اٹھائی گئی۔ پہلا کندھا عرب ملکوں کے سفیروں نے دیا جب کہ شہادت کی صداؤں میں جنازہ اٹھا تو عربی سفر اُکا ندھا دیتے وقت پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ، خان محمد یونس خاں ، مسٹر کرشنا مینن ، مسٹر پرودو چندر اور نجی غلام محمد نے احاطہ سے باہر میت کو توپ گاڑی پر رکھا۔ راجندر بابو دمہ کے مریض ہونے کے باوجود صبح ہی سے تصویر یا س بنے کھڑے تھے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے ، آج ۸۴ سال کی دوستی اور رفاقت کا انت ہو گیا۔ مولانا ایسے لوگ پھر کبھی پیدا نہ ہوں گے اور ہم تو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔“

پنڈت نہرو کی ہچکی بندھ گئی۔ مولانا احمد سعید کی سفید داڑھی پر آنسوؤں کے موتی جگمگا اُٹھے۔ تمام فضا میں نالہ ہائے شیون تیرنے لگے ۔۔۔۔۔ جنازے کی گاڑی میں سرہانے کی سمت دائیں رخ پر پنڈت نہرو دائیں طرف پر صدر کانگدکس دھیر بھائی کھڑے تھے۔ ان کے پیچھے جنرل شاہ نواز ، دھیر بھائی کے ساتھ نجی غلام محمد اور پروفیسر ہمالیوں کیر موجود تھے۔“ لے

موصوف کو کون سے مسنون طریقے کے ساتھ سپردِ خاک کیا گیا۔ اس آخری جلس میں زیادہ تر کوٹے عقیدت مند حضرات شامل ہوئے۔ یہ بیان بھی شورش کا شکاری کے لفظوں میں ہی ملاحظہ فرمائیں:

”میت پر کھدرا کفن تھا۔ میت ہندوستان کے قومی جھنڈے میں لپٹی ہوئی تھی، جس پر کشمیری شال پڑا تھا۔ جنازہ کے پیچھے صدر جمہوریہ اور نائب صدر کاربن بیٹھے تھے۔ اُن کے پیچھے پارلیمنٹ کے ارکان، مختلف صوبوں کے وزرائے اعظم اکثر صوبائی گورنر اور غیر ملکی سفارتی نمائندے چلے آ رہے تھے۔ بھارتی افواج کے چیف آف اسٹاف جنازہ کے دائیں بائیں تھے۔۔۔۔۔ پر پڈ گراؤنڈ میں محتاط سے محتاط اندازہ کے مطابق پانچ لاکھ افراد جمع تھے۔ قبر کے ایک طرف علماء و حفاظ قرآن مجید پڑھ رہے تھے، دوسری طرف اکابر و فضلا، سر جھکائے کھڑے تھے۔ یہاں سب سے پہلے بڑی فوج کے ایک ہزار سپاہیوں ہوئی فوج کے تین سو جانبازوں اور بڑی فوج کے پانچ سو نوجوانوں نے اپنے عسکری بانکین کے ساتھ میت کو سلام کیا۔ پھر مولانا احمد سعید نے دو بجکر پچاس منٹ پر نماز جنازہ پڑھائی۔

ادھر نماز جنازہ پڑھائی جا رہی تھی ادھر پنڈت نہرو قبر کے قریبے ترین پر بیٹھے ٹک ٹک دیکھ رہے تھے۔ امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا اور میت لحد کے قریب لائی گئی تو ہزار ہا ہندو سکھ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ فوج نے تعزیتی بگل بجائے۔ ستاروں کی طرح پھیلے ہوئے مسلمانوں کی آنکھیں پھر اشتکبار ہو گئیں۔ مولانا احمد سعید نے لحد میں اتارا۔ کوئی تابوت تیار نہ کیا گیا تھا۔ ایک یا دو گارجم سفید کفن میں لپٹا ہوا خاک کے حوالہ کر دیا گیا۔ راجندر بابو نے آنسوؤں کی سیل میں جھگو کر پھول نچھاور کیے۔ پنڈت نہرو نے گلاب چھڑکا تو بے اختیار ہو گئے، لوگوں نے سہارا دیا اور جب مٹی دینے لگے تو بیک بیک کر رہے تھے۔“

گاندھی نے تو ان حضرات کے بقول شہادت پائی تھی لیکن ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے کہ گاندھی اور ابوالکلام آزاد میں سے کس کا مرتبہ اونچا رہا کیونکہ ابوالکلام آزاد یقیناً شہادت سے محروم رہے تھے۔ بہر حال اس تاریخ ساز ہستی کے متعلق گاندھی حضرات کا مندرجہ ذیل تبصرو بھی نظر انداز کرنا ظلم ہوگا:

”گاندھی جی کی شہادت کے بعد سے ملک کبھی ایسا متزلزل نہیں ہوا جیسا کہ مولانا صاحب کی حسرتناک موت سے ہوا۔ انھوں نے ۴۵ سال سے بھی زیادہ ملک کی خدمت کی ہے۔ ماضی قریب کے بہت سے برسوں کی ہندوستانی تاریخ مولانا مرحوم کے اس کردار کو ایک وسیع صورت میں پیش کرے گی جو مرحوم نے اس تاریخ کی تعمیر میں ادا کیا ہے۔“ ۱

موصوف کی وفات پر بھارت کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ:

”ہندوستان ایک عظیم عالم، ایک بلند پایہ مقرر، ایک تجربہ کار سیاستدان، ایک مسلمہ قوم پرست، ایک مایہ ناز محب وطن، جنگ آزادی کے ایک سپہ سالار اور ایک عظیم رہنما کی خدمات سے محروم ہو گیا ہے۔ جس کا مشورہ مشکل اوقات میں قوم کے لیے ہمیشہ ہی مشعل راہ کا کام دیتا رہا ہے۔ وہ آخر وقت تک وطن کی، جس سے انھیں بے حد پیار تھا، آبیاری اور خدمت کرتے رہے۔“ ۲

بھارت کے دوسرے صدر ڈاکٹر رادھا کرشن نے موصوف کی وفات پر اپنے تعزیتی پیغام میں ان کی خدمات کا وزنی الفاظ میں اعتراف کرتے ہوئے خراج عقیدت پیش کیا ہے:

”مولانا آزاد ایک بہت بڑے سیاست دان تھے، محکمہ اور اسکا رتھے، پکتے مسلمان تھے اور پرجوش محب وطن۔ ان کی سیرت کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے محض اپنے نظریات کی خاطر بڑی مصیبتیں سہی

لیکن پروانہ کی۔ مولانا مرحوم کی خدمات کا اعتراف کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قوم اُس نصب العین کو کلیجے سے لگائے رکھے جسے مولانا نے ہمیشہ سامنے رکھا۔ ہمیں مولانا ابوالکلام آزاد کے خیالات، رواداری اور اتحاد کی روح کو یاد رکھنا چاہیے۔“ لے

بھارت کے وزیر داخلہ پنڈت گوبند ولجپنت نے اپنے تعزیتی پیغام میں یوں اپنے تاثرات بیان کیے ہیں:

”ایک زندگی جو ایک مقصد کے لیے وقف تھی ختم ہو گئی۔ ایک عظیم انسان جو ہر لحاظ سے عظیم تھا ہم سے جدا ہو گیا۔ مولانا آزاد جیسی ہستی پہلے پھر بھی دیکھنے کو نہ ملے گی۔ ہندوستان کی گزشتہ برسوں کی تاریخ بتائے گی کہ اس میں مولانا نے کتنا حصہ لیا تھا۔ انھوں نے تحریک آزادی کے وقت برسوں تک کانگرس کی رہنمائی کی۔ مولانا مرحوم صحیح معنوں میں ایک عظیم الشان انسان تھے۔“ لے

پنڈت جواہر لال نہرو ایک بُت پرست تھے اور ابوالکلام آزاد مسلمان کہلانے والے بلکہ اپنے حلقے میں ”امام الہند“ تک مشہور تھے اور اپنے موحد ہونے پر بھی نازاں تھے۔ حالات نے یہ بتایا اور دکھایا کہ ایک توحید پرست کی موت پر ایک مشہور زمانہ بُت پرست اس طرح ہلک کر روتا اور بے قابو ہو جاتا ہے جیسے کوئی عاشق صادق اپنے معشوق کی لاش کو دیکھ کر۔ موحد اور بُت پرست کے عشق کی کہانی، مرنے والے کی زبانی سُنئے:

”جواہر لال نہرو میرے (ابوالکلام آزاد کے) محبوب ترین دوست ہیں۔ ہندوستان کی قومی زندگی میں انھوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ کسی دوسرے فرد سے کم نہیں ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے کام کیا تھا، مصائب برداشت کیے تھے اور آزادی ہند کے بعد سے تو وہ ہماری قومی زندگی اور

ارتقاء کا نشان بن گئے ہیں! لے

جناب ابوالکلام آزاد نے دوسری جگہ اسی تعلق خاطر اور دلی لگاؤ کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

”شروع ہی سے جب کانگرس میری سرگرمیوں کا مرکز بنی، میں اور جواہر لال بہترین دوست تھے۔ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ایک دوسرے کی تائید پر بھروسہ کرتے تھے۔ ہم دونوں کے درمیان رقابت یا حسد کا سوال کبھی نہیں پیدا ہوا اور میرا خیال تھا کہ ایسا کبھی ہو بھی نہیں سکتا۔ حقیقت و قہم یہ ہے کہ نہرو خاندان سے میرے تعلقات کی تاریخ پنڈت موتی لال نہرو کے زمانہ سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے بھی میں جواہر لال کو ایک بھائی کے بیٹے کی حیثیت سے دیکھتا رہا اور وہ بھی اپنے والد کے دوست کی حیثیت سے میرا احترام کرتے رہے۔“ لے

ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کے خیالات اور جذبات ایک ہی تھے۔ کانگرس کی عداوت کے لیے اسی لیے موصوف کو اپنے بعد جواہر لال سب سے موزوں نظر آئے، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

”دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ میرا جانشین کون ہو؟ میں (ابوالکلام) چاہتا تھا کہ ایسا آدمی منتخب ہو، جو میرے خیالات و جذبات کا حامل ہو اور میری قیام کی ہوئی پالیسی پر عمل پیرا ہو سکے۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جواہر لال سے زیادہ موزوں آدمی کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ۲۶ اپریل کو میں نے اس مفہوم کا ایک بیان شائع کیا اور کانگرس اصحاب سے اپیل کی کہ وہ بالاتفاق جواہر لال کو منتخب کر لیں۔ گاندھی جی سردار پٹیل کی طرف مائل تھے لیکن جواہر لال کا نام جب میری طرف سے پیش ہو گیا تو انھوں نے سبک طور پر

پھر اپنے خیالات اس سلسلہ میں ظاہر نہیں کیے۔^۱

لیکن دوسرے ہندو وزراء، کانگریسی لیڈر اور اراکین سلطنت بھی اُن کی موت کو گاندھی کی موت کے بعد سب سے بڑا سانحہ شمار کر رہے تھے اُس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہندو لیڈر اپنی اکثریت کے گھنٹہ میں دوسری اقوام خصوصاً مسلمانوں کا سب کچھ چھین لینا چاہتے تھے اُن کے اس منصوبے کو جتنی مدد ابوالکلام آزاد سے ملی اتنی پورے ایک سو ہندو لیڈروں سے بھی نہیں مل سکتی تھی۔ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات پر کاری ضرب لگانے سے موصوف کبھی نہیں ہچکچائے، اسی لیے ہندو قیادت اُن کی قدر دانی کی بالا چھنے لگ جاتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اندر خانہ وہ بھی موصوف کو جعفر بنگال یا صادق دکن ہی سمجھتے ہوں۔ لیکن ہندوؤں کو چونکہ ان کی ذات اور ان کے مشن سے بڑی تقویت پہنچ رہی تھی اور آج تک پہنچ رہی ہے، اس لیے وہ لوگ ابوالکلام جیسے مسن کی تعریف میں سبیل سے کیوں کام لیتے؟

ایک واقعہ ملاحظہ فرمائیے۔ ۱۹۴۵ء کے صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ نے ۱۷ کانگریس نے ۶ سیٹیں پنجاب سے حاصل کیں۔ جمعیتہ العلماء ہند نے دو اور آزاد امیدوار نے ایک نشست حاصل کی، پانچ حلقے مشترک تھے۔ گویا کانگریس سے تو پنجاب میں پھر بھی مسلم لیگ ہی بازی لے گئی۔ ہندوؤں اور سکھوں کی کوئی پیش نہ گئی۔ لیکن ابوالکلام آزاد کا تاریخی کارنامہ اس موقع پر انجام دیا گیا، ایک یادگار کے طور پر محفوظ رہے گا، وہ یہ ہے:

”میں (ابوالکلام) نے پنجاب میں جو کچھ کیا تھا، وہ یہی تو تھا کہ اس حقیقت کے باوجود کہ گورنر مسلم لیگ کی وزارت قائم کرنے پر تیار ہوا تھا، کانگریس کو بھی ایوان وزارت میں دھکیل کر پہنچا دیا۔ یہ میرے ہی مساعی کا نتیجہ تھا کہ مسلم لیگ نظر انداز کر دی گئی اور کانگریس اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب کے معاملات میں فیصلہ کن عنصر بن گئی۔“^۲

موصوف اس مسلم دشمنی کے کارنامے پر نازاں اور اپنے ہندو بھائیوں کی واہ وا کے شور میں مست ہو کر فرماتے ہیں :

”یہ پہلا موقع تھا کہ پنجاب میں کانگریس شریک حکومت بنی۔ یہ بات ایسی تھی جو اب تک ناممکن سمجھی جاتی رہی۔ سارے ملک کے سیاسی حلقوں نے اعتراف کیا کہ میں نے غیر معمولی صلاحیت اور تدبیر کا ثبوت دیتے ہوئے پنجاب میں وزارت سازی کا کارنامہ انجام دیا ہے۔ ملک کے مختلف اطراف و جوانب سے مبارکباد کے تاروں کی مجھ پر بھرمار ہو گئی۔ نیشنل ہیئر الڈ نے جو یو۔ پی۔ کانگریس کا ترجمان ہے ، مجھے مبارکباد دی کہ میں نے ایسا طرز کار اختیار کیا جس سے پنجاب کا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ حل ہو گیا۔ اس اخبار نے تو میرے بارے میں یہاں تک لکھ دیا کہ پنجاب کے حالات کو اس طرح مٹھی میں لے لینا میری صلاحیت اور تدبیر کی ایسی شاندار مثال ہے ، جس کی نظیر اب تک کسی کانگریسی لیڈر کے ہاں نظر نہیں آئی۔“

موصوف کے اس عظیم الشان کارنامے پر رئیس احمد جعفری کا تبصرہ بھی پڑھنے کے قابل ہے، وہ لکھتے ہیں :

”مولانا (ابوالکلام) کے اس کارنامے کی حقیقت یہ ہے کہ پنجاب میں تقریباً ساری مسلم نشستوں پر اگرچہ لیگ نے قبضہ کر لیا تھا اور از روئے اخلاق و آئین اسے تشکیل وزارت کا حق تھا، لیکن مولانا نے سرخضریات خاں اور ان کے تین چار ساتھیوں قزلباش اور برقی وغیرہ کو مسلمانان پنجاب کا نمائندہ تسلیم کر لیا۔ کانگریس کو، سکھوں کو اور دوسرے غیر مسلم عناصر کو، سرخضریات کا پشت پناہ بنا دیا۔ مسلمانوں کی اکثریت چونکہ عدوی تھی لہذا مبینہ غداروں کو اپنے ساتھ ملا لینے کے بعد مولانا نے درحقیقت کانگریسی بظاہر یونینسٹ حکومت

قائم کرادی۔

مولانا ہندوؤں کے شورِ مبارک باد سے اتنے مسحور ہوئے کہ انہوں نے
برہمن سوچا، اس طرح وہ پاکستان کی بنیاد مستحکم کر رہے ہیں۔ مسلمانوں نے سوچا اور
بجاطور پر سوچا کہ جب اس طرح ہماری اکثریت چال بازیوں کے باعث اب اقلیت
بنائی جاسکتی ہے تو سارے ہندوستان کی عنانِ اقتدار ہاتھ میں لے لینے کے
بعد مسلم اکثریت کے صوبے بالکل کانگریس کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ وہاں وہی
حکومت بن سکے گی جو کانگریس کی منظور نظر ہوئے۔

موصوف نے اسی وزارت سازی پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے اس طرح تجزیہ کیا ہے:
”واقعی مسلم لیگ عوامی جماعت تھی، اس سے اشتراک و تعاون کانگریس کے
شایانِ شان تھا لیکن یونینسٹ جماعت، جس نے ہمیشہ کانگریس کے سر پر ڈنڈے
برسائے، جس نے کانگریس کی ہر تحریک کو پوری بھیمیت سے کچلا، جس نے کانگریسی
لیڈروں کو ہتھکڑیاں پہنا کر جیل بھیجا، جس نے انگریزوں کی حمایت اور جہاں شاری
میں اپنے ملک، قوم اور وطن سے غداری کی، جو صرف جاگیرداروں اور بڑے
بڑے زمینداروں پر مشتمل تھی۔ جس میں سردار، خان بہادر، رائے بہادر بھرے
ہوئے تھے۔ جس کے ارکان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں تھا جس نے کبھی
بھولے سے بھی کسی عوامی تحریک میں حصہ لیا ہو۔ جس نے ہمیشہ انگریزوں کی
وفاداری پر قوم اور ملت کی وفاداری کو ترجیح دی۔ محض مسلم لیگ کو زک دینے
کے لیے ایسی جماعت سے ساز باز کرنا اور سازش سے کام لے کر اس کی
وزارت بنوا دینا، یقیناً مولانا کا ایسا کارنامہ تھا جس پر ہندوؤں کی مسرت
بجاعتھی، جس پر مولانا بھی فخر کرنے میں، لکھن ہے حق بجانب ہوں لیکن ملت
اسلامیہ کا جہان تک تعلق ہے، اس نے نفرت اور حقارت کے ساتھ اس

کا زمانہ کو دیکھتا تھا۔ یہ کارنامہ اُس کی نظر میں بالکل ایسا ہی تھا جیسے جعفر صادق کا^۱۔
 جب کانگریس نے مسلم لیگ اور مسلم اکثریت کے صوبوں کے ساتھ یہ سلوک کیا تو عوشِ قسمتی سے
 مسلم لیگ کو وزارتِ مال کا عہدہ مل گیا۔ کانگریس نے یہ عہدہ اس غرض سے مسلم لیگ کے سپرد
 کرنے کی پیش کش کی تھی کہ اُن کے خیال میں اسے سنبھالنے والا آدمی مسلم لیگ کے پاس کوئی
 نہیں تھا لہذا انکار کر دے گی اور اس طرح مسلم لیگ اور مسلمانوں کو مرکز میں قابلِ ذکر عہدوں سے
 محروم کر دیا جائے گا۔ مسلم لیگ نے یہ عہدہ قبول کر لیا۔ لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ
 خاں لیاقت علی خاں اس پر فائز کیے گئے۔ لیاقت علی خاں نے اپنے رفقاء کے کار کی مدد سے
 اس ہوشمندی سے یہ کام چلایا کہ کانگریس کی ساری مشینری کو معطل کر کے رکھ دیا۔ بڑے سے بڑے
 ہندو عہدیدار بھی بے بس ہو کر رہ گئے۔ اور آخر میں بجٹ وہ پیش کیا کہ ہندو ٹیسروں یعنی صنعتکاروں
 اور مہاجنوں کے سارے پیر و خیم نکال کر رکھ دیے اور بتا دیا کہ سارے مسلمان کھلانے والے
 ابوالکلام آزاد اینڈ کمپنی جیسے ملت فروش نہیں ہیں جنہیں ہندو آنکھ دکھا کر یا مینٹھی گولیاں کھلا کر
 ٹھگل سکتے ہیں بلکہ ان میں اکثریت اُن غیور مسلمانوں کی ہے جنہیں ٹھگنا انتہائی مشکل اور بڑی ہی ٹیڑھی
 سمجھ رہے ہیں۔ لیاقت علی خاں کی اس کارگزاری کو ابوالکلام آزاد کی زبان سے سن لینا چاہیے:
 ”محکمہ مالیات کی باگ مسلم لیگ کے ماتھے میں تھی، گو یا نظم و انصرام کی کنجی اُس
 کے پاس تھی۔ محکمہ مالیات میں چند نہایت قابل اور سینئر مسلم حکام موجود تھے،
 انہوں نے لیاقت کو ہر ممکن امداد دی۔ اُن کے مشورے سے لیاقت علی
 ہر اُس تجویز کو مسترد یا مؤخر کر دیتے تھے جو ایکزیکٹو کونسل کے کانگریسی ممبران کی
 طرف سے پیش کی جاتی تھی۔ سِر اِپٹیل نے خود ہی یہ انکشاف کیا کہ اگرچہ وہ
 وزیر داخلہ ہیں لیکن لیاقت علی کی مرضی کے بغیر وہ ایک چپر اسی کا تقرر بھی
 نہیں کر سکتے۔ کانگریسی ممبروں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کریں۔“^۲

لیاقت علی خاں نے جو بجٹ پیش کیا وہ انہی اصولوں پر مبنی تھا جو کانگریسی لیڈروں کے اعلانات اور اُن کی پالیسی سے بالکل ہم آہنگ تھے۔ موصوف کے اصولوں کی کانگریسی زعماء نے بھی تائید کی۔ لیکن وہ اعلانات منافقت پر مبنی تھے اور یہ بجٹ اُن کی عملی تصویر تھی۔ مثلاً ابوالکلام آزاد یوں وضاحت کرتے ہیں:

”ہم خود یہ چاہتے تھے کہ تقسیم دولت زیادہ سے زیادہ مساوی بنیاد پر ہو اور ٹیکس سے بچنے والے لوگوں کو ہرگز معاف نہ کیا جائے، لہذا بنیادی طور پر ہمیں لیاقت علی کی تجویز سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ جب انھوں نے کابینہ میں یہ مسئلہ پیش کیا تو کہا کہ اُن کی تجاویز اُن اعلانات پر مبنی ہیں جو مزدوار کانگریسی لیڈروں کی طرف سے ہوتے رہے تھے۔ انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ یہ اعلانات زیادہ تر جواہر لال کے تھے لیکن انھوں نے کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ عام احساس پر ہم نے اُن سے اصولی طور پر اتفاق کر لیا۔“

رئیس احمد جعفری نے اس بجٹ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:

”عوام کے ساتھ کانگریس کا یہ منافقانہ رویہ اور سرمایہ داروں کے ساتھ اس نیاز مندانہ برتاؤ پر اتنی ہزار صفحے کی کتاب لکھ دی جاتی، ملک کے طول و عرض میں شعلہ نوا خطیب اور آتش نوا مقرر تھمکے مچا دیتے تو بھی وہ اس طرح بے نقاب نہیں ہو سکتے تھے جس طرح لیاقت علی خاں کے چند ورق کے اس میزانیہ نے کر دیا۔۔۔۔۔ گویا لیاقت علی نے بجٹ اس لیے بنایا تھا کہ برلا، والیا، ہنگامیہ کو لوٹ کر غریب مسلمانوں کی جھولیاں بھر دیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت پٹیل اور راجگوپال اچاری کے منہ سے وہ الفاظ نہیں نکلا سکتی تھی جو لیاقت علی کے بجٹ نے نکلوا دیے۔“

یہ سطر یہاں جملہ مقررہ کے طور پر آگئیں۔ ذکر تھا جناب ابوالکلام کی ہندو نوازی اور ہر موقع پر مسلم مفادات پر کاری ضربیں لگانے کا۔ مسلمانوں نے ہندو لیڈروں کی عیاری اور مسلم دشمنی کے تحت تقسیم ملک کی تجویز اور مطالبہ پاکستان کو اپنے حقوق کے تحفظ کا واحد حل پا کر اپنی تمام تر مساعی اس مقصد کو حاصل کرنے پر مرکوز کر دی تھیں تاکہ علیحدہ حصے میں مسلمان اپنی قسمت کے آپ مالک بن کر رہیں۔ انہیں صاف نظر آنے لگا تھا کہ انگریز کی غلامی سے نجات پانے کے بعد بھی مسلمان ہند غلامی کے چکر سے نہیں نکل سکیں گے۔ آزادی ملک کے بعد ہندو اکثریت کی غلامی کا جوا گندھوں پر رکھا ہوا ہوگا۔ جو انگریزی اقتدار میں مسلمانوں کو پیس رہے ہیں وہ بعد میں تو پتیا ہی چبانے کی کوشش کیا کریں گے۔ ان متوقع خطرات سے بچاؤ کی صورت مطالبہ پاکستان کے سوا اور کیا تھی؟ مسلمان ہند کے اس مطالبے نے جب انتہائی شدت اختیار کر لی تو بڑے بڑے ہندو لیڈروں کو بھی تقسیم ہند کے علاوہ مسلمانوں کو مطمئن کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نظر نہ آئی۔ حالات کے آگے انہیں بھی جھکنا اور مطالبہ پاکستان کو درست تسلیم کرنا پڑا۔ اس سلسلہ میں پاکستان کو "پلیدیستان" یا "کنبری" بتا کر قبول کرنے والے نام نہاد علماء کا ذکر نہیں کرتا بلکہ مذکور ہے اس ادنیٰ چوٹی کی سرکار کا، جس کو گاندھی جی حضرات امام الہند کا لقب دیتے ہیں کہ موصوف کا اس وقت کیا خیال تھا؟

"اب کہ سردار پٹیل ہی نہیں جواہر لال بہک تقسیم ہند پر راضی ہو چکے تھے، میری (ابوالکلام کی) تنہا امید گاہ، گاندھی جی کی ذات تھی۔ وہ ۲۱ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے دہلی آئے ہیں، فوراً ان سے ملنے روانہ ہو گیا۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کہا، تقسیم ہند اب ایک خطرہ بن چکی ہے۔ دلچسپ بھائی (یعنی سردار پٹیل) اور صرف وہی نہیں جواہر لال بہک سپر انداز ہو چکے ہیں۔ بتائیے مولانا آپ کیا کریں گے؟ آپ میرا ساتھ دیں گے یا آپ بھی بدل چکے ہیں؟

میں نے جواب دیا: میں تقسیم ہند کا مخالف پہلے ہی تھا، اب بھی ہوں، بلکہ اب سے زیادہ اس تسخیل کا مخالف کبھی نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ جواہر لال اور سردار پٹیل نے شکست تسلیم کر لی ہے، بلکہ

آپ کے الفاظ میں سپر انداز ہو گئے ہیں۔ میری واحد امید گاہ آپ کی ذات ہے اگر آپ تقسیم کے خلاف آمادہ عمل ہوں تو ہم حالات کو اب بھی قابو میں لاسکتے ہیں لیکن اگر آپ بھی خاموشی اختیار کر لیں تو مجھے شبہ ہے کہ پھر ہندوستان ہاتھ سے گیا۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ ”یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، اگر کانگریس تقسیم ہند قبول کر لینا چاہتی ہے تو یہ کارروائی میری لاش ہی پر ہو سکے گی۔ جب تک میں زندہ ہوں، میں کبھی بھی تقسیم ہند پر رضا مند نہیں ہو سکتا اور نہ میں کانگریس کو ایسا کرنے دوں گا۔“

عبادت کے تیور بتا رہے ہیں کہ تقسیم ہند کا جھگڑا گویا ہندوؤں اور مسلمانوں یا کانگریس اور مسلم لیگ کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ جھگڑا تھا ابوالکلام آزاد اور مسلمانوں کا۔ مسلمانان ہند کا مطالبہ تھا کہ ہندو ہمارے ساتھ اب بھی زیادتی کر رہے اور آزادی کے بعد تو ذرا بھی کسر باقی نہیں چھوڑیں گے۔ لہذا ہندوستان کو تقسیم کر کے ہمارا حق ہمیں علیحدہ دے دیا جائے تاکہ ہم انگریز کی غلامی کے ساتھ ہی ہندو کی غلامی سے بھی نجات حاصل کر لیں۔ اس کے برعکس ابوالکلام دی گریٹ کا نظریہ یہ تھا کہ خواہ سارے ہندو لیڈر اور پوری ہندو قوم بھی اس بات پر رضا مند ہو جائے کہ ہم مسلمانوں کو اپنا غلام بنانے پر رضد نہیں اور تقسیم ہند کا منصوبہ تسلیم کر کے مسلمانوں کو ان کا حق دینے پر راضی ہیں لیکن میں پھر بھی اس فیصلے کو تسلیم نہیں کروں گا۔ موصوف کے اس وقت بھی تسلیم نہ کرنے کی چند وجوہات ہیں :

۱۔ جس طرح ابوالفضل غلامی (المتوفی) نے اکبر بادشاہ کو سمجھایا تھا کہ ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم بنایا جائے۔ ہندو اور مسلمان وغیرہ کی علیحدہ قومیت کا تصور ہی ختم کر دیا جائے اسی طرح ماضی قریب میں اس ایک قوم (متحدہ قومیت) بنانے کے منصوبے کو پروان چڑھانے والے نہ ہندو لیڈر تھے، نہ گاندھی تھا، نہ اور کوئی، وہ امام الہند کہلوانے والا ابوالکلام آزاد تھا۔

۲۔ ہندو لیڈر اس متحدہ قومیت کے منصوبے میں ابوالکلام کے معاون و مددگار ضرور تھے لیکن اس منصوبے کی علمداری اور سارے قافلے کی سپہ سالاری کے جملہ حقوق تو بحق

ابن مولانا خیر الدین محفوظ تھے۔

۳۔ تقسیم ہند سے ہندو بھی کڑے ضرور، وہ اپنے لیے اسے نقصان دہ فیصلہ سمجھتے تھے، لیکن براہ راست ضرب تو ابوالکلام آزاد کے منصوبے پر پڑ رہی تھی۔ وہ ٹرپ کیوں نہ اُٹھتے، آنکھوں دیکھتے اُن کی پچیس تیس سالہ محنت پر پانی پھرنے لگا تھا۔ ہندو لیڈر تک دو قومیں، دو طاقتیں مان کر ملک کے دو حصے بنا دینے پر رضامند ہو رہے تھے مگر یہ کیسے ہوتے؟ ملک کے دو حصے بنا متحدہ قومیت کی ضد ہے، اسی لیے متحدہ قومیت کا علم دار تقسیم ہند کو کس طرح قبول کرتا جبکہ یہ اُس کی شان ابوالفضل کے خلاف تھی۔

۵۔ ڈوبنے والا تنکے کا بھئی سہارا لینے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح ہندو اور مسلمان کو ایک قوم بنانے والے، توحید اور بت پرستی کا فرق مٹانے والے اور کعبے میں بت خانہ سجانے والے امام الہند نے اپنے منصوبے کو بگڑتے دیکھا تو برہندو لیڈر کا سہارا لینے کی کوشش کی لیکن انھیں ناکامی و نامرادی کا منہ دیکھنا پڑا۔

ہاں تو ذکر تھا کہ ابوالکلام آزاد، تقسیم ہند کے خلاف گاندھی سے استناد کر رہے تھے۔ گاندھی نے یقین دہانی کرائی، پُر زور الفاظ میں اپنی شناہنہ طاقت کا اظہار کیا۔ چند روز بعد تقسیم ہند کی مخالفت کرنے والا، ہندوستان کا بے تاج بادشاہ کہلانے والا گاندھی کون سی آندھی میں اڑا! یہ ابوالکلام آزاد سے سینے،

اُسی دن گاندھی جی لاڈ داؤنٹ بیٹن سے ملے، دوسرے دن دونوں کی پھر ملاقات ہوئی اور ۲ اپریل کو پھر پہلی مرتبہ جب وہ لاڈ داؤنٹ بیٹن سے مل کر واپس آئے تو فوراً ہی سردار پٹیل اُن کے پاس پہنچے اور دو گھنٹے تک بیٹھے رہے۔ اس ملاقات میں کیا باتیں ہوئیں؟ میں نہیں جانتا۔ لیکن جب دوبارہ میں گاندھی جی سے ملا، تو میں نے ایسا جھٹکا محسوس کیا جو میری زندگی کا اہم ترین حادثہ ہے۔ میں نے دیکھا، گاندھی جی بھی بدل گئے۔ جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ صدمہ پہنچایا اور حیران کیا وہ یہ تھی کہ اب گاندھی جی بالکل سردار پٹیل کی زبان میں بول رہے تھے۔ دو گھنٹے ٹھنک دیں انھیں ہوار

کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اُس پر کوئی اثر نہ ڈال سکا۔ آخر کار میں نے اُن سے کہا کہ اگر آپ نے بھی یہ خیالات قبول کر لیے ہیں تو پھر مجھے کوئی آس نہیں ہے کہ ہندوستان تباہی سے بچ سکے گا۔ گاندھی جی نے مجھے بتایا کہ پوزیشن ایسی ہے کہ اب تقسیم ہند کو ٹالنا نہیں جاسکتا۔

تقسیم ہند کے مسلمانوں کو اُن کا حق دینے اور ہندوؤں کی غلامی سے آزادی حاصل کر لینا ابوالکلام آزاد کی نظر میں کیا تھا، یہ مذکور ہوا، اسی سلسلے میں موصوف کی ایک وضاحت اور ملاحظہ ہو:

”۱۴ جون ۱۹۴۷ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بہت سے جلسوں میں شریک ہو چکا ہوں، لیکن اس عجیب جلسے میں کاش اشریک نہ ہوا ہوتا۔ کانگریس جس نے ہمیشہ ہندوستان کی آزادی اور وحدت کے لیے لڑائی جاری رکھی تھی، آج تقسیم ہند کے ریزولیشن پر غور کر رہی تھی۔ پنڈت گوبند بلبھ پنت نے ریزولیشن پیش کیا، پھر سردار پٹیل اور جواہر لال بولے، بعد میں گاندھی جی نے لب کشائی کی۔

کانگریس کی طرف سے اتنے ذیل طریقے پر ہتھیار ڈال دینے کا منظر برداشت کر لینا میرے بس سے باہر تھا۔ اپنی تقریر میں، میں نے صاف طور پر کہا کہ جس فیصلے پر ورکنگ کمیٹی پہنچی ہے وہ نہایت افسوسناک حالات کا نتیجہ ہے۔ تقسیم ہندوستان کے لیے سب سے بڑا المیہ ہے اور اس کی تائید میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ ہم نے اپنے مقدور بھر تقسیم سے بچنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہے۔ بہر حال ہمیں نہ مجھونا چاہیے کہ قوم ایک ہے (یعنی کفر و اسلام ایک ہی بات ہے)؛ اس کی تہذیبی زندگی ایک ہے اور ایک رہے گی، سیاسی طور پر ہم ناکام ہو اور اسی لیے تقسیم ملک پر مجبور ہو گئے، ہمیں اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے،

لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ عہد بھی کر لینا چاہیے کہ ہماری تہذیب تقسیم نہیں ہوئی۔
اگر ہم پانی کو ایک چھڑی سے ہلائیں تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ پانی تقسیم ہو گیا،
لیکن تقسیم نہیں ہوتا، چھڑی جیسے ہی ہٹائی جائے گی، تقسیم کے اثرات فوراً
زائل ہو جائیں گے۔ ۱

اس تقریر پر کوئی تبصرہ کرنا ہمارے نزدیک لا حاصل ہے کیونکہ موصوف کے نظریات اُن کے الفاظ
سے خود ہی پورے طور پر واضح ہو رہے ہیں، ہاں اس کے متعلق سردار پٹیل کے تاثرات پیش
کر کے فیصلہ قارئین کے سپرد کرتا ہوں :

”سردار پٹیل کو میری تقریر پسند آئی۔ اُن کی ساری تقریر میری تقریر کا جواب تھی
اُنھوں نے کہا تقسیم ملک کا پوزیشن جبر یا کمزوری کا نتیجہ نہیں، بلکہ ہندوستان کے
موجودہ حالات کا بہترین حل یہی ہے۔ ۲

پٹیل، جواہر لال اور گاندھی تک اگرچہ تقسیم ہند پر رضامند ہو گئے لیکن آخری سانس تک رضامند
نہ ہونے والے ابوالکلام کے نزدیک یہ ایک بدترین اندیشہ تھا جو کبھی کبھی ان کے دماغ کی
کھڑکیوں کو کھڑکھڑا کر اُن کی نیندیں حرام کر دیا کرتا تھا، وہی اندیشہ اب موصوف کے سامنے۔
حقیقت بن کر آگیا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں :

”لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانوی حکومت سے تقسیم ہند کی اسکیم منظور کرا کے ۲۰ مئی کو
دہلی واپس آئے۔ ۲ جون کو نمائندگان لیگ و کانگریس سے اُنھوں نے گفتگو کی۔
۳ جون کو تقسیم ہند کی تفصیلات کے ساتھ قرطاس ابیض شائع ہو گیا۔ میں
صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے بدترین اندیشے واقعہ بن گئے۔ آزادی ہند
کی قیمت دو حکومتوں میں ہندوستان کی تقسیم تھی۔ ۳

۱۔ رئیس احمد جعفری : آزادی ہند، مطبوعہ لاہور، ص ۲۳۳، ۲۳۴

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۴

۳۔ ایضاً، ص ۲۴۱، ۲۴۲

مطابق پاکستان جو ہندوؤں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی آخری صورت تھی، اُس کے بارے میں موصوف نے اپنی پوری سوجھ بوجھ اور ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر یوں فیصلہ صادر فرمایا تھا:

”ہر ممکن نقطہ نظر سے میں نے مسلم لیگ کی تجویز پاکستان پر غور کیا۔ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ نہ صرف مجموعی حیثیت سے ہندوستان کے لیے بلکہ خاص طور پر مسلمانوں کے لیے بھی مضر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تجویز سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا بلکہ بہت سے نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔“

اس سلسلے میں موصوف نے ذرا صاف بیانی سے کام لیتے ہوئے پاکستان کے متعلق ارشاد فرمایا تھا:

”میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت مقبول نہیں کرتی۔“

گویا مسلمان ہند کے مفادات سے جتنے ابوالکلام آزاد کھراٹے وہ کسی بڑے سے بڑے ہندو لیڈر سے بھی نہ بن سکا۔ تقسیم ملک کے بعد موصوف کو تعلیمات کا محکمہ دیا گیا کیونکہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو اردو زبان اور عثمانیہ یونیورسٹی سے محروم کرنے نیرنی نسل کے فہمنوں کو نئے انداز میں ڈھالنے کے لیے ابوالکلام آزاد سے موزوں شخصیت اور کون تھی؟ کوئی ہندو یہ کام کرتا تو ہنگامے ہوتے، شور مچتا، مسلمانوں کا بدخواہ ٹھہرایا جاتا لیکن اس طرح سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی محفوظ رہی۔ یہ کام نہ ابوالکلام وزیر اعظم بن کر انجام دے سکتے تھے اور نہ بھارت کے صدر ہو کر۔ اسی لیے ہندو لیڈروں نے انھیں صدارت اور وزارتِ علی کے بر موقیع پر نظر انداز کیا۔ مثلاً جعفری صاحب لکھتے ہیں:

”اگر کانگرس صحیح معنی میں قومی تنظیم تھی، تو مولانا نے بتایا ہوتا کہ جس عالی ظرفی کا مظاہرہ مسلم لیگ کی ضد میں، لارڈ ویول کو اپنے نمائندوں کی فہرست پیش کرتے وقت کانگرس نے کیا، آزاد ہندوستان میں ایسا کیوں نہیں کیا، لارڈ ویول کو جو فہرست پیش کی گئی اُس میں پہلا نام مولانا آزاد کا تھا لیکن جب

(الف) ہندوستانی کابینہ میں نائب وزیر اعظم کا عہدہ پیش کیا گیا تو پہلا نام سردار ٹیل کا تھا حالانکہ مستحق مولانا آزاد تھے۔

(ب) ٹیل کے انتقال کے بعد بھی مولانا آزاد ”سینئر مونسٹ“ ممبر تھے، لیکن یہ عہدہ ختم کر دیا گیا مگر مولانا کو مستحق نہ سمجھا گیا، حالانکہ ان کا جرم سوا اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وہ مسلمان تھے۔

(ج) ماؤنٹ بیٹن کے بعد جب یہ سوال پیدا ہوا کہ اب کوئی ہندوستانی گورنر جنرل بنایا جائے تو پہلا نام راج گوپال اچاری کا پیش ہوا اور منظور ہوا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے سزاوار مولانا تھے۔

(د) پھر جب صدر جمہوریہ ہند کا منصب تخلیق ہوا تو بھی مولانا نظر انداز کر دیے گئے اور راجندر بابو کا پہلا اور آخری نام منظور کر دیا گیا، حالانکہ خدمات کے لحاظ سے ٹیل، راجہ جی، راجن بابو سب مولانا کے سامنے طفلِ متب تھے۔

گاندھی مدینہ

بجنور سے نکلنے والا اخبار ”مدینہ“ کانگرس اور متحدہ قومیت کا حامی تھا۔ اُس کا حال ملاحظہ ہو:

”اچھیں جرائد میں بجنور کا اخبار ”مدینہ“ بھی ہے جو کبھی اسم باستی تھا لیکن آج کل برعکس نہند نام رنگی کا فور اچھا خاصا سومنات بنا ہوا ہے۔ کانگرس اور گاندھی جی کو خوش کرنے کی دھن میں اس اخبار نے اپنی تمام گزشتہ روایات کو

طالقِ نسیاں کے حوالے کر دیا ہے۔ اسلام کے سوا اعظم کو انگریزوں کا ٹوڈی کہنا ان آزاد خیال مسلمانوں کو جن کا جرم صرف اس قدر ہے کہ وہ کانگریس میں جذب ہونا پسند نہیں کرتے بلکہ ایک برابر کی جوڑ کی حیثیت سے اُس کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنے پر آمادہ ہیں، پانی پی پی کر کو سنا، ہندوؤں سے خراج تحسین حاصل کرنے کے لیے مسلمان اکابر پر جھوٹے الزام لگانا "مدینہ" کا محبوب ترین شغل ہے۔ لے

گاندھی کی پیشوائی کے بارے میں یہی ظفر علی خاں یوں "مدینہ" کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

"جہاں تک کانگریس کے اصولوں کا تعلق ہے ہمیں ان کے ساتھ اتفاق ہے، مگر ہم اپنی دائرہ گاندھی جی کے ہاتھ میں دینا پسند نہیں کرتے۔ پرتاپ یا ملاپ ہی کر "مدینہ" اگر ان باتوں پر بگڑتا ہے تو بگڑا کرے، مسلمانوں کو اس کی کوئی پروا نہیں وہ شوق سے اپنی دائرہ گاندھی جی کے ہاتھ میں تھما دے، جس کم جہاں پاک؛ لے

موصوف نے "مدینہ" بجنور کی گاندھیویت پر اُس کی خدمت میں ایک سوغات پیش کی تھی، وہ بھی ملاحظہ ہو:

"مدینہ اب وہ مدینہ نہ رہا، آج کل وہ سوغات ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ اسی مناسبت سے ایک نئی سوغات اُس کی خدمت میں پیش کی جائے۔ سُنئے، جب مدینہ کے قتلکار یہودی ہو جائیں

کیوں نہ پھر اُس کو بھی تابوتِ سکینہ کہیے
کالی ماتا کی اسے کیسے چیتتی بیٹی
یا مہادیو کی اولادِ زہینہ کیسے
کانگریس جس سے مسلمان کو لیتی ہے خرید
اپنے سینہ کو اسی زر کا خزانہ کیسے

لے ظفر علی خاں، چغتسان، مطبوعہ لاہور، ص ۷۶

لے ایضاً، ص ۷۷

اُڑ رہا جس پہ نہرو کا ہوترنگا جھنڈا
اپنے اخبار کو اُنسی بام کا زینہ کیسے
وہ دعا آپ کو دے، آپ اُسے گالی دیں
آپ میں یا ہے "زمیندار" کینہ کیسے

جب اسلامی عقائد و معمولات کو غیر اسلامی اور غیر اسلامی باتوں کو اسلامی کہا جانے لگے تو ایسے
مساعد حالات اور فتنہ پروردور میں اللہ تعالیٰ کا جو مقبول بندہ تائید ایزدی سے دلائل و براہین
کے ذریعے فتنہ پردازوں کو ساکت و مبہوت کر کے حق و باطل کو واضح کر دکھائے، دُودھ کا دُودھ
اور پانی کا پانی کر دے، اصطلاحِ شرع میں اُسے مجتہد کہا جاتا ہے۔ آج تک کوئی مجتہد ایسا
نہیں ہوا، نہ ہو سکتا ہے کہ وہ دیوبندیوں کے مولوی اشرف علی تھانوی کی طرح نصاریٰ کے ہاتھوں
چھ سو روپیہ ماہوار پر پک کر خود تو ساری عمر کفر کے سمندر میں پڑا غوطے لگاتا رہے لیکن دوسروں
سمجھانا بھجانا بھی ضروری سمجھے۔ چنانچہ موصوف نے بھی اپنی گاندھوی برادری کو یوں سمجھایا تھا:
"مسلمانوں میں افسوس تو یہ ہے کہ دوست دشمن کی بھی پہچان نہیں۔ یہی وجہ ہے
کہ آئے دن مصائب کا شکار بن رہتے ہیں۔ خصوصاً اُن پر زیادہ افسوس ہے
کہ جو مسلمانوں کے رہبر اور مقتدا کہلاتے اور جی کے ہاتھ میں اُن کی تکمیل ہے۔
جو اُن کی کشتی کے ناخدا بنے ہوئے ہیں۔ جو ان کے سیاہ و سفید کے مالک ہیں
وہ اُن کے لیڈر ہیں۔ لیکن ایسے لوگ کیا خاک رہبری کریں گے جو خود گم کردہ
راہ ہیں تو دوسروں کو کیا راہ بتائیں گے؟

انھوں نے کافروں کی چکنی چوڑی باتوں میں آکر مسلمانوں کو لپیٹا دیا اور
مسلمانوں ہی کو کیا، خود بھی اُن چیزوں کا ارتکاب کیا جو ایمان اور دین کو خراب
اور برباد کرنے والی تھیں۔ بجے کے نعرے لگاتے، پشیمانیوں پر تشقے لگاتے،
ہندوؤں کی ارجھیں کو کندھا دیا، رام بیلاد وغیرہ کا انتظام مسلمان و الٹیروں نے

کیا، یہود اور کفر پر کلمات کہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو فلاں ہندو نبی ہوتا، کیا خرافات و اہیات ہے۔

میں نے اُس ہی شباب تحریک کے زمانہ میں کہا تھا کہ جو شخص توحید اور رسالت کا منکر ہو اور وہ اسلام اور مسلمانوں کا خیر خواہ اور ہمدرد ہو، یہ معتمدِ سمجھ میں نہیں آتا مگر اُس وقت پڑھی ہوئی تھی، کون سُنتا تھا۔ اب دیکھ لی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔ ادھر تو حکومت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو آگے کر دیا، ادھر بعض بد فہم اور بے سمجھ مسلمانوں کے جو راہبر تھے اُن کو بھلا چھسلا کر ہجرت کا سبق پڑھایا، ادھر شدھی کا مسئلہ جاری کر دیا بغرضیکہ ہر طرح پر مسلمانوں کے جان، ایمان، جائیداد، مال، زرا، زمین، گھر، سب کا مالک اپنی قوم کو بنانا چاہتا تھا۔ یہ تھی اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اُس کی خیر خواہی اور ہمدردی۔

لیکن یہ لیڈر نہ سمجھے اور نہ اُن کے ہم خیال مولوی۔ ہندوؤں کو تو قوت ہوئی مسلمانوں کی شرکت سے اور مسلمانوں کی شرکت ہوئی مولویوں کی شرکت سے اور نہ لیڈران قوم تو قریب قریب ڈیڑھ سال سے چیخ رہے تھے، عوام مسلمانوں نے شرکت نہ کی تھی جس وقت مولویوں نے شرکت کی تب بیچارے عوام مسلمان بھی چپس گئے۔ اگر وہ ہندو (گاندھی) ایسا ہی تھا جیسا کہ بعض بد اندیش سمجھے ہوئے تھے یا اب تک بعض سمجھے ہوئے ہیں، تو محمد علی تو پاس رہے ہیں، اُن کا فیصلہ دیکھ لو کہ کس طرح الگ ہوئے تھے۔ ۱

احرار پارٹی

پنجاب میں کانگریس کے مفادات کا تحفظ "احرار پارٹی" کر رہی تھی۔ احرار پارٹی حقیقت

یہ جمیۃ العلماء ہند کی ذیلی شاخ تھی جس طرح خود جمیۃ العلماء ہند ہی کانگریس کی شاخ ہے ۔
 احرار کی حضرات پھر گاندھی پرستی اور زنازدوستی میں کسی دوسرے گاندھوی سے پیچھے کس طرح
 رہ سکتے تھے ؟ کانگریس بھی ان کی دل و جان سے سرپرستی کا فریضہ ادا کر رہی تھی ۔ یہی وجہ ہے
 کہ ان حضرات نے مسلمانوں کا سرتاج بننے کے بجائے گاندھی ، نہرو اور ٹیل کا نعلین بردار بننا
 رضا و رغبت قبول کیا ہوا تھا ۔ ظفر علی خاں لکھتے ہیں :

میں نے کل پوچھا یہ ”صدر مجلس احرار سے

بندہ پرور آپ کیوں ہیں خاکساروں کے خلاف

گر عقائد کی بنا پر آپ کی ہے اُن سے جنگ

کیوں نہیں ہیں آپ پھر زنازدادوں کے خلاف

پیارے شرک میں ٹیل و گاندھی و نہرو و بوس

کاش ہوتی آپ کی یلغار ان چاروں کے خلاف

ہنس کے فرمانے لگے ارشادِ عالی ہے بجا

ہو تو جائیں ہم بھی ان مردارخواروں کے خلاف

پل رہے ہیں اُن کے چندوں پر مگر احرار ہند

پھر ہوں کیوں وہ اپنے اُن پردگاروں کے خلاف

کانگریس نے پال رکھے ہیں مدینہ کے کچھ اونٹ

عالمِ اسلام ہے اُن بے ہماروں کے خلاف

احرار پارٹی کے کارنامے گناتے ہوئے مزید اُس کا تعارف کرانے کی یوں کوشش کی گئی ہے :

بادا تھے مسلمان تو بیٹے تھے مجوسی

پوتے جو ہیں ”احرار“ وہ کہلائے فلو سی

مل جائے جہاں چندہ ، وہی ہے وطنِ ان کا

ہندی ہیں نہ مصری ہیں نہ چینی ہیں نہ روسی

جو بلند مرے غم کی مہاجن سے بچی تھی
پنجاب کے احرار ستم پیشہ نے چوسی

نہر و جو ہے دولہا تو دلہن مجلس احرار
ہو پیر بخاری کو مبارک یہ عسروسی

مجلس احرار کے صدر مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری تھے۔ موصوف ایک شعلہ بیان مقرر اور دیوبندی
مکتب فکر سے متعلق تھے۔ مسلمانان ہند کی نمائندگی کرنے والی واحد جماعت مسلم لیگ سے
ان حضرات کو اتنا ہی خارتھا جتنا مشرکین ہند کو اور شاید کانگریس کے کسی بڑے سے بڑے
لیڈر نے بھی مسلم لیگ اور اُس کی ہمنوائی کرنے والوں کے حق میں اتنے گندے الفاظ استعمال
نہ کیے ہوں گے جیسے گاندھوی علمائے استعمال کیے تھے۔ مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری
اور مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی کے بارے میں یوں مرقوم ہے:

”ایک دوسرے صاحب نے فرمایا کہ احرار کے متعلق ایک شعر ضرور ہونا چاہیے
کیا آپ کو معلوم نہیں کہ احرار کی شریعت کے امیر، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری
نے امر و ہرمین تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ جو مسلم لیگ کو ووٹ دیں گے
وہ سُور ہیں اور سُور کھانے والے۔ اوکا قال۔“

پھر میرٹھ میں مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی صدر مجلس احرار اس قدر
جوش میں آئے کہ دانت پیستے جاتے تھے، غصہ میں آکر ہونٹ چباتے تھے
اور فرماتے جاتے تھے کہ دس ہزار جینا اور شوکت اور ظفر، جو اہر لال نہرو کی
جوتی کی نوک پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔“

لے ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۹۷

لے مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری ۱۲۱۰ھ / ۱۸۹۱ء میں پیدا ہوئے اور ۱۳۸۱ھ / ۱۹۶۱ء میں وفات پائی۔

لے مراد مسٹر محمد علی جناح، مولانا شوکت علی اور ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار اخبار ہیں۔

لے ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۱۰۳

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری اور دیگر اراکین مجلس احرار امتیازی خویوں کے مالک تھے۔ دیوبندی
مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے مولوی ظفر علی خاں نے ان حضرات کا تعارف یوں کروایا ہے:

گالیاں دے، جھوٹ بول، احرار کی ٹولی میں مل

نکتہ یوں ہی ہو سکے گا حل سیاسیات کا

پہلے ہی دن سے ہیں جب دیدے بخاری کے پٹم

مانگتے پھرتے ہیں کیوں کا حبل سیاسیات کا

خالصہ کا ساتھ دے جب یہ شریعت کا امیر

کیوں نہ کہیے اس کو ”بابا بٹل“ سیاسیات کا

کیا تماشا ہے کہ زلفِ شرع کی مشاطگی

کر رہا ہے آج دستِ شل سیاسیات کا

دیکھ لے مظہر علی اظہر کو افضل حق کے ساتھ

ایک پڑی دوسرا جھانپل سیاسیات کا

مجلس احرار کے نیفے کی رونق بن گیا

ایک پسٹو دوسرا کھٹل سیاسیات کا

دغلِ معقولات میں دیتا ہے کیوں ”بڈ مولوی“

عقدہ کیا کھولے گا یہ ڈھیل سیاسیات کا

ڈاکٹر کچلو زبر ہیں اور حسام الدین ہیں زیر

یہ دمن اس عہد کی وہ نل سیاسیات کا

جل گئے مٹھ میں بجھتے مولوی داؤد کے

حد سے بڑھ کر گرم تھا بھوبل سیاسیات کا

سنا ہے کہ مجلس احرار نے شہید گنج مسجد کے بارے میں سودا بازی کی تھی۔ اندرونِ حنا

سکھوں سے ساز باز تھی اور زبانی ہمدردی مسلمانوں کے ساتھ۔ واللہ اعلم کہ اس بیان میں کہاں تک صداقت ہے۔ بہر حال اجاز "زمیندار" کے ایڈیٹر کی رائے قارئین کرام کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے:

زالی وضع کا مومن ہے طبقہ احرار

کہ سر جھکا ہوا مشرک کے آستان پر ہے

اس آزدویں کہ نہر کسی طرح خوش ہو

نگاہ خشم کندر حیات خاں پر ہے

خدا کے گھر کی تباہی میں حصہ دار ہوئے

یہ ظلم انھوں نے کیا آپ اپنی جاں پر ہے

اشارہ پاک کے اُدھر سے شہید گنج کا شور

کئی دنوں سے اُن اشار کی زباں پر ہے

سنا کیا جو کئی سال دیر کا ناقوس

لگا ہوا وہی کان آجکل اذواں پر ہے

مولوی مظہر علی اظہر احراری نے کامریڈ محمد حسین مین ساز کو مخاطب کر کے یوں دھمکی دی تھی:

ہم ہیں احرار نہیں ہم سے اُلجھنا اچھا

جری اوقات ہی کیا ہے اے اوٹین فروش

کامریڈ محمد حسین نے مولوی مظہر علی اظہر احراری کی اس دھمکی کا جواب یوں دیا تھا:

میں نے مسجد نہیں بھی کبھی تیری مانسہ

اے اوچندے کے بھوکے، اے او دین فروش

مولوی عطاء اللہ شاہ بخاری کے سکھوں سے بھی اُسی طرح کے نیاز مندانہ تعلقات تھے

جن طرح کے مشرکین ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو سے تھے سیکھوں کی طرف سے بھی موصوف
پر نوازشات کا سلسلہ جاری رہتا تھا:

احرار کے بیت خانہ سے منظر کو بلالا

منظور بنانا ہو جو مسجد کو شوالا

سرکارِ مدینہ سے بلا مجھ کو بھی کبیل

سیکھوں نے بخاری کو جو بٹھا ہے دوشالا

اراکینِ مجلسِ احرار کی صفت و ثنا میں اسی سلسلے کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :

جاء نصرُ اللہ کی ہریانہ سے آئی صدا

رنگِ افضل حق کا سنتے ہی جسے فتنی ہو گیا

گر پڑے غش کھا کے مولانا عطاء اللہ شاہ

اور کلیجہ مولوی داؤد کا شق ہو گیا

مولوی مظہر علی اظہر کی رسوائی کا داغ

اُن کی مجلس کے سیہ خانے کی رونق ہو گیا

اُس طرف مندر کا شور اور اس طرف مسجد کا زور

بیچ میں مظہر علی اظہر معشتی ہو گیا

جاٹے کیا سوچ کر احرار سے ملائے غوثؒ

ساروں میں کس لیے شامل یہ تعلق ہو گیا

صدرِ احرار آگئے لے کر لنگوں کے پرے

لشکرِ اشرار سے جنگ آزما حق ہو گیا

لے ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۶

لے مراد، مولوی غلام غوث نہرادی جو آج کل پاکستان اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔

لے ظفر علی خاں، چمنستان، مطبوعہ لاہور، ص ۵۸، ۵۹

حلقہ بجنور سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر عبدالسمیع کھڑے ہوئے تھے اور اُن کے مقابلے پر کانگرس نے
حافظ ابراہیم کو کھڑا کیا تھا۔ نام نہاد ابراہیم صاحب کی زنازدوستی پر دو شعر مزید ملاحظہ ہوں:
کیا قیامت ہے کہ جس کا نام ہی تھا بت شکن

بُت کے آگے سر اُسی ملت کا بھک جانے لگے
نغمہ توحید اب کس کی زباں پر آئے گا

جب خود ابراہیم بندے ماترم گانے لگے لے
ہزارہ میں جب مسلم لیگ نے نمایاں کامیابی حاصل کی تو گاندھیوں میں یوں صفِ ماتم بچھ گئی:
جب جیت لیگ کی ہوئی اور کانگرس کی ہار

روتی تھی سرکڑ کے گورمنٹ ”خان“ کی
گاندھی بھی رو رہے تھے یہ کہہ کر کہے ہوئے

سرحد میں ناک کٹ گئی ہندوستان کی
میدان میں جم سکا نہ قدم سرخ پوش کا

جس وقت سر پہ آئی گھڑی امتحان کی لے
علمائے حقانی اور دینِ متین کی مخالفت میں پوری جولانی دکھانے والے اور ابوالکلام آزاد
وجہیۃ العلماء ہند سے احرار پارٹی اور اُن کے مجملہ گاندھی افراد سے عقیدت رکھنے والے جناب
شورش کشمیری نے احرار پارٹی کی دیانت داری کے بارے میں ایک انکشاف شائع
کیا تھا، وہ موصوف ہی کے لفظوں میں ملاحظہ ہو:

”جب مولانا دھڑکا کر جانے لگے تو شاہ جی نے روک لیا۔ مولوی صاحب! آپ
کہاں جا رہے ہیں؟ آپ تشریف رکھیں، آپ کے خلاف باجماعت (مجلس
احرار) کے خلاف شورش کچھ چارج لگا رہا ہے۔ مولوی صاحب رُک گئے۔ میں

نے ترتیب وار چارج لگانے شروع کیے۔ کانگریس کاروبار پہ ساڑھے ہزار، دس ہزار کی ایک قسط اور پچاس ہزار کی دوسری قسط اور یونیٹ پارٹی ابھی فخر پورا بھی نہ ہوا تھا کہ مولانا غلام غوث نے ایک ایک شق پر زور دیا۔ کچھ دیر تو ستانا چھایا رہا پھر سکوت ٹوٹا۔ مولانا نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے لیکن اس وقت اُن کے ذہن میں صحیح یاد نہیں کہ یہ رقم کتنی ہے۔ بات صبح پر ملتوی ہو گئی۔

مجھے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ، مولانا مظہر علی اظہر کے مکان پر لے گئے رات وہیں کاٹی۔ مولانا اس اقتدار کو برا خیال کرتے تھے اور منظر بھی تھے۔ لیکن وہ اخفا کے حق میں تھے۔ میں نے عرض کیا جب تمام لوگ آپ سے روپیہ لے چکے ہیں تو پھر وہ معصوم الخطا کیوں بنتے ہیں؟ رات جو گزری سو گزری، صبح وہی حیثیت بحث۔ صاحبزادہ صاحب نے ورکنگ کھیلٹی کے اجلاس میں کہیں یہ کہہ دیا کہ شورش اپنے الزام واپس لیتا ہے۔ میں موجود نہ تھا، جب پہنچا تو مجھے حیرت ہوئی۔ خیر دوبارہ وہی قصہ چھڑ گیا۔

مولانا مظہر علی نے تسلیم کیا کہ روپیہ لیا گیا ہے۔ لیکن اُس کے سزاوار وہ تھا نہیں بلکہ باقاعدہ مشورے سے رقم لی گئی ہے۔ پہلا دس ہزار روپیہ مولانا داؤد غزنوی نے دیا تھا اور شیخ حسام الدین اُس وقت موجود تھے۔ دوسری قسط بھی انہی حضرات کے مشورے سے حاصل کی گئی۔ یعنی شیخ حسام الدین نے مولانا حبیب الرحمن کو لہجیانہ خط لکھا کہ وہ کلکتہ میں کانگریس ہائی کمانڈ تک پہنچیں۔ یہ خط لے کر خاتون بابر مولانا مظہر علی کے صاحبزادے لہجیانہ پہنچے۔ مولانا حبیب الرحمن کلکتہ گئے۔ مولانا ابوالکلام ایک لاکھ روپے کے لگ بھگ رقم دینے کو تیار ہو گئے مگر سردار پٹیل جو کانگریس کے خازن تھے، اس سے اختلاف کیا اور پچاس ہزار روپے کی رقم کا چیک لالہ مجیم سین سپر کی تحویل میں دیا گیا، جو اُن کی معرفت دفتر احرار میں پہنچا، پھر اس رقم کی بندر باٹ کی گئی۔

وہ رقم جو پرنسٹ پارٹی سے وصول کی گئی اور جس کو بہ اختلاف مولانا نے تسلیم کیا کہ وہ رقم جو دو چار ہزار بطور چندہ فراہم کی گئی یہ تمام مل ملا کر پچانوے یا پچاسی ہزار بنتے تھے جب مولانا مظہر علی نے بتایا کہ نواب زادہ نصر اللہ کے سوا درکنگ کمیٹی کے ہر امیدوار نے اُن سے روپیہ لیا ہے، تو سب نے تسلیم کیا۔ شیخ حسام الدین بھی مان گئے، ماسٹر تاج الدین نے بھی سر ہلا دیا، مولانا حبیب الرحمن نے بھی صا د کیا۔ اس مجموعی رقم میں سے لے دے کہ صرف بیس ہزار بچتے تھے۔ مولانا مظہر علی نے دس ہزار اپنے ایکشن کا صرفہ بتایا اور دس ہزار روپے کے متعلق کہا کہ وہ روزنامہ آزاد نکالنے کے لیے جمع رکھا گیا ہے۔ لے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی
میں کیا تاؤں رات مجھے کس کے گھر ملے

تھانوی صاحب کے خلیفہ عبد الماجد دریابادی نے مدرسہ دیوبند سے گاندھوی فیض حاصل کرنے والے طلبہ اور متعلقین کی تبلیغی مساعی کے ساتھ اُن کی متحدانہ شان کا ایک المناک منظریوں پیش کیا ہے :

”آج چار دن سے اس قصبہ (دریاباد) پر کانگڑسی خیال کے مسلمانوں کا دھاوا ہے۔ دیوبند کے طلباء کا ایک دستہ آیا ہوا ہے اور اپنے مسلک کی تبلیغ یا کوشش تبلیغ میں مصروف ہے۔ اس میں مضائقہ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہر فریق یہی کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے لیکن ایک عجیب و غریب بات یہ ہے کہ کام مسلمانوں کے اندر کرتا ہے لیکن تعلقات یہ تمام مسلمانوں سے توڑے ہوئے ہے اور قصبہ کی غیر مسلم آبادی سے جوڑے ہوئے ہیں۔ قیام اُن کا دھرم سالہ میں ہے، سالانہ قصبہ میں ایک نہیں دوسرا بیس مسلمانوں کی موجود ہیں۔ ان کا رہنا سہنا چلنا پھرنا، کھانا پینا تمام تر ہندوؤں کے ساتھ، اُنھیں کے درمیان اور

اُنہیں کا سا ہے۔ حد یہ ہے کہ ان سطور کے راقم کو جب بھی اُنہوں نے سرفراز کیا تو ہمیشہ ہندوؤں ہی کے حلقہ میں۔ یہاں تک کہ ایک دن مسلمان صاحب تو ایک تھے اور اُن کے ہندو رفقاء تین کی تعداد میں، گویا توجید تملیٹ کے نغمہ میں۔ اس سے قبل سنٹرل اسمبلی کے الیکشن کے وقت تو یہ منظر دیکھنے میں آیا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمان امیدوار کے کارکن اور باقاعدہ پولنگ ایجنٹ تک ہندو ملک یا سیاسی نظریہ کے غلط یا صحیح ہونے کا یہاں ذکر نہیں، ذکر یہاں صرف اس ناقابل حل معرکہ کا ہے، اچھوت بنائے جانے ہوئے سنا تھا، پڑھا تھا، اچھوت بنتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ۱

یہ حضرات اچھوت کیوں نہ بنتے، جنہوں نے اپنے قلوب سے سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت نکال ڈالی تھی اور اُن کی شان میں نازیبا الفاظ جاری کرتے اور گستاخانہ نظریات کی نشر و اشاعت کرنا اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا تھا، اُن کے دلوں میں گاندھی جیسے دشمن اسلام و مسلمین اور ٹھیٹ بُت پرست کی الفت اس طرح جاگزیں ہوئی کہ گو سالہ، سامری کی طرح اُس کی پرستش ہونے لگی اور شب و روز اُس کی بارگاہ میں بڑے بڑے صاحبانِ حُجّہ و دستار اور امام الہند و شیخ الاسلام جی سچو و عقیدت کے نذرانے پیش کرنے لگے۔ مسلمانوں کو مشرک اور بدعتی ٹھہرانے والے اگر ہندو کے برادرانِ دینی و یقینی نہ بنتے تو اور کس کے بنتے؟ ملتِ اسلامیہ سے کٹ جانے والے اگر دشمنانِ اسلام کے غلام نہ بنیں تو اور کس کے نہیں؟ یہ اُن حضرات کا اپنا ہی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کا بھائی بننا پسند کیا اور بُت پرستوں کا غلام بننا دل و جان سے پسند کیا۔ بزرگوں سے تعلق رکھنے کے منکر اور اُن کی فاتحہ کو بدعت و حرام ٹھہرانے والے اپنے باپوشہد کی پوجا پاٹ اُس کی موت کے بعد بھی یوں کرتے رہے،

”حافظ بیعت اللہ رکن جمعیتہ العلماء ہند اور حضرت بابا خضر محمد سابق سرپرست جمعیتہ العلماء ہند کان پور نے مہاتما گاندھی کی رُوح کو خراجِ عقیدت پیش کرنے

کے لیے قرآن کریم کی آیتیں اُن (گاندھی) کی تصویر کے سامنے بیٹھ کر
پڑھیں اور اُن کی روح کو بخش دیں۔“ الخ ۱

۲ صورت تو مومنانہ ہے بیشک حضور کی
سیرت کا گوشہ گوشہ مگر ہندوانہ ہے

یہاں ایک تلخ حقیقت کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چودھری حبیب احمد صاحب نے
ایک ضخیم کتاب تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء کے نام سے لکھی۔ اُس میں گاندھی علماء
کی غیر اسلامی روش اور ہندو نوازی کا تذکرہ نیز تحریک پاکستان کے راستے میں اُن حضرات کی
رکاوٹوں کا اخباری بیانات کی روشنی میں سیر حاصل ذکر کیا ہے لیکن مسٹر پرویز کے معتقد
ہونے کے باعث نیشنلسٹ علماء کے مقابلے پر ہر جگہ مسٹر پرویز جیسے دشمن اسلام کو پیش
کرتے رہے ہیں۔ موسوف کا ارشاد ہے کہ گاندھی علماء کا جتنا مقابلہ ہمارے پرویز صاحب
نے کیا اتنا کسی اور سے کب بن پڑا؟ ستم بالائے منعم تو یہ ہے کہ علمائے اہلسنت اُن کے
نزدیک کسی گنتی شمار میں نہیں۔

چودھری صاحب چونکہ تاحال بقید حیات ہیں لہذا ہم یہ عرض کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں
کہ تحریک پاکستان کے وقت ہندوستان میں مدعیان اسلام کی تعداد دس کروڑ تھی، جن
میں سے نو کروڑ سے زائد اہلسنت و جماعت کا وہ سوادِ اعظم تھا جسے بتدین زمانہ نے بریلوی
جماعت کے نام سے متعارف کیا ہوا ہے۔ باقی جملہ فرقوں کے افراد کی مجموعی تعداد ایک کروڑ سے
بھی کم تھی۔ دیوبندی، اچمدیث، جماعت اسلامی، پرویزی، گاندھی اور مرزائی وغیرہ
سارے مل کر مسلمانان اہلسنت و جماعت کا عشرِ عشر بھی نہ تھے۔ سنی کانفرنس بنارس میں
پانچ ہزار علماء و مشائخ نے شمولیت کی۔ سنیوں کے بیس ہزار رہنما یعنی علماء و مشائخ سنی
کانفرنس کے رکن تھے۔ گویا اتنے رہنما تھے اور اتنی قوم تھی۔ کیا چودھری صاحب ہمیں یہ بتا
سکتے ہیں کہ مسٹر پرویز کی قوم کتنی تھی؟ اُس قوم کے کتنے حضرات نے پاکستان کے حق میں

وٹ دیے؛ پرویزی حضرات کے دوٹوں سے آیا مسلم لیگ کا ایک بھی مرکزی یا صوبائی اسمبلی کامبر کامیاب ہوا؛ اگر کوئی ایک بھی ایسا ہے تو اُس کا نام بتا دیا جائے ورنہ واضح کیا جائے کہ پرویز صاحب کا قیام پاکستان میں حصہ ہی کیا ہے؛ اگر کوئی حصہ ہو بھی تو مسلمانوں کا ان کے بیانات سے کیا تعلق؛ اگر کوئی ہندو یا سکھ یا عیسائی بھی پاکستان کی حمایت کرتا تو کیا اتنی بات سے وہ مسلمانوں کا رہنما بن سکتا ہے؛ ہرگز نہیں۔ اسی طرح مسٹر پرویز کے کاغذی بیانات کچھ بھی ہوں لیکن نہ مسلمان اُن کے ساتھ ہیں نہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں۔ جب تک وہ دائرۃ اسلام میں نہیں آتے اُس وقت تک مسلمانوں اور پرویزیوں کا معاملہ لکھ دیکھ دیکھ دیکھ دیکھ والا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ چودھری صاحب اور دوسرے پرویزی حضرات پر احقر کی یہ وضاحت گراں گزرے لیکن حقیقت کو چھپانا دین و ملت کی بدخواہی اور غداری ہے جسے یہ ناچیز ہرگز پسند نہیں کرتا۔

علمائے اہلسنت کی فہمائش

گاندھی علماء اور لیڈروں نے جب خوفِ خدا اور خطرۂ روزِ جزا ہی کو بھلا دیا تھا، ہندو کی خوشنودی پر سب کچھ قربان کر چکے تھے تو کسی رہنمائی کی فہمائش پر کب کان دھرنے لگے تھے۔ بُت پرست نوازی کے منازل طے کرتے ہوئے چودھویں صدی میں ایک پراسرار اور نرالا جہاد بھی ایجاد فرمایا۔ بقائے خلافت اور تحفظِ مقاماتِ مقدسہ کے نام پر وہ جہاد جاری کیا کہ جب پر وہ اٹھا تو صاف نظر آ گیا کہ یہ مشرکینِ ہند کی حمایت میں سوراج کی خاطر تحریکِ ترکِ موالات یعنی نان کو آپریشن سیکیم تھی۔ مولانا سلیمان اشرف مرحوم نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

عوامِ سیدیشی کا استعمال کریں یہ اُن کا جہاد ہے۔ اعزازی عہدے واپس کیے جائیں یہ انگریزی کام کرنے والوں کا جہاد ہے۔ کونسل کی ممبری چھوڑ دینا انریبل ہونے والوں کا جہاد ہے۔ سب سے بڑا جہاد طلباءِ انگریزی خول کے لیے ہے۔ وہ موجودہ نظامِ تعلیم کو جب تک نہ چھوڑیں گے مجاہدین میں اُن کا شمار قطعاً نہ ہوگا۔ ساری وعیدیں جو تارکینِ جہاد کے لیے ہیں ایک وعید

بھی اُن میں سے باقی نہ رہے گی جو طلباء پر صادق نہ آجائے۔ موجودہ نظام تعلیم کے ترک میں تاخیر و تدبیر بھی گناہِ کبیرہ ہے۔ والدین و اساتذہ کے استشارہ و استرخا کی بھی حاجت و فرصت نہیں۔

وہ جہاد جسے فرضِ عین کہا گیا تھا۔ وہ جہاد جس میں اولاد کو والدین اور زوجہ کو زوج کی اجازت کی حاجت نہ تھی۔ وہ جہاد جس کے لیے نفیر عام ثابت کیا گیا تھا۔ وہ جہاد جس کے معنوں کا کسی وقت شمار کیا گیا تھا۔ وہ جہاد جس کی صورت خاص آج تک غیر متعین تھی۔ وہ یہی مسئلہ نان کو آپریشن ہے۔۔۔ ہاں یہ ساری فتوے نویسی اور مجالس کی گرما گرمی صرف اسی لیے تھی کہ نوجوانوں کو والدین و اساتذہ سے سرکشی و تمرد پر اچھی طرح آمادہ کر دیا جائے تاکہ ملک میں ہنگامہ آرائی کے لیے ایک کافی تعداد پڑھے لکھے نا تجربہ کاروں کی ہاتھ آجائے۔“ لے

اس کے ساتھ ہی گاندھی جی کی سرکار سے ان حضرات کو ہجرت کا الہام ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا، اَمْتًا وَصَدَقْنَا کہہ کر عمل پیرا ہو گئے۔ ملازمتیں اور کاروبار چھوڑ دیے۔ مسلمانوں کی جائیدادیں ہندوؤں کے ہاتھوں کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگیں۔ مسلمانوں کو برباد کرنے کی یوں رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ مسلمانوں کی اس خانہ بربادی میں ہندوؤں کی خانہ آبادی تھی۔ یہ اُجڑ رہے تھے وہ بن رہے تھے۔ ہندو لیڈروں نے تو ایک تیر سے دو شکار کر لیے کہ اپنی قوم کو آباد اور مسلمانوں کو برباد کر دیا لیکن مسلمانوں کے لیڈروں کو غیر خواہ ملت کہا جائے یا بدخواہ؟ رہنما کہا جائے یا غدار ان قوم، جن علماء نے اس گاندھی جہاد (نان کو آپریشن) اور ہجرت برائے افادہ ہندو کو شرعی حکم کا لباس پہنایا، اسے آیات و احادیث سے مزین کر کے خدا اور رسول کا حکم بنا کر دکھایا انھیں خدا کے بندے کہا جائے یا گاندھی کے؟ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُمتی کہلانے کے حقدار ہیں یا دشمنِ اسلام و

مسلمین، بہت پرست گاندھی کے؛ اس صورت حال پر ایک خیر خواہ ملت کی نوحہ خوانی ملاحظہ ہو:

”بہاد اور ہجرت ان دونوں اہم و اعظم مسئلوں کو جس طرح اس دور کے علمائے سیاسی نے تباہ کیا ہے تاریخ اسلام اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ مسلمان ہند کا جو نقصان اس مدرس و کاذب نتوئی نویسی سے ہوا دیکھیے اُس کی اصلاح کیونکر ہوتی ہے اور کتنا زمانہ چاہتی ہے؛ علی الخصوص لفظ جہاد میں کچھ وہ برقی قوت تھی کہ اس کے سننے سے غیر مسلموں کو ٹھنڈا پسینہ آتا تھا اور مسلمانوں کے مردہ افسردہ قلوب میں حیات و تازگی۔

اس موقع سے قبل جب کبھی اور جہاں کہیں بھی یہ لفظ کہا گیا تو مثل دیگر کلمات کے اس نے اپنے تلفظ کو وہ ہوائے محیثت ثابت ہونے نہیں دیا جو ایک مرتبہ ٹکرا کر ہوا کی موجوں میں گم ہو جائے اور اس کڑا ارضی پر اُس کا نام بھی غیر قارہ اشیاء کی فہرست میں منسلک ہو جائے بلکہ جب کبھی یہ لفظ کہا گیا اور مسلمانوں کے کانوں تک پہنچا یا گیا ہے تو کفر و شرک کی بنیادیں ہل گئی ہیں مخلوق پرستوں اور خدا کے دشمنوں میں زلزلہ پڑ گیا ہے۔ تاریخ اقوام اور جغرافیہ ملی میں ہمیشہ ایک عظیم تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس لفظ جہاد کے کہنے اور سننے کے ایام صفحاتِ زمین پر ہمیشہ خون کی سُرخمی اور نوکِ سنان و شمشیر سے لکھے گئے ہیں۔

لیکن آج تم نے مسلمانوں کی اس سیزدہ صد سالہ عظمت کو اپنے قدموں کے نیچے روند ڈالا۔ آج تم نے سات کروڑ مسلمانوں کی دینی غیرت کو یوں ذیل و خوار کیا۔ دیکھو غیر مسلم قومیں تم پر ہنستی ہیں۔ نہ انگریزوں میں تمھاری ہیبت رہی نہ ہندوؤں میں تمھارا خوف رہا۔

تم اور تمھارا دین، تم اور تمھارا مذہب، تم اور تمھاری مذہبی تعلیم، تم اور تمھارے دینی احکام، سب کے سب نگاہِ غیر مسلم میں ہیج و فرد باہت ثابت ہوئے لیکن اس کی تمھیں کیا پروا جبکہ تقریباً ایک ملک کا خراج تمھارے گھروں میں پہنچ گیا جبکہ ہزاروں انسان تمھیں اپنے دوشِ عقیدت پر لیے لیے پھرے۔

جبکہ ہر روز شاہد دسترخوان سے کام و زبان نئی نئی لذتیں لے رہی ہیں ، تو پھر
ان نعمتِ خلدِ بریں کے مقابلہ میں اسلام کیا ہے اور ایمان کیا ؟

اے سرستانِ بادۂ بیدری ! ذرا ہوش میں آکر ہمیں بتاؤ کہ تم سوراج
کے لیے اٹھائے گئے تھے یا خلافت کے لیے تم نے ہندوؤں کو آمادہ کیا تھا ؟ تم
اسلام کی نشر و تبلیغ کا علم لے کر بڑھے تھے یا کفر و شرک کی حکومت قائم کرنے کی
غرض سے یہ لشکر آرائی کی گئی تھی ؟ اسلام کی حقانیت اور ارکانِ اسلام کا غیر مسلم کو
گرویدہ بنانا تمہارا نصب العین تھا یا خود کفر و شرک کے جال میں پھنس کر آزادی
ہند کا ترانہ سننا مقصود و مطلوب تھا ؟ لے

موصوف نے اس موقع پر اُس ہندو نواز اور زنا ر دوست ٹولے سے ایک سوال کیا جو ہر مسلمان
کے دل کی آواز ہے اور ان کی روش کے پیشِ نظر ہر خیر خواہ دین و ملت کے دل و دماغ کی گہرائیوں
سے اُٹھتا اور اُسے مضطرب کر کے رکھ دیتا تھا۔ وہ سوال حضرت علامہ ہی کے لفظوں میں ملاحظہ
فرمائیے :

”بہ سارے اعمال جو وقوع پذیر ہوئے اور ہو رہے ہیں ، ان سے ہندوؤں کے
مطالب و مقاصد مذہبی و ملکی کا تکملہ ہو رہا ہے یا اسلام اور اسلامی خلافت کی
خدمت انجام پا رہی ہے ؟ چوبیس کروڑ ہندوؤں کا قدم خلافتِ اسلامی کی طرف
بڑھایا اسات کروڑ مسلمانوں نے بڑھ کر سوراج اور مرا سم کفر و شرک کو لبیک کہا ؟
مسلمان ہندوؤں کے ہو گئے یا ہندو مسلمانوں کے ہو رہے ؟ مسلمانوں کے
”قلبِ آہنی“ تھے یا مقناطیسی ؟ مسلمانوں نے مقناطیس بن کر ہندوؤں کو اپنی
طرف کھینچا یا ہندوؤں نے اپنی مقناطیسی سے انھیں اپنے میں جذب کر لیا ؟
اس کا جواب واقعات سے ہونا چاہیے نہ خطیبانہ عبارت آرائی سے“ لے

موصوف نے ان حضرات کو کلمہ گوئی کا پاس لحاظ کرتے ہوئے ، اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی کا

ثبوت دیتے ہوئے بڑے درد بھرے انداز میں بالغ نظری سے اُن کی کثرت کا آل سمجھایا اور یوں نمائش کی ہے:

”علم بردارانِ نان کو آپریشن و سوراخِ اُقیامت ایک دن ضرور قایم ہوگی، جہاں اولین و آخرین کا مجمع ہوگا اور پھر لَعْنِ الْمَلٰٓئِکَ الْیَوْمَ۔ لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ کی دل کپکپا دینے والی آواز کے ساتھ تختِ ربِّ العالمین سامنے ہوگا۔۔۔۔ اُس دن تمہارے سرائے و مخفیات کھل جائیں گے۔۔۔۔ اُس دن تمہیں اُس جلیل و جبار، قادر و قہار کے سامنے جا کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔۔۔۔ تمہاری کیا حالت ہوگی اور تمہارے اِن اعمال کا ترازو کسے عمل پر کیا وزن ہوگا؟ خلافت اور دین کا نام لے کر سوراخ اور یقیناتِ گاندھی میں فنا ہو جانا کیا نتیجہ لانے کا۔۔۔۔ یقین کر لو کہ اُس روز تمہاری تلبیس کی چادر پارہ پارہ ہوگی اور تلبیس کا جال ریزہ ریزہ۔ یہی لیڈری اُس دن تمہیں وبال ہوگی اور یہ ہر دلعزیزی تمہیں رُسوا و خوار بنائے گی۔ آج وہ جھپٹوا نبوہ جس پر تمہیں ناز و تہنتر ہے، آج وہ ہنگامہ و ہجوم جس پر تمہیں اعتماد و سہارا ہے، کل بروزِ قیامت تم سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوگا۔۔۔۔ یہ گروہِ معتقدین، یہ مجمعِ ارادت مندان جو آج تمہیں اِس درجہ محبوب ہے کل بروزِ محشر تم اِس سے خفا ہو گے اور دست بردار۔ شامتِ اعمال کا وبال سامنے ہوگا اور یہ ہیکڑی خاک سیاہ۔“ ل

اِس گاندھی گردی کے دور میں مسلمانوں کے لیڈر کھلانے والوں اور گاندھی علما سے کیسے کیسے افعال و اقوالِ شنیعہ و فحیحہ سرزد ہوئے اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف یوں رقمطراز ہیں:

”لا الہ الا اللہ۔ گاندھی نے کس حُسنِ تدبیر سے مسلمانوں کو اپنا اور اپنے مذہب کا غلام بنا لیا۔ ایک برس بھی گزرنے نہ پایا جو حمایتِ خلافت سے نہ صرف ہندو دست کش ہو گئے بلکہ اِس عیارِ اندِ چال سے خود مسلمانوں ہی کے

ہاتھوں نے مسئلہ خلافت کو دھتکے دے کر پس پشت ڈال دیا۔ خلیفۃ المسیح اور امیر المؤمنین کی جگہ گاندھی کو دی گئی۔ اب یہ مدعیان اسلام اسی کی کوشش کر رہے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے گاندھی کی محبت و عظمت سے کوئی قلب مومن خالی نہ رہے۔ کوئی امام مہدی علیہ السلام کا ٹیل کہتا ہے۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر نبوت ختم نہ ہو گئی ہوتی تو گاندھی نبی ہوتا، یعنی نبوت کے ماتحت جو سب سے بڑا رتبہ و منصب ہو سکتا ہے وہ گاندھی کا ہے۔ کوئی اپنے کو پس رد گاندھی کا کہتا ہے اور اسلام کی نجات کا اسی کے ہاتھوں سے یقین رکھتا ہے۔ مسلمان اپنے کانوں سے سنتے ہیں، آنکھوں سے اخبارات میں یہ مضامین دیکھتے ہیں، پڑھتے ہیں، پھر بھی عالم وجد و تواجد میں آکر وہ ہمارے لیڈروا شاہد باش ہمارے لیڈروا کی رٹ لگائے جاتے ہیں۔ لے

فخر السنت، خیر خواہ دین و ملت، علامہ سلیمان اشرف رحمۃ اللہ علیہ نے ان حضرات کی گمراہی اور اقوال شنیعہ کا تذکرہ کرتے ہوئے بارگاہِ مجیب الدعوات میں یوں دست دعا دراز کیے تھے :

”انتہائی بد نصیبی یہ ہے کہ آج اُس دینِ حنیف اور ملتِ بریضا کے نہ صرف پیرو بلکہ اس مذہب کے عالم و علامہ ہونے کے مدعی اور علم کے ساتھ کسی سلسلہ طریقت کے شیخ ہونے کا جو ادعا رکھتے ہیں، جن کے ہاتھوں پر سیکڑوں مسلمان بیعت طریقت کر کے وصول الی اللہ کی راہ پانا چاہتے ہیں، آج وہ ہیں کہ صرف لفظوں میں یہ کہہ رہے ہیں کہ :— گاندھی مذکور ہے — پس رو گاندھی کا ہوں — گاندھی کو اپنا رہنما بنا لیا ہے — اسلام کی نجات گاندھی کے ہاتھوں سے ہوگی — لا الہ الا اللہ۔ ان مدعیانِ علم نے لقد کان لکمْ فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کی جو تفسیر کہ اس وقت اپنے اقوال و افعال سے

کی ہے، اُس سے اسلام اور اسلام کی تعلیم بزار ہے۔ حق سبحانہ انہیں ہدایت فرمائے اور ان کا کھویا ہوا ایمان پھر انہیں مرحمت فرمائے بحرمتہ النبی والہ الامجاد! لے
 رحمت علامہ مولانا سلیمان اشرف بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دیدہ و در کی طرح ان حضرات کی
 کرامت اور اقوال شنیعہ کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیتے ہوئے مزید فہمائش کی اور خیر خواہی کا
 ادا کرتے ہوئے مال سمجھایا ہے۔ آپ کے یہ ایمان افروز الفاظ گاندھی صوفی حضرات کے لیے
 براہِ انبیل اور منصف مزاج کے لیے لمحہ فکریہ ہیں۔ موصوف رقمطراز ہیں:

”میدان اخبار بجنور ۲۱ فروری ۱۹۲۰ء میں مسٹر شوکت علی کی تقریر شایع ہوئی تھی اُس
 کے دو فقرے نقل کرتا ہوں: زبانی بچے پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ اگر تم
 ہندو بھائیوں کو راضی کرو گے تو خدا کو راضی کرو گے۔ بھائیو! خدا کی
 رستی کو مضبوط پکڑو۔ اگر ہم اس رستی کو مضبوط پکڑ لیں گے تو چاہے دین ہمارے
 ہاتھ سے جاتا رہے مگر دنیا ہمیں ضرور ملے گی۔“

یہ فقرات جہاں یہ بتا رہے ہیں کہ مطہر نظر ان حضرات کا کیا ہے ،
 مذہب کی حقیقت اور وقعت ان کے نزدیک کس قدر ہے ، دین و مذہب کا نام
 کیوں لیا جاتا ہے ، وہاں یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہندو کے ساتھ انہیں کیسی عقیدت
 و ارادت ہے۔

چنانچہ جیلٹہ جمعیتہ العلماء میں جس کا انعقاد بہ ماہ نومبر دہلی میں ہوا ، مسٹر
 شوکت علی نے صاف الفاظ میں یہ کہا: — ”اے اللہ! ہم سے ایک نیک
 کام ہو گیا ہے کہ میں اور مہاتما گاندھی یعنی بھائی ہو گئے ہیں۔“ (فتح دہلی، ۲۴ نومبر
 ۱۹۲۰ء) پھر ایک عالم نے یہ کہا: — ”خدا نے اُن (گاندھی) کو ہمارے
 واسطے نڈر بنا کر بھیجا ہے ، قدرت نے اُن کو مدبر بنا کر بھیجا ہے۔“ (فتح دہلی،
 ۲۴ نومبر ۱۹۲۰ء)۔

ایمان سے کیے، یہ جمعیت العلماء ہے یا امت گاندھی کا حلقہ؟ یہ اسلام اور شارع علیہ السلام کی طرف اللہ کے بندوں کو دعوت دے رہی ہے یا گاندھی کی نبوت تسلیم کر رہی ہے؟ یہ حضرات اسلام کی ہمدردی میں انگریزوں سے لڑنا چاہتے ہیں یا دین گاندھی کی حمایت میں؟ پھر اگر کسی نے ان کی بات نہ سنی تو کافر، منافق، یزیدی، ملعون اور جہنمی کیونکر ہوا؟

لیڈران قوم! آج اخبار و جرائد تمہارے ہاتھوں میں ہیں، جسے چاہو گالیاں دو، کافر کہو، حق کو باطل اور باطل کو حق کہو اور چھاپ کر شائع کر دو۔ اس وقت تو تمہاری بات بن آئی ہے، مخلوق اندھی ہو گئی ہے لیکن ایک وقت آنیگا اور ساری حقیقت نمایاں ہو جائے گی۔

میدانِ کربلا میں یزیدیوں نے بعد شہادتِ شہزادہ کونین سیدنا امام حسین علیہ السلام فتح کے تقارے بجائے، دو دمانِ نبوت کو جس طرح چاہا، اسیر کیا۔ لیکن آج دنیا دیکھ رہی ہے کہ یزیدیوں پر خدا نے ایسی لعنت بھیجی کہ آج تک اُس کا سلسلہ منقطع ہوا نہ قیامت تک منقطع ہو۔ اس وقت اہل حق کے مقابلہ میں تمہیں اپنے انبوه پرناز ہے، جسے چاہتے ہو عوام سے فضیلت دے سوا کرات نہ ہو۔ اہل حق فصیح و جمیل کہہ کر ضبط کر جاتے ہیں۔

اہل حق کے مقابلہ میں مثل یزید دعویٰ اجماع پیش کرتے ہو؟ صریح نصِ قرآن اور نصِ حدیث کی مخالفت اور پھر اجماع کا دعویٰ کیا احکامِ قرآن کا نسخ اجماع سے جائز ہے؟ اور پھر اجماع بھی ایسے علماء کا جن کے پاس خدا نے گاندھی کو نہ کرنا کر بھیجا ہے، جو علماء پس رو گاندھی ہیں۔ جس طرح قرآن مجید تو ریت و انجیل کا نسخ ہے اُسی طرح گاندھی کا فرمان آیاتِ الہیہ کا نسخ ان مدعیانِ علم و اجتہاد کے عقیدہ میں ہے۔ ایسے نجس و ناپاک عقیدے کا اظہار کرتے ہوئے کچھ تو شراب پیے الحیاء شعبۂ من الایمان۔

یزیدیوں نے جب یزید کی امامت و خلافت کا علم بلند کیا تو اہل حق کے

مقابل میں انھوں نے یہی دلیل پیش کی تھی کہ سارے ملک نے یزید کی امامت تسلیم کر لی، اجماع ہو گیا، صرف چار شخص ہیں جو اُس کی امامت تسلیم نہیں کرتے یعنی عبدالرحمن بن ابوبکر، عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عمر اور سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہم۔ دیکھتے ہو وہ اجماع یزید کی امامت پر ہوا تھا، کیسا خائب و خاسر ہوا؟ عبرت پکڑو اور اہل حق کو گالیاں دینے سے باز آؤ۔ اُن کی تکلیف اور اذیت رسانی سے اپنے ہاتھ اور زبان کو منع کرو۔ تمہارے دشنام دہی کی یہ ہمہ گیری ہے کہ جہاں تم نے ایک رکن دین، حامی شرع متین، امام اہلسنت، مجدد مائتہ حاضر، مؤید ملت طاہرہ پر سب و شتم کیا وہاں اس فقیر بے نوا کو بھی بار بار متعدد جرائد میں تم نے گالیاں سنائیں۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟ بیشک یہ قصور ہوا کہ جس وقت ساری زبانیں گنگ تھیں مجھ کو گھڑکار کی زبان کلمہ حق کہہ رہی تھی، جس وقت سارے اقلام خشک تھے مجھ بے بضاعت کا قلم مصروف تحریر تھا، جس وقت سارے پاؤں مفلوج تھے مجھ ضعیف کا پاؤں منزل رساں راستہ پر تھا۔ انصاف کرو اس میں میری کیا خطا ہوئی؟

یہ تو اللہ کا فضل تھا۔ تم ہلالِ احمر کے نام سے چندہ وصول کرتے تھے اور وادعیش و نشاط دینے تھے۔ زرکشی کے لیے جس طرح کے مضامین ضروری تھے تم انھیں کو لکھتے، انھیں کو کہتے تھے لیکن اس فقیر کو خلافت کی کو لگی تھی، اس لیے ترکوں کی مختصر تاریخ پھر اُن کی خلافت، اُن کی اطاعت اور اُن کے حقوق دہان کے ساتھ لکھ کر مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیے۔ دیکھو فقیر کا رسالہ ابلاغ۔ تمہیں مسئلہ خلافت کی اب اگر جو دھن بھی بندھی تو ایک کافر کے تذکرہ و تلقین سے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کی جگہ سوراخ نے خلیفۃ المسالین سے کہیں ارفع و اعلیٰ مقام گاندھی نے اور شیخ الاسلام کا لقب شیخ الہند نے لے لیا۔

اُسی زمانے میں گاندھوی حضرات کے غیر اسلامی نعروں سے متعلق دہلی کے مروّجی آگاہ سے اُن کا شرعی حکم دریافت کیا گیا۔ وہ سوال اور حضرت مفتی اعظم دہلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایمان افسر و جواب ملاحظہ ہو :

سوال نمبر ۲۳۸

ایک شخص مسلمان جو پہلے انجمن اسلام کا ممبر تھا اب کانگرس میں شامل ہو کر نعرہ ہائے مندرجہ ذیل لگا کر تا ہے : — مہاتما گاندھی کی جے — بھارت ماتا کی جے — بندے ماترم وغیرہ۔ کیا ایسے شخص سے میل جول رکھنا اور اُس کے پیچھے نماز پڑھنا اور موسّٰی تعلقات رکھنا درست ہیں یا نہیں ؟ بینیٰ توجہ واد۔

مستفتی : — احمد رضا خاں

ایس۔ پی۔ ڈبلیو۔ آئی ریٹائرڈ

ہوالموفق

گاندھی کو مہاتما کہنا اور اُس کی فتح کے نعرے لگانا شرعاً ناجائز و حرام ہے کہ مہاتما کے معنی ہیں رُوحِ اعظم اور رُوح کا اطلاق قرآن پاک میں جان پر بھی آیا ہے اور وحی پر بھی اور حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ السلام کو بھی یہ لقب عطا ہوا ہے اور حضرت جبرئیل علی نبینا وعلیہ السلام کو بھی۔ پس ان معانی و القاب پر نظر کرتے ہوئے اس کے یہ معانی ہوں گے کہ تمام جانوں میں بڑی جان یا حق تبارک و تعالیٰ کی حیوں میں بڑی وحی یا حضرت عیسیٰ و حضرت جبرئیل علی نبینا وعلیہم السلام سے بلند مرتبہ۔

اب مسلمان خود ہی غور کر لیں کہ جس لفظ کے یہ معانی ہوں اُس کو ایسے شخص کے لیے جس کو نصوص قطعیہ : لیل سے دلیل بتایا گیا ہو کیونکہ استعمال کیا جاسکتا ہے ؛ اسی طرح کفار کی شان میں ارشاد ہوا :

ان یتفقو کہ یکونوا لکم اعداء یعنی اگر کفار تم پر تباہ پائیں گے تو تمہارے

وَيَسْطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ
وَالسِّنَنُ بِالْسُوءِ وَدُوا
لَوْ تَكْفُرُونَ ۝

دشمن ہو جائیں گے اور تم پر دست درازی
اور زبان زور کریں گے اور وہ چاہتے
ہیں کہ (ان کی مانند کسی طرح) تم بھی
کافر ہو جاؤ۔

چنانچہ اس کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے کہ جب کبھی بھی ان کو قوت میسر آئی مسلمانوں کا تباہ
کرنا اُن کا پہلا فرض رہا۔ اسی تحریک میں ملاحظہ کر لیجئے کہ باوجودیکہ ابھی کامیابی کی جھلک بھی
نہیں دکھلائی دی ہے لیکن ابھی سے یہ کتنا شروع کر دیا ہے کہ، گاندھی جی کی بجے کے مقابل
اللہ اکبر کے نعرے نہ لگاؤ۔ وہ زمانہ گزر گیا جس میں ہم خاموشی کے ساتھ یہ نعرے سُنتے رہے ،
اب ایسا نہیں لگا سکتے۔ ”دو روز ہوئے کہ جمعیتہ افغانہ چوموں (ریاست جے پور) کا ایک خط
موصول ہوا جس میں انھوں نے کلمہ کیٹیاں بنانے کی استدعا کی ہے اور تحریر کیا ہے کہ :
”یہاں کے مشرکین عام طور پر فقارہ کی چوٹ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان اب تو کلمہ
ہمارے روبرو نہیں پڑھ سکتے۔ وہ دن دور ہوتے جب وہ ایسے نادان اور
بودے تھے کہ اس کلمے کے سُنے کی تاب لا سکتے تھے۔ اب اُن کو سمجھ آ گئی۔
یہ کلمہ تو ہندو دیوتاؤں کی شان میں گستاخی ہے۔ اس کو پکارنا ہے تو مکہ،
مدینہ چلے جاؤ، ہمارے دیس میں اس کا کیا کام؟ (انتہی بلفظہ)

اب شاید یہ کہا جائے کہ یہ تمام ہندو کے اقوال نہیں، ان کا کیا اعتبار؟ تو پھر ذمہ دار کا قول
لیجیے، رسالہ شدھی سماچار مورخہ ۵ جون ۱۹۳۰ء میں ہجارت شدھی سبھا (دہلی) کے
جنرل سیکرٹری نے شدھی اور سورااج کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے اُس کا ترجمہ بعض اخبارات
نے چھاپا ہے، جس کے چند الفاظ یہ ہیں :

”بہیں تو جہاں حصول سورااج کے میدان میں لڑائی کرنا منظور ہے وہاں ہم
اُن کو دھوکا دے کر قتل کرنے والوں اور پڑوسی لیٹروں سے بھی اپنے گھر کی
حفاظت کریں گے جو سر ڈال کر، چھپ کر ہمارے گھر میں نقب لگانے کی
تاک میں بیٹھے ہیں۔“

غرض اس حالت کو دیکھتے ہوئے اس تحریک کی فتح یا بی (کہ وہی گاندھی کی فتح ہے) کے لیے نعرے لگانا اپنی بربادی پر نعرے لگانے کے معنی میں ہوگا اور یہ یقیناً حرام ہے۔ بھارت ماتا کی بجائے اور ہندو ماترم کے معنی اگر صرف مادر ہند کی فتح ہی کے ہیں، تب بھی چونکہ یہ مشرکین کے خاص قومی نعرے ہیں اور ان کے شعائر سے ہیں اس لیے مسلمانوں کو ان نعروں میں بھی شرکت کرنا شرعاً جائز نہیں ساخیہ التشبیہ الکفار وهو ممنوع۔ فقط

محمد مظهر اللہ غفر اللہ له

امام مسجد فتحپوری دہلی (۱۹۳۰ء)

اس فتوے کا ہر لفظ کتنا ایمان افروز اور رہنمائی کے جذبات سے بھرپور ہے لیکن افسوس! گاندھی جی حضرات مشرکین ہند کی محبت میں کچھ ایسے سرشار ہو گئے تھے کہ کسی کی آواز پر کان دھرنا اپنی توہین سمجھنے لگے۔ اس کے برعکس ان کی تمام تر یاتیں اور صلاحیتیں ہندو مسلم اتحاد کی خاطر وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ چنانچہ مسلم لیگ کے صدر محترم عالی جناب حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نے ترک موالات پر زور دیتے ہوئے اپنی دیانت داری کا یوں مظاہرہ کیا:

”حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب نہایت غیظ و غضب اور پرجوش لہجہ میں ناتمام عبارت ابن جریر کی نقل فرما کر یہ نتیجہ استخراج فرماتے ہیں کہ: ”اگر اس کے بعد بھی یہ کہا جائے کہ ہمیں مسلمانوں کو ہندوستان کی دوسری قوموں کے ساتھ بھی ترک موالات کرنی چاہیے تو اب کہنے والوں کو خدا ہی بہتر سمجھا سکتا ہے۔“ (خطبہ صدارت مجلس استقبالیہ جمعیتہ العلماء ص ۱۵) طرفی یکہ بز واقساط کا صحیح ترجمہ خود بالائی سطروں میں حکیم صاحب نے احسان و انصاف تحریر فرمایا ہے لیکن استخراج نتیجہ میں موالات کو بز واقساط کا مراد قرار دے کر عوام کو نہایت شرمناک دھوکا دینے کی کوشش کی ہے“ ۱

موصوف کی اس کتر بیونت کا یعنی کلام الہی میں معنوی تحریف کا علامہ سلیمان اشرف بہاری

رحمۃ اللہ علیہ نے تعاقب کرتے ہوئے تفسیر ابن جریر کی عبارت کو مد نظر رکھ کر، یوں گاندھویت کا کھوٹ سمجھایا تھا:

”جن چیزوں کو ابن جریر نے آیت کریمہ لا یَتَّخِذُ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِیَاءَ کی تفسیر میں مولات کہہ تھا ان میں سے کسی ایک کی بھی اجازت و رخصت آیت لا ینہاکم اللہ الخ سے نہ سمجھی نہ لکھی، بلکہ ان کی ممانعت کی۔ اس مقام پر پھر تصریح فرما کر ہر کافر کے ساتھ ہر حال میں ترک مولات پر مہر فرمادی۔ کیا اب بھی حکیم صاحب یہی ارشاد فرمائیں گے کہ بڑا قساطرادف مولات ہیں؟ ان تصریحات کے بعد بھی اگر حکیم صاحب یا ان کے حواریین علمائے سیاسی اپنے اس قول پر کہ ہندوؤں سے مولات یا وادیا محبت منطوق کلام الہی اور موافق تعلیم نبوی ہے، متعصبانہ اصرار فرمائیں تو جوہر گاندھی صاحب کے اور کوئی انھیں سمجھا نہیں سکتا، لے

حضرت بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے حضرات کی مبت پرست نوازی اور زناہ دوستی پر افسوس کرتے ہوئے انھیں شاہراہ اسلام و ایمان سمجھانے کی، ایک حقیقی خیر خواہ بن کر بڑے درد بھرے دل سے کوشش کی اور اپنے قلبی جذبات کو صفحہ قرطاس پر سجا کر یوں گاندھی حضرات کے سامنے پیش کیا:

”اے پرستاران ہندو! کبھی ایمان کی قوت اور اسلامی اخلاق کی کشش بھی تم نے دیکھی ہے؟ کبھی تم نے کلمہ توحید جس دل پر نقش ہو اُس کے نعرہ تکبیر کے زور و طاقت کا خیال بھی کیا ہے؟ تمہاری مادی آنکھیں کفار کی جمعیت دیکھ کر پتھر اگئیں۔ تمہارے مادی دماغ کفار کی قوتِ فکریہ سے لرزاں و ترساں ہو گئے۔ لیکن کیا تمہارے پاس کبھی کچھ ایمان کی بھی پونجی ہے؟ میری دلی دعا ہے کہ اس کا جواب تم اثبات میں دے سکو، پھر میں تم سے یہ کہوں کہ ایمان

کے نور سے توجید و خدا پرستی کے زور و قوت کا نظارہ کرو تو تمہیں اصلی شاہراہ عمل معلوم ہو جائے۔ میری دردمندانہ گزارش تھمتب اور ہٹ دھرمی سے یکسو ہو کر سنو۔ اس وقت سیاسی مفتیوں نے الہامات گاندھی سے متاثر و مستفیض ہو کر موالات کی جو تعریف بیان کی ہے اور جن چیزوں کو مصداقِ موالات قرار دیا ہے وہ محض اتفاق گاندھی کی تعمیل ہے، اس کا نتیجہ حقیقی اسلامی خدمت سے تغافل و بے پروائی ہے۔

ایک مقام پر آپ نے مسلمانوں کے لیڈر کہلانے والوں اور گاندھیوی علماء کو زور دار لفظوں میں غیرت دلاتے ہوئے اُن کی لیڈری اور علامگی کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

”اے گروہِ ناخدا ترس! اے جماعتِ علمائے سوء! یوں کہو کہ یہ احادیث اور یہ حکمِ الہی تو آج تک تمہیں نسیا منسیا ہے اس لیے کہ تمہارا رہبر اور تمہارا مذکر گاندھی ہے۔ آج تک اُس نے تمہیں یاد نہ دلایا تو پھر تمہیں یاد کیونکر آئے؟ اگر قرآن شریف یا کتب احادیث و سیرِ تمہارے رہبر و مذکر ہوتے تو تمہیں سب کچھ یاد آجاتا۔ فی الحقیقت تم معذور ہو، تمہارا مرتبہ عوام کا ہے، تمہارے دماغِ علوم سے خالی، تمہارے سینے جذبات سے کورے، تمہارے قلوب دولتِ ایمانی سے مفلس، تمہاری زبانیں گنگ اور تمہارے اقلام خشک۔ تم تو ایک قالیب بے جان ہو۔ جو تمہارے لیڈر کہتے ہیں تم اُسی کی محاکات کر دیتے ہو اور اُن لیڈروں کا منبعِ فیض سرکارِ گاندھی اور اُن کی ہنود پارٹی ہے۔ سلسلہ یوں ہے کہ ایک تحریکِ مسٹر گاندھی پیش کرتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمان اُسے لبیک کہتے ہیں، علماء سیاسی کا جتہ و عمامہ اُسے شرعی جامہ پہناتا ہے۔ ان علماء کی یہ مجال نہیں کہ وہ بطور خود کوئی تحریک پیش کر سکیں یا کسی تحریک کے سامنے آتنا و صدقنا کے سوا کوئی آواز بلند کرنے کی جرأت

۱۳۴۹ھ / ۱۹۳۰ء میں بنارس کے مسلمانوں پر رمضان المبارک میں جمعیتہ العلماء ہند کے خداوندانِ نعمت یعنی مشرکین ہند نے ایک قیامت برپا کر دی۔ سفاکی کے تمام مرحلے طے کر دیے گئے لیکن ہندو مسلم اتحاد کا راگ الاپنے والے گاندھوی علما سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ان کی ہمدردی میں ایک لفظ بھی منہ سے نکالتے۔ اپنے پروردگاروں کی بارگاہ میں تو اپیل کرتے کہ سرکار! ہم تو آپ کے بندہ بے دام ہیں، ذرا ظلم و ستم ڈھاتے وقت ہماری مخلصانہ فدائی کا کچھ تو لحاظ فرمایا کیجیے۔ ہندو لیڈروں حتیٰ کہ گاندھی تک مسلمانوں کی ہمدردی یا ہنر بے بہبود کو سمجھانے پر ایک منٹ بھی صرف کرنا تصبیح اذقات شمار کیا، بلکہ اس گاندھوی ٹولے کے پاس خاطر سے جھوٹ موٹ بھی ایک لفظ تک ہمدردی کا منہ نہ نکالا۔ ان حالات میں آج العلماء مفتی محمد نعیمی رحمۃ اللہ علیہ درو بھرے دل سے جمعیتہ العلماء ہند کے سنگدل اور ملت فروش صاحبانِ جتہ و دستار سے سوال کرتے ہیں،

"ہندوؤں کا کلمہ پڑھنے والی جمعیتہ العلماء کو کچھ خبر ہے کہ رمضان المبارک ۱۳۴۹ھ میں بنارس کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنا ڈالی۔ ماہ مبارک اُن کے لیے محرم بن گیا۔ درندہ صفت ہندوؤں نے بے گناہ مسلمانوں کو اس بے رحمی سے شہید کیا جس کے تصور سے دل کانپتا ہے۔ گھر کے گھر صاف کر دیے۔ بچے تک قتل کر ڈالے۔ مسجدیں مسمار کر دیں۔ دکانیں ٹوٹ لیں۔ ظلم و ستم کا سیلاب اُمنڈتا چلا آتا ہے۔ جو روح جفا کے سمندر میں طغیانی تھی۔ مسلح ہندو گنڈاسوں اور بھالوں سے بے خبر نہتے مسلمانوں پر بلائے ناگہانی بن کر ٹوٹ پڑتے تھے۔ دھوکے دے دے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے محلے میں لے جا کر شہید کرتے تھے۔ جمعۃ الوداع کی نماز تک مسلمان اس مصیبت کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔

مسلمانوں کی اس مصیبت کا جمعیت العلماء کو کچھ درد ہوا؛ جمیعت کچھ حرکت میں آئی؛ ہندو پرستانہ جذبات کچھ بھی سرد ہوئے؛ ہندوؤں کے فدائی اپنی بے جا فداکاری پر کچھ بھی نادم و شرمندہ ہوئے؛ آئندہ کے لیے انھوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے ہوشیار رہنے اور اپنا تحفظ کرنے کا کوئی مشورہ دیا؛ یا اپنے ہندو خداوندانِ نعمت سے کوئی اپیل کی؛ جن کے قدموں پر سر جھکاتے ہیں اُن سے ہندوؤں کے ان مظالم کی کچھ شکایت کی؛ اپنے قبیلہ و کعبہ کا مذہبی کو لیجا کر بنارس کے مقتل کی سیر کرائی؛ ہندو لیڈروں سے جن کی غلامی کیا کرتے ہیں ان ہولناک مظالم کو روکنے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کے نقصانات کی تلافی کرنے کی کوئی تحریک کی؛ یا ہندو لیڈر اس جمعیت العلماء کی فداکاری کی قدر کر کے مسلمانوں کی دلجوئی کرنے بنارس گئے؛ یا انھوں نے ہندوؤں کی ان امن سوتہ خونخواریوں پر اظہارِ نفرت و ملامت کیا؛ عدم تشدد کا وظیفہ پڑھنے والے لگانے دیئے ہندوؤں کے اس ہولناک تشدد پر کوئی مؤثر کارروائی کی؛ تمھاری ہمدردی میں ہندوؤں نے کچھ کیا ہو تو بتاؤ؛ یا انھوں نے تمھاری عنایات اطاعت شعاری کو بے التفاتی سے ٹھکرا دیا؛ مسلمانوں کے خون کی قیمت اُن کی نظر میں کچھ بھی نہ ٹھہری؛ پھر بھی تمھاری غیرت تمھیں ہندو پرستی کی اجازت دے گی؛ اب بھی تم ہندوؤں کے غلام بنے رہو گے؛ اب بھی تمھاری آنکھ نہ کھلے گی؛ اب بھی مسلمانوں کو ہندوؤں کی اطاعت و فرمانبرداری کی دعوت دیا کرو گے؛ کہو اب بھی تمھارا نشہ اُترا یا ہندوستان میں ہر جگہ ایسی ہی بربادی دیکھنا چاہتے ہو؟ لے

بنارس کے بعد ہندوؤں نے مرزا پور، آگرہ اور دیگر کتنے ہی مقامات پر مسلمانوں کا قتل عام کیا۔ لیکن کسی ہندو لیڈر نے افسوس کا ایک لفظ نہ کہا، نہ اپنی قوم کو سمجھانے کا کوئی وعدہ

ہو گیا۔ اس کے باوجود مسلمانوں کے لیڈر بننے والوں اور گاندھی جی علماء کی زنا دوستی اور بت پرست
 لڑائی میں سب موقوف نہ آیا۔ اس صورت حال کے پیش نظر مولانا قاضی احسان الحق نعیمی رحمۃ اللہ
 علیہ کے قلبی جذبات لفظوں کی صورت میں یوں صفحہ قرطاس پر بکھر گئے :

”بنارس کے دلدوز واقعات اور مسلمانوں پر ہندوؤں کے خونخوار حملوں نے جو
 طوفان برپا کیا تھا ابھی وہ پورے طور پر ساکن نہ ہونے پایا تھا کہ نواح بنارس
 و مرزا پور و آگرہ سے غوغا ہنگاموں کی اطلاع ملی۔ ہندوؤں کے نیزے تیر و سنان
 مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہندوستان کی جیو ہتیا نہ کرنے والی قوم
 مسلمانوں کے خون بہانے پر تکی ہوئی ہے اور اس کی آتش غیظ کے تند و تیز
 شعلے بڑے زور سے بھڑک رہے ہیں۔ ہندو لیڈر اور چند ہندو پرست مسلم نما
 مسلمانوں کو ہندو مسلم اتحاد کا سبز باغ دکھا کر مغالطہ میں ڈال رہے ہیں مسلمانوں
 کی جان پر بنی ہوئی ہے، اُن کے زن و فرزند قتل کیے جاتے ہیں، مال لوٹے
 جاتے ہیں، گھر بار برباد کیے جاتے ہیں، مسجدیں مسمار ہوتی ہیں، مگر کوئی لیڈر
 صاحب پلیٹ فارم چھوڑ کر ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگاتے ہوئے مسلمانوں
 کے قتل میں نہیں پہنچتے اور ہندوؤں کو اس درندہ و ش سفاکی، جفا جوئی سے
 نہیں روکتے۔ اگر درحقیقت یہ قوم مسلمانوں کے ساتھ کچھ بھی ارادہ اتفاق
 رکھتی تو اپنے ہم قوموں کی ان ہنگامہ آرائیوں و جفا شعاریوں کو روکنے کے لیے
 میدان عمل میں آتی۔ گاندھی صاحب مزے مزے کی تقریروں میں مصروف ہیں
 اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے ایسی باتیں کہہ رہے ہیں جیسی باتیں بنیوں نے
 ہمیشہ بنا بنا کر مسلمانوں کا دیوالیہ کر دیا۔ ہمیں اس وقت یہ دیکھنا ہے
 کہ ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار گاندھی ہندوؤں کے ان مظالم کو دیکھ کر کیوں
 نہیں گھبرا اٹھا اور اس نے اپنی قوم کو جا کر عدم تشدد اور شانتی کا درس کیوں
 نہیں دیا؟ آج وہ اپنے اس رٹے ہوئے سبق کو کیوں بھول رہا ہے اور ہندو
 قوم کو خونخواری سے روکنے کے لیے میدان عمل میں پہنچنے کے واسطے اس کا

قدم کیوں نہیں جنبش کرتا؟ کیا ایسے ہی شخص کو مسلمانوں کا ہمدرد، ملک کا خیر خواہ، امن کا حامی کہا جاسکتا ہے؟ لے

ہندو کی بے وفائی، محسن کشی، خود غرضی اور عیاری ایک ایسی مسئلہ حقیقت ہے جس کا ہمیشہ مظاہرہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کے باوجود جو حضرات ہندوؤں کے بندہ بے دام اور ہاتھ جوڑ کر غلام بنے اُن کی قلت فرشتی میں کون سے انصاف پسند اور صاحبِ عقل و دانش کو شبہ ہو سکتا ہے؟ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۱۳۶۷ھ/۱۹۴۸ء) نے ہندو بے بہنو اور گاندھی صوفی علماء کی ذہنیت کا یوں تجزیہ کیا ہے :

”ہندوؤں کی بے وفائی کا ایک دو مرتبہ نہیں، دس مرتبہ نہیں، ہزار مرتبہ نہیں، روزمرہ ہر کہیں تجربہ ہو رہا ہے۔ اُن کا بچہ بچہ مسلمانوں کی عداوت و ایذا رسانی کے خمار میں مست و سرشار ہے۔ سلطنتِ اسلام کے عہد میں شاہانِ اسلام کے مراجعِ خروانہ اس قوم کے حال پر مبذول رہے، انھیں تعلیم دی، علم سکھایا، شائستہ بنایا، وزارتیں دیں، عہدے اور منصب دیے، جاگیریں دیں، انعام و اکرام کیے، جن کے اثر آج تک باقی ہیں۔ لیکن اس قوم کی محسن کشی و غداری اُس زمانے میں ہی نہ شرعاً اور عنایات و اکرام کے سامنے ممنونِ احسان ہو کر خمیدہ سر نہ ہوئی۔ پروپیگنڈے، ریشہ دوانیاں، بداندیشی و بدخواہی ان کی طرف سے ہمیشہ جاری رہی۔ اچھے سلوکوں کا انھوں نے ہمیشہ بُرا بدلہ کیا اور اُس محسنِ سلطنت کو نیست و نابود کرنے کی فکر میں ہمیشہ لگے ہی رہے مگر غلامانہ ذہنیت کے ساتھ دشمنی پر دوستی کا اور بدخواہی پر خیر خواہی کا، غداری پر وفاداری کا پردہ ڈالے رکھا۔ سلطنتِ اسلام کے بعد سے آج تک بھی ان کا یہی طریقہ عمل ہے۔

وہ مسلمانوں کو نجس و ناپاک سمجھتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ کی چھوٹی ہوئی چیز

پلید جانتے ہیں۔ جب نفرت کا یہ عالم ہے تو ایذا رسانی سے وہ کس طرح صبر کر سکتے؟ آدمی جس چیز کو ناپاک سمجھتا ہے اُس کو دفع کرنے پر اُس کی طبیعت مجبور ہوتی ہے۔ اس لیے ہر قرن اور ہر زمانہ میں ہندو طرح طرح کے جیلوں اور تادیبوں سے مسلمانوں کو مٹانے میں کوشاں رہے۔ اب سے دس سال قبل جب ہندو مسلم اتحاد کے علم بلند کیے گئے اور مسلمان جاہل خود رائے لیڈروں کے اغواء سے ہندوؤں پر فدا ہو رہے تھے۔ جوشِ محبت میں بہت سی ناکردنی حرکات کے مرکب ہوئے، ہندوؤں کو مسجدوں میں بلایا، منبروں پر بٹھایا، پیشانیوں پر قشقے لگائے، چہروں پر گلاب لگوائے، ہولکیوں میں خاک اڑائی، ہندو مردوں کی ٹکلیاں اٹھائیں، بچے کے نعرے لگائے، قربانی کی گائیں گوتسالوں میں پہنچائیں، کشت گمان امیرسر کی ہڑتالیں کیں، انھیں شہید بنایا، سب کچھ کیا، مگر ہندوؤں نے ستم رانی کی خصلت نہ چھوڑی، اُن کی جنما کاریوں میں فرق نہ آیا۔ آ رہ، شاہ پور اور کٹار پور کے مظالم سے بھی سیر نہ ہوئے۔ ملک بھر میں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں، مسجدوں کی بے حرمتی کی، نمازوں کے وقت مسجدوں کے سامنے باجا بجا کر مسلمانوں کو تنگ اور آزدہ کیا۔ اس حسد سے مار دھاڑ شروع کی، ہزار ہا بیگناہ مسلمانوں کو قتل کر ڈالا، لوٹ لیا، گھروں کو آگ لگا دی، جلتی آگ میں مسلمانوں کو ڈال کر چھونک دیا۔

تعلخ تجربے ہونے کے بعد کون مسلمان تھا جو ہندوؤں سے اُمید و فاکر؟ اُمید خیر خواہی رکھتا؟ تمام ملک کے مسلمان ان کے دستِ ستم سے نالاں تھے، ان کی حکومت پر کیسے راضی ہوتے؟ اس لیے موجودہ زمانے کی تحریکات کانگرس میں مسلمان بالکل علیحدہ رہے۔ ان کا کوئی طبقہ شریک نہ ہوا۔ یہ روش مسلمانوں کے لیے بہت بہتر تھی۔ اس فرصت کو بہت غنیمت سمجھتے اور اپنی بگڑی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ مگر ہندوؤں نے محسوس کیا کہ یہ علیحدگی مسلمانوں کو نفع پہنچائے گی اور اس فرصت میں وہ کچھ نہ کچھ کمزوری رفع کرنے

میں کامیاب ہو جائیں گے اور گورنمنٹ کا مقابلہ تنہا ہندوؤں سے رہ جائے گا۔
 اُس کا جو خیال وہ بھگتنا ہو گا وہ تنہا ہندو قومیت کے سر پڑے گا۔ اگر مسلمان
 شریک ہوئے ہوتے تو مرنے، پٹنے، قید ہونے کے موقعوں پر اُنہیں پیش کیا جاتا
 اور یار لوگ کئی کاٹ جاتے۔ اس خیال سے اُنہیں بہت فکر تھی کہ مسلمانوں کو
 اس تحریک میں کس طرح شامل کیا جائے؟ مگر مسلمانوں کا کوئی طبقہ اُن کے ہاتھ
 نہ آیا، البتہ چند غرض لوگ اُن کے ہتھے چڑھ گئے جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کو
 مقدم رکھ کر قوم کے ساتھ غداری کی اور مسلمانوں کو شرکت کانگرس کی دعوت دی
 اور ہندوؤں کے رویہ سے مدد لے کر اغوائے اہل اسلام کا کام جاری رکھا۔
 اس قلیل، طماع، خود غرض جماعت نے اپنا نام جمعیتہ العلماء رکھا اور
 مسلمانوں کو مغالطہ دیا کہ یہ ہندوستان کے تمام علماء کی جمعیت ہے باوجودیکہ
 تمام علمائے ہند اس کے سخت مخالف ہیں اور اس نام نہاد جمعیت کو جمعیتہ
 السنود جانتے ہیں۔ جو چند ذی وقار علماء اس میں پہلے کسی وجہ سے شریک
 ہو گئے تھے اس وقت وہ بھی علیحدہ ہو گئے۔ گنتی کے آٹھ دس نام کے مولوی
 رہ گئے جنہوں نے اپنا ضمیر ہندوؤں کے ہاتھ کھوٹے داموں کو فروخت کر دیا
 اور کانگریسی پروپیگنڈا کے ایجنٹ ہو گئے اور کسی نہ کسی قدر مسلمانوں کو مغالطہ
 دینے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ خطرناک جماعت ہندوؤں کی کچھ پتلی ہے، اُن
 کے اشاروں پر رقص کیا کرتی ہے۔ مسلمان اس سے متفق نہیں، نہ ملک کا کوئی
 معتمد شخص ان کے ساتھ شریک عمل ہے۔ مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ
 رہنا چاہیے کہ نام نہاد جمعیتہ العلماء ہندوستان کے علماء یا عام اہل اسلام
 کی نائب و ترجمان نہیں ہے بلکہ وہ تمام مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں سے ساز باز
 کرنے کی مجرم ہے۔ اس نے اپنے نفع کی خاطر بہت سے مسلمانوں کو غلطی
 میں ڈالا اور نقصان میں مبتلا کیا۔ غلط فتوے دیتے رہنے، بے فائدہ ہندو
 تحریک پر مرنے والوں کو شہید بنا کر مسلمانوں کو جانیں کھونے پر آمادہ کیا۔ مسلمان

اس نثار، مسلم کش، ہندو پرست جماعت کے دامِ نزویر سے بچیں۔“ لے

۱۳۴۹ھ/ ۱۹۳۰ء میں حضرت مفتی اعظم دہلی، سیدی و مرشدی شاہ محمد ظہار اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ہندو کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت اور مسٹر گاندھی کے احکامات کی پیروی کے بارے میں سوال کیا گیا۔ آپ کا جواب خلوص و لہیت اور تقویٰ و طہارت کا آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کی وسیع النظری اور اعلائے کلمۃ الحق میں کوشاں رہنے کا زندہ ثبوت ہے۔ دہلی جیسے شہر میں جو وابہ سے بھرپور اور گاندھی حضرات کا ہیڈ کوارٹر ہو وہاں آپ کا لومۃ لاٹم سے بے خوف ہو کر علی الاعلان حق بات کہنا اور کسی بڑی سے بڑی طاقت کو خطرے میں نہ لانا حق پرستی کی عظیم الشان مثال ہے۔ اب وہ فتویٰ ملاحظہ فرمائیے اور حق و صداقت کی داد دیجیے۔

سوال نمبر ۲۳۹

۱۔ آج کل قوم ہندو آزادی حاصل کرنے میں بڑی سرگرم نظر آتی ہے اور اس نے فیصلہ کر لیا، کہ حکومت کی قانون شکنی کر کے اس کو مجبور کیا جائے تاکہ وہ ہم کو آزاد تسلیم کرے۔ اگر اس مقابلہ میں حکومت کی جانب سے نقصان برداشت کرنے پڑیں تو ان کو بھی بلا مذمت برداشت کیا جائے، یہاں تک کہ ان کی گولیاں اپنے سینے پر لی جائیں لیکن قدم پیچھے نہ ہٹے۔ پس اس صورت میں ہندو کے ساتھ مسلمانوں کی شرکت جائز ہے یا نہیں اور اس امر میں جمعیۃ العلماء کا یہ فیصلہ کہ مسلمانوں کو شریک ہونا چاہیے حق بجانب ہے یا اس سے غلطی ہوئی؟

۲۔ اگر اس مقابلہ میں کوئی مسلمان گولی گنے کی وجہ سے مر جائے تو شہید ہوگا یا نہیں؟

۳۔ محض اس لیے کھڑے پہننا کہ ہندو اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں اور شرک کا بول بالا رہے اور اس کو اپنے لیے بمنزلہ فرض کے سمجھنا اور جو لوگ کھڑے نہ پہنتے ہوں ان کو

بظہرِ حقارت دیکھنا، یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اُن کی نمازوں میں قصور بتلانا، یہ سب امور جائز ہیں یا نہیں؟

۴۔ مشرک قانونِ ملک کے توڑنے کا حکم دیتا ہے۔ اس پر کسی مسلمان کا یہ کہنا کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے، لہذا اُس کے حکم کی تعمیل فرض ہے۔ پس یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ بیذا بالذلیل۔

الجواب

۱۔ مسلمانوں کا آزاد ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ احکامِ کفریک قلم نابدو ہو جائیں اور اہل اسلام کو غلبہ حاصل ہو جائے، جو مطلوبِ شارع ہے اور ہندوؤں کی آزادی یہ ہے کہ مسلمانوں کو نیست کر دیں اور کسی مسلم کو یہ قوت نہ رہے کہ وہ مشرک اور کفر کی برائی بھی کر سکے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دونوں آزادیوں میں تضاد ہے۔ ایک ملک میں دونوں آزادیوں کا اجتماع محالاتِ عقلیہ سے ہے۔

پس صورتِ مذکورہ میں اگر آزادی ہو سکتی ہے تو ان دونوں قوموں میں سے صرف ایک قوم آزاد ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں غیر آزاد قوم یقیناً آزاد قوم سے مغلوب رہے گی۔ اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی آزادی چاہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اخبارِ بین حضرات پر اچھی طرح روشن ہے کہ ہندو کا اصلی منشاء اپنی بھی کامل آزادی نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ گورنمنٹ کے سایہ میں ہم کو وہ قوت میسر آجائے جس سے مسلمانوں کی مالی قوت تو برباد کر ہی چکے ہیں، دینی قوت بھی مٹا دالیں کہ آج اس کی کوشش کی جاتی ہے تو گورنمنٹ اڑے آتی ہے، جب ہم خود مختار ہو جائیں گے تو اپنے ستیس ممبروں میں مسلمانوں کے دس ممبروں کو جذب کر لینا کون سی بڑی بات ہوگی کہ اول تو وہ ممبر خود بھی ایسے ہوں گے جو ہماری آواز پر لبیک کہنے والے ہوں گے، لہذا اگر کبھی انھوں نے کسمپاسا چاہا بھی تو پھر کثرتِ رائے کے بھاری پہاڑ سے بچ کر اُن کے لیے بھاگنے کی راہ بھی کہاں ہوگی؟ غرض پھر جس طرح نچائیں گے اُن کو

ناچنا پڑے گا۔ کیا سارا دایکٹ کے مسئلہ سے تجربہ نہ ہو چکا جو ہندو مسلم ممبروں کی کمیٹی نے پاس کر دیا، وہ آجکل اٹل ہے۔ اس کے منسوخ کرانے میں کیا دقیقہ اٹھا رکھا گیا، لیکن بائیمہ آج تک اس کو جنبش نہیں ہوئی اور گورنمنٹ کی جانب سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ ہم کیا کریں؟ یہ سب تمہارے نمائندوں کی روشنی و داغ کا نتیجہ ہے۔

پھر ہم نے تو اختیار کیا تمہارے بعض معتمد علیہ علما سے بھی دریافت کر لیا تھا۔ لیکن جب ہم ان سے بھی اجازت مل جائے تو پھر ہمارا کیا قصور؟ دوسرا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ جب کسی ملک میں مختلف مذاہب موجود ہوں اور کوئی اصلاحی اسکیم جاری کی جائے تو اُس وقت اصلاح معاشرت عام ہوتی ہے، کسی خاص قوم کا اُس میں استثنیٰ نہیں کیا جاسکتا۔ اسی قسم کے اور بھی جواب دیے جاتے ہیں جن کا صاف مطلب یہ ہے کہ اب چیخے پھلاتے رہو، جو ہونا تھا ہو چکا۔ غرض یہی قصہ آئے دن اُس وقت ہوگا جب یہ دنیا کے دلدادہ منصب حکومت پر فائز ہوں گے اور زہر کفر و غسل اسلام کی معجون تیار کر کے اُسی کے ساتھ قوم کا علاج شروع کریں گے۔

مسلمانو! ہوش میں آؤ۔ اپنے ہاتھوں اپنے کو برباد نہ کرو۔ اس مسئلے میں جمعیتہ العلماء ہویا کوئی دوسری جماعت، جو بھی تم کو شرکتِ مشترکین کی رائے دے وہ سخت غلطی میں ہیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، بیسیوں آیات میں اس کی حرمت ظاہر و باہر ہے۔

تبرکاً صرف دو آیتوں پر اکتفا کرنا ہوں۔ ارشاد ہوتا ہے: یا ایہا الذین امنوا لا

تتخذوا بطانۃ (الایہ) مسلمانو! غیروں کو اپنا بھیدی نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی

میں کمی نہ کریں گے۔ اُنھیں تمہارا تکلیف میں پڑنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اُن کی

زبانوں سے دشمنی ظاہر ہو رہی ہے اور جو امور اُن کے سینوں میں پوشیدہ ہیں وہ

اور بھی زیادہ سخت ہیں۔ اگر تم کو عقل ہے تو ہم نے کھلی نشانیاں بیان کر دیں۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: یا ایہا الذین امنوا ان تطیعوا الذین

کفرُوا (الایہ) مسلمانو! اگر تم نے کافروں کا کتھان لیا تو یاد رکھنا وہ تم کو الٹا

پھیر دیں گے (اور تمہاری پچھلی لپستی کا تم کو نظارہ پھر تم کو دکھلا دیں گے) پھر تم نقصان

میں جا پڑو گے (یہ تمہاری کیا مدد کریں گے تم اپنے پاؤں پر کھڑے تو ہو) اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اُس کی مدد سب سے بہتر ہے۔ ہم عنقریب تمہارا رعب کافروں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔

بعض مسلمانوں کو جرات ہندو کی ہمراہی پر ابھار رہی ہے، یہ ہے کہ اب یہ اُن کے ذہن نشین ہو چکا ہے کہ جس روش پر اس قوم کی اس وقت جدوجہد ہے اگر کچھ زمانہ یونہی رہی تو ضرور بازی لے جائیں گے۔ پھر یہیں سوائے افسوس کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور جب اُنھوں نے حقوق حاصل کر لیے تو یہ گورنمنٹ اور نیز دوسری سلطنتوں کی نگاہ میں معزز ہو جائیں گے اور ہم ذلت کی نگاہوں سے دیکھے جائیں گے۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ اَوّل تو جن حقوق کا مطالبہ ہے وہ خالص ہندو کے حقوق نہیں ہیں، بلکہ مشترکہ تمام ہندوستانیوں کے لیے ہیں۔ تو اگر حاصل ہو بھی گئے تو مسلمان محروم نہ رہیں گے۔ پھر خواہ مخواہ اُن کا اس بُری صورت کے ساتھ دخل انداز ہونا کیا معنی؟ خصوصاً جبکہ ہندو بھی کہتے ہیں کہ ہمیں مسلمانوں کی شرکت کی حاجت نہیں اور اگر کہتے ہیں کہ ہمارے حقوق برائے نام ہیں اصل میں وہ حقوق زیادہ تر اُنھیں کے حق میں مفید ہوں گے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ پھر اُن کے حاصل کرنے کے لیے آپ کیوں کوشاں ہیں؟ آپ کو چاہیے کہ گورنمنٹ کی خدمت میں ایسے حقوق پیش کریں جو آپ کے لیے مفید ہوں مگر قانونی حدود میں رہتے ہوئے اور تہذیب کے ساتھ تاکہ بلا کسی نقصان کے آپ کو حقیقی کامیابی میسر آجائے، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ درخواست کنندگان میں سے گورنمنٹ ایسے اشخاص کو محروم رکھے جو اس کے قواعد کے ساتھ درخواست کرتے ہیں اور اُن کو کامیاب بنا دے جو اُس کے ساتھ برسرِ پیکار ہیں۔ رہا عزت کا سوال۔ ان کے ساتھ تو شرکت ممنوع ہے لقولہ تعالیٰ:

أَيُّتَغُونَ عَنْهُمْ الْعِزَّةَ
فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا۔

کیا تم اُن کی شرکت میں عزت ڈھونڈ رہے ہو؟ عزت تو تمام کی تمام محض اللہ ہی کے لیے ہے۔

پس عزت اگر ہے تو صرف اس میں کہ حاکم حقیقی کے حکم کے آگے کسی کے حکم کی پروا نہ کی جائے
اور تمام مسلمان اتفاق کے ساتھ مضبوطی کے ساتھ عامل ہو جائیں، پھر ہو نہیں سکتا کہ میاں بی
ہمارے قدم نہ چوم لے۔ اگر یہی ظفری اور بدینی رہی تو ذلت کی شکایت بے جا ہے کہ اس کا
ارشاد ہو چکا:

واطيعوا الله واطيعوا الرسول
ولا تنازعوا فتفشلوا وتذهب
سماحکم۔
اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری
کو اور آپس میں تنازعہ نہ ڈالو ورنہ
تم کم ہمت اور سست پڑ جاؤ گے
اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

سچ فرمایا باری تعالیٰ جل مجدہ نے۔ آخر ذکر کیا، آج سے دس سال پہلے (۱۳۳۹ھ میں) اگرچہ
حالت بہت تباہ ہو چکی تھی مگر پھر بھی کسی ہوا بندھی ہوئی تھی؛ لیکن جب تم نے اُس (اللہ تعالیٰ)
کے حکم کی مخالفت کی اور ہنود سے دوستی گانٹھی اور جو کچھ اسلام کے خلاف نہ کرنا تھا، وہ کیا،
جس کے بیان کے لیے دفاثر بھی گنجائش نہیں رکھتے، یہاں تک کہ مخالفین کو سارے گھر کے
مجید دیے اور ان کی دلی مراد پوری کر دی کہ آپس میں اچھی طرح مخالفت پیدا کر لی اور آج وہ
حالت ہو گئی کہ وہ تم کو کسی سار میں نہیں لاتے۔ لیکن تمہاری شراب محبت کا خمار اب بھی نہیں اُتر
اسی کوشش میں لگ رہے ہو کہ کسی طرح رہی سہی یہ اسلامی شان بھی ہندوستان سے مٹ
جائے۔ ہنود کے روزمرہ کے سلوک دیکھ رہے ہو لیکن آنکھیں ایسی پٹم ہو گئی ہیں کہ کچھ سوچتا
ہی نہیں۔

مسلمانو! خدا را خواب غفلت سے بیدار ہو اور بہت جلد اُن وسائل سے کام لو جن سے
آپس کا اتفاق نصیب ہوتا ہے کہ اجتماعی قوت سے آنے والی مشکلات کی مدافعت کر سکو کہ
آج ایک قوت کے کرشموں کا رونا رو رہے ہو، کل دوسری قوت کے مظالم کا سامنا پڑنا ہے۔
لیکن تمہاری ہر کوشش اور ہر نقل و حرکت محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے اور پابندی دین کے
ساتھ ہو، ورنہ کامیابی کی امید نہ رکھنا۔

اس مسئلے میں نصوص صریحہ تطعیہ کی مخالفت کی جا رہی ہے، لہذا ہر مسلمان پر واجب ہے کہ

(جس) جلسہ میں اُس کے سامنے اس نام نہاد جنگ آزادی میں شرکت کا مسئلہ پیش ہوا وہ صاف بلند آواز سے کہہ دے کہ ہم شرکت سے ہرگز راضی نہیں۔ اس میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں ورنہ یاد رکھیں کہ قیامت میں اُس سے سخت باز پرس ہوگی۔

بعض لوگ شرکتِ مشترکین پر یہ بیان کر کے اُجھا رہے ہیں کہ غیر مسلم قوم جب مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کرے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے ملک کو اُس سے آزاد کرانے کی کوشش کریں۔ مسئلہ تو یہ نہیں ہے مگر اول تو یہ ہر مسلمان پر فرض نہیں بلکہ اُن مسلمانوں پر فرض ہے کہ جو آزاد کرانے کی طاقت رکھتے ہوں۔ ہندوستان کے مسلمان اس پر ہرگز قدرت نہیں رکھتے۔ دوسرے جو آزادی شائع کو مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ خالص مسلمانوں کی قوت و شوکت کے حصول کی امید اور یہاں ایسی آزادی کی ہرگز امید نہیں بلکہ اور نقصان کا اندیشہ ہے۔ عالمگیری میں دشمن کے مقابلے کی اباحت کے شرائط کو ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

والشافی ان یرجوا الشوكة والقوة لاهل الاسلام باجتهاده او باجتهادین
من یعتقد فی اجتهاده ورايه وان کان اسرجوا القوة والشوكة للمسلمین فی القتال
فانه لا یحل له القتال لما فیہ من القاء نفسه فی التملکة۔

دوسری وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ہم اس حکومت کی وجہ سے طرح طرح کے نقصانات کے شکار ہو رہے ہیں۔ سو اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف فرما دیا ہے کہ:

اسمعوا واطیعوا فاننا علیہم
ما حملوا وعلیکم ما
حملتم۔

تم تو منے جاؤ، اطاعت کرتے رہو کہ جو
حقوق حکام پر ڈالے گئے ہیں وہ اُن پر
لازم ہیں اور جو تم پر ڈالے گئے ہیں وہ
تم پر لازم ہیں۔

یہ کچھ عرض کیا گیا نفسِ شرکت کے متعلق تھا کہ اس وقت کی شرکت کا کیا حکم ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اس راہ کے دوسرے اور بھی صدیاں منہیات کا ارتکاب کیا جاتا ہے جن کی وجہ سے شرکتِ اش حرام کا حکم پیدا کر لیتی ہے۔ چونکہ اُن تمام کا ذکر موجب طوالت تھا، دوسرے اُن کے متعلق سوال میں استفسار بھی نہیں تھا، اس لیے ان کو ترک کیا گیا۔

۲۔ اس مقابلے میں اگر قوم کی جانب سے ایسا تشدد وقوع میں نہ آئے جس میں پولیس یا فوج کے افراد میں سے بعض کے تلف ہو جانے کا خوف ہو اور ایسی صورت میں حکومت کی جانب سے گولی چلا دی جاتے اور کوئی مسلمان گولی کے صدمہ سے مر جائے تو شہید کہلانے کا اور اُس کے تلف ہونے کا سبب ایسے وقت ظلم ٹھہرے گا اور ظلماً مارا جانا شہادت ہے۔ لیکن ایسے وقت میں بھی اگر کسی مسلمان کا اس پر گمان غالب ہو جائے کہ اگرچہ میرا کوئی ایسا سنگین گناہ نہیں ہے لیکن حکومت اس پر بھی گولی چلا دے گی، تو ایسی صورت میں اُس پر فرض ہوگا کہ وہ اُس مقام سے ہٹ جائے۔ اگر نہ ہٹے گا اور مارا جائے تو شہید نہ کہلانے گا۔

اگر قوم کی جانب سے ہی ایسے تشدد کی ابتداء کی گئی جس میں گورنمنٹی ملازمین سے بعض افراد مارے گئے یا اُن کے مارے جانے کا قوی اندیشہ تھا کہ وہ آلاتِ جارحہ کے استعمال کا ارتکاب کر رہے تھے اور ایسی صورت میں مجمع کے منتشر کرنے کے لیے گولی چلائی گئی اور اُس میں کوئی مسلمان بھی مارا گیا تو اُس کو بھی شہید نہ کہا جائے گا کہ اُس موقع پر وہ یقیناً جانتا ہے کہ گولی چلنا لابدی ہے، پس ایسے وقت میں اُس کا ٹھہر جانا اپنے اوپر موت کا پیش کرنا ہے، جو حرام ہے۔ پھر جن صورتوں میں شہادت کا حکم نہیں کیا گیا، اگر وہ جانتا تھا کہ شرعاً مجھے یہاں ٹھہرنا ممنوع ہے، تب تو خودکشی کا ترکب ٹھہرے گا ورنہ امید ہے کہ ماخوذ نہ ہو۔ حکومت کے خلاف جن اور پر اصرار کیا جاتا ہے وہ تو مکروہات سے بھی نہیں۔ علماً نے حفاظتِ جان کے لیے بعض محرکات کے ارتکاب کو بھی فرض فرمایا ہے۔ عالمگیری میں ہے:

السلطان اذا اخذ رجلاً وقال لا قتلک اولتشریت هذا الخمرکان فی غالب دایه وانہ لولم یتناول یقتل فان لم یتناول حتی قتل کان اثماً فی ظاہر الروایۃ عن اصحابہ و ذکر شیم الاسلام انه اثم ماخوذ بدمه الا ان یكون جاهلاً بالاباحة حالة الضرورة اذا کان عالماً بالاباحة کان ماخوذاً
خذ اقال محمد رحمہ اللہ تعالیٰ۔

۳۔ کھدر کا استعمال فی نفسہ مباح ہے لیکن اس نیت سے پہننا جو سوال میں مذکور ہے، ممنوع ہے کہ مباح اشیاء کا استعمال اچھی نیت سے مستحسن ہے اور بُری نیت سے مکروہ۔

۴۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی نیت سے نہ قانون نمک کے توڑنے کا حکم دیا گیا نہ یہ ارشاد مبارک کا مقصد وہ ہے کہ اگر کوئی حکومت نمک پر محصول لے تو اس کی مخالفت کر کے ایسے قانون کو توڑ دیا جائے۔ غرض بہر حال مذکور محض کذب ہے۔ فقط ۱

محمد مظہر اللہ غفر اللہ لہ

مسجد جامع فتحپوری

اب ہم قارئین کرام کے سامنے ایک فتویٰ اور پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مستفتی نے باختلاف الفاظ یہی چار سوال جمعیتہ العلماء ہند کے قائم مقام صدر یعنی مفتی کفایت اللہ دہلوی سے اُن کا جواب مانگا۔ ہم مفتی صاحب موصوف کے جواب کو حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ مصنفِ خزائن العرفان اول الکلمۃ العلیا کی تنقید سمیت پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ قارئین کے سامنے تصویر کے دونوں رخ آجائیں اور فریقین کا موقف سمجھنے میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو کیونکہ دونوں حضرات ہی اپنی اپنی جماعت کے معتز علیہ اور چوٹی کے علماء میں شمار ہوتے تھے۔ لیجیے وہ استفاء مع جواب و تنقید پیش خدمت ہے:

استفتاء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم والہ واصحابہ اجمعین۔ اما بعد۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیان شرع متین امورات ذیل میں۔ جواب مع اولہ شرعیہ بیان فرمائیے۔
اولاً: ایک شخص غیر مسلم و غیر معاہد حکم کرتا ہے کہ قوانین مروجہ حکومت حاضریہ کی خلاف ورزی اُس کی قوم اور اُس کے ہم وطن کریں، جس سے رام راج حاصل ہو گا۔ بصورتِ قانون شکنی بغیر استطاعتِ اندفاع و بغیر کوشش اندفاع برداشت کرنے کی حتیٰ کہ گولی چلنے کے وقت گولی کو اپنے سینے پر لینے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اُس کے حکم کی تعمیل کرتا ہے

تشرعاً جائز ہے یا ناجائز؟

ثانیاً: اگر اُس غیر مسلم کے حکم کی تعمیل میں کوئی مسلمان اس خطہ میں یہ جانتے ہوئے کہ گولی لگنے سے موت واقع ہو سکتی ہے، اپنے آپ کو مبتلا کرے اور گولی لگنے سے مر جائے تو اُس کی موت کیسی موت ہوگی؟ آیا اُس کو شہادت کہیں گے یا خودکشی کہہ سکتے ہیں؟

ثالثاً: ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ کھدر پہنو۔ اُس کی تعمیل میں کوئی مسلمان کھدر پہنتا ہے اور فر کرتا ہے کہ میں نے اُس کے حکم کی تعمیل کی اور اُس حکم کو فرض قرار دے کر دوسرے مسلمانوں کو اُس غیر مسلم کے حکم پر آمادہ کرتا ہے اور جو شخص کھدر نہ پہنے اُس سے نفرت کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا کھدر پہننا، حکم غیر مسلم کی تعمیل کو فرض سمجھنا، کھدر نہ پہننے والے مسلمان سے نفرت کرنا کیسا ہے؟

رابعاً: حکومتِ حاضرہ کی طرف سے نمک بنانے پر عرصہ سے محصول لیا جاتا ہے۔ ایک غیر مسلم کہتا ہے کہ یہ محصول دیے بغیر نمک بناؤ اور گرفتار ہو جاؤ۔ اس پر ایک مسلمان کہتا ہے کہ اس نے باوجود غیر مسلم ہونے کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی ہے، اس لیے غیر مسلم کے حکم کی تعمیل ہر مسلم پر فرض ہے۔ مسلم کا یہ کہنا جائز ہے یا نہیں؟ اور ناجائز ہے تو کیا حکم رکھتا ہے۔ بیٹو! تو جروا۔

الجواب

غالباً یہ سوالات تحریکِ حاضرہ سے متعلق ہیں۔ اگر ایسا ہے تو تحریر سوالات میں کس قدر قلبیس سے کام لیا گیا ہے جو مناسب نہ تھا، بلکہ چاہیے یہ تھا کہ واقعہ صاف صاف ذکر کر کے اُس کا حکم ذکر کیا جاتا۔ مثلاً سوال اول یوں لکھنا چاہیے تھا کہ ہندوستان میں ایک غیر ملکی حکومت کا جبریہ قبضہ ہے، جس کو ہندوستان کے رہنے والے کسی طرح پسند نہیں کرتے۔ ہندوستان کی خواہش ہے کہ پر دیسی قوم جو ہزاروں میل دور سے آکر ہمارے وطن و ملک پر جبراً قابض اور مسلط ہے اور ہمارے تمام خزانوں اور منافع کو ہمارے ہاتھوں سے چھین کر لے جا رہی ہے اور جس کی بدولت اہل ملک مجھو کے اور محتاج ہو گئے ہیں، جلد سے جلد ہمارا ملک خالی کر دے

تاکہ اہل ملک خود اپنی مرضی کے موافق حکومت قائم کریں اور اپنے ملی ذخائر سے خود متمتع ہوں، لیکن وہ پر دیسی حکومت کسی طرح ہندوستانیوں کی خواہش کا احترام کرنے کو تیار نہیں ہوتی اور اپنی مادی طاقت کے بل پر جبراً حکومت کر رہی ہے۔ ہندوستانیوں کے پاس مادی قوت اور طاقت نہیں ہے کیونکہ تمام مادی طاقتیں اور قوتیں اُس پر دیسی قوم نے اپنے قبضہ میں کر رکھی ہیں۔ حتیٰ کہ ہندوستانیوں کو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے بھی ہتھیار رکھ سکیں۔ اس لیے ہندوستان کی ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں، یہ طے کیا کہ اس غیر ملکی حکومت قسطنطنیہ سے آزادی حاصل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے جبر پر قوانین کی خلاف ورزی کی جائے اور اس سلسلے میں جو تکالیف اور مصائب برداشت کرنے پڑیں ان کو برداشت کیا جائے گا اور اپنی طرف سے تشدد پر ہرگز اقدام نہ کیا جائے تاکہ تحریک آزادی کی کامیابی کی اُمید ہو، ورنہ بصورت تشدد حکومت کو تشدد کا بہانہ مل جائیگا اور پھر وہ اپنی مادی قوت سے قوم کو تباہ کر دے گی۔ خلاف ورزی قوانین کو عملی جامہ پہنانے کیلئے ملک میں سے ایک شخص تیار ہوا جو غیر مسلم تھا۔ اس مجلس مشترک نے اُس کو اس مظلومانہ جنگ کی انجام دہی کے لائق سمجھ کر اس جنگ کی تکمیل کے اختیارات دے دیے۔ اب وہ غیر مسلم تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے آداب بتا رہا ہے اور قوم کو لڑا رہا ہے، تو آیا اس کے حکم کی تعمیل جائز ہے یا نہیں اور اس مظلومی کی جنگ میں اگر مطالبہ حتیٰ آزادی کی وجہ سے کسی کی جان تلف ہو جائے تو وہ شہید ہوگا یا نہیں اور آیا بحالات مذکورہ آزادی کا مطالبہ کرنا اور اپنے آپ کو ایسے خطرات میں مُستلک کرنا، جس میں جان تلف ہو جانے کا خطرہ ہے، جائز ہے یا نہیں؟ سوال کی صحیح شکل یہ ہے۔

اب اس کا جواب یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قومیں آباد ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی اصول سے مسلمانوں پر ایک غیر مسلم حکومت جابرہ قسطنطنیہ سے اپنے ملک کو آزاد کرانا اولین فریضہ ہے۔ اِنَّ الْحُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ اور لَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكَافِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے اگر وہ اطاعت کرتے ہیں تو مجبوری اور اضطراری طور پر کرتے ہیں اور اگر

اس مجبوری اور اضطراب کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو ان پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس جبری حکومت کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار چھینکیں۔ یہ وجہ تو ایسی ہے کہ اس میں غیر مسلم شریک نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے (جس میں تمام ہندوستانی اقوام برابر کی شریک ہیں) کہ ایک اجنبی قوم کو جو ہزاروں میل پرے کی رہنے والی ہے کوئی حق نہیں ہے کہ وہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے۔ ہم اس کی حکومت کو ایک لمحہ کے لیے بھی طوعاً برداشت کرنے کو تیار نہیں اور یہ ہمارا فطری، عقلی، عرفی، بین الاقوامی حق ہے اور جس تدبیر اور جس طریقہ سے ہم اپنا یہ حق حاصل کر سکیں اختیار کرنے اور عمل میں لانے میں حق بجانب ہوں گے۔ چونکہ ہمارے پاس مادی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے معذور و مجبور ہیں۔ مگر عدم تشدد کے ساتھ رسولِ نافرمانی کی مظلومانہ جنگ یقیناً لڑ سکتے ہیں اور اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ لڑھکیاں کھاتیں، سنگینیں اور برچھیاں، چھڑے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً ان کو اپنے حق آزادی کے مطالبہ کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے کیونکہ ان کا فعل فی حد ذاتہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں اگر حکومت لڑھکیاں برساتے یا سنگینیں بھونکے یا چھڑے اور گولیاں مارے تو یہ بربریت اور ظلم حکومت کا فعل ہے، اس کی ذمہ داری حکومت پر ہے، نہ ان مظلوموں پر جو اپنا حق مانگتے ہیں اور کسی ایسے قانون کی خلاف ورزی کرتے ہیں جس کو وہ پہلے سے ناپسند کرتے تھے مگر مجبوراً اس کی تعمیل کیا کرتے تھے۔

رہی یہ بات کہ یہ جانتے ہوئے کہ حکومت بسا اوقات اپنی بربریت کے مظاہرہ کے لیے لڑھکیاں چلاتی ہے، گولیاں برساتی ہے، کسی کو ایسے خطرہ میں پڑنا جائز ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مطالبہ حقوق ہمیشہ خطرات سے پُر ہوتا ہے۔ مذہب و وطن کی آزادی کا مقصد چونکہ اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ اس لیے اس کے راستہ کے خطرات بھی بہت بڑے اور ہیبت ناک ہیں مگر بغیر خطرہ کے تو کوئی مقصد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو اور اگر بغیر اس کے کہ ہماری طرف سے کوئی تشدد آمیز حرکت ہو، حکومت بلاوجہ تشدد پر اتر آئے اور ہمیں مار مار کر زخمی یا شہید کر دے تو اس کی

زرداری حکومت پر ہوگی۔ مثلاً یہ قصد ہو کہ دفعہ ہم اکی غلاف درزی کریں اور پانچسو اشخاص ایسے مہیا کیے جاتیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور احکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کر دو کہ صرف یہی پانچسو اشخاص تھے اور یہ سب عدم تشدد کے پابند تھے۔ اب حکام آئے اور انھوں نے حکم دیا کہ منتشر ہو جاؤ۔ انھوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا مگر کوئی حرکت نہیں کی۔ تو اس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ اُن سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ اُن لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاسٹھیوں سے پٹوا کر منتشر کراتی ہے اور کبھی گولیاں چلا کر بہیمیت اور بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے۔ اس ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وہ فصل ناجائز نہ ہو جائے گا جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اس بہیمیت و بربریت کا شکار ہو کر شہید ہوں گے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ اُن کو خودکشی کا مرتکب بنانا سخت جہالت اور ناواقفیت احکام شرعیہ کی دلیل ہے۔

یہ سول نافرمانی کی اس مظلومانہ جنگ میں جو اپنے وطن اور مذہب کو ایک غیر ملکی حکومت کے جابرانہ قوانین سے آزاد کرانے کے لیے اپنی وطنی مشترک مجلس کی جانب سے جاری کی گئی ہے شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کرنا ناجائز نہیں ہے۔ کیونکہ یہ کوئی مذہبی رہنمائی اور دینی ہدایت نہیں ہے محض جنگی رہنمائی ہے جو لوگ اسے ناجائز کہنے کی جرأت کرتے ہیں اور جنگ میں زخمی ہونے والے کو ملامت کرتے ہیں اور مرجانے والوں کو شہادت سے محروم کرتے ہیں وہ پہلے اُن مسلمانوں کا حکم بتائیں جو کسی غیر مسلم جابر دشمن اسلام حکومت کی حمایت اور اُس کی حرص ملک گیری کی خاطر اُس کے مقرر کیے ہوئے غیر مسلم افسروں کی کمان میں رہ کر اُن غیر مسلموں کے فوجی احکام کی اطاعت کرتے ہیں اور بسا اوقات غیر مسلم حکومت کی طرف سے اپنے مسلمان بھائیوں کو نشانہ بندوق بناتے ہیں یا خود گولی کھا کر مر جاتے ہیں، اُن مسلمانوں کا کیا حکم ہے، یعنی کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ حکومت کے غیر مسلم افسروں کی ماتحتی میں کام کریں اور مسلمانوں پر گولیاں چلائیں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ غیر مسلم ججوں کے سامنے اپنے مقدمات لے جائیں اور اُن سے خلاف شرع فیصلے صادر کرائیں اور اُن پر

عمل کریں اور کیا مسلمانوں کو جائز ہے کہ وہ شرعی معاملات نکاح، طلاق، امین بالجہر، رفع یدین وغیرہ وغیرہ نزاعات کے مقدمات غیر مسلم حکام کی عدالتوں میں فیصلے کے لیے لے جائیں؟

اگر ان تمام سوالات کا جواب نفی میں ہے تو ان حضرات کا پہلا فرض یہ تھا، وہ قوتِ ایمانی کا ثبوت دینے کے لیے پہلے ان امور کے متعلق فتوے شایع کرتے اور مسلمانوں کو ان مملکت سے بچانے کی کوشش کرتے، جنہوں نے ان کے اسلام اور قومیت دونوں کو فنا کر دیا ہے۔

کھدر پہننے کا حکم اُس غیر مسلم نے دیا ہے، وہ اُس نے اپنے مذہب کی بنا پر نہیں دیا ہے بلکہ ملک و وطن کی بھلائی اور دشمن کو کمزور کرنے کی ایک تدبیر سمجھ کر دیا ہے اور مسلمان کے لیے کھدر پہننا مذہبی احکام کے بموجب ناجائز نہیں ہے، اس لیے کھدر پہننا ناجائز نہیں ہے۔ یہ حکم اُن احکام سے بدرجہا زیادہ قابلِ تعمیل ہے جو انگریزی عدالتوں کے غیر مسلم حکام سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ بلکہ میرا خیال تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے کھدر ہی بہترین لباس ہے اور جبکہ پہننے والوں کی نیت اپنے بھائیوں کی فائدہ رسانی بھی ہو تو ایک پختہ دوکاج، دوسرا ثواب ملے گا۔ اس کو گاندھی پرست فرقہ کا شعار بتانا میری سمجھ سے باہر ہے۔ اول تو کھدر پہننے والے مسلمانوں کو گاندھی پرست کہنا ہی ظلمِ عظیم ہے کیونکہ وہ مسلمان ہیں اور خدا پرستی کے سوا کسی کی پرستش اُن کے دہم و گمان میں بھی نہیں آتی۔ وہ تو رسول پرست بننے سے بھی تو پر کرتے ہیں، پھر اُن کو گاندھی پرست کہنا کتنی بڑی جرأت و جسارت ہے؟ دوسرے یہ کہ وکیلوں کے گون اور اسی طرح بعض اداروں کے مخصوص لباسوں کے متعلق ان حضرات نے کبھی کوئی فتویٰ شایع کیا ہے یا نہیں؟ اور اس کو حکومت پرستی یا ادارہ پرستی کی بنا پر ناجائز فرمایا ہے یا نہیں؟ نہیں تو کیوں نہیں؟

قانونِ نمک کی خلاف ورزی اُس کی سہولت اور ہم گیری کے لحاظ سے اختیار کی گئی ہوگی۔ اصل مقصود تو قانون شکنی تھی۔ ابتداءً ایسا قانون اختیار کیا گیا جس کی خلاف ورزی ہر مقام، ہر حصہ میں ہو سکے اور ہر شخص انفرادی طور پر کر سکے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس قانون کو منتخب کرنے میں یہ فائدہ بھی ظاہر ہو کہ شریعتِ اسلامیہ میں نمک کو اپنے فطری معاون میں آزاد رکھا گیا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے یہ کہہ دیا کہ اس قانون کی خلاف ورزی فی نفسہ بھی شریعت

اسلامیہ کے موافق ہے تو اُس نے کیا گناہ کیا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ تو کسی نے بھی نہیں کہا کہ گاندھی جی نے اس قانون کی خلاف ورزی کا حکم شرعی احکام کی تعمیل کی نیت سے دیا ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ گاندھی جی غیر مسلم ہیں۔ وہ اسلامی حکم کی تعمیل کی نیت سے کوئی حکم دیں یہ بظاہر مستعجب ہے۔ مگر یہ ہر شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلامی حکم کے خلاف نہیں ہے۔ جیسے گاندھی جی شراب چھوڑنے کا حکم دے رہے ہیں تو یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ گاندھی جی نے یہ حکم شریعت اسلامیہ کی تعمیل کی نیت سے دیا ہے۔ مگر ہر مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حکم اسلام کے حکم کے موافق ہے۔ اسلام بھی شراب کو حرام قرار دیتا ہے، اس لیے مسلمانوں کو اس حکم کی تعمیل کرنی چاہیے اور اس میں کوئی غلطی نہیں ہے۔

محمد کفایت اللہ غفرلہ

جمعیتہ العلماء ہند کے فائز مقام صدر یعنی جناب مفتی کفایت اللہ شاہجہانپوری **عرض مصنف** ثم دہلوی کی خدمت میں مذکورہ استفسار جناب سید ممتاز احمد صاحب (سجادین) نانقاہ اخوند صاحب فراش خانہ دہلی نے پیش کیا تھا۔ مفتی صاحب موصوف کا جواب قارئین کی خدمت میں بلفظ پیش کر دیا گیا ہے۔ جناب محمد ظہور سوداگر چچہ عقب لال مسجد مراد آباد نے مذکورہ فتویٰ حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پیش کر کے اس اقدام کی غرض و غایت یوں بیان کی :

یہ فتویٰ حاضر کر کے دریافت کیا جاتا ہے کہ جواب مجیب کا صحیح ہے یا نہیں؟
اس کی پوری حقیقت سے آگاہ فرمایا جائے۔ بنیوا تو جبروا۔“

حضرت صدر الافاضل نے اس فتوے پر جو تبصرہ فرمایا اُس کا ایک ایک لفظ اہلسنت و جماعت کے موقف کی ترجمانی کر رہا ہے۔ ہم موصوف کے تبصرے یا تنقید کو بلفظ پیش کرنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے وضاحت کے ساتھ تصویر کے دونوں رخ آجائیں :

الجواب بعون الملک الوہاب

بسم اللہ الرحمن الرحیم ۵ نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔

سید ممتاز احمد صاحب مستفتی کے سوالات و واقعات کے نہایت مطابق تھے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب کا انھیں تلبیس بتانا غلط اور تلبیس ہے۔ مستفتی کا کوئی جملہ ایسا نہیں ہے جس کا انکار کیا جاسکے اور خود مفتی صاحب سے ممکن نہ ہوا کہ وہ دوچار غلط پیش کر کے بتا سکتے کہ مستفتی نے اُن میں تلبیس کی ہے اور واقعات سے سوال کے فلاں لفظ میں یہ مطابقت نہیں ہے۔ اس طرح تو ہر ایک کلام کو تلبیس کہا جاسکتا ہے، مگر جو چیز بے ثبوت ہو، جو بات بے سند ہو، اصحاب عقل و خرد کے نزدیک لایق التفات نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سوالات نے مفتی صاحب کے چھٹے چھڑا دیے اور انھیں اپنے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے جواب کی کوئی راہ نہ ملی، اس لیے آپ نے اُن سوالوں کے جواب کی بجائے اپنی طرف سے اپنے حسبِ نشاط طول طویل سوال بنانے کی زحمت گوارا فرمائی اور اپنے ہی سوال کا جواب تحریر فرمایا۔ یہ طریقہ رائج ہو جائے تو ہر شخص مفتی بن سکتا ہے۔ جب مستفتی کے سوال کا لحاظ ہی نہ ہو تو اپنا من مانا سوال گھڑنا اور اُس کا جواب دے لینا کیا مشکل ہے۔ مفتی صاحب نے جو سوال بنایا ہے اُس میں تلبیس ہیں اور اُس کی چند قابلِ لحاظ باتیں یہ ہیں:

- ۱۔ ہندوستان پر ایک غیر ملکی حکومت کا جبر قبضہ۔
- ۲۔ ہندوستانیوں کی خواہش ہے کہ پر دیسی قوم ہمارے خزانوں و منافع چھین کر لے جا رہی ہے اور اس کی بدولت ہم محتاج ہو گئے ہیں۔ وہ ہمارا ملک خالی کر دے۔
- ۳۔ اہل ملک اپنی مرضی کے موافق حکومت قائم کریں اور ملکی ذخائر سے خود متمتع ہوں۔
- ۴۔ ایک ملکی مجلس نے جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے شریک ہیں، طے کیا کہ آزادی حاصل کی جائے۔
- ۵۔ آزادی کا طریقہ جبر یہ قوانین کی خلاف ورزی ہے۔

۶۔ اس سلسلہ میں جو مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں، اکی جائیں۔

۷۔ مشترک مجلس نے ایک غیر مسلم کو جنگ کے اختیارات دے دیے۔ وہ تمام ہندوستانیوں کو جنگ کے طریقے بتا کر لڑا رہا ہے۔ ان نمبروں میں مفتی صاحب نے جو عیاریاں اور تلبیسیات کی ہیں وہ ملاحظہ کیجیے:

مفتی جمعیت کے تلبیسیات (۱) کی نسبت یہ دریافت طلب ہے کہ جبری قبضہ سے کیا مراد ہے؟

یہی کہ اگر اُس ملک کے بعض لوگ اس قبضہ کو پسند نہ کرتے ہوں تو بذور قوت اُن پر حکومت
 قائم رکھی جائے یا کچھ اور معنی ہوں تو مفتی صاحب بیان کریں اور اگر یہی معنی ہیں تو دنیا کی
 ایسی کون سی حکومت ہے اور جہاں میں ایسی کون سی سلطنت قائم ہوئی جس کا کوئی مخالف ہی
 نہ ہوا ہو اور جس نے اپنے قیام حکومت کے لیے قوت جمع نہ کی ہو؟

۲۔ ہندوستانیوں سے کون مراد ہے؟ تنہا ہندو یا ہندو اور مسلمان سب؟

دوسری صورت میں کیا مفتی صاحب کے علم میں نہیں ہے کہ ہندو مسلمانوں کو پر دہشی
 بتاتے ہیں اور صرف اپنے آپ کو ہندوستان کے منافع کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس لیے
 اُن کی خواہش فقط انگریزوں کو نکال دینے سے پوری نہیں ہو سکتی جب تک وہ مسلمانوں کو
 بھی ہندوستان سے باہر نہ کریں اور ایسا وہ بار بار کہہ چکے ہیں اور بہت سے ہندوؤں کے
 قلم سے ایسے مضامین نکل چکے ہیں اور ملک میں اس کا غلغلہ مچایا گیا ہے۔ اس کو چھپانا اور
 یہ ظاہر کرنا کہ ہندوؤں کی صرف یہ خواہش ہے کہ حکومت موجودہ کو نکال دیں، اس کے بعد
 ہندوستان کی دولتوں میں مسلمانوں کو برابر شریک بنالیں گے، یہ سخت تبلیغ ہے، محض
 دھوکا ہے ایسے ہی دھوکے دینے کے لیے سوال دوبارہ گھڑا گیا ہے۔

۳۔ اہل ملک سے کیا مراد ہے؟ صرف ہندو یا مسلمان بھی؟ دلیل کے ساتھ بیان کیجیے۔ ہندوؤں
 نے کب مسلمانوں کو اہل ملک قرار دیا ہے؟ یہ بھی تبلیغ ہے۔

۴۔ یہ بہت بڑی تبلیغ ہے کہ ملکی مجلس جس میں ہندوستانی تمام اقوام کے نمائندے
 شریک ہیں۔ ایسی مجلس کونسی ہے؟ آپ کانگریس کو ایسی مجلس بتانا چاہتے ہیں مگر یہ انتہا
 درجے کی تبلیغ اور غایت درجے کا فریب ہے۔ کانگریس میں تمام اقوام کے نمائندے
 کب شامل ہیں؟ کیا ہندوؤں کے زرخیزہ اشخاص کسی قوم کے نمائندے قرار دیے
 جاسکتے ہیں؟ یا آپ کی مٹھی جبر جمعیت جو جمہور اہل اسلام کے مخالف ہو کر کانگریس کا کلمہ
 پڑھنے لگی ہے اور تمام عالم اسلام اُس پر ملامت کر رہا ہے یہ اُن کی نمائندہ ہو سکتی ہے؟
 جو قوم کسی جماعت سے ناراض ہو، اُس کو غدار سمجھے، وہی جماعت اُس کی نمائندہ قرار
 دی جاسکتی ہے، مسلمانوں نے کب کانگریس مدعیان اسلام کو اپنا نمائندہ بنایا؟ کہاں اپنا

قائم مقام مقرر کیا، کس مجلس میں شرکت کانگریس کی اجازت دی، خود نمائندہ بن بیٹھنے سے کوئی شخص کسی کا وکیل ہو سکتا ہے، ایسی وکالت آپ نے کس کتاب میں پڑھی ہے؟ اور یہ طریق نمائندگی کون سے دارالافتاء کے حکم سے جائز سمجھا ہے؟ اسے کیسے جبری نمائندگی اور یہ تہہ تبلیس۔ آپ کے مستفتی نے تو تبلیس نہیں کی مگر جناب کا جواب مجموعہ تبلیسیات ہے۔

۵۔ جبریہ قوانین کے معنی بھی بتائیے۔ کیا اگر باذنہ تعالیٰ ہندوستان میں کبھی اسلامی حکومت قائم ہو تو آپ کے اہل ملک اور آپ کی ملکی مجلس اُن قوانین کو برضا و رغبت قبول کرنے کے لیے تیار ہوگی اور جبریہ قوانین نہ بتائے گی؟ بتائے گی اور ضرور بتائے گی اور بتا چکے ہیں اور جبریہ سے زیادہ سخت الفاظ کہہ چکے ہیں اور شرعی قوانین کی نہایت توہین کر چکے ہیں اور اب بھی کہہ رہے ہیں۔

اگر آپ کے علم میں نہ ہو تو مجھ سے دریافت کیجیے گا۔ آپ کو بتاؤں گا اور ذخیرے کے ذخیرے آپ کو دکھاؤں گا، جو اسلامی شریعت اور اسلامی قوانین کی مخالفت و امانت میں پُر ہیں۔ تو آپ کی ملکی مجلس اور آپ کے اہل ملک سوائے رام راج کے یعنی سوائے اپنے مذہبی قوانین کے دنیا کے ہر ایک قانون کو جبری قانون اور ظالمانہ قانون کہتے ہیں۔ جب اہل ملک کے نزدیک اسلامی قانون بھی جبری اور ظالمانہ ٹھہرا اور جبری قانون سے آزادی مطلوب، تو آپ کے اہل ملک کے نزدیک آزادی رام راج میں منحصر ہوئی۔ آپ نے اس پر پردہ ڈالا، یہ ہے آپ کی تبلیس۔

۶۔ اہل ملک کی کافر عوام کی آزادی یعنی رام راج کے سلسلہ میں تمام مصائب برداشت کی جائیں۔ اس میں لٹنا پٹنا، مارا جانا، تباہ ہونا، سب ہی کچھ آگیا۔ آپ ہی انصاف سے کہیے کہ جو ہندوؤں کی محبت میں اس قدر فنا ہو گیا ہو کہ وہ مسلمانوں کو رام راج قائم کرنے کے لیے مرجانے اور ہلاک ہو جانے کی رائے دیتا ہو، اُس کو اگر ہندو پرست کہا جائے تو کیا بیجا ہے؟ رام راج قائم کرنے کے لیے دعا کو آپ نے لفظ آزادی کے پردہ میں چھپایا۔ اس کو کہتے ہیں تبلیس۔

۷۔ کیا آپ اپنے اعتقاد میں یہ سچ جانتے ہیں کہ بحالت موجودہ مسلمانان ہند سب کے سب

یا اُن کا سوا اعظم گاندھی کو جنگ کے مکمل اختیارات دینے اور پچنا سپہ لار اعظم بنانے پر راضی ہیں اور یہ جائز سمجھتے ہیں اور قرآن و حدیث میں اس کی اجازت دی گئی ہے؛ شاید ایسا آپ بھی نہ کہہ سکیں اور اتنا موٹا جھوٹ بولنے کی آپ کو جرأت نہ ہو، تو آپ ہی بتائیے کہ جس جماعتِ ذلیلہ نے عامۃ المسلمین کی مرضی اور اُن کے عقیدے کے خلاف ایک مشرک کو سپہ لار اعظم بنایا ہو اور جنگ کے تمام اختیارات تفویض کر دیے ہوں اور اپنے آپ اُس کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بن کر رہ گئی ہو، وہ مسلمانوں کی نمائندہ ہو سکتی ہے؛ اور اُس کو مسلمانوں کا نمائندہ بتانا کیسی بڑی تبلیغ ہے؛ اور مجلسِ مشترک کا لفظ اسی تبلیغ کے لیے لایا گیا ہے تاکہ لوگوں کو اس مغالطہ میں ڈالا جائے کہ کانگریس میں ہندو مسلمان ایک حیثیت سے شامل ہیں اور جس طرح کانگریس ہندوؤں کی نمائندہ ہے اُسی طرح تمام مسلمانوں کی بھی نمائندہ ہے۔ یہ ہیں آپ کے تبلیغات۔

سوالات کی شکل اس تنقید کے بعد مولوی کفایت اللہ صاحب کی تقریر سے سوال کی مسطورہ ذیل شکل قائم ہوتی ہے۔

سوال نمبر ۱: ہندو نقطہ ہندوؤں کو ہندوستانی سمجھتے ہیں اور اعتقاد رکھتے ہیں کہ وہی ہندوستان میں عیش و آرام کرنے، یہاں کی سرزمین سے فائدہ اٹھانے، یہاں حکومت کرنے کے مستحق ہیں اور مسلمانوں کو غیر ملکی جانتے ہیں۔ وہ آزادی ملک کے لیے جو جدوجہد کریں آیا وہ مسلمانوں کے لیے نافع و جائز ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۲: جمعیتہ العلماء نے عامۃ المسلمین کی رائے کے خلاف کانگریس کی اطاعت منظور کی۔ ایسی حالت میں جمعیتہ العلماء کو مسلمانوں کا نمائندہ کہنا اور محض اس جماعتِ قلیلہ کی شرکت سے کانگریس کو مشترک مجلسِ ظاہر کرنا فریب ہے یا نہیں؛ اور جو شخص ایسا کہتا ہے وہ دین و ملت کا عداوت ہے یا نہیں؟

سوال نمبر ۳: جس حالت میں عام ہندو اور بالخصوص کانگریسی اسلامی قانون کو انگریزی قانون سے سخت اور قلیل اعتراض سمجھتے ہیں، تو یہ باور کرنے کی کیا وجہ ہے کہ وہ قانونِ شریعت کی بے حرمتی نہ کریں گے؛ اور اس کو اپنے ملک کے لیے خوش دلی سے منظور

کر لیں گے۔ اگر ہندو قانونِ شریعت کو منظور نہ کریں تو کیا آپ کے نزدیک ہندو دھرم شاستر انگریزی قانون سے بہتر ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کی وجہ مع دلائل بیان کیجیے؛

سوال نمبر ۴: رام راج یعنی وہ حکومت جو ہندو دھرم شاستر کو اپنا قانون بنائے یا اور کسی غیر اسلامی قانون کو رائج کرے اور قانونِ اسلامی کو ناقابلِ نفاذ اور جرم جانے، ایسی حکومت قائم کرنے کے لیے ملک کے امن کو برباد کرنا، اپنے جان و مال کو خطرہ میں ڈالنا، بکھڑپنا، قید ہونا، مرجانا، آیا یہ شرعاً جائز ہے؟ اور یہ موتِ دین کے لیے ہوگی؟ اور اس موت کو شہادت کہا جاسکے؟ دلائل کے ساتھ بیان کیجیے۔

سوال نمبر ۵: جو کافر رام راج قائم کرنے کے لیے اٹھا ہوا اور اُس کی سعی کا انجام جو اُس کے پیشِ نظر ہے یہی ہوگا کہ ہندوستان کو انگریزوں اور مسلمانوں سے آزاد کرایا جائے اور ہندو قانون رائج کیا جائے، اُس کو جو جماعت اختیاراتِ جنگ تفویض کرے اور اُس کے اشارہ اشارہ کا اتباع اپنے اوپر لازم کرے اور مسلمانوں کو اُن کی فرمانبرداری کی اجازت دے اور مسلمانوں کو یہ مغالطہ دے کہ جس طرح یہ کافر ہندوؤں کا نمائندہ ہے ایسے ہی مسلمانوں کا بھی نمائندہ ہے۔ ایسی جماعت اسلام کی دشمن اور غدار ہے یا نہیں؟ اور اس جماعت میں شامل ہونا اور اُس کے حکموں کا ماننا درست ہے یا نہیں؟ شریعت میں ایسی جماعت کا کیا حکم ہے؟ دلائل سے بیان کیجیے۔

یہ تو مولوی کفایت اللہ صاحب کی تحریر سوالات پر تنقید کرنے سے جو شکل سوالات پیدا ہوتی وہ تھی اور اصل مستفتی کے سوالات بدستور لاجواب ہیں۔ مفتی صاحب پر لازم ہے کہ وہ ان دونوں کے جواب تحریر کریں اور دیانت و انصاف کے ساتھ تحریر کریں۔ اب مولوی کفایت اللہ صاحب کے جواب پر ایک نظر کی جائے اور دیکھا جائے کہ اُن کے جواب میں کہاں تک شرع محفوظ ہے۔

مولوی کفایت اللہ کے کلام سے انگریزی حکومت جائز اور سوراہی حکومت اور اس کے لیے کوشش ناجائز ثابت ہوتی ہے

(۱) مولوی کفایت اللہ صاحب نے غیر مسلم حکومت سے ملک کو آزاد کرانا اولین فریضہ بتایا ہے

اور اس کی دلیل میں دو آیتیں إِنِ الْحُكْمُ لِلَّهِ — اور — لَنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا پیش کیں اور اس کے بعد فرمایا ہے کہ ان آیات پر ایمان رکھنے والے طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے اگر کرتے ہیں تو مجبوری و اضطراری طور پر کرتے ہیں اور اس مجبوری کو دفع کرنے کی کوئی صورت بھی ممکن ہو تو اس سے آزادی حاصل کرنا ان پر لازم ہو جاتا ہے۔ یہ مضمون ہے مفتی کفایت اللہ صاحب کے جواب کا جو انھوں نے وجہ اول میں بیان کیا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انگریزی حکومت کا اتباع تو جائز ہے کیونکہ وہ مجبوری و اضطرار گیا جاتا ہے اور کانگرس کی مجوزہ حکومت ناجائز ہے کیونکہ اس میں ہندو اکثریت حکمران ہوگی اور خداوندی احکام کی اطاعت کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے گا اور ایسی حکومت بقصد اختیار طلب کی جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ان کے تسلط سے مجبوراً ان کے احکام ماننے پڑے ہوں۔ لہذا مفتی صاحب کی پیش کی ہوئی آیات کے حکم اور مولوی صاحب کی تصریح سے ثابت ہوا کہ کانگرس کی مطلوبہ حکومت ناجائز، اس کی اطاعت مسلمانوں کو حرام۔ تو اس ناجائز حکومت کیلئے سعی و امداد ناجائز و حرام اور حکم قرآنی کے خلاف ہے۔

(۲) جواب میں دوسری وجہ مفتی کفایت اللہ صاحب نے یہ لکھی ہے کہ اجنبی قوم کو حق نہیں کہ ہمارے ملک پر ہماری مرضی کے خلاف جبراً حکومت کرے، ہم اس کی حکومت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، یہ ہمارا فطری عقلی عرفی بین الاقوامی حق ہے۔ ان لفظوں کے معنی مفتی صاحب بیان کر دیں تو بہت بہتر ہو کیونکہ اس سے تردد ہو رہا ہے کہ ہمارا ملک سننے کا حقدار کون ہے اور اس استحقاق کی بنا کس چیز پر ہے؟ اگر کیسے قبضہ پر، تو قبضہ انگریزوں کا موجود ہے۔ اور اگر کیسے پیدائش پر، تو کیا وہ ہندو یا مسلمان اجنبی سمجھے جائیں گے جو ولایت یا عرب یا اور کسی ملک میں پیدا ہوئے اور ان کے آباء و اجداد ہندوستان میں سکونت رکھتے تھے، وہ خود بھی ہندوستان میں سکونت رکھتے ہیں۔ اور کیا وہ انگریز جو ہندوستان میں پیدا ہوئے اجنبی ہوں گے اور ہندوستان کی حکومت بقول آپ کے ان کا فطری عقلی عرفی بین الاقوامی حق ہوگی اور آپ کے نزدیک انھیں جائز ہوگا کہ وہ ہندوستان کو اپنا ملک بنائیں۔ اسی طرح بہت سے افغانیوں، چینیوں، جاپانیوں کے ہندوستان میں اولاد ہوتی ہے، کیا ان سب کو حق ہے کہ ہندوستان

اپنا ملک کہیں۔ یا ہمارا ملک کہنے کا حق صرف اُن لوگوں کو ہے جو ہندوستان میں قدیم سے بودو باش رکھتے ہیں۔ اس تعہد پر مسلمان تو مسلمان، ہندو بھی ہندوستان کو اپنا ملک نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ یہاں کے قدیم باشندے نہیں ہیں۔

ذرا اپنے خداوندانِ نعمت (ہندو) سے پوچھ دیکھیے کہ وہ ملک کا حقدار کس کو سمجھتے ہیں اور ملک والا کس کو بتاتے ہیں؟ اجنبی کس کو ٹھہراتے ہیں؟ مسلمانوں سے کتنی مرتبہ کہا گیا ہے کہ تم ہندوستان سے چلے جاؤ، تمہارا اس ملک میں کوئی حق نہیں ہے۔ جن کے آپ ہمنوا ہیں اور جن کی محبت میں آپ نے دین تک کو خیر باد کہہ دیا ہے، وہ ہندوستان کو خواص اپنا بتاتے ہیں اور مسلمانوں کو غیر ملکی پر دلیسی کہتے ہیں۔ جب کانگریس یہ مطالبہ کرے کہ ہندوستان ہمارا ہے، اجنبی چلے جائیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ انگریز اور مسلمان دونوں بویا بدھنا اٹھا کر چلتے ہوں۔ اگر جمعیت یا مفتی جمعیت کانگریس کو اس معاملہ میں حق پر سمجھتی ہے تو وہ ہندوستان سے مسلمانوں کے اخراج کی مساعی ہے۔

مفتی کفایت اللہ صاحب نے فطری حق کے کیا معنی لیے ہیں؟ یہی کہ جہاں جو پیدا ہو جائے وہ جگہ اُسی کے لیے ہے، دوسرے کو اس سے کچھ سروکار نہیں یا کچھ اور؟ اگر یہی معنی ہیں تو کڑی کو دیک سے، کتاب کو کیڑے سے، چارپائی کو کھٹل سے، اگر آپ صاف کرنا چاہیں تو یہ ظلم ہوگا کیونکہ بقول آپ کے سر جو فطری حق ہے، چارپائی کھٹل کا فطری حق ہے، کتاب کیڑے کا فطری حق ہے اور اس کے علاوہ یہود کو جزیرہ عرب سے نکال دینے کا حکم پیغمبر خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دیا، تو کیا آپ کے نزدیک حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فطری حق سلب کیا تھا؟ اور اس ہندوستان میں جو مسلمان دوسرے ممالک سے سلطنت کرنے کے لیے آئے، وہ بھی اجنبی تھے، پر دلیسی تھے، ہزاروں میل دور کے رہنے والے تھے، ہندوستانی ان کی سلطنت سے راضی نہ تھے تو کیا آپ کا یہی فتویٰ ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر جبری حکومت کی اور ہندوؤں کا فطری حق چھینا اور وہ سلطنت فطرۃً، عقلاً، عرفاً اور بین الاقوامی طریقہ سے ناجائز تھی؟ اور جس قدر تصرفات انہوں نے ملک میں کیے وہ سب ظلم تھے؟

کھل کر کہیے اور اگر آپ یہ کہنے کے لیے تیار ہوں تو آپ کو اعلان کر دینا چاہیے کہ سلطنت

اسلام کی مٹا کی ہوئی اہلک و معافیات و اوقاف پر جو مسلمان قابض ہیں، یہ قبضہ ناجائز ہے، یہ سب ہندوؤں کو واپس کر دینا چاہیے۔ اور جس سلطنت کا ہندوستان میں قبضہ ہی ناجائز تھا اور اُس کو فطری، عقلی، عرفی، بین الاقوامی طور پر کوئی حق ہی حاصل نہ تھا، اُس نے جتنی مسجدیں بنائیں، وہ بھی سب غصب کی زمین تھیں، اُن کے لیے کیا حکم ہے؟ اگر ہندوؤں کو واپس دینے کا فتویٰ دے دیجیے تو آپ کا کام بن جائے اور جو مصلح نظر ہے وہ پورا ہو جائے اور آپ کے ہندو آقا یا بی نعمت خوب خوش ہوں۔ آپ ہندوؤں کی محبت میں اس قدر محو ہیں کہ اسلام و حکومت کا اسلام پر درپردہ حملے کر رہے ہیں۔ اس کو ہندو پرستی نہ کہا جائے تو اور کیا کہا جائے؟ جس کے مقابل نہ شریعت کی پروا ہے نہ دین کی، نہ مسلمانوں کے طریق و آئین کی۔ انگریزوں کی مخالفت تو ایک بہانہ ہے، اصل مقصود تو ہندوؤں کو راضی رکھنا اور مسلمانوں کو کٹھانا اور مردانا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہلاک کر دادو، پھر ہندوستان صرف تمہارے دوستوں ہی کے لیے رہ جائے گا۔ سوراج ہی سوراج ہے۔ حامی سوراج ہونو ایسا ہو، قوم مٹ جاتے، مذہب برباد ہو جائے، مگر ہندو راضی رہیں۔ خوب حق نمک ادا کیا۔ واہ مفتی! (اللہ تعالیٰ ہدایت نصیب کرے)

(۳) مفتی کفایت اللہ صاحب نے لکھا ہے:

”چونکہ ہمارے پاس مادی قوت نہیں ہے اس لیے ہم تشدد کا طریقہ اختیار کرنے سے مجبور ہیں۔“

یہاں تو انگریزوں سے جنگ آزما ہونے سے انکار اور مجبوریوں کا اظہار ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما رہے ہیں کہ:

”اگر ہمارے افراد اس کے لیے تیار ہیں کہ وہ لاٹھیاں کھاتیں، سنگینیں اور برچھیاں، چھڑے اور گولیاں اپنے سینوں پر لیں تو یقیناً انھیں اپنے حق آزادی کے لیے یہ طریقہ اختیار کرنا جائز ہے۔“

مفتی صاحب کی یہ دونوں تعلیمیں باہم مخالفت و متضاد ہیں۔ ایک میں مادی طاقت نہ ہونے سے جنگی مجبوری کا اظہار ہے۔ دوسرے میں لاٹھیاں، سنگینیں، برچھیاں، چھڑے، گولیاں کھانے کے لیے مسلمانوں کو ابھارا گیا ہے۔

جب تمہارے پاس مادی طاقت نہیں ہے، نہ تم دشمن کو مار سکتے ہو، نہ اُن کی مار کو روک سکتے ہو، تو چُھرے، گوبیاں اور سنگینیں کھانے سے کیا نتیجہ؟ مسلمان گوبیاں کھا کر مر گئے تو آزادی کون لے گا؟ کہو چارے یا رہندو، جن کے اوپر ہم مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا چاہتے ہیں۔ کیا ستم ہے، ہندوؤں کے لیے ملک خالی کرانے کے واسطے مسلمانوں کو مرنے اور جان کھونے کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

جب آپ کا یہ فتویٰ ہے اور مسلمانوں کو نشانہ بندوق بننے کا آپ مشورہ دیتے ہیں تو خود کیوں ایسے موقع پر آگے نہیں بڑھتے؟ جناب کی ساری بہادری اُسی وقت تک ہے جب تک بندوق کا رُخ دوسرے مسلمانوں کی طرف ہو اور جو جناب مفتی صاحب کی طرف بندوق کا رُخ ہو تو ابھی معافی مانگ لیں اور فتویٰ یاد نہ آتے۔ یہ فتویٰ اپنے گھر چھوڑ کر سارے جہان کے لیے ہے۔ اپنے گھر پر آفت آنی دیکھیں تو ہندوؤں کی دوستی سے بھی دست بردار ہو جائیں مفتی صاحب کی طرف سے بہت سے بلند آہنگیاں کرنے والے بہادر جو مسلمانوں کو بڑھاوے دے کر کنوئیں میں دھکیلا کرتے تھے، معافی مانگ بیٹھے اور تحریک کے مخالف ہو گئے۔

اب رہی یہ بات کہ جب کفار سے مقابلہ کی قوت نہ ہو، اُس وقت اُن کے مطابق ہو جانا اور اُن کی تیغ و سنان سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنا جو مفتی صاحب نے جائز لکھا ہے، اس جواز سے کونسا جواز مراد ہے؟ جواز سوراجی یا فطری یا عقلی یا بین الاقوامی کون سا جواز؟ جواز فطری اگر ہوتا تو اس پر آپ کوئی شرعی دلیل تحریر فرماتے تو کہاں سے فرماتے؟ شریعت کے تو خلاف کہہ رہے ہیں۔ شریعت نے تو مسلمانوں کو اپنی جان کی حفاظت کا حکم دیا ہے، کسی مباح کام کے کرنے یا ترک کرنے پر اگر اُس کو جان کا اندیشہ ہو اور دشمن قتل کرنے یا کم سے کم کسی عضو کے تلف کرنے پر آمادہ ہو، تو مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ اپنی بات پر اڑ رہے اور اور یہ کہے کہ میں تو مباح کام کرتا ہوں، جائز کام کرتا ہوں، ہرگز اس سے باز نہ آؤں گا۔ اگر اُس نے ایسا کیا اور دشمن نے اُس کو مار ڈالا، تو وہ گنہگار ہو گا اور اُس پر الزام ہو گا کہ اُس نے اپنی جان ہلاک کرنے میں دشمن کو مدد پہنچائی، بلکہ اگر کسی حرام کام پر بھی مجبور کیا جائے، تو شریعت مسلمان کی جان کی حفاظت مقدم رکھتی ہے اور یہ حکم دیتی ہے کہ جان بچانے کے لیے

حرام کا ارتکاب کرے۔ اس ارتکاب پر اللہ تعالیٰ اُس کو نہ پکڑے گا۔

زیادہ بسط تو کیا کیا جاتے، آپ کو ہدایہ کی صرف ایک عبارت دکھا دی جاتی ہے۔ متداول کتاب ہے، ملاحظہ کیجیے:

ان اكره على ان ياكل الميتة او يشرب الخمر فاكوه على ذلك
بحبس او يضرب او قيد لم يحل له الا ان يكره بما يخاف منه
على نفسه او على خصوص اعضائه فاذا خاف على ذلك ان يهدم
على ما اكره عليه وكذا على للذالدم ولحم الخنزير لان
تناول هذه المحرمات انما يباح عند الضرورة كما في حالة
الخمسة لقيام المحرم فيما وراءها ولا ضرورة الا اذا خاف
على النفس او على العضو حتى لو ضعف على ذلك بالضرب الشديد
وغلب على ظنه ذلك يباح له ذلك ولا يسعه ان يصبر على ما
توجد فان صبر حتى ارقعوا به ولم ياكل فهو اثم لانه
لما ابيح كان بالامتناع معاونا لغيره على هلاك نفسه فياثر
كما في حالة الخمسة۔

مردار کھانا اور شراب پینا شرعاً حرام ہے اور اس سے باز رہنا مسلمان کا دینی و شرعی فرض ہے۔ جو مسلمان مردار کھانے یا شراب پینے سے انکار کرتا ہے، وہ نہ فقط امر جائز کا مرتکب ہے بلکہ اپنے فرض کو ادا کر رہا ہے، لیکن جس حالت میں کوئی شخص اُس کو ان چیزوں کے کھانے پینے پر مجبور کرے اور قتل یا قطع عضو پر آمادہ ہو جائے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ ان چیزوں کو نہ کھائے پئے اور قتل ہو جائے۔ اگر مسلمان نے ایسا نہ کیا اور مارا گیا تو گنہگار ہوگا اور اپنی جان ہلاک کرنے میں دشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ ہر ایک کی مذکورہ بالا عبارت میں یہ مضمون صاف و صریح موجود ہے۔ مفتی کفایت اللہ صاحب کی یہ طبع زاد دلیل کہ حق آزادی کا طلب کرنے والا ایک امر جائز کا مرتکب تھا، حکومت نے اگر گولیاں برسائیں تو یہ اُس کا فعل ہے اور اس کی ذمہ داری منہ بوا پر کچھ نہیں۔ یہ اُن کی اپنی ذاتی رائے ہے اور رائے بھی ایسی جو شریعت کے خلاف۔ شریعت اُس

فرض کو گنہگار بتاتی ہے، اپنے دشمن کی اعانت کا مجرم قرار دیتی ہے، مگر مولوی کفایت اللہ صاحب خلاف شرع اُس کو بری اور بے گناہ کر رہے ہیں۔ آپ کی دلیل نہ قرآن سے مقتبس، نہ حدیث سے، نہ فقہ سے معلوم نہیں ہندوؤں کے دھرم شاستر سے آپ فتویٰ دیتے ہیں یا کانگریسی قانون سے؟ غرض جو کچھ بھی یہ فتویٰ شریعتِ حقہ کے خلاف ہے۔

آپ نے اس کی مثال میں لکھا ہے کہ:

”دفعہ ۴۴۴ کی خلاف ورزی کریں اور پانچ سو اشخاص ایسے مہتیا کیے جائیں جو جمع ہو کر جلسہ کریں اور حکام کے اس حکم سے کہ منتشر ہو جاؤ، منتشر نہ ہوں۔ اس قصد سے جلسہ شروع کیا گیا اور فرض کر دو کہ صرف بہن پانچ سو اشخاص تھے کہ سب عدم تشدد کے پابند تھے۔ حکام آئے اور انہوں نے حکم دیا، منتشر ہو جاؤ۔ انھوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ اس صورت میں حکومت کا فرض یہ ہے کہ اُن سب کو آدمیت کے ساتھ گرفتار کرے اور قانونی کارروائی کرے۔ مگر بسا اوقات حکومت آئین اور انسانیت کے ساتھ اُن لوگوں کو گرفتار کرنے کے بجائے کبھی تو لاطھیوں سے پٹوا کر منتشر کرتی ہے اور کبھی گولیاں چلا کر بہیمیت و بربریت کا انتہائی مظاہرہ کرتی ہے اور ظالمانہ کارروائی سے مظلوموں کا وہ فعل ناجائز نہ ہو جائے گا، جو عقل و انصاف اور مذہب کے خلاف نہ تھا اور جو لوگ اس بربریت اور بہیمیت کا شکار ہو کر شہید ہو گئے وہ یقیناً مظلومیت کی وجہ سے شہادت کا درجہ پائیں گے۔ اُن کو خودکشی کا ترکیب بتانا سخت جہالت اور ناواقفیتِ احکامِ شرعیہ کی دلیل ہے۔“

مذکورہ بالا لفظ کشیدہ عبارت مفتی کفایت اللہ صاحب کی ہے۔ اس میں آپ نے خودکشی کا ترکیب بتانے والوں کو سخت جاہل اور ناواقفِ احکامِ شرعیہ تو فرمایا مگر احکامِ شرع نقل نہ فرمائے، جو دفعہ ۴۴۴ کو توڑنے پر اپنی جانیں ہلاکت میں ڈالنے والوں کو مظلوم اور شہید قرار دیتے اور آپ وہ احکام بیان کہاں سے کرتے؟ شریعت میں تھے کہاں؟ شریعت کے خلاف تو آپ نے خود فتویٰ دیا ہے، احکامِ شرعیہ کے نام پر عوام کو مغالطہ دیا ہے۔ دفعہ ۴۴۴ کی خلاف ورزی شرعاً فرض نہیں، نہ اس کی موافقت مردار اور شراب کی طرح حرام۔ غایت یہ ہوگی کہ ایک امر جائز ہو،

اُس کے لیے جان کا ہلاک کرنا کس طرح مظلومیت اور شہادت ہو گا جبکہ شریعت نے مردار اور حرام شراب جیسی چیزوں سے محترز رہنے پر جان کا ہلاکت میں ڈانچا نہیں رکھا اور ایسے شخص کو اپنے قتل کا معین اور گناہگار قرار دیا، جیسا کہ ہدایہ کی مذکورہ بالا عبارت سے ظاہر ہے۔ شریعت اُس شخص کو ظالم کا معین قرار دیتی ہے اور آپ مظلوم۔ شریعت اُس کو گناہگار بتاتی ہے۔ شریعت کے حکم کی آپ ملامت مخالفت کر رہے ہیں اور جہالت و ناواقفیت کا الزام دوسروں پر۔

جہالت تو یہ ہے کہ آپ نے خود اپنے فتوے میں لکھا کہ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ: ”ہم اپنی طرف سے کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس کا نتیجہ حکومت کی جانب سے تشدد ہو“ اور خود ہی اس کے خلاف یہ فتویٰ دیا کہ: دفعہ ۴۴ کی مخالفت میں اڑے رہنا اور جان دے دینا شہادت ہے۔ ایک ہی صفحہ میں اتنا بڑا تعارض! اُسی صفحہ میں آپ نے قانون شکنی کو جائز قرار دیا اور اُسی صفحہ میں حکومت سے قانونی کارروائی کرنے اور دفعہ ۴۴ کا خلاف کرنے والوں کو گرفتار کرنے کا مطالبہ کیا۔ جس قانون کی آپ مخالفت کرتے ہیں اُسی قانون کے برتاؤ کرنے کی گورنمنٹ سے استدعا کرتے ہیں، منتی صاحب یہ فتویٰ کس خمار میں بیٹھے لکھ رہے تھے، جو اپنی ہی بات خود بار بار کاٹتے تھے اور حافظہ نباشد کا مضمون پیش آتا رہتا تھا۔ آپ کے اس فتوے نے بہت سے مسلمانوں کی جانیں کھوئیں، جنہوں نے شہادت سمجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالا اور خدا جانے اور کتنے آپ کی تیغِ ستم کے قیل ہوں گے اور آپ کے اس خنجرِ خونخوار کی دھار سے موت کے گھاٹ اُتریں گے، مسلمانوں کو تو یہ غلط فتویٰ دے کر مروا ڈالو اور ہندوؤں کے لیے ملک خالی کر دو۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔

مولوی کفایت اللہ نے غیر مسلم کے اس فتویٰ میں بہادر مفتی نے لکھ دیا کہ شرعی احکام کے دائرے میں رہتے ہوئے غیر مسلم کے احکام کی اطاعت ناجائز نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے تو آپ رسولِ نافرمانی اور قانون شکنی کا حکم کس طرح دے سکتے ہیں؟ آپ کی جو بات ہے متضاد۔ اس سے بھی دگر دیکھیے تو یہ بتائیے کہ غیر مسلم کے احکام کی اطاعت کا جواز جناب نے کس دلیل شرعی سے لکھا ہے؟

آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ اپنے فتوے کے اوّل میں لکھ چکے تھے: ”مسلمان جو ان الحکمہ“

اور — وَ كُنْ يَجْعَلَ اللَّهُ لِلْكَافِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا پر ایمان رکھنے میں
 طوعاً کسی وقت کسی طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت نہیں کر سکتے۔ یہ آپ ہی کا مقولہ تھا اور
 آپ ہی غیر مسلم کے احکام کی اطاعت جائز بنا رہے ہیں۔ اُس میں تو یہ تعلیم تھی کہ کسی وقت کسی
 طرح بھی غیر خداوندی احکام کی اطاعت جائز نہیں۔ اب کون سی طرح جواز کی نکل آئی، یا گاندھی جی
 کے احکام کو خداوندی احکام سمجھ لیا، معاذ اللہ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔

وہ آیتیں جو آپ نے خود نقل کی تھیں اُن پر اب عمل کیوں نہیں ہے؟ اب اُن کے خلاف
 کیوں گاندھی کی اطاعت جائز کی جا رہی ہے؟ غرض مفتی صاحب کے فتوے کا بطلان خود اُن کے
 کلام سے بھی ثابت ہوا۔ گاندھی کی اطاعت اور اسے رہنا بنانا، اُس کا ماتحت اور لشکری بننا
 کسی طرح بھی جائز نہیں۔ انگریزوں کی اطاعت کے جواز کی وجہ تو مفتی صاحب نے مجبوری بتائی
 تھی، یہاں تو کوئی مجبوری بھی نہیں ہے۔ پھر جعلی اللہ للکفرین علی المؤمنین کی مخالفت
 کر کے گاندھی کی اطاعت کس طرح جائز کی جاتی ہے؟ یہ چند باتیں نمونہ کے طور پر لکھ دی گئیں، فتویٰ
 بہت اغالیط پر مشتمل ہے۔ اگر مفتی صاحب نے قلم اٹھایا اور چاہا تو اُن کے باقی ماندہ اغالیط بھی
 پیش کیے جاسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو راہِ ہدایت نصیب فرمائے، کجروی و گمراہی سے
 بچائے۔ آمین و صلی اللہ تعالیٰ علی سید المرسلین محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

کتبہ العبد المقتضم بجلد المتین
 محمد نعیم الدین عفا عنہ المعین

مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مفتی اعظم دہلی شاہ محمد مظہر اللہ دہلوی، مولانا سلیمان اشرف
 ہماری، مولانا قاضی احسان الحق نعیمی اور مولانا مفتی محمد عمر نعیمی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ حضرات جن کی
 گاندھی فریق کے خلاف چند نگارشات پیش کی ہیں، یہ اور دیگر تمام علمائے اہلسنت جو ہر قدم پر
 مسلمانوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے تھے، یہ بریلی کے اُس مردِ حق آگاہ کی فوج کے
 بزنیل اور سپاہی وغیرہ تھے جس کو اللہ رب العزت نے چودھویں صدی کی تجدید کا منصب مرحمت

فرمایا تھا، جو مسلمانوں کی ہر بڑے اور چھوٹے معاملے میں رہنمائی کر رہا تھا، جو ہر گمراہ اور گمراہ گمراہ کو گمراہ بنانے میں پیش پیش تھا، محمدی کچھار کے جس شیر خراں کے رو برو ہونے کی نہ کسی شیخ الہند کے ملانے والے کو جرأت ہوئی نہ کسی شیخ الاسلام کو، جس کے سامنے نہ کوئی امام الہند زبان کھول سکے اور نہ شیخ اکمل، جس کے بالمقابل نہ کسی بوطانوی قطب الاقطاب کا چراغ جل سکا نہ تخریب دین کے سلسلے میں برٹش گورنمنٹ سے چھ سو روپیہ ماہوار معاوضہ لینے والے حکیم الامت کا۔ وہ امام محمد غزالی امام فخر الدین رازی اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہم جیسے سابقہ مجدد دین کی طرح دین و ملت کی تجدید کا فریضہ ادا کر رہا تھا، گمراہ گروں کے جملہ شبہات کو مناکر دلائل و براہین کے ذریعے مطلع صاف کر رہا تھا۔ چنانچہ ویلے اسلام کے اُسی فقیہ اعظم، مرکز دائرہ تحقیق اور مرجع ہر خاص و عام کے سامنے اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر حاکم علی نقشبندی مجددی اور اسلامیہ ہائی اسکول لاٹپور کے سابق ہیڈ ماسٹر چودھری عزیز الرحمن نے یکے بعد دیگرے دو استفتاء ۱۹۲۰ء میں اُس وقت پیش کیے جب گاندھی کی آندھی چڑھی ہوئی تھی۔ نام نہاد تحریک خلافت اور ترک موالات کے فتنے کی صدائے بازگشت سے ملک کا ہر گوشہ گونج رہا تھا۔ آپ نے دلائل و براہین سے مزین ایسا جواب دیا، جس کی نظر اس موضوع پر لکھے ہوئے سارے اسلامی لٹریچر میں پائی نہیں جاتی وہ جواب الحجۃ المومنین کتاب کی شکل میں آج بھی موجود ہے اور اس بات کا مستحق ہے کہ اُس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جائے، اسکولوں اور کالجوں میں اُسے رائج کیا جائے کیونکہ اس لحاظ سے یہ کتاب وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ یہی دو قومی نظریے کا وہ نمٹ سبق ہے جو آخر کار ہندو کے چر کے کھانے کے بعد علامہ اقبال مرحوم اور محمد علی جناح جیسے بیدار مغز لیڈروں کو بھی اپنا ناٹھ اور جو قیام پاکستان کا باعث ہوا۔ آپ نے دلائل و براہین سے جواب دیتے ہوئے ترک موالات کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں کی حالت پر اظہارِ تا مسف کیا اور فرمایا:

”افسوس اور سخت افسوس یہ کہ آج آپ کو جتنے لیڈر دکھائی دیں گے، وہ اور اُن کے بازو اور اُن کے ہم زبان عام طور پر اُنہیں اسکولوں کالجوں کے کاسے لیس ملیں گے۔ اُنہیں سے بڑی بڑی ڈگریاں ایم۔ اے۔ بی۔ اے کی پاس ہوئے ہوں گے۔“

کیا اُس وقت اُن میں یہ جہالتیں نہ تھیں، ضرور تھیں مگر ان صاحبوں کو مقبول اور منظور تھیں۔ اور اب جو آنکھ کھلی، تو صرف ایک گوشہ انگریزوں کی طرف کی اور وہ بھی شریعت پر زیادت کے ساتھ کہ اُن سے مجبورِ معاملت بھی حرامِ قطعی بلکہ فہر اور مشرکوں کی طرف کی پہلے سے بھی زیادہ پٹ ہو گئی کہ اُن سے دوا و اتحاد واجب، بلکہ اُن کی غلامی و انقیاد فرض، انھیں راضی کر لیا تو خدا کو راضی کر لیا۔ تو ثابت ہوا کہ اسلام ان حضرات کو نہ جب بد نظر تھا، ورنہ ایسی محترَب دین تعلیموں سے بھاگتے، ناب بد نظر ہے، ورنہ مشرکوں کے اتحاد و انقیاد کے فتنے نہ جاتے۔ ۱۷

قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر کفار سے ترکِ موالات کا حکم دیا ہے کہ گاندھوی علماء کی جرأت کا اندازہ بھلا کون کر سکتا ہے جنہوں نے قرآن و سنت کے صریح احکام کو پس پشت ڈال کر افراط و تفریط کا اس ایک ہی مسئلے میں وہ المناک منظر دکھا دیا جو تاریخ کا ایک شرمناک باب ہو کر رہ گیا ہے۔ ترکِ موالات کے فتوے جاری کر کے انگریزوں سے محض معاملت بھی حرام ٹھہرانے لگے اور دوسری جانب مشرکین ہند سے نہ صرف موالات جائز رکھے بلکہ اُن کی غلامی کو اپنے اُپر فرض قرار دے لیا اور اُن کی تبلیغ کا مرکزی نقطہ یہی ہو کر رہ گیا۔ اعلیٰ حضرت، مجدداتہ حاضرہ، امام احمد رضا خاں بریلوی قدس سرہ نے گاندھوی علماء کے اس طرزِ عمل پر یوں تنبیہ فرمائی تھی:

”ترکِ معاملت کو ترکِ موالات بنا کر قرآنِ عظیم کی آیتیں کہ ترکِ موالات میں ہیں سُوجھیں، مگر فتویٰ مسٹر گاندھی سے، اُن سب میں استثنائے مشرکین کی پھر لگائی، کہ آیتیں اگرچہ عام ہیں مگر ہندوؤں کے بارے میں نہیں۔ ہندو تو با دیانِ اسلام ہیں۔ آیتیں صرف نصاریٰ کے بارے میں ہیں اور نہ کل نصاریٰ فقط انگریز اور انگریز بھی کل تک ان کے مورد نہ تھے، حالاتِ حاضرہ سے ہوئے۔ ایسی ترمیمِ شریعت و تغیرِ احکام و تبدیلِ اسلام کا نام خیر خواہی اسلام رکھا ہے۔ ترکِ موالات کفار میں قرآنِ عظیم ایک دودس میں جگہ تاکیدِ شدید پر اکتفا نہ

فرمانی بلکہ کثرت، جا بجا کان کھول کر تعلیم حق سنائی اور اُس پر بھی تنبیہ سنادی کہ:
 قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ اِنْ كُنْتُمْ لَتَعْقِلُوْنَ ۝ ہم نے تمہارے لیے آیتیں
 صاف کھول دی ہیں اگر تمہیں عقل ہو۔

مگر تو بہ! کہاں عقل اور کہاں کان؛ یہ سب تو دوا دہند پر قربان۔ لاجرم
 اُن سب ہندوؤں کا استثناء کرنے کے لیے بڑے بڑے آزاد لیڈروں نے قرآنِ عظیم
 میں تحریریں کیں۔ آیات میں پیوند جوڑے، پیش خویش واحد تبار کو اصلاحیں دیں۔
 ان کی تفصیل گزارش ہو تو دفتر طویل نگارش ہو۔“ لے

گاندھوی علماء جو رام راج (سوراج) کی خاطر ہندوؤں پر نشانہ تھے، اُن کے بندہ بے دام ہو کر
 اللہ جل شانہ سے منہ پھیر بیٹھے، خوفِ خدا اور خطرہ روزِ جزا سے عاری ہو کر ترکِ موالاتِ کفار کی آیتوں
 میں ہنود کا استثناء کرتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی خاطر سوراج کا نام آزادی
 اور ہنود کی غلامی کو ہندو مسلم اتحاد بنا کر ہلکا ٹھہراتے تاکہ عام مسلمان ان کی اسلام دشمنی اور ملت فروشی
 پر مطلع نہ ہو جائیں۔ اس پر فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے فرمایا:

”مقصود سیلف گورنمنٹ ہے، جس کی صاف تصریح بڑے بڑے لیڈران نے کر دی،
 بلکہ عجز و بیکہ کر مشرکوں کا دامن پکڑا، اُنہیں اپنا یار و انصار بنایا، اوروں کو چھوڑ دیے،
 مولویوں میں گنے جانے والے لیڈر فرماتے ہیں: ہم ہندوستان کی آزادی کو ایک
 فرضِ اسلامی سمجھتے ہیں، اس کے لیے ضرورت ہے کہ عام اتحاد ہو اور پوری کوشش
 سے مقصد حاصل کیا جائے۔“ حالانکہ مشرکوں سے ایسی استعانت نصِ قرآنی کے
 خلاف اور قطعاً حرام بلکہ مراءتہ قرآنِ کریم کی تکذیب ہے۔“ لے

قرآنِ کریم نے جملہ کفار سے ترکِ موالات کا حکم دیا ہے۔ گاندھوی علما نے ہنود کی محبت سے سرشار
 ہو کر مشرکین ہند کا سورہ متحنہ کی آیت کریمہ لَا يَنْفِكُمُ اللّٰہُ سے استثناء نکالنا شروع

کر دیا۔ مجددائے حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد کتب معتبرہ یعنی تفاسیر و احادیث، فقہ و فتاویٰ کے حوالوں سے اس کی پانچ تفاسیر پیش کیں کہ:

- ۱۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے نزدیک بنو خزاعہ کے متعلق ہے۔
- ۲۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک وہ مسلمان مراد ہیں جنہوں نے اس آیت کے نزول تک مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب ہجرت نہیں کی تھی۔
- ۳۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس سے کفار کی عورتیں اور بچے مراد ہیں۔
- ۴۔ اکثر مفسرین و محدثین کے نزدیک یہ حکم والدہ اسماء بنت ابوبکر کے متعلق ہے۔
- ۵۔ بعض مفسرین کے نزدیک یہ مطلق اُن کافروں کے بارے میں ہے جو مسلمانوں سے نہ لڑے اور اس معنی کے لحاظ سے یہ آیت منسوخ ہے۔ حضرت امام اہلسنت نے وضاحت فرمائی کہ ہمارے اکابر احناف کے نزدیک یہ آیت دربارہ اہل قبیلہ اور اس لحاظ سے احناف کے نزدیک یہ آیہ کریمہ محکم ہے۔ اس وضاحت کے بعد آپ نے ہنود کے بے شمار مظالم شمار کر کے ہندو نواز لڑے کو یوں مخاطب کیا:

اب کوئی ستم رسیدہ مسلمان ان لیڈروں سے یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اے اسٹیجوں پر مسلمان بننے والو! ہندوئی اسلام کا ظاہری تانا تہنے والو! کچھ حیا کا نام باقی ہے تو ہندوؤں کی گنگا میں ڈوب مرو۔ اسلام و مسلمین و مساجد و قرآن پر یہ ظلم توڑنے والے، کیا یہی تمہارے بھائی، تمہارے چچیتے، تمہارے پیارے، تمہارے سردار، تمہارے پیشوا، تمہارے مددگار، تمہارے غمگسار، مشرکین ہند نہیں؟ جن کے ہاتھ آج تم بکے جاتے ہو؟ جن کی جے مناتے، جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو؟ لے

گاندھوی علماء کہتے تھے کہ تمام ہندو تو مسلمانوں سے نہیں لڑتے بلکہ وہ بعض ہیں جنہوں نے مسلمانوں پر بعض جگہ مظالم ڈھائے، لہذا سب کو محارب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ حالانکہ اُن کی یہ پچر اسلام دشمنی

اور بت پرست نوازی کی آئینہ دار ہے کیونکہ قرآن کریم نے محارب یا غیر محارب کی تقسیم و تفریق نہیں فرمائی بلکہ گنہگار و مشرکین سے موالات رکھنا حرام قرار دیا ہے۔ گاندھوی حضرات کی راوی فرار بند کرتے ہوئے فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

”اب جس شہر، جس قصبہ، جس گاؤں میں چاہو آزما دیکھو۔ اپنی مذہبی قربانی کے لیے گائے بچاؤ۔ اس وقت یہی تمہاری باتیں پسلی کے نکلے، یہی تمہارے سنگے بجائی، یہی تمہارے منہ بولے بزرگ، یہی تمہارے آقا، یہی تمہارے پشتوا، تمہاری ہڈی پسلی توڑنے کو تیار ہوتے ہیں یا نہیں؛ ان متفرقات کا جمع کرنا بھی جہنم میں ڈالے۔ وہ جو آج تمام ہندوؤں بلکہ تم سب ہندو پرستوں کا امام ظاہر و بادشاہ باطن ہے یعنی گاندھی، صاف نہ کہہ چکا کہ مسلمان اگر قربانی گاؤں نہ چھوڑیں گے تو ہم تلوار کے زور سے چھڑا دیں گے۔ اب بھی کوئی شک رہا کہ تمام مشرکین ہندوین میں ہم سے محارب ہیں۔ پھر انھیں کہ یَقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ میں داخل کرنا نہری بے حیائی ہے یا صریح بے ایمانی بھی؟“

مجدد مآثر حاضرہ امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے موالات کے بارے میں انتہائی تنزل اختیار کر کے گاندھوی حضرات کی حرکاتِ شنیعہ و افعال و اقوالِ قبیحہ گنائے اور انھیں یوں شرمسار کیا ہے:

”ان صاحبوں سے یہ پوچھ دیکھیے کہ سب جانے دو، کہیمہ لَا یَنْتَهِکُمْ ہر مشرک غیر محارب کو عام ہو کر محکم ہی سہی اور مشرکین ہند میں کوئی بھی محارب نہ سہی۔ اب دیکھو تمہارے ہاتھ میں قرآن سے کیا ہے؟ خالی ہوا۔ افشہ تسم صواء کہیمہ لَا یَنْتَهِکُمْ نے کچھ نیک بڑاؤ، مالی مواسات ہی کی رخصت دی یا یہ فرمایا کہ انھیں اپنا انصار بناؤ؟ ان کے گھرے یار ہو جاؤ؟ ان کے طاغوت کو اپنے دین کا امام ٹھہراؤ؟ ان کی جے پکارو، ان کی حمد کے نعرے مارو، انھیں مساجد

مسلمین میں بادب تعظیم پہنچا کر، منہ مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر لے جا کر، مسلمانوں سے اونچا اٹھا کر، واعظ و بادئی مسلمین بناؤ، اُن کا مردار جیفہ اٹھاؤ، کندھے پر کھینکی زبان پر بجے یوں مر گھٹ پر پہنچاؤ، مساجد کو اُن کا ماتم گاہ بناؤ، اُن کے لیے دعائے مغفرت و نماز جنازہ کے اعلان کراؤ، اُن کی موت پر بازار بند کرو، سوگ مناؤ، اُن سے اپنے ماتھے پر قشتے لگواؤ، اُن کی خوشی کو شعا بر اسلام بند کراؤ، گائے کا گوشت کھانا گناہ ٹھہراؤ، کھانے والے کو کمینہ بتاؤ، اُسے شل سوڑ کے گناہ و خدا کی قسم کی جگر رام دہائی گاؤ، واحد قہار کے اسماء میں الحاد درچاؤ، اُسے معاذ اللہ رام یعنی سر چیز میں رہا ہوا، ہر چیز میں حلول کیے ہوا ٹھہراؤ، قرآن مجید کے ساتھ رامائن کو ایک ڈولے میں رکھ کر مندر میں لے جاؤ، دونوں کی پوجا کراؤ۔

اُن کے سر غنہ کو کہو، خدا نے ان کو تمہارے پاس مذکر بنا کر بھیجا ہے، یوں معنی نبوت جماؤ، اللہ عز و جل نے سید الانبیاء صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے یہی توفریا اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ تَم تو نہیں مگر مذکر اور خدا نے مذکر بنا کر بھیجا ہے اس نے معنی رسالت کا پورا نقشہ کھینچ دیا، ہاں لفظ بچایا، اُسے یوں دکھایا:۔

نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے اور امام و پیشوا و بجائے مہدی موعود تو صاف کہہ دیا، بلکہ اُس کی حمد میں یہاں تک اونچے اُڑے کہ خاموشی از ثنائے توحید ثنائے تست، صاف کہہ دیا کہ آج اگر تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کر لیا تو اپنے خدا کو راضی کر لیا، صاف کہہ دیا کہ ہم ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھا دے گا۔ صاف کہہ دیا کہ ایسا مذہب چاہتے ہیں جو سنگم و پریاگ کو مقدس علامت ٹھہرائے گا، صاف کہہ دیا کہ ہم نے قرآن و حدیث کی تمام عبرت پستی پر نثار کر دی۔ کیا کریمہ لَا يَنْهٰكُہُمْ میں ان ملعونات و کفریات کی اجازت دی تھی؟ لے

حضرت امام اہلسنت رحمۃ اللہ علیہ نے واضح تحقیق دیتے ہوئے فرمایا کہ کفار سے مدد لینے کی تین

صورتیں ہیں:

(۱) التجا (۲) اعتماد (۳) استخدام

پہلی دونوں صورتوں کی وضاحت کرنے کے بعد حکم یوں واضح فرمایا:

”یہ دونوں صورتیں (التجا و اعتماد) کفار کے ساتھ یقیناً قطعاً نصوص قطعیہ قرآنیہ سے حرام قطعی ہیں، جن کی تحریم کو پہلی اور دوسری دو ہی آیتیں کافی و دافی ہیں ہرگز کوئی مسلمان انھیں حلال نہیں کہہ سکتا۔ استخدام: وہ کہ کافر ہم سے دبا ہوا ہے۔

اُس کی چوٹیا ہمارے ہاتھ میں ہو، کسی طرح ہمارے خلاف پر قادر نہ ہو۔ وہ اگرچہ اپنے کفر کے باعث یقیناً ہمارا بدخواہ ہو گا مگر بے دست و پا ہے۔ ہم سے خوف و طمع رکھتا ہے۔ خوف شدید کے باعث اظہار بدخواہی نہ کر سکے یا طمع کے

سبب مسلمان کے بارے میں نیک رائے ہو گا۔“

حضرت امام عظیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ (المتوفی ۱۵۱ھ) نے اس استعانت کی صورت کے

بارے میں فرمایا ہے کہ: کَانَ اسْتِعَانَةً بِالْکَلَابِ۔ مجدد مآثر حاضرہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا:

”دو باتیں افادہ فرمائیں۔ ایک یہ کہ اُنھیں کُتتا بنا کر اُن سے مدد لے سکتے ہیں،

جیسے شکار میں کُتوں سے مدد لیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ہمارے ہاتھوں میں کُتوں

کی طرح مسخر ہوں کہ اُن کا فعل ہمارے ہی لیے ہو، ہمارے ہی دین کے اعزاز

کے واسطے ہو۔ کُتے سے شکار میں استعانت کب جائز ہوتی ہے، جبکہ وہ وقت

شکار سارا کام ہمارے ہی لیے کرے، اُس میں سے اپنے واسطے کچھ نہ کرے،

اگر شکار مارا اور ماشہ بھر اس کا گوشت کھالیا، شکار حرام ہے۔ تو استخدام

بتایا اور وہ بھی سب سے ذلیل تر یعنی جیسے کُتے سے خدمت لیتے ہیں اور شرط

فرمادی کہ وہ خود سری سے یکسر نکل کر محض ہمارے ہی آلہ کار بن گئے ہوں ! لے
مجدد مآثرہ حاضرہ قدس سرہ نے بتایا کہ استخدا م کی صورت میں سچی شرع مطہر نے کفار سے استعانت
کی عام اجازت نہیں دی ہے بلکہ اس کی چار صورتیں ہیں :

- ۱۔ اگر استخدا م کی صورت میں اُسے رازدار اور دخیل بنانا پڑے تو یہ استعانت بھی حرام۔
- ۲۔ اگر کوئی منصب یا عہدہ دینا پڑے تو یہ مسلمان پر اُس کا استعلا ہونے کے باعث حرام ہے۔
- ۳۔ بغیر ضرورت بھی کفار سے استعانت جائز نہیں۔
- ۴۔ ضرورت ہو اور اُس میں کافر کو رازدار یا دخیل نہ بنایا جائے اور کوئی منصب نہ دینا پڑے
تو استعانت جائز ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا :

”ان شروط و قیود سے مشروط استعانت نہ اُن کو رازدار و دخیل کار بنانا ہے کہ
آیت اولیٰ کا خلاف ہو، نہ اُن سے عزت چاہنا کہ آیت دوم کے مخالف ہو، ذیل
و قلیل سے کون عزت چاہے گا؟ نہ اُسے کوئی ولی و نصیر بنانا کہ گاہ کہ باقی آیات
کے خلاف ہو۔ یہ استعانت اگر ایسی نہیں جیسے کَتَبْتُ بِالْغَلَمِ میں تو ایسی ضرور ہے
جیسے لوگ چاروں کو پکڑ کر بیگار لیتے ہیں بلکہ جب اُنھیں کچھ مال دیا جاتا ہے تو ایسے
جیسے چار کو پیسہ دے کر جوتا گنٹھوا لینا۔ کیا اسے کوئی کہے گا کہ چار کو ولی و ناصر
بنایا، لاجرم کلمات علماء مخالف آیات نہ ہوئے یہ تھا حکم شرعی
جس کی تحقیق و تنقیح بحمد اللہ تعالیٰ اُس وجہ جلیل پر ہوئی کہ ان سطور کے غیر میں
نہ ملے گی۔“ لے

آپ نے خلافت کمیٹی کے سبق یعنی ترک موالات کے بارے میں ایک حقیقت پسندانہ جائزہ
لیتے ہوئے اس کے مبلغ لیڈروں اور گاندھوی علماء کے ضمیروں کو یوں مھنجھوڑا تھا :
”عقل باور نہیں کرتی کہ ان کی چیخ پکار سے تمام ہندو سندھ و بنگال و برہما و

افریقہ و جاداحتی کہ عدت تک کے مسلمان سب نوکریاں، ملازمتیں، زمینداریاں، تجارتیں یک نخت چھوڑ دیں۔ یہ شرطیں تو دو دن سے ہیں۔ صد ہا حرام نوکریاں پہلے ہی سے کر رہے ہیں، وہ تو چھوڑیں نہیں، مباح نوکریاں اور حلال تجارتیں، زمینداریاں کس طرح چھوڑیں گے؟

ان جلسوں، ہنگاموں، تبلیغوں، کراموں سے اگر سود و سود نوکریاں یا دس بیس نے تجارتیں یا دو ایک نے زمینداریاں چھوڑ بھی دیں تو اس سے ترکوں کا کیا فائدہ یا انگیزوں کا کیا نقصان؟ غریب نادار مسلمانوں کی کمائی کا ہزار ہا روپیہ ان تبلیغوں میں برباد جا رہا ہے اور جائے گا اور محض بیکار و نامراد جا رہا ہے اور جائے گا، ہاں لیڈروں، مبلغوں کی سیروسیاحت کے سفر خرچ اور جلسہ و اقامت کے پلاؤ فورے سیدھے ہو گئے اور ہوں گے۔ اگر یہ فائدہ ہے تو ضرور نقد وقت ہے اور سیر یورپ کا حساب تو روز حساب ہی کھلے گا۔ لے

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات جو شش تعصب میں یا اُن لیڈروں کی محبت میں محض بدگمانی قرار دیں لہذا ہم تحریک خلافت کے سرگرم حامی و کارکن اور گاندھوی بیڑے کے امیر البحر یعنی عالیجناب ابوالکلام آزاد کے اس بارے میں تاثرات پیش کر دیتے ہیں، کیونکہ موصوف کا بیان ایک عینی شاہد کے بیان کی حیثیت رکھتا ہے، چنانچہ موصوف کے تجربات و مشاہدات کو عبدالرزاق صاحب مدح آباد نے یوں نقل کیا ہے:

”خلافت تحریک کے سلسلے میں ہندوستان کے غریب مسلمانوں نے قابلِ فخر جذبہٴ ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بے شمار روپیہ خلافتِ فتنہ میں دیا۔ پردہ نشین خواتین نے زیور تک اُتار کے دے دیے۔ خود لیڈروں کا اعتراف تھا کہ چھپن لاکھ روپیہ جمع ہوا ہے لیکن اس کا مال فتنہ کا حشر کیا ہوا، ایک قلیل رقم تو ترکوں کو پہنچی باقی روپیہ کو مرنے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اُس زمانے میں خود میں اپنی آنکھوں سے

دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بیداری سے قومی روپ اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں۔
 اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترک تعاون کی تبلیغ کرنے والے علماء اور لیڈروں سے
 براہ راست بھی استفسار کیا کہ اُن میں سے کتنے حضرات نے اپنے فتوؤں اور ارشادات کے
 مطابق برٹش گورنمنٹ سے تعلق ترک کیا ہے؟ نان کو آپریشن کو اُن کی زندگیوں میں کہاں تک عمل دخل
 ہے؟ چنانچہ آپ نے پوچھا:

”کیا لیڈر صاحبان فہرست دکھائیں گے کہ ان برسوں کی مدت اور لاکھوں روپے
 کی اخراجات میں اتنا فائدہ مرتب ہوا؟ اتنوں نے نوکریاں چھوڑیں، اتنوں
 نے تجارتیں، اتنوں نے زمینداریاں؛ طرفہ کہ اُن کے خون گرم حامی بہم دم محرم
 اخبارات اس ترک تعاون پر بڑے بڑے زور لگاتا رہے ہیں، خود اپنے اخبارات
 مطالبہ کیوں نہیں بند کرتے؟ ان صیغوں کو تو انگریزوں سے جو گہرے تعلقات ہیں
 دوسرے صیغوں کو کم ہوں گے۔ کیا اوروں کے لیے شور و فغاں اور اپنے لیے
 نوش جاں؟ اور ایک اخباری و مطالبی کیا کریں، بڑے بڑے لیڈر بننے والے
 اسی مرض میں گرفتار ہیں۔ دیگر ان نصیحت و خود رافضیت..... ہجرت کا
 غل مچایا اور اپنے آپ ایک نہ سرکا۔ جو ابھارنے میں آگئے اُن مصیبت زدوں
 پر جو گزری گزری۔ یہ سب اپنے جو روپوں میں چین سے رہے، ہڑالگانہ پٹکری۔
 اور ترک تعاون میں بھی کیا کسی لیڈر کے پاس زمینداری یا کسی قسم کی تجارت نہیں؟
 نہ اُن کا کوئی انگریزی یا ریاست میں ملازم ہے؟ پھر اخصیں کیوں نہیں چھوڑتے؟
 لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ ۝

مجدد مآثر حاضر امام احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترک تعاون کی تبلیغ کرنے والے
 گاندھوی علماء اور مسلمانوں کو بے دست و پا بنانے کی گاندھوی اسکیم کو کامیاب بنانے والے
 لیڈروں سے یہ سوال بھی کیا کہ گاندھوی کے بہکانے اور ہندو کی دوستی کے نشہ سے سرشار ہو کر

لے عبدالرزاق طبع آبادی: ذکر آزاد، ص ۳۸۸

لے احمد رضا خاں بریلوی، امام: الحجۃ المومنین، ص ۸۸، ۸۹

آپ ترک تعاون کا ڈھول تو پیٹتے پھر رہے ہیں لیکن کبھی ہندوؤں کی طرف بھی دیکھا ہے کہ خود انھوں نے اس ترک تعاون کی تحریک پر کہاں تک عمل کیا ہے؟ اگر آپ حضرات کی آنکھیں کھلی ہوتیں تو صاف نظر آجاتا کہ یہ اسکیم صرف مسلمانوں کو بے دست و پا اور انگیزوں کا موردِ عتاب بنانے کے لیے چلائی گئی ہے۔ چنانچہ آپ نے اُن حضرات کو بڑوں مخاطب کیا:

”بغرض غلط و بغرض باطل اگر سب مسلمان زمینداریاں، تجارتیں، نوکریاں، تمام تعلقات یکسر چھوڑ دیں تو کیا تمہارے جگدی خیر خواہ، جملہ ہندو بھی ایسا ہی کریں گے؟ اور تمہاری طرح مجھ کے ننگے رہ جائیں گے؟ حاشا ہرگز نہیں، زہار نہیں اور جو دعویٰ کرے اس سے بڑھ کر کاذب نہیں، مکار نہیں۔ اتحاد و داد کے جھوٹے بھرتوں پر مجھو لے ہو، منافقانہ میل پر چھو لے ہو، سچے ہو تو موازنہ دکھاؤ کہ اگر ایک مسلمان نے ترک کی ہو تو دوسرے پچاس ہندوؤں نے نوکری، تجارت، زمینداری چھوڑی ہو کہ یہاں مالی نسبت یہی یا اس سے بھی کم ہے۔۔۔ لاجرم نتیجہ کیا ہوگا؟ یہ کہ تمام اموال گُل دو لٹیں، دنیاوی جمیع اموال، جملہ جائیدادیں صرف ہندوؤں کے ہاتھ میں رہ جائیں اور مسلمان دانے دانے کو بھیک مانگیں اور نہ پائیں۔ ہندو کہ اب انھیں پکائے ڈالتے ہیں جب بے خوف و خطر کچا ہی چبائیں۔ یہ ہے بیڈر صاحبوں کی خیر خواہی۔ یہ ہے حمایتِ اسلام میں جانکاہی۔“

قرآن کریم نے مسلمانوں کو بتایا ہے لَا يَأْتِيكُمُ خَبْرًا كَافَرْتُمْ هِيَ نَقْصَانِ پھپھانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ گاندھوی علماء اور لیڈروں نے اللہ رب العزت کو سچا نہ جانا، اُس کے فرمان پر یقین نہ آیا۔ ایک مشرک ٹھیٹ بُت پرست گاندھی نے اپنی حمایت کا یقین دلایا تو اُسے نہ صرف اپنا خیر خواہ بلکہ پیشوا مان لیا۔ مسلم لیگ، خلافت کمیٹی، جمعیتہ العلماء ہند، احرار پارٹی وغیرہ تمام جماعتوں نے گاندھی جیسے دشمنِ اسلام و مسلمین کو اپنا لجا دیا اور ہادی مطلق و امام علی الاطلاق بنالیا۔ اُس کی ہر حکیم پر عمل کرنا یہ اپنی سعادت سمجھتے اور قرآن و حدیث کی نصوص کو اُس پر اس طرح

منطبق کرنے میں کوشاں رہتے جیسے اصل ارشادات گاندھی ہیں اور قرآن و حدیث تو محض اُس کا
 ماشیہ اور شرح ہیں۔ یہ حق پرستی نہیں بلکہ زنا دوستی کی بدستی تھی۔ حضرت امام اہلسنت نے گاندھی کی
 جملہ ایکہیوں کا راز فاش کرتے ہوئے گاندھیوی علماء اور لیڈروں کی بے بصری کو واضح کیا اور انتہائی
 وسیع النظری سے اُس ہجرت، جہاد اور ترکِ معاملات کے مضمرات کو یوں الم نشرح کیا تھا،
 ”اؤ تمہیں قرآن عظیم کی تصدیق دکھائیں اور اُن (ہندو) کی طرف سے میل اور میل کا
 راز بتائیں۔ دشمن اپنے دشمن کے لیے یمن باتیں چاہتا ہے؛
 اولے اُس کی موت کہ جھگڑا ہی ختم ہو۔

دوم یہ نہ ہو تو اُس کی جلا وطنی کو اپنے پاس نہ رہے۔
 سوم یہ بھی نہ ہو سکے تو اخیر درجہ اس کی بے پری کہ عاجز بن کر رہے۔
 مخالف نے یہ تینوں درجے ان پر طے کر دیے اور ان کی آنکھیں نہیں کھلتیں بغیر خواہی
 سمجھے جاتے ہیں۔

اولاً جہاد کے اشارے ہوئے۔ اُس کا کھلا نتیجہ ہندوستان کے مسلمانوں کا فنا
 ہونا تھا۔

ثانیاً جب یہ نہ بنی، ہجرت کا مجھڑا دیا کہ کسی طرح یہ دفع ہوں۔ ملک ہماری کبڈیاں
 کھیلنے کو رہ جائے۔ یہ اپنی جائیدادیں کوڑیوں کے مول بچیں یا یونہی چھوڑ جائیں۔
 بہر حال ہمارے ہاتھ آئیں۔ ان کی مساجد و مزارات اولیاء ہماری پامالی کو
 رہ جائیں۔

ثالثاً جب یہ بھی نہ سمجھے تو ترکِ موالات کا جھوٹا حیلہ کر کے ترکِ معاملات پر ابھارا ہے
 کہ نوکریاں چھوڑ دو، کسی کو نسل کیٹی میں داخل نہ ہو، مانگڑاری ٹیکس کچھ نہ دو، خطابات
 واپس کر دو۔ امر اخیر تو صرف اس لیے ہے کہ ظاہری نام کا دنیاوی اعزاز بھی کسی
 مسلمان کے لیے نہ رہے اور پہلے تین اس لیے کہ ہر صیغہ و ہر محکمہ میں صرف ہندو رہ
 جائیں تو اُس وقت کا اندازہ کیا ہو سکتا ہے؛ مانگڑاری وغیرہ نہ دینے پر کیا انگریز
 چُپ بیٹھے رہیں گے؛ ہرگز نہیں۔ قرقیاں ہوگی، تعلیقے ہوں گے، جائیدادیں نیلام

ہوں گی اور ہندو خریدیں گے۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان صرف قلی بن کر رہ جائیں۔ یہ تیسرا درجہ ہے۔
 دیکھا تم نے قرآنِ عظیم کا ارشاد کہ وہ تمہاری بدخواہی میں گئی نہ کریں گے۔ اُن کی دلی تمنا ہے
 کہ تم مشقت میں پڑو، والعباد باللہ تعالیٰ ۱۱

یہ تو پھر ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء کی باتیں ہیں حالانکہ اُس وقت ہمارے عظیم لیڈر اور پاکستان کے بانی مہاتما
 یعنی ڈاکٹر سر محمد اقبال اور محمد علی جناح جیسے بھی ہندو مسلم اتحاد کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ اقبال
 مرحوم کبھی کہہ رہے تھے،

ہندی میں ہم وطن ہے ہندوستان ہمارا

لیکن جب اُن کی آنکھیں کھلیں ہندو کی اسلام دشمنی اور اسلامی تعلیمات پر گہری نظر پڑی تو مجذبات ثانی
 اور احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہما والے دو قومی نظریے کو اپنانا پڑا، جس کی ان دونوں بزرگوں نے
 اپنے اپنے وقت میں علمبرداری کا فریضہ ادا کیا تھا اور اس کے پیش نظر علامہ موصوف کو یہ نظریہ قائم
 کرنا پڑا،

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

جناب محمد علی جناح کی آنکھیں نہر پورٹ کے وقت جا کر کھلیں اور انھیں صاف نظر آ گیا کہ حقیقت
 میں فردوسِ گوش بنانے کے قابل وہی بریلی کے مرد قلندر کی آواز تھی، جس پر کوئی لیڈر اس لیے
 کان دھنا پسند نہیں کرتا تھا کہ سارے ہی گاندھی کی اندھی میں مست ہو کر تنکوں کی طرح اڑتے
 پھر رہے تھے۔ گاندھی علیٰ اُن کی حرکاتِ قبیمہ و اقوالِ شنیعہ پر شریعت کی مہریں ثبت کر کے
 جہاں لیڈروں کو شتر بے مہار بنا رہے تھے، وہاں اپنے علماءِ سوء اور ملت فروش ہونے کا زندہ
 ثبوت بھی پیش کر دیتا تھا۔ اگر اور بھی پیچھے کی طرف دیکھیں تو اس سے آٹھ سال پہلے ۱۳۳۱ھ/
 ۱۹۱۲ء میں پہلی جنگِ عظیم کے وقت آپ مسلمانانِ ہند کو یوں فہمائش کر رہے تھے؛

”ہندی مسلمانوں میں یہ طاقت کہاں کہ وطن و مال و اہل و عیال چھوڑ کر ہزاروں کو کس
 (ترکوں کے پاس)، جائیں اور میدانِ جنگ میں مسلمانوں کا ساتھ دیں، مگر مال تو
 دے سکتے ہیں۔ اس کی حالت بھی سب آنکھوں دیکھ رہے ہیں، وہاں مسلمانوں
 پر یہ کچھ گزر رہی ہے یہاں وہی جلسے ہیں، وہی رنگ، وہی تھیٹر، وہی امنگ،

وہی تماشے، وہی بازیاں، وہی غفلتیں، وہی فضول خرچیاں، ایک بات کی بھی کمی نہیں۔ ابھی ایک شخص نے ایک دنیاوی خوشی کے نام سے پچاس ہزار روپے ایک شخص نے ایک چنیں و چنوں جگہ کو پچاس ہزار دیے۔ ایک رئیس نے ایک کالج کو ڈیڑھ لاکھ دیے اور یونیورسٹی کے لیے توفیق لاکھ سے زائد جمع ہو گیا۔ ایک رات میں ہمارے اس مفلس شہر سے اُس کے لیے چھپیس ہزار کا چندہ ہوا۔ مہینے میں ایک کم درجے کے شخص نے صرف ایک کوٹھری چھپیس ہزار روپے کو خریدی۔ فقط اس لیے کہ اُس کے وسیع مکان سکونت سے ملتی تھی، جسے میں بھی دیکھ آیا ہوں۔ اور مظلوم اسلام کی مدد کے لیے جو کچھ جوش دکھائے جا رہے ہیں، آسمان سے بھی اُونچے ہیں اور جو عمل کارروائی ہو رہی ہے زمین کی تہ میں ہے۔ پھر کس بات کی اُمید کی جائے؟

بڑی ہمدردی یہ نکالی ہے کہ یورپ کے مال کا بائیکاٹ ہو۔ میں اسے پسند نہیں کرتا، نہ ہرگز مسلمانوں کے حق میں کچھ نافع پاتا ہوں۔ اول تو یہ بھی کہنے ہی کے الفاظ ہیں، نہ اس پر اتفاق کریں گے، نہ ہرگز اس کو نباہیں گے۔ اس عہد کے پہلے توڑنے والے جنگلیں حضرات ہی ہوں گے، جن کی گزر بغیر یورپین اشیاء کے نہیں۔ یہ تو سارا یورپ ہے پہلے صرف آٹلی کا بائیکاٹ ہوا تھا۔ اُس پر کتنوں نے عمل کیا اور کتنے دن نباہا؟ پھر اس سے یورپ کو ضرر بھی کتنا اور ہو بھی تو کیا فائدہ کہ وہ سوئٹزرلینڈ سے اُس سے دُگنا ضرر پہنچا سکتے ہیں۔ لہذا ضرر رسانی کا ارادہ صرف وہی مثل ہے کہ کمزور اور پٹنے کی نشانی۔

بہتر ہے کہ مسلمان اپنی سلامت روی پر قائم رہیں۔ کسی شریر قوم کی چال نہ سیکھیں۔ اپنے اُپر مغفّت کی بدگمانی کا موقع نہ دیں۔ ہاں اپنی حالت سنبھالنا چاہتے ہیں تو ان لڑائیوں ہی پر کیا موقوف تھا، ویسے ہی چاہیے تھا کہ:

اولاً باستثناء اُن معدود باتوں کے جن میں حکومت کی دست اندازی ہو، اپنے تمام معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اپنے سب مقدمات اپنے آپ فیصلہ کرتے۔ یکرڈوں روپے جو اسٹامپ و وکالت میں گھسے جاتے ہیں، گھر کے گھر تباہ

ہو گئے اور ہوئے جاتے ہیں محفوظ رہتے۔

ثانیاً اپنی قوم کے ہر ایک سے کچھ نہ خریدے کہ گھر کا نفع گھر ہی میں رہتا۔ اپنی حرفت و تجارت کو ترقی دیتے کہ کسی چیز میں کسی دوسری قوم کے محتاج نہ رہتے۔ یہ نہ ہوتا کہ یورپ و امریکہ والے چھٹانک بھرتا نیا کچھ صناعتی کی گھڑنت کر کے، گھڑی وغیرہ نام رکھ کر آپ کو دے جائیں اور اُس کے بدلے پاؤ بھر چاندی آپ سے لے جائیں۔ ثالثاً مجبوری، حکومت، رنگون، مدراس، حیدرآباد وغیرہ کے تو لگے مسلمان اپنے بھائی مسلمانوں کے لیے بنک کھولتے۔ سود شرع نے حرام قطعی فرمایا ہے مگر اور سو طریقے نفع لینے کے حلال فرمائے ہیں، جن کا بیان کتب فقہ میں مفصل ہے اور اس کا ایک نہایت آسان طریقہ کفل الفقیہ الغاہم میں چھپ چکا ہے۔ اُن جائز طریقوں پر نفع بھی لیتے کہ اُنھیں بھی فائدہ پہنچا اور اُن کے بھائیوں کی بھی حاجت بر آتی اور آتے دن جو مسلمانوں کی جائیدادیں بیویوں کی نذر ہوئی چلی جاتی ہیں اُن سے بھی محفوظ رہتے۔ اگر بیویوں کی طرح جائیداد ہی لی جاتی، مسلمان ہی کے پاس رہتی، یہ تو نہ ہوتا کہ مسلمان ننگے اور بنیے چنگے۔

رابعاً سب سے زیادہ اہم، سب کی جان، سب کی اصلِ عظم وہ دینِ متین تھا جس کی رستی مضبوط تھا منے نے اگلوں کو اُن مدارجِ عالیہ پر پہنچایا، چار دانگ عالم میں اُن کی ہیبت کا سکہ بٹھایا، نانِ شعبینہ کے محتاجوں کو بلند تاجوں کا مالک بنایا اور اُسی کے چھوڑنے نے پھیلوں کو یوں چاؤِ دولت میں گرایا فات اللہ وانا الیہ راجعون ۵ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

دینِ متین، علمِ دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ علمِ دین سیکھنا، پھر اُس پر عمل کرنا اپنی دونوں جہاں کی زندگی چاہتے، وہ اُنھیں بتا دیتا، اندھو! جسے ترقی سمجھ رہے ہو، سخت تنزل ہے۔ جسے عزت جانتے ہو، اشد ذلت ہے۔ مسلمان اگر یہ چار باتیں کر لیں تو انشاء اللہ العزیز آج اُن کی حالت سنہیل جاتی ہے۔

جہاد، ہجرت اور ترکِ معاملات (نان کو آپریشن) وغیرہ امور پر گاندھی نے مسلمانوں کو کیوں ابھارا؟ ان کی وجوہات و مضمرات آپ مجددِ مآثر حاضرہ قدس سرہ کے لفظوں میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ اب یہ ملاحظہ ہو کہ اُس دشمنِ اسلام و مسلمین گاندھی نے کھتر کی تحریک کیوں شروع کی تھی؟ ایک جانب وہ برٹش گورنمنٹ کو غرض کرنا چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی صنعت پارچہ بانی کا مقابلہ کرنے سے برطانوی عاجز رہے اور مکران ہونے کے باوجود اس صنعت کو مسلمانوں کے ہاتھ سے نہ چھین سکے نہ تباہ کر سکے، گاندھی نے اپنی حکمتِ عملی سے پارچہ بافوں کو بیکار بٹھا دیا جو اہل ملک سے خاطر خواہ دولت کماتے تھے۔ چونکہ اکثر روپیہ ہندو گاہکوں کے ذریعے مسلمان پارچہ بافوں کی جیب میں پہنچتا تھا، لہذا ہندو سرمایہ محفوظ اور مسلمان مغلوب ہو کر رہ گئے۔ اس حقیقت کی قدر سے تفصیل اور قربانی کا ذکر روکنے کا اصلی راز حافظ امیر حسین مراد آبادی مرحوم کی زبانی ملاحظہ ہو:

ہندوؤں نے دیکھا کہ اگرچہ مسلمانوں کا زمیندار طبقہ تباہ ہو گیا لیکن تجارت کے ذریعے یہ دو قومیں عروج کو پہنچ گئیں۔ اب انھیں تباہ کرنے کی یہ تدبیر نکالی کہ قریش (قصاب) کے لیے تو ذبیحہ گاؤں کے روکنے کی رات دن کوششیں کی جا رہی ہیں، جس سے اس قوم کی مالی حالت کمزور ہو اور مومن قوم (پارچہ بافوں) کے لیے کھتر کی تحریک جاری کی گئی، کیونکہ یہ معلوم تھا کہ مسلمان پارچہ بافوں کی نفیس صنعتوں نے ولایت کو شکست دے دی ہے۔ ڈھاکہ کی چکن، جالس کی جامدانی، مٹھارک پور کے ڈریٹے، سنگی مشروح، غلط بھاگلپور کی سسک، فتوحا کے عمامے، بنارس کے دوپٹے، ساڑھیاں، کجواب، زربفت، زری وغیرہ وہ کپڑے ہیں جن سے ولایت کے جولاہے کبھی مقابلہ نہیں کر سکے اور ولایتی پارچہ جات ان کی قدر و قیمت کم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کوئی شخص ان کے مقابلہ میں ولایتی کپڑے پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ شادیوں میں عام طور پر بنارسی اور مبارکپوری کپڑے کا ہزار ہا روپے کا خرچ ہوتا ہے۔ ایک اور تکلیف وہ بات ہندوؤں کے لیے یہ تھی کہ بنارس کی نفیس اور قیمتی ساڑھیاں جو سات سات سو روپے قیمت تک کی ہوتی ہیں وہ بکثرت ہندو خریدتے ہیں، یہ تجارتیں ہندوؤں سے نہ دیکھی گئیں اور اس کام کو

برباد کرنے کے لیے انھوں نے کھڑکی تحریک جاری کی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی کروڑ ہا روپے کی تجارتیں خراب ہو گئیں اور بڑے بڑے کارخانوں کو زبردست نقصان پہنچے۔

مسلمانانِ اہلسنت وجماعت اسلامی تعلیمات کے مطابق برٹش گورنمنٹ اور ہندو سے معاملت کرتے رہے۔ یہ گاندھی کی ان تحریکوں میں شامل ہوئے جو مسلمانوں کی بربادی کے لیے جاری کی جا رہی تھیں اور نہ حکومت یا ہندو کسی کے یار و انصار اور آلہ کار بنے۔ بفضلہ تعالیٰ سوادِ اعظم کا یہ کارواں سلاست کے ساتھ قرآنی تعلیمات کے مطابق رواں دواں رہا لیکن سیاسی تنظیم کا فقدان ہونے کے باعث دوسری منظم جماعتوں کے مقابلے میں خاطر خواہ کام نہ دکھاسکے جبکہ بدخواہانِ دین و ملت اپنی تنظیم کے باعث روز بروز آگے ہی بڑھتے رہے جو ہمارے کوتاہ اندیش لیڈروں کی بے تدبیری اور یارانِ تیرگام کی عیار کا زندہ ثبوت ہے۔

علمائے اہلسنت کی رفتار بے شک سُست رہی اور انھیں کوئی راسخ العقیدہ لیڈر میسر نہ آسکا لیکن بفضلہ تعالیٰ ان کے قرآنی موقف میں کوئی فرق نہیں آیا نہ ذرا بھر لچک پیدا ہوئی بلکہ آج تک اُسی موقف پر قائم ہیں۔ پاکستان کی تحریک اسی نتیجے کے طور پر ابھری جس کی آواز حقیقت میں سب سے پہلے سٹی کانفرنس کے بانی حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے پیش کیا تھا۔ آپ ہی کی آواز کو ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے الہ آباد میں پیش کیا۔ ڈاکٹر صاحب کے لیڈر ہونے کے باعث یہ نظریہ موصوف ہی کی جانب منسوب ہو کر مشہور ہو گیا۔ ادھر پاکستان کا نام مسلمانوں کی زبانوں پر آنا شروع ہوا اور ادھر علمائے اہلسنت نے پشتاور سے لنگا ہمک طوفانی دورے کرنے شروع کر دیے تاکہ مسلمانوں کو اس کے لیے آمادہ کریں۔ بحمد اللہ تعالیٰ اہلسنت وجماعت نے اپنے علمائے کرام کے پیغامات کو بغور سنا اور حصولِ پاکستان کے لیے سرکف ہو گئے۔ ان دنوں علمائے کرام و مشایخ عظام نے بنارس میں سٹی کانفرنس کے اجلاس کیے۔ یہ کانفرنس ۲۴ تا ۲۷ جمادی الاولیٰ ۱۳۶۵ھ مطابق ۲۷ تا ۳۰ اپریل ۱۹۴۶ء

ہوتی رہی۔ اس میں پانچ ہزار علمائے کرام و مشایخ عظام نے شرکت کی اور حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ صدارت کو تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے عظیم الشان تاریخی اجتماع نے سنا۔ اسی عظیم الشان تاریخی خطبے میں آپ نے فرمایا تھا:

”حجاز مقدس جو ہم سنیوں کے ایمانیات کا گوارہ ہے اور جس کے ذرہ ذرہ سے صلیبوں کی دینی روایات وابستہ ہیں اُس پر پنجوی فتن و زلازل کو مسلط کر دیا گیا ہے۔ وہ ارض مقدس اب تک اُن فتنوں کی آماجگاہ ہے۔ فلسطین کے سنی بھائیوں پر بے رحم یہودیت ستم آرائیوں کی مشق کرنے کے لیے مسلط کی جا رہی ہے۔ ہمارے جادا اور انڈونیشیا کے سنی بھائیوں پر توپ اور بم کی بارش ہو رہی ہے اور اُن بے گناہوں کی خطا صرف اتنی ہے کہ وہ سنی ہیں اور اپنے مقدس دین کی آزادی کو کسی قدر پرچھوڑنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ملک میں صرف اہلسنت و جماعت کو پامال کرنے کے لیے (ہندو اکثریت کا سانڈ چھوڑ دیا گیا ہے۔ اہل باطل کی ٹولیوں کو سنیوں پر بھونکنے کے لیے پالا جا رہا ہے اور قیامت یہ ہے کہ سنیوں کو ختم کرنے کے لیے جن درندوں کو راشن دیا جاتا ہے اُن کا نام بھی سنی رکھا گیا ہے“

اہلسنت و جماعت کو مٹانے اور مغلوب کرنے کی خاطر برٹش گورنمنٹ نے فرقے قائم کیے اُن کی غرض و غایت اور کارگزاری پر روشنی ڈالتے ہوئے اسی خطبے میں آپ نے یوں ارشاد فرمایا تھا:

آج کا وہابی کل سنی تھا، آج کا قادیانی کل سنی تھا، آج کا خارجی کل سنی تھا۔ اس طرح سنیوں کے گھر میں آگ لگا دی گئی ہے اور ایک ایک کاشتکار کھیل کر سنیوں کے خلاف شکاریوں نے مستقل سازش کر رکھی ہے اور انہی پالتو اور شکار کیے ہوئے افراد کے بل بوتے پر آگ مار کر لیڈر سنیوں کو آنکھیں دکھاتے ہیں رسول جنگ کی دھمکی دیتے ہیں۔ کس قدر ہوشربا واقعہ ہے کہ ہندوستان سنی مسلمانوں کا ملک تھا۔ سنیوں نے سیکڑوں برس اس پر حکمرانی کی اور تہذیب کی بنیاد

رکھی لیکن اب ان کا وجود نہ راعی کی نظر میں ہے نہ دنیا کی نگاہ میں۔ ہم جاگیر و عالمگیر کے وارث کچھ نہ رہے اور برطانوی پالیسی کی پیداوار تین تین نفر کی ٹولیاں سب کچھ ہو رہی ہیں۔ امام الہند بننے کی ترکیبیں نکالی جاتی ہیں۔ امیر شریعت اپنے کو کہلایا جاتا ہے۔ ہمارا وہ مقدس و برگزیدہ نام جو ہمارے آقا حضور پر نور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا تھا اور ہمارا یہی مکمل پتہ بتایا تھا مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاصْحَابِيْ لَعْنِي الْاِسْلَمْتُ وَ جَاعَتِ، اُس کا مجربانہ استعمال اپنے لیے وہ کر رہا ہے جو سُنّیوں کو ہلاک کر دینے پر حلف اٹھا چکا ہے۔ سُنّیوں کے پیسے سے مدرسہ چلایا جاتا ہے اور اُس میں ایسے دل و دماغ تیار کیے جا رہے ہیں جو سُنّیوں کو تنائیں، جمہوریت اسلامیہ سے منکر لیں، اسلامی اتحاد میں انتشار پیدا کریں، اسلامی ہم آہنگی کو صدمہ پہنچائیں۔ ہمارے سلاطین و امراء و خواص و عوام کی بنائی ہوئی مسجدوں پر قبضہ ہمارے دشمنوں کا، ہماری تعلیم گاہوں پر چھنڈا ہمارے محاربوں کا، ہماری خانقاہوں میں رسائی خانقاہ شکنوں کی۔۔۔۔۔ غضب یہ ہے کہ یہ سارے منظم فتنے اور تمام مہلک خطرے آپ (علماء و مشایخ) کے سامنے ہیں۔ آپ کے دیکھتے ہوئے سُنّیوں کا جینا دشوار ہو رہا ہے۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے سُنّیوں پر گھیرا ڈال دیا گیا ہے اور آپ کی موجودگی میں آپ کے رسول کی اُمت دن دھاڑے لوٹی جاتی ہے۔“ لے

اسی خطبے میں حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے لفظ پاکستان کا مطلب واضح کیا جو مختلف جماعتوں کی زبانوں پر چڑھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں آپ نے علی رؤس الاشہاد فرمایا:

میرے دینی رہنماؤ! میں نے عرضداشت میں ابھی ابھی پاکستان کا لفظ استعمال کیا ہے اور پہلے بھی کئی جگہ پاکستان کا لفظ آچکا ہے۔ ملک میں اس لفظ کا استعمال روزمرہ بن گیا ہے۔ درودِ یار پر پاکستان زندہ باد، تجاویز کی زبان میں پاکستان ہمارا حق ہے، نعروں کی گونج میں پاکستان لے کے رہیں گے، مسجدوں میں، خانقاہوں

میں، بازاروں میں، ویرانوں میں لفظ پاکستان لہرا رہا ہے۔ اس لفظ کو پاکستان کا یونینسٹ لیڈر بھی استعمال کرتا ہے اور ملک بھر میں ہر لگی بھی بولتا ہے اور ہم سُنّتیوں کا بھی یہی محاورہ ہو گیا اور جو لفظ مختلف ذہنوں کے استعمال میں ہو اس کے معنی مشکوک ہو جاتے ہیں، جب تک بولنے والا اُس کو واضح طور پر نہ بتا دے۔

یونینسٹ کا پاکستان وہ ہو گا جس کی مشبہ نری سردار جو گندرسنگھ کے ہاتھ میں ہوگی۔ لیگ کے پاکستان کے متعلق دوسری قویں جیتی ہیں کہ اب تک اس نے پاکستان کے معنی نہ بتائے اور جو بتائے وہ اُلٹے پلٹے ایک دوسرے سے لڑتے بتاتے۔ اگر صحیح ہے تو لیگ کا بانی کمانڈر اس کا ذمہ دار ہے لیکن جن سُنّتیوں نے لیگ کے اس پیغام کو قبول کیا ہے اور جس یقین پر اس مسئلے میں لیگ کی تائید کرتے پھرتے ہیں، وہ صرف اس قدر ہے کہ ہندوستان کے ایک حصہ میں اسلام کی، قرآن کی آزاد حکومت ہو جس میں غیر مسلم ذمیوں کے جان و مال، عزت و آبرو کو حسب حکم شرع امن دی جاتے۔ اُن کو، اُن کے معاملات کو، اُن کے دین پر چھوڑ دیا جائے۔ وہ جانیں اُن کا دھرم جانے۔ اُن کو آیتُوا لَیْہُمْ عَمَلُہُمْ سُنّا دیا جائے اور بجائے جنگ و جدل کے صلح و امن کا اعلان کر دیا جائے۔ ہر انسان اپنے پُر امن ہونے پر مطمئن ہو جائے۔ اگر سُنّتیوں کی اس سمجھی ہوئی تعریف کے سوا لیگ نے کوئی دوسرا راستہ اختیار کیا تو کوئی سُنّتی قبول نہیں کرے گا۔

مسلم لیگ اور آل انڈیا سُنّتی کانفرنس کا معاہدہ ہو چکا تھا کہ قیام پاکستان کے سلسلے میں سُنّتی مسلمان مسلم لیگ کی بھرپور تائید و حمایت کریں گے لیکن دینی معاملات میں مسلم لیگ ہر موقع پر سُنّتی کانفرنس کی رہنمائی اور ہدایات کو ملحوظ رکھے گی۔ چنانچہ اس خطبے میں اُس کا ذکر یوں کیا گیا:

ہم سے مسلم لیگ کو اسی کی اُمید رکھنی چاہیے کہ اُس کا جو قدم سُنّتیوں کے سمجھے ہوئے پاکستان کے حق میں ہو گا اور اس کے جس پیغام میں مسلمان و مسلمین کا نفع ہو گا آل انڈیا

سُنی کافر نس کی تائید اس کو بے دریغ حاصل ہوگی اور دینی امور میں ہاتھ لگانے سے پہلے آل انڈیا سُنی کافر نس کی رہنمائی اُس کو قبول کرنی پڑے گی اور ضرور کرنی پڑے گی۔ اگر ہماری حق گوئی کسی کے نزدیک جرم ہے اور کسی لیگی کے نزدیک یہ لیگ کی دشمنی ہے تو ہمیں ڈیفینس میں ایک لفظ نہیں کہنا ہے اور اگر لیگ کے دشمنوں کے نزدیک یہ ہمارا لیگی ہو جانا ہے تو ہم اس خوش فہمی کو بھی قابلِ مضحکہ سمجھتے ہیں! لہ

اسی طرح ۶، ۵ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ / جون ۱۹۴۶ء کو بنارس کافر نس کے تقریباً سو اہمیتہ بعد مسجد شاہجہانی واقع درگاہ معلیٰ اجیر شریف میں آل انڈیا سُنی کافر نس کے اسپیشل اجلاس ہوئے ایک نشست کی صدارت حضرت محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ نے کی اور اپنے خطبہ صدارت میں فرمایا:

”حضرات! میں نے بار بار پاکستان کا نام لیا ہے اور آخر میں صاف کہہ دیا ہے کہ پاکستان بنانا صرف سُنّیوں کا کام ہے اور پاکستان کی تعمیر آل انڈیا سُنی کافر نس ہی کرے گی۔ اس میں کوئی بات بھی نہ مبالغہ ہے، نہ شاعری ہے اور نہ سُنی کافر نس سے غلو کی بنا پر ہے۔ پاکستان کا نام بار بار لینے سے جس قدر ناپاکوں کو چڑ ہے اُسی قدر ناپاکوں کا وظیفہ ہے اور اپنا وظیفہ کون سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے کھاتے پیتے پورا نہیں کرتا؟ اب رہا پاکستان کا رُستیاں است۔ یہ ملک کی کسی سیاسی جماعت سے تصادم کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے، جس کا اظہار بلا خوفِ لومۃ لا تم کر دیا ہے۔ اول تو مسلم لیگ کے سوا کوئی ٹولی ایسی نہیں جو پاکستان کے ساتھ لفظی موافقت بھی رکھتی ہو اکھڑ ملۃ واحده۔ سارے ناپاکوں نے اپنے اندر بے شمار اختلافات رکھتے ہوئے پاکستان کے خلاف صف آرائی کر لی ہے اور مسلم لیگ میں پاکستان کا پیغام کس سے پہنچا اور لوگوں نے مسلم لیگ کا عقیدہ اُس کو بنایا؟ اگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو وہ صرف سُنی ہیں۔ پاکستان کے معنی اسلامی قرآنی آزاد حکومت ہے۔ مسلم لیگ سے ہمارے

سُنی کانفرنس کی مجلسِ عالمہ کے رکن حضرت سید شاہ زین الخانات صاحب سجادہ نشین
 مانکی شریف (سرحد) نے کہہ دیا ہے کہ اگر ایک دم سارے سُنی مسلم لیگ سے
 نکل جائیں تو کوئی مجھے بتا دے کہ مسلم لیگ کس کو کہا جائے گا؟ اُس کا دفتر کہاں
 رہے گا؟ اور اُس کا جھنڈا سارے ملک میں کون اٹھائے گا؟

اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا کہ مسلم لیگ کی وکالت اور اہلسنت و جماعت کے دوٹوں سے ۱۴ اگست
 ۱۹۶۹ء کو پاکستان قائم ہو گیا۔ ہندوستان کا ایک حصہ علیحدہ ہو کر اسلامی نظریاتی مملکت کے
 بطور دنیا کے نقشے پر ظہور پذیر ہوا۔ یہ موقع اور یہ شاندار کامیابی ہندوستانی مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی
 اور پاکستان کا قیام عالم اسلام کے لیے انتہائی مسترت و شادمانی کا پیغام تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنے
 حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے اسے دائم قائم رکھے، آمین۔

پاکستان قائم ہو جانے پر سُنی کانفرنس کا نام جمعیتہ علماء پاکستان رکھ لیا گیا لیکن مسلمانان اہلسنت و
 جماعت کی بے قسمتی کہ آل انڈیا سُنی کانفرنس کے بانی اور سُنیوں کی فعال شخصیت حضرت صدر
 الانافضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۶۷ھ مطابق ۲۳ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو
 بروز جمعۃ المبارک اپنے پروردگار کو پیارے ہو گئے (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ)۔ حضرت
 محدث کچھ چھوڑی اور مولانا سلیمان اشرف حبیبی ہستیاں ہندوستان ہی میں رہ گئیں۔ اور قارئین اعظم
 محمد علی جناح بھی ۱۱ ستمبر ۱۹۶۸ء کو اس جہان فانی سے عالم جاوداتی کی جانب سدھار گئے۔
 نہ مسلم لیگ ہی قیام پاکستان کے بعد اپنے اسلامی و قرآنی وعدوں کو پورا کر سکی اور نہ جمعیتہ العلماء پاکستان
 یعنی سابق سُنی کانفرنس ہی سے کوئی ایسا مرد میدان نکل سکا جو مسلم لیگ کو مجبور کر دیتا کہ اپنے
 وعدوں کو پورا کرے۔

حالات کی ستم ظریفی تو ملاحظہ ہو کہ جس طرح برٹش گورنمنٹ نے مسلمانان اہلسنت و عجمت
 کی جمعیت کو منتشر کرنے کی غرض سے مختلف فرقے کھڑے کر دیے تھے، پاکستان بن جانے کے
 بعد اُسی سوادِ اعظم کو جس کے دوٹوں سے یہ نظریاتی مملکت معرض وجود میں آئی تھی اُسی جماعت
 کو دبانا گرانا اور ہمدرد ہوں کو ابھارنا شروع کیا گیا، حتیٰ کہ پاکستان کے مخالفوں تک کی
 ناز برواری کو ناصردی سمجھا گیا، جس کا خیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے کہ قیام پاکستان کا مقصد
 حاصل کرنا، اس میں قرآن و سنت کا آئین نافذ ہونا تو دُرور کی بات، دینی اور اسلامی فضا ناگفتہ بہ
 لہ خطبہ صدارت، ص ۳۹

ہوتی جا رہی ہے۔ خدا تے ذوالمن ہاری حالت پر کرم فرمائے اور ہمیں اپنی انفرادی و اجتماعی حالتوں کو درست کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے، آمین۔

نجدی وہابیہ کی بُت پرست نوازی

خارج کے متعلق جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ وہ مختلف ناموں کے ساتھ قیامت تک رہیں گے اور اُن کا آخری گروہ دجال علیہ اللعنة کے ساتھ ہوگا۔ اسی کے مطابق علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ نے درمختار کے حاشیہ رد المحتار میں تصریح فرمائی ہے کہ محمد بن عبد الوہاب نجدی اور اس کے متبعین زمانہ حال کے خارج ہیں۔ موصوف کے اس بیان کی مولوی حسین احمد ٹانڈوی (المتوفی ۱۴۴۷ھ/۲۱۹۵ء) نے اپنی تصنیف ”الشہاب الثاقب“ میں اور مولوی خلیل احمد انبٹوی (المتوفی ۱۴۴۵ھ/۱۹۲۶ء) نے المہند میں تصدیق و تائید کی ہے۔ یہ دونوں کتابیں تمام علمائے دیوبند کی مسخرہ اور موخر الذکر اکثر اکابر دیوبند کی مستند ہے۔

ہندوستان میں مولوی محمد اسماعیل دہلوی (المتوفی ۱۲۶۶ھ/۱۸۳۱ء) نے محمد بن عبد الوہاب نجدی کے مذہب کی ترویج و اشاعت کی تھی۔ موصوف کے جملہ متبعین بھی خارج ہی کی ماڈرن آفس کاپیاں ہیں۔ احادیث میں خارجیوں کی ایک پہچان یہ بھی بتائی گئی ہے کہ وہ اہل اسلام کو قتل کریں گے اور کافروں مشرکوں سے بنا کر رکھیں گے۔ چنانچہ نجدی مذکور نے اور اُس کے اتباع و خلفاء نے جزیرہ عرب کے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہانے اور اُن کے اموال کو غنیمت کا مال سمجھ کر چھیننے میں کون سا دقیقہ فرو گذاشت کیا تھا، ظالموں نے حریم کا ادب بھی قطعاً ملحوظ نہ رکھا۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے مسلمانوں پر وہ قیامت ڈھائی جس کے سُننے سے مسلمانوں کا خُون کھول اٹھتا ہے، یہاں تک کہ اصحاب رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم و رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کو اُن کی آخری آرام گاہوں میں تنگ کیا، مزارات شہید کروادیے اور جنت البقیع میں ہل چلوا دیے نیز کتنی ہی مقدس یادگاروں کا اس طرح سے نام و نشان مٹا دیا کہ صرف کتابوں میں تذکرے ہی رہ گئے۔

اگر نجدی خارجیوں نے یہ کچھ کیا تو ہندی خارجی کون سے پیچھے رہ گئے۔ انہوں نے

انگریزوں کی مدد سے سکھوں سے مقابلہ کرنے کی آڑ میں دل کھول کر پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی۔ خادی خاں سردار، ہنڈ، یار محمد خاں حاکم یا عستان اور اُس کے بھائی سلطان محمد خاں سے یکے بعد دیگرے لڑائیاں کیں۔ اول الذکر دونوں کو شہید کیا۔ ان لڑائیوں میں جو مال چھینا اُسے مال غنیمت شمار کیا۔ اسی طرح کھلاہٹ، مرغز، کدا، ٹھنڈ کوٹی، پنج پیر، ہنڈ، شیوہ، چارگلٹی، معدم، گھڑپالی، نو اکٹی، شیخ جانا، اسماعیلہ، امان زئی، کاٹ لنگ، لونڈو، مردان، ہوتی، مایار، تور و غیرہ دیہات کو بذورِ شمشیر مسلمانوں سے چھینا گیا۔ مایار کی لڑائی میں سیکڑوں مسلمانوں کو شہید کیا اور پشاور پر پیش قدمی کی لیکن سلطان محمد خاں کی دانشمندی سے جنگ کا خطرہ ٹل گیا۔ ہزاروں مسلمانوں کا خون رنگ لایا اور ظالموں کو مظلوموں کا خون بگل گیا و ذلک جزاء الظالمین۔

جب ہندی اور نجدی خارجی مسلمانوں کو قتل کرنے میں قدم سے قدم ملا کر چل رہے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں پوری طرح کوشاں تھے تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہندی خارجی تو گاندھی اور نہرو کی پوجا کریں اور نجدی خارجی صرف دُور بیٹھے تماشا ہی دیکھتے رہیں۔ ان حضرات کی مذہبی غیرت نے بھی انہیں مشرکینِ ہند اور خصوصاً گاندھی و نہرو کی تعظیم بلکہ پوجا پاٹ کرنے پر ابھارا۔ چنانچہ مئی ۱۹۵۵ء میں شاہ ابن سعود کے ہمراہ اُن کے بھائی شاہ امیر فیصل بھی ہندوستان آئے۔ موخر الذکر نے اپنا مذہبی فریضہ یوں ادا کیا:

”امیر فیصل نے بھارت میں قیام کے دوران میں ڈاکٹر راجندر پرشاد، ڈاکٹر رادھا کرشن اور پنڈت نہرو سے ملاقاتیں کیں اور راج گھاٹ پر مہاتما گاندھی کی سادھ پر پھول چڑھانے کے نیز ایک گاؤں رتن گڑھ میں تشریف لے گئے جہاں دیہات سدا کا کام دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ وہیں دس ہزار روپے کا عطیہ عنایت فرمایا۔“

بہر حال یہ اُس وقت پھر بھی چھوٹے میاں تھے۔ بڑے میاں کی سینیہ جنھیں محافظِ حرم کا خطاب

اُن کے معتقد حضرات بڑی عقیدت سے دیتے ہیں جو بُت شکن کے بجائے قُبہ شکن تھے۔ مسلمانوں کو مشرک سمجھ کر اُن سے دشمنی رکھنے پر مجبور تھے لیکن مشرکوں بُت پرستوں سے اتحاد اور دوستی کی یوں بھیک مانگتے پھرتے تھے،

”شہد سے آٹھ میل دور آپ (شاہ ابن سعود نجدی) نے ہماچل پر ویش کے لوگوں کا پیش کیا ہوا لوک ناچ کا ایک پروگرام دیکھا اور جناب صدر، معزز وزراء، خواتین اور راجندر پرشاد کے جواب میں شاہ سعود نے تقریر فرمائی۔ مدرسہ دیوبند کو پچیس ہزار روپیہ دیا اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان اور سعودی عرب کے اتحاد اور دوستی کے رشتے ہمیشہ مضبوط رہیں گے۔“

اپنے اس دورے کے موقع پر شاہ ابن سعود نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ارض مقدس کا دورہ کرنے کی دعوت دی جسے اُس بُت پرست نے قبول کر کے ستمبر ۱۹۵۶ء میں سعودی عرب کا دورہ کیا۔ اُس وقت ان مسلمانوں کو مشرک بتانے والے لیکن حقیقت میں مشرک پرستوں نے کیسے کیسے قیامت خیز طریقوں سے پنڈت نہرو کا استقبال کیا، اُن ایمان سوز حرکتوں پر پورا عالم اسلام ہلکا اٹھا اور ہر طرف سے صدائے احتجاج بلند ہوئی کہ موحد ہونے کے دعویدار ارض مقدس میں مشرک پرستی کا عالمی ریکارڈ کیوں قائم کر رہے ہیں؟ نہرو کے دورے کا حال پاکستان کے سارے اخباروں میں شائع ہوا۔ ایک اخبار کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

”سعودی عرب میں نہرو کا ”مَرَحَبَا رَسُوْلُ السَّلَام“ اور جے ہند کے نعروں سے استقبال۔ شاہ سعود نہرو کی پنج شہلا پر ایمان لے آئے۔ سعودی عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ نہرو کے استقبال کے لیے عرب عورتیں بھی موجود تھیں۔۔۔۔۔ ریاض پہنچے پر شاہ سعود نے نہرو کو گلے سے لگایا۔“

سرمزین حجاز پر پہلی مرتبہ بھارتی ترانہ ”جانا مانا گانا“ بجایا گیا۔ پنڈت نہرو جب سعودی عرب کے دار الحکومت ریاض پہنچے تو ہزاروں افراد نے جن میں

شاہ سعود، سعودی شہزادے، وزراء اور سعودی فوج کے اعلیٰ افسر شامل تھے نہرو کا استقبال کیا اور ایک فوجی دستے نے نہرو کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ اس کے بعد نہرو ایک کھلی کار میں شاہ سعود کے محل روانہ ہو گئے۔ راستے میں شرک پر دونوں طرف ہزاروں افراد نے نہرو کو دیکھ کر زندہ باد کے نعرے لگائے۔ چوبیس ستمبر کی رات کو شاہی محل ”الحراء“ میں شاہ سعود نے نہرو کے اعزاز میں شاہی ضیافت دی۔ اُس کمرے کو رنگارنگ روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ جب نہرو کمرے میں داخل ہوا تو شاہ سعود نے آگے بڑھ کر اُن کی شیروانی کے کاج میں سرخ رنگ کا ایک گلاب ڈالنا کہا۔

شرک نہرو کا استقبال ”یا سُوْلُ السَّلَام“ کے نعرے سے کرنے پر پورے عالم اسلام سے احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں۔ توحید کے پردے میں یہ شرک پرستی کا نظارہ مسلمانانِ عالم کے لیے ناقابلِ برداشت ہو کر رہ گیا اور سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ واقعی ان نام نہاد موجدوں کی خارجیت میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور یہ حضرات سیاسی مصالح کی خاطر اپنی ظاہری مسلمانی کو بھی داؤ پر لگانے میں نہ کوئی ہاک محسوس کرتے آئے ہیں اور نہ آج کل کر رہے ہیں۔ اب پاکستانی اخبارات کا احتجاج ملاحظہ ہو:

”یہ نہرو دَسُوْلُ السَّلَام“ کا نعرہ ضرور کھٹکتا ہے۔ کاش مغرب عرب میزبان اپنے مہمان کو امن کا رسول پکارتے وقت اپنے اُن کلمہ گو بھائیوں کا بھی تصور کر لیتے جن پر بھارت میں ان دنوں امن و عافیت کے سب دروازے بند کر دیے گئے ہیں اور جن کا خون محض اس جرم کی پاداش میں پانی سے زیادہ ارزاں کر دیا گیا ہے کہ انہوں نے رسولِ عربی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دلخراش توہین پر احتجاج کیوں کیا تھا؟ افسوس بھارتی مسلمانوں کی قلب کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آہیں بھی عربوں کو اس وزیرِ اعظم کو ”امن کا رسول“ قرار دے کر

مرجائے سے باز نہ رکھ سکیں، جس کی سرکاری انگلیوں سے جھارتی مسلمانوں کا گرم خون اجمی ٹپک ہی رہا تھا۔^۱

دوسرے اخبار نے "جے ہند" کے نعرے لگانا اور ارض مقدس میں مشرک کو بلا کر اُس کا اعزاز کرنے پر شاہ سعود کو متنبہ کیا اور اس خاندان کی تہہ شکنی کا ذکر کرتے ہوئے یوں سعودی حکمرانوں کی سیاسی مصلحت پر تبصرہ کیا ہے،

آل مودنے پہلے خالص سیاسی مصلحتوں کے تحت ایک بُت پرست قوم کے نمائندے کو ریاض بلایا اور اُس کے استقبال کے لیے خواتین اور بچوں کو ساتھ لے گئے اور اُن سے "جے ہند" کے نعرے گوائے۔ سعودی عرب کا یہ فعل سراسر بدعت ہے جس کی کوئی مسلمان بھی حمایت نہیں کر سکتا۔ عجیب بات ہے کہ جن حکمرانوں نے صحابہ کی پختہ قربی اور فتنے تک اس لیے ڈھا دیے ہوں کہ وہ اُن کی نظروں میں اسلام کی تعلیمات کے منافی تھے وہی حکمران آج اپنی سیاسی مصلحتوں کے لیے ایک ایسے شخص کو حجاز میں مدعو کر کے استقبال کرتے ہیں جو بُت پرستوں کا نمائندہ ہے۔ اور اسلام کے ہر متکبر خیال کے علماء کا متفقہ فتویٰ ہے کہ کوئی بُت پرست اسلام کے اس گہوارے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔^۲

۱ لیکن یہ کیا کہ نعرہ توحید کی بجائے

اُن کی زباں پہ برہمنوں کا ترانہ ہے

سعودی حکومت کے دعویٰ اسلام کے بارے میں نعرہ "دَسْوَلُ السَّلَام" کے پیش نظر یہ اقتباس بھی قابلِ غور ہے،

"شاہ سعود پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس روایت کو توڑا اور صنم خانہ کے ایک

پاسبان کو ارض کعبہ پر بلایا اور صرف بلایا ہی نہیں بلکہ خلافِ روایات انداز سے

^۱ روزنامہ نوائے وقت لاہور، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۶ء

^۲ روزنامہ کوہستان لاہور، یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء

اُس برہمن بچے کا استقبال کیا۔ استقبال کے وقت جو نعرے بلند کیے گئے اُن میں سے ایک نعرہ دنیا کے اسلامی حلقوں میں خاص طور پر قابلِ اعتراض سمجھا جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پنڈت جی کو ”رسول السلام“ کہا گیا جس کے معنی پیغمبرِ اسلام کے ہیں۔ پنڈت نہرو کے حالیہ دورہ سے یہ تاثر بھی شدت اختیار کرنا جا رہا ہے کہ سعودی مملکت جو اسلام کے نام پر قائم ہوئی تھی، محض نام کی اسلامی حکومت ہے اور اس کا طرزِ عمل ازمنہ وسطیٰ کی عیسائی تھیوکریٹک حکومتوں سے قطعاً مختلف نہیں جو مذہب کے نام پر لوگوں کا ناجائز استحصال کرتی ہیں۔^۱

اس دورے کے وقت سعودی حکومت نے ”گیتا نجلی“ پڑھوائی۔ کعبہ و بت خانہ، کافر و مومن، مومن و مشرک اور بت شکن و بت پرست کا فرق مٹانے کی جو کوشش کی اُس پر یہ تبصرہ ملاحظہ ہو:

”کعبہ اور بت خانے کو ہمدوش کرنے کے لیے شاہِ سعود اور پنڈت نہرو جو کوششیں کر رہے ہیں اُس میں برہمن کا تو کچھ بھی نہیں جانے گا البتہ مومن الذکر جو بت شکنی (قبضہ شکنی) میں سبکدست ہوتا ہے اُس میں مصلحت شناسی اور روباہی آجائے گی۔ اللہ اکبر۔ ایک دور وہ تھا علامہ (ابن) عبد الوہاب نجدی کے نام لیوا..... یہ نعرہ لگانے سے کہ ہمارے لیے قرآن اور حدیث کافی ہیں (فقہ کی ضرورت نہیں) اب وہ گیتا نجلی پڑھتے اور پڑھاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر پنڈت نہرو کو کتنی مسرت ہوئی ہوگی، وہ کیوں نہ خوش ہوں، وہ کہتے ہوں گے، بھارت کے مسلمانوں کو ہندو نہر ارسال سے اپنا مذہب پڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن وہ پڑھ کے نہیں دیتے اور میرے سعودی عرب کے ایک دورے نے عربوں کی نئی نسل میں گیتا نجلی پڑھنے کا ذوق و شوق پیدا کر دیا۔ سعودی عرب کے اس تجربہ کے بعد عجب نہیں کہ بھارت کے مسلمانوں کو حکم ہو جائے کہ تم اپنی مسجدوں میں اشوک جی سنایا کرو۔“^۲

دیوبندی علماء جو اپنے کام کے کفریہ کلمات، کفریہ عبارتیں حتیٰ کہ کفریہ عقیدے تک ایمان کا جو ہر سچہ کر قبول کر لیتے ہیں، مسلمانوں کے ٹوکنے پر اُن کی دوزخ کا رتا ویلیں کر کے خود بھی اُن کفریات میں برابر کے حصّے دار بن جاتے اور اُنھیں اسلامی عقیدے اور عبارتیں ثابت کرنے پر ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اگرچہ بات بنی ایک دفعہ بھی نہیں لیکن اس طرح اپنے متبعین اور جہلاء کو مطمئن کر دیتے ہیں کہ ہم نے دندان شکن جواب دے دیا اور ثابت کر دکھایا ہے کہ ہمارے یہ عقیدے اور عبارتیں ہرگز کفریہ نہیں ہیں۔ لیکن یہ اُن حضرات کا اسلام کے ساتھ مذاق اور اپنی جانوں پر ظلم ہے۔ آخر عاقبت تو اپنی ہی خراب کرتے ہیں اور اپنے ساتھ متبعین کو بھی گھرے میں لے کر ڈوبتے ہیں اس اس کے باوجود نجدیوں کا نعرہ ”سُرْسُولُ السَّلَام“ مولوی احتشام الحق تھانوی (کراچی) کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ اس شناعیت و قباحیت کو موصوف بھی برداشت نہ کر سکے۔ اُن کا ایک بیان یوں اخبارات و رسائل میں شائع ہوا:

”مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج رات ایک بیان میں کہا ہے کہ سرزمینِ حجاز کے دار الخلافہ ریاض میں بھارتی وزیرِ اعظم پنڈت نہرو کے استقبال پر ”مرحبا نہرو سُرْسُولُ السَّلَام“ سے جوتنگِ اسلام اور اسلام سوز قسم کے نعرے لگائے گئے اُن سے نہ صرف یہ کہ مسلمانانِ عالم کے دینی و ملی جذباتِ غیرت کو ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا ہے بلکہ متولیِ حرمین شریفین کی اُس موقدانہ دینداری کا پول بھی کھل گیا ہے، جس کا سارے عالم میں ڈنک مٹا جا رہا ہے۔

اس سے قطع نظر کہ سرزمینِ توحید اور گہوارہٴ اسلام میں ایک صغیر پرست بلکہ منکرِ خدا اور اللہ کے باغی کو دعوتِ تکریم دینا اور جوارِ رسول میں بسنے والے موحّدینِ مردوں اور عورتوں سے خیرِ مقدم و استقبال کرنا پاسبانِ حرم کے لیے کہاں تک زیب دیتا ہے یا اُس احساسِ ذمہ داری کو کہاں تک پورا کرتا ہے جو حرمین شریفین کی تولیت پر مسلمانانِ عالم کی طرف سے عاید ہوتی ہے، خود یہ بات بھی اپنی جگہ انتہائی شرمناک اور غیر اسلامی ہے کہ پنڈت نہرو کے لیے ”رسولِ السلام“ جیسے اصطلاحی الفاظ استعمال کیے جاتیں۔

سعودی عرب کے سفارت خانے سے جو ضاحتی بیان دیا گیا ہے، نامزنگار عربی کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے کہ رسول سے قاصد کے معنی مراد ہیں نبی کے معنی مراد نہیں میرے نزدیک عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے اور ممکن ہے کہ نامہ نگار عربی کی ابجد سے حقیقت میں واقف نہ ہو، لیکن سعودی عرب کے سفارتی ترجمان سے زیادہ واقف اسلام ضرور ہوتا ہے اور الزام کی تردید کرنے والے ترجمان ممکن ہے کہ عربی کی مہارت تامہ رکھتے ہوں مگر اسلام اور تعلیمات اسلام کی ابجد سے بھی نا آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

مرحبا رسول السلام کے نعرہ سے ادنیٰ سے ادنیٰ عقل رکھنے والے کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی ہے کہ پٹرن نہرو کو نبی یا پیغمبر بنا دیا یا اس لفظ سے نبی کے معنی مراد لیے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ رسول سے قاصد ہی کے معنی مراد لیے گئے ہیں، یہ اعتراض ہے کہ لفظ "رسول" اسلام اور قرآن کریم کی مخصوص اصطلاح ہے، جس کی حیثیت شعائر اللہ اور شعائر اسلام کی ہے۔ جیسے قرآن، مسجد حرام، مسجد اقصیٰ وغیرہ قسم کے بے شمار الفاظ اسلامی شعائر ہیں، جو اپنے لغوی معنی سے نکل کر اصطلاحی معنی کے لیے خاص ہو گئے۔ اب ان الفاظ کو لغوی معنی میں استعمال کرنا، بالخصوص ان لوگوں کی طرف سے جن کو عربی زبان کے استعمال کرنے میں حدود دین کا پاس رکھنا ہے، قطعاً ناجائز و حرام ہے، بلکہ شعائر اللہ کی کھلی ہوئی بے حرمتی اور توہین ہے۔ ص

چوں کفر از کعبہ بر خیزد کجا ماند مسلمان

کیا کسی مسلمان کو یہ اجازت ہے کہ وہ اپنی تصنیف کا نام کتاب اللہ، اپنے گھر کا نام بیت اللہ اور اپنی مسجد کو مسجد حرام، اپنے باغ کو جنت، اپنے تالاب کا نام کوثر اور تنور کا نام مجیم اور اپنے پوسٹ میں کا نام رسول رکھ لے؟ حالانکہ لغوی اعتبار سے یہ سب صحیح ہیں۔ کیا قرآن کریم میں یا ایہا الذین امنوا لا تقولوا داعنا و قولوا انظرنا میں الفاظ کا ادب مسلمانوں کو نہیں سکھایا

گیا ہے؟ کیا حدیث کے اندر مسلمانوں کو غیبتِ نفسی کی ممانعت سے یہی ادبِ الفاظ نہیں بتلایا گیا ہے؟

سعودی عرب کے سفارتی ترجمان کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کی عربی زبان بھی وہ زبان ہے جس میں اصطلاحاتِ قرآن کی حرمت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر اللہ کے باغی کے احترام میں آج ناموسِ رسول کو یہ کہہ کر بھینٹ پڑھایا گیا کہ رسول کے معنی قاصد کے ہیں تو آئندہ تمام شعائرِ اسلام کی حرمت کبھی باقی نہ رہ سکے گی۔ پھر سلامتی و امن کا استعمال بھی کس قدر جیسا سوز اور عزت کشش ہے کہ جس کے ملک میں آئے دن خونِ مسلم سے ہولی کھیلی جاتی رہی ہو وہ قاصدِ امن تو کیا ہوتا اُس میں امن و سلامتی کا ادنیٰ شائبہ بھی موجود نہیں ہے۔ خدا کی شان ہے کہ مردمِ خرد و دندوں کو قاصدِ امن کے لقب سے یاد کیا جائے۔

۷ جنوں کا نام خرد رکھ لیا خرد کا جنوں !
جو چاہے آپ کا حُسن کر شتمہ ساز کرے

ہم آخر میں پاسبانِ حرم سے صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ عربین شریفین مسلمانانِ عالم کی امانت ہے اور ان پاسبانوں کی طرف سے ناموسِ رسول کی بے حرمتی کبھی برداشت نہیں کی جاسکتی۔ ۱۷

قارئینِ کرام حیران ہوں گے کہ جب دوسرے دیوبندی حضرات خاموشی یا تاویلات کے پتھر میں پھنسے ہوئے تھے تو اس غیر اسلامی نعرے پر دیوبندی ہونے کے باوجود مولوی احتشام الحق تھانوی نے تنقید کیوں کی تھی؟ ہم قارئینِ سطور کی واقفیت کے لیے عرض کرتے ہیں کہ موصوف کا تعلق اُس جماعت سے ہے، جس کے سرگروہ مولوی اشرف علی تھانوی صاحب (المتوفی ۱۳۶۲ھ/۱۹۴۳ء) بقول علامہ شبیر احمد عثمانی (المتوفی ۱۳۶۸ھ) چھ سو روپیہ ماہوار انگریزی حکومت سے وظیفہ پاتے تھے، اسی وجہ سے تھانوی صاحب اور اُن کے تابعین

زنا دوست ہونے کی بجائے برٹش نواز تھے اور ہندو نواز علماء پر تنقید بھی کرتے رہتے تھے جیسا کہ
اسی باب میں مولوی اشرف علی تھانوی صاحب کا ایک طویل بیان پیش کیا جا چکا ہے۔ مولوی
احتشام الحق صاحب کا تعلق بھی چونکہ اسی تھانوی گروپ سے ہے لہذا موصوف کا اس
زنا دوستی پر تنقید کرنا چنداں محلِ تعجب نہیں۔ اب اس ثبتِ فروشاہِ حرکت پر ماہنامہ ”نقاد“ کراچی
کے ایڈیٹر کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیے :

” قاطع بدعت و منافی، مقلد (ابن) عبد الوہاب نجدی، محافظِ حرمین الشریفین

جلالۃ الملک شاہِ سعود کے نام

فدائیانِ رسول و عالمیانِ اسلام کا پیغام

جلالۃ الملک ! اللہ آپ کو محبتِ رسول دے۔ خدا معلوم آپ کو معلوم ہے یا
نہیں کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں نے ۱۹۴۷ء میں ”پاکستان“ کے
نام سے ایک الگ ملک بنا لیا تھا۔ اس نوزائیدہ ملک کے بنتے ہی دشمنانِ اسلام
و مسلمین نے مسلمانانِ ہند کو اپنے زرخے میں لے لیا تھا اور پھر اُن کا قتلِ عام
شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں نے اپنے آبائی وطن کو
گھروں سے بھاگ بھاگ کر، مرتے گرتے نہ جانے کیا کیا مصائب برداشت
کرنے کے بعد پاکستان میں سکونت اختیار کر لی۔ لیکن اس کے باوجود اب بھی
ہندوستان میں ساڑھے چار یا پانچ کروڑ مسلمان موجود ہیں، جہاں نہ اُن کی
جائیں محفوظ ہیں نہ اُن کی عورتوں کی عصمتیں۔

لیکن اے کلیدِ بردارِ حرم ! جب آپ پچھلے دنوں ہندوستان کے
سرکاری دورے پر آئے تو ان حالات کے باوجود آپ نے ہندوستانی حکومت
کو یہ سند شاہی عطا فرمادی کہ ”میں بحیثیتِ محافظِ حرمین الشریفین اس بات
سے مطمئن ہوں کہ ہندوستان میں مسلمان امن و سکون سے ہیں اور اُن کی
جائیں محفوظ ہیں وغیرہ وغیرہ

یقین کیجیے شاہ ! آپ کی اس سند شاہی کی تشہیر کے بعد بھی محمد شاہ

رنگیلے کے فرامین بے ساختہ یاد آ گئے تھے اور ہم یہ بھی سمجھ گئے تھے کہ ترک کی مسلمان قوم آپ اور آپ کی حکومت سے کیوں غیر مطمئن رہی ہے۔

اس واقعہ کے بعد آپ نے ایک غیر مسلم سربراہ کو سرزمینِ حجاز مقدس کے سرکاری دورے کی دعوت دی اور ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو جب آپ کے دار الخلافہ ریاض پہنچے تو آپ کی حکومت کے اکٹھے کیے ہوئے عوام نے ”يَا رَسُولَ السَّلَامِ تَهْرُودُ“ کے شرمناک نعروں سے اُن کا استقبال کیا تھا۔ اس استقبال کرنے والوں میں عرب کے وہ قبائلی بداد اور عورتیں بھی شریک کیے گئے تھے جو کسی دشمنِ اسلام فرد یا قوم کے لیے اپنے دلوں میں جذباتِ احترام نہیں رکھتے۔ پھر سب سے بڑا اجتہاد جو آپ جیسے قاطع بدعات نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ عرب کی خواتین کو غیر محرموں کے انبوه کثیر میں لاکر اُن سے ایک غیر محرم، غیر مسلم شخص کا استقبال سرزمینِ حجاز پر ”رسول“ جیسے متبرک مقدس خطاب سے کرایا۔

شاہِ قہر شکن! پنڈت جواہر لال نہرو کو ”رسول“ کے نام سے آپ نے یا آپ کی قوم نے یاد کر کے پاکستان کے نوکر و مسلمانوں کی جو دلازاری کی وہ ناگفتہ بہ ہے۔ آپ کو کسی نے یہ بات غلط بتادی ہے کہ پاکستان میں ایسی قوم آباد ہے جو عربی زبان سے ناواقف ہے اور عربی زبان کے معانی و مطالب سے آگاہ نہیں ہے۔ آپ کے سفارت خانے لفظ ”رسول“ کے لیے جو تاویلات وضع کر رہے ہیں اُس سے اُن کی بیچارگی اور ندامتِ جرم متشرع ہو رہی ہے۔ جلالتِ الملک! ہم مسلمانانِ عالم حیران ہیں کہ آپ اور آپ جیسے عقائد مذہبی رکھنے والے لوگ ایک ایسے شخص کو تو ”يَا رَسُولُ“ جیسے عظیم لقب سے خوش آمدید کہہ سکتے ہیں جو بطناً و سلاً بت پرست اور مسلماً لاندہب ہے، لیکن کوئی مسلمان حیاتِ النبی، خاتمِ الرسل، حضورِ رسولِ مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو دُور جذبات و عقیدت، لوازمِ احترام اور واجباتِ استغاثہ میں یا رسول،

یا محمد، یا مصطفیٰ کہہ کر یاد کرے تو اسے کافر و مشرک قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ کونسی منطق ہے؟ یہ کون سا عقیدہ ہے؟ یہ کون سا مذہب ہے۔ استغفر اللہ ربی۔

آپ لوگوں نے جنت البقیع کے تمام آثار مقدسہ کو شہید کر دیا۔ صند ہا اصحاب کبار کے قبوں کو مسمار کر دیا۔ گنبد خضریٰ، آرام گاہ رسول، سرچشمہ نور الہی کے معاد سے زمین بوسی کو حرام اور جرم قرار دیا گیا اور آپ اور آپ کے ہم مسلک عقیدہ مولویوں نے یہ حکم بھی لگا دیا کہ ختم المرسلین، نبی آخر الزمان، حیات النبی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جو شخص کھڑے ہو کر یا دَسْوَلُ سَلَامٌ عَلَیْكَ پڑھے مشرک و کافر ہے اور اس عقیدے پر اصرار کرے تو مرتد اور واجب القتل! لیکن آج یہ کیا ہوا کہ احترام رسول کو بدعت و شرک و کفر کہنے والے مقلدین ابن عبد الوہاب نجدی ایک ایسی قوم کے سربراہ کا استقبال "یا دَسْوَلُ السَّلَام" کے نعروں سے کرتے ہیں جو دشمن رسول و اسلام ہے اور لاکھوں دیوبندیوں کا پجاری ہے اللہ اکبر۔

اے شاہ اہم آج سمجھے کہ بڑے بڑے جنادریوں کے عقاید و مسلک کے آہنی قلعوں کو سیاسی تقاضے ایک ہی جھٹکے میں مسمار کر ڈالتے ہیں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا آج سعودی عرب میں کسی ڈاکیہ یا پوسٹ بین یا کسی بھی پیغام رساں کو اہل زبان یا دیہاتی لوگ "یا دَسْوَلُ" کہہ کر پکارتے ہیں؟ ہم پوچھتے ہیں کہ عرب کے کسی بھی گوشے میں کیا کوئی ایسا بد نصیب مسلمان ہے جو رسول کا لفظ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے علاوہ عام آدمیوں علی الخصوص کسی مشرک و بت پرست یا لامذہب شخص کے لیے بولتا یا لکھتا ہو؟

ہمارے سوالات کا جواب یقیناً نفی میں ہے اور ہم نہایت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ حضور پر نور (روحی فداہ) کی شان میں گستاخانہ خیالات رکھنے اور بارگاہ رسالت میں اپنے معاملات صاف نہ رکھنے کی پاداش میں عرب حاکموں سے بیحماقت اور دیوانگی سرزد ہوئی ہے۔ تواضع و میزبانی عربوں کا طرہ امتیاز ہے

لیکن اسے کلیدِ برادرِ حرم! آپ نے یہ بھی غور کیا کہ سیاسی استحکام اور ذاتی حُریتِ جاہ کے لیے آج آپ کی میزبانی اپنی حدود سے بڑھ کر دشمنی دین اور شہادتِ رسالت کے تعزیرات اور ظہورِ ضلالت کی سرحدوں پر آپہنچی ہے۔ آپ تمام حضرات غیر مشروط طور پر اقرارِ گناہ کر لیں۔ اس نازک مرحلے پر تاویلات اور استدلال کے سہارے بڑے شرمناک ہیں۔ اس راستہ میں باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار، کا عقیدہ واجب و لازم ہے اور تاویلات، ”عذرِ گناہ بدتر از گناہ“ کے مترادف ہیں۔ خداوندِ کریم آپ کو محبتِ رسول دے اور یہ توفیق بھی ارزاں فرمائے کہ آپ یا آپ کی حکومت مسلمانانِ عالم کی اس دلازاری کے سلسلہ میں نادم ہو۔ اَسْلَامُ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدَى“ لے

۷ خدا ہی جانتا ہے حشر اُس ٹولی کا کیا ہو گا؟

حرم سے جس کی بدبختی نے رُخِ ملت کا پھیرا ہے

مولوی احتشام الحق تھانوی صاحب کچھ تو بولے، یہ بھی غنیمت ہے کہ وہ ہندو نوازی سے اتفاق نہیں رکھتے ورنہ یہ کونسی نئی بات تھی یا نہ الاغیر اسلامی لفظ دہا بیوں کے مُنہ سے نکل گیا تھا۔ اپنے دوسرے ہم مسلک علماء کی طرح موصوف بھی چپ سا دھ لیتے یا تاویلات کی جھول جھلیاں میں پھرنے لگ جاتے مگر ہندو نوازی پر اپنے گرد پ کی لاج رکھنے کے لیے بولنا پڑا لیکن اس طرح کہ دوسرے غیر اسلامی عقاید و نظریات اور نجدیوں کے کارناموں کو ٹھیس تک نہ لگنے دی۔

قارئینِ کرام نے ایڈیٹر ماہنامہ ”نقاد“ کراچی، جناب ظفر نیازی صاحب کا تبصرہ ابھی ملاحظہ فرمایا۔ موصوف نے وہی کچھ کہا جو ایک مسلمان کو کہنا چاہیے اور جو کچھ کہا جراتِ رندانہ سے کہا۔

۷ آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں رو بہا ہی

قارئینِ کرام! نجدیوں کی اس غیر اسلامی روش نے غیر مسلموں کے ہاتھوں میں کیسا

ہتھیار تھما دیا۔ ”رسول“ کے اصطلاحی اور لغوی معنوں کے بارے میں کیسی کیسی موٹنگائیوں کا موقع فراہم کر دیا۔ چنانچہ بھارت کا دہلی سے نکلنے والا اخبار ”پینچ“ اپنے ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کے ادارے میں نجدیوں کے اسی نعرے پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ اُس ادارے کا ایک اقتباس نوائے وقت لاہور نے یوں نقل کیا تھا:

۱۔ ”پر دھان منتری شری جاہر لال نہرو پیغمبرِ اسلام کی دنیا میں پہنچے تو اُن کا استقبال ”پیغمبرِ امن“ کے نعروں سے کیا گیا۔

۲۔ اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو اسلام کے معنی امن کے ہیں، سلامتی کے ہیں پیغمبرِ اسلام کے معنی بھی امن و سلامتی کے پیغامبر کے ہیں۔ (گو با پیغمبرِ امن اور پیغمبرِ اسلام ایک ہی بات ہے)

۳۔ پیغمبرِ اسلام کے ملک باسیوں نے پنڈت جی کی عزت افزائی کے لیے وہی لفظ منتخب کیا جس پر اُسے ناز ہے۔ جس کی وجہ سے دنیا کے اسلام میں عرب دلش کی عزت ہے۔

۴۔ پنڈت جی کے اس دورہ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ — یہ تو وقت بتائے گا، مگر اس سے کفر اور کافر کے فلسفے میں تبدیلی ہوگئی تو یہ دورہ کی بہت بڑی فتح ہوگی۔“

۵۔ یہ بندگی خدائی، وہ بندگی گدائی

یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ

اس اسلام سوز نعرے کی بنا پر مرزا ئی حضرات ان نام نہاد موجدوں کے مُنہ پر یوں لگام لگاتے ہیں:

”ایک مذہبی سوال لفظ ”رسول“ کے استعمال سے متعلق ہے۔ آج تو اہلِ محدثوں کو یہ تاویل سمجھ آرہی ہے کہ رسول کے معنی قاصد کے ہوتے ہیں مگر جب حضرت بانی سلسلہ احمدیہ (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی) نے رسول کے معنی

مامور اور تابع شریعت اُمتی نبی کے پیش کیے تھے تو یہی مولوی (نذیر حسین دہلوی،
 فناء اللہ امرتسری اور محمد حسین بٹالوی وغیرہ) شور مچاتے تھے کہ ”رسول“ شرعی
 اصطلاح ہے، اس لفظ کے اطلاق کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نئی شریعت لانے کا
 مدعی ہے۔ اگر اس موقع پر ائمہ محدثوں کو یہی لفظ ”رسول“ کے استعمال کی وسعت کا
 احساس ہو جائے اور وہ اپنی غلطی کو مان جائیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ اہل نجد کی غلطی مفید
 ہی ثابت ہوئی۔“ لے

قارئین کرام نے نجدی وہابیوں کی زنا ر دوستی اور مشرک فوازی کا کرشمہ دیکھ لیا۔ یہ ہے ان حضرات
 کی توحید پرستی کا عالم۔ مسلمانوں کو مشرک ٹھہرانے والے کس طرح کے مشرک دوست اور
 بُت پرست نواز نکلتے ہیں۔ نجدی اور ہندی سارے ہی وہابی قبروں اور خصوصاً مزاروں سے
 بہت جلتے ہیں، اسی لیے مسلمانوں کو قبر پرست اور پیر پرست کہے بغیر تو ان حضرات کا کھانا
 بھی ہضم نہیں ہوتا۔ غضب تو یہ ہے کہ روضہ رسول پر بھی غلاموں کو نہیں جانے دیتے کہ کہیں
 اُس بارگاہ بے کس پناہ میں حاضر ہو کر یہ مشرک نہ بن جائیں، کافر نہ ہو جائیں۔ مسلمانوں کو اپنے
 اصطلاحی کفر و شرک سے بچانے والے خود کن لوگوں کی قبروں سے اپنی ساختہ توحید کی بھیک
 مانگ کر لاتے ہیں، ملاحظہ ہو :

”دانشگن بکم فروری۔ آج صبح شاہ سعود پوٹوک دریا کو عبور کر کے ارنگنگن
 قبرستان گئے اور گنام سپاہی کی قبر پر چھول چڑھائے۔ یہ قبر گزشتہ جنگ
 میں ہلاک ہونے والے تمام امریکی سپاہیوں کی یادگار سمجھی جاتی ہے۔ دوپہر کا
 کھانا شاہ سعود نے نائب صدر نکسن کے ہمراہ کھایا۔“ لے

سعودی عرب کی نجدی حکومت کے اُس وقت کے وزیر دفاع نے اپنے شہنشاہ معظم
 کے ہمراہ امریکہ میں محافظ حرمین اور خیخراہ اسلام ہونے کا البیلا مظاہرہ کرتے ہوئے یوں

اپنے فرضی موجد ہونے کا بین الاقوامی ثبوت پیش کیا:
 "سعودی عرب کے وزیر دفاع، امیر فہد بن سعود نے جوشاہ سعود کے ہمراہ امریکہ آئے ہیں،
 کل امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی قیام گاہ کی سیر کی۔ بارش کے باوجود
 انھوں نے مکان کے پائیں باغ کی بھی سیر کی اور جارج واشنگٹن کی قبر پر
 پھول چڑھائے۔" لے

مسلمان اگر اللہ جل شانہ کے دوستوں یعنی حضرات اولیاء اللہ کے مزارات پر پھول چڑھائیں
 تو وہابی حضرات کو یہ فعل خالص مشرکانه نظر آتا ہے لیکن یہی حضرات خدا کے دشمنوں یعنی کافروں
 اور مشرکوں کی قبور پر پھول چڑھائیں تو کیا مجال کہ ان کی توجید میں ذرا بھی فرق آجائے بلکہ اس
 قطعاً غیر اسلامی اور سراسر الجیسی توجید میں اور چارچاند لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب
 صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے صدقے مسلمانان اہلسنت وجماعت کو ایسی نام نہاد توجید سے
 محفوظ و مامون رکھے اور ان حضرات کو خوش فہمی کی بھول بھلیاں سے نکال کر راہ ہدایت پر
 گامزن فرمائے۔ آمین

کاش! وہ خارجی حکمران کبھی یہ سوچنے کی رحمت گوارا فرمایا کریں کہ جس دین و مذہب کے
 نام پر انھیں مسلمانوں سے نفرت ہے وہ مذہب انھیں کھدے کافروں، طھیٹ مشرکوں سے محبت
 کی پیٹلیں بڑھانے سے کیوں نہیں روکتا؟ عالم اسلام کی وہ قربانیاں جو راہِ خدا میں حج کے
 موقع پر پیش کی جاتی ہیں، ان کے متعلق سنا ہے کہ نجدی وہابی ہرگز ان کا گوشت نہیں کھاتے، مشرکین
 کا ذبیحہ قرار دے کر اجتناب کرتے ہیں لیکن غیر ممالک کے دورے پر جائیں تو سب کچھ
 ضیافتوں کے بہانے ہضم کر جائیں۔ کچھ نہ سہی تو ملکی خزانے کو جس طرح اپنی ملکیت قرار دیا ہوا ہے
 اور بے دریغ شہا ہی خاندان پر لٹایا جاتا ہے، کیا یہ حلال ہے؟ کیا مسلمانوں کی وہ قربانیاں
 حرام ہیں؟ کیا یہ ضروری نہیں کہ وہاں کا حکمران طبقہ مسلمانوں اور کافروں سے جس طرح کا سلوک
 روا رکھے ہوئے ہے اس پر نظر ثانی کرے، کیونکہ ان حکمرانوں کی اور پورے عالم اسلام کی بھلائی

اور بہتری اسی میں ہے کہ کافروں کو کافر سمجھ کر ان سے اسی طرح سلوک کریں جیسا کہ مسلمانوں کو ان سے کرنا چاہیے اور مدعیان اسلام کے مابین جو اختلافات ہیں انہیں افہام و تفہیم کے ذریعے دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے۔ حق کو قبول کرنا اور باطل سے پیچھا چھڑانا جہاد اکبر ہے۔

بُت پرستوں کی پُختہ زُناری

قارئین کرام! آپ نے اس باب میں ہندو نوازوں، زُتار دوستوں اور گاندھی پرستوں کے کارنامے تو ملاحظہ فرمائیے کہ علم و فضل کے تمام تر وعادی کے باوجود ان کی کوششوں کی منزل مقصود یہی تھی کہ ہندوستان کے سارے مسلمان گاندھی کے قدموں میں بھجکتے، اسلامی غیرت و حمیت کو کھوتے اور ہندومت میں مدغم ہوتے چلے جائیں۔ گویا ان حضرات کی کوششوں کا ماحصل یہی تھا کہ اُمتِ محمدیہ کا رُخ حرم سے سموات کی جانب پھیر دیا جائے خدا پرستی کے بجائے مسلمانوں کو ایسے راستے پر گامزن کیا جائے جس سے یہ ان لوگوں کے پرستار بن جائیں جو خود بُت پرست ہیں۔ ان کی ملتِ اسلامیہ سے خیر خواہی کی ابتداء انگریز کی غلامی کے نعرے سے شروع ہوتی تھی اور گاندھی کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو جانے پر سارے پروگرام کی انتہا ہو جاتی ہے، یہ تھی ان حضرات کی ستم ظریفی، جس کا انتہائی فخریہ انداز میں آج تک ڈھول بجا یا جا رہا ہے کہ باعثِ رونق چین اگر کوئی تھا تو ہم ہیں اور مسلمانانِ پاک و ہند کے چہروں پر اگر رونق کے کوئی دھندلے سے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں تو وہ ہماری ہی مساعی جمیلہ کے مرہونِ منت ہیں۔ اسی غرض سے ہم نے پورے انصاف کے ساتھ ان حضرات کے حقیقی خدو خال تاریخ اور حقائق کی روشنی میں سب کے سامنے اُجاگر کر دیے ہیں۔ اب دوسری جانب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمایا جائے کہ جن ہندو بے بہود پر یہ کرم فرما مٹے جا رہے تھے اور جن کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں کو ان کے قدموں میں بھکانے کا فریضہ پوری ہمت اور جہالتشانی سے ادا کرتے آ رہے تھے، خود ان ہندو ولیڈروں یعنی ہندو نوازوں کے مہاتما اور ان داتا حضرات کس وجہ مسلمانوں کی جانب بھجے، کیا ان کی پُختہ زُناری میں کوئی فرق آیا، کیا اپنے بُجاریوں کے پاس خاطر یا تسکینِ قلوب کے پیش نظر انہوں نے اپنے دھرم میں کوئی لچک پیدا کی، کاشش انہوں نے

گوشِ ہوش سے سنا ہوتا کہ ان کے گاندھی مہاراج علی الاعلان یوں فرما رہے تھے:

”میں اپنے آپ کو سنانتی ہندو کہتا ہوں کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں اور اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گنور کھٹا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور بہت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رُوں رُوں ہندو ہے۔“

کاش! مسلمانوں کی خیر خواہی کا دعویٰ کرنے والے ان زنا ر دوستوں کو یہ توفیق مل جاتی کہ ہم مسلمان ہیں، کتاب و سنت ہمارے دین کے ماخذ ہیں اور اُن کے اندر واضح لفظوں میں غیر مسلموں سے دوستی رکھنا حرام قرار دیا گیا ہے، بلکہ قرآن کریم میں تو یہاں تک فرما دیا گیا ہے کہ جو غیر مسلموں سے دوستی کرے گا وہ اُن میں ہی شمار کیا جائے گا۔ لہذا یہ اسلامی غیرت کے سراسر خلاف ہے کہ ہم بہت پرستوں کے آلہ کار اور مشرکین ہند کے نعلین بردار بن جائیں لیکن ایسا تو کوئی اُسی وقت کہہ سکتا ہے جب اسلام کی نورانیت سے اُس کے دل و دماغ منور ہوں۔ گاندھی کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے:

”مختلف طبقات و مذہب کے بچوں میں رواداری اور دوستی کی جو رُوح

پیدا ہو رہی ہے، اُس کے پیشِ نظر میں اس بات کو سخت مہم سمجھتا ہوں کہ

اُن کو یہ سکھا یا جائے کہ اُن کا مذہب دیگر مذاہب پر برتری رکھتا ہے یا جس

مذہب کے دُعا قائل ہیں، اُن کے نزدیک بس وہی سچا مذہب ہے۔“

کیا گاندھی حضرات نے سُن کر دریں چہ شک نہ کہا ہو گا۔ اگر کچھ بھی نہیں کہا، تب

بھی خاموشی نیم رضا مندی ہوتی ہے۔ خیر جس گاندھی کو یہ کرم فرما مسلمانوں کا اس دور میں

سب سے بڑا خیر خواہ منوانے پر ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے اور اعلان کرتے تھے کہ اگر

نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نہی ہوتے، وہی ان حضرات کا مذہبی پیشوا، نبوت کی اہلیت

رکھنے والا ان کا دینی رہنما کسی گلی لپٹی کے بغیر اپنوں اور بیگانوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈنکے کی چوٹ یوں علی الاعلان سنارہا تھا :

”میری رُوح اس بات کے تصور سے بغاوت کرتی ہے کہ اسلام اور ہندومت مختلف اور متضاد کلچر اور نظریہ حیات کے حامل ہیں کسی ایسے نظریہ کا تسلیم کر لینا میرے نزدیک خدا کے انکار کے مترادف ہے، کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کا خدا بھی وہی ہے جو گیتا کا ہے“ لہ

کیا اس اعلان کو سن کر گاندھی علماء کی پیشانیوں پر بل آئے تھے؟ اگر بل آئے ہوتے تو اس کے بعد تو کم از کم گاندھی کی آندھی میں تھکنے بن کر فضا میں اڑنے سے توبہ کر لیتے۔ لیکن فضا میں اڑنے کے لیے جو بلند مقام مل رہا تھا وہ توبہ کب کرنے دیتا تھا۔ مزید مٹنے کہ گاندھی نے متحدہ قومیت کی تبلیس کا زہر کس مزے سے شربتِ اتحاد و اتفاق کے نام سے ان علمبردارانِ توحید اور دشمنانِ شرک و مشرکین کو پلایا اور انھوں نے بڑے مزے سے لے کر نوش جان فرمایا تھا۔ چنانچہ گاندھی صاحب نے کہا تھا :

”اگر مذہب کو علیٰ حالہ رہنے دیا جائے یعنی ایک بیج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے، جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترکہ ہو۔ مذاہب انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لیے نہیں ہیں، وہ انھیں ایک رشتہ میں پروانے کے لیے ہیں“ لہ

۱۹۴۴ء میں گاندھی صاحب کا ایک بیان اخبارات میں محمد علی جناح کے نام کھلا خط کے نام سے شائع ہوا تھا۔ موصوف نے اُس میں قومیت کا جو تصور پیش کیا اور جملہ گاندھی حضرات

صرف جس کے قائل بلکہ مبتنع تھے، وہ اسلامی غیرت کیلئے کھلا چیلنج ہے۔ انہوں نے کہا تھا:

”میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد

کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور اُن کی اولاد یہ دعوے

کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان انگریزوں

کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد اُسے ایک ہی قوم رہنا چاہیے،

خواہ اُس کے سپوتوں میں سے کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔“

وہابی حضرات کے ”سُؤْلِ السَّلَام“ یعنی پنڈت جواہر لال نہرو جو مسلمانانِ پاک و ہند

کے ازلی دشمن اور کھلے کافر، ٹھٹھٹ پرست تھے، اُن کی صدارت میں آل انڈیا نیشنل

کنونشن مارچ ۱۹۳۷ء میں منعقد ہوا۔ پنڈت جی نے صدارتی خطبے میں قومیت کا تصور یوں

بکھیرا تھا:

”ایسے لوگ بھی ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں

گویا دو ملکوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس

دقیقا نوسخی خیال کی گنجائش نہیں۔“

پنڈت جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کی حضرات کو اسلام کا ظاہری طور پر نام لینے اور

خود کو مسلمان بنانے سے ہٹانے کی خاطر مذہب کی مخالفت جن لفظوں میں کی وہ دیدنی ہے۔

موصوف نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ:

”جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اُسے ہندوستان میں اور دوسری

جگہ دیکھ کر میرا دل بیت زدہ ہو گیا ہے۔ میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے

اور اُسے مٹا دینے کی آرزو تک کی ہے۔“

لے عام اخبارات، ۱۵ ستمبر ۱۹۳۴ء

لے روڈ آف آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء

لے میری کہانی: ص ۶۱

مسٹر گاندھی اور پیٹر جواہر لال نہرو کے لفظوں سے بھی واضح تر الفاظ میں، ہندو مہاسبھا کے صدر یعنی مسٹر سادکر سے ہندو کی تعریف سن لیجیے۔ موصوف نے کہا تھا:

”لفظ ہندو سے عبارت ہے ہر وہ شے جو ہندوستان کی ہو مثلاً کلچر، نسل اور روایات اور ہندو کے معنی ہیں ہر وہ شخص جو ہندوستان کا رہنے والا ہو۔“

اسی ہندو مہاسبھا کے نائب صدر یعنی ڈاکٹر رادھا مکرجی نے آل انڈیا ہندو ویدک یوتھ کانفرنس منعقدہ لاہور کے صدارتی خطبے میں علی الاعلان کہا تھا کہ:

”ہندوستان کو فطری اور عملی طور پر ایک ہندو اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ جس کا کلچر ہندو اور جس کا مذہب ہندو لازم ہو اور جس کی حکومت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہو۔“

دیوبندی حضرات کے شیخ الہند یعنی مولوی محمود الحسن صاحب جس شخص کی سرکردگی میں ریشمی رومال کی تحریک میں حصہ لیا تھا اور جو اُس تحریک میں مرکزی کردار ادا کر رہا تھا، اُسی لالہ ہر دیال کا بیان ہے کہ:

”پس اگر ہندوستان کو کبھی آزادی ملی تو یہاں ہندو راج قائم ہوگا۔ نہ صرف ہندو راج قائم ہوگا بلکہ مسلمانوں کی شدھی، انفالستان کی فتح وغیرہ باقی آدرش بھی پورے ہو جائیں گے۔“

اب کون پوچھے گا نہ ہوی حضرات اور اُن کے علماء و مشائخ کہلانے والوں سے کہ حضرات! آپ کے قومی رہنماؤں، مذہبی پیشواؤں، اخلاقی یاروں، پیاروں، مددگاروں اور اقتصاد پروردگاروں کے بیانات تو ایسے تھے، لہذا مسلمانوں نے تو اُن بت پرستوں، ملتِ اسلامیہ کے ازلی دشمنوں کو اُسی نظر سے دیکھا، جس کے وہ قابل تھے لیکن گاندھی حضرات کا رشتہ تبسیح اُن پختہ زنا روں کے حضور میں کیوں ٹوٹ گیا؟ دینی غیرت کیوں

مرگنی، دلوں اور دماغوں پر جو متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا جھوٹ سوار ہوا تھا، اُس نے اسلامی
حمیت کی حق بھی باقی رہنے دی، ستم نظریاتی قویہ کہ اپنے موقف کی انتہائی کمزوری کا احساس
ہو جانے کے باوجود پاکستان میں بھی وہ حضرات اہل حق کے خلاف ہر میدان میں صفت آراء ہیں۔

حالات کے تعاضوں کو محسوس کرتے ہوئے اور مدعیان اسلام کی ہمدردی سے مجبور ہو کر
راقم الحروف کو یہ روشن دستاویز ایک مصفا آئینے کی صورت میں پیش کرنی پڑی، تاکہ انصاف پسند
حضرات اور متلاشیان حق اس کی روشنی میں حق و باطل کو پرکھ سکیں اور اُس راستے پر گامزن ہو سکیں
جس میں دارین کی کامیابی ہے، جو ملت اسلامیہ اور سواد اعظم کا راستہ ہے۔ ضراط مستقیم اسی کو
کہتے ہیں۔ اس راستے کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اللہ کے سارے مقبول بندے اسی
راستے پر چلتے آئے ہیں یعنی اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ وَاللّٰہُ اَسْتَعِیْذُ بِہٖ مِنْ اَنْ یَّکُوْنَ لَیْسَ بِہٖ
اللّٰہُ عَلَّ شَانِہٖ نَے نُوَلِّیْہٖ مَا تَوَلَّیْ وَ نَصْلِیْہٖ جَہَنَّمَ وَ سَاءَتْ مَصِیْرُ اَکِی و عید سائی ہے۔

اگر ان پرانگندہ سطروں میں کوئی خوبی نظر آئے تو اُسے اس سیاہ کار و عصیان شعار کے
ولی نعمت، مُرشدِ برحق، مفتی اعظم دہلی، حضرت شاہ محمد مظهر اللہ فاروقی نقشبندی مجددی
دہلوی اور مجدداتہ حاضرہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری برکاتی بریلوی رحمۃ اللہ علیہما کی
نظرِ کرم اور فیضان کا کرشمہ شمار کیا جائے۔ جتنی غلطیاں، فروگزاشتیں اور کوتاہیاں نظر آئیں
وہ میری نااہلی کا نتیجہ ہیں۔ قارئین کرام سے التماس ہے کہ وہ غلطیوں اور مفید مشوروں سے
مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں ان کا خیال رکھا جاسکے۔ خدائے ذوالمنن اپنے حقیر بندے
کی اس ناچیز کاوش کو شرف قبولیت بخشے ہوئے اسے میرے لیے کفارہ ستیات، باعثِ
حُسنِ خاتمہ، توشہ آخرت اور سرمایہٴ نجات بنائے۔ آمین یا اَللّٰہُ اَعْلَمُ ۝ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ وَ تَبَّ عَلَيْنَا اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ۝ وَ
صَلَّى اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی حَبِیْبِہٖ سَیِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَ صَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ ۝

خاکبائے علماء: محمد عبد الحکیم خاں مجددی مظہری

المعروف بہ انتہر شاہ بھانپوری

دار المصنفین - لاہور

۱۵۔ رمضان المبارک ۱۴۳۹ھ

۲۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء

ماخذ و مراجع

- ۱- ابو الحسن علی ندوی، مولوی
- ۲- سید ابوالقاسم، شیعہ مجتہد
- ۳- ابوالکلام آزاد، مولوی
- ۴- احمد رضا خاں بریلوی، امام
- ۵- " "
- ۶- " "
- ۷- " "
- ۸- " "
- ۹- " "
- ۱۰- احمد بن عبدالرحیم العرفی شاہ ولی اللہ دہلوی، مولانا
- ۱۱- احمد شہاب الدین ابن حجر مکی، محدث
- ۱۲- احمد یار خاں، مفتی
- ۱۳- ارشد قادری، مولانا
- ۱۴- " "
- سیرت سید احمد شہید، مطبوعہ مکتبہ ۱۹۳۹ء
- برہان المتعہ، مطبوعہ نیو امپیریل پریس لاہور
- آزاد کی کہانی خود ان کی زبانی، مرتبہ عبدالرزاق طبع آبادی
- انکوکتہ الشہایہ فی کفریات ابی الوہاب، مطبوعہ
- الامان پرنٹنگ پریس لاہور
- الحجۃ المومنین، مطبوعہ بریلی شریف ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء
- تذکرۃ فلاح و نجات و اصلاح، مطبوعہ آفتاب عالم پریس لاہور
- تمہید ایمان بآیات القرآن، مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور
- حدائق بخشش، دونوں حصے، مطبوعہ مشہور پریس کراچی
- کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، مطبوعہ لاہور مع
- نور العرفان، ۱۳۹۵ھ
- القول الجمیل مترجم، مطبوعہ عربی پریس کراچی ۱۹۵۴ء
- فتاویٰ حدیثیہ
- مرآۃ شرح مشکوٰۃ، جلد ہفتم، مطبوعہ لاہور
- تبلیغی جماعت، حقائق و معلومات کے اُجالے میں،
- مطبوعہ لاہور ۱۹۷۵ء
- جماعت اسلامی اپنے آئینے میں

- ۳۸۔ مرزا حیرت دہلوی، ادیب
۳۹۔ احمد حسین ٹانڈوی دیوبندی، مولوی
۴۰۔ " " "
۴۱۔ " " "
۴۲۔ حسین علی سحرانوی دیوبندی، مولوی
۴۳۔ حسین رضا خاں بریلوی، مولانا
۴۴۔ خلیل احمد انبٹھوی دیوبندی، مولوی
۴۵۔ " " "
۴۶۔ ملا خلیل قزوینی، شیعہ مجتہد
۴۷۔ ذکا اللہ دہلوی، مولوی
۴۸۔ رحمان علی، مولانا
۴۹۔ رشید احمد گنگوہی دیوبندی، مولوی
۵۰۔ رئیس احمد جعفری، ادیب
۵۱۔ سخاوت مرزا، ادیب
۵۲۔ سلطان خاں، مولوی
۵۳۔ سلیمان اشرف بہاری، مولانا
۵۴۔ سید سلیمان ندوی، مولوی
۵۵۔ " " "
۵۶۔ سر سید احمد خاں
۵۷۔ " " "
۵۸۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی
مولوی
- حیاتِ طیبہ، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۲ء
الشہابِ الثاقب، مطبوعہ ویم پرنٹنگ پریس دیوبند
مکتوباتِ شیخ، جلد دوم
نقشِ حیات، جلد دوم، مطبوعہ دہلی
مبشراتِ بلغۃ الحیران
وصایا شریف، مطبوعہ مقبول عام پریس لاہور
المہند علی المفنداردو، مطبوعہ لاہور
براہینِ قاطعہ، مطبوعہ نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند
صافی شرح اصول کافی، مطبوعہ نوکشور کھنڈو
عروجِ عہدِ انگلشیہ
تذکرہ علمائے ہند، مطبوعہ نوکشور کھنڈو ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۴ء
فتاویٰ رشیدیہ کامل مکتوب، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی
آزادی ہند، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور ۱۹۶۵ء
ترجمہ مکتوباتِ سید احمد شہید، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۸ء
تذکیر الانوان، اردو، مطبوعہ اتحاد پریس لاہور ۱۹۵۶ء
النور، مطبوعہ علی گڑھ ۱۳۴۹ھ/۱۹۱۹ء
حیاتِ شبلی، مطبوعہ اعظم گڑھ ۱۳۷۳ھ/۱۹۵۳ء
تعارف، مصنف معین المنطق، مطبوعہ کراچی، بار اول
۱۹۶۷ء
آثار الصنادید، مطبوعہ نوکشور پریس کھنڈو ۱۸۷۶ء
ہنٹر پر ہنٹر، مطبوعہ کیپٹل کوآپریٹو پرنٹنگ پریس لاہور
بار اول ۱۹۴۹ء
ترجمانِ وہابیہ، مطبوعہ اتر

- ۵۹ - ذاب قی حسن جوبالی غیر مقلد، مولوی
- ۶۰ - " " " "
- ۶۱ - " " " "
- ۶۲ - طاہر احمد قاسمی دیوبندی، مولوی
- ۶۳ - ظفر علی خاں دیوبندی، ادیب
- ۶۴ - ظفر الدین بہاری، مولانا
- ۶۵ - عاشق الہی میرٹھی دیوبندی، مولوی
- ۶۶ - " " " "
- ۶۷ - عبدالرشید ارشد دیوبندی، مولوی
- ۶۸ - عبدالستار دہلوی، مولوی
- ۶۹ - حضرت محی الدین عبدالقادر جیلانی،
غوث اعظم
- ۷۰ - عبدالغنی نابلسی، امام
- ۷۱ - شاہ عبدالعزیز دہلوی، محدث
- ۷۲ - " " " "
- ۷۳ - عبید اللہ سندھی دیوبندی، مولوی
- ۷۴ - عبدالشاہ خاں شروانی، مولوی
- ۷۵ - حافظ عبداللہ غیر مقلد، مولوی
- ۷۶ - عبدالجبار غزنوی غیر مقلد، مولوی
- ۷۷ - عبدالحق حقانی، مولوی
- رحلۃ الصدیق الی البیت العتیق
فتح المغیث لبقة الحدیث
- الروضۃ الندیہ فی شرح در البیہ
- مکالۃ الصدیقین، مطبوعہ تعلیمی پریس لاہور
- چمنستان، مطبوعہ اردو پریس لاہور ۱۹۶۲ء
- حیاتِ اعلیٰ حضرت، جلد اول، مطبوعہ کراچی ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء
- تذکرۃ الخلیل، اخوان، اقبال پرنٹنگ پریس سیالکوٹ
- ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء
- تذکرۃ الرشید، دونوں جلدیں مطبوعہ میرٹھ ۱۹۰۵ء
- پیس بڑے مسلمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم ۱۹۷۰ء
- فتاویٰ ستاریہ، ہر چار جلد
- غنیۃ الطالبین، شائع کردہ مکتبہ سعودیہ کراچی
- حدیقہ ندیہ
- تحفہ اشاعرہ اردو ترجمہ، مطبوعہ ایجوکیشنل و جاوید پریس
- کراچی ۱۹۶۳ء
- تفسیر عربی سوره البقرہ
- شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک، مطبوعہ دین محمدی
- پریس لاہور ۱۹۶۲ء
- باغی ہندوستان، مطبوعہ دین پریس بجنور ۱۹۴۷ء
- مسئلہ سماع موتی
- سوانح عمری عبداللہ غزنوی
- تفسیر حقانی، جلد اول، مطبوعہ محبوب پرنٹنگ پریس دیوبند

۹۸ -	مزا غلام احمد قادیانی، کذاب و کمال	تبلیغ رسالت جلد ہفتم
۹۹ -	" "	تبلیغ رسالت جلد ہشتم
۱۰۰ -	" "	تتمہ حقیقۃ الوحی
۱۰۱ -	" "	تحفہ قیصریہ
۱۰۲ -	" "	تربیاق القلوب
۱۰۳ -	" "	تحفۃ العوام جلد اول
۱۰۴ -	" "	تحفہ گولڑویہ
۱۰۵ -	" "	حاشیہ چشمہ معرفت - مطبوعہ انوار احمدیہ قادیان، بار اول
		۱۹۰۸ء
۱۰۶ -	" "	حقیقۃ الوحی، مطبوعہ میگزین قادیان، بار اول ۱۹۰۷ء
۱۰۷ -	" "	حاشیہ ضمیمہ انجام آتھم
۱۰۸ -	" "	خطبہ الہامیہ - مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اول
		۱۳۱۹ھ
۱۰۹ -	" "	دافع البلاء ٹائٹل پیج - " " " " " "
		۱۹۰۲ء
۱۱۰ -	" "	در شمیم
۱۱۱ -	" "	رسالہ تشہید الازہان
۱۱۲ -	" "	ستارہ قیصرہ
۱۱۳ -	" "	شہادت القرآن - مطبوعہ پنجاب پریس سیالکوٹ
		۱۹۶۸ء
۱۱۴ -	" "	کشتی نوح، مطبوعہ غورشیہ عالم پریس لاہور ۱۹۰۶ء
۱۱۵ -	" "	نور الحق
۱۱۰ -	" "	نزول المسیح، مطبع ضیاء الاسلام قادیان، بار اول ۱۹۰۹ء

- تحفہ دہلیہ
 ۱۳۸- محمد اسماعیل غزنوی غیر مقلد، مولوی
 ۱۳۹- محمد اسماعیل سابق امیر المذہب،
 ۱۴۰- محمد اسماعیل پانی پتی، مولوی
 ۱۴۱- علامہ سر محمد اقبال، شاعر مشرق
 ۱۴۲- " " "
 ۱۴۳- محمد امین ابن عابدین شامی، فقیہ
 ۱۴۴- محمد ایوب قادری، پروفیسر
 ۱۴۵- " " "
 ۱۴۶- شیخ محمد اکرام، مٹر
 ۱۴۷- " " "
 ۱۴۸- محمد ایلیاس برنی، پروفیسر
 ۱۴۹- محمد جعفر تھانیسری، مولوی
 ۱۵۰- محمد سعید، مولوی
 ۱۵۱- محمد سرور، مولوی
 ۱۵۲- میاں محمد شفیع، ڈپٹی کمشنر
 ۱۵۳- محمد صابر قادری نسیم بستوی، مولانا
 ۱۵۴- محمد عمر اچھروی، مولانا
 ۱۵۵- " " "
- تقدیر حسن البیان، مطبوعہ لاہور، بار سوم
 مقالات سرسید، حصہ نہم، مطبوعہ لاہور
 از مغالہ حجاز، مطبوعہ لاہور، طبع پنجم ۱۹۵۱ء
 کلیات اقبال، مطبوعہ دہلی
 رد المحتار، جلد سوم
 دیباچہ تذکرہ علمائے ہند اردو، مطبوعہ پاکستان
 ہسٹریکل سوسائٹی کراچی ۱۹۶۱ء
 مولانا محمد احسن نانوتوی، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۹ء
 شبلی نامہ
 موج کوثر، مطبوعہ لاہور، بار ہشتم ۱۹۵۹ء
 قادیانی مذہب کا علمی محاسبہ، مطبوعہ اشرف پریس
 لاہور
 حیات سید احمد شہید (سوانح احمدی) مطبوعہ کراچی
 ۱۹۶۸ء
 ہدایت قلوب قاسیہ
 افادات و لفظات سندھی، مطبوعہ لاہور، بار اول
 ۱۹۷۲ء
 ۱۸۵۷ء، مطبوعہ اشرف پریس لاہور، بار اول ۱۹۵۷ء
 مجتہد اسلام، مطبوعہ کان پور بھارت ۱۹۵۹ء
 مقیاس حقیقت، مطبوعہ فیاض پریس لاہور، بار ہشتم
 ۱۹۶۶ء
 مقیاس دہلیت

آئینہ صداقت، مطبوعہ مطبع سعیدی کراچی، طبع دوم

۱۹۶۹ء

تجدید الناس، مطبوعہ لاہور

خطبہ صدارت اجیر، مطبوعہ تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور

خطبہ صدارت بنارس، مطبوعہ " " " "

آفتاب ہدایت، مطبوعہ استقلال پریس لاہور، طبع نهم

۱۹۶۳ء

فاضل بریلوی اور ترک موالات، مطبوعہ لاہور

فتاویٰ مظہری، مطبوعہ کراچی، ۱۹۶۰ء

مواعظ مظہری، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۰ء

ہندوستان میں وہابی تحریک (اردو ترجمہ) مطبوعہ کراچی

۱۹۶۲ء

مقدمہ معین المنطق، مطبوعہ کراچی، بار اول ۱۹۶۴ء

آئینہ صداقت

انوار خلافت

محمد بن عبد الوہاب، مطبوعہ کراچی ۱۹۶۹ء

ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک، مطبوعہ راولپنڈی

۱۳۶۸ھ

مرثیہ گنگوہی، مطبوعہ لاہور

الملفوظ، چاروں حصے، مطبوعہ کراچی

تفسیر صافی

خون کے آنسو، دونوں حصے، مطبوعہ پنجاب پریس لاہور

سوانح قاسمی، جلد اول و دوم

۱۵۶۔ محمد فیروز الدین رومی، پروفیسر

۱۵۷۔ محمد قاسم نانوتوی دیوبندی، مولوی

۱۵۸۔ سید محمد کچھوچھوی، مولانا

۱۵۹۔ " " " "

۱۶۰۔ محمد کرم الدین و بیبر، مولوی

۱۶۱۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر

۱۶۲۔ " " " "

۱۶۳۔ " " " "

۱۶۴۔ محمد مسلم عظیم آبادی، پروفیسر

۱۶۵۔ حکیم محمود احمد برکاتی، مولوی

۱۶۶۔ مرزا محمود احمد، خلیفہ قادیانی کذاب

۱۶۷۔ " " " "

۱۶۸۔ مسعود عالم ندوی، مولوی

۱۶۹۔ " " " "

۱۷۰۔ محمود الحسن دیوبندی، مولوی

۱۷۱۔ مصطفیٰ رضا خاں بریلوی، مولانا

۱۷۲۔ محسن کاشی، شیعہ مجتہد

۱۷۳۔ مشتاق احمد نظامی، مولانا

۱۷۴۔ مناظر احسن گیلانی دیوبندی، مولوی

۱۷۵- منور حسین سیف الاسلام دہلوی، تصویب الایمان، مطبوعہ لاہور، بار دوم
مولوی

۱۳۸۵ھ / ۱۹۶۵ء

۱۷۶- منظور احمد، پرنسپل انگریزی نبی، مطبوعہ پنجاب نیشنل پرنٹنگ پریس لاہور

۱۷۷- مودودی صاحب، بانی جماعت اسلامی تجدید و احیائے دین، مطبوعہ لاہور، بار ہفتم

۱۷۸- تفہیم القرآن، جلد اول، مطبوعہ لاہور، بار ہفتم ۱۹۶۸ء

۱۷۹- جلد دوم " " " " ۱۹۷۰ء

۱۸۰- جلد سوم " " " " بار سوم ۱۹۶۹ء

۱۸۱- جلد چہارم " " " " ۱۹۷۰ء

۱۸۲- تنبیہات جلد اول " " " "

۱۸۳- تنبیہات جلد دوم، مطبوعہ پاکستان پرنٹنگ ورکس " " " "

بار دوم ۱۹۵۵ء

۱۸۴- تنقیحات " " " "

۱۸۵- خلافت و ملوکیت، مطبوعہ لاہور، بار پنجم ۱۹۷۰ء

۱۸۶- دستور جماعت اسلامی " " " "

۱۸۷- مسئلہ قومیت، مطبوعہ لاہور، بار ہفتم ۱۹۷۰ء

۱۸۸- میان نذیر حسین دہلوی، بانی غیر مقلد فرقہ فتاویٰ نذیریہ جلد اول و دوم

۱۸۹- معیار الحق، مطبوعہ چٹان پریس لاہور ۱۹۶۵ء

۱۹۰- ابو حنیفہ نعمان بن ثابت، امام عظم الفقہ الکبر، مطبوعہ اشرف پریس لاہور

۱۹۱- نور الحسن خاں جھوپالی، غیر مقلد، مولوی عرف الجادوی، جلد اول و دوم

۱۹۲- نور بخش توکلی، مولانا تحفہ شیعہ، جلد اول، مطبوعہ گلزار عالم پریس لاہور

۱۹۵۸ء

۱۹۳- وحید الزمان خاں غیر مقلد، مولوی تنبیہ القرآن

۱۹۴- نزل الابرار، جلد دوم " " " "

- ۱۹۵- وکیل احمد سکندر پوری، مولانا
وسیلہ جلیلہ، مطبع مصطفائی ۱۳۰۱ھ
۱۹۶- ونامک سادکر، ہندو
ساورکر، طبع اڈل
۱۹۷- ولیم ہنٹر، انگریز
ہمارے ہندوستانی مسلمان
۱۹۸- ولی الدین احمد، محدث
مشکوٰۃ المصابیح

رسائل و جرائد

- ۱- ہفت روزہ، الاعتصام، لاہور
 - ۲- " " " " " "
 - ۳- " " " " " "
 - ۴- ماہنامہ، الجمعینہ، دہلی
 - ۵- سہ ماہی، العلم، کراچی
 - ۶- ماہنامہ، الفرقان، لکھنؤ
 - ۷- " " " " " "
 - ۸- " " " " " ربوہ
 - ۹- ماہنامہ، السواد الاعظم، مراد آباد
 - ۱۰- " " " " " "
 - ۱۱- " " " " " "
 - ۱۲- " " " " " "
 - ۱۳- " " " " " "
 - ۱۴- " " " " " "
 - ۱۵- ماہنامہ، تجلی
 - ۱۶- ہفت روزہ، چٹان، لاہور
 - ۱۷- ہفت روزہ، خدام الدین، لاہور
- بابت ۹ اکتوبر ۱۹۷۰ء
بابت ۱۶ اکتوبر ۱۹۷۰ء
بابت ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۰ء
شیخ الاسلام نمبر
بابت مارچ تا مئی ۱۹۵۸ء
شہید نمبر
بابت رمضان المبارک ۱۳۶۷ھ
بابت فروری ۱۹۵۷ء
بابت ربیع الاول ۱۳۴۸ھ
بابت جمادی الاولیٰ ۱۳۴۹ھ
بابت جمادی الاخریٰ ۱۳۴۹ھ
بابت شعبان ۱۳۴۹ھ
بابت شوال ۱۳۴۹ھ
بابت ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ
بابت فروری، مارچ ۱۹۵۷ء
بابت ۱۶ اپریل ۱۹۵۱ء
بابت ۱۳ اپریل ۱۹۶۲ء

- ۱۸ - ہفت روزہ، خدام الدین، لاہور
- ۱۹ - " " " "
- ۲۰ - ماہنامہ، دارالعلوم، دیوبند
- ۲۱ - ماہنامہ، نقاد، کراچی
- ۲۲ - اخبار، الفضل، قادیان
- ۲۳ - روزنامہ، جنگ، کراچی
- ۲۴ - " " " "
- ۲۵ - روزنامہ، سیاست، کانپور
- ۲۶ - " " " "
- ۲۷ - روزنامہ، صدق، لکھنؤ
- ۲۸ - روزنامہ، کوہستان، لاہور
- ۲۹ - " " " "
- ۳۰ - " " " "
- ۳۱ - روزنامہ، ملاپ، لاہور
- ۳۲ - روزنامہ، نوائے وقت، لاہور
- ۳۳ - " " " "
- ۳۴ - " " " "
- ۳۵ - ہندوستان ٹائمز
- ۳۶ - " " " "
- ۳۷ - روزنامہ، ینگ انڈیا
- ۳۸ - روزنامہ، جنگ، کراچی
- ۳۹ - روزنامہ اسٹیشن
- بابت ۲۲ فروری ۱۹۶۳ء
- بابت ۱۳ اپریل ۱۹۶۳ء
- بابت ستمبر، ۱۹۵۷ء
- بابت نومبر ۱۹۵۶ء
- بابت ۱۵ دسمبر ۱۹۵۳ء
- بابت ۲۷ دسمبر ۱۹۶۶ء
- بابت
- بابت ۳ دسمبر ۱۹۵۵ء
- بابت یکم فروری، ۱۹۵۷ء
- بابت ۲ فروری، ۱۹۵۷ء
- بابت یکم اکتوبر ۱۹۵۶ء
- بابت ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء
- بابت ۲ فروری ۱۹۵۷ء
- بابت ۱۳ جنوری ۱۹۲۵ء
- بابت ۱۱ مئی ۱۹۵۵ء
- بابت ۲۸ ستمبر ۱۹۵۶ء
- بابت ۲ فروری ۱۹۵۷ء
- بابت ۲۰ فروری ۱۹۳۹ء
- بابت ۹ جون ۱۹۲۰ء
- بابت ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء
- بابت ۲۹ ستمبر ۱۹۵۶ء
- بابت ۷ ارجی ۱۹۳۸ء

قطعی تاریخ کتابت

(از حضرت مولانا اختر الحمادی الرضوی مدظلہ - حیدرآباد)

لنہ ، پائندہ باد اسے اختر
جس میں عریاں ہیں دیو کے بندے
اُن کے مکروہ چہروں سے تُو نے
اُن کی اک اک فریب کاری کا
وہ کیا ہے محاسب تُو نے
اللہ اللہ تیری نوکِ مسلم
مار جس کی ارے معاذ اللہ
مظہری فیض ہے یہ سب لاریب
پاسبانِ ملکِ رضا کا تُو
تیری تحریر سے یہ ہے ظاہر
سُنّت و دین کے تحفظ کا
عہد نامہ ہے تیری ہر تحریر
جس کا ہر حرف ساغرِ عرفاں
اللہ اللہ یہ فیضِ شاہِ رضا
واہ وا عہد نامہ اختہ

آئینہ ہے ، کتاب یہ کیا ہے
بر سرِ عام ہر سراپا ہے
ہر نقاب آج نوچ پھینکا ہے
تار تار ہر دبیز پردہ ہے
سر بازار مکر ننگا ہے
شاہ احمد رضا کا نیزہ ہے
قہر حق جس کا وار ، توبہ ہے
تجھ پہ بے شک کرمِ رضا کا ہے
رہبرِ راہِ شاہِ بطحا ہے
عہد تُو نے رضا سے باندھا ہے
کام تجھ کو رضا نے سونپا ہے
حِشمتِ فیض ہر رسالہ ہے
ہر سطر جس کی بادِ خانہ ہے
جس نے دیکھا پکار اُٹھا ہے
آج نچناتہ مٹلا ہے

۹۵
۱۳

۹۵
۱۳

قطعہ تاریخ ترتیب

(از حضرت مولانا اختر الہامی رضوی مدظلہ العالی حیدرآباد)

اللہ اللہ حضرت اختر کی کیا تصنیف ہے
مل گیا ہے خاک میں نجدی کا تاریخی غرور
مگر کی ان کے فضا میں اڑ رہی ہیں دھبیاں
اس طرح فرمایا ہے بوجہلیوں کا احتساب
نوپ چھینکی رنج سے ہر خریب کاری کی نقاب
یعنی سب انگریز کی شطرنج کے مہرے ہیں یہ
بیش قیمت ہے یہ علمی کارنامہ آپ کا
روز و شب علم و عمل میں ہو ترقی آپ کے
مرجبا تحقیقی، یہ روزِ قلم صد آفریں
ایک سرمایہ ہے یہ اہل قلم کے واسطے

دیکھ کر جس کو نظر پر نور ہے روشن نگاہ
سب کی ٹھوکر میں ہے مصنوعی فضیلت کی کلاہ
ہر دلیل ان کی ہوا کے ہے پروں پر شل کا
ہے ہر اک عریاں سر بازار با حالِ تباہ
آج ہے پیشِ نظر اک ایک کار وئے سیاہ
حاشیہ بردار گاندھی، کانگرس کے خیر خواہ
ہے یقیناً آپ پر لطفِ رضا شام و پکا
ہو زمانے میں فزوں سے بھی فزوں تر عز و جاہ
اس کا اک اک حرف ہے علمی فضیلت پر گو
اک مورخ کے لیے مشعلِ بکف، مینار

جس نے دیکھا اس کو اختر کہہ اٹھا بسیاختہ

واہ رضوی شان ہے، کیا یہ، رضا کی شان واہ

۱۳ ۹۴

۱۳ ۹۴

قطعة تاریخ طباعت

(از حضرت اختر الحامدی الرضوی مدظلہ العالی - حیدر آباد)

اختر ترے شمار ہے کیا سیرتِ رضا
احمد رضا کا والا و شیدا نہ تو ہو کیوں
تجھ پر نگاہِ نطفِ رضا کی ہے رات و دن
سر پر امامِ اہلِ قلم کا سجا ہے تاج
طرزِ بیاں میں کلکِ رضا کا ہے بانچن
جنگِ آزما و برسرِ پیکارِ رات و دن
عمرت دراز باد، دُعا یہ خدا سے ہے
جب اُن کو عشقِ سرور ہر دوسرا سے ہے
یہ اوجِ علم و فضل اُنھیں کی عطا سے ہے
کیا شانِ فضلِ حضرتِ غوثِ الوری سے ہے
ظاہر بہِ جُسن، تیرے قلم کی ادا سے ہے
تُو دشمنانِ ذاتِ شرِ انبیاء سے ہے

تاریخِ طبع میں ہے یہ اختر کا فیصلہ

تُو فیضِ حشمہ فیضِ رضا سے ہے

۱۹ ۶ ۷۶

چیتو زینت شاپ بخت
مکتبہ اسلامیہ 310
0313-455584

شرح صحیح مسلم

(۷ جلد)

تصنیف

علامہ غلام رسول سعیدی شیخ الحدیث دارالعلوم امیرکراچی
اس صدی کی بہترین شرح جس میں عصر حاضر کے
جدید مسائل کا مختصراً حل پیش کیا گیا ہے۔
● یہ شرح قارئین کو دوسری شرحوں سے
بے نیاز کرے گی۔

اشعۃ اللمعات

(۷ جلد)

شرح مشکوٰۃ

تصنیف منیف
عارف باللہ شیخ محقق حضرت مولانا عبدالحی محمد دہلوی رضویہ
اردو ترجمہ حواشی
حضرت مولانا محمد امجد علی نقشبندی مدظلہ العالی
علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری نقشبندی

بخاری شریف مترجم

(۳ جلد)

امام الحدیث ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بخاری
مترجم، مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہان پوری

سنن نسائی مترجم

(۳ جلد)

امام ابو عبد الرحمن احمد بن حنبل بن علی بن جریر نسائی
ترجمہ مولانا دوست محمد کازم مولانا محمد عبد اللہ قادری

جامع ترمذی مترجم مع شمائل ترمذی

(۲ جلد)

محدث حلیل امام ابویوسف محمد بن یحییٰ ترمذی
مترجم، مولانا علامہ محمد صدیق سعیدی ہزاری

مشکوٰۃ شریف مترجم

(۳ جلد)

امام ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب غزالی
مترجم، فاضل شہیر مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہان پوری

سنن ابن ماجہ مترجم

(۲ جلد)

امام حافظ ابو عبد اللہ محمد بن یزید ابن ماجہ الربیع القشیری
مترجم، مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہان پوری

طحاوی شریف مترجم

(۱ جلد)

محدث حلیل امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی
مترجم، علامہ محمد صدیق ہزاری مترجم ترمذی شریف، فاضل الصائغین
تقدیم، علامہ غلام رسول سعیدی شارح مسلم شریف

سنن ابو داؤد شریف مترجم

(۳ جلد)

امام ابو داؤد سید جمال بن اشعث بختانی روانہ
مترجم، مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہ جہان پوری

ریاض الضائقین مترجم

(۲ جلد)

شیخ الاسلام ابو زکریا یحییٰ بن شرف النووی
مترجم، مولانا محمد صدیق ہزاری مدظلہ
تقدیم، محمد عبدالحکیم شرف قادری

فرید بک سٹال

۳۸۔ اردو بازار لاہور ۳۱۲۱۷۳ فون ۲۲۲۳۸۹۹